دلچسپ اور سنسنی خیز کہانیوں کا مجموعہ
ماہنامہ
جاسوسی ڈائجسٹ
کراچی
مارچ 2017
نگرانِ اعلیٰ
معراج رسول

جلد 47 • شمارہ 03 • مارچ 2017 • زرِ سالانہ 800 روپے • قیمت فی پرچہ پاکستان 60 روپے •

خط و کتابت کا پتا: پوسٹ بکس نمبر 229 کراچی 74200 • فون: 35895313 (021) فیکس 35802551 (021) Email:jdpgroup@hotmail.com

مدیر اعلیٰ
عذرا رسول

پبلشر و پروپرائٹر: عذرا رسول • مقام اشاعت: C-63 فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس کمرشل ایریا مین کورنگی روڈ کراچی 75500
پرنٹر: جمیل حسن • مطبوعہ: ابنِ حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

Medora
Perfumed Talc
خوشبو جو دل کو بھائے
تازگی جو ہر کوئی چاہے
Pleasure
Cherish
Joy
Passion
Greetings
Dignity
Salute
خوشبو کی دنیا کے 8 شگفتہ احساس
MEDORA OF LONDON

عزیزانِ من......السلامُ علیکم

مارچ کے اس شمارے کے ساتھ دل زخمی ہیں اور آنکھیں پُرنم......مرگِ انبوہ پر ہر طرف ایک سکوت سا طاری ہے۔لوگ اپنے سائے سے بھی ڈرے ہوئے ہیں۔ پیغامات چل رہے ہیں۔فون آرہے ہیں کہ فلاں فلاں جگہ نہ جانا، بھیڑ بھاڑ سے دور رہنا،تفریحات کو فی الحال بھول جاؤ، گھر میں رہو اور بلاضرورت باہر نہ نکلو۔یوں لگ رہا ہے جیسے ہر کوچے میں بھوکے درندے شکار کی تاک میں آبیٹھے ہوں۔الرٹ آتے رہے، ریاستی ادارے مستعد رہے لیکن پھر بھی پچھلے چند دنوں میں معصوم اور بے گناہ پاکستانیوں کی وہ خوں ریزی ہوئی کہ الا مان۔پہلے بھی ملک اور یہی لوگ تھے اور سب مل جل کر محبت سے رہتے تھے۔کسی کو دوسروں کے مذہب یا عقیدے سے کوئی غرض نہیں تھی لیکن پچھلے چند عشروں سے ایک عجب فتنے نے سر اٹھایا ہے جو انسانی لہو کا پیاسا ہے، لاشیں گرا کر اسے تسکین ملتی ہے،نہتوں کو خاک و خون میں نہلا کر یہ فتح کے زعم میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ المیہ یہ ہے کہ بیشتر مرنے والے مسلمان اور ان کو مارنے والے بھی خود کو یہی کہتے ہیں۔سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ ہولناک کھیل کہاں رکے گا۔ادارے بیدار اور فوج تیار و مستعد ہے۔جرنیل نے واشگاف الفاظ میں دہشت و بربریت کو پوری قوت سے کچل دینے کا عزم ظاہر کیا ہے۔پوری قوم اس عزم کی پشت پناہ ہے۔ہر سچے پاکستانی کی دلی خواہش ہے کہ سڑکوں، پہاڑوں، میدانوں، اسکولوں، درگاہوں اور عبادت گاہوں میں انسانی لہو کی یہ ارزانی بند ہو اور لوگ پوری بے خوفی کے ساتھ اپنے معمولات کو انجام دے سکیں۔اس امید کے ساتھ چلتے ہیں اپنی محفل میں جہاں نوائے تلخ و شیریں کے باوجود مکمل امن و امان رہتا ہے۔

گھارو سے منصور حبیب پلیجو کے نت نئے انداز’’ماہ فروری کے سرورق پہ عالمِ شباب کے درمیانی زینے عبور شدہ قاتل حسینہ شاطرانہ ادا سے چہرے پر سفاکانہ تبسم سجائے سال خوردہ آدمی اور جارحانہ جوان کی ہاتھا پائی سے لطف اندوز ہوتے نظر آئی تو ہم نے ہتھیار کی موجودگی کے باعث نو دو گیارہ ہونے میں ہی عافیت جانی اور محفل گلستان جاسوسی کی جانب لپکے جہاں مدیر اعلیٰ عالمی منظرنامے اور ٹرمپ پہ ہلکی پھلکی تنقید کے ساتھ مستقبل کی بابت خدشات اور خوش فہمیوں میں گھرے نظر آئے بقول شاعر مشرق میری سادگی دیکھ کیا چاہتا ہوں۔وارث علی اپنے نپے تلے معیاری تبصرے کے ساتھ خوشی سے نہال ہیں مبارک ہو،لیلیٰ کوثر آپ کے دُرگا سے پاروتی کے بدلاؤ نے سوچ میں ڈال دیا ہے۔طلعت مسعود کی سہی آمد، فراز سومرو کے پُراعتماد انداز، عمر فاروق کی جرأت انگیزی، شاہد امین کے شاعرانہ بیان، انصر علی کی کہانیوں کی چیر پھاڑ، اسرار ساقی کے منجھے اندازِ تحریر، شفقت محمود کے بھرپور تجزیے، مرحا گل کی روایتی چھیڑ چھاڑ اور فطری شوخیوں، جاسوس 007 کے تیا پانچہ کرتے موازنے، الجھے الجھے تبصرے کے سنگ سلجھے احسان سحر، رومی انصاری کی مایوسانہ نصیحتیں، واصلی برادرز کے دل لبھاتے الفاظ اور محترمہ سعدیہ قادری کی مستقل مزاجی سے معاشرتی فلاسفی نے محفلِ یاراں کو چار چاند لگا دیے۔جنونِ وفا حساس دلوں کو تڑپاتی اور آنکھیں نم کرتی کہانی جس میں کہانی کے مکمل لوازمات اور سارے رنگ موجود رہے۔انگارے حسبِ روایت تیز رفتاری سے رنگ بدلتے نت نئے موڑ لیتی فیصلہ کن معرکہ آرائی تک آن پہنچی ہے البتہ آوارہ گرد دوبارہ جمودِ حصار میں مقید ہوتی نظر آرہی ہے۔قدرت کا انعام، اثباتِ جرم اور فاش غلطی جیسے موضوعات پر پہلے کئی کہانیاں پیش کی گئیں ہیں البتہ تجدیدِ عہد اور دوسری دنیا عمدہ تر رہیں جبکہ قبضہ بہترین چناؤ رہی بدگمانی کے انجام سے متعلق سبق آموز انتخاب۔سرورق کا پہلا رنگ شکار بلاشبہ اس ماہ کے جاسوسی میں سب سے زیادہ داد کی مستحق ٹھہری۔کہانی میں سنسنی اور سسپنس نے آخر تک اپنے حصار میں لیے رکھا مصنفہ نے کرداروں اور واقعات کو تسلسل سے پوری گرفت کے ساتھ قارئین کو بھی خوب الجھائے رکھا اور اندازوں کے برعکس انجام تک محویت کا عالم برقرار رکھا مرحوم سلیم فاروقی کی فراقِ اجل تنقیدی چشمہ اتار کے بڑی عقیدت سے پڑھی کہ اب یہ ستارہ بھی آنکھوں سے اوجھل ہوا اللہ تعالیٰ مرحوم کے درجات بلند کرے اور لواحقین کو صبرِ جمیل عطا کرے۔‘‘

007 جاسوسِ اعظم کی نیم بیزاری’’فروری کا جاسوسی آسمان سے روئی کے گالوں کی طرح گرتی برف باری کے دوران ملا۔ٹائٹل پر نیلا رنگ شاید زہریلی دشمنی کی علامت تھا۔بائیں طرف ایک نیم گنجی حسینہ آملہ ریٹھے کے تیل کی تلاش میں ہلکان نظر آئی۔دو عدد لڑاکا مرد خواہ مخواہ کشتی میں الجھے ہوئے تھے۔اداریے میں امریکی ڈونلڈ ڈک کی آمد پر فکرمندی تھی۔وارث علی کو بدھائی ہو۔فراز سومرو بھائی! ہم ہوئے، تم ہوئے، میر ہوئے۔ڈاکٹر بھٹی کے سبھی اسیر ہوئے۔اے ایچ کاظمی! تبصرے کی اشاعت کا انتظار اور خوشی کا بھی مزہ الگ ہی ہوتا ہے۔جب میرا پہلا تبصرہ شائع ہوا تھا تو دل چاہتا تھا کہ چھت سے مارے خوشی کے چھلانگ لگا دوں۔شاہد امین! کاشف زبیر کی سالگرہ تین اگست نہیں، تین جنوری کو ہوتی ہے۔لیلیٰ کوثر لاشاری کی اردو دانی بھی کمال کی تھی۔لیلیٰ کے اسلوب نے ایک مصور تبصرہ نگار کی یاد دلا دی۔عبداللہ ادیب صحرائی کی ناپسند بڑی عجلت زدہ تھی۔مرحا گل کے تبصرے کے بعد اپنی گلو اور بلو باجی بہت یاد آئیں، کہاں چھپی بیٹھی ہیں یہ دونوں؟ عبادت کاظمی بھی غائب تھے اس بار۔کہانیاں دو دن میں ساری چٹ کر ڈالیں۔ آوارہ گرد میں کبیل دادا کی ٹوٹی ٹانگ اور فل سپیڈ ایکشن نے بہت مزہ دیا۔بھٹی صاحب اب ذرا جلدی سے میڈم اور کبیل کو شگنوں کی مہندی بھی لگوا دیں

اور سب کی دعائیں لیں۔ انگارے کی قسط سنسنی خیز تھی۔ شدید برف باری میں بھی خون گرما گیا۔ طاہر جاوید مغل کا قلم سدا بہار ہے۔ بہت سنسنی خیز اختتام تھا۔ پروین زبیر کی جنونِ وفا کچھ دکھی سا کر گئی۔ نویرا کے والدین پر بھی غصہ آیا کہ بیٹی کو یوں گھر سے نکال دیا اور پھر کبھی خبر بھی نہ لی کہ زندہ ہے یا مرگئی۔ حسنات کے کردار سے کرکٹ سے بیزاری مزید زیادہ ہوئی۔ شبنم شفیق نے مغربی انداز میں خوب قتل و غارت کی۔ موضوع بولڈ تھا قلم بھی کئی دفعہ لڑکھڑایا لیکن مزہ خوب آیا۔ مرحوم سلیم فاروقی کی کہانی بھی بہت پسند آئی۔ کومل اور شیراز پر مجھے اسٹارٹ سے ہی شک تھا۔ منظر امام آج کل عجیب و غریب موضوعات لانے لگے ہیں۔ دوسری دنیا کچھ خاص نہیں تھی۔ مغربی کہانیاں پڑھنے کا موڈ نہیں۔''

محمد صفدر معاویہ کی خانیوال سے تبصرہ نگاری'' ماہ فروری کا جاسوسی 29 جنوری کو صدر بازار پشاور میں بادلوں کے سائے میں جا کر خریدا۔ سرورق کی خوب صورت ماڈل اور ساتھ ہی دو مردوں کو آپس میں لڑتے دکھایا گیا جو یقیناً فرح اور شیراز ہیں اور پستول والا ہاتھ کومل کا ہوگا۔ بہت ہی پیارا سرورق ہے۔ آپ کا اداریہ پڑھا، پہلے ایک موذی کم تھا جو دوسرا ٹرمپ بھی دنیا پر مسلط ہوگیا خدا خیر کرے۔ دوستوں کی محفل میں انٹری دی تو وارث علی پیارے تبصرے کے ساتھ موجود تھے۔ فراز سومرو بھی وزارت کا عہدہ بہت عمدگی سے سنبھالے ہوئے تھے۔ اے ایچ کاظمی کی خوشی بھی قابل دید تھی۔ مسقط سے شاہد امین کی بھی اچھی انگلز، انصر علی کا چنچل پن بھی پسند آیا۔ سعدیہ قادری کی بھی بہترین تبصرہ نگاری، بہترین تبصرہ کے ساتھ لیلیٰ کوثر لاشاری بھی محفل کی رونق بنیں۔ شفقت محمود کی دکھ بھری باتیں تلخ یادیں چھوڑ گئیں۔ دبئی سے طلعت مسعود کو جاسوسی کی محفل میں پہلی انٹری پر ویلکم جی۔ عبداللہ ادیب بھی مختصر سی حاضری کے ساتھ محفل میں موجود۔ جاسوس 007 کا بھی اچھا انداز۔ اعتزاز اینڈ زریاب وصلی کی عمدہ انٹری، رومی انصاری بھی محفل کو چار چاند لگا رہے تھے۔ آہ ایک اور ادب کا چراغ بجھ گیا۔ سلیم فاروقی بھی اپنی یادیں ہمارے درمیان چھوڑ کر خالقِ حقیقی کو جا ملے۔ خدا تعالیٰ آپ کی لحد کو جنت کا باغ بنائے اور صبرِ جمیل اجرِ عظیم عطا کرے، آمین۔ احسان سحر کی تلخ باتیں بھی اچھی رہیں۔ کندیاں کے ایک تبصرہ نگار بھائی نادر سیال سے دسمبر میں ملاقات ہوئی اور فون پر بھی گپ شپ رہتی ہے، دوستوں کو سلام کہہ رہا تھا اور ساتھ یہ بھی کہ کچھ مصروفیات کی وجہ سے محفل سے دور ہوں اور جلد ہی حاضری دوں گا۔ بہت ہی اچھے اور ملنسار انسان ہیں۔ (انتظار رہے گا)۔ بشیر احمد ایاز کا بھی تبصرہ عمدہ رہا، مرحا گل بہن جی آپ کو سالگرہ بہت بہت مبارک ہو، اللہ پاک آپ کو ایسی ہزاروں سالگرہیں مبارک کرے۔ محفل کے بعد سب سے پہلے کترنیں پڑھیں۔ بہت ہی مزہ آیا۔ کہانیوں میں سب سے پہلے بھٹی صاحب کی آوارہ گردی پڑھی۔ آخر کار ایک مرتبہ پھر کبیل دادا اور شہزی مل گئے ساتھ میں شکیلہ اور اول خیر سے ملاقات ہوگئی۔ اب آئے گا مزہ برسات کا اوہ سوری بہار کا جب یہ چاروں مل کر دشمنوں کو نیست و نابود کریں گے۔ انگارے پڑھی جہاں انگارے اب شعلے بن کر آسمان تک جا رہے ہیں۔ آخر کار آقا جان اپنی کم ظرفی پر اتر آیا۔ شاہ زیب کا کہا قسطینا کو پسند نہ آیا، آقا جان کے بارے میں تو اب بھگتیں گے۔ پروین زبیر صاحبہ جنونِ وفا لے کر آئیں بہت ہی نائس تحریر۔ نویرہ نے واقعی میں محبت میں وفا کی حد کر دی لیکن وہ ایک سراب کے پیچھے بھاگ رہی تھی۔ بھلا وہ نویرہ کے ساتھ کیسے وفا کرتا یہاں ارسل کی ہمت کی داد دینی پڑے گی، نویرہ کے انکار کے باوجود اس کی سنتا رہا اس کو سمجھاتا رہا۔ تنویر ریاض کی تجدید عہد بھی اچھی اسٹوری تھی کہ اس میں لارنس اور برائن نے دورانِ جنگ زخمی ہونے کی صورت میں ایک دوسرے کو ختم کرنے کا عہد کیا تھا۔ عکس فاطمہ کی حاضر دماغ مختصر مگر عمدہ تحریر تھی۔ سلیم انور کی ذہین ساس بھی بہترین رہی۔ اس نے جس طریقے سے فون نمبر کا پتا چلایا، وہ کافی انٹرسٹنگ تھا۔ منظر امام کی دوسری دنیا بھی بہترین تحریر تھی۔ تمکین رضا کی اثباتِ جرم بھی اچھی رہی، ماں نے بیٹے کو بچانے کے لیے سب کچھ اپنے سر لے لیا۔ مختار آزاد مرحوم کی قبضہ میں موڈی کے ذہن میں آنے والی پراگندہ سوچوں نے اس کو جیسمن کے خلاف سوچنے پر مجبور کر دیا کہ شاید وہ میرا گھر ہتھیانا چاہتی ہے لیکن اب پچھتائے کیا ہوت جب چڑیاں چگ گئیں کھیت جیسمن کو مار کر خود بھی راہِ عدم کی باسی ہوئی۔ شبنم شفق کی شکار کیا تحریر تھی، اس کا نام شکار کے بجائے خونی سفر ہونا چاہیے تھا۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا کہ کوئی اتنا سفاک ہوسکتا ہے جو محض تسکین کے لیے قتل کرتا پھرے آخر تک ڈیوڈ علینہ اور مشعل کی طرف شک گیا ہی نہیں۔ سرورق کا دوسرا رنگ قزاقِ اجل سلیم فاروقی مرحوم کے قلم سے۔ کیا اسی کو محبت کہتے ہیں کہ کسی کو پانے کے لیے اس سے وابستہ لوگوں کی زندگی ہی ختم کر دی جائے۔ اگر کومل کو اس سے محبت ہوتی تو وہ کبھی بھی اس کی بیوی کو نہ مرواتی حالانکہ آپ جس سے محبت کرتے ہو اگر وہ کسی اور سے محبت کرتا ہے تمہیں بھی اس کی محبت کا احترام کرنا چاہیے بے شک وہ تمہارا رقیب ہی کیوں نہ ہو۔''

لاہور سے عبدالجبار رومی انصاری کا عذر'' خوب صورت دوشیزہ کی لب کشائی سے تو یہی لگ رہا ہے کہ وہ کہہ رہی ہے یہ لڑائی جھگڑا بند کرو ذرا میری طرف دیکھو، قدرت کی کیسی صناعی ہوں، میں امن و محبت کا پیغام ہوں، سو آپ سب بھی امن و محبت سے رہیں۔ ٹرمپ کو دیکھ کر لگ رہا ہے کہ وہ دنیا پر مسلط کر دیا گیا ہے خصوصاً مسلمان دنیا کے لیے۔ سندیلیا نوالی سے وارث علی کی خواہش اچھی لگی، مبارک ہو۔ تبصرہ زبردست ہے اور ہاں میں بھی 3 تاریخ کو سندیلیا نوالی شادی پر جا رہا ہوں اس لیے جلدی میں تبصرہ بھی مختصر ہو رہا ہے۔ باقی فراز سومرو، شاہد امین، انصر علی، لیلیٰ کوثر، جاسوس 007، عمر فاروق، ارشد اور اسرار ساقی نے بہترین تبصرہ نگاری کی۔ انگارے میں لگا تھا افغانی کی دھلائی ہو جائے گی لیکن شاہ زیب نے تو اس کی باتوں سے ہی دھلائی کر دی۔ باقی کہانی زبردست رہی۔ آوارہ گرد میں شہزی کا روپ بھی کبھی کبھی کھٹکنے لگتا ہے۔ کچھ اتفاقات سے بچ جاتا ہے اور دوسرا وہ خود بھی کمال کا ایکٹر ہے بالآخر وہ کبیل دادا سے بھی مل ہی گیا آخر میں کبیل دادا جانے کون سا ماضی کھنگالنا چاہتا ہے جو اس کڑے وقت میں دوشیزہ نوشابہ یاد آ گئی ہے۔ اس دفعہ اتنی مصروفیت رہی کہ مزید کہانیاں پڑھ نہیں سکا۔''

وارث علی ملاح کی نوازش سندیلیا نوالی سے'' ماہ فروری کا دلفریب شمارہ 30 جنوری کی شام کو جھلمل کرتا ہوا خوش گوار جھونکے کی طرح ملا۔ ایک دوست نے 3 دن پہلے خوش خبری دی تھی کہ تیرے لیے جاسوسی میں ایک بہت بڑا سرپرائز ہے جس کی وجہ سے بہت انتظار کرنا پڑا۔ دھڑکتے دل سے حسینہ

ماہ جبینہ کو نظر انداز کرتے تبصروں پر نظر ڈالی تو حیرت سے گنگ ہی تو رہ گیا۔ جاسوسی نے اتنی بڑی خوشی دی تھی کہ اس خوشی کو ناپنے کے لیے کوئی پیمانے ہوتے تو بھی کم پڑ جاتے۔ اولین تبصرہ ہمارا تھا۔ اک خواب سا لگتا تھا پر جاسوسی نے اس خواب کو شرمندہ تعبیر کر دیا جو میں نے دیکھا بھی نہیں تھا۔ صفدر معاویہ، کوثر لاشاری اور نامعلوم بندے جی آپ لوگوں کا شکریہ کہ آپ نے ہمیں اپنے تبصرے میں یاد کیا۔ کہانیوں میں آغاز انگارے سے کیا۔ اس دفعہ کی قسط بہت دکھی کر گئی۔ شاہ زیب اور جاناں کی حالت پر بہت رونا آ رہا تھا۔ افغانی جس کا خدشہ تھا۔ اس سے تو شاہ زیب بچ گیا لیکن خبیث آقا جان نے آخر اپنی اوقات دکھا ہی دی۔ قسطینا کو بھی بڑا ہی ناز تھا اپنے چچا جان پر...... جاناں نے جان پر کھیل کر بہت ہی اہم معلومات فراہم کیں۔ مغل صاحب اب اور شاہ زیب پر ظلم نہ کریں جی، بہت زبردست قسط رہی۔ دوسرے نمبر پر آوارہ گرد پڑھی۔ پچھلی اقساط کی نسبت شکر ہے کہ بھٹی صاحب نے اس قسط میں مار دھاڑ نہیں کروائی۔ شہزی کو جلد از جلد ہی کچھ کرنا ہوگا ورنہ اس کا بھیس والا بھید کھل جائے گا۔ باقی بہت عرصے بعد کبیل دادا، اول خیر اور شکیلہ کا شہزی کو ملنا بہت ہی خوشی دے گیا۔ شکریہ پروین زبیر آپا جی کہ آپ نے جاسوسی میں قدم رکھ کر دل خوش کر دیا۔ جنونِ وفا میں نویرہ نے وفا کی جو مثال قائم کی، اس پر بے اختیار آنسو نکل پڑے۔ نویرہ نے کیا کچھ نہیں کیا تھا اس کم بخت حسنات کے لیے پر حسنات اور اس کے خاندان کو وہ بوجھ لگنے لگی۔ کاش نویرہ، ارسل کا ہاتھ تھام لیتی خود کو بھی تباہ کر گئی اور ارسل بے چارے کو بھی۔ بہت اچھی اسٹوری تھی۔ منظر امام کی کہانی بھی انوکھی تحریر تھی۔ اب ساری عمر کا پچھتاوا سلیم کے گلے پڑ گیا۔ ایک مسلمان روح کو ہندو پنڈت کے حوالے کر دیا۔ باقی کہانیاں زیرِ مطالعہ ہیں۔ طاہر گلزار جی اس دفعہ بھی غیر حاضری رہیں۔ بھائی کبیر عباسی اور زویا اعجاز سے درخواست ہے کہ جلدی آئیں بہت اچھی کہانی لے کر۔ سلیم فاروقی جی کا بہت دکھ ہوا اللہ ان کی مغفرت فرمائے، آمین۔''

کھاریاں سے بابر عباس، حسنین عباس کی پسند ناپسند'' جاسوسی کا نیا شمارہ 28 کو ملا۔ زبردست اور جاسوسی ٹائپ سرورق تھا۔ جانِ عزیز محفل چینی کم شوگر زیادہ میں پہنچے۔ اس بار پہلے تبصرے پر وارث علی تھے۔ فراز سومرو صاحب، محمد صفدر صاحب کا تبصرہ اچھا تھا۔ اے ایچ کاظمی صاحب زیادہ خوشی کا اظہار نہ کریں ورنہ لوگ پاگل ای، اوے کہنے لگیں گے۔ شاہد امین صاحب امیدوں پر پانی پھیرنا بری بات ہے پھیرنا ہے تو کچھ اور پھیریے جیسے جھاڑو۔ سعدیہ قادری صاحبہ آپ کیا اسما قادری صاحبہ کی بہن ہیں، تھوڑا سا خط پر توجہ دیں۔ شفقت محمود بھایا آپ کا خط پسند آیا۔ طلعت مسعود صاحب آپ نے کہہ تو دیا ہے پرانے قاری ہیں یہ نہیں لکھا کتنے پرانے قاری ہیں وضاحت فرمائیں گے۔ بھائی عبداللہ ادیب آپ کا مختصر سا تبصرہ پسند آیا۔ اس طرح مختصر سے تبصرے کے ساتھ آتے رہے تو انشاء اللہ ایک دن ضرور ترقی کریں گے۔ اب بات کہانیوں کی تو سب سے پہلے آل ٹائم گریٹ جو مغل اعظم بن کر زبردست کہانیاں تخلیق کرتے ہیں۔ ونڈرفل مغل صاحب خدا آپ کو صحت اور تندرستی عطا فرمائے، آمین۔ دوسرے نمبر پر ایک اور خوب صورت اور بڑا نام جو مریضوں کے بجائے اپنے قارئین کا زیادہ خیال رکھتے ہیں جن کے نام پر بڑی خوب صورت اور معیاری کہانیاں ہیں جناب ڈاکٹر عبدالرب بھٹی جن کی آوارہ گردی نے ہمیں اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ جکڑ رکھا ہے ڈاکٹر صاحب تسی گریٹ او، اس میں کوئی شک نہیں آپ آوارہ گرد کو زبردست طریقے سے آگے لے کر جا رہے ہیں۔ اس بار جاسوسی کو ایک اور بڑے خوب صورت نام کا ساتھ ملا یعنی پروین زبیر صاحبہ کا، ان کی جنونِ وفا نے اسی طرح متاثر کیا جس طرح کسی جہاز کو ہیروئن متاثر کرتی ہے۔ پروین زبیر صاحبہ نے شروع سے آخر تک قلم پر اپنی گرفت مضبوط رکھی۔ کہانی بھی اتنی خوب صورت تھی کہ آدھے گھنٹے میں ختم کر لی۔ پہلا رنگ اس بار شبنم شفیق کا شکارا اپنے اندر سنسنی، تھرل، ایکشن اور سسپنس لیے ایک زبردست رنگ تھا۔ کہیں کہیں شبنم شفیق اوور ہوئی تھیں مگر ویسے دیکھا جائے تو پہلا رنگ بہت بہتر تھا۔ اس کے لیے شبنم شفیق مبارک باد کی مستحق ہیں۔ دوسرا رنگ سلیم فاروقی مرحوم کا قزاقِ اجل تھی، مرحوم کی آخری تحریر زبردست رہی، زبردست تحریر شروع سے لے کر آخر تک اپنی تیز رفتاری برقرار رکھی۔ بہت اچھے فاروقی صاحب آپ اپنی خوب صورت تحریروں کے ذریعے ہمارے درمیان زندہ رہیں گے۔ منظر امام اس بار دوسری دنیا لے کر منظرِ عام پر آئے۔ منظر امام جب بھی آتے ہیں خاص چیز قارئین کے لیے لے کر آتے ہیں۔ دوسری دنیا بھی اپنی طرز کی ایک نرالی کہانی تھی۔ ایک اور نام جو اپنی تحریروں کے ذریعے ہم میں زندہ ہے، مختار آزاد صاحب۔ خدا مرحوم کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے، اس بار قبضہ کے ذریعے حاضر ہوئے۔ مغرب سے درآمد شدہ قبضہ بہتر تھی۔''

میانوالی سے احسان سحر کی آخری بات'' بادل اور ٹھنڈی ہوائیں دن کے وجود سے لپٹی ہوئی تھیں۔ خواہشیں دل میں چکراتی ہی رہتی ہیں اکثر پوری بھی ہو جاتی ہیں۔ جاسوسی کا ملنا بھی انہی خواہشوں میں سے ایک تھا۔ ٹائٹل کی تعریف تو بنتی ہے، کیونکہ اس ماہ کے ٹائٹل نے آخری کہانی تک ساتھ نبھایا۔ رنگ کہیں سے بھی نہیں اُڑا۔ لگتا ہے اس دفعہ کلر پاکستان کے بجائے چائنا سے منگوایا گیا تھا جو اتنا مضبوط تھا۔ خطوط کی محفل میں سبھی دوست چھائے رہے۔ وارث علی اچھا تبصرہ کر گئے۔ مجھے محبت ہوتی تھی، جب ہم کسی سے محبت کرتے ہیں تو اسے اونچا مقام دیتے ہیں۔ اتنا اونچا مقام کہ آخرکار وہ شخص ہماری پہنچ سے باہر ہو جاتا ہے......آہ...... یہ بے بسی۔ پہلی کاوش بے حد پسند آئی۔ یہ وفا کا جنون ہی تھا جو قدم قدم پر نویرہ کی صورت میں دیکھنے کو ملا۔ خاقان نے آخر تک گردن نہ جھکائی اور ہمت اور جرأت سے دشمنوں کو اپنے بھیانک انجام تک پہنچایا۔ پہلا رنگ بڑے عرصے بعد ایسا ایڈونچر دیکھنے کو ملا۔ مشعل، ڈیوڈ اور علینا نے واقعی اینڈ تک محسوس نہ ہونے دیا کہ واقعی اصل قاتل ہیں۔ ایسے لوگ نفسیاتی بھی ہوتے ہیں کیونکہ انسان خود عجوبہ ہے۔ دوسرا رنگ بھی متاثر کرنے میں کامیاب ہوا، جاسوسی کافی حد تک پھیلی رہی۔ تجدیدِ عہد دو دوستوں کی تلخ نوائی جو جنگ سے نبرد آزما ہونے کے بعد پھر یکجا ہوئے ایک نئی زندگی کے ساتھ۔ ذہین ساس اور حاضر دماغ مختصر کہانیاں اچھی لگیں۔ انگارے کی قسط سنسنی خیز رہی۔ کمانڈر افغانی کو جتنا خطرناک سمجھ بیٹھے تھے۔ الٹا ہو گیا اور دل بھی خوشی سے نہال ہو گیا۔ بہت خوب۔ دوسری دنیا بھی کالے جادو کے حوالے سے اچھی کاوش رہی۔ اثباتِ جرم نے آخر تک تجسس

باندھے رکھا۔ قدرت کا انعام، واقعی ہملٹن پر قدرت کا انعام ہی ہوا کہ سارہ کی موت کے ساتھ ساتھ اپنی بیٹی کی موت کی وجہ کا بھی علم ہوگیا۔ بعض اوقات انسان کے لیے بہت کچھ اچھا ہو جاتا ہے۔ قبضہ ہلکی پھلکی سادہ سی خوب صورت کہانی جو دھیمے دھیمے پن سے آگے بڑھتی رہی اور اینڈ نے دکھی کر دیا۔ موڈی کی غلط فہمی نے سب تباہ کر دیا۔ آوارہ گرد تیزی سے آگے بڑھتی جا رہی ہے۔ یہ قسط بھی کافی دلچسپ رہی۔ آخری بات کے ساتھ تبصرہ ختم کروں گا۔ بعض لوگ ہمیں زندگی میں بہت دیر سے ملتے ہیں۔ اتنی دیر سے کہ ہم چاہیں بھی تو انہیں زندگی کا حصہ نہیں بنا سکتے۔''

کراچی سے ادریس احمد خان کی محبت ''جاسوسی گوناگوں رنگینیوں کے ساتھ آموجود ہوا۔ سرورق بھی ذاکر صاحب کی کاوشوں کا ثبوت تھا۔ اندر کے صفحات میں چیخی نکتہ چینی میں اداریہ بھی زبانِ حال سے سب کی توجہ حاصل کیے ہوئے تھا۔ ناموں کی محفل میں وارث علی سرفہرست نظر آرہے تھے، مبارک ہو۔ دیگر ناموں میں نئے و پرانے سارے دوستوں کی حاضری بھرپور تھی۔ سلیم فاروقی صاحب کو اللہ جنت میں اعلیٰ مقام دے، آمین۔ جنونِ وفا سب سے پہلے پڑھی۔ بہترین کہانی ثابت ہوئی۔ عورت کی محبت کی کہانیاں سنتے تھے۔ واقعی نویرہ نے محبت کی انتہا کر دی۔ اپنا سب کچھ محبت پر وار دیا۔ تن من دھن حتیٰ کہ اپنی جان سے گئی۔ دولت و امارت کے نشے میں حسنات نے نویرہ جیسی محبت کرنے والی لڑکی کی قدر نہ کی۔ بدنصیب ہوتے ہیں ایسے لوگ جو محبت کو دولت کے پیمانے سے ناپتے ہیں۔ سچے جذبوں کو نہیں سمجھتے ہیں۔ تجدیدِ عہد بھی ایک اچھی کہانی تھی۔ حاضر دماغ میں عقلمندی سے کام لیا اور بہادری کا مظاہرہ کر کے کوئی اسلحہ نہ ہوتے ہوئے صرف ریزگاری کے ڈبے سے ایک ڈاکو کو زیر کر لیا۔ ہمت سے بڑے بڑے کام ہو جاتے ہیں۔ اسلحہ ہو مگر ہمت اور جرأت نہ ہو تو ایسا اسلحہ کسی کام کا نہیں ہوتا۔ ذہین ساس میں عورت نے دماغ سے کام لیتے ہوئے معما حل کر دیا۔ اس کے بعد انگارے کا مطالعہ کیا، وہ حسبِ معمول کامیابی سے جاری ہے اور قاری کو پڑھنے کے دوران دوسری طرف متوجہ نہیں ہونے دیتی۔ منظر امام کی دوسری دنیا نے بھی اچھا تاثر دیا۔ اثباتِ جرم، قبضہ بھی اچھی کہانی تھی۔ موڈی نے غلط فہمی کا شکار ہو کے ایک قتل کر دیا اور اپنے آپ کو پابندِ سلاسل کر دیا۔ ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کی آوارہ گردی بھی دلچسپی کا عنصر لیے کامیابی سے اپنا سفر جاری رکھے ہوئے ہے۔ قدرت کا انعام بھی بہتر کہانی تھی۔ فاش غلطی بھی اپنی جگہ ٹھیک تھی۔ شکار اور قزاقِ اجل آخری صفحات کی بہترین کہانیاں تھیں۔''

کراچی سے رضوان تنولی کی باتیں ''جاسوسی سے ملاقات کی شب فضا گنگنانے لگی رنگ برسنے لگے۔ گیسوؤں کی گھٹاؤں سے بے نیاز بلوری آنکھوں والی مسمات کے سرخ لب و رخسار دہکنے لگے۔ سرورق صنفِ کرخت لڑتے لگے۔ چیخی نکتہ چینی کا وزٹ کیا۔ مقدر کی سکندری کا تاج وارث علی کے سر جگمگایا مبارکاں۔ نفیس و شائستہ ندازِ بیان کے منفرد تبصرہ نگار احسان سحر کی آمد نے بزم جگ مگ کر دی۔ دوست باکمال رانا حبیب گلوں کی ناری سعدیہ بے چاری کی کوئی خبر لا دو کستوری لگا کے۔ یار دغم خوار و اپنے فیصل آباد کے بلے باز نہیں البتہ مراثی پورے پاکستان میں مشہور ہیں۔ مری کے کبیر پہاڑی، گاؤں دیہات میں کمہار نہیں بلکہ نائی حضرات شادی بیاہ کے موقع پر کھانا بناتے ہیں اور کمہار برتن بناتے ہیں (مٹی کے) پھول رنگ محبت کی چاشنی لیے پروین زبیر کی لطف آفریں تحریر جنونِ وفا عمدہ آغاز لے کے اختتام میں تشنگی چھوڑ گئی۔ تنویر ریاض کی تجدیدِ عہد عمدہ تاثر دے گئی۔ عکس فاطمہ کی ذہین ساس مناسب رہی۔ دل بے قرار کی دھڑکنیں زیر و زبر کرتی، انگارے میں الباکستانیوں کے اکلوتے ریسلر کی یادگار پھینٹی کے بعد شاہ زیب کمپنی کا وطن واپس ہونے کا چانس ہے۔ سجاولے ڈاکو کے غیاب میں غدار آقا جان ملوث ہوسکتا ہے، حریم رؤف کی چیں پٹاخ قربتیں رضوان ٹی سے بغلگیر ہو کر گمشدہ خزینے دریافت کر سکتی ہیں، ویلڈن مغلِ اعظم۔ منظر امام کی دوسری دنیا مختصر مگر پُراثر تحریر، تبت کے لاماؤں پر ایک طویل تحریر کی فرمائش کستوری لگا کے۔ ارشد بیگ کی مغربی تحریر فاش غلطی، مجرم چاہے کتنا ہی چالاک کیوں نہ بالآخر قانون سے ہارتا ضرور ہے۔ ڈاکٹر کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ دل کی آنکھوں سے پڑھنے کے قابل ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کی آوارہ گرد بے مثال لاجواب تحریر۔ جمال دستی کی تحریر قدرت کا انعام اچھی تحریر۔ مختار آزاد کی حرص اور خودغرضی کی عکاس قبضہ مناسب رہی۔ دونوں رنگ خوب سے خوب تر رہے۔ اس کے ساتھ اپنا جاسوسی مکمل ہوا۔''

نمرہ خان کی موہائیاں مانسہرہ سے پہلی آمد ''کٹھن انتظار کے بعد 30 جنوری کی سُریلی رسیلی شام جاسوسی کا دیدار نصیب ہوا۔ تخت طاؤس پر فائز وارث علی کا تبصرہ بہت اچھا تھا۔ مانسہرہ سے اے ایچ کاظمی کا خط دیکھ کر کاغذ قلم سنبھال کر انگلی کٹوا کر شہیدوں میں نام لکھوانے کا سوچ کر پہلا تبصرہ لکھنے کی کوشش کی۔ (خوش آمدید، خوش آمدید) قیصر اقبال، ہمایوں سعید، اعجاز احمد راحیل، ماہا ایمان، تصویر العین جیسے پرانے تبصرہ نگاروں کی کمی شدت سے محسوس ہوئی۔ محفل کی رونقیں آباد کرنے کے لیے جلدی حاضری یقینی بنائیں۔ اب آتے ہیں کہانیوں کی طرف۔ سب سے پہلے انگارے پڑھی۔ اتنے سسپنس کے بعد وہ سرکسی انڈین لڑکی کا نکلا۔ منحوس آقا جان پر پھٹکار نازل ہو۔ شاہ زیب اینڈ جاناں کو ڈھیر ساری مار پڑی۔ اب شاہ زیب اس کا بدلہ کس سے لے گا پھر لمبا انتظار کرنا ہوگا۔ دوسرے نمبر پر آوارہ گرد پڑھی۔ گبیل دادا نے شہزی کو بچالیا۔ ویسے شہزی کی اول خیرا اور شکیلہ سے ملاقات کے سین نے کافی جذباتی کیا۔ سرورق کا پہلا رنگ نہایت شاندار تھا۔ پڑھتے ہوئے ذرا بھی شک نہیں ہوا کہ وہ گھناؤنا کام مشعل اینڈ کمپنی کا ہوسکتا ہے۔ سرورق کا دوسرا رنگ بھی اچھا تھا۔ میں نے یہ معما پہلے ہی حل کر لیا تھا کہ شمسہ کا قتل کومل نے کروایا ہے۔ پروین زبیر کی کہانی جنونِ وفا بس ٹھیک ہی تھی مگر حسنات کو اس کے کیے کی سزا ضرور ملنی چاہیے تھی۔ مجموعی طور پر اس ماہ کا شمارہ شاندار تھا۔''

ڈی آئی خان سے سید عبادت کاظمی کی شوخی ''نئے سال میں پاکستان میں تبدیلی آئے نہ آئے جاسوسی میں آگئی ہے۔ پہلے جاسوسی 5 کو ملتا تھا اب اٹھائیس کو مل گیا۔ جاسوسی جلدی ملنے کی خوشی میں بارش میں ہم پھسلتے پھسلتے رہ گئے۔ ٹائٹل اس دفعہ منفرد سا تھا۔ حسینہ کی گہری سیاہ آنکھیں دل کا ایکسرے کرتی نظر آئیں۔ البتہ ہونٹ ضرورت سے زیادہ موٹے تھے۔ ویسے ذاکر انکل حسینہ کے ہونٹ اتنے بڑے کیوں بناتے ہیں۔ دوسری سائڈ پر غالباً قاسم انصاری اور ظہیر شیخ گتھم گتھا تھے کہ بھائی ہماری ٹیم زیادہ اچھی ہے۔ ہم نے سرورق کے پوسٹ مارٹم کے بعد

اشتہاروں سے نظریں چرا کر محفل میں قدم رکھا جہاں وارث علی تا کا لگائے کھڑے تھے۔ جاسوسی نشست کے وارث علی کے تبصرے میں طاہرہ گلزار کو جلد حاضر ہونے کی درخواست کی گئی ہے۔ باجی جلدی آجائیں، بچے آپ کو یاد کرتے رہتے ہیں یوں غائب نہ ہوا کریں۔ جانے پہچانے فراز حسن سومرو اپنی محفل سجاتے نظر آئے۔ مختصر مگر بہترین تبصرہ تھا۔ اے ایچ کاظمی تبصرہ شائع ہونے پر بچوں کی طرح خوش نظر آئے۔ شاہد امین کا تبصرہ نہ جانے کیوں اداس سا لگا۔ وطن سے دوری انسان کو بے قرار رکھتی ہے۔ طلعت مسعود آپ کی محبت کے مشکور ہیں۔ جاسوس 007 ارے یہ کون ہے اور آتے ہی مجھ پر حملہ۔ بھائی ساڈے تال پنگا ناٹ چنگا۔ جناب کا جلا کٹا تبصرہ سر کے اوپر سے گزر گیا۔ اعتزاز اینڈ زریاب دونوں ساتھ ساتھ چنگے نظر آتے ہو۔ ویسے ہمیں بھولنے کی عادت اچھی نہیں۔ اچھا تبصرہ کیا۔ عبدالجبار رومی کے تبصرے نے دل خوش کر دیا۔ احسان سحر اتنی تلخی زندگی میں نہیں ہونی چاہیے۔ رانا بشیر احمد ایاز کے تبصرے کو غور سے پڑھا کیونکہ محفل میں ان کا تبصرہ میری پسندیدہ لسٹ میں ہوتا ہے۔ ہمیشہ کی طرح پرفیکٹ تبصرہ تھا۔ مرحا گل دعاؤں کے لیے جزاک اللہ۔ فورٹ عباس سے عمر فاروق ارشد کی واپسی اچھی لگی۔ اسرار ساقی جیل سے خط لکھنا آپ کی جاسوسی سے محبت کی علامت ہے۔ خوب تجزیہ رہا۔ سلیم فاروقی کی موت کا سن کر افسوس ہوا۔ سب سے پہلے انگارے پڑھی۔ مغل صاحب نے کہانی کو یک دم پلٹا دیا، میں تو لرز کر رہ گیا۔ جاناں کی شاہ زیب سے محبت جنونیت اختیار کر گئی ہے۔ تاجور کا ذکر کم ہی ہوتا ہے۔ قسطینا کا دشمن اس کا اپنا ساتھی آقا جان نکلا اور ہم بھی کیا کیا اندازے لگاتے رہے۔ آوارہ گرد پر بھٹی صاحب نے اب توجہ دینی شروع کر دی ہے۔ شہزی واپس اپنے ساتھیوں سے مل گیا۔ کیبل دادا کی جوڑی زہرہ بیگم کے ساتھ فٹ رہے گی۔ کہانی اب ٹریک پر آنے لگی ہے۔ ابتدائی صفحات پر جنونِ وفا اس ماہ کی سب سے بہترین کہانی تھی۔ محبت انسان کو اتنا بے بس کیوں کر دیتی ہے۔ نویرہ کی حسنات سے محبت نے تو آنکھ نم کر دی۔ وہ سراب کے پیچھے بھاگتی رہی اور موت اس کا انجام ٹھہری۔ نویرہ کی موت نے تو رلا دیا۔ شبنم شفیق کی اکثر کہانیاں اچھی ہوتی ہیں۔ شکار اچھی لکھی گئی۔ لیکن کیا واقعی آج کے دور میں علینا، مشعل اور ڈیوڈ جیسے لوگ ہیں۔ اتنے بے رحم اور سفاک معصومیت کا ڈھونگ رچائے۔ اس کہانی نے تو رونگٹے کھڑے کر دیے۔ ایشل کو نیا ساتھی مل گیا۔ کہانی نے آخری وقت تک اپنی گرفت برقرار رکھی۔ مصنف کی یہی خوبی ہے کہ آخر تک پتا نہ چلنے دے کہ آخر راز ہے کیا۔ سلیم فاروقی قزاقِ اجل کے ساتھ خوب چھائے رہے۔ تجدیدِ عہد تنویر ریاض کی بہتر کہانی تھی۔ جیک کے کردار کی کچھ خاص سمجھ نہیں آئی۔ ایک طرف وہ برائن کو چھوڑ کر چلا گیا تھا پھر واپس کیوں آیا۔ ویسے ترجمہ شدہ کہانیاں مجھے کچھ خاص پسند نہیں۔ تمکین رضا اور مختار آزاد چھوٹی کہانیوں میں اچھے رہے۔''

ہری پور ہزارہ سے معراج محبوب عباسی کی واپسی ''جاسوسی ڈائجسٹ 30 جنوری کو لیا۔ ٹائٹل منفرد تھا۔ ریوالور سے فائر کے بعد بھاگنے کے بجائے ایتھلیٹ آپس میں ہی لڑ پڑے جس پر پیاری لڑکی کا منہ حیرت کے باعث کھلا ہی رہ گیا۔ تاج سرداری کا وارث، وارث علی سندیلیا نوالی سے بنے۔ فراز سومرو، مظہر سلیم کے طفیل ملنے والی ہمت کا تسلسل ٹوٹنے نہ پائے۔ آپ کی کاوش بہترین تھی۔ اے ایچ کاظمی آپ کی خوشی پر آپ کو مبارک باد۔ کہانیوں میں اس بار انگارے سے آغاز کیا تو اس بار ہر سطر میں ایکشن اینڈ تھرل، آقا جان کی کمینگی اب کھل کر سامنے آگئی ہے۔ شاہی کی حالت بھی ابتر ہے جبکہ دوسری جانب عزت مآب ریان فردوس اینڈ فیملی بھی موت کے دہانے پر کھڑی ہے۔ اب اگلی قسط تخت یا تختہ والی ہے شاعر کی اجازت سے۔ حاضر دماغ میں بیٹے نے مشکل وقت میں باپ کی نصیحت کو پلے سے باندھ کر رکھا اور اعصاب کو قابو میں رکھتے ہوئے اہم کارنامہ سرانجام دیا۔ تیسری اور آخری کہانی جو اس شمارے میں پڑھ پایا وہ ذہین ساس ہے۔ ساس نے بھی داماد کی مشکل حل کر دی اور ایک ایسا کیس جسے وہ مشکل سمجھ رہا تھا چٹکی بجاتے حل کر دیا شاعر کی اجازت سے۔ بے پناہ مصروفیات کے باوجود بھی رضوان سلطان بھائی کی خواہش پر تقریباً نصف سال بعد اس مختصر اور نامکمل تبصرے کے ساتھ حاضر ہو رہا ہوں۔''

رانا بشیر احمد ایاز کی احسان پور ضلع رحیم یار خان سے دھواں دھار بیٹنگ ''فروری کا شمارہ 29 تاریخ کو ہمارے ہاتھوں میں طویل عرصہ انتظار کے بعد یوں آیا جیسے مخالف ٹیم کے فیلڈر کے ہاتھوں میں شاہد آفریدی کا کیچ۔ اداریے میں مدیرِ اعلیٰ رمیز راجا کی طرح خوب صورت انداز میں امریکا کی صورتِ حال پر کمنٹری کر رہے تھے۔ اپنی پلیئنگ الیون کا جائزہ لیا جہاں اس دفعہ وارث علی بھائی اوپننگ کر رہے تھے۔ چوتھے نمبر پر شاہد امین بھائی نے پچاس رنز کی اننگ کھیلی۔ تبصرہ پسند کرنے کا شکریہ سائیں۔ چنیوٹ سے لیلیٰ کوثر جلد ہی رن آؤٹ ہو گئیں۔ عبدالجبار رومی انصاری کی بیٹنگ نے دل موہ لیا۔ بہت اچھے جناب، گیارہویں نمبر پر اسرار بشیر ساقی جدوجہد کرتے نظر آئے مگر کافی متاثر کر گئے جناب، باقی پلیئرز میں باجی طاہرہ گلزار، سجاد احمد ساحر، ادریس احمد خان، عبادت کاظمی، محمد خواجہ صاحب اور محمد صفدر معاویہ بھائی ان فٹ ہو کر ٹیم سے باہر نظر آئے۔ شمارے کا آغاز حسبِ دستور انگارے سے کیا جہاں پر عیار اور ناعاقبت اندیش آقا جان نے ایسٹرن کنگ کا مار مار کر وہی حال کیا جو ڈیوڈ وارنر نے پاکستانی ٹیم کا کیا ہے۔ قسطینا کی محبت کچھ زیادہ بڑھ گئی ہے۔ انیق اور سیفی بھی سنگلز ڈبلز اچھے لے رہے ہیں۔ کہانی میں تاجور کی جھلک آفریدی کی پرفارمنس جیسی ہے۔ مکار آقا جان کی غداری کھل کر سامنے آگئی ہے اور امید ہے شاہ زیب جاوید میانداد کی طرح مردِ بحران بن کر شکست کو شکست فاش دے گا۔ منظر امام متاثر نہ کر سکے۔ ان کی دوسری اننگز بس مناسب تھی۔ قومی ٹیم کے کپتان اظہر علی کی کارکردگی کی طرح۔ ڈاکٹر بھٹی کی آوارہ گرد کو یوں ڈک کیا جیسے شعیب اختر کا برق رفتار باؤنسر مخالف کھلاڑی بمشکل اپنا سر بچانے کے لیے کرتے ہیں۔ ابتدائی نمبر پر پروین زبیر صاحبہ کافی طویل عرصے بعد آئیں اور کرکٹ کے موضوع پر لکھا۔ حسنات خان خاندانی طور پر دولت مند گھرانے کا چشم و چراغ ہونے کے باوجود فکسنگ جیسی لعنت کا شکار ہو گیا۔ نویرہ، ارسل کی محبت کو ٹھکرا کر سراب کے پیچھے بھاگتی رہی اور آخر کار اپنی زندگی کا اپنے ہاتھوں سے خاتمہ کر لیا۔ ارشد بیگ کی فاش غلطی اچھی لگی۔ عکس فاطمہ نے حاضر دماغی سے کام لے کر نہ صرف بینک ڈکیتی کو ناکام بنایا بلکہ ڈاکو کو بھی

رن آؤٹ کرادیا ڈائریکٹ تھرو پر۔ سلیم انور صاحب کی ذہین ساس نے داماد کی جگہ کیس کو اس کے انجام تک پہنچایا، داماد سے زیادہ تو ساس قابل سراغ رساں ثابت ہوئی۔ تمکین رضا کا اثباتِ جرم معقول تھا اور مختار آزاد کا قبضہ مناسب لگا۔ پہلے رنگ میں شبنم شفیق صاحبہ نظر آئیں۔ آسٹریلیا کے خوب صورت شہروں سڈنی وغیرہ کے گرد گھومتی کہانی کافی دلچسپ رہی۔ دوسرے رنگ میں سلیم فاروقی صاحب کے ہیرو نے حسبِ روایت پندرہ بیس قتل کر کے سارے موڈ کا مزہ یوں غارت کیا جیسے ٹی ٹوئنٹی میں مصباح الحق پورا اوور میڈن کھیل کر کرتے ہیں۔ باقی ٹائٹل پر تبصرہ ادھار رہا۔"

مومنہ کشف کی بہاولپور سے شفق "ٹائٹل گرل بہت سندر تھی پر اس کا ماتھا کیوں اتنا بڑا تھا۔ لگتا ہے پی ایس ایل کا میچ کرانا ہوگا..... معصوم لڑکی لڑتے جھگڑتے انکلز سے بچ کر چینی کھانے پہنچ گئی۔ سلیم فاروقی صاحب کی ڈیتھ کا بہت افسوس ہوا، اللہ اپنے پیارے حبیب کے صدقے ان کے درجات بلند کرے، (آمین) وارث علی بھائی تھینک یو، کاش میرا بھائی مجھے وقت پر جاسوسی لا دے تو میں ہر ماہ دھمال ڈالنے آجاؤں۔ اے ایچ کاظمی انکل کی بات سے میں بھی ایگری کرتی ہوں کہ احمد اقبال صاحب کو بہت مس کیا۔ ان کی سردی جلدی بھگائیں۔ شاہد انکل اور سعدیہ آنٹی نے تو بڑے پیارے تبصرے لکھے تھے۔ انگارے میں تو اس بار آگ لگی ہوئی تھی۔ اس ظالم آقا کا لکھنا رہے میرے شاہزیب کی تو جان ہی نکال دی ہے۔ اس بار تو جاناں بھی بری نہیں لگی۔ اف اب اگلی قسط میں کیا ہوگا؟ آوارہ گرد بھی بڑے مزے کی تھی۔ اپنے ساتھیوں کے ساتھ مل کر شہزی بابا پتا نہیں کیا کرے گا؟ مجھے قسط وار کہانیوں کے علاوہ جاسوسی کی انگلش کہانیاں بہت اچھی لگتی ہیں۔ قبضہ سب سے اچھی لگی، مرنے والی ہو کر بھی بے چاری کو مفت میں قتل کر دیا۔ قدرت کا انعام اور فاش غلطی نے بھی دماغ کی دہی بنادی جس کو بڑے مزے سے چٹ کر گئی۔ ذہین ساس نے تو چٹکی بجاتے میں کیس حل کر دیا۔ داماد کچھ زیادہ ہی بے وقوف تھا شاید۔ تجدیدِ عہد اور حاضر دماغ بھی مزے کی کہانیاں تھیں۔ پروین زبیر کی جنونِ وفا بھی بہت اچھی کہانی تھی پر اتنی اچھی نہیں لگی جتنی ان کی پچھلی کہانیاں ہوتی تھیں، نویرہ بہت خود غرض تھی کہ اپنے ماں باپ کو بھی دھوکا دیا۔ اس لیے اس کے ساتھ ایسا ہوا۔ شکار بہت اچھی لگی کیونکہ مجھے ایسی انگلش فلمیں بڑی اچھی لگتی ہیں۔ قاتل کو ڈھونڈتے رہو اور جس پر شک ہو اس کی جگہ کوئی اور قاتل نکل آئے۔ قزاقِ اجل شروع سے آخر تک اتنی تیز تھی کہ میں پڑھتی ہی چلی گئی۔"

اسلام آباد سے سیدہ ایمانے زارا شاہ کی عدم بیزاری "پہلی دفعہ جاسوسی ڈائجسٹ پہ تبصرہ کرنے کے لیے قلم پکڑا ہے۔ سرورق پہ نظر ڈالی تو ایسا لگا جیسے محترمہ مجھے بلا رہی ہوں، آجاؤ شاباش تمہارا ہی انتظار ہے۔ سائڈ پر موجود دو گتھم گتھا افراد کو ہی دیکھ لو..... اوپر سے محترمہ کے ماتھے کا پلاٹ اس قدر وسیع ہے کہ پورا گھر تعمیر ہوسکتا ہے۔ ہمیشہ سے ڈائجسٹ ترتیب وار پڑھنے کی عادت ہے تو سب سے پہلے پروین زبیر کی جنونِ وفا پڑھی۔ کہانی کے دونوں حصے کہیں سے بھی آپس میں صحیح سے جوڑے نہیں گئے۔ عجیب تشنگی سی رہ گئی۔ نویرہ کے قتل کے بعد کہانی کو لپیٹ دیا گیا۔ عکس فاطمہ کی حاضر دماغ مختصر مگر اچھی کاوش تھی۔ بچے کی چابکدستی اور حاضر دماغی نے واردات ناکام بنادی۔ ذہین ساس واہ ساس ہو تو ایسی..... مگر بات یہ ہے کہ موت کی کشمکش میں انسان اتنا سوچ کے کوڈ ورڈز میں فون نمبر کیسے بتا سکتا؟ (واقعی سوچنے کی بات ہے) یہ پڑھ کے تو آئن اسٹائن بھی قبر پہ لات مار کے باہر آجائے۔ قبضہ میں موڈی بے چاری کے پاس کوئی آپشن نہیں تھا۔ جیسمین کی باتیں بھی تو مشکوک در مشکوک تھیں کوئی عقلمند بھی ہوتا تو یہی سمجھتا جو موڈی نے سمجھا اور کیا! لیکن ضمیر کا پچھتاوا جان ہی لے گیا سیڈ۔ فاش غلطی باقی ترجمہ شدہ کہانیوں سے اچھی لگی! شمارے کی سب سے بہترین کہانی شکار لگی، واؤ زبردست..... مشعل کیا ڈاکٹر تھی، یہ لوگ تو انسانیت کے نام پر دھبا تھے۔ کہانی کا کہیں بھی ٹیمپو خراب نہیں ہوا۔ میرے تو خواب وخیال میں بھی نہیں تھا یہ منحنی سا سافٹ ویئر انجینئر آدم خور نکلے گا..... ذہانت حد سے بڑھ جائے تو آگے موت ہی رہ جاتی ہے۔ قزاقِ اجل آغاز سے ہی معلوم ہوگیا تھا کومل ہی قاتلہ ہوگی۔ ساری کہانی میں وہ دُم چھلا بنی رہی فرحان کی۔ جرنلسٹ جو ٹھہری ہر خبر پر نظر تا کہ کوئی سرا ہی ہاتھ نہ آئے۔"

ملتان سے محمد عامر سلیم کا نرم خو تبصرہ "حسبِ سابق، جاسوسی نے چند دن انتظار کرایا اور بالآخر چار فروری کے بھیگتے دن ہاتھوں میں آیا۔ نم نم سا ڈائجسٹ یکدم خاصا پرکشش لگا۔ سرورق پر ستائشی نگاہ ڈالی اور ماہ جبیں کی فراخ پیشانی پر حیران ہوتے ہوئے رسالہ کھولا۔ بچپن کی معصوم عادت نے سب سے پہلے رسالے کی کترنیں چنوائیں۔ اولین کہانی جنونِ وفا خاصی دلچسپ تھی۔ اس کے ہنگاموں کے بیچ جابجا طاری نرم و نازک جذبات کی گہری اثر خیزیوں نے کہانی کو کافی دلکش بنادیا۔ اپنے من پسند موضوع پر دلنشین انداز میں شروع ہوتی کہانی تجدیدِ عہد پُرتاثیر تھی۔ ایک سپاہی کے جذبات عام ہوتے ہوئے بھی خاص سے لگتے ہیں۔ ہمتِ مرداں اور حاضر دماغی کا سبق دیتی حاضر دماغ بہترین ننھی کہانی تھی۔ ایک دلچسپ پُرمغز کیس کے اندر ذہین ساس کی ذہانت اور معاملہ فہمی نے لبوں پر مسکان بکھیر دی۔ منظر امام صاحب کی کہانی پر اس بار بجائے بعد کے، پہلے ہی چونک گئے۔ دوسری دنیا کا موضوع ہی کچھ ایسا تھا۔ پنڈت کی سفاک خود غرضی نے دل پیچ ڈالا۔ اثباتِ جرم میں جرم وسراغ رسانی کے نئے رنگ نظر آئے۔ جانے یہ اکثر مجرم بہترین اداکار بھی کیوں کر ہوتے ہیں۔ مختار آزاد کی قبضہ سسپنس کے ہمراہ مخصوص جذباتی ٹچ بھی لیے ہوئے ایک عمدہ کہانی تھی۔ بوڑھی موڈی کی غلط فہمی اور حماقت کا شروع ہی میں اندازہ ہوجانے کے باوجود کہانی کی سنسنی آخری دم تک قائم رہی۔ سرورق کے دونوں رنگ بھی خاصے ہنگامہ آرا اور متاثر کن رہے۔ باقی شمارہ بھی دلچسپی سے پڑھا گیا۔"

ماہ تاب سمیع رانا کی ملتان سے تابانیاں "6 فروری کی سہانی سی صبح کو جاسوسی کو ہم نے شرف ملاقات بخشا۔ سرورق حسینہ کچھ دیکھی دیکھی سی لگ رہی تھیں ابھی ذہن پر زور ڈال ہی رہی تھی کہ کہاں دیکھا اچانک ہی آئینے پر نظر پڑ گئی۔ جی جی..... آپ صحیح سمجھے۔ صنفِ کرخت آپس میں

برسرِ پیکار...... اور ساتھ ہی ہتھیار۔ لاجواب سرورق تیار کیا ذاکر انکل نے۔ خوشبو سے مہکتی اپنی محفل میں پہنچے۔ انکل جی کا ابتدائیہ کوزے میں دریا بلکہ سمندر کو بند کر دیا تھا۔ بلاشبہ یہ انکل جی کا ہی کمال ہے۔ وارث علی ابتدائی تبصرہ کر رہے تھے، مبارک ہو۔ فراز سومرو آپ کو بھی مبارک۔ تھوڑا آگے جا کر ایک جھٹکا لگا۔ وہ بھی خوشی والا...... ارے...... ادھر تو بہت سارے جانے پہچانے نام۔ اے ایچ کاظمی۔ شاہد امین، سعدیہ قادری، لیلیٰ کوثر لاشاری، شفقت محمود، احسان سحر، وصلی برادرز اور رومی انصاری، گڈ...... اور باقی سینئر تبصرہ نگاروں سے پُرزور اپیل کی جاتی ہے کہ وہ بھی واپس لوٹ آئیں۔ کہانیوں کی ابتدا کی آوارہ گرد سے۔ سسپنس، ایکشن اور تھرل سے بھرپور کہانی۔ اگلی قسط کا انتظار ہے کہ کیبل دادا، شیزی، اول خیر اور شکیلہ کا ملنا کیا رنگ دکھاتا ہے۔ اور اللہ پوچھے بھٹی صاحب، اینڈ میں وہی سسپنس۔ انگارے۔ قسطنطنیہ، سوری قسطینا کی قربت کی بڑی بھاری قیمت چکا رہا ہے شاہ زیب۔ قسط زبردست رہی۔ ابتدائی صفحات جنونِ وفا ایک پرستار کی کہانی جس نے اپنے ہیرو پر سب لٹا دیا حتیٰ کہ جان بھی۔ جنون کوئی بھی ہو نقصان ہی پہنچاتا ہے۔ دوسری دنیا منظر امام کی مختصر مگر پُراثر تحریر۔ اثباتِ جرم۔ کافی ٹف ٹائم دیا اس کہانی نے آخر تک اندازہ نہیں ہو پایا کہ کیا چل رہا ہے۔ قبضہ انسانی ذہن کی فتنہ سازی پر مبنی سبق آموز تحریر۔ فاش غلطی مجرم کی فاش غلطی نے بھانڈا پھوڑ دیا۔ کترنوں میں بھی خاطر خواہ اضافہ ہوا ہے۔ اسکیچز بھی ٹھیک رہے۔"

دبئی سے طلعت مسعود کی آرزو "فروری کے شمارے کا انتظار ہمیں پہلے ہی معمول سے زیادہ تھا کیونکہ پہلی دفعہ تبصرہ بھیجا تھا اور پھر ڈائجسٹ کے ہم...... تک پہنچنے سے پہلے ہی کچھ دوستوں کے طفیل اس بات کا پتا چل گیا کہ ہمارا تبصرہ شائع ہو گیا ہے۔ رسالہ ملتے ہی چینی نکتہ چینی کی طرف دوڑ لگائی حالانکہ سرورق کی بغیر بالوں والی آنٹی نے ترچھی نظر سے ہماری طرف دیکھا بھی لیکن اس کو چھوڑ کر ہم پھر آگے بڑھے ہی تھے کی فہرست پر نظر پڑی جو ایک نئے انداز کے ساتھ سجی ہوئی اچھی لگی۔ چینی نکتہ چینی میں انکل موجودہ عالمی حالات پر تشویش کا اظہار کرتے نظر آئے لیکن دنیا کے سب سے طاقتور صدر نے منتخب ہونے کے بعد اپنے پہلے ہی اقدامات سے پوری دنیا کو تشویش میں ڈال دیا ہے۔ آگے آگے دیکھتے ہیں کیا ہوتا ہے۔ خطوط میں اپنا خط دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔ اس کے بعد دوسرے خطوط پر نظر ڈالی تو پہلی نشست پر وارث علی صاحب بھرپور تبصرے کے ساتھ موجود تھے، تبصرہ اچھا لگا۔ سعدیہ قادری، شاہد امین وصلی برادرز، شفقت محمود کے تبصرے عمدہ رہے کچھ دوست ہماری طرح پہلی دفعہ شرکت کر رہے ہیں، ان سب کو خوش آمدید۔ کہانیوں میں سب سے پہلے انگارے سے آغاز کیا جس نے پوری طرح اپنے سحر میں جکڑ لیا ہے۔ یہ قسط انتہائی سنسنی خیز رہی۔ آوارہ گرد میں بھی تیزی آتی جا رہی ہے۔ جنونِ وفا از پروین زبیر ابتدائی صفحات پر پوری آب و تاب کے ساتھ موجود تھی۔ نویرہ کا جنون اس کے لیے اک سراب ہی ثابت ہوا۔ کہانی نہایت عمدہ رہی لیکن نویرہ کے انجام اور ارسل کی حالت پر دکھ ہوا۔ پہلا رنگ شکار بہت سنسنی اور تجسس سے بھرپور رہا آخر تک قاتل کا اندازہ نہیں ہوا اور قاتلوں کے بے نقاب ہونے پر کافی حیرت ہوئی کہ اتنے معزز پیشوں سے وابستہ لوگ اتنے گھناؤنے کام کر رہے ہیں۔ سلیم فاروقی صاحب مرحوم کی قزاقِ اجل کافی تیز رفتار رہی فرحان خوش قسمت تھا کہ اس کا تعلق میڈیا سے ہونے کی وجہ سے اس کی رسائی ہر جگہ تھی۔ اور وہ بیوی کے قاتلوں کو ڈھونڈنے میں کامیاب رہا ورنہ عام آدمی تو خود ہی چکر میں پھنس جاتا ہے۔ مختصر کہانیوں میں دوسری دنیا شاید ہمیں ہی سبق دیتی نظر آئی کہ قدرت کے کاموں میں دخل اندازی نہیں کرنی چاہیے۔ قبضہ میں موڈی نے جلد بازی میں... جیسمین کی جان لے لی لیکن آخر میں قبضہ اس کا بھی ختم ہو گیا۔ سلیم انور کی ذہین سا س سے ہمیں یہی خیال آیا کہ ہمارے کچھ تفتیشی افسروں کو بھی ایسی ساسیں مل جائیں تو شاید...... اس کے علاوہ قدرت کا انتقام اچھی لگی۔ آخر میں اِک گزارش ہے آپ سے کہ احمد اقبال صاحب سے کہہ کر بزدل میاں سے ہی ملاقات کروا دیں۔ اسی کے ساتھ اجازت۔"

کراچی سے سعدیہ قادری کی خوش دلی "جنوری کی ٹھنڈی ٹھنڈی شام میں جاسوسی ملا، اس مرتبہ بھی اپنا تبصرہ شامل دیکھ کر دل خوشی سے جھوم اٹھا، حسبِ معمول اداریے سے ابتدا کی جہاں ٹرمپ کو آڑے ہاتھوں لیا جا رہا تھا۔ تصور ہی تصور میں ٹرمپ کے لتے لیتے ہوئے قلمی اکھاڑے کی جانب رخ کیا جن احباب نے خوش آمدید کہا ان کا شکریہ۔ عمر فاروق آپ کے جیجا جی کو اچھی طرح پتا ہے کہ ان کی گھر واپسی پہ دروازہ میں نے کھولنا ہے لہٰذا وہ ڈائجسٹ کے بغیر آنے کا نہیں سوچ سکتے۔ سلیم فاروقی کی رحلت کا بہت افسوس ہوا۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کو غریقِ رحمت کرے، آمین۔ کراچی کی غیر متوقع سردی میں گرما گرم انگارے کی فل ایکشن قسط نے بہت مزہ دیا، مغل انکل تک میری آواز پہنچ گئی اور حشمت پہلوان کا پھڑکتا ہوا شعر حاضر ہو گیا، منظر نگاری ہمیشہ کی طرح کمال رہی۔ پروین زبیر جنونِ وفا لے کر آئیں لیکن کچھ تشنگی سی رہ گئی۔ ایسا لگا جیسے بہت عجلت میں لکھا گیا ہو۔ مختصر کہانیوں میں عکس فاطمہ کی حاضر دماغ سب سے اچھی رہی، کاش میں بھی اتنی حاضر دماغ ہوتی۔ ذہین ساس میں ساس نے خود کو دورِ جدید کے تقاضوں سے ہم آہنگ کیا اور بہ آسانی کیس حل کر دیا۔ منظر امام اس ماہ بھی زبردست تحریر لے کر آئے۔ ماورائی تحاریر مجھے بہت پسند ہیں۔ اثباتِ جرم، اف توبہ! مارگریٹا، فریڈا، انطونیا نے سر میں درد کر دیا۔ ترجمہ شدہ کہانیاں کچھ خاص پسند نہیں ہیں۔ قبضہ میں مختار آزاد نے ثابت کر دیا کہ بلاوجہ کا شک و شبہ بربادی کے سوا کچھ نہیں لاتا۔ جمال دستی کی کہانی میں ہملٹن کو ضمیر کے تازیانے سے نجات کا انعام ملا۔ فاش غلطی بھی خاص پسند نہیں آئی۔ اس ناپسندیدگی کا ازالہ شکار نے کر دیا، جاسوسی کے مزاج کے عین مطابق تھوڑا تھرل، تھوڑا سسپنس۔ آخری صفحات پہ سلیم فاروقی کی قزاقِ اجل بھی ان کی دیگر تحاریر کی طرح فل آف ایکشن تھی۔"

ان قارئین کے اسمائے گرامی جن کے محبت نامے شاملِ اشاعت نہ ہو سکے۔

مریم مقدس، جنگ شاہی۔ تانیہ مہر، لاہور۔ لیلیٰ کوثر لاشاری، چنیوٹ۔ اعتزاز اینڈ زریاب وصلی، تاندلیانوالہ۔ محمد قدرت اللہ نیازی، حکیم ٹاؤن خانیوال۔ محمد اقبال، کراچی۔ عمران ملک، ٹنڈو آدم۔ ثاقب عزیز، کوٹری۔

راہ گزیدہ

اقبال کاظمی

بعض گرہیں ایسی ہوتی ہیں جنہیں آدمی ہاتھوں سے نہیں کھول سکتا کیونکہ وہ سختی سے لگی ہوتی ہیں... ایسی سخت گرہ کو کھولنے کے لیے سخت چیز کا استعمال ضروری ہو جاتا ہے... ایک ایسے ہی دلیر... مظلوم اور بے سہارا نوجوان کی سرگزشت... قدرت نے اس کی زندگی کو عجیب و غریب نشیب و فراز سے ہمکنار کر دیا تھا... بدقسمتی ہر دفعہ اس کے آڑے آتی رہی... اور راستے ناہموار اور دشوار تر ہوتے چلے گئے... کسی مقام پر کسی خوشی نے اس کا خیرمقدم نہیں کیا... ہر راہ پر پاٹ دار... خوں خوار اور سنگ دل درندے سامنے آتے رہے... اور اسے ایسے راستے پر چلنے کے لیے مجبور کرتے رہے... جہاں ہر قدم پر نفرتیں اور کشت و خون کے سوا کچھ نہ تھا...

وقت اور حالات کے بھنور میں جنم لینے والی
ایک طویل داستاں کے حیرت انگیز موڑ......

موت کے فرشتے اُس کے تعاقب میں تھے اور وہ اپنے آپ کو ان کی گرفت سے بچانے کے لیے جان توڑ کر دوڑ رہا تھا۔ رات کی تاریکی اور سناٹا اس کے چاروں طرف بکھرا ہوا تھا۔

وہ دوڑتے دوڑتے رک گیا۔ اس کا سانس بری طرح پھولا ہوا تھا۔ اس سے کھڑے رہنا مشکل ہو رہا تھا۔ ٹانگیں شل ہو چکی تھیں اور ان میں اس کے جسم کا بوجھ اٹھانے کی ہمت نہیں رہی تھی۔ وہ بری طرح ہانپ رہا تھا۔ پسلیوں میں درد ہونے لگا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ نیچے جھکتا چلا گیا۔

کئی منٹ گزر گئے تب کہیں اسے اپنی سانس بحال ہوتی محسوس ہوئی۔ اپنی کیفیت پر قابو پانے کے بعد وہ آہستہ آہستہ اٹھ کر پ ردں

طرف دیکھنے لگا۔ فضا میں ایک جانی پہچانی سی مہک رچی ہوئی تھی۔ دھان کی مہک۔ اس کے چاروں طرف دور دور تک دھان کے کھیت تھے لیکن پودے ابھی اتنے بڑے نہیں ہوئے تھے کہ ان میں چھپا جا سکتا۔

وہ متوحش نگاہوں سے چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔ دھان کے کھیتوں کے کنارے کہیں کہیں اونچے درخت اس طرح جھومتے نظر آرہے تھے جیسے بدروحیں رقص کررہی ہوں۔

بائیں طرف بہت دور چند ٹمٹماتی ہوئی روشنیاں نظر آرہی تھیں۔ وہ کوئی چھوٹی سی بستی تھی لیکن وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ رات کے آخری پہر کسی بستی کا رخ کرنا خطرے سے خالی نہیں ہوگا۔

پچھلی رات کا چاند اونچے درختوں کی اوٹ سے جھانکنے لگا۔ مدھم سی، میلی سی چاندنی بکھرنے لگی۔ اس کے ساتھ ہی اس کی روح فنا ہونے لگی۔ رات کی گہری تاریکی میں تو وہ اب تک اپنے دشمنوں سے بچا رہا تھا لیکن یہ میلی سی چاندنی اس کے لیے موت کا پیغام بھی بن سکتی تھی۔ وہ بدحواس ہو کر ایک بار پھر اپنے چاروں طرف دیکھنے لگا۔ اسے اندازہ نہیں تھا کہ اس کے دشمن اس سے کتنا دور ہیں۔ اس کے تعاقب میں تھے بھی یا رات کے اندھیرے میں کسی اور طرف نکل گئے تھے۔

دفعتاً خاموش فضا میں فائر کی آواز گونجی اور وہ بری طرح اچھل پڑا۔ ایک لمحے کو تو اسے یوں محسوس ہوا جیسے سینے میں اس کا سانس رک گیا ہو۔ اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ بہت دور اسے دو سائے کھیتوں میں دوڑتے نظر آئے۔ وہ یقیناً موت کے وہی فرشتے تھے جو تقریباً دو گھنٹوں سے اس کے تعاقب میں تھے۔

اس نے ایک بار پھر چاروں طرف دیکھا اور پھر دوڑ لگا دی۔ اندھا دھند دوڑتے ہوئے نہر میں جا گرا۔ اس نے سنبھلنے میں چند لمحوں سے زیادہ نہیں لگائے۔ وہ تیرتا ہوا نہر کے دوسرے کنارے پر پہنچ گیا۔ اسی لمحے خاموش فضا ایک بار پھر فائرنگ کی آواز سے گونج اٹھی۔ اس مرتبہ یہ آواز زیادہ دور کی نہیں تھی۔ اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا لیکن نہر زمین کی سطح سے خاصی نیچی تھی۔ وہ دوسرے کنارے سے اوپر نہیں دیکھ سکا لیکن اسے یہ اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی تھی کہ اس کا تعاقب کرنے والے قریب پہنچ گئے تھے۔ وہ دائیں بائیں دیکھنے لگا۔ دائیں طرف چند قدم پر نہر کے کنارے پر ایک کٹاؤ سا تھا۔ اس کٹاؤ میں بھی پانی بھرا ہوا تھا اور کناروں پر گھنی جھاڑیاں تھیں۔ وہ بڑی احتیاط سے سرکتا ہوا اس کٹاؤ میں داخل ہو گیا اور مڑ کر دوسرے کنارے کی طرف دیکھنے لگا۔ چند سیکنڈ بعد ہی دوسرے کنارے پر اسے دو انسانی سائے نظر آگئے۔ وہ دوڑتے ہوئے آئے تھے اور نہر کے کنارے پر آ کر رک گئے تھے۔ مدھم سی چاندنی میں ان دونوں کے ہاتھوں میں رائفلیں صاف نظر آرہی تھیں۔

''کہاں غائب ہو گیا۔ آس پاس کہیں بھی نظر نہیں آرہا۔'' ایک آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔

''میں نے اسی جگہ اسے نہر میں چھلانگ لگاتے ہوئے دیکھا تھا۔ ممکن ہے وہ پانی کے بہاؤ کے ساتھ نکلنے کی کوشش کررہا ہو۔'' دوسری آواز سنائی دی۔

''تم پانی کے بہاؤ کی طرف آگے تک جا کر دیکھو۔ میں یہیں کھڑا ہوں۔'' پہلی آواز نے کہا۔

دوسرا شخص نہر کے کنارے کے ساتھ ساتھ بہاؤ کی طرف دوڑنے لگا۔ رائفل اس کے ہاتھ میں تھی۔ وہ تقریباً پچاس گز تک دوڑتا ہوا چلا گیا پھر واپس لوٹ آیا۔

''میں کافی دور تک دیکھ آیا ہوں۔ وہ اس طرف نہیں گیا۔'' اس نے اپنے ساتھی کو بتایا۔

''تو پھر اس کا مطلب ہے کہ وہ دوسرے کنارے پر جھاڑیوں میں کہیں چھپا ہوا ہوگا۔ دوسرے کنارے کی جھاڑیوں میں ایک برسٹ مارو...... پتا چل جائے گا۔'' پہلے آدمی نے کہا۔

اسی لمحے فضا فائرنگ کی خوفناک آواز سے گونج اٹھی۔ تڑتڑاتی ہوئی کئی گولیاں نہر کے کٹاؤ کے کناروں پر اُگی جھاڑیوں میں بھی لگی تھیں۔ کٹاؤ میں جھاڑیوں کے نیچے پانی میں چھپا ہوا وہ شخص کانپ اٹھا۔ اگر وہ پانی کے بجائے جھاڑیوں میں چھپا ہوتا تو اس کا جسم چھلنی ہو چکا ہوتا۔

''ہمیں نہر کے دوسری طرف جانا ہی پڑے گا۔ اگر وہ زندہ بچ نکلنے میں کامیاب ہو گیا تو یہ ہماری زندگی کی بھی آخری رات ہوگی۔ چلو...... اترو نہر میں۔'' پہلے آدمی نے کہا۔

دوسرا آدمی جھجکتا ہوا نہر میں اتر گیا۔ پانی اس کے سینے تک تھا۔ بہاؤ بھی زیادہ تیز نہیں تھا۔ اس نے دونوں ہاتھ اوپر اٹھا رکھے تھے۔ ایک ہاتھ میں رائفل تھی۔ وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا دوسرے کنارے پر آگیا۔ اس کے چند سیکنڈ بعد اس کا دوسرا ساتھی بھی پہنچ گیا۔ وہ دونوں کچھ دیر

تک وہاں کھڑے رہے پھر ایک پگڈنڈی پر چلنے لگے۔ اگر وہ نہر کے اس کٹاؤ میں جھانک لیتے یا ایک برسٹ مار لیتے تو ان کا مشن یہیں پر مکمل ہو جاتا اور انہیں آگے جانے کی زحمت نہ کرنا پڑتی۔

نہر کے کٹاؤ میں چھپے ہوئے اس شخص نے دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا۔ موت اس کے بہت قریب سے گزر گئی تھی۔ وہ کچھ دیر تک کھاڑی میں دبکا رہا اور جب اسے یقین ہو گیا کہ موت کے وہ فرشتے کافی دور نکل چکے ہوں گے تو وہ بھی پانی سے نکل آیا اور متجسس نگاہوں سے چاروں طرف دیکھنے لگا۔ دور دور تک ان دونوں کا نام و نشان تک نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ یقیناً بہت دور نکل گئے تھے۔

اس کے کپڑوں سے پانی نچڑ رہا تھا۔ وہ کچھ دیر تک وہاں کھڑا رہا۔ پھر کچھ سوچ کر کھیتوں میں داخل ہو گیا۔ کچھ دور چلنے کے بعد وہ سڑک تک آ گیا۔

پختہ سڑک پر پہنچ کر اس نے راوی کے پل کی طرف جانے کا فیصلہ کیا اور سڑک سے ذرا ہٹ کر تیز تیز قدموں سے چلنے لگا۔ وہ سڑک کے کنارے چھوٹی چھوٹی بستیوں سے دور ہی رہا تھا۔

راوی کے پل کی روشنیاں نظر آ رہی تھیں۔ رات کا آخری پہر ہونے کے باوجود پل پر ٹریفک کا ہجوم تھا۔ جبکہ اس سے پہلے ریلوے لائن کا پل تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔

وہ ریلوے لائن والے پل سے تقریباً نصف میل دور دریا کے کنارے کی طرف بڑھ رہا تھا کہ ایک غراتی ہوئی آواز سن کر رک گیا۔ اس کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا تھا۔

''رک جاؤ...... اپنی جگہ سے حرکت مت کرنا۔''

اس کے دونوں ہاتھ بے اختیار سر سے اوپر اٹھ گئے۔ اس نے آواز سے پہچان لیا تھا کہ جن شکاری کتوں کو دھوکا دے کر یہاں تک پہنچا تھا، وہ اس سے پہلے ہی یہاں موجود تھے۔

''ہمیں یقین تھا کہ تم اسی طرف آؤ گے اس لیے ہم پہلے ہی سے تمہارے استقبال کے لیے یہاں موجود تھے۔''

وہی غراتی ہوئی آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔

''تت...... تم لوگ کون ہو اور مم...... مجھ سے کیا چاہتے ہو...... یقین کرو میرے پاس زیادہ پیسے نہیں ہیں۔''

وہ ہکلایا۔

''انجان بننے کی کوشش مت کرو فریدی۔'' اس شخص نے بھیڑیے کی طرح غرا کر کہا۔

اُس کے منہ سے بے اختیار گہرا سانس نکل گیا اور وہ آہستگی سے ان کی طرف گھوم گیا۔ وہ دونوں اس سے چند قدم کے فاصلے پر کھڑے تھے۔ دونوں کے ہاتھوں میں پکڑی ہوئی رائفلوں کا رخ اسی کی طرف تھا۔ وہ دونوں اس کے لیے اجنبی نہیں تھے۔ ان میں سے ایک انور تھا اور دوسرا قادر۔ مدھم چاندنی میں ان دونوں کے چہرے بہت بھیانک لگ رہے تھے۔

''میرے خیال میں تمہارے پاس اسلحہ نام کی کوئی چیز نہیں ہے لیکن ہم احتیاط کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑنا چاہتے۔ انور! اس کی تلاشی لو۔'' قادر نے آخری الفاظ اپنے ساتھی سے مخاطب ہو کر کہے تھے۔

انور نے رائفل ایک ہاتھ میں لٹکا لی اور محتاط انداز میں قدم اٹھاتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔ وہ ابھی دو قدم ہی آگے بڑھا تھا کہ فریدی اُن کے پیچھے دیکھتے ہوئے چیخا۔

''پولیس!''

وہ دونوں بیک وقت بہت تیزی سے پیچھے گھوم گئے۔ فریدی کا یہ نفسیاتی حربہ کامیاب رہا۔ اس نے ایک لمحہ ضائع کیے بغیر اپنی طرف بڑھنے والے انور پر چھلانگ لگا دی۔ ظاہر ہے انور اس حملے کے لیے تیار نہیں تھا۔ رائفل اس کے ہاتھ سے نکل کر فریدی کے ہاتھوں میں پہنچ گئی۔ فریدی نے رائفل نال کی طرف سے پکڑ کر لٹھ کی طرح پوری قوت سے گھمائی۔ اس کا بٹ انور کی کھوپڑی پر لگا اور وہ بھینسے کی طرح ڈکراتا ہوا ڈھیر ہو گیا۔

انور سے نمٹتے ہی فریدی، قادر کی طرف متوجہ ہو گیا۔ اگر وہ چاہتا تو فائر کر کے بڑی آسانی سے قادر کی زندگی کا چراغ بھی گل کر سکتا تھا مگر وہ گولی نہیں چلانا چاہتا تھا کیونکہ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ وہاں سے تھوڑے ہی فاصلے پر پل کے ساتھ سڑک پر پولیس کی ایک عارضی چوکی قائم تھی۔ فائر کی آواز وہاں تک آسانی سے پہنچ سکتی تھی۔ اس نے رائفل کو ایک بار پھر لاٹھی کی طرح گھما دیا لیکن قادر جھکائی دے کر بچ گیا۔ سیدھا ہوتے ہوئے اس نے رائفل بھی سیدھی کرنے کی کوشش کی تھی مگر فریدی نے اس سے زیادہ پھرتی دکھائی اور اچھل کر اس نے قادر کے سر پر زوردار ٹھوکر رسید کر دی۔

قادر بلبلاتا ہوا پیچھے الٹ گیا۔ اس مرتبہ رائفل بھی اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر دور جا گری تھی۔ فریدی نے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس پر ٹھوکروں کی بارش کر دی۔ قادر کچھ دیر تک اس کی ٹھوکریں کھاتا رہا لیکن ایک مرتبہ موقع ملتے ہی اس نے فریدی کا پیر پکڑ لیا۔ فریدی ایک ٹانگ پر ناچ کر رہ گیا۔ رائفل ابھی تک اس کے ہاتھوں میں تھی۔ اس

نے رائفل کے بٹ سے وار کرنا چاہا مگر قادر نے اس کا پیر مروڑتے ہوئے زوردار جھٹکا دیا۔ فریدی لڑکھڑا کر پشت کے بل گرا۔ سنبھلنے کی کوشش میں اس نے ہاتھوں سے رائفل بھی چھوڑ دی تھی۔

قادر نے فوراً ہی سنبھل کر اس پر چھلانگ لگا دی۔ بچنے کی کوشش کے باوجود اس مرتبہ فریدی اس کی گرفت میں آ گیا۔ قادر اس کے سینے پر سوار تھا اور اس کے دونوں ہاتھ فریدی کے گلے پر تھے۔ فریدی کو یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کا گلا آہنی شکنجے میں کسا گیا ہو۔ گرفت لحہ بہ لحہ سخت تر ہوتی جا رہی تھی۔ قادر کی پوری قوت سمٹ کر جیسے اس کے ہاتھوں میں آ گئی تھی۔ فریدی کو سینے میں سانس رکتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ اس کی آنکھیں حلقوں سے ابل آئیں اور زبان باہر نکلنے لگی لیکن اس کا ذہن اب بھی بڑی تیزی سے کام کر رہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اگر قادر کی گرفت سے نجات نہ ملی تو اس کی زندگی کا چراغ گل ہو جائے گا۔

اس نے دونوں ہاتھ قادر کی بانہوں پر جما دیے اور بڑی مشکل سے ٹانگیں سمیٹ کر دونوں پیر قادر کی ٹانگوں کے بیچ میں جما دیے اور پوری قوت سے قادر کو پیروں کے زور سے اوپر اٹھانے کی کوشش کرنے لگا۔ اسے مایوسی نہیں ہوئی۔ اس کی پوری قوت ٹانگوں میں سمٹ آئی تھی۔ قادر اپنے آپ کو اس پر لادے رکھنے کی کوشش کر رہا تھا مگر کامیاب نہ ہو سکا اور فریدی کے سر کے اوپر سے قلابازی کھاتا ہوا پشت کے بل بھد سے نیچے گرا۔

فریدی کی حالت اگرچہ خاصی ابتر تھی لیکن اس نے اٹھنے میں دیر نہیں لگائی۔ قادر کے سنبھلنے سے پہلے ہی فریدی نے اس پر ٹھوکروں کی بارش کر دی۔ قادر کا حال برا ہو چکا تھا۔

فریدی نے قادر کو ایک اور ٹھوکر مارنا چاہی مگر اس مرتبہ قادر اچھل کر دور جا گرا۔ اتفاق سے اس کا ہاتھ زمین پر پڑی ہوئی رائفل پر پڑ گیا۔ اس نے رائفل اٹھالی اور اس کی انگلی ٹریگر پر پہنچ گئی۔ اسی لحہ فریدی نے اچھل کر اس کے بازو پر ٹھوکر ماری۔ قادر کی انگلی کو جھٹکا لگنے سے ٹریگر دب گیا۔ فضا فائر کی آواز سے گونج اٹھی۔ فریدی نے اس کے کندھے پر ایک اور ٹھوکر ماری۔ رائفل قادر کے ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے گر گئی۔

فائر کی بازگشت ابھی ختم نہیں ہوئی تھی کہ فضا ایک بار پھر تڑتڑاہٹ کی آواز سے گونج اٹھی۔ یوں لگا تھا جیسے آٹومیٹک رائفل کا پورا برسٹ مارا گیا ہو۔ اس کے ساتھ ہی ایک بھاری گونج دار آواز سنائی دی۔

''اے...... ادھر جھاڑیوں میں کون ہے خبردار......''

یہ یقیناً پولیس والے کی آواز تھی۔ فریدی اور قادر کو سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ وہ گشتی پولیس کی کوئی پارٹی تھی۔ جو دریا کے بند پر گشت کرتی ہوئی اس طرف نکل آئی تھی۔ وہ دونوں اپنی اپنی جگہوں سے بھاگ کھڑے ہوئے۔

قادر تو دریا کے کنارے ڈھلان میں کھیتوں کی طرف نکل گیا تھا۔ فریدی کا رخ ان ٹمٹماتی ہوئی روشنیوں کی طرف تھا جو کسی آبادی کی نشاندہی کر رہی تھیں۔ پولیس نے ایک اور ہوائی برسٹ مارا تھا۔

وہ آبادی میں پہنچ گیا۔ کتوں نے بھونک کر اس کا استقبال کیا تھا لیکن وہ کتوں کی پروا کیے بغیر تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا گلیوں میں چلتا رہا اور بالآخر چند منٹ بعد آبادی سے نکل کر سڑک پر پہنچ گیا۔ تقریباً دو فرلانگ کے فاصلے پر سڑک کے دوسری طرف سبزی منڈی تھی۔ وہ سڑک پار کر کے تیز تیز قدموں سے سبزی منڈی کی طرف چلنے لگا۔

جب وہ منڈی میں داخل ہوا تو اس کا دل بڑی شدت سے دھڑک رہا تھا۔ اس نے تھوڑی دیر پہلے ہی ایک انسان کو قتل کیا تھا۔ یہ قتل اگرچہ اس نے اپنی جان بچانے کے لیے کیا تھا لیکن قانون کی نظروں میں وہ قاتل تھا اور ہو سکتا ہے پولیس نے قاتل کی تلاش شروع کر دی ہو۔ پولیس کے علاوہ اسے قادر کا بھی خوف تھا۔ قادر اور انور نے رات بھر میلوں دور تک اس کا تعاقب کیا تھا اور اس کے ہاتھوں اپنے ساتھی کے قتل کے بعد تو قادر اسے کسی صورت میں زندہ نہیں چھوڑے گا۔ لیکن یہ سبزی منڈی بہر حال اس کے لیے محفوظ تھی۔

منڈی میں کاروبار عرج پر تھا۔ ٹرکوں سے مال اتر رہا تھا۔ کئی جگہوں پر سبزیوں اور پھلوں کی پیٹیوں کے انبار لگے ہوئے تھے اور بیوپاری حلق پھاڑ پھاڑ کر اپنے مال کی قیمت بڑھا رہے تھے اور خریدنے والے بولیاں لگا رہے تھے۔ لاتعداد مزدور اپنے کام میں مصروف تھے۔ وہ پھلوں کی پیٹیاں اور سبزیوں کے ٹوکرے اٹھا کر مالکوں کے پیچھے پیچھے چل رہے تھے۔

فریدی ابھی کچھ سوچ ہی رہا تھا کہ فائرنگ کی آواز سن کر اچھل پڑا۔ فائرنگ کی آواز کے ساتھ ہی اس کے قریب کھڑا ہوا ایک مزدور چیختا ہوا ڈھیر ہو گیا۔ فریدی نے سبزیوں کے ٹوکروں کے پیچھے چھلانگ لگا دی۔ اس طرف چھلانگ لگاتے ہوئے اس نے قادر کو ایک ٹرک کے پیچھے کی طرف

دوڑتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ فریدی کو سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ یہ فائرنگ اس پر کی گئی تھی لیکن زد میں وہ مزدور آ گیا تھا۔

سبزی منڈی میں بھگدڑ سی مچ گئی۔ لوگ بدحواسی میں چیختے ہوئے اِدھر اُدھر دوڑنے لگے۔ فریدی سبزیوں کے ڈھیر کے پیچھے ہوتے ہوئے وہاں سے دور ہٹنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ویسے اسے قادر پر حیرت ہوئی تھی کہ اس نے سبزی منڈی میں آ کر اس طرح بے باکی سے فائر کیسے کھول دیا تھا۔

فضا ایک بار پھر فائرنگ کی آواز سے گونج اٹھی۔ اس مرتبہ یوں لگا جیسے دو متحارب پارٹیاں ایک دوسرے کے سامنے آ گئی ہوں۔ دونوں طرف سے فائرنگ ہو رہی تھی۔ فریدی نے سبزیوں کے ڈھیر کی آڑ سے جھانک کر دیکھا۔ اسے صورتِ حال دیکھ کر حیرت بھی ہوئی تھی۔ پولیس والے فائرنگ کرتے ہوئے قادر کو گھیرنے کی کوشش کر رہے تھے اور قادر دفاعی انداز میں فائرنگ کرتا ہوا راہِ فرار اختیار کرنے کی کوشش میں تھا۔

منڈی کا وہ حصہ سنسان ہو چکا تھا۔ فریدی بھی وہاں سے اٹھ کر دوڑتا ہوا اس جگہ پہنچ گیا جہاں لاتعداد لوگ جمع تھے، جو چھوٹے چھوٹے بیوپاری مال خرید چکے تھے وہ وہاں سے نکلنے کی فکر میں تھے۔ ایک بیوپاری قریب ہی کھڑا بدحواس سی نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا پھر فریدی کو دیکھ کر وہ اس کی طرف لپکا۔

”اوئے پانڈی......“

”جی چوہدری صاحب۔“ فریدی فوراً ہی اس کی طرف متوجہ گیا۔

”یہ ٹوکرے اٹھا کے رکھ اس سوزوکی پر اور بیٹھ جا تو بھی...... یہاں سے نکل لینا ہی بہتر ہے۔“ بیوپاری نے کہا۔

فریدی نے ایک لمحے کی تاخیر کیے بغیر سبزی کے ٹوکرے اٹھا کر سوزوکی پر لادنا شروع کر دیے۔ آخری ٹوکرا رکھنے کے بعد وہ خود بھی اوپر چڑھ گیا۔ اس دوران وہ بیوپاری اسٹیئرنگ کے سامنے بیٹھ کر انجن اسٹارٹ کر چکا تھا۔ یہ سوزوکی ٹرک یقیناً اسی کا تھا اور فریدی کے لیے تو وہ رحمت کا فرشتہ ثابت ہوا تھا جس کی وجہ سے اسے اس ڈینجر زون سے نکلنے کا موقع مل گیا تھا۔ اس نے بیوپاری سے یہ بھی نہیں پوچھا تھا کہ اسے کہاں جانا ہے۔ وہ تو یہاں سے نکلنا چاہتا تھا۔ وہ سوزوکی میں لدے ہوئے سبزیوں کے ٹوکروں پر لیٹ گیا۔

رات بیت گئی تھی۔ فضا میں دن کا ہلکا سا اجالا پھیلنے لگا تھا۔ فریدی رات بھر سے بھاگ دوڑ میں رہا تھا۔ اس کا مقابلہ موت کے فرشتوں سے تھا۔ کئی مرتبہ موت سے پنجہ آزمائی ہوئی تھی اور بالآخر وہ موت کو شکست دینے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ وہ بری طرح تھک گیا تھا۔ پورا جسم شل ہو رہا تھا۔ اب قدرے آرام ملا تو ذہن پر غنودگی طاری ہونے لگی اور آنکھیں بار بار بند ہونے لگیں۔ لیکن...... وہ سونا نہیں چاہتا تھا۔

سوزوکی کی رفتار کم ہونے لگی اور بالآخر ٹرک ایک جگہ رک گیا۔ فریدی کی بھی آنکھ کھل گئی۔ وہ ٹوکروں پر لیٹا ہوا تھا۔ ٹرک رکتے ہی وہ اٹھ گیا اور جیسے ہی اس نے اپنے اطراف میں دیکھا۔ اس کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ سوزوکی ٹرک کو پولیس نے گھیرے میں لے رکھا تھا۔

بیوپاری دروازہ کھول کر نیچے اتر آیا۔ اس کے سامنے چار پولیس والے کھڑے تھے۔ ایک نے اس کا لباس تھپتھپا کر یہ اندازہ لگانے کی کوشش کی کہ اس کے پاس کسی قسم کا اسلحہ تو موجود نہیں۔ پھر بیوپاری کو ایک طرف کھڑا کر کے وہ فریدی کی طرف متوجہ ہو گیا۔

”تم کون ہو؟ نیچے اترو......“

”مم...... میں پانڈی ہوں جی۔ چوہدری صاحب کے ساتھ منڈی سے آ رہا ہوں۔“ فریدی نے ٹرک سے چھلانگ لگا کر جواب دیا۔ اس کا دل ہولے ہولے کانپ رہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اگر اس کی بھی اسی طرح تلاشی لی گئی تو قمیص کے نیچے شلوکے میں رکھی ہوئی رقم چھپی نہ رہ سکے گی۔ پولیس والے یقیناً یہ جاننا چاہیں گے کہ ایک مزدور کے پاس اتنی بڑی رقم کہاں سے آئی۔ لیکن غنیمت تھا کہ پولیس والے نے اس کا لباس تھپتھپاتے ہوئے اس کے سینے پر ہاتھ نہیں مارا تھا۔ اس نے فریدی کے پہلوؤں، کمر اور ٹانگوں کو تھپتھپا کر ہی تلاشی مکمل کر لی تھی۔

”یہ ٹوکرے اتار کے نیچے رکھو۔“ اسی پولیس والے نے فریدی کی طرف دیکھتے ہوئے تحکمانہ لہجے میں کہا۔

”سنتری بادشاہ! بات کیا ہے۔ کس چیز کی تلاش ہے آپ کو، چٹا دن چڑھ آیا ہے مجھے دکان کھولنی ہے۔ آپ ہمیں یہاں روک کر......“

”چپ اوئے۔“ پولیس والے نے اسے ڈانٹ دیا۔

بیوپاری سہم کر رہ گیا۔ وہ شاید یہ بھول گیا تھا کہ پولیس کا کوئی معمولی کانسٹیبل بھی جب وردی میں ہوتا ہے تو بادشاہ ہی ہوتا ہے۔ اس کے منہ سے نکلی ہوئی ہر بات شاہی

فرمان کا درجہ رکھتی ہے۔

''تو ٹوکرے اتار اوئے۔'' کانسٹیبل نے ایک بار پھر فریدی کو حکم دیا۔

فریدی بلاچون و چرا سبزیوں کے ٹوکرے اتار اتار کر نیچے رکھنے لگا۔ ٹرک خالی کروانے کے بعد ٹوکرے دوبارہ لدوا دیے گئے۔ وہی پولیس والا اب آگے والی سیٹیں اٹھا کر تلاشی لے رہا تھا۔ بالآخر وہ سیدھا ہو کر کھڑا ہو گیا۔

''آخر بات کیا ہے سنتری بادشاہ، کس چیز کی تلاش ہے۔'' بیوپاری نے پھر پوچھا۔

''تم سبزی منڈی سے آرہے ہو، تمہیں نہیں معلوم وہاں کیا ہوا تھا؟'' پولیس والا غرایا۔

''وہاں فائرنگ ہوئی تھی۔ دو پارٹیوں میں تصادم ہو گیا تھا۔'' بیوپاری نے جواب دیا۔

''ہمیں اس شخص کی تلاش ہے جو منڈی میں فائرنگ کر کے فرار ہوا ہے۔ اس نے ایک مزدور اور ایک پولیس والے کو قتل کر دیا ہے۔ وائرلیس پر تمام موبائل پارٹیوں اور چوکیوں کو اطلاع کر دی گئی ہے۔ ہمیں بھی اس کے بارے میں اطلاع مل گئی تھی۔'' پولیس والے نے کہا۔

''تو تمہارے خیال میں ہم نے کسی شخص کو سبزی کے ٹوکروں یا سیٹ کے نیچے چھپا رکھا ہو گا؟'' بیوپاری بولا۔

''بک بک نہ کر اوئے...... اب جاؤ یہاں سے۔'' پولیس والا دہاڑا۔

فریدی بھی پولیس والے کے اس کھسیانے پن پر دل ہی دل میں مسکرا دیا تھا۔ لیکن اس پولیس والے کے توسط سے اسے بہرحال یہ پتا چل گیا تھا کہ قادر بھی فائرنگ کے بعد منڈی سے فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

دن کی روشنی پھیل گئی تھی اور سڑکوں پر اچھا خاصا ٹریفک شروع ہو گیا تھا۔ پولیس والے اب بعض دوسری گاڑیوں کو روک کر چیک کر رہے تھے۔ فریدی اس مرتبہ بیوپاری کے ساتھ ہی اگلی سیٹ پر بیٹھ گیا تھا۔ سوزوکی ٹرک مختلف سڑکوں پر دوڑتا ہوا چوبرجی کی طرف نکل آیا۔ اس بیوپاری کو غالباً سمن آباد کی طرف جانا تھا لیکن فریدی نے چوبرجی کے سامنے ٹرک رکوا لیا۔

''مجھے یہیں اتار دیں چوہدری جی۔ میری طبیعت خراب ہو رہی ہے۔ یہاں سے گھر چلا جاؤں گا۔ آج کی رات تو منڈی میں فائرنگ کی وجہ سے ضائع ہی ہو گئی۔ کوئی کام بھی نہیں مل سکا تھا۔''

بیوپاری نے سڑک کے کنارے سوزوکی ٹرک روک لیا اور جیب سے نوٹ نکال کر اس کی طرف بڑھا دیے۔

''میں دیکھ رہا ہوں کہ تمہاری طبیعت واقعی ٹھیک نہیں ہے۔ تھوڑی دیر سو جاؤ گے تو طبیعت بحال ہو جائے گی۔ ویسے رہتے کہاں ہو؟ زیادہ دور ہو تو میں چھوڑ دوں؟'' بیوپاری نے کہا۔

''زیادہ دور نہیں ہے جی، چوبرجی کے پچھلی طرف نالے کے کنارے ایک کچے مکان میں رہتا ہوں۔'' فریدی نے نوٹ جیب میں رکھتے ہوئے جواب دیا۔

سوزوکی ٹرک آگے نکل گیا۔ فریدی چند لمحے وہاں کھڑا رہا۔ پھر سڑک پار کر کے دوسری طرف آ گیا۔ یہاں آہنی پل کے قریب اسٹاپ پر اچھی خاصی چہل پہل تھی۔ صبح سویرے کاموں پر جانے والے اپنی حیثیت کے مطابق اپنی اپنی پسند کی سواریوں میں بیٹھ رہے تھے۔ سائیکل سوار بھی نظر آرہے تھے۔

۔فریدی گندے نالے کا پل عبور کر کے دوسری طرف نکل گیا۔ یہاں دکانیں کھلنا شروع ہو گئی تھیں۔ چند گز آگے ایک چھوٹا سا ریسٹورنٹ بھی کھلا ہوا تھا۔ ریسٹورنٹ کے سامنے لکڑی کی بینچ اور خستہ حال میزیں بچھی ہوئی تھیں۔ چند مزدور پیشہ لوگ ان بینچوں پر بیٹھے ناشتا کر رہے تھے۔ فریدی بھی ایک بینچ پر بیٹھ گیا اور لڑکے کو چائے لانے کے لیے کہا۔

شب بیداری اور رات بھر کی بھاگ دوڑ نے اس کے جسم کو شل کر دیا تھا۔ گرم گرم چائے سے اسے کچھ سکون سا محسوس ہوا۔ چائے پینے کے بعد وہ فوراً ہی وہاں سے اٹھ گیا۔

شام نگر کا یہ علاقہ چھوٹے بڑے گھروں پر مشتمل تھا۔ ہر گلی میں گھومتے ہوئے وہ پیچھے مڑ کر دیکھ لیتا۔ دھوپ نکل آئی تھی۔ بڑے گھروں کی ان گلیوں میں بھی لوگوں کی آمدورفت شروع ہو چکی تھی لیکن فریدی پر کسی نے توجہ نہیں دی تھی۔

کئی گلیوں میں گھومنے کے بعد بالآخر فریدی ایک گلی کے کونے والے گھر کے سامنے رک گیا۔ اس نے گردن گھما کر چاروں طرف دیکھا اور پھر پھرتی سے دیوار پر چڑھ کر صحن میں کود گیا۔

برآمدے میں پہنچ کر وہ رک گیا۔ ایک دیوار پر لکڑی کا بکس تھا جس پر بجلی کا میٹر اور سوئچ بورڈ لگا ہوا تھا۔ اس نے بکس کا دروازہ کھول کر میٹر کے اوپر رکھی ہوئی چابی اٹھا لی اور دروازہ کھولنے لگا۔

اندر داخل ہو کر فریدی نے دروازہ بند کر دیا۔ یہ ایک

مختصر سی راہداری تھی۔ وہ دائیں طرف والے کمرے میں داخل ہونے کے لیے مڑا لیکن پھر کچھ سوچ کر آگے بڑھ گیا۔ دروازے سے آگے بڑھ کر وہ دو قدم آگے چلا تھا کہ کوئی ٹھنڈی سی چیز اس کی گردن کو چھونے لگی۔ اس کے ساتھ ہی ایک غراتی ہوئی آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔

''ہاتھ اوپر اٹھالو اور کوئی غلط حرکت مت کرنا۔''

فریدی کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ اس کے دونوں ہاتھ خود بخود سر سے اوپر اٹھ گئے۔

''کک...... کون ہو تم...... اور اندر کیسے داخل ہوئے۔ باہر سے تو تالا لگا ہوا تھا؟'' فریدی نے کہا۔ اس کے لہجے میں ہلکی سی کپکپاہٹ تھی مگر ذہن بڑی تیزی سے سوچ رہا تھا۔

''تم نے ایک ہی وقت میں کئی سوال کر ڈالے ہیں۔ ان سب کا جواب یہ ہے کہ میں تمہاری موت کا پیامبر ہوں اور کوئی دیوار، کوئی دروازہ اور کوئی تالا موت کا راستہ نہیں روک سکتا۔'' فریدی کے پیچھے کھڑے ہوئے شخص نے جواب دیا۔ اس کے لہجے میں غراہٹ بدستور تھی۔

''لیکن...... مجھ سے تمہاری کیا دشمنی ہے۔ میں تو شاید تمہیں جانتا بھی نہیں۔'' فریدی نے کہا اور پیچھے مڑنے کی کوشش کی۔

''نہیں، اپنی جگہ سے حرکت مت کرنا ورنہ میرے ریوالور کی صرف ایک ہی گولی تمہارا بھیجا اڑا دے گی اور میں تمہیں یہ بھی بتا دوں کہ میرا یہ ریوالور شور مچانا بالکل پسند نہیں کرتا۔'' اس شخص نے کہتے ہوئے فریدی کی گردن پر ریوالور کی نال کا دباؤ بڑھا دیا۔

''مگر تم ہو کون؟'' فریدی کے لہجے میں اس مرتبہ ہلکی سی جھنجلاہٹ تھی۔

''کہا نا کہ تمہاری موت کا پیامبر۔'' اس شخص نے جواب دیا۔ ''پچھلی رات جب تم حویلی سے فرار ہوئے تھے تو اس کے کچھ ہی دیر بعد تمہارے فرار کی اطلاع ہمیں مل گئی تھی۔ اگرچہ انور اور قادر تمہارے تعاقب میں تھے اور انہیں حکم دے دیا گیا تھا کہ تمہیں شہر پہنچنے سے پہلے پہلے ہر صورت میں گولی مار دی جائے۔ انور اور قادر اپنے کسی مشن میں کبھی ناکام نہیں رہے لیکن تمہارے بارے میں بھی ہمیں بہت کچھ معلوم ہے۔ تم ذہین اور بہادر ہی نہیں چالاک بھی ہو۔ تمہارے اس ٹھکانے...... اس مکان کے بارے میں باس کو بھی معلوم نہیں۔ کوئی بھی نہیں جانتا کہ تم نے یہ مکان ایک فرضی نام سے کرائے پر لے رکھا ہے لیکن میں نے اتفاق سے تمہیں ایک روز اس مکان میں داخل ہوتے ہوئے دیکھ لیا تھا اور کسی نہ کسی طرح مالک مکان سے رابطہ قائم کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس نے بتایا کہ تم نے یہ مکان امجد کے نام سے کرائے پر لے رکھا ہے اور تم ریلوے میں ایک اعلیٰ عہدے پر فائز ہو اور سرکاری کام کے سلسلے میں اکثر دورے پر رہتے ہو۔ مجھے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ تم نے یہاں اپنا خفیہ ٹھکانا بنا رکھا ہے جس کا تمہارے ساتھیوں کو بھی علم نہیں۔ تمہارے اس خفیہ ٹھکانے کا علم صرف مجھے ہے اس لیے میں رات ہی سے یہاں بیٹھا تمہارا انتظار کر رہا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ اگر تم انور اور قادر کے ہاتھوں سے بچ گئے تو یہیں آؤ گے۔''

''تمہاری اس لمبی چوڑی تقریر سے میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ تم کسی غلط فہمی میں مبتلا ہو، میں وہ نہیں جو تم سمجھ رہے ہو۔ میرا نام امجد حسین ہے اور میں واقعی ریلوے کے محکمے میں ایک اعلیٰ عہدے پر فائز ہوں۔ اگر تم چاہو تو ریلوے ہیڈ کوارٹر فون کر کے میرے بیان کی تصدیق کر سکتے ہو۔ فون ہال کمرے میں موجود ہے۔'' فریدی نے کہا۔

''بند کرو یہ بکواس۔'' وہ شخص دہاڑا۔ ''میں تمہارے دھوکے میں نہیں آسکتا۔ اگر تم وہ ہیروئن میرے حوالے کر دو تو تمہاری جان بچ سکتی ہے۔ بصورت دیگر میں تمہیں اس طرح سسکا سسکا کر ماروں گا کہ موت بھی تمہاری حالت دیکھ کر کانپ اٹھے گی۔''

''میں نہیں سمجھ سکا کہ تمہیں کس طرح......''

''بس، اب میں ایک لفظ بھی فالتو نہیں سنوں گا۔'' وہ شخص غرایا۔ ''بتاؤ ہیروئن کہاں ہے؟'' اس کے ساتھ ہی اس نے گردن پر ریوالور کا دباؤ بڑھا دیا۔

فریدی کو سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ یہ شخص اسے نہیں چھوڑے گا۔

''وہ......'' وہ ایک طرف ہاتھ کا اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ''وہ اس الماری میں ہے۔''

''تم جھوٹ کہتے ہو۔ میں اس الماری کی تلاشی لے چکا ہوں۔'' اس شخص نے کہا۔

''کک...... کیا تم نے اس الماری کے پیچھے دیوار کے خفیہ خانے میں بھی دیکھا تھا؟'' فریدی ہکلایا۔

''دیوار کا خفیہ خانہ!'' وہ شخص بڑبڑایا۔

''ہاں، الماری کے پیچھے دیوار میں ایک خفیہ خانہ بنا ہوا ہے اور ہیروئن اسی خفیہ خانے میں رکھی ہے۔'' فریدی نے جواب دیا۔

''اوہ!'' اس شخص کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ ''آگے بڑھو اور الماری کھول کر دیوار کے اس خفیہ خانے سے ہیروئن نکالو۔لیکن خبردار! اگر تم نے کوئی چالاکی دکھانے کی کوشش کی تو زندہ نہیں بچ سکو گے۔''

فریدی آگے بڑھ گیا۔اس نے دونوں ہاتھ بدستور سر سے اوپر اٹھا رکھے تھے۔اس کا انداز ایسا ہی تھا جیسے وہ آگے بڑھ کر الماری کھولنا چاہتا ہو۔الماری کے سامنے پہنچ کر وہ رک گیا۔

''کیا میں ہاتھ نیچے کرسکتا ہوں؟'' فریدی نے کوئی حرکت کیے بغیر کہا۔

''ہاتھ نیچے نہیں کرو گے تو الماری کیسے کھولو گے۔چلو، جلدی سے الماری کھولو۔'' اس شخص نے کہا۔

فریدی نے دونوں ہاتھ نیچے گرا دیے پھر وہ اسی طرح آگے کی طرف جھکنے لگا جیسے الماری کھولنا چاہتا ہو لیکن دوسرے ہی لمحے وہ برق رفتاری سے نیچے جھک گیا۔اس کے ساتھ ہی اس نے دونوں کہنیوں کو پوری قوت سے پیچھے کی طرف جھٹکا دیا تھا۔

اس کے جھکنے سے ریوالور اس کی گردن سے ہٹ گیا۔ اس کی دونوں کہنیاں پیچھے کھڑے ہوئے شخص کے پیٹ میں لگی تھیں۔یہ صورتِ حال اس شخص کے لیے بالکل غیر متوقع تھی۔اس نے ٹریگر دبا دیا۔اس کے ساتھ ہی وہ کراہتا ہوا دہرا ہوگیا۔

فریدی نے اس صورتِ حال سے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔خاموش ریوالور سے نکلنے والی گولی الماری میں لگی۔ فریدی نے اسے دوسرا فائر کرنے کا موقع دیے بغیر اس کے ریوالور والے ہاتھ پر ہاتھ ڈال دیا اور گھٹنے سے اس کے پیٹ پر ایک اور ضرب لگائی۔وہ شخص ایک بار پھر کراہا۔

ان دونوں میں ریوالور کے لیے کشمکش ہونے لگی۔ اسی کشمکش میں ٹریگر ایک بار پھر دب گیا۔گولی اس مرتبہ کہنی سے ذرا اوپر فریدی کے بازو کا گوشت چیرتی ہوئی نکل گئی۔

زخمی ہونے کے باوجود اس شخص کی کلائی پر فریدی کی گرفت کمزور نہیں پڑی تھی۔کیونکہ وہ جانتا تھا کہ اس موقع پر کمزوری دکھانے کا مطلب موت کے سوا کچھ نہیں ہوگا۔وہ پوری قوت سے اپنے حریف کی کلائی مروڑتا رہا۔

''تم کیا سمجھتے تھے کہ اکیلے فریدی پر قابو پالو گے؟'' فریدی نے اس کی پسلیوں پر زوردار ٹھوکر مارتے ہوئے کہا۔''انور اور قادر رات بھر پاگل کتوں کی طرح میرا پیچھا کرتے رہے ہیں مگر اپنی ہر کوشش میں ناکام رہے ہیں۔''

''تم اپنے بارے میں خوش فہمی کا شکار ہو فریدی۔'' اس شخص نے کہا۔وہ اپنی تکلیف پر بڑی حد تک قابو پاچکا تھا۔''باس دنیا کے آخری کونے تک تمہارا پیچھا کرے گا۔ تمہیں کہیں بھی اس سے پناہ نہیں مل سکے گی۔باس غداروں اور دھوکے بازوں کو معاف کرنے کا عادی نہیں ہے'اگر تم باس کے عتاب سے بچنا چاہتے ہو تو میری بات مان لو۔مال باس کے حوالے کردو۔میں تم دونوں میں سمجھوتا کرا سکتا ہوں۔''

''سمجھوتا تو اب تمہارا ہوگا......موت سے۔'' فریدی نے جواب دیا۔''اگر تمہارا باس معاف کرنے کا عادی نہیں ہے تو اپنے دشمن کو زندہ چھوڑ دینا میری فطرت میں بھی شامل نہیں۔تمہاری موت ہی تمہیں یہاں لائی تھی۔مجھے یقین ہے کہ کئی روز تک تمہاری موت کا کسی کو پتا نہیں چلے گا کیونکہ میرے اس ٹھکانے کے بارے میں تمہارے سوا اور کوئی نہیں جانتا۔اب تم مرنے کے لیے تیار ہوجاؤ......میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔رات بھر کی بھاگ دوڑ سے میں بری طرح تھک گیا ہوں اور کچھ دیر آرام کرنا چاہتا ہوں۔'' اس نے ریوالور کا رخ اس شخص کی طرف کردیا۔

''نن......نہیں......تم مجھے نہیں مار سکتے۔'' وہ شخص ہکلایا۔اس کے چہرے پر بے پناہ خوف کے تاثرات ابھر آئے تھے۔

''مجھے کون روک سکتا ہے؟'' فریدی نے اُس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے جواب دیا اور بڑے اطمینان سے ٹریگر دبا دیا۔گولی اس شخص کی پیشانی میں لگی اور وہ فرش پر لوٹنے لگا۔

فریدی کے چہرے پر بے پناہ سفاکی تھی۔وہ چند لمحے اپنے دشمن کے تڑپنے کا نظارہ کرتا رہا پھر اس نے ریوالور کا دستہ اور ٹریگر اپنی قمیص کے دامن سے صاف کیا اور ریوالور اس کی لاش کے قریب پھینک کر باتھ روم میں گھس گیا۔

نہانے اور لباس تبدیل کرنے کے بعد اس نے کچن میں جا کر ناشتا تیار کیا اور کچن ہی میں بیٹھ کر ناشتا کرنے لگا۔ اسے اس بات کی قطعی پروا نہیں تھی کہ اس نے کچھ دیر پہلے ایک انسان کو قتل کیا ہے اور لاش ہال کمرے میں پڑی ہے۔

اطمینان سے ناشتا ختم کرنے کے بعد وہ ہال کمرے میں آگیا۔اس نے ایک نظر فرش پر پڑی ہوئی لاش کی طرف دیکھا اور پھر اس کونے میں چلا گیا جہاں اسٹینڈ پر ٹیلی فون رکھا ہوا تھا۔ٹیلی فون کے قریب ہی دیوار پر ایک کاغذ چپکا

ہوا تھا جس پر اہم مقامات کے ٹیلی فون نمبرز لکھے ہوئے تھے۔ اس فہرست میں مقامی پولیس اسٹیشن کا نمبر بھی درج تھا۔ فریدی تقریباً چھ ماہ پہلے جب اس مکان میں آیا تھا تو یہ کاغذ پہلے ہی سے یہاں چپکا ہوا تھا اور اس نے اسے ہٹانے کے بجائے جوں کا توں رہنے دیا تھا اور آج اسے اس فہرست کی ضرورت پڑ گئی تھی۔ اس نے کاغذ پر مقامی پولیس اسٹیشن کا نمبر دیکھا اور پھر ریسیور اٹھا کر نمبر ڈائل کرنے لگا۔ لائن ملنے میں دیر نہیں لگی تھی۔

''ہیڈ محرر عمر شریف بول رہا ہوں۔'' ریسیور پر آواز ابھری۔

''ایس ایچ او سے بات کراؤ۔'' فریدی نے کہا۔ ''ایک اہم اطلاع دینا چاہتا ہوں۔''

''ایس ایچ او صاحب ایک کیس کی تفتیش کے سلسلے میں باہر گئے ہوئے ہیں۔ آپ کون صاحب بول رہے ہیں۔ وہ اہم اطلاع مجھے دے دیں۔ ایس ایچ او صاحب آئیں گے تو انہیں بتا دیا جائے گا۔'' دوسری طرف سے کہا گیا۔

''تو پھر میری بات غور سے سنو ہیڈ محرر عمر شریف۔'' فریدی نے کہا۔ ''میں جو کچھ بتانے جا رہا ہوں اس پر تمہیں ترقی بھی مل سکتی ہے۔'' وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بتانے لگا کہ راوی کے بند پر ملنے والی لاش اور سبزی منڈی میں ایک مزدور اور پولیس کانسٹیبل کو ہلاک کرنے والا کون ہے۔ اس کا نام قادر ہے۔ وہ تمہیں باغبانپورہ میں مل جائے گا۔'' اس نے وہ پتا بھی بتا دیا جہاں قادر کو پکڑا جا سکتا تھا۔

''آپ کون ہیں، کہاں سے بول رہے ہیں اور یہ سب کچھ آپ کو کیسے معلوم ہوا؟'' دوسری طرف سے پوچھا گیا۔

''سنو ہیڈ محرر۔'' فریدی نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔ ''اگر تم مجرم کو گرفت میں لے کر اپنی ترقی چاہتے ہو تو میری اس کال کو گمنام سمجھ کر نظر انداز مت کر دینا۔ میں پھر فون کروں گا اور تمہارے ہی علاقے میں ایک اور لاش کے بارے میں اطلاع دوں گا۔'' اس نے فرش پر پڑی ہوئی لاش کی طرف دیکھتے ہوئے فون بند کر دیا۔

وہ فون بند کرنے کے بعد کچھ دیر تک خاموش کھڑا فرش پر پڑی ہوئی لاش کی طرف دیکھتا رہا۔ لاش کے زخم سے بہنے والا خون جم چکا تھا۔

یہ مکان اگرچہ فریدی کا خفیہ ٹھکانا تھا لیکن یہاں اس نے زیادہ ساز و سامان جمع نہیں کیا تھا۔ چند جوڑے کپڑے اور ضرورت کی چند چیزیں، البتہ وہ اپنا قیمتی مال بھی اسی مکان میں رکھتا تھا۔ پولیس کو فون پر قادر کے بارے میں اطلاع دینے کے بعد وہ اپنے بیڈ روم میں آ گیا اور الماری کھول کر اس میں ٹنگے ہوئے کپڑے نکال کر پلنگ پر رکھنے لگا پھر اس نے الماری کے اوپر رکھا ہوا سرمئی رنگ کا سیمسونائٹ کا سوٹ کیس بھی اتار لیا اور سر اٹھا کر چھت کی طرف دیکھنے لگا۔

یہ مکان ایک سرکاری ملازم کی ملکیت تھا۔ کہنے کو تو وہ شخص محض ہیڈ کلرک تھا۔ اس محکمے میں اللہ کا فضل ہن بن کر برستا تھا۔ اس شخص نے اس مکان کی تعمیر پر اچھی خاصی رقم خرچ کی تھی۔ پورے مکان میں فالس سیلنگ لگی ہوئی تھی اور فریدی کے خیال میں بھی اس فالس سیلنگ پر ہی لاکھوں روپے خرچ ہوئے ہوں گے۔

فریدی نے ایک اونچا اسٹول لا کر کمرے میں پلنگ کے قریب رکھ دیا اور ایک چھوٹا اسکریو ڈرائیور لے کر اسٹول پر کھڑا ہو گیا۔ اس طرح اس کے ہاتھ آسانی سے سیلنگ تک پہنچ گئے۔ یہ فالس سیلنگ سفید رنگ کے بڑے خوب صورت نقش بلاکس کو جوڑ کر تیار کی گئی تھی۔ یہ بلاک بھی ایک خاص میٹریل سے بنے ہوئے تھے۔ فریدی کچھ دیر تک چھت کے عین وسط میں لگے ہوئے بلاک کو دیکھتا رہا پھر اس میں لگے ہوئے اسکریو کھولنے لگا۔ تقریباً پانچ منٹ بعد وہ خوب صورت ہلکا پھلکا سا بلاک اس کے ہاتھ میں تھا۔ اس نے جھک کر بلاک کو پلنگ پر ڈال دیا اور ایک بار پھر کھڑے ہو کر سیلنگ میں پیدا ہونے والے اس خلا میں جھانکنے لگا۔ پھر اس نے خلا میں ہاتھ ڈال کر اندر رکھا ہوا ایک بریف کیس باہر کھینچ لیا۔ یہ بریف کیس حجم میں قدرے بڑا تھا۔ اس نے بریف کیس پلنگ پر پھینک دیا اور سیلنگ سے نکالا ہوا بلاک دوبارہ اس کی جگہ فٹ کر دیا۔

بریف کیس کھولتے ہی اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔ بریف کیس میں نوٹوں کی گڈیاں بھری ہوئی تھیں اور نوٹوں کی ان گڈیوں کے نیچے سفید پوڈر کی تھیلیاں بڑے سلیقے سے رکھی ہوئی تھیں۔ یہ ہیروئن تھی اور تھیلیوں کی تعداد پندرہ تھی۔ ہر تھیلی میں ایک کلو ہیروئن تھی۔ پندرہ کلو ہیروئن...... عالمی منڈی میں اس ہیروئن کی قیمت کروڑوں ڈالر سے بھی زیادہ تھی۔ اس نے بریف کیس بند کر دیا اور وہ سوٹ کیس کھولنے لگا جو الماری کے اوپر سے اتارا تھا۔

فریدی نے بریف کیس، سوٹ کیس میں رکھ کر اس کے اوپر کپڑے رکھ دیے اور سوٹ کیس لے کر ہال کمرے

میں آ گیا۔ سوٹ کیس ٹیلی فون کے قریب رکھ کر وہ پورے مکان میں گھوم پھر کر جائزہ لینے لگا۔ یہاں کوئی ایسی چیز نہیں تھی جس سے اس کے بارے میں سراغ لگایا جا سکتا۔ وہ دوبارہ فون کے قریب آ گیا اور ریسیور اٹھا کر مقامی پولیس اسٹیشن کا نمبر ڈائل کرنے لگا۔

''ہیڈ محرر عمر شریف بول رہا ہوں۔'' ریسیور پر آواز سنائی دی۔

''مجھے یقین ہے کہ تم نے میری پہلی اطلاع کو نظر انداز نہیں کیا ہوگا۔'' فریدی نے کہا۔ ''تمہارے لیے دوسری اطلاع یہ ہے کہ تمہارے ہی علاقے میں شام نگر کے ایک گھر میں ایک لاش موجود ہے۔ اسے گولی مار کر ہلاک کیا گیا ہے اور وہ ریوالور بھی تمہیں لاش کے قریب ہی مل جائے گا۔ یہ شخص بھی قادر بٹ ہی کا ساتھی تھا اور راوی کے بند کے قریب پائی جانے والی لاش کا تعلق بھی انہی سے ہے اگر تم قادر بٹ کو گرفتار کرنے میں کامیاب ہو جاؤ تو اور بھی بہت سے انکشافات ہو سکتے ہیں۔''

''قادر بٹ کے بارے میں ایس ایچ او صاحب کو بتا دیا ہے لیکن تم کون ہو اور کہاں سے بول رہے ہو؟'' دوسری طرف سے پوچھا گیا۔

''میں کون ہوں؟ اس سے تمہیں کوئی غرض نہیں ہونی چاہیے۔ البتہ میں جہاں سے بول رہا ہوں وہ پتا نوٹ کر لو۔ وہ لاش بھی تمہیں اسی مکان میں مل جائے گی۔ اور ایک بات ذہن میں رکھنا کہ مالک مکان کا اس لاش سے کسی قسم کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ البتہ تم اس سے یہ ضرور پوچھ سکتے ہو کہ ایک معمولی سی ملازمت پر رہتے ہوئے اس نے یہ مکان کیسے بنا لیا۔'' فریدی نے گھر کا پتا لکھوایا اور فون بند کر دیا۔

اس نے آخری مرتبہ لاش کی طرف دیکھا اور سوٹ کیس اٹھا کر باہر نکل آیا۔

اس وقت صبح کے دس بجے تھے۔ دھوپ میں تپش آ گئی تھی۔ وہ گلیوں سے نکل کر سڑک پر آ گیا۔ اسے فوراً ہی ایک ٹیکسی نظر آ گئی۔ فریدی نے پچھلی سیٹ پر بیٹھتے ہوئے اسے لکشمی چوک چلنے کو کہا۔ سوٹ کیس بھی اس نے اپنے ساتھ سیٹ پر ہی رکھ لیا تھا۔

لکشمی چوک پر ٹیکسی سے اتر کر فریدی نے سوٹ کیس اٹھایا اور سڑک پار کر کے دوسری طرف آ گیا۔ یہاں بھی دو تین ٹیکسیاں کھڑی تھیں۔ فریدی ایک جگہ کھڑا اس ٹیکسی کو دیکھتا رہا جو میکلوڈ روڈ پر ریلوے اسٹیشن کی طرف چلی گئی تھی۔ چند سیکنڈ بعد فریدی قریب کھڑی ہوئی ٹیکسی میں بیٹھ گیا۔

فریدی نے یہ ٹیکسی گڑھی شاہو میں ایک سینما کے سامنے چھوڑ دی اور کچھ دیر بعد ایک تیسری ٹیکسی پر سوار ہو کر محمد نگر پہنچ گیا جو وہاں سے زیادہ دور نہیں تھا۔ ٹیکسی اس نے تنگ سے بازار میں چھوڑ دی اور بھاری سوٹ کیس اٹھا کر ایک گلی میں داخل ہو گیا اور پھر مختلف گلیوں میں ہوتا ہوا ایک مکان کے سامنے رک گیا۔ اس نے گلی میں اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے دروازے پر ہلکی سی دستک دی۔ صرف ایک منٹ بعد دروازہ کھل گیا۔

دروازہ کھولنے والی ایک جوان لڑکی تھی۔ اس کی عمر تئیس چوبیس کے لگ بھگ رہی ہوگی۔ وہ بے حد حسین تھی۔ فریدی کو دیکھتے ہی اس کا چہرہ کھل اٹھا۔ وہ فوراً ہی دروازے سے ایک طرف ہٹ گئی اور فریدی سوٹ کیس اٹھا کر اندر آ گیا۔ اس کے اندر داخل ہوتے ہی لڑکی نے دروازہ بند کر دیا۔

''تم آج اسکول نہیں گئیں رخشندہ؟'' فریدی نے ایک کمرے کی طرف بڑھتے ہوئے پوچھا۔

''دو تین دن سے طبیعت ٹھیک نہیں۔ چھٹی لے رکھی ہے۔ لیکن تم ایک ہفتے سے کہاں غائب تھے۔ اماں پریشان ہو رہی تھیں۔ تم نے فون پر بھی کوئی اطلاع نہیں دی تھی۔'' رخشندہ نے کہا۔

''تم جانتی ہو کہ میں کام کے سلسلے میں اکثر کئی کئی روز تک غائب رہتا ہوں۔ اس مرتبہ فون کرنے کا موقع نہیں مل سکا۔ اماں کہاں ہے؟'' فریدی نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔

''سبزی گوشت لینے بازار گئی ہیں۔ بس آتی ہی ہوں گی۔'' رخشندہ نے جواب دیا۔ ''تمہیں یقینا بھوک لگ رہی ہوگی۔ میں ناشتا بناتی ہوں۔''

''ناشتا میں کر چکا ہوں۔ صرف ایک کپ چائے پیوں گا۔'' فریدی نے جواب دیا اور سوٹ کیس ایک طرف رکھ کر کمرے میں بچھے ہوئے پلنگ پر دراز ہو گیا۔

کچھ دیر بعد رخشندہ چائے بنا کر لے آئی۔ تقریباً اسی وقت اماں بھی بازار سے آ گئی۔ فریدی کو دیکھ کر اس کا چہرہ بھی کھل اٹھا۔ اماں اور رخشندہ وہیں بیٹھ گئیں اور وہ تینوں دیر تک باتیں کرتے رہے۔

''میں رات بھر کا جاگا ہوا ہوں۔ سونا چاہتا ہوں۔ جب تک خود نہ اٹھوں مجھے جگایا نہ جائے۔'' فریدی نے خالی کپ رخشندہ کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے بیٹا، تم دروازہ بند کرلو۔ تمہیں کوئی ڈسٹرب نہیں کرے گا۔" اماں کہتے ہوئے اٹھ گئیں اور رخشندہ کے ساتھ کمرے سے باہر آ گئیں۔

فریدی نے اٹھ کر دروازہ بھیڑ دیا اور سوٹ کیس میں سے بریف کیس نکال کر الماری کے سب سے نچلے خانے میں رکھ دیا اور پلنگ پر دراز ہوگیا۔

یہ گھر بھی فریدی کی ان خفیہ پناہ گاہوں میں سے ایک تھا جس کے بارے میں کسی کو علم نہیں تھا۔ اس گھر میں آ کر فریدی کو ہمیشہ سکون ملتا تھا۔ اسے یوں لگتا تھا جیسے وہ ماں کی آغوش میں آ گیا ہو۔ رخشندہ اور اماں سے اس کا کوئی خونی رشتہ نہیں تھا۔ صرف انسانیت کا رشتہ تھا جو خون سے بھی زیادہ گہرا اور مضبوط تھا۔ ان دونوں کے بارے میں سوچتے ہوئے فریدی کا ذہن کئی سال پیچھے چلا گیا۔

یہ دس سال پہلے کی بات تھی۔ اس وقت فریدی کی عمر بارہ سال تھی اور وہ ساتویں کلاس کا طالب علم تھا۔ اس کا قد لمبا اور صحت قابلِ رشک تھی۔ وہ اپنی عمر سے کہیں بڑا لگتا تھا۔ اس کا نام تو غلام فرید تھا لیکن پیار میں سب ہی اسے فریدی کہنے لگے تھے۔ ان کی رہائش بھاٹی دروازے کے اندر کوچہ لالہ ہرنام داس کے ایک مکان میں تھی۔ تنگ سی گلی میں اس مکان کا فرنٹ اگرچہ بہت مختصر سا نظر آتا تھا لیکن اندر سے یہ مکان تقریباً چار کنال کے رقبے پر پھیلا ہوا تھا۔ بیرونی دروازے سے اندر داخل ہوتے ہی سامنے ایک وسیع و عریض صحن تھا جس کے چاروں طرف بڑے سلیقے سے کمرے بنے ہوئے تھے۔ یہ ایک طرح کی وسیع و عریض حویلی تھی جہاں قیامِ پاکستان سے پہلے ایک سکھ خاندان آباد تھا۔ فریدی کا دادا بھی تقسیم کے وقت ہوشیار پور سے لمبی چوڑی جائداد چھوڑ کر آیا تھا۔ لاہور کے مہاجر کیمپ میں اس کی ملاقات ایک جاننے والے سے ہوگئی۔ وہ فرید کے دادا علی احمد کو بہت اچھی طرح جانتا تھا۔ اسے کیمپ میں کسمپرسی کی حالت میں دیکھ کر دوست کو ترس آ گیا اور وہ اسے مہاجر کیمپ سے نکال کر اس مکان میں لے آیا۔ ہوشیار پور میں چھوڑی ہوئی علی احمد کی جائداد کے مقابلے میں سکھوں کا چھوڑا ہوا یہ حویلی نما مکان اگرچہ کچھ بھی نہیں تھا مگر اشک شوئی کے لیے کافی تھا۔ فسادات کم ہوئے تو پاکستان میں ری ہیبلی ٹیشن اور اسٹیبلشمنٹ کے محکمے قائم ہو گئے اور ہندوستان سے آئے ہوئے مہاجرین کی آبادکاری کا کام شروع ہوگیا۔ علی احمد نے بھی اپنا کلیم داخل کر دیا۔ اس کے دوست نے بھی اس معاملے میں اس کی بڑی مدد کی اور یہ

مکان علی احمد کو الاٹ ہوگیا۔ علی احمد کو بھاٹی دروازے کے باہر ایک دکان بھی مل گئی جہاں اس نے پھلوں کا کاروبار شروع کر دیا۔ فرید کا باپ سعید اس وقت چھ سات سال کا تھا۔ سعید اپنے ماں باپ کی اکلوتی اولاد تھا۔ علی احمد نے اسے گورنمنٹ اسکول میں داخل کروا دیا۔

سعید دس سال کا تھا تو علی احمد کا انتقال ہوگیا۔ دکانداری سعید کی ماں نے سنبھال لی۔ وہ مردانہ وار حالات کا مقابلہ کرتی رہی۔ سعید اسکول سے واپس آتا تو دکان اور گھر کے کام میں ماں کی مدد کرتا۔ ماں سعید کو پھل فروش نہیں بنانا چاہتی تھی۔ وہ اسے اعلیٰ تعلیم دلانا چاہتی تھی تاکہ وہ بھی اس نوزائدہ ملک کی تعمیر و ترقی میں بھرپور حصہ لے سکے۔

سعید نے جب بی اے کا امتحان پاس کیا تو ماں نے اس کی شادی کر دی۔ اس کا خیال تھا کہ وہ دکانداری سنبھالے رہے گی اور سعید تعلیم حاصل کرتا رہے گا۔ لیکن تقدیر اپنا فیصلہ لکھ چکی تھی۔ سعید کی والدہ کا انتقال ہوگیا اور اسے تعلیم ادھوری چھوڑ کر دکانداری سنبھالنا پڑی۔ شادی کے کئی سال بعد فرید پیدا ہوا۔

سعید بی اے سے آگے تعلیم حاصل نہیں کر سکا تھا لیکن وہ بیٹے کو خوب پڑھانا چاہتا تھا۔ فرید بہت ذہین بچہ تھا۔ ماں باپ نے اس سے بہت سی توقعات وابستہ کر لی تھیں۔ فرید بارہ سال کا ہوگیا۔ وہ ساتویں کلاس میں تھا۔ انہی دنوں اس کے والد سعید اور سامنے والے مکان میں رہنے والے اسلام الدین نامی ایک وکیل میں جھگڑا شروع ہوگیا۔ اسلام الدین کا مکان پانچ مرلے کا تھا۔ یہ اس کے دادا پردادا کا مکان تھا۔ جب پاکستان معرضِ وجود میں آیا تو اسلام الدین کی عمر بھی سات آٹھ سال تھی۔ میٹرک تک وہ اور سعید ایک ہی اسکول میں پڑھتے رہے تھے لیکن کالج میں ان کے راستے الگ ہوگئے۔ بی اے کرنے کے بعد اسلام الدین نے لاء کالج میں داخلہ لے لیا۔ وکالت پاس کرنے کے بعد اس نے کچہری میں پریکٹس شروع کر دی اور سعید کو دکانداری سنبھالنا پڑی تھی۔

اسلام الدین ایک کینہ پرور، حاسد اور نہایت گندی ذہنیت کا مالک شخص تھا لیکن وہ وکالت کے پیشے میں بہت کامیاب زندگی گزار رہا تھا۔ اس کی نظریں سعید کے اس حویلی نما مکان پر تھیں جو علی احمد نے کلیم میں حاصل کیا تھا۔ اسلام الدین کو افسوس تو اس بات پر تھا کہ تقسیم ملک کے وقت سکھ خاندان کے جانے کے بعد اس مکان پر اس کے باپ نے قبضہ کیوں نہیں کیا تھا اور اب وہ اس مکان پر قبضہ

کرنا چاہتا تھا۔ وہ سازشی ذہن کا مالک تھا۔ اس نے اسٹیبلشمنٹ کے بعض راشی افسروں کو ساتھ ملا کر اس مکان کی ملکیت کے سلسلے میں سعید کو نوٹس دے دیا۔

کیس عدالت میں زیر سماعت تھا۔ فریقین پیشیاں بھگت رہے تھے۔ اسلام الدین اس مکان کو اپنے پُرکھوں کی جائداد ثابت کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہا تھا۔ اس نے اسٹیبلشمنٹ کے بعض کلرکوں اور افسروں کو بھاری رشوتیں دی تھیں جو کاغذات میں ردوبدل کرنے پر تیار ہوگئے تھے۔

فریدی کو وہ رات کبھی نہیں بھولے گی۔ آسمان پر صبح ہی سے گہرے بادل چھائے ہوئے تھے۔ دن میں ایک دو مرتبہ ہلکی سی بوندا باندی بھی ہوئی تھی۔ لیکن بار بار آسمان پر تڑپتی ہوئی بجلی اور گرجتے ہوئے بادل کسی بڑے طوفان کی پیشگوئی کر رہے تھے۔

شام سے کچھ پہلے فریدی کی ماں اسے لے کر داتا دربار چلی گئی۔ جب سے مکان کا جھگڑا شروع ہوا تھا وہ روزانہ داتا دربار جایا کرتی تھی۔ اس روز بھی وہ فریدی کو ساتھ لے کر دعا مانگنے گئی تھی۔ واپسی پر اندھیرا ہوگیا اور ہلکی ہلکی بوندا باندی بھی ہونے لگی۔ سعید کی پھلوں کی دکان راستے ہی میں تھی۔ شام کے وقت بھاٹی کی رونق عروج پر ہوا کرتی تھی۔ چائے، پان اور مشروبات کی دکانوں کے سامنے بے فکرے نوجوانوں کی ٹولیاں بیٹھی رہتیں۔ موتیے کے ہار بیچنے والے گھوم پھر کر آوازیں لگاتے رہتے۔ رات گئے تک عجیب سا سماں رہتا لیکن اس شام بھاٹی چوک کچھ اجڑا ہوا سا لگ رہا تھا۔ بوندا باندی شروع ہوگئی تھی اور موسم کے بگڑے ہوئے تیور دیکھ کر لوگ گھروں میں دبک کر بیٹھ گئے تھے۔

''بارش شروع ہوگئی ہے۔ تم بھی دکان بند کر کے گھر آجاؤ۔'' فریدی کی ماں نرگس نے اپنے شوہر کو مشورہ دیا۔

''ہاں میں بھی یہی سوچ رہا ہوں۔'' سعید نے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''تم لوگ چلو...... میں بھی آتا ہوں پندرہ بیس منٹ میں۔'' اس نے درجن بھر کینو تنکوں کی ٹوکری میں ڈال کر ٹوکری فریدی کے ہاتھ میں تھمادی۔

وہ دونوں ماں بیٹا چوک سے نکل کر بھاٹی گیٹ کے اندر کی طرف آگئے۔ تنگ اور پُرپیچ گلیوں سے گزرتے ہوئے جب وہ اپنے مکان پر پہنچے تو بارش تیز ہوچکی تھی۔ وہ جیسے ہی دروازے میں داخل ہوئے بادل زور سے گرجے۔ اس کے ساتھ ہی بجلی بھی کڑکی۔ نرگس نے فریدی کو اپنے ساتھ لپٹا لیا۔ بارش ایک دم تیز ہوگئی تھی۔ ان کے رہائشی کمرے صحن کے دوسری طرف بالکل آخر میں تھے۔ صحن میں دوڑتے ہوئے انہیں محسوس ہو رہا تھا جیسے منٹو پارک میں دوڑ رہے ہوں۔

''تمہارا ابا اب بارش میں بھیگتا ہوا آئے گا۔'' نرگس نے برآمدے میں پہنچ کر کہا۔ ''تمہارے کپڑے بھی بھیگ گئے ہیں۔ اندر چل کر کپڑے بدل لو کہیں ٹھنڈ نہ لگ جائے۔''

تقریباً آدھے گھنٹے بعد سعید بھی پہنچ گیا۔ وہ واقعی پانی میں شرابور ہو رہا تھا۔

''لو، تم کپڑے بدل لو...... میں اتنی دیر میں کھانا تیار کرتی ہوں۔'' نرگس کہتی ہوئی کمرے سے نکل کر باورچی خانے میں چلی گئی۔

بارش میں شدت آگئی تھی۔ آسمان سے چھاجوں پانی برس رہا تھا۔ اس کے ساتھ ہی سردی میں بھی اضافہ ہوگیا تھا۔ کھانے کے بعد وہ کمبل اوڑھ کر بیٹھ گئے اور کھلے ہوئے دروازے سے بارش کا نظارہ کرنے لگے۔ گزرنے والے ہر لمحے کے ساتھ بارش میں تیزی آتی جارہی تھی۔ بادلوں کی گھن گرج اور بجلی کی کڑک سے دل دہلا جارہا تھا اور پھر وہ دونوں ایک دم اچھل پڑے۔ بڑے زور کا دھماکا ہوا تھا جیسے قریب ہی بم گرا ہو۔ سعید کو سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ کہیں بجلی گری تھی۔ نجانے کیوں وہ دونوں میاں بیوی غیرارادی طور پر فریدی کی طرف دیکھنے لگے جو چارپائی پر کمبل میں لپٹا سو رہا تھا۔

''لگتا ہے یہ بارش رات بھر اسی طرح برستی رہے گی۔ مجھے تو سکینہ آپا کی فکر ہو رہی ہے اس کے مکان کی چھت ویسے ہی کمزور ہے۔ کہیں اس بارش میں چھت بیٹھ ہی نہ جائے۔ پرسوں وہ آئی تھی تو کہہ رہی تھی کہیں سے پیسے مل جائیں تو چھت کی مرمت کروالے۔'' نرگس نے کہا۔

سکینہ آپا اسی محلے کی رہنے والی تھی۔ اس کا مکان گلی کے شروع میں تھا۔ اس کی عمر تیس کے لگ بھگ رہی ہوگی۔ اس کی ایک بچی تھی جس کی پیدائش کے دو سال بعد اس کے شوہر کا انتقال ہوگیا تھا۔ وہ گھروں میں کام کاج کر کے زندگی کے دن گزار رہی تھی۔ اس کی بیٹی فریدی سے تقریباً دو سال چھوٹی تھی جو پرائمری اسکول میں زیر تعلیم تھی۔ سکینہ آپا کبھی کبھی ان کے ہاں بھی آجایا کرتی تھی اور نرگس اس کی تھوڑی بہت مدد کردیا کرتی تھی۔

''سکینہ آپا کے بارے میں ایک دو مرتبہ میں نے بھی

سوچا تھا لیکن اپنے خیال پر عمل کرنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ آج کی رات خیریت سے گزر جائے۔ کل بارش رکی تو سب سے پہلے میں اس کے مکان کی چھت مرمت کرواؤں گا۔''

سعید نے کہا پھر دیوار پر لگے ہوئے کلاک کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''ارے، گیارہ بج گئے۔ باتوں میں وقت کا پتا ہی نہیں چلا۔ اب سو جانا چاہیے۔ صبح مال لینے کے لیے میوہ منڈی بھی جانا ہے۔''

انہیں بستر پر لیٹے ہوئے چند ہی منٹ گزرے تھے کہ سعید چونک کر اٹھ گیا۔ اسے یوں محسوس ہوا تھا جیسے کسی نے باہر کا دروازہ کھٹکھٹایا ہو۔ نرگس بھی اٹھ گئی۔ اسی لمحے دروازہ کھٹکھٹائے جانے کی آواز ایک بار پھر سنائی دی۔ تیسری مرتبہ بھی بارش کے شور میں کنڈی کھٹکھٹائے جانے کی آواز سنائی دے گئی تھی۔

''اللہ خیر کرے، اس وقت کون ہوسکتا ہے؟'' نرگس بڑبڑائی۔

''میں دیکھتا ہوں۔ مجھے اندیشہ ہے کہ کہیں سکینہ آپا کے مکان کی چھت نہ بیٹھ گئی ہو۔'' سعید کہتا ہوا کمرے کا دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔ نرگس کمبل اوڑھے چارپائی پر بیٹھی رہی۔ کمرے میں نائٹ بلب جل رہا تھا اور اس نے اٹھ کر تیز روشنی کا بلب جلانے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ بارش بہت شدت سے ہو رہی تھی۔ وہ اپنی چارپائی پر بیٹھی باہر تاریکی میں گھورتی رہی۔ اس دوران ایک بار پھر دروازہ کھٹکھٹایا گیا تھا جیسے کوئی بہت عجلت میں ہو۔

سعید نے جیسے ہی دروازہ کھولا دو سائے اس پر جھپٹ پڑے۔ سعید اس صورتِ حال کے لیے قطعی تیار نہیں تھا۔ وہ دونوں سائے، جن کے چہروں پر ڈھاٹے بندھے ہوئے تھے، سعید کو گھسیٹتے ہوئے صحن میں لے آئے۔ ایک نے جلدی سے دروازہ بند کر دیا اور پھر دونوں حملہ آور لاٹھیوں سے سعید پر وار کرنے لگے۔

سعید کی چیخوں کی آواز سن کر نرگس اچھل پڑی۔ اس نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا مگر تیز بارش اور تاریکی میں کچھ نظر نہیں آیا۔ وہ اٹھ کر دروازے کی طرف دوڑی۔ سعید کے چیخنے کی آوازیں بھی اس کے کانوں میں گونج رہی تھیں اور پھر اس نے ان دونوں سایوں کو دیکھ لیا جو زمین پر گرے ہوئے تیسرے سائے پر لاٹھیاں برسا رہے تھے۔ وہ سعید تھا جو لاٹھیوں سے بچنے کے لیے چیخ چیخ کر لوٹ رہا تھا۔

نرگس چیختی ہوئی اس طرف دوڑی۔ وہ جاتے ہی ایک حملہ آور سے لپٹ گئی۔ لیکن اس شخص نے اسے پیچھے دھکیل دیا اور اس پر بھی لاٹھیاں برسانے لگا۔ اس دوران سعید کو کچھ سنبھلنے کا موقع مل گیا تھا۔ اگرچہ وہ خاصا زخمی ہو چکا تھا مگر وہ اٹھ کر حملہ آور کا مقابلہ کرنے کی کوشش کرنے لگا۔

دوسری طرف نرگس بھی چیختے ہوئے دوسرے حملہ آور کا مقابلہ کر رہی تھی۔ لاٹھی کا ایک وار اس کے سر پر لگا تھا۔ سر پھٹ گیا اور خون بہنے لگا لیکن وہ مقابلہ کرتی رہی۔

چیخوں کی آواز سن کر فریدی کی آنکھ کھل گئی۔ وہ دوڑ کر کمرے سے باہر نکل آیا۔ کڑکتی ہوئی بجلی کی روشنی میں اس نے ان نقاب پوشوں کو دیکھ لیا جو اس کے ماں باپ پر لاٹھیوں سے حملے کر رہے تھے۔ وہ ان کی طرف دوڑا۔ وہ جیسے ہی قریب پہنچا ایک نقاب پوش نے اس پر بھی لاٹھی سے حملہ کر دیا۔ فریدی چیخ اٹھا اور دوڑتا ہوا مکان کا صحن عبور کر کے سیڑھیوں پر چڑھتا چلا گیا۔ چھت پر چھپنے کی کوئی جگہ نہیں تھی۔ البتہ سیڑھیوں کے اوپر چھوٹی سی چھت ایسی جگہ تھی جس پر لیٹ کر ان نقاب پوشوں سے چھپا جا سکتا تھا۔ وہ بڑی مشکل سے سیڑھیوں کی چھت پر چڑھ کر سینے کے بل لیٹ گیا۔ نقاب پوش کی لاٹھی اس کی کمر پر لگی تھی اور وہ شدید تکلیف محسوس کر رہا تھا۔ وہ چھت پر لیٹا موسلا دھار بارش میں بھیگتا رہا یہاں سے وہ صحن میں صاف دیکھ سکتا تھا۔ نقاب پوش اس کے ماں باپ پر لاٹھیاں برسا رہے تھے پھر بجلی کی چمک میں اس نے ایک نقاب پوش کے ہاتھ میں چمکتا ہوا خنجر دیکھ لیا۔

نقاب پوش نے نرگس کے سینے اور پیٹ پر کئی وار کیے۔ وہ چیختی ہوئی ڈھیر ہو گئی۔ اس کا خون بارش کے پانی میں بہنے لگا۔ خنجر بردار نقاب پوش اب سعید پر خنجر سے حملے کر رہا تھا۔ چند منٹ میں سعید بھی ڈھیر ہو گیا۔

فریدی سیڑھیوں کی چھت پر لیٹا بار بار چمکتی ہوئی بجلی کی روشنی میں یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ اس نے اپنی چیخیں روکنے کے لیے ایک ہاتھ سے اپنا منہ سختی سے دبا رکھا تھا۔

''اب یہ دونوں ختم ہو گئے ہیں بالے، اس سنپولیے کو دیکھو...... وہ سیڑھیوں پر گیا تھا۔ میرا خیال ہے کہ وہ چھت پر ہی کہیں چھپا ہوا ہوگا۔'' ایک نقاب پوش نے کہا۔

''چلو...... وہ کہیں بھاگ نہ جائے۔'' دوسرے نے کہا اور وہ دونوں سیڑھیوں کی طرف دوڑے...... چھت پر پہنچ کر وہ اِدھر اُدھر دیکھنے لگے مگر چھت سپاٹ تھی۔

''بالے! وہ کم بخت تو یہاں نہیں ہے۔'' پہلے نقاب پوش نے کہا

''میرا خیال ہے وہ ساتھ والی چھت پر کود کر کہیں

بھاگ گیا ہوگا۔'' دوسرے نقاب پوش نے کہا جسے بالے کے نام سے مخاطب کیا گیا تھا۔ ''چلو چھٹی ہوئی...... اب وہ کبھی اس طرف نہیں آئے گا۔ وکیل صاحب کا راستہ صاف ہو گیا۔''

فریدی سیڑھیوں کی چھت پر لیٹا یہ سب کچھ سن رہا تھا۔ وہ ہاتھ سے منہ کو دبائے رہا۔ وہ دونوں نقاب پوش سیڑھیوں میں غائب ہو گئے۔ پھر وہ وسیع و عریض صحن میں نظر آئے۔ چند لمحوں کو دونوں لاشوں کے قریب رکے اور پھر باہر کا دروازہ کھول کر غائب ہو گئے۔

فریدی چھت سے اتر کر صحن میں آ گیا۔ وہ موسلا دھار بارش میں بھیگتا ہوا اپنے ماں باپ کی لاشوں کے قریب آ گیا۔ چمکتی ہوئی بجلی کی روشنی میں خون میں لت پت لاشیں دیکھ کر اس کے منہ سے بے اختیار چیخ نکل گئی۔ وہ دیر تک ماں اور باپ کی لاش سے لپٹ کر روتا رہا۔ پھر اس نے چیخنا شروع کر دیا۔ لیکن موسلا دھار بارش کے شور، بجلی کی کڑک اور بادلوں کی گھن گرج میں اس کی چیخوں کی آواز مکان کی چار دیواری سے باہر نہیں نکل سکی۔ وہ ایک بار پھر ماں باپ کی لاشوں سے لپٹ کر روتا رہا۔ پھر وہاں سے اٹھ کر برآمدے میں آ گیا اور ستون سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ اس نے جو کچھ دیکھا تھا وہ انتہائی خوفناک تھا۔ اس نے اپنی آنکھوں کے سامنے اپنے ماں باپ کو بیدردی سے قتل ہوتے دیکھا تھا۔ یہ خوفناک منظر کسی بھی شخص کو پاگل کر دینے کے لیے کافی تھا مگر فریدی پاگل نہیں ہوا۔ وہ برآمدے کے ستون سے ٹیک لگائے بیٹھا ہچکیوں اور سسکیوں سے روتا رہا۔ اس کا لباس پانی میں تر ہو رہا تھا۔ سردی سے اس کا جسم ہولے ہولے کانپ رہا تھا۔ دانت بج رہے تھے۔ اس میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ اٹھ کر کمرے میں چلا جاتا۔ وہ اسی جگہ بیٹھا رات بھر ٹھٹھرتا، کانپتا اور روتا رہا اور بارش ہوتی رہی، بجلی چمکتی رہی اور بادل گرجتے رہے۔

صبح چھ بجے کے قریب بارش بند ہو گئی۔ فریدی برآمدے کے فرش پر پڑا تھا۔ وہ سو گیا۔ لیکن منہ سے ہلکی ہلکی کراہیں خارج ہو رہی تھیں۔ جب باہر کے دروازے کا کنڈا کھٹکھٹایا جانے لگا تو اس وقت بھی فریدی کی آنکھ نہیں کھلی۔

وہ سکینہ آپا تھی جو صبح سویرے بارش بند ہوتے ہی ان لوگوں کی خیریت دریافت کرنے چلی آئی تھی۔ وہ دیر تک کنڈا کھٹکھٹاتی رہی لیکن جب کوئی جواب نہیں ملا تو اس نے دروازے کو آہستہ سے دھکا دیا۔ دروازہ کھل گیا۔ دروازہ اس طرح کھل جانے پر اسے حیرت بالکل نہیں ہوئی تھی۔ سعید اکثر صبح سویرے میوہ منڈی چلا جایا کرتا تھا۔ وہ عام طور پر باہر سے کنڈا لگا دیا کرتا تھا لیکن آج شاید وہ کنڈا لگانا بھول گیا تھا۔ سکینہ آپا یہی سوچتی ہوئی اندر آ گئی۔

آسمان پر سیاہ بادل تھے۔ دن کی روشنی بھی پوری طرح طلوع نہیں ہو پائی تھی۔ ملگجا سا اجالا تھا اس لیے سکینہ آپا دروازے میں داخل ہوتے ہی وہ خوفناک منظر نہیں دیکھ پائی تھی لیکن چند قدم آگے بڑھتے ہی وہ ٹھٹک کر رک گئی۔ اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ اس نے جھک کر باری باری سعید اور نرگس کی لاشوں کو دیکھا اور پھر سیدھی ہو کر ہسٹریائی انداز میں چیخنے لگی۔

اس وقت گلی میں لوگوں کی تھوڑی بہت آمد و رفت شروع ہو چکی تھی۔ سکینہ کی چیخوں کی آوازیں سن کر لوگ اندر آ گئے اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے مکان کے صحن میں اور گلی میں ہجوم لگ گیا۔ اس دوران سکینہ برآمدے کی طرف آئی تو وہاں فریدی کو پڑے دیکھ کر اس کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ سکینہ نے اسے بری طرح جھنجوڑ ڈالا مگر فریدی نے آنکھیں نہیں کھولیں۔ وہ مدہوشی میں نجانے کیا بڑبڑا رہا تھا۔ سکینہ نے اس کی پیشانی پر ہاتھ رکھا تو اچھل پڑی۔ وہ تیز بخار میں پھنک رہا تھا۔ سکینہ نے اسے اٹھانا چاہا مگر کامیاب نہ ہو سکی۔ اس نے صحن میں موجود محلے کے ایک آدمی کو بلا لیا اور پھر دونوں نے مل کر اسے اٹھایا تو فریدی کی گود میں پڑا ہوا خون آلود خنجر فرش پر گر گیا۔ خنجر دیکھ کر سکینہ اور وہ آدمی چونک گئے۔ اس وقت فریدی بھی تھوڑی دیر کے لیے ہوش میں آ گیا۔

''مم...... مجھے کہاں...... لے جا رہے ہو...... چھوڑ دو مجھے......'' وہ بڑبڑایا۔

''ہوش کرو فریدی...... یہ خنجر تمہارے پاس کہاں سے آیا...... یہ کیا کیا تم نے......؟'' محلے کے آدمی نے اسے جھنجوڑا۔

''خنجر......'' فریدی بڑبڑایا۔ ''خنجر...... مجھے دے دو...... میں ماردوں...... گا ان دونوں کو...... قتل کر دوں گا۔''

''اسے اندر لے چلو...... تیز بخار میں جانے کیا کیا ہذیان بک رہا ہے۔'' سکینہ بولی۔

وہ اسے کمرے میں لے آئے۔ کرسی پر فریدی کے وہ کپڑے پڑے ہوئے تھے جو اس نے شام کو بدلے تھے۔ وہ کپڑے سوکھے ہوئے تھے۔ سکینہ نے اس آدمی کی مدد سے فریدی کے کپڑے بدلے اور اسے چارپائی پر لٹا کر دو تین کمبل اوڑھا دیے۔ اس کے باوجود فریدی تھر تھر کانپ

رہا تھا۔

پولیس ایک گھنٹے بعد پہنچی۔ مزید ایک گھنٹا کارروائی میں لگ گیا اور پھر ان دونوں لاشوں کے ساتھ فریدی کو بھی میو اسپتال پہنچا دیا گیا۔ فریدی کو نمونیا ہو گیا تھا۔ اسے فوری طور پر ٹریٹمنٹ دیا جانے لگا۔

پولیس نے وہ خنجر بھی اپنے قبضے میں لے لیا تھا۔ ابتدائی تفتیش سے یہ ثابت ہو گیا کہ یہ ڈکیتی وغیرہ کی واردات نہیں تھی۔ کیونکہ گھر کے کمروں میں سے کسی چیز کو نہیں چھیڑا گیا تھا۔ کپڑے کی ایک تھیلی میں وہ رقم بھی جوں کی توں آتشدان کے کارنس پر موجود تھی جو غالباً سعید نے صبح منڈی لے جانے کے لیے رات کو وہاں رکھی تھی۔ ہر چیز اپنی جگہ جوں کی توں موجود تھی۔ کسی کمرے میں کسی قسم کی افراتفری کے آثار نظر نہیں آئے۔ جو کچھ بھی ہوا تھا صحن ہی میں ہوا تھا۔ پولیس نے نامعلوم قاتلوں کے خلاف مقدمہ درج کر لیا تھا اور یہ اندیشہ ظاہر کیا تھا کہ یہ ذاتی دشمنی کا شاخسانہ ہو سکتا ہے۔

چند روز بعد فریدی کو اسپتال سے چھٹی مل گئی۔ سکینہ اسے اپنے گھر لے آئی۔ اسپتال میں بھی اس کی دیکھ بھال وہی کرتی رہی تھی اور ابھی اسے دیکھ بھال کی ضرورت تھی۔

کئی روز تک اس وحشیانہ دہرے قتل کی یہ واردات لوگوں کا موضوع گفتگو بنی رہی پھر لوگ بتدریج اسے بھولتے چلے گئے۔ لیکن ایک شخص ایسا بھی تھا جو اس واردات کو نہیں بھولا تھا۔ وہ سعید کا پڑوسی وکیل اسلام الدین تھا۔ وہ اس واردات کو کوئی اور ہی رنگ دینے کی کوشش کر رہا تھا۔ چند ہی روز بعد محلے کے ایک شخص نذیر سے ملاقات میں باتوں کے دوران انکشاف ہوا کہ فریدی کو جب نیم بے ہوشی کی حالت میں برآمدے سے اٹھایا گیا تھا تو اس کے پاس ایک خون آلود خنجر بھی موجود تھا اور اس نے بڑبڑاتے ہوئے کہا تھا کہ میں ان دونوں کو قتل کر دوں گا۔

سازشی ذہن کو ایک نیا راستہ مل گیا۔ وکیل اسلام الدین نے فوراً ہی پولیس سے رابطہ قائم کیا اور انہیں تفتیش کی ایک نئی راہ دکھا دی۔ سعید سے مکان کے جھگڑے کی وجہ سے قتل کی واردات کے بعد پولیس نے اس وکیل کو بھی شامل تفتیش کر لیا تھا لیکن اس نے یہ ثابت کر دیا تھا کہ اس روز ایک مقدمے کی پیروی کے سلسلے میں وہ قصور گیا ہوا تھا۔ اور اس نے وہ رات بھی قصور میں اپنے موکل کے گھر پر گزاری تھی۔ دوسرے دن دوپہر کو واپس آیا تو اسے سعید اور اس کی بیوی کے قتل کا پتا چلا تھا اور اب وہ پولیس کو یہ باور کرانے کی کوشش کر رہا تھا کہ سعید اور نرگس کو ان کے بیٹے فریدی ہی نے قتل کیا تھا۔ اس نے نذیر نامی اس شخص کو بھی پولیس کے سامنے پیش کر دیا تھا جس نے فریدی کے پاس خون آلود خنجر کی موجودگی کا انکشاف کیا تھا۔ پولیس نے سکینہ سے بھی اس سلسلے میں پوچھ گچھ کی۔ اس نے یہ اعتراف کر لیا کہ جب وہ نذیر کی مدد سے فریدی کو برآمدے سے اٹھانے لگی تھی تو خون آلود خنجر اس کی گود سے گرا تھا اور اس نے مدہوشی میں بڑبڑاتے ہوئے یہ بھی کہا تھا کہ خنجر مجھے دے دو۔ میں ان دونوں کو قتل کر دوں گا لیکن سکینہ نے یہ بھی کہا کہ فریدی اس وقت بخار میں تپ رہا تھا اور اس پر غشی کی سی کیفیت طاری تھی۔ اس حالت میں اس کے منہ سے نکلی ہوئی کسی بات کا یقین نہیں کیا جا سکتا۔

خنجر پر فریدی کی انگلیوں کے نشانات مل گئے۔ پولیس نے فریدی کو اپنے ماں باپ کے قتل کے الزام میں گرفتار کر لیا۔ فریدی رو رو کر اپنی بے گناہی کا یقین دلانے کی کوشش کرتا رہا۔ اس رات ہونے والے سانحے کی رُوداد بیان کرتا رہا مگر وکیل اسلام الدین اسے قاتل ثابت کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہا تھا۔ اس کے پاس ذرائع تھے۔ وسائل تھے۔ اس کے ہاتھ بہت لمبے تھے۔ فریدی کے پاس کچھ نہیں تھا۔ سکینہ اس کے لیے بھاگ دوڑ کرتی رہی مگر...... تمام شہادتیں فریدی کے خلاف تھیں اور بالآخر باطل قوتیں غالب آگئیں۔ مظلومیت اور سچائی کا سر جھک گیا۔ فریدی کو عدالت سے پندرہ سال کی سزا ہو گئی اور اسے کوٹ لکھپت جیل کی آہنی سلاخوں کے پیچھے پہنچا دیا گیا۔

سکینہ اس دنیا میں واحد ہستی تھی جسے فریدی کی بے گناہی کا یقین تھا۔ اسے یہ بھی یقین تھا کہ یہ سب کچھ وکیل اسلام الدین کا کیا دھرا ہے۔ وہ انتہائی کمینہ اور گھٹیا ذہن کا مالک تھا۔ اس نے سعید کے مکان پر قبضہ کرنے کے لیے جو گھناؤنی سازش تیار کی تھی، وہ سو فیصد کامیاب رہی تھی۔ اس نے نہ صرف سعید اور نرگس کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے راستے سے ہٹا دیا تھا بلکہ ان کے بیٹے کو بھی ان کا قاتل ثابت کر کے ایک طویل عرصے کے لیے جیل بھجوا دیا تھا۔

سکینہ ہی وہ واحد ہستی تھی جو فریدی سے ملاقات کے لیے مہینے میں دو مرتبہ باقاعدگی سے جیل آتی رہی۔ وہ اس کے لیے ہمیشہ کچھ نہ کچھ لے کر آتی۔ کبھی اس کی بیٹی رخشندہ بھی اس کے ساتھ ہوتی۔ جیل کی آہنی سلاخوں کے پیچھے بند فریدی اکثر سوچتا کہ اگر اسے ان ماں بیٹی کا سہارا نہ ہوتا تو

شاید وہ جیل کی محبوس فضا میں دم گھٹ کر مر جاتا۔

سکینہ نے یہ عقلمندی بھی کی تھی کہ بھاٹی گیٹ والی سعید کی دکان کرائے پر دے دی تھی۔ اور اس کا کرایہ فریدی کے نام سے بینک اکاؤنٹ میں جمع کرواتی رہی تھی۔

اور پھر ایک روز سکینہ جب ملاقات کے لیے آئی تو اس نے یہ سنسنی خیز انکشاف کیا کہ عدالت کے فیصلے کے مطابق مکان وکیل اسلام الدین کو مل گیا ہے اور اس نے مکان پر قبضہ کر کے سامان سکینہ کے حوالے کر دیا ہے۔ یہ خبر فریدی کے لیے بم کے دھماکے سے کم نہیں تھی لیکن اس نے بڑے صبر سے اس صدمے کو برداشت کر لیا۔

فریدی نے جیل میں بھی اپنی تعلیم کا سلسلہ جاری رکھا۔ جیل میں اس کے قابل تعریف چال چلن اور تعلیم میں دلچسپی کی بنا پر اسے کچھ سہولتیں بھی فراہم کی گئی تھیں۔ اس کے کردار کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس کی سزا میں بھی تخفیف ہو رہی تھی۔

اسے عدالت سے پندرہ سال کی سزا ہوئی تھی مگر مثالی کردار اور تعلیمی سرگرمیوں کی وجہ سے اس کی سزا کے پانچ سال معاف ہو گئے۔ دس سال بعد جب وہ کوٹ لکھپت جیل کے گیٹ سے باہر نکلا تو وہ بائیس سال کا ایک گبرو جوان تھا۔ اس کے ہاتھ میں پکڑے ہوئے خاکی کاغذ کے ایک بڑے سے لفافے میں اس کی میٹرک، انٹر اور بی اے کی ڈگریاں تھیں۔ اس نے ہر امتحان فرسٹ کلاس پوزیشن میں پاس کیا تھا۔

سکینہ اور اس کی بیٹی رخشندہ اس کے استقبال کے لیے جیل کے باہر موجود تھیں۔ رخشندہ جوان ہو گئی تھی۔ اس کے بے مثال حسن کو دیکھ کر بے اختیار دل دھڑ کنے لگتا تھا۔ اس نے ایف اے کر لیا تھا اور اب سی ٹی کا کورس کر رہی تھی۔ اس نے بچپن ہی سے استانی بننے کا خواب دیکھا تھا اور اب کچھ ہی عرصے بعد اسے اپنے خواب کی تعبیر ملنے والی تھی۔

سکینہ، فریدی کو اپنے گھر لے آئی تھی۔ اپنے مکان کے سامنے سے گزرتے ہوئے فریدی ایک لمحے کو رکا۔ دروازے پر اسلام الدین ایڈووکیٹ کی نیم پلیٹ دیکھ کر اس کا خون کھول اٹھا تھا۔ اس طوفانی رات کا منظر اس کی نظروں کے سامنے گھوم گیا جب اس کے ماں باپ کو اس کی آنکھوں کے سامنے بے دردی سے قتل کیا گیا تھا۔ وہ چند لمحے اس نیم پلیٹ کی طرف دیکھتا رہا پھر اس نے بے اختیار دروازے کی طرف قدم بڑھا دیا۔ سکینہ اور رخشندہ اس کے چہرے کے تاثرات دیکھ کر سہم گئیں۔ ان دونوں نے اسے بانہوں سے پکڑ لیا اور تقریباً کھینچتی ہوئی آگے لے جانے لگیں۔

''میں تمہارے جذبات سمجھ رہی ہوں بیٹا، لیکن...... ابھی کچھ کرنے کا وقت نہیں آیا۔ لیکن یقین رکھو کہ ایک دن ایسا ضرور آئے گا جب مکان تمہارا ہوگا اور تم اپنے ماں باپ کے قتل کا بدلہ لے سکو گے۔''

''اسی دن کے انتظار میں تو میں نے جیل میں دن اور راتیں گن گن کر گزاری ہیں۔'' فریدی نے جواب دیا اور اپنے ہاتھ چھڑا کر خاموشی سے ان کے ساتھ چلنے لگا۔

محلے کے لوگوں کو یہ معلوم نہیں تھا کہ فریدی آج رہا ہونے والا ہے۔ اگر کسی کو معلوم بھی تھا تو وہ اسے سکینہ کے ساتھ دیکھ کر پہچان نہیں سکے تھے۔ اب وہ بارہ سال کا بچہ نہیں ایک بھرپور جوان تھا۔ اس کے چہرے میں بھی بہت سی تبدیلیاں آ چکی تھیں۔ بھاری مونچھوں نے اسے خاصا پُر وقار اور بارعب بنا دیا تھا۔

فریدی تقریباً ایک ہفتے تک گھر سے باہر نہیں نکلا۔ سکینہ اور رخشندہ اس کی ہر ضرورت کا خیال رکھتیں۔ رخشندہ کو اپنے قریب پا کر فریدی بعض اوقات کچھ عجیب سی کیفیت محسوس کرنے لگتا۔

ایک روز صبح ناشتے کے بعد سکینہ نے خاکی کاغذ کا ایک بڑا بوسیدہ سا لفافہ اس کے سامنے رکھ دیا۔

''یہ لو بیٹا...... سنبھالو اپنی امانت...... اور میرا خیال ہے اب تم کوئی کام دھندا شروع کر دو، اس طرح گھر میں پڑے پڑے اور سوچتے سوچتے بیمار ہو جاؤ گے۔''

''یہ کیا ہے اماں؟'' فریدی نے لفافے کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''بیٹا!'' سکینہ نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''تمہارے جیل جانے کے بعد تمہارے ابا کی دکان میں نے کرائے پر دے دی تھی اور کرایہ ہر مہینے تمہارے نام سے بینک میں جمع کرواتی رہی تھی۔ یہ بینک کی رسیدیں اور دوسرے تمام کاغذات ہیں۔ انہیں دیکھ لو...... آج تم بینک جا کر منیجر سے مل لو۔ تاکہ تمہیں یہ رقم نکلوانے میں آسانی رہے۔ میں نے دکان کے کرائے دار سے بھی بات کر لی ہے۔ وہ بھی اس دکان پر پھلوں ہی کا کاروبار کرتا ہے۔ وہ ایک ہفتے میں دکان خالی کر دے گا۔ میں تو کہتی ہوں کہ تم بھی کاروبار شروع کر دو۔ دکان بھی بڑے موقع کی ہے۔ گاہکوں کی رونق لگی رہتی ہے۔''

''ٹھیک ہے اماں، لیکن کیا کرائے دار واقعی ایک ہفتے میں دکان خالی کر دے گا؟'' فریدی نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

''ہاں بیٹا، وہ کہتا ہے کہ اس کی ایک دکان لکشمی چوک پر بھی ہے جہاں اس کا چھوٹا بھائی بیٹھتا ہے لیکن وہ ٹھیک سے دکان کو سنبھال نہیں پا رہا۔ سراج یہ دکان چھوڑ کر وہاں چلا جائے گا۔''

''سراج کون ہے؟'' فریدی نے پوچھا۔

''وہی اپنا کرائے دار۔'' سکینہ نے جواب دیا۔

''اچھا۔'' فریدی نے کہا پھر وہ لفافہ سکینہ کی طرف بڑھا دیا۔ ''یہ رکھ لو اماں، فی الحال مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے۔''

''ضرورت کیوں نہیں ہے۔ کیا کوئی کام شروع نہیں کرنا؟'' سکینہ نے اسے گھورا۔

''میرے پاس پیسے ہیں۔'' فریدی نے جواب دیا۔

''تمہارے پاس پیسے کہاں سے آ گئے۔ کیا جیل میں بھی کوئی کاروبار کرتے رہے ہو؟''

''نہیں اماں۔'' فریدی بولا۔ ''جیل میں قیدیوں سے کام لیا جاتا ہے تو اس کا معاوضہ اس کے حساب میں جمع ہوتا رہتا ہے جب قیدی سزا پوری کر کے جیل سے نکلتا ہے تو یہ رقم اسے دے دی جاتی ہے تاکہ وہ کوئی کاروبار شروع کر کے باعزت زندگی گزار سکے۔ مجھے بھی اتنی رقم مل گئی ہے کہ میں دکان پر پھلوں کا کاروبار تو شروع کر ہی سکتا ہوں۔''

''ٹھیک ہے بیٹا، جیسے تمہاری مرضی۔'' سکینہ نے سر ہلا دیا۔

فریدی کے پاس واقعی اتنی رقم موجود تھی، وہ کاروبار نہایت آسانی سے شروع کر سکتا تھا۔ سکینہ نے اس کی عدم موجودگی میں اس کے نام سے بینک میں جو رقم جمع کرائی تھی۔ اس رقم کے بارے میں فریدی نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ اسے رخشندہ کے اکاؤنٹ میں جمع کروا دے گا۔

اگلے ہفتے حسب وعدہ سراج نے دکان خالی کر دی۔ دو تین دن صفائی ستھرائی اور رنگ روغن میں لگ گئے اور پھر فریدی نے وہاں پھلوں کا کاروبار شروع کر دیا۔

دو دن کی دکان داری میں فریدی نے ایک عجیب سی بات محسوس کی تھی۔ اس دوران بعض گاہک ایسے بھی آئے تھے جو وہاں کھڑے ہو کر بڑی محتاط نگاہوں سے کبھی ادھر اُدھر دیکھتے اور کبھی عجیب سی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھنے لگتے۔ ان لوگوں کی آنکھوں اور چہروں پر عجیب سی پریشانی اور ویرانی پائی جاتی تھی۔ ایسے گاہک کوئی پھل خریدے بغیر وہاں سے چلے گئے تھے اور فریدی کے خیال میں ان میں کوئی بھی گاہک ایسا نہیں تھا جو ایک پاؤ امرود بھی خرید سکتا ہو۔ تیسرے دن ایسے ہی ایک گاہک نے اس کی طرف سو کا نوٹ بڑھاتے ہوئے بڑی رازداری سے روا مانگا تھا۔

''روا!'' فریدی نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ ''تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے نا بھائی! روا پرچون کی دکان پر ملتا ہے اور یہ پھلوں کی دکان ہے، پھل کھاؤ، جان بناؤ۔''

''نہیں مجھے روا چاہیے۔'' مریل سے گاہک نے کہا۔ اس کی آنکھوں سے عجیب سی ویرانی جھانک رہی تھی۔

''تو پھر پرچون کی دکان پر چلے جاؤ بھائی۔ یہ پھلوں کی دکان ہے۔'' فریدی بولا۔

''مجھے بھی معلوم ہے کہ یہ پھلوں کی دکان ہے اور میں پچھلے ایک سال سے یہیں سے روا خریدتا رہا ہوں..... مجھے بتاؤ ساجھا کہاں ہے؟''

''ساجھا یہ دکان چھوڑ کر جا چکا ہے، وہ تمہیں لکشمی چوک پر ملے گا۔'' فریدی نے کہا۔

''دیکھ میرے بھائی..... میرے باپ..... مجھے کل سے کچھ نہیں ملا..... میں کسی کو نہیں بتاؤں گا۔ روا دے دو نا..... میں..... میں بہت پریشان ہوں۔'' وہ شخص منت سماجت پر اتر آیا۔

فریدی گہری نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔ اسے اس شخص کی دماغی صحت پر شبہ ہونے لگا تھا۔ پہلے تو وہ شخص پھلوں کی دکان سے روا خریدنے پر بضد تھا اور اس کا کہنا تھا کہ وہ پچھلے ایک سال سے اسی دکان سے روا خریدتا رہا ہے۔ اس نے ساجھے (سراج) کا نام بھی لیا تھا اور اب منت سماجت کر رہا تھا کہ اسے روا دے دیا جائے۔ اسے کل سے کچھ نہیں ملا۔ فریدی بڑی مشکل سے اس نیم پاگل شخص کو وہاں سے بھگانے میں کامیاب ہو سکا تھا۔ اس کے جانے کے بعد وہ بہت دیر تک سوچتا رہا کہ کیا سراج اپنی پھلوں کی دکان پر روا بھی بیچتا رہا ہے۔ اسے پھلوں کی دکان پر روا بیچنے کی کوئی تک سمجھ میں نہیں آئی تھی پھر دفعتاً اس کی نظروں میں ان گاہکوں کے چہرے ابھر آئے جو اس کی دکان پر کھڑے عجیب سی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتے رہے تھے پھر کچھ خریدے بغیر چلے گئے تھے۔ فریدی اس معاملے میں جیسے جیسے سوچتا گیا، اس کا دماغ الجھتا گیا۔

اسی رات گیارہ بجے کے لگ بھگ جب فریدی دکان

بندہ کرنے کی سوچ رہا تھا کہ ایک اور آدمی آ گیا۔ لباس اور شکل سے وہ کوئی بھکاری ہی لگتا تھا۔ میلے کچیلے کپڑے، دبلا پتلا سا جسم، کئی دن کا بڑھا ہوا شیو، پچکے ہوئے رخسار اور اندر کو دھنسی ہوئی سرخ آنکھیں...... پیروں میں ہوائی چپل، ایک پیر کی چپل کا اسٹریپ سرخ تھا اور دوسری کا سفید۔

''کیا چاہیے؟'' فریدی نے گھورتی ہوئی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

اس شخص نے پہلے محتاط نگاہوں سے چاروں طرف دیکھا پھر قمیص کی جیب سے سو روپے کا نوٹ نکال کر اس کی طرف بڑھا دیا اور سرگوشیانہ لہجے میں بولا۔

''روا۔''

فریدی کا دماغ بھک سے اُڑ گیا۔ یہ دوسرا آدمی تھا جس نے اس سے روا مانگا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ نہ تو وہ شخص پاگل تھا جس نے پہلے روا مانگا تھا اور نہ ہی یہ شخص پاگل ہے جو اس کے سامنے کھڑا تھا۔ بھکاریوں جیسی حالت والے اس شخص کی آنکھوں کی سرخی بتا رہی تھی کہ وہ کسی قسم کا نشہ کرنے کا عادی ہے۔

نشہ کا لفظ ذہن میں آتے ہی اس کے دماغ میں جھماکا سا ہوا اور اس نے اپنے سامنے کھڑے ہوئے بھکاری نما شخص کا ہاتھ پکڑ لیا۔

''یہ روا کیا ہوتا ہے، سچ بتاؤ ورنہ میں تمہارا یہ ہاتھ توڑ دوں گا۔'' اس نے اس شخص کی کلائی کو ذرا سا دبایا۔

اس شخص کے چہرے پر کرب کے تاثرات ابھر آئے۔ وہ اپنا ہاتھ چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے ویران سی نظروں سے فریدی کی طرف دیکھنے لگا۔

''بتاؤ...... ورنہ تمہارا ہاتھ توڑ دوں گا۔'' فریدی کے حلق سے غراہٹ سی نکلی۔

''آپ کو نہیں معلوم کہ روا کیا ہوتا ہے، سا جھ کو تو پتا ہے۔ ہم اسی سے روا لیتے ہیں۔'' اس شخص نے جواب دیا۔

''مگر یہ روا ہے کیا؟'' فریدی جھنجلا گیا۔

''ہیروئن کو کہتے ہیں جی......'' اس شخص نے جواب دیا۔

''ہیروئن۔'' فریدی کا دماغ بھک سے اُڑ گیا۔ اب ساری بات اس کی سمجھ میں آ گئی تھی۔ سراج پھلوں کی دکانداری کی آڑ میں ہیروئن فروخت کرتا تھا۔ اس کا تعلق منشیات فروشوں کے گروہ سے تھا اور یہ دکان اس علاقے میں منشیات فروشی کے اڈے کا کام دے رہی تھی۔ اس نے دکان خالی کرنے کے لیے ایک ہفتے کی مہلت اسی لیے مانگی تھی کہ اپنے گاہکوں کو نئے اڈے کے بارے میں بتا سکے جن گاہکوں کو معلوم نہیں ہو سکا تھا وہ اب آ رہے تھے۔

''دیکھو۔'' فریدی نے اس شخص کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ ''جو شخص تم لوگوں کے ہاتھ یہ زہر بیچا کرتا تھا، وہ یہاں سے جا چکا ہے۔ آئندہ تم بھی یہاں مت آنا۔ اگر تم یہ زہر کھا کر اپنی زندگی کا خاتمہ کرنا ہی چاہتے ہو تو کوئی اور جگہ تلاش کر لو۔ آئندہ اِدھر آئے تو میں تمہیں پولیس کے حوالے کر دوں گا، سمجھے؟''

''سمجھ گیا جی۔'' وہ شخص سو کا نوٹ جیب میں ڈال کر وہاں سے رخصت ہو گیا۔ فریدی اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس شخص کی چال میں لڑکھڑاہٹ صاف دکھائی ہو رہی تھی۔ شاید اس کا نشہ ٹوٹ رہا تھا۔

اس رات فریدی کو نیند نہیں آ سکی۔ یہ سوچ کر ہی وہ کانپ اٹھتا تھا کہ اس کے باپ کی قائم کردہ دکان میں منشیات فروشی کا اڈا کھلا ہوا تھا۔ اس دن سے لوگوں کو وہ زہر فروخت کیا جا رہا تھا جسے وہ بخوشی اپنی رگوں میں اتار رہے تھے۔ وہ اگرچہ دس سال جیل میں رہا تھا لیکن اخبارات کا باقاعدگی سے مطالعہ کرتا رہا تھا۔ ہیروئن کے بارے میں اس نے بہت کچھ پڑھا تھا۔ بعض بے حس اور بے ضمیر لوگ راتوں رات دولت مند بننے کے لیے نوجوان نسل کی رگوں میں یہ زہر گھول کر مفلوج بنا رہے تھے۔

کئی روز گزر گئے۔ روا خریدنے والے اِکّادُکّا گاہک فریدی کی دکان پر آتے رہے۔ اور پھر ایک روز ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس نے فریدی کی زندگی کا رخ بدل دیا۔ شام ہو چکی تھی۔ فریدی ایک خاتون گاہک کو پھل دے کر فارغ ہو رہا تھا کہ ایک آدمی اس کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے شال اوڑھ رکھی تھی اور اس کے دونوں ہاتھ شال میں چھپے ہوئے تھے۔ فریدی سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔ اس شخص نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے پلاسٹک کا سیاہ رنگ کا ایک پھولا ہوا شاپنگ بیگ اس کی طرف بڑھا دیا۔

''یہ تھیلا رکھ لو...... جیرے گجر نے بھیجا ہے تمہارے لیے۔'' اس شخص نے کہا۔

''اس میں کیا ہے اور جیرا گجر کون ہے؟'' فریدی نے اُلجھی ہوئی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

''تم جیرے گجر کو نہیں جانتے؟'' اس شخص نے حیرت کا مظاہرہ کیا۔ ''لیکن وہ تمہیں جانتا ہے۔ بڑا بادشاہ آدمی ہے۔ اس میں روا ہے۔ پُڑیوں کی صورت میں، ہر پُڑیا سو

"روا!" فریدی اچھل پڑا۔ "لیکن...... میں یہ کام نہیں کر سکتا۔ چلے جاؤ یہاں سے ورنہ تمہیں پولیس کے حوالے کر دوں گا۔"

"گری کھانے کی ضرورت نہیں بھائی میرے۔" اس شخص نے پُرسکون لہجے میں کہا۔ "یہاں پہلے ساجھا بیٹھا کرتا تھا۔ بڑا اہم اڈا تھا یہ ہمارا۔ روزانہ تیس پینتیس ہزار کا بزنس ہوتا تھا لیکن اس نے بے وقوفی کر دی اور اس بُڑھیا کے کہنے پر یہ اڈا چھوڑ دیا لیکن جیرا گجر یہ اڈا نہیں چھوڑنا چاہتا۔ تم پر اعتماد کرتے ہوئے اس نے پچاس ہزار روپے کا مال بھیج دیا ہے۔ اس میں سے دس فیصد تمہارا کمیشن ہوگا۔"

"کمیشن دس فیصد ہو یا سو فیصد۔ میں یہ گھناؤنا دھندا نہیں کروں گا۔ لے جاؤ یہاں سے۔ ورنہ میں تمہیں ابھی پولیس کے حوالے کر دوں گا۔" فریدی نے جواب دیا۔

"پولیس!" وہ شخص استہزائیہ انداز میں ہنسا۔ "اگر اس ملک کی پولیس فرض شناس اور دیانت دار ہوتی تو ہم جیسے لوگ بھی یہ گھناؤنے کاروبار کرنے کے بجائے محنت مزدوری کر کے حق حلال کی روزی کھا رہے ہوتے۔ تم پولیس کی فکر مت کرو۔ جیرے گجر کے ہاتھ بڑے ہی لمبے ہیں۔ بڑے بڑے پولیس افسر اس کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑے رہتے ہیں۔"

"تم جاتے ہو یا......"

"سوچ لو فریدی۔" اس شخص نے فریدی کی بات کاٹ دی۔ "اس کاروبار میں بڑا ہی پیسا ہے...... جیرا گجر جس پر مہربان ہو جاتا ہے نا...... وہ بس دولت ہی میں کھیلتا ہے اور پھر تمہیں اس بے ایمان وکیل سے اپنے باپ کا مکان بھی تو واپس لینا ہے۔ تمہارے سر پر جیرا گجر جیسے آدمی کا ہاتھ ہوگا تو ساری مشکلیں آسان ہو جائیں گی۔"

"میرے باپ کا مکان...... تم یہ سب کچھ کیسے جانتے ہو؟" فریدی چونک گیا۔

"جیرا گجر سب کچھ جانتا ہے۔ اگر تم اپنا مکان واپس......"

"دفع ہو جاؤ یہاں سے۔" فریدی چیخا۔ "میرے اندر ہمت ہوگی تو میں وہ مکان واپس لے لوں گا۔ لیکن اپنا جائز حق لینے کے لیے میں اس قسم کا غیر قانونی اور گھناؤنا دھندا نہیں کر سکتا۔"

"ایک بار پھر سوچ لو۔" وہ شخص بولا۔ "یہ اڈا جیرے گجر کے لیے بہت اہم ہے۔ انکار کی صورت میں تم اس کے عتاب کا شکار بھی ہو سکتے ہو۔"

"میں نے سوچ لیا ہے، تم یہاں سے چلے جاؤ۔" فریدی غرایا۔

وہ شخص چند لمحے اُسے ناگوار نگاہوں سے دیکھتا رہا پھر اس نے تھیلا شال میں چھپا لیا اور داتا دربار کی طرف جانے والی سڑک پر چل دیا۔

اس رات فریدی دکان بند کر کے گھر کی طرف جاتے ہوئے یہی سب کچھ سوچ رہا تھا کہ سڑک پار کرتے ہی دو آدمی اس کے دائیں بائیں چلنے لگے۔ ان دونوں نے چادریں اوڑھ رکھی تھیں۔ وہ دونوں چند قدم اس کے ساتھ ساتھ چلتے رہے پھر دائیں طرف والا آدمی فریدی کی طرف جھکتے ہوئے سرگوشیانہ لہجے میں بولا۔

"خاموشی سے ہمارے ساتھ چلتے رہو۔ اگر تم نے کوئی ہنگامہ کرنے کی کوشش کی تو گولی سے اُڑا دیے جاؤ گے۔ تانگوں کے اڈے کے قریب سفید رنگ کی ٹویوٹا کھڑی ہے۔ خاموشی سے چلتے ہوئے اس گاڑی میں بیٹھ جاؤ۔"

فریدی کو اپنے پہلو میں پستول یا ریوالور کی چبھن محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے دائیں بائیں گردن گھما کر باری باری دونوں کی طرف دیکھا۔ ان دونوں کے چہرے ان کے کردار کی عکاسی کر رہے تھے۔ اسے یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ اگر اس نے حکم عدولی کی تو اسے بے دریغ گولی مار دی جائے گی۔ اس کا دل شدت سے دھڑک رہا تھا۔

"میرے پاس زیادہ رقم نہیں ہے، اور میں......"

"ڈرو نہیں، ہمیں رقم کی ضرورت نہیں، ہم تو تمہیں کچھ دینا چاہتے ہیں۔ اگر ہمارے ساتھ تعاون کرو گے تو تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچایا جائے گا۔ بصورت دیگر......" اس شخص نے خاموش ہو کر اس کے پہلو پر پستول کا دباؤ بڑھا دیا۔

فریدی خاموشی سے اُن کے ساتھ چلنے لگا۔ اس کا دل خزاں رسیدہ پتے کی طرح کانپ رہا تھا۔ تانگوں کا اڈا چند قدم دور تھا۔ وہاں سڑک کے کنارے سفید رنگ اور غالباً نئے ماڈل کی ٹویوٹا کار کھڑی تھی جس کی اسٹیئرنگ سیٹ پر پہلے ہی سے ایک آدمی بیٹھا ہوا تھا۔ فریدی کے ساتھ آنے والوں میں سے ایک آدمی نے پچھلی نشست کا دروازہ کھول دیا۔ پہلے وہ خود اندر بیٹھا پھر فریدی کو ہاتھ سے پکڑ کر اندر کھینچ لیا۔ دوسرا آدمی اس کے ساتھ بیٹھ گیا۔ اس طرح فریدی ان دونوں کے بیچ سینڈوچ بن کر رہ گیا۔ اسٹیئرنگ کے سامنے بیٹھے ہوئے شخص نے ان کے بیٹھتے ہی انجن

اسٹارٹ کر دیا تھا، کسی کو کچھ کہنے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ گاڑی حرکت میں آکر ایک سڑک پر گھوم گئی۔ یہی سڑک کچھ آگے جا کر وسیع و عریض پارک کے قریب ایک شاندار سے علاقے میں آگئی۔

یہ بنگلوں پر مشتمل خوب صورت علاقہ تھا۔ یہاں بعض بنگلوں میں تجارتی کمپنیوں کے دفاتر بھی بنے ہوئے تھے۔ ٹویوٹا مختلف چھوٹی سڑکوں پر گھومتی ہوئی بالآخر ایک خوب صورت بنگلے کے گیٹ میں داخل ہو کر رک گئی۔

اس بنگلے کی تمام بتیاں روشن تھیں۔ برآمدے میں بھی ٹیوب لائٹ جل رہی تھی۔ وہ سیڑھیاں چڑھ کر جیسے ہی برآمدے کے دروازے کے سامنے پہنچے دروازہ خودبخود کھل گیا۔ دروازے کے دوسری طرف بڑی بڑی مونچھوں والا ایک لمبا تڑنگا آدمی کھڑا تھا جس نے ایک ہاتھ میں کلاشنکوف رائفل پکڑ رکھی تھی۔ غالباً اسی نے انہیں دیکھ کر دروازہ کھولا تھا۔

''بڑی دیر کر دی تم لوگوں نے۔ استاد دو تین مرتبہ تم لوگوں کو پوچھ چکا ہے۔'' اس شخص نے کہا۔

''ایسے کاموں میں دیر سویر تو ہو جاتی ہے بشیرے۔ یہ بتا استاد کس کمرے میں بیٹھا ہے۔'' فریدی کے ساتھ آنے والوں میں سے ایک نے کہا۔

''سامنے والے کمرے میں۔ جاؤ، اب اور دیر نہ کرو۔'' بشیرے نے جواب دیا۔

وہ دونوں فریدی کو لے کر ایک وسیع ہال سے گزرتے ہوئے سامنے والے کمرے کے سامنے آگئے۔ دروازہ جڑا ہوا تھا۔ ان میں سے ایک نے پہلے دروازے پر ہلکی سی دستک دی پھر دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گئے۔

یہ بھی ایک وسیع و عریض کمرا تھا۔ فرش پر دبیز قالین بچھا ہوا تھا۔ قیمتی صوفے قرینے سے سجے ہوئے تھے۔ سامنے والے صوفے پر دو آدمی بیٹھے تھے اور ایک درمیانی عمر کی عورت ساتھ والے سنگل صوفے پر بیٹھی ہوئی تھی۔ خاصی حسین تھی یا ممکن ہے اس کا یہ حسن میک اپ کا مرہونِ منت رہا ہو۔ وہ بڑے پُرسکون انداز میں سگریٹ کے کش لگا رہی تھی۔ دوسرے صوفے پر جو دو آدمی بیٹھے ہوئے تھے، ان میں سے ایک دبلا پتلا اور لمبے قد کا تھا۔ سر کے بالوں میں سفیدی نمایاں تھی۔ اس کی عمر پچاس کے لگ بھگ رہی ہو گی۔ دوسرا آدمی درمیانے قد اور قدرے بھاری بھرکم جسم کا مالک تھا۔ بھاری مونچھیں اور چہرے پر دونوں طرف زخموں کے نشانات نے اسے خاصا بھیانک بنا دیا تھا۔ اس نے

ٹرمپ کا آرڈر ہے..... یورپی ہو یا ایشیائی..... ہر مسلمان کے سامان کی بھرپور تلاشی لو! ہر چیز ادھیڑ ڈالو

شلوار قمیص پہن رکھی تھی۔ عمر چالیس کے لگ بھگ رہی ہو گی۔

''ہم تمہارے مہمان کو لے آئے ہیں استاد۔'' فریدی کے ساتھ آنے والوں میں سے ایک نے کہا۔

''بسم اللہ..... جی آیاں نوں.....'' شلوار قمیص والے شخص نے اٹھ کر بڑی گرم جوشی سے فریدی سے ہاتھ ملایا اور اسے ایک صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا پھر وہ اس عورت اور سوٹ والے کی طرف متوجہ ہو گیا۔

''آپ چلیں ملک جی..... آپ کی پیشکش میں بڑی کشش ہے۔ لیکن اپنے فیصلے سے آپ کو کل آگاہ کروں گا، آج رات مجھے سوچنے کا موقع دیں۔''

''آپ کو جو بھی فیصلہ کرنا ہو مجھے اس کی اطلاع صبح گیارہ بجے سے پہلے دے دیں کیونکہ دوپہر ایک بجے کی فلائٹ سے کراچی چلا جاؤں گا اور وہاں سے ہانگ کانگ۔ واپسی میں تقریباً دو ہفتے لگ جائیں گے اور میں چاہتا ہوں کہ یہ فیصلہ جانے سے پہلے ہو جائے تاکہ میں ہانگ کانگ میں بھی اس سلسلے میں کوئی بات کر سکوں۔'' نیلے سوٹ والے ملک جی نے اس سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔

''آپ کو صبح گیارہ بجے سے پہلے اطلاع مل جائے گی ملک جی۔'' استاد نے جواب دیا۔

ملک جی اور وہ عورت کمرے سے نکل گئے۔ استاد

اپنے آدمیوں کی طرف رخ کر کے بولا۔
"تم دونوں بھی باہر جا کر بیٹھو، کچھ کھاؤ پیو۔ میں ذرا اپنے یار سے بات کر لوں اور ہمارے لیے بھی کچھ کھانے پینے کو بھیج دو۔"
وہ دونوں باہر نکل گئے۔ استاد بے تکلفی سے فریدی کے ساتھ صوفے پر بیٹھ گیا۔ اس کا انداز ایسا تھا جیسے بچھڑے ہوئے کسی پرانے دوست سے ملا ہو۔ فریدی کا ذہن بری طرح الجھا ہوا تھا۔ وہ اتنا تو سمجھ گیا تھا کہ یہ کوئی اچھے لوگ نہیں ہیں۔ کسی کو گن پوائنٹ پر اغوا کرنا اچھے لوگوں کا کام نہیں ہوتا۔ لیکن اسے حیرت تھی کہ یہ شخص اس سے اتنا بے تکلف ہونے کی کوشش کیوں کر رہا ہے۔ وہ شخص اس سے اس کی جیل میں گزری ہوئی زندگی اس کے کاروبار اور اس کے مرحوم باپ کے بارے میں باتیں کرتا رہا۔ اس کا لہجہ ہمدردانہ تھا اور اندازہ ہوتا تھا کہ وہ اس کے بارے میں بہت کچھ جانتا ہے۔
اسی دوران ایک آدمی نے ان کے سامنے میز پر کھانا لگا دیا۔
"شروع کرو جی' انتظار کس بات کا ہے۔ یہ چرغہ لو، لکشمی سے منگوایا ہے۔" اس شخص نے فریدی کی طرف پلیٹ بڑھاتے ہوئے کہا۔
"لیکن چوہدری جی! مجھے پہلے یہ تو پتا چلے کہ آپ کون ہیں، مجھے یہاں کیوں لایا گیا ہے اور مجھے یہاں لانے کے لیے جو طریقہ استعمال کیا گیا ہے، وہ کسی طرح بھی شریفانہ نہیں کہا جا سکتا۔" فریدی بولا۔
"یہ میرے آدمیوں سے واقعی زیادتی ہوئی ہے۔ میں نے ان سے کہا تھا کہ تمہیں عزت و احترام سے یہاں لایا جائے۔ جیرا گجر کسی شریف آدمی کے ساتھ زیادتی برداشت نہیں کر سکتا۔ میں اپنے ان دونوں آدمیوں......"
"جیرا گجر......" فریدی ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور متوحش نگاہوں سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔
"آہو جی، آپ کا یہ خادم۔ جس نے آج آپ کو ایک تحفہ بھی بھیجا تھا مگر آپ نے وہ تحفہ قبول کرنے سے انکار کر دیا۔"
"اوہ! تو تم ہو وہ منشیات فروش...... جیرا گجر۔" فریدی نے اسے گھورا۔
"منشیات فروش نہیں۔ بیوپاری...... ترقی یافتہ ملکوں میں اسے بزنس کہا جاتا ہے۔" جیرا گجر نے کہا۔ "بڑا منافع بخش کاروبار ہے۔ آدمی راتوں رات امیر بن جاتا ہے۔

اس بزنس میں تھوڑا سا رسک ضرور ہے لیکن اوپر تعلقات اچھے ہوں تو......"
"لیکن میں تم سے کوئی تعلق نہیں رکھنا چاہتا۔" فریدی نے اس کی بات کاٹ دی۔ "نفرت ہے مجھے ایسے لوگوں سے جو نوجوان نسل کے خون میں یہ زہر گھول کر انہیں موت کے منہ میں دھکیل رہے ہیں۔ کیا تم لوگ بھول گئے ہو کہ یہ ملک کس طرح حاصل کیا تھا۔ اس کے لیے کتنی قربانیاں دی گئی تھیں۔ تم لوگ اپنے ذاتی مفاد کے لیے اس ملک کی بنیادیں کھوکھلی کر رہے ہو جو ابھی پوری طرح اپنے پیروں پر بھی کھڑا نہیں ہو سکا جس نوجوان نسل نے کل کو اس ملک کی باگ ڈور سنبھالنی ہے، اسے تم لوگوں نے اس زہر کا عادی بنا کر جسمانی اور ذہنی طور پر مفلوج کر دیا ہے۔ تم لوگوں کو ان معصوم نوجوانوں سے کوئی ہمدردی نہیں ہے جو اس لعنت کا شکار ہو کر سسک رہے ہیں۔ تمہیں اس ملک سے کوئی ہمدردی نہیں ہے۔"
"تم تو جذباتی ہو رہے ہو باؤ فریدی۔" جیرا نے معنی خیز انداز میں مسکراتے ہوئے کہا۔ "اس ملک سے مجھے بھی اتنی ہی محبت ہے جتنی تمہیں ہو سکتی ہے۔ جس طرح تم اپنا کاروبار کر رہے ہو اسی طرح ہمیں بھی اپنی پسند کا کاروبار کرنے کا حق حاصل ہے۔"
"لیکن نوجوانوں کو منشیات کا عادی بنا کر انہیں ذہنی اور جسمانی طور پر مفلوج کر دینا زیادتی ہے۔ ظلم ہے۔ تم کوئی اور شریفانہ کاروبار بھی کر سکتے ہو لیکن دولت کی ہوس نے تم لوگوں کو اندھا کر دیا ہے۔"
"بات یہ ہے باؤ فریدی۔" جیرا گجر نے اسے ایک بار پھر ٹوک دیا۔ "آدمی اسی بزنس میں پیسا لگاتا ہے جس میں اسے فائدے کی توقع ہو۔ میں گجر ہوں...... میرا دودھ کا کاروبار تھا۔ کئی بھینسیں پال رکھی تھیں میں نے۔ صبح سے رات تک ان بھینسوں کی سیوا کرتا پھر دکانوں پر دودھ سپلائی کرتا تھا مگر مجھے کیا ملتا تھا؟ میرے بچوں کے جسم پر نہ تو ڈھنگ کے کپڑے تھے اور نہ پیروں میں جوتے۔ میں قرض خواہوں سے منہ چھپائے پھرتا۔ میرے لیے عزت کی زندگی گزارنا مشکل ہو گیا تھا۔ میرے بچے گاؤں کے گورنمنٹ اسکول میں پڑھتے تھے۔ وہ ننگے پیر اسکول جاتے، کتابیں اور کاپیاں نہ ہونے کی وجہ سے آئے دن اسکول میں ان کی پٹائی ہوتی رہتی۔ لیکن آج میرے بچے کانونٹ اسکول میں تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ ایک نئی ہونڈا کار انہیں اسکول لانے لے جانے کے لیے مخصوص ہے۔ کل

وہ ہر چیز سے محروم تھے۔ آج ان کے پاس ہر چیز موجود ہے۔''

''کیا تمہارے بچے یہ جانتے ہیں کہ ان کا باپ منشیات فروش ہے۔ اس کا شمار ایسے لوگوں میں ہوتا ہے جنہیں دنیا نفرت کی نگاہوں سے دیکھتی ہے۔ وہ قانون کا مجرم ہے اور ان جیسے معصوم بچوں کو منشیات کی لعنت کا عادی بنا کر انہیں تباہی کی طرف دھکیل رہا ہے۔'' فریدی نے اسے گھورا۔

''میں نے تمہیں یہاں تقریر کرنے کے لیے نہیں بلایا باؤ فریدی۔'' جیرا نے ناگوار سے لہجے میں کہا۔

''تو پھر مجھے یہاں کیوں لایا گیا ہے، کیا چاہتے ہو مجھ سے؟'' فریدی بولا۔

''میں تمہارے بارے میں سب کچھ جانتا ہوں۔ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ وکیل اسلام الدین نے تمہارے ماں باپ کو قتل کروایا تھا اور پھر تمہیں اس دہرے قتل میں پھنسا کر جیل بھجوا دیا تھا۔ اس طرح اسے تمہارے باپ کے مکان پر قبضہ کرنے میں آسانی ہوگئی تھی۔ اسلام الدین بہت ہی کمینہ اور گھٹیا آدمی ہے۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ تم اس سے انتقام لینا چاہتے ہو۔ لیکن جب تک اپنے پلے کچھ نہ ہو دوسرے کی طرف انگلی بھی نہیں اٹھائی جاسکتی۔ اسلام الدین جیسے شخص سے انتقام لینے کے لیے طاقت چاہیے اور پیسے میں بڑی طاقت ہوتی ہے۔ میں جانتا ہوں تم ایک شریف نوجوان ہو۔ تم نے جیل میں بھی اپنی شرافت کا ایک شاندار ریکارڈ قائم کیا ہے اور شرافت کے یہ سرٹیفکیٹس تمہارے کسی کام نہیں آسکتے بلکہ یہ شرافت تو تمہیں اور بزدل بناتی چلی جائے گی۔ تم کسی کے سامنے سر نہیں اٹھا سکو گے۔ انتقام کیا لو گے...... میں تمہیں وہ طاقت اور قوت دینا چاہتا ہوں جو وکیل جیسے لوگوں کو تمہارے پیر چاٹنے پر مجبور کردے گی۔''

''لیکن...... تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟'' فریدی بولا۔

''تعاون۔'' جیرا مسکرا دیا۔ ''تم جیل میں تھے تو تمہاری دکان سراج کے باپ نے کرائے پر لی تھی۔ اس کا انتقال ہوگیا تو یہ دکان سراج نے سنبھال لی۔ سراج بھی ایک شریف آدمی ہے۔ ہمیں اس علاقے میں اپنے کاروبار کے لیے ایک اڈے کی ضرورت تھی۔ ہم نے بڑی مشکل سے اسے اپنے ساتھ مل کر کام کرنے پر آمادہ کرلیا۔ دو سال میں اس نے لاکھوں کمائے۔ سمن آباد میں کوٹھی بھی خرید لی۔ لیکن ہمیں بتائے بغیر اس نے دکان چھوڑ دی۔ یہ اس کی شرافت تھی کہ وہ بلا چون و چرا دکان خالی کرنے پر آمادہ ہوگیا۔ لیکن اس کی شرافت کی وجہ سے ہمیں روزانہ ہزاروں روپے کا نقصان اٹھانا پڑ رہا ہے۔ ہمارا وہ اڈا بہت کامیاب جارہا تھا لیکن اس کے ختم ہوجانے کی وجہ سے مخالف پارٹی کو اسی علاقے میں قدم جمانے کا موقع مل گیا۔ کوئی نیا اڈا بنانے میں ہمیں وقت لگے گا اور اس دوران ہماری مخالف پارٹی اس علاقے میں بزنس پر مکمل طور پر کامیاب ہوجائے گی۔ میں چاہتا ہوں کہ تمہاری دکان پر ہمارا اڈا قائم رہے۔ تم ہم سے تعاون کرو۔''

''لیکن...... اگر میں یہ کام نہ کرنا چاہوں تو......؟''

فریدی نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔

''کوئی فیصلہ کرنے میں جلد بازی کی ضرورت نہیں ہے۔'' جیرا مسکرایا۔ ''اپنے نفع نقصان کا اچھی طرح سوچ لو...... میں ایک دو دن بعد تم سے رابطہ ... کروں گا۔ مجھے یقین ہے کہ تم جو بھی فیصلہ کرو گے اپنے حق میں کرو گے۔''

جیرا چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر دروازے کی طرف منہ کرکے آواز لگائی۔ فریدی کو لانے والے دو آدمیوں میں سے ایک اندر آگیا۔ ''شیدے!'' جیرا اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''باؤ فریدی کو بھاٹی گیٹ چھوڑ آؤ۔''

فریدی، شیدے کے ساتھ کمرے سے نکل گیا۔

ٹویوٹا میں شیدا اسے بھاٹی گیٹ کے سامنے تانگوں کے اڈے کے قریب اتار کر چلا گیا۔ بھاٹی چوک پر اگرچہ اس وقت بھی کچھ رونق تھی لیکن بھاٹی کی اندرونی گلیوں میں سناٹا تھا۔ فریدی تنگ سی گلیوں میں چلتا ہوا سکینہ کے مکان کے سامنے پہنچ گیا۔ پہلی دستک پر ہی دروازہ کھل گیا۔ سکینہ بے حد پریشان اور بدحواس سی نظر آرہی تھی لیکن اسے دیکھتے ہی اس کے چہرے پر رونق سی آگئی۔

''کہاں چلے گئے تھے بیٹا۔ میں تو پریشان ہوگئی تھی۔ تین چار مرتبہ دکان کا چکر لگا چکی ہوں، ماجھے حلوائی نے بتایا تھا کہ تم گیارہ بجے دکان بند کرکے چلے گئے تھے۔ کہاں چلے گئے تھے تم......؟''

''ایسے ہی اماں......''

''شاید تم دربار چلے گئے تھے۔'' سکینہ نے خود ہی اپنے سوال کا جواب دے دیا۔ ''کہیں جانا ہو تو بتا دیا کرو بیٹا۔''

''ٹھیک ہے اماں، آئندہ بتا کر جایا کروں گا۔'' فریدی نے جواب دیا۔

''تم کمرے میں چلو، میں کھانا گرم کرکے لاتی ہوں، رخشندہ بھی تمہارا انتظار کرکے کچھ دیر پہلے کچھ کھائے بغیر ہی

سوگئی ہے۔'' سکینہ نے کہا۔

''مجھے بھوک نہیں ہے اماں، لیکن رخشندہ کو تم نے کھانا کھائے بغیر کیوں سونے دیا۔'' فریدی چلتے چلتے رک گیا۔

''میں سوئی نہیں، جاگ رہی ہوں۔ بھیا آ گئے ہیں۔ اب سکون سے سو جاؤں گی۔'' یہ آواز سن کر فریدی تیزی سے گھوم گیا۔ رخشندہ اپنے کمرے کے دروازے پر کھڑی مسکراتی ہوئی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

فریدی کی نظریں جھک گئیں۔ کتنی محبت تھی ان دونوں ماں بیٹی کو اس سے۔ کتنا خلوص تھا ان میں۔ وقت پر اس کے گھر نہ پہنچنے سے یہ دونوں کتنی پریشان ہو رہی تھیں۔

فریدی نے ان دونوں سے بھی جھوٹ بولا کہ وہ دربار چلا گیا تھا لیکن اس رات وہ سو نہیں سکا۔ وہ بستر پر کروٹیں بدلتا رہا، کبھی اٹھ کر ٹہلنے لگتا۔ جیرا گجر کی باتیں اس کے دماغ میں بگولوں کی طرح گردش کر رہی تھیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ وہ اسلام الدین سے نہ صرف اپنے ماں باپ کے قتل کا بدلا لینا چاہتا تھا بلکہ مکان بھی حاصل کرنا چاہتا تھا مگر اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا تھا کہ وہ موجودہ صورتِ حال میں اپنے آپ کو اسلام الدین کے سامنے بالکل بے بس محسوس کر رہا تھا۔ اس کے پاس نہ تو دولت تھی اور نہ ہی ایسے ذرائع جن پر بھروسا کرتے ہوئے وہ وکیل جیسے شخص پر ہاتھ ڈال سکتا۔ البتہ جیرا اسے ایک نئی راہ دکھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ یہ راہ خطرناک بھی تھی اور غیر قانونی بھی۔ وہ خطرے سے نہیں گھبراتا تھا مگر وہ موت کا سوداگر نہیں بننا چاہتا تھا۔ اپنے ذاتی مفاد کی خاطر بے گناہ اور معصوم زندگیوں سے نہیں کھیلنا چاہتا تھا۔

صبح جب فجر کی اذان ہوئی تو فریدی اس فیصلے پر پہنچ چکا تھا کہ وہ جیرا کی پیشکش قبول نہیں کرے گا۔ یہ فیصلہ کر کے اسے اطمینان سا ہو گیا۔

تقریباً پندرہ منٹ بعد فریدی کے کمرے کا دروازہ کھلا اور سکینہ چنگیر میں گرم گرم پراٹھے اور چائے کا کپ لے کر اندر داخل ہوئی۔

''لو بیٹا! تم ناشتا کر لو۔ میں نماز پڑھنے جا رہی ہوں۔ منڈی جانے لگو تو دروازے کو باہر سے کنڈا لگا جانا۔'' سکینہ کہتے ہوئے کمرے سے نکل گئی۔

فریدی بھی اس کے پیچھے ہی کمرے سے نکل آیا۔ رات بھر جاگنے سے اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ کچھ تھکن اور کسلمندی ہو رہی تھی۔ غسل خانے میں آ کر اس نے منہ ہاتھ دھویا اور کمرے میں آ کر ناشتا کرنے لگا۔ مزید چند منٹ بعد وہ چادر کی بکل مارے گھر سے نکل رہا تھا۔

دو دن گزر گئے۔ جیرا کے آدمیوں نے اس سے رابطہ قائم نہیں کیا۔ البتہ تیسرے روز رات نو بجے کے قریب سیاہ رنگ کی ایک گاڑی اس کی دکان کے سامنے آ کر رکی۔ فریدی نے گاڑی کی طرف دیکھا۔ اگلی سیٹ پر ڈرائیور کے ساتھ ایک آدمی چادر اوڑھے بیٹھا تھا۔ وہ شکل ہی سے چھٹا ہوا بدمعاش لگ رہا تھا۔ اس کے کندھے کے قریب چادر کا کونا اٹھا ہوا تھا اور کلاشنکوف رائفل کی نال صاف نظر آ رہی تھی۔ پچھلی سیٹ پر تین آدمی تھے۔ دائیں اور بائیں طرف بیٹھے ہوئے آدمیوں کے پاس بھی کلاشنکوف رائفلیں تھیں۔ ان کے درمیان جیرا بیٹھا ہوا تھا۔ اسے دیکھتے ہی فریدی کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔

''فریدی سیٹھ، ذرا یہاں آ کر جیرے استاد کی بات تو سن لو۔'' کھڑکی کی طرف بیٹھے ہوئے شخص نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

فریدی دکان سے نکل کر کار کے قریب آ گیا اور کھڑکی پر جھک کر جیرا کی طرف دیکھنے لگا۔

''بتاؤ یار جی...... کیا فیصلہ کیا ہے تم نے؟'' جیرے نے پوچھا۔

''مجھے تمہاری پیشکش قبول نہیں ہے۔ میں اس گھناؤنے دھندے میں تمہارا شریک نہیں بن سکتا۔'' فریدی نے دوٹوک لہجے میں جواب دیا۔

''کوئی بات نہیں بادشاہو۔'' جیرے نے پُرسکون لہجے میں جواب دیا اور ڈرائیور کو اشارہ کر دیا۔ گاڑی ایک جھٹکے سے آگے بڑھ گئی۔

اس رات فریدی دکان بند کر کے گھر جا رہا تھا تو محتاط نگاہوں سے چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ اپنے قریب آنے والے ہر شخص کو مشکوک نگاہوں سے دیکھنے لگتا۔ شام کو اس کا انکار سن کر جیرا گجر خاموشی سے چلا گیا تھا۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ اس جیسے لوگ آسانی سے اپنی شکست نہیں مانتے۔ اسے شبہ ہی نہیں یقین تھا کہ جیرا پہلے کی طرح آج رات بھی اسے گن پوائنٹ پر اٹھانے کی کوشش کرے گا۔ اسی لیے وہ بہت محتاط ہو کر چل رہا تھا مگر...... ایسا کوئی ناخوشگوار واقعہ پیش نہیں آیا اور وہ خیریت سے گھر پہنچ گیا۔

وہ جمعرات کی شام تھی۔ اس روز بھاٹی پر کچھ زیادہ ہی رونق رہتی تھی۔ جمعرات کو داتا دربار آنے جانے والے لوگوں کا بھی ہجوم رہتا تھا۔ فریدی کی دکان داری بھی کچھ بڑھ جاتی تھی۔ مغرب کے وقت ایک مرد اور ایک عورت اس

کی دکان پر آکر رکے۔ مرد کی عمر چالیس اور عورت تیس کے لگ بھگ رہی ہوگی۔ مرد کے ماتھے پر محراب کا نشان تھا جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ پانچ وقت نماز پڑھنے کا عادی ہے۔ عورت اگرچہ خوش شکل تھی مگر اس کے چہرے پر کسی قسم کا میک اَپ نظر نہیں آرہا تھا۔ لباس بھی سادہ تھا اور اس نے کشمیری شال اوڑھ رکھی تھی۔ انہوں نے تقریباً ڈیڑھ سو روپے کا پھل خریدا۔ فریدی نے پیسے وصول کرنے کے بعد پھلوں کے دونوں تھیلے مرد کی طرف بڑھا دیے۔

''یہ تھیلا یہیں نہ چھوڑ جائیں۔ واپسی پر لیتے چلیں گے۔'' عورت نے شال کے اندر اپنے ہاتھ میں پکڑا ہوا پلاسٹک کا ایک شاپنگ بیگ نکالتے ہوئے کہا۔

''میرے خیال میں یہی بہتر رہے گا۔ بتاشے اور مکھانے وغیرہ بھی خریدنے ہیں۔ اس تھیلے کو کہاں سنبھالتے پھریں گے۔'' مرد نے کہا پھر فریدی کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''بھائی صاحب، اگر آپ برا نہ مانیں تو ہمارا یہ تھیلا یہاں رکھ لیں۔ ہم دربار جارہے ہیں۔ چڑھاوے کی چادر اور کچھ اور چیزیں بھی خریدنی ہیں۔ اس تھیلے کو کہاں سنبھالتے پھریں گے۔ ہم واپسی میں لے لیں گے۔ ایک گھنٹے تک تو آپ کی دکان کھلی رہے گی نا؟''

''تھیلا رکھ جائیے۔ یہ آپ کی امانت ہے۔ دکان گیارہ بجے تک کھلی رہے گی۔'' فریدی نے جواب دیا۔

''شکریہ، مگر اس تھیلے کو ذرا پیچھے ہٹا کر رکھیے، غلطی سے کوئی گاہک نہ لے جائے۔ اس میں بچوں کی کچھ فرمائشی چیزیں خریدی ہوئی ہیں۔'' عورت نے کہا۔

''آپ مطمئن رہیے جی۔ یہ تھیلا یہاں محفوظ رہے گا۔ لیجیے، میں اِسے پیچھے رکھ دیتا ہوں۔'' فریدی نے عورت کے ہاتھ سے تھیلا لے کر پیچھے ٹوکروں کے نیچے رکھ دیا۔

وہ دونوں شکریہ ادا کرتے ہوئے پھلوں کے تھیلے اٹھا کر دربار کی طرف چلے گئے اور فریدی دوسرے گاہکوں کی طرف متوجہ ہوگیا۔

نو بج رہے تھے۔ وہ مرد اور عورت شام چھ بجے کے قریب اپنا تھیلا رکھوا کر گئے تھے اور انہوں نے کہا تھا کہ تقریباً ایک گھنٹے میں واپس آجائیں گے۔ مگر اب تین گھنٹے گزر گئے تھے۔ فریدی نے ایک دو مرتبہ ان کے بارے میں سوچا تھا۔ جمعرات کو دربار میں بے پناہ ہجوم رہتا تھا لوگ گھنٹوں بیٹھے تلاوت کرتے یا دعائیں مانگتے رہتے تھے اگر وہ لوگ ابھی تک واپس نہیں آئے تھے تو اس میں پریشانی کی کوئی بات نہیں تھی۔

سوا نو بجے تھے۔ وہ اس وقت ایک گاہک کو سودا دے رہا تھا کہ پولیس کی ایک وین اس کی دکان کے سامنے آکر رکی۔ تقریباً نصف درجن مسلح پولیس والوں نے وین سے اتر کر دکان کو گھیرے میں لے لیا۔ اس پولیس پارٹی کا انچارج ایک سب انسپکٹر تھا۔ اس کے حکم پر دو کانسٹیبلوں نے فریدی کو گرفت میں لے لیا اور دو کانسٹیبل پھلوں کے ٹوکرے الٹنے لگے جبکہ دو کانسٹیبل دکان کے سامنے رائفلیں تانے کھڑے رہے۔

''کیا بات ہے سر جی؟ یہ سب کیا ہے؟'' فریدی نے سب انسپکٹر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ پولیس کو اس طرح کارروائی کرتے دیکھ کر وہ خوف زدہ ہوگیا تھا۔

لوگ دکان کے سامنے جمع ہونے لگے۔ سامنے کھڑے ہوئے دونوں کانسٹیبل لوگوں کو دکان سے دور رکھنے کی کوشش کررہے تھے۔

''تمہیں ابھی پتا چل جائے گا کہ یہ سب کیا ہے۔'' سب انسپکٹر نے خونخوار نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

دونوں کانسٹیبل اس طرح پھلوں کے کریٹ اور ٹوکرے الٹ رہے تھے۔ جیسے انہیں کسی خاص چیز کی تلاش ہو۔ بالآخر ایک کانسٹیبل نے ٹوکروں کے پیچھے پڑا ہوا کالے رنگ کا وہ تھیلا اٹھا لیا جو فریدی نے دربار جانے والے مرد اور عورت کی امانت سمجھ کر دبا رکھا تھا۔ کانسٹیبل تھیلے میں ہاتھ ڈال کر ٹٹولنے لگا پھر مٹھی بھر کر کوئی چیز نکال لی۔ اس نے مٹھی سب انسپکٹر کے سامنے کھول دی۔ وہ چھوٹی چھوٹی کئی پڑیاں تھیں۔

''یہ کیا ہے اوئے؟'' سب انسپکٹر نے فریدی کے منہ پر زوردار تھپڑ رسید کردیا۔ ''ہیروئن بیچتے ہو اور پوچھتے ہو یہ سب کیا ہے؟''

''ہیروئن۔'' فریدی کا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔ ''تم...... میں اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتا' یہ تھیلا تو ایک عورت اور ایک مرد یہاں رکھوا کر دربار گئے تھے۔ انہوں نے کہا تھا کہ ایک گھنٹے میں واپس آجائیں گے۔ م...... میں...... ایک شریف آدمی ہوں، میں نے بھی......''

''بند کرو بکواس۔'' سب انسپکٹر نے اسے ایک اور تھپڑ مار دیا۔ ''تمہاری ساری شرافت اس تھیلے میں بھری ہوئی ہے۔ ابھی تھانے چل کر تمہاری مزید شرافت کا راز بھی کھل جائے گا۔ اسے گاڑی میں بٹھاؤ علی احمد۔'' سب انسپکٹر نے آخری الفاظ اپنے ایک ماتحت سے مخاطب ہوکر کہے تھے۔

اسی وقت دو آدمی ہجوم سے نکل کر آگے آگئے۔ وہ

دونوں فریدی کے پڑوسی دکان دار تھے۔ انہوں نے سب انسپکٹر کو سمجھانے کی کوشش کی کہ فریدی ایک شریف آدمی ہے یقیناً اس کے کسی دشمن نے اسے پھنسانے کی کوشش کی ہے۔

''ان دونوں کو بھی لے چلو علی احمد۔'' سب انسپکٹر غرایا۔

''ہم نے کیا کیا ہے سر جی...... ہم تو......'' ایک پڑوسی ہکلایا۔ ان دونوں کے چہرے ایک دم خوف سے پیلے پڑ گئے تھے۔

''بھاگ جاؤ یہاں سے۔'' سب انسپکٹر نے انہیں آنکھیں دکھائیں اور وہ دونوں بڑی تیزی سے پیچھے ہٹ گئے۔

فریدی چیخ چلا رہا تھا۔ دو پولیس والوں نے اسے اٹھا کر وین میں ٹھونس دیا اور رائفلیں سنبھال کر اس کے ساتھ بیٹھ گئے۔ دوسرے پولیس والے بھی وین میں سوار ہو گئے اور وین بڑی تیزی سے حرکت میں آ گئی۔

تھانے میں فریدی کے ساتھ جو سلوک کیا گیا اس کی وضاحت کی ضرورت نہیں۔ آنے والا ہر پولیس والا اسے ایک آدھ تھپڑ یا ٹھوکر رسید کر دیتا۔ اس کے ساتھ وہی سلوک کیا جا رہا تھا جو ایک منشیات فروش کے ساتھ کیا جانا چاہیے تھا۔ فریدی چیخ چیخ کر اپنی بے گناہی ثابت کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ مگر قانون کے یہ محافظ اس کی ایک بات سننے کو تیار نہیں تھے۔ اس کی ہر بات کا جواب ٹھوکروں اور تھپڑوں سے دیا جاتا۔ اس کی ناک سے خون بہہ رہا تھا اور بائیں آنکھ کے نیچے گھونسا لگنے سے سیاہ دھبا پڑ گیا تھا اور رخسار سوج رہا تھا۔ بالآخر اسے لاک اپ میں بند کر دیا گیا۔ اس کے خلاف ابھی تک کوئی پرچہ وغیرہ نہیں کاٹا گیا تھا کیونکہ ایس ایچ او موجود نہیں تھا۔ تحریری کارروائی ایس ایچ او کے آنے کے بعد ہی ہوئی۔

آدھے گھنٹے بعد ایس ایچ او آ گیا۔ فریدی کو اس کے سامنے پیش کیا گیا۔

''کب سے یہ دھندا کر رہے ہو تم؟'' ایس ایچ او نے خونخوار نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

''میں ایک شریف آدمی ہوں جی، میں نے کبھی کوئی غیر قانونی کام نہیں کیا۔ یہ تھیلا تو ایک عورت اور ایک مرد مجھے دے گئے تھے۔ انہوں نے کہا تھا کہ وہ دربار سے واپس آ کر یہ تھیلا لے جائیں گے۔ اگر مجھے پتا ہوتا کہ اس تھیلے میں کوئی غیر قانونی چیز ہے تو میں کبھی بھی نہ رکھتا۔''

''لیکن ہماری اطلاع کے مطابق تمہاری دکان پر بہت عرصے سے منشیات فروشی کا دھندا ہو رہا ہے۔ ہم تو بہت عرصے سے تمہاری تاک میں تھے اور بالآخر آج تم قابو آ ہی گئے۔'' ایس ایچ او نے کہا۔

''یہ غلط ہے جی۔'' فریدی نے کہا۔ ''مجھے تو یہ دکان کھولے ہوئے ابھی ایک مہینہ بھی نہیں ہوا۔ یہ دکان تو کرائے پر دی ہوئی تھی۔ وہ کرائے دار ہی یہ گھناؤنا دھندا کرتا ہوگا جس کے بارے میں مجھے کچھ علم نہیں ہے۔''

''دکان کھولنے سے پہلے تم کیا کرتے تھے؟'' ایس ایچ او نے اسے گھورا۔

''جی میں......''

''یہ جیل میں تھا سر، دس سال کاٹ کر آیا ہے۔'' سب انسپکٹر نے مداخلت کرتے ہوئے کہا۔

''اوہ...... کس جرم میں جیل گئے تھے؟'' ایس ایچ او نے اسے گھورا۔

''سر اس نے بارہ سال کی عمر میں اپنے ماں باپ کو قتل کر دیا تھا۔ اسے پندرہ سال کی سزا ہوئی تھی۔ جیل میں اچھے چال چلن کی بنا پر صرف دس سال بعد اسے رہائی مل گئی۔'' سب انسپکٹر نے کہا۔ ''یہ سعید اور نرگس کا بیٹا ہے۔ جنہیں دس سال پہلے کوچہ لالہ ہرنام داس کے ایک مکان میں قتل کیا گیا تھا۔''

''اوہ...... تو یہ وہ لڑکا ہے۔ دس سال جیل میں رہ کر تو اس نے بہت کچھ سیکھا ہوگا۔'' ایس ایچ او نے اسے گھورا۔

''میں نے جیل میں رہ کر علم سیکھا ہے۔ گریجویشن کیا ہے۔ جیل میں میرا کردار مثالی کردار تھا جس کی وجہ سے میری سزا میں پانچ سال کی تخفیف کر دی گئی۔'' فریدی نے جواب دیا۔

''اور جیل سے باہر آتے ہی تم نے اس شرافت کی آڑ میں یہ دھندا شروع کر دیا۔ تمہارے قبضے سے دو سو ساٹھ گرام ہیروئن چھوٹی پڑیوں کی صورت میں برآمد ہوئی ہے۔ تم ہیروئن کہاں سے خریدتے ہو۔ اگر تم سب کچھ سچ بتا کر دیگر منشیات فروشوں کی گرفتاری میں ہمارے ساتھ تعاون کرو تو ہم تمہارے ساتھ کچھ رعایت کر سکتے ہیں۔''

''میں سچ کہہ رہا ہوں جناب۔ اس ہیروئن سے میرا کوئی تعلق نہیں ہے اور نہ ہی میرا کسی منشیات فروش سے کوئی تعلق ہے۔'' فریدی نے جواب دیا۔

ایس ایچ او چند لمحے اسے گھورتا رہا پھر اس نے اچانک ہی فریدی کے منہ پر زوردار گھونسا رسید کر دیا۔ فریدی کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ وہ لڑکھڑا کر پیچھے گرا۔ ایک

کانسٹیبل نے اسے دو تین ٹھوکریں رسید کر دیں۔ فریدی جب اٹھ کر کھڑا ہوا تو اس کے ہونٹوں سے خون بہہ رہا تھا۔

''میں سچ جاننا چاہتا ہوں۔'' ایس ایچ او بھیڑیے کی طرح غرایا۔

اسی لمحے تھانے میں ہلچل سی مچ گئی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے کوئی بہت اہم اور غیر معمولی بات ہو گئی ہو۔

''یہ کیا ہو رہا ہے۔ باہر شور کیسا ہے؟'' ایس ایچ او نے سوالیہ نگاہوں سے اس کانسٹیبل کی طرف دیکھا جو ابھی ابھی کمرے میں داخل ہوا تھا۔

''جیرا اگجر آیا ہے سر۔'' کانسٹیبل نے جواب دیا۔

ایس ایچ او اور سب انسپکٹر اس طرح مستعد ہو گئے جیسے کوئی بہت اعلیٰ افسر یا وزیر آ گیا ہو۔ اسی وقت جیرا کمرے میں داخل ہوا۔ اس نے لاچا اور لمبا کرتہ پہن رکھا تھا۔ ایک خوب صورت کشمیری شال اس کی گردن میں اس طرح پڑی تھی کہ اس نے دونوں پلو سامنے لٹکے ہوئے تھے۔

''آیئے..... آیئے جیرا صاحب!'' ایس ایچ او نے آگے بڑھ کر بڑی گرم جوشی سے اس سے ہاتھ ملایا۔ ''آیئے کیسے زحمت کی، کوئی کام تھا تو مجھے بلا لیا ہوتا۔''

''کام تو کوئی نہیں، اِدھر سے گزر رہا تھا۔ سوچا آپ لوگوں کو بھی سلام کرتا چلوں۔'' جیرا نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔ ''ارے تم باؤ فریدی!'' وہ فریدی کو دیکھ کر چونک گیا۔

''کیا ہوا باؤ فریدی! تم یہاں کیسے اور یہ تمہاری کیا حالت ہو رہی ہے؟'' وہ ایس ایچ او کی طرف گھوم گیا۔ ''اس شریف آدمی کو کیوں پکڑ لائے ہو تھانے دار..... کیا جرم کیا ہے اس نے؟''

''آپ جانتے ہیں اِسے؟'' ایس ایچ او نے پوچھا۔

''بہت اچھی طرح جانتا ہوں، بڑا بیبا آدمی ہے، لیکن.....''

''یہ منشیات فروش ہے جیرا پہلوان۔'' ایس ایچ او نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ''اس کے قبضے سے دو سو ساٹھ گرام ہیروئن برآمد ہوئی ہے۔ پھلوں کی آڑ میں یہ گھناؤنا دھندا کرتا تھا۔ ایسے لوگوں کو تو چوک پر پھانسی پر لٹکا دینا چاہیے جو منشیات کا زہر پھیلا کر پوری قوم کو تباہ کر رہے ہیں۔''

''نہیں تھانے دار.....'' جیرا اگجر نے کہا۔ ''میں اس نوجوان کو ذاتی طور پر جانتا ہوں۔ بہت شریف آدمی ہے۔ تمہارے آدمیوں کو یقیناً کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔''

''غلط فہمی کیسی؟'' تھانے دار بولا۔ ''اس کی دکان

ویلنٹائن کارڈ

''آپ کے پاس ویلنٹائن ڈے کے کارڈ ہیں؟''

''بالکل ہیں..... آپ کو کیسا کارڈ چاہیے؟''

''مجھے تم سے شدید محبت ہے۔ تم میری پہلی اور آخری محبت ہو!''

''یہ لیں!''

''ویری گڈ..... دو درجن دے دیں۔''

اسماعباس، کھاریاں

ہوشیار..... خبردار

جعلی وکیل نے دکان دار سے ویلنٹائن ڈے کارڈ طلب کیے۔ کافی دیکھ بھال کے بعد انہوں نے ایک کارڈ پسند کر لیا جس پر تحریر تھا۔ ''ڈارلنگ! ویلنٹائن ڈے مبارک ہو۔ پچھلی ملاقات یادگار تھی۔ کل کب اور کہاں مل رہی ہو؟..... تمہارا اپنا۔''

''یہ چالیس کارڈ دے دو۔'' انہوں نے فرمائش کی۔

''سر! آپ اتنی خواتین سے بیک وقت کیسے مل سکیں گے؟'' دکان دار نے حیرت سے پوچھا۔

''ارے ملنا ملانا کس کو ہے!'' انہوں نے ہنس کر کہا۔ ''پچھلے سال محلے کے دس گھروں کے پتے پر کارڈ بھیجے تھے اور اسی ہفتے طلاق کے تین کیس آ گئے تھے۔ اس بار چالیس بھیجوں گا تو جھٹ دس پندرہ کیس مل جائیں گے۔ یہ بزنس ٹرک ہے!''

کوئٹہ سے رضوان الحسن کا کاروباری نکتہ

سے ہیروئن برآمد ہوئی ہے۔''

''ہیروئن تو کسی بھی شریف آدمی کی جیب سے برآمد کی جا سکتی ہے۔ مجھے ذرا اس سے بات کر لینے دو۔ کیوں باؤ فریدی، یہ کیا قصہ ہے؟'' جیرا نے آخری الفاظ فریدی سے مخاطب ہو کر کہے تھے۔

فریدی نے اس تھیلے کے بارے میں سب کچھ بتا دیا جو وہ عورت اور مرد وہاں رکھوا کر گئے تھے۔

''میں کہتا تھا نا کہ تمہارے آدمیوں کو غلط فہمی ہوئی ہے۔'' جیرا تھانے دار کی طرف متوجہ ہو گیا۔ ''اس شریف آدمی کو پھنسانے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس کے خلاف ابھی پرچہ تو نہیں کٹا۔''

''ابھی نہیں، لیکن پرچہ ایسا کٹے گا کہ اسے چھ سات

سال سے کم سزا نہیں ہوگی۔" ایس ایچ او نے فریدی کو گھورتے ہوئے کہا۔

"نہیں تھانے دار۔" جیرا نے کہا۔ "ایک شریف آدمی کی زندگی برباد مت کرو۔ مجھے یقین ہے کہ یہ بے قصور ہے۔ اسے میں اپنی ضمانت پر لے جارہا ہوں۔ تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں؟"

"جیرا پہلوان تم......"

"میں کوئی بات نہیں سنوں گا۔" جیرا نے اس کی بات کاٹ دی۔ "کچھ لینے دینے کی بات کرنی ہے تو میں یہاں موجود ہوں۔ اس شریف آدمی کو جانے دو۔"

"ٹھیک ہے جیرا پہلوان۔" ایس ایچ او نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا۔ "میں تمہارے سامنے انکار نہیں کر سکتا۔ تم جاسکتے ہو۔" اس نے آخری الفاظ فریدی کی طرف دیکھتے ہوئے کہے۔

"جاؤ باؤ فریدی۔ ان سے باقی حساب کتاب میں خود کرلوں گا۔" جیرا نے کہا۔

ایس ایچ او سمیت تمام پولیس والے جیرا کے سامنے اس طرح مؤدب کھڑے تھے جیسے وہ ان کا اَن داتا ہو۔ اس نے باری باری ان سب کی طرف دیکھا اور پھر آستین سے ہونٹوں سے رسنے والا خون پونچھتا ہوا ایس ایچ او کے کمرے سے نکل آیا۔ برآمدے میں جیرا گجر کے تین گن مین کھڑے تھے۔ یہ تینوں وہی تھے جو اس شام کار میں اس کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے۔

آج کے اس واقعے سے فریدی نے دو باتیں اخذ کی تھیں۔ پہلی بات تو یہ کہ جیرا گجر کا خاصا رسوخ تھا۔ وہ منشیات کا اسمگلر تھا لیکن تھانے کے تمام لوگ اس کے سامنے اس طرح مؤدب کھڑے رہے تھے جیسے وہ کوئی بہت بڑا آفیسر یا سیاسی لیڈر ہو۔ اس کے صرف ایک مرتبہ کہنے پر ایس ایچ او نے فریدی کو چھوڑ دیا تھا اور جیرا گجر کے سامنے کسی قسم کی چوں چرا نہیں کی تھی۔

دوسری اہم بات یہ تھی کہ فریدی کو یقین تھا کہ اسے ایک سوچی سمجھی اسکیم کے تحت اس کیس میں پھنسایا گیا تھا اور اس سازش کے پیچھے جیرا گجر کا ہاتھ تھا۔ وہ عورت اور مرد یقیناً اسی کے گرگے تھے جو ہیروئن کا تھیلا اس کی دکان پر رکھوا کر گئے تھے۔ دیکھنے میں وہ دونوں کتنے نیک اور شریف نظر آتے تھے مگر ان کا کردار کتنا گھناؤنا ثابت ہوا تھا اور پھر فریدی کے پکڑے جانے کے تھوڑی دیر بعد ہی جیرا گجر کا تھانے پہنچ جانا بھی معنی خیز تھا۔

اس رات فریدی گھر پہنچا تو اس کی حالت دیکھ کر سکینہ اور رخشندہ پریشان ہوگئیں۔ فریدی نے آج تک انہیں جیرا گجر کے بارے میں نہیں بتایا تھا۔ آج بھی اس کا یہ حلیہ جیرا گجر ہی کی وجہ سے بگڑا تھا مگر اس نے ان ماں بیٹی کو بتایا کہ دکان پر کسی گاہک سے اس کی لڑائی ہوگئی تھی۔ گاہک کے کچھ حمایتی بھی آگئے تھے جنہوں نے اس کی یہ درگت بنا ڈالی۔ اس نے اگرچہ یہ کہہ کر سکینہ اور رخشندہ کو ٹال دیا تھا کہ معمولی چوٹیں ہیں لیکن حقیقت میں وہ رات بھر اپنے کمرے میں بستر پر لیٹا تکلیف سے کراہتا رہا تھا۔

فریدی کا اندازہ درست نکلا۔ دو دن بعد اُسے جیرا گجر کا پیغام ملا۔ مگر فریدی نے اس سے ملاقات سے انکار کردیا۔ تیسرے دن دو آدمی فریدی کو گن پوائنٹ پر ایک بار پھر جیرا کے بنگلے پر لے گئے۔

"کیوں بھئی باؤ فریدی۔" جیرا گجر نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔ "میں تو تمہاری طرف دوستی کا ہاتھ بڑھانا چاہتا ہوں مگر تم مجھ سے دور بھاگ رہے ہو۔"

"میں تم جیسے لوگوں سے دوستی نہیں رکھنا چاہتا۔" فریدی نے دوٹوک جواب دیا۔

"حیرت ہے۔" جیرا گجر بولا۔ "لوگ مجھ جیسے بڑے لوگوں کی دوستی پر فخر کرتے ہیں اور تم......"

"بڑے لوگ۔" فریدی نے اس کی بات کاٹ دی۔ "تم بڑے نہیں، بہت چھوٹے اور بہت گھٹیا آدمی ہو، کوئی شخص ناجائز ذرائع سے دولت جمع کرکے بڑا آدمی نہیں بن جاتا۔"

"میں نے تمہاری بات کا برا نہیں مانا۔" جیرا گجر نے کہا۔ "لیکن تم شاید بھول گئے ہو کہ اس رات جب ہیروئن فروشی کے الزام میں پکڑے گئے تھے تو میں نے ہی تمہیں پولیس سے نجات دلائی تھی۔ کوئی اور تمہیں چھڑانے کے لیے وہاں کیوں نہیں آیا تھا۔ اگر میں تمہیں نہ چھڑاتا تو اس وقت حوالات میں پڑے سسک رہے ہوتے۔"

"اس میں بھی تمہاری چال تھی۔" فریدی نے کہا۔ "پہلے تم نے میری دکان پر دھوکے سے ہیروئن رکھوائی پھر چھاپا پڑوا دیا اور آخر میں میرے ہمدرد بن کر تھانے پہنچ گئے۔ تم سمجھتے ہو کہ اس طرح مجھے اپنا آلۂ کار بنانے میں کامیاب ہوجاؤ گے۔ تمہارا یہ خواب کبھی پورا نہیں ہوگا۔"

"بہت عقل مند ہو۔" جیرا گجر نے اُسے گھورا۔ "لیکن میری ایک بات غور سے سن لو۔ وہ اڈا میرے لیے بہت

اہمیت رکھتا ہے یا تو تم خود ہمارے لیے کام کرو یا وہ دکان ہمارے ہاتھ فروخت کر دو۔ میں تمہیں منہ مانگی قیمت دے سکتا ہوں۔"

"دونوں میں سے کوئی بات بھی نہیں ہوگی۔" فریدی نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔ "تم اب میری دکان پر تو کیا اس علاقے میں کہیں بھی ہیروئن نہیں بیچ سکو گے۔"

"تم نے بہت بڑی بات کہہ دی ہے باؤ فریدی۔" جیرا گجر نے اُسے گھورا۔ "تم نے شاید اندازہ نہیں لگایا کہ میرے ہاتھ کتنے لمبے ہیں۔"

"میں اندازہ لگا چکا ہوں لیکن اب وہ ہاتھ بھی کاٹ دیے جائیں گے جو تمہاری سرپرستی کر رہے ہیں۔" فریدی نے جواب دیا۔ وہ جوشِ جذبات میں بہت بڑی بات کہہ گیا تھا جو اس کے لیے خطرناک بھی ثابت ہو سکتی تھی۔

"اوہ۔" جیرا گجر کی آنکھوں میں اُلجھن تیر گئی۔ "اس ملک کے وزیراعظم سے تمہاری دوستی ہو گئی ہے یا جادو کی چھڑی تمہارے ہاتھ لگ گئی ہے؟" وہ چند لمحوں تک خاموش ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ "میری بات غور سے سنو باؤ فریدی! میں تمہیں صرف چوبیس گھنٹے کی مہلت دے رہا ہوں۔ کل اس وقت تک تمہیں آخری فیصلہ کرنا ہوگا۔ میرا دوست بن کر عیش کی زندگی گزارنا چاہتے ہو یا دشمنی مول لے کر تباہی و بربادی کو اپنا مقدر بنانا چاہتے ہو۔ اب تم جا سکتے ہو، گاڑی تمہیں بھاٹی تک چھوڑ آئے گی۔"

"مجھے تمہاری گاڑی کی ضرورت نہیں۔ میں خود چلا جاؤں گا اور کل بھی میرا فیصلہ وہی ہوگا جو آج میں تمہیں سنا چکا ہوں۔" فریدی نے جواب دیا اور تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا کمرے سے نکل گیا۔

دوسرا دن گزر گیا۔ فریدی رات کو دکان بند کرنے کی تیاری کر رہا تھا کہ جیرا گجر کی گاڑی وہاں آ کر رکی۔ اس کے ساتھ حسبِ معمول اس کے ساتھ تین مسلح باڈی گارڈ بھی تھے۔ آج جیرا گجر گاڑی سے اتر کر فریدی کے قریب آ گیا۔

"کیا فیصلہ کیا ہے تم نے باؤ فریدی؟" اس نے فریدی کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔

"میرا فیصلہ وہی ہے جو کل ہی تمہیں سنا دیا تھا۔" فریدی نے ٹھوس لہجے میں جواب دیا۔

"ٹھیک ہے، نو پرابلم۔" جیرا گجر کہتا ہوا گاڑی میں بیٹھ گیا اور گاڑی تیزی سے وہاں سے رخصت ہو گئی۔

فریدی اس رات بھی نہیں سو سکا۔ اسے ایک لمحے کو بھی نیند نہیں آ سکی تھی۔ وہ رات بھر بستر پر کروٹیں بدلتا اور اٹھ اٹھ کر کمرے میں ٹہلتا رہا۔ صبح فجر کی اذان کے فوراً بعد سکینہ اس کے کمرے میں داخل ہوئی تو فریدی کمرے میں ٹہل رہا تھا۔

"تم اٹھ گئے، اچھا تیار ہو جاؤ۔ میں تمہارے لیے ناشتا لے کر آتی ہوں۔" سکینہ نے اسے دیکھتے ہی کہا۔

"آج مجھے منڈی نہیں جانا اماں۔ ناشتا نہیں، صرف چائے بنا دو۔ مجھے رات بھر نیند نہیں آ سکی۔ سر میں درد ہو رہا ہے۔" فریدی نے کہا۔

"رات بھر سوئے نہیں۔ تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟" سکینہ نے جلدی سے آگے بڑھ کر اس کی پیشانی پر ہاتھ رکھ دیا۔

"ہاں ماں، میں بالکل ٹھیک ہوں، رات کو ویسے ہی نیند نہیں آئی۔ پتا نہیں کیوں؟" فریدی نے جواب دیا۔

"اچھا میں چائے بنا کر لاتی ہوں۔" سکینہ کمرے سے چلی گئی۔

اس روز فریدی صبح ساڑھے سات بجے ناشتا کر کے گھر سے نکلا۔ وہ تنگ اور پُرپیچ گلیوں سے نکل کر بھاٹی دروازے سے باہر نکلا ہی تھا کہ سامنے سے بارہ تیرہ سال کی عمر کا ایک لڑکا دوڑتا ہوا نظر آیا۔ وہ اسی طرف آ رہا تھا۔ فریدی نے اسے دور سے ہی پہچان لیا۔ وہ گلزار قسائی کا لڑکا تھا۔ اس کی دکان بھی بھاٹی چوک پر ہی تھی۔

"فریدی بھیا، جلدی چلو، میں تمہیں بلانے کے لیے ہی جا رہا تھا۔" لڑکا اس کے قریب پہنچ کر رک گیا، وہ بری طرح ہانپ رہا تھا۔

"کیا بات ہے، اس طرح کیوں دوڑے جا رہے ہو؟" فریدی نے پوچھا۔ اس کی چھٹی حس اسے کسی انہونی سے آگاہ کر رہی تھی۔

"تمہاری دکان کو آگ لگ گئی ہے۔ وہ بالکل جل چکی ہے۔" لڑکے نے جواب دیا۔

"کیا......؟" فریدی اچھل پڑا۔

وہ لڑکے کے ساتھ دوڑتا ہوا چوک پر پہنچ گیا۔ اس کی دکان جل کر راکھ ہو چکی تھی۔ چھت بھی گر چکی تھی۔ ملبے کے ڈھیر سے اب بھی دھواں اٹھ رہا تھا۔ بہت سے لوگ وہاں جمع تھے۔ قریب رہنے والے ایک آدمی نے بتایا کہ آگ رات [illegible] بجے کے قریب لگی تھی۔ کچھ لوگوں نے آگ بجھانے کی کوشش کی تھی مگر دکان پوری طرح آگ کی لپیٹ میں آ چکی تھی۔

لوگوں کا خیال تھا کہ یہ آگ بجلی کے شارٹ سرکٹ

سے لگی ہوگی لیکن فریدی سمجھ گیا تھا کہ یہ آگ کیسے لگی ہوگی۔

جیرا گجر نے اس پر پہلا وار کیا تھا۔ فریدی نے تھانے میں اس آتش زدگی کی رپورٹ میں جیرا گجر پر شبہ ظاہر کیا تو پولیس نے رپورٹ لکھنے سے ہی انکار کر دیا۔ فریدی کو پہلے ہی یقین تھا کہ پولیس جیرا گجر کے خلاف رپورٹ نہیں لکھے گی۔

وہ چند لوگوں کی مدد سے دکان کا ملبا صاف کر رہا تھا کہ ایک گاڑی دکان کے سامنے آکر رکی۔ اس گاڑی میں جیرا گجر کو دیکھ کر فریدی کا خون کھول اٹھا۔ جیرا گجر نے اس کی طرف دیکھ کر ہاتھ ہلایا اور گاڑی حرکت میں آکر آگے بڑھ گئی۔ اب تو فریدی کو یقین ہو گیا کہ دکان کو آگ جیرا گجر ہی نے لگوائی تھی اور اس وقت شاید وہ اس کی بربادی کا تماشا دیکھنے آیا تھا۔

اس روز فریدی دوپہر کو گھر پہنچا تو سکینہ اسے دیکھ کر چونک سی گئی۔ فریدی دوپہر کا کھانا کھانے کے لیے کبھی گھر نہیں آیا تھا۔ وہ ہوٹل سے کھانا منگوا کر کھالیا کرتا تھا۔

"خیریت تو ہے بیٹا، تم آج اس وقت کیسے آگئے۔" سکینہ نے اسے دیکھتے ہی پوچھا۔

"خیریت ہی تو نہیں ماں۔" فریدی نے جواب دیا۔

"اللہ خیر کرے۔ کیا ہوا بیٹا؟" سکینہ پریشان ہو گئی۔

"رات کو دکان میں آگ لگ گئی تھی۔ سب کچھ جل کر راکھ ہو گیا۔" فریدی بولا۔

"ہائے۔" سکینہ نے دل تھام لیا۔ "تین روز سے میری الٹی آنکھ پھڑک رہی تھی۔ دل میں رہ رہ کر ہول سے اٹھتے تھے۔ مجھے ڈر تھا کہ کچھ نہ کچھ ہو کر رہے گا۔ کیسے لگی آگ...... تمہاری تو کسی سے دشمنی بھی نہیں۔"

"آگ بجلی سے لگی ہے ماں۔" فریدی نے جواب دیا۔ "سجن دشمن تو سب ہی کے ہوتے ہیں۔ کسی کے بارے میں کچھ کہا نہیں جاسکتا۔ بہر حال، جو ہونا تھا وہ ہو گیا اور اب میں نے یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ پھلوں کی دکانداری نہیں کروں گا۔ کوئی اور کام شروع کرنے کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔"

"ہاں بیٹا، اب کوئی اور ہی کام شروع کرو جس میں تمہیں کوئی آرام بھی ملے۔ اس دکان پر تو تم صبح تڑکے سے آدھی رات تک قیدیوں کی طرح بندھے رہتے تھے۔" سکینہ نے کہا۔

"کچھ کھانے کو ہے ماں، بھوک لگ رہی ہے۔" فریدی موضوع بدلتے ہوئے بولا۔ وہ جیرا گجر کے بارے میں کچھ بتا کر سکینہ کو پریشان نہیں کرنا چاہتا تھا۔

"ہاں بیٹا، میں روٹی ڈالتی ہوں۔ تم نہا کر کپڑے بدل لو۔" سکینہ نے کہا۔

کھانا کھانے کے بعد فریدی اپنے کمرے میں آکر لیٹ گیا۔ وہ رات بھر کا جاگا ہوا تھا۔ تھوڑی دیر بعد نیند کی آغوش میں پہنچ گیا۔

دو تین روز گزر گئے۔ فریدی صبح گھر سے نکلتا اور اس کی واپسی شام کو ہوتی۔ وہ جیرا گجر کے خلاف کوئی کارروائی کرنے سے پہلے اپنے بچاؤ کا بندوبست کر لینا چاہتا تھا۔ جیرے کے بارے میں وہ اندازہ لگا چکا تھا کہ وہ دشمنی میں کس حد تک جاسکتا تھا۔ جو بے ضمیر لوگ اپنے ذاتی مفاد کے لیے پوری قوم کو داؤ پر لگا سکتے تھے۔ انہیں کسی ایک آدمی کی کیا پروا ہو سکتی تھی۔

محمد نگر میں سکینہ کے نام کرائے پر ایک مکان حاصل کرنے کے بعد اس نے سکینہ کو بتایا کہ وہ بھاٹی والا مکان چھوڑ رہے ہیں۔ یہ مکان بھی ہم اس طرح چھوڑیں گے کہ کسی کو شبہ نہ ہو سکے۔ صرف انتہائی ضرورت کی چیزیں ساتھ لے جانا ہوں گی۔

"تم نے مجھے بڑی الجھن میں ڈال دیا ہے بیٹا۔" سکینہ گہرا سانس لیتے ہوئے بولی۔ "اس طرح چوری چھپے مکان چھوڑنے کی کیا وجہ ہو سکتی ہے۔ مجھے نہیں بتاؤ گے؟ میں نے تمہیں اپنی کوکھ سے جنم تو نہیں دیا مگر تمہیں ہمیشہ اپنی اولاد کی طرح عزیز رکھا ہے۔ میں کئی دن سے تمہیں پریشان دیکھ رہی ہوں۔ میں نے جب بھی کچھ پوچھا تم نے ٹال دیا۔ کیا مجھے کچھ نہیں بتاؤ گے؟"

"میں نے آپ کو ہمیشہ ماں کا درجہ دیا ہے۔ اگر آپ میرا سہارا نہ بنتیں تو میں شاید جیل ہی میں گھٹ گھٹ کر مر چکا ہوتا۔" فریدی نے جواب دیا۔

"تو پھر مجھے بتاؤ تمہیں کیا پریشانی ہے۔ اس طرح یہ مکان کیوں چھوڑنا چاہتے ہو؟"

"بات یہ ہے ماں کہ......" فریدی چند لمحے خاموش ہوا پھر اس نے رک رک کر جیرا گجر کے بارے میں سب کچھ بتا دیا۔ آخر میں وہ کہہ رہا تھا۔ "وہ بہت کمینہ آدمی ہے۔ اس کا پورا گروہ ہے۔ میری دکان کو بھی اسی نے آگ لگوائی تھی۔ مجھے ڈر ہے کہ وہ میری دشمنی میں تم لوگوں کو بھی کوئی نقصان پہنچانے کی کوشش کرے گا۔ اسی لیے میں تم لوگوں کو کسی محفوظ مقام پر منتقل کر دینا چاہتا ہوں جس کے بارے میں یہاں والوں کو بھی علم نہ ہو۔"

''تم اس کے خلاف پولیس میں رپٹ کیوں نہیں لکھواتے؟'' سکینہ نے اس کے خاموش ہونے پر پوچھا۔
''پولیس اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔'' فریدی نے جواب دیا۔''وہ اس کے زرخرید ہیں۔ وہ اس کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کریں گے۔لیکن میں نے فیصلہ کرلیا ہے کہ جیرے کواس کے جرم کی سزا ضرور دوں گا۔خواہ اس کے لیے میری جان ہی کیوں نہ چلی جائے۔''
''میں تمہیں منع نہیں کروں گی،لیکن......''
''میں نے جو فیصلہ کیا ہے اس پر قائم رہوں گا۔'' فریدی نے اس کی بات کاٹ دی۔''آپ یہاں سے رخصت ہونے کی تیاری شروع کردیں۔سارا سامان صرف دو تین سوٹ کیسوں پر مشتمل ہونا چاہیے۔ہم ایک دو دن میں یہاں سے رخصت ہوجائیں گے۔''
اور پھر فریدی رات کے اندھیرے میں تھوڑا تھوڑا سامان محمد نگر والے مکان میں منتقل کرتا رہا اور بالآخر ایک روز وہ سکینہ اور رخشندہ کو بھی محمد نگر والے مکان میں لے آیا۔
گھر کا سامان دیکھ کر دونوں ماں بیٹی حیرت زدہ سی رہ گئیں۔
تین بیڈ رومز کا مکان تھا۔چوتھی بیٹھک تھی اور سامنے وسیع صحن تھا۔تمام کمروں میں قالین بچھے ہوئے تھے اور فرنیچر کے علاوہ ضرورت کی ہر چیز موجود تھی۔
انہیں محمد نگر والے مکان میں منتقل کرنے کے بعد فریدی نے جیرا گجر کے خلاف اپنی کارروائی شروع کردی۔
دو تین دن کی کوشش کے بعد وہ پولیس کے اعلیٰ ترین آفیسر سے رابطہ قائم کرنے میں کامیاب ہوگیا۔اس نے اپنی بپتا سنانے کے بعد جیرا گجر کے دیواز گارڈن والے بنگلے کے بارے میں بتایا کہ شہر میں اس کے گروہ کے ذریعے ہیروئن کے سارے کاروبار کو اسی بنگلے سے کنٹرول کیا جاتا ہے اور پورے شہر کو ہیروئن بھی اسی بنگلے سے سپلائی کی جاتی ہے۔اس نے اس یقین کا اظہار بھی کیا تھا کہ اگر چھاپا مارا جائے تو اس بنگلے سے بڑی مقدار میں ہیروئن برآمد ہوسکتی ہے۔
''اگر تمہاری یہ اطلاع غلط ثابت ہوئی تو جانتے ہو اس کا نتیجہ کیا ہوگا؟'' پولیس آفیسر نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔
''اچھی طرح جانتا ہوں۔'' فریدی نے پُرسکون لہجے میں جواب دیا۔جیرا گجر کے تعلقات بہت اوپر تک ہیں۔اطلاع غلط ثابت ہونے پر آپ بھی زیرِعتاب آسکتے ہیں۔پولیس کی کارروائی تک میں اپنے آپ کو پولیس کی کسٹڈی میں دینے کو تیار ہوں۔اگر میری اطلاع غلط ثابت ہوئی تو میں ہر قسم کی سزا بھگتنے کو تیار ہوں۔''
''ٹھیک ہے۔تم جاسکتے ہو۔میں اپنے چند ذمے دار افسروں سے مشورہ کرنے کے بعد کل تمہیں بتاؤں گا کہ جیرے کے خلاف کسی قسم کی کارروائی کی جاسکتی ہے۔'' پولیس آفیسر نے کہا۔
فریدی شکریہ ادا کرکے دفتر سے نکل آیا۔اس پولیس آفیسر کے دفتر میں جاتے اور وہاں سے نکلتے ہوئے فریدی نے اس بات کا خیال رکھا تھا کہ کوئی مشتبہ آدمی اسے نہ دیکھ پائے۔لیکن پولیس کے کئی اہلکار جیرے کے نمک خوار تھے۔کسی کے بارے میں کہا نہیں جاسکتا تھا کہ کون اس کے پے رول پر ہے۔بہرحال اس نے اپنے طور پر احتیاط برتی تھی۔
سکینہ اور رخشندہ کو محمد نگر والے مکان میں منتقل کرنے کے بعد فریدی خود بھاٹی والے سکینہ کے مکان میں ہی رہتا تھا۔سارا دن تو وہ باہر رہتا۔وہاں صرف رات گزارنے کے لیے آتا تھا۔اس روز بھی وہ رات بارہ بجے کے قریب گھر آیا اور بستر پر لیٹا دیر تک اپنی آج کی کارروائی کے بارے میں سوچتا رہا۔وہ چشمِ تصور سے جیرا گجر کو آہنی سلاخوں کے پیچھے دیکھ رہا تھا۔جاگتی آنکھوں سے یہ خواب دیکھتے ہوئے وہ نیند کی آغوش میں پہنچ گیا۔
صبح سات بجے اس کی آنکھ کھل گئی۔جاگ جانے کے بعد بھی وہ کافی دیر تک بستر پر کروٹیں بدلتا رہا پھر اٹھ کر باہر جانے کی تیاری کرنے لگا،ناشتا وغیرہ کرنے کے بعد جب وہ گھر سے نکلا تو دس بج رہے تھے۔بھاٹی دروازے کے اندر دکانوں کے سامنے سے گزرتے ہوئے وہ ٹھٹک کر رک گیا۔چائے کی دکان کے سامنے بینچوں پر محلے ہی کے چند بزرگ بیٹھے باتیں کررہے تھے۔ان میں سے ایک نے ہاتھ میں اخبار پکڑا ہوا تھا۔وہ لوگ بڑی گرمجوشی سے باتیں کررہے تھے۔ان میں سے کسی نے جیرا گجر کا نام لیا تھا اور فریدی یہ نام سن کر ہی ٹھٹکا تھا۔
چائے کی دکان کے ساتھ ہی فٹ پاتھ پر ایک اخبار فروش بھی بیٹھا ہوا تھا۔ایک چوڑے تختے پر اخبار سجے ہوئے تھے۔فریدی آگے بڑھ کر اخباروں کی سرخیاں دیکھنے لگا۔سب سے اوپر والے اخبار کے صفحۂ اول پر وہ چار کالمی سرخی نظر آگئی۔اس نے ہاتھ بڑھا کر اخبار اٹھا لیا اور خبر پڑھنے لگا۔اخبار کی اس اطلاع کے مطابق گزشتہ رات پولیس نے دیواز گارڈن میں جیرا گجر کے بنگلے پر چھاپا مار کر

تقریباً پینتیس کلو گرام ہیروئن برآمد کر کے تین آدمیوں کو گرفتار کرلیا تھا جبکہ جیرا گجر فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ اخبار کے مطابق ایک نہایت باوثوق خفیہ اطلاع ملنے پر پولیس کی اعلیٰ سطح پر ہونے والی ایک خفیہ میٹنگ میں یہ چھاپا مارنے کا فیصلہ کیا گیا تھا اور اس کارروائی میں حصہ لینے والے پولیس والوں کو بھی آخری لمحوں تک بے خبر رکھا گیا تھا کہ چھاپا کہاں اور کیوں مارا جا رہا ہے۔ اخباری اطلاع کے مطابق پولیس جیرا گجر اور اس کے دوسرے ساتھیوں کی تلاش میں شہر کے مختلف مقامات پر چھاپے مار رہی ہے۔

چھاپے کی یہ خبر پڑھ کر فریدی سناٹے میں آ گیا۔ اس کے پورے جسم میں سنسنی کی ایک لہر سی دوڑتی چلی گئی۔ اس نے اخبار والے کو پیسے دیے اور اخبار لے کر بینچ پر بیٹھ گیا اور ایک بار پھر اس خبر کو پڑھنے لگا۔ اسی دوران ہوٹل کے ملازم لڑکے نے پوچھے بغیر اس کے سامنے چائے کا کپ رکھ دیا تھا۔ فریدی چائے کی چسکیاں لیتے ہوئے اخبار پڑھنے لگا۔

وہ دل ہی دل میں پولیس کے اس افسر اعلیٰ کی تعریف کیے بغیر نہیں رہ سکا تھا جس سے اس نے گزشتہ روز ملاقات کی تھی۔ اس پولیس آفیسر نے اگرچہ فریدی سے یہ کہا تھا کہ وہ کل اس سے رابطہ قائم کرے گا لیکن ہوا یہ تھا کہ اس نے فریدی کی بات پر یقین کرتے ہوئے رات ہی کو جیرے کی کوٹھی پر چھاپا مار دیا تھا لیکن جیرا گجر بچ نکلا تھا جس کا فریدی کو افسوس تھا۔

فریدی، جیرا گجر کے خلاف پولیس کی اس کارروائی سے بے حد خوش تھا۔ اس کے ساتھ ہی اسے یہ بھی احساس ہو رہا تھا کہ اس نے اپنے لیے مزید خطرات پیدا کر لیے ہیں جیرا گجر ایسا بے وقوف بھی نہیں تھا کہ صورتِ حال کو سمجھ نہ سکتا۔ اس نے فریدی کی دکان کو آگ لگوائی تھی۔ مقصد فریدی کو اپنے قدموں پر جھکانا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ یہ نقصان اٹھانے کے بعد فریدی اس کے سامنے سر جھکا دے گا مگر فریدی نے اس کے خلاف مخبری کر کے اس کا چیلنج قبول کرلیا تھا۔ فریدی نے اسے کروڑوں کا نقصان پہنچایا تھا اور ظاہر ہے اتنے نقصان کے بعد جیرا گجر چین سے نہیں بیٹھے گا۔

فریدی وہاں سے اٹھ کر انار کلی کے ایک ریسٹورنٹ میں آ گیا۔ اس ریسٹورنٹ کا مالک فریدی کا دوست تھا۔ ریسٹورنٹ میں بیٹھے ہوئے لوگوں کا موضوعِ گفتگو بھی پولیس اور جیرا گجر ہی تھا۔ فریدی کاؤنٹر کے قریب ایک کرسی پر بیٹھا کچھ دیر تک لوگوں کی باتیں سنتا رہا پھر اٹھ کر اوپر سعید کے کمرے میں چلا گیا۔ اسے یقین تھا کہ جیرا گجر کے آدمی شکاری کتوں کی طرح اسے پورے شہر میں تلاش کرتے پھر رہے ہوں گے۔

فریدی نے سارا دن سعید کے ریسٹورنٹ کے رہائشی کمرے میں گزارا اور جب وہ باہر نکلا تو شام کا اندھیرا پھیل چکا تھا۔

اس رات فریدی گھر پہنچا تو گیارہ بج چکے تھے۔ گلی کے موڑ پر اس نے ایک آدمی کو تاریکی میں کھڑے دیکھا مگر فریدی نے اس پر توجہ نہیں دی لیکن وہ آدمی فریدی کو دیکھتے ہی تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا بھاٹی دروازے کی طرف چلا گیا۔

ساڑھے گیارہ بج گئے تھے۔ میز پر رکھا ہوا ریڈیو ہلکی آواز میں چل رہا تھا۔ فلمی گیتوں کا پروگرام آ رہا تھا۔ فریدی ریڈیو بھی سن رہا تھا اور ایک ڈائجسٹ بھی پڑھ رہا تھا۔ کہانی خاصی دلچسپ تھی۔ اس کی آنکھوں میں نیند بھری ہوئی تھی لیکن وہ اس کہانی کو ادھورا نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔

دفعتاً دھپ کی آواز سن کر وہ چونک گیا۔ یوں محسوس ہوا تھا جیسے کوئی دیوار سے کودا تھا۔ وہ چند لمحوں تک کچھ سننے کی کوشش کرتا رہا لیکن خاموشی رہی۔ وہ اسے اپنا وہم سمجھ کر پھر ڈائجسٹ پڑھنے لگا۔ ابھی اس نے چند سطریں ہی پڑھی تھیں کہ دھپ کی آواز دوبارہ سنائی دی، اس نے ڈائجسٹ بند کر دیا اور بستر سے اٹھنا ہی چاہتا تھا کہ کسی نے باہر سے کمرے کے دروازے کی کنڈی لگا دی۔

''ارے...... کون ہے باہر، کنڈی کھولو۔'' فریدی چیخ چیخ کر دروازہ دھڑ دھڑانے لگا۔

جواب میں خوفناک قہقہے گونجنے لگے۔ وہ کم از کم تین آدمی تھے۔ پھر فریدی کو یوں محسوس ہوا جیسے دروازے پر اور اس کے آس پاس پانی انڈیلا جا رہا ہو۔ دوسرے ہی لمحے فریدی کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ پیٹرول کی بُو اس کے نتھنوں سے ٹکرا رہی تھی۔ اسے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ پورے مکان میں پیٹرول چھڑکا جا رہا تھا۔ فریدی دروازے کو ٹکریں مارنے لگا مگر دروازہ بہت مضبوط تھا۔ ٹس سے مس نہیں ہوا۔ دروازے کی جھریوں سے باہر تیز نارنجی روشنی نظر آ رہی تھی۔ انہوں نے پیٹرول چھڑک کر آگ لگا دی تھی۔ ان کے شیطانی قہقہے فضا میں گونج رہے تھے۔

دروازہ آگ کی لپیٹ میں آ چکا تھا۔ فریدی بدحواس ہو کر کمرے میں اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ پچھلی دیوار میں روشن دان کے علاوہ ایسی کوئی جگہ نہیں تھی جہاں سے نکلنے کے بارے میں سوچا جا سکتا لیکن روشن دان بھی زیادہ بڑا نہیں تھا۔

باہر اب شور کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ آگ دیکھ کر شاید محلے کے لوگ جمع ہو گئے تھے لیکن اسی لمحے فضا فائرنگ کی آواز سے گونج اٹھی۔ آگ لگانے والے لوگوں کو دور رکھنے کے لیے ہوائی فائرنگ کر رہے تھے۔ ان کے پاس کلاشنکوف رائفلیں تھیں۔ ان میں سے ایک نے کمرے کے جلتے ہوئے دروازے پر بھی ایک برسٹ مارا۔ فریدی اگر دروازے کے سامنے ہوتا تو چھلنی ہو چکا ہوتا۔ وہ دیوار کی آڑ میں تھا اس لیے فائرنگ سے بچ گیا۔

آگ پھیل رہی تھی۔ دروازے کے اوپر بھی دائیں بائیں دو روشن دان تھے۔ وہاں سے آگ میں جلتے ہوئے کپڑے کے گولے اندر پھینکے گئے۔ پلنگ کے بستر اور بعض دوسری چیزوں نے فوراً ہی آگ پکڑ لی۔

فریدی بری طرح چیخ رہا تھا۔ کمرے میں بھی آگ پھیل رہی تھی۔ جیرا گجر بے حد بھیانک انداز میں اس سے اپنی بربادی کا انتقام لے رہا تھا۔ وہ اسے زندہ جلا دینا چاہتا تھا۔ فریدی میز پر چڑھ کر روشن دان پر قسمت آزمائی کرنے لگا۔ اس کے ہاتھ میں پھل کاٹنے والی چھری تھی جس سے وہ روشن دان کے آس پاس کی اینٹیں اکھاڑنے کی کوشش کر رہا تھا۔

اس نے ایک اور اینٹ اکھاڑ کر روشن دان کے لکڑی کے فریم کو پوری قوت سے پیچھے کی طرف دھکیلا۔ فریم باہر کی طرف جا گرا۔ فریدی نے اچک کر دیوار کے کنارے پر ہاتھ جما دیے اور اپنے جسم کو آہستہ آہستہ اوپر کھینچنے لگا۔ اس کے دائیں پائنچے کو...... آگ لگ گئی تھی۔ ٹخنے سے اوپر پنڈلی کی کھال جل رہی تھی۔ تکلیف اب ناقابلِ برداشت ہو رہی تھی۔ اس کے منہ سے خوفناک چیخ نکل گئی۔ لیکن اس نے ہمت نہیں ہاری اور وہ روشن دان میں سے نکلنے میں کامیاب ہو گیا۔

دوسرے مکان کی چھت پر کود کر اس نے سب سے پہلے اپنے لباس کی آگ بجھائی پنڈلی کی کھال جل گئی تھی لیکن زخم زیادہ گہرا نہیں تھا۔

پورا مکان آگ کی لپیٹ میں تھا۔ شعلے آسمان سے باتیں کر رہے تھے۔ گلی کی طرف سے لوگوں کے شور کی آواز سنائی دے رہی تھی اور صحن میں ان تینوں کے قہقہوں کی آوازیں گونج رہی تھیں۔ فریدی پڑوسیوں کے مکانوں کی چھتوں سے ہوتا ہوا ایک چکر لگا کر اپنے مکان کی گلی والی دیوار پر آ گیا۔ وہ تین ہی آدمی تھے جو صحن میں ناچتے ہوئے وحشیانہ انداز میں قہقہے لگا رہے تھے۔ ان تینوں کے ہاتھوں میں کلاشنکوف رائفلیں تھیں۔ فریدی دیوار پر کھڑا چند لمحے تو تنا رہا پھر اس نے للکارتے ہوئے ایک آدمی پر چھلانگ لگا دی۔ وہ تینوں تیزی سے مڑے مگر فریدی ایک آدمی پر گرا۔ وہ آدمی ڈھیر ہو گیا۔ فریدی نے اس کے ہاتھ سے کلاشنکوف چھین لی۔ دوسرے دونوں آدمی اسے دیکھ کر بدحواس ہو گئے۔ وہ اپنے تئیں فریدی کو زندہ جلا چکے تھے مگر فریدی کو زندہ دیکھ کر انہیں اپنی موت سامنے کھڑی نظر آنے لگی۔ ان دونوں نے رائفلیں سیدھی کرنے کی کوشش کی مگر فریدی نے انہیں مہلت نہیں دی۔ وہ رائفل چلانا نہیں جانتا تھا مگر اس نے ٹریگر دبا دیا۔ رائفل سے نکلنے والی گولیوں نے ان دونوں کے جسم چھلنی کر دیے۔ فریدی اب اس تیسرے آدمی کی طرف مڑا جس پر اس نے چھلانگ لگائی تھی لیکن وہ شخص باہر کے دروازے کی طرف چھلانگ لگا چکا تھا۔ فریدی نے فائر کرنا چاہا مگر رک گیا۔ گلی میں بہت سے لوگ موجود تھے۔ کوئی بے گناہ فائرنگ کی زد میں آ سکتا تھا۔ وہ للکارتا ہوا اس شخص کے پیچھے دوڑا۔

گلی میں بہت سے لوگ جمع تھے۔ انہیں ایک دوسرے کے پیچھے دوڑتے دیکھ کر لوگ ڈر کر اِدھر اُدھر ہٹ گئے۔ وہ شخص ایک اور گلی میں گھس گیا۔ فریدی نے کچھ دور تک اس کا پیچھا کیا مگر وہ شخص پُر پیچ گلیوں میں غائب ہو چکا تھا۔ فریدی واپس آ گیا۔ گلی میں اب بھی لوگوں کا ہجوم لگا ہوا تھا۔ کھلے ہوئے دروازے سے لوگوں نے مکان کے صحن میں دو لاشیں بھی دیکھ لی تھیں۔

"یہ لوگ مجھے زندہ جلانا چاہتے تھے۔ میں نے انہیں مار دیا ہے۔ ان کا تیسرا ساتھی بھاگ گیا ہے۔ یہ جیرا گجر کے آدمی ہیں۔ آگ بجھاؤ۔" فریدی چیخا۔

اب لوگ گھروں سے پانی لا لا کر بھڑکتی ہوئی آگ پر ڈالنے لگے مگر مکان پوری طرح آگ کی لپیٹ میں تھا۔ اس پر بالٹیوں سے قابو پانا ممکن نہیں تھا۔ اسی دوران شاید کسی نے فائر بریگیڈ کو بھی فون کر دیا تھا۔ فائر بریگیڈ کی گاڑی ان تنگ گلیوں میں نہیں آ سکتی تھی۔ البتہ پائپ یہاں تک پہنچ گئے۔ اس طرح دوسرے مکانوں کو تو آگ کی لپیٹ میں آنے سے بچا لیا گیا لیکن فریدی والا مکان پوری طرح جل کر راکھ ہو چکا تھا۔ آگ بجھنے کے بعد پولیس بھی پہنچ گئی۔ فریدی نے بتایا کہ جیرا گجر کے آدمیوں نے اسے زندہ جلانے کی کوشش کی تھی لیکن پولیس نے فریدی کو ان دو آدمیوں کے قتل کے الزام میں گرفتار کر لیا۔

فریدی کو سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ بعض ضمیر فروش اور

بددیانت پولیس آفیسر اب بھی جیرا گجر کے وفادار تھے اور مفرور ہونے کے باوجود وہ جیرا گجر کو تحفظ فراہم کر کے حقِ نمک ادا کررہے تھے۔ فریدی اچھی طرح جانتا تھا کہ اگر وہ تھانے پہنچ گیا تو اس کی زندگی کا باقی حصہ آہنی سلاخوں کے پیچھے ہی گزرے گا۔ اس وقت پولیس کی گرفت میں آنے کا مطلب یہ ہوتا کہ اسے ایک مظلوم کے بجائے مجرم کی حیثیت سے دنیا کے سامنے پیش کیا جاتا لہٰذا اس نے فیصلہ کرلیا کہ وہ پولیس کے جال میں نہیں پھنسے گا۔

بیسیوں لوگ اب بھی گلی میں جمع تھے۔ پولیس نے ابھی فریدی کو ہتھکڑی نہیں لگائی تھی۔ ایک پولیس والے نے اس کا ہاتھ گرفت میں لے رکھا تھا۔ فریدی نے ایک جھٹکے سے اپنا ہاتھ چھڑایا اور لوگوں کو دھکے دیتا ہوا گلی میں ایک طرف بھاگ نکلا۔ دو پولیس والے اس کے پیچھے بھاگے۔ انہوں نے ہوائی فائرنگ بھی کی تھی لیکن فریدی ان کے ہاتھ نہیں آیا۔

اس وقت صبح کے چار بج رہے تھے۔ ابھی اندھیرا ہی تھا۔ فریدی تنگ اور تاریک گلیوں میں دوڑتا ہوا لوہاری دروازے سے نکل کر انارکلی میں پہنچ گیا۔ اپنے دوست سعید کے ریسٹورنٹ تک پہنچنے میں اسے کوئی دشواری پیش نہیں آئی تھی۔

سعید اسے اتنے سویرے دیکھ کے حیران تھا۔ فریدی نے اسے تمام کتھا سے آگاہ کردیا۔

''اوہ! کھڑے کیوں ہو، بیٹھ جاؤ۔ اطمینان سے بات کریں گے۔'' سعید صبح کا ناشتا عام طور پر خود ہی تیار کیا کرتا تھا۔ ناشتا کرنے کے بعد ہی وہ ریسٹورنٹ میں جاتا تھا۔ فریدی ایک صوفے پر بیٹھ گیا تھا۔ سعید کچن میں آگیا۔ کچھ دیر بعد وہ دو کپ چائے تیار کر کے دوبارہ کمرے میں آگیا۔

''تم بہت گھبرائے ہوئے ہو، لو...... چائے پیو...... پھر اطمینان سے بات کریں گے۔'' سعید نے ایک کپ اس کی طرف بڑھادیا۔

فریدی واقعی بے حد گھبرایا ہوا اور بدحواس سا ہورہا تھا۔ چائے کے چند گھونٹ بھرنے کے بعد اس نے کپ سامنے کافی ٹیبل پر رکھ دیا۔ سعید کافی ٹیبل کے دوسری طرف پلنگ کی پٹی پر بیٹھا ہوا تھا۔

''ہاں، اب بتاؤ کیا قصہ ہے؟'' اس نے سوالیہ نگاہوں سے فریدی کی طرف دیکھا۔

''بات یہ ہے۔'' فریدی چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر شروع سے آخر تک جیرا گجر کے بارے میں بتانے لگا۔

''حیرت ہے تم نے جیرا گجر کے بارے میں سب کچھ اب تک مجھ سے چھپائے رکھا۔'' سعید نے اس کی بات کے جواب میں کہا۔ ''اور مزید حیرت یہ ہے کہ تم اب تک اس سے کیسے بچے رہے ہو۔ وہ تو ایسا زہریلا ناگ ہے جو اپنا راستہ کاٹنے والے کو بھی نہیں بخشتا۔ اس کی فطرت کے مطابق ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ جب تم نے پہلی مرتبہ انکار کیا تھا تو وہ تمہیں اسی وقت راستے سے ہٹادیتا۔''

''اس نے شروع میں شاید میرے معاملے میں کچھ شرافت کا مظاہرہ کیا تھا لیکن اب وہ اوچھے ہتھکنڈوں پر اتر آیا ہے۔''

''مجھے تم سے ہمدردی ہے فریدی۔ لیکن مجھے بتاؤ میں تمہارے لیے کیا کرسکتا ہوں۔'' سعید نے اس کے خاموش ہونے پر کہا۔

''اگر میں نے شرافت کو سینے سے لگائے رکھا تو زندگی بھر جیرا گجر جیسے لوگوں کے خوف سے منہ چھپائے پھرتا رہوں گا۔'' فریدی نے کہا پھر چند لمحوں کی خاموشی کے بعد بولا۔ ''تم نے ایک مرتبہ اپنے کسی ایسے دوست کا ذکر کیا تھا جو......''

''میں سمجھ گیا۔ تم شاید علی مہر کی بات کررہے ہو۔'' سعید نے اس کی بات کاٹ دی۔ ''وہ بھی جیرا گجر ہی کا ڈسا ہوا ہے۔ وہ اگرچہ ابھی تک جیرے کو کوئی خاطر خواہ نقصان نہیں پہنچا سکا مگر اس کے لیے مشکلات ضرور پیدا کیے ہوئے ہے۔ اس نے بھی ایک چھوٹا سا گروہ بنا لیا ہے۔ تم نے جیرا گجر سے ٹکر لے ہی لی ہے تو علی مہر تمہارا بہترین مددگار ثابت ہوسکتا ہے۔''

''علی مہر سے ملاقات کب اور کہاں ہوسکتی ہے؟'' فریدی نے پوچھا۔

''آج کا دن تم اسی کمرے میں آرام کرو۔ میں رات کو تمہیں اس کے پاس لے چلوں گا۔'' سعید نے جواب دیا۔ اس نے دیوار پر لگی ہوئی گھڑی کی طرف دیکھا۔ ساڑھے پانچ بج رہے تھے۔ ''تم میرے بستر پر آرام کرو...... میں ذرا نیچے دیکھ کر آتا ہوں۔ ریسٹورنٹ کھلنے کا وقت ہوگیا ہے۔ میں واپس آکر ناشتا تیار کروں گا۔ تم ناشتا کر کے سوجانا۔''

''تم نیچے کا چکر لگا آؤ، میں یہیں بیٹھا ہوں۔'' فریدی نے جواب دیا۔

سعید اٹھ کر ریسٹورنٹ کے اندر کی سیڑھیوں والے

دروازے میں غائب ہوگیا۔فریدی صوفے پر بیٹھا کمرے کی چیزوں کو گھورتا رہا۔پھر وہ سعید کے بارے میں سوچنے لگا۔اپنے والدین کے قتل کے الزام میں جیل جانے سے پہلے فریدی ساتویں کلاس کا طالب علم تھا۔سعید اس کا کلاس فیلو تھا۔وہ دوسری کلاس سے ساتھ ہی پڑھتے آرہے تھے۔ ان دونوں میں گہری دوستی تھی اور پھر تقدیر نے راستے بدل دیے۔فریدی دس سال کے لیے جیل چلا گیا۔جب وہ سزا بھگت کر جیل سے واپس آیا تو ایک روز لوہاری چوک پر مسلم مسجد کے نیچے ایک بک اسٹال پر دونوں کی ملاقات ہوگئی۔ فریدی وہاں کوئی کتاب خریدنے گیا تھا اور سعید بھی اپنی پسند کی کتاب تلاش کررہا تھا۔ان کا آمنا سامنا اگرچہ بارہ سال بعد ہوا تھا لیکن ان دونوں نے ایک دوسرے کو پہچان لیا تھا۔سعید اسے اپنے ریسٹورنٹ لے آیا۔

فریدی یہی سب کچھ سوچ رہا تھا کہ سعید واپس آگیا۔اس وقت سات بجنے والے تھے۔سعید نے کچن میں جاکر ناشتا تیار کیا۔دونوں نے بیٹھ کر ناشتا کیا اور پھر سعید باتھ روم میں جاکر لباس تبدیل کرنے لگا۔ چند منٹ بعد جب وہ نیچے ریسٹورنٹ میں جانے لگا تو فریدی کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

''تم اطمینان سے یہاں سوجاؤ۔ذہن میں کوئی ایسی ویسی بات لانے کی ضرورت نہیں۔''

''اگر تم پر اعتماد نہ ہوتا تو میں یہاں نہ آتا اور پھر تمہیں یہ سب کچھ نہ بتاتا۔''فریدی نے جواب دیا۔

''گڈ! میں تم سے یہی سننا چاہتا تھا۔اب تم آرام کرو۔میں دوپہر کے کھانے کے وقت تمہیں جگا دوں گا۔ اس دوران اگر تمہاری آنکھ کھل بھی گئی تو نیچے آنے یا دروازے سے جھانکنے کی حماقت مت کرنا۔''

''اطمینان رکھو، جب تم اوپر آؤ گے تو میں تمہیں سوتا ہوا ہی ملوں گا۔''فریدی نے مسکراتے ہوئے جواب دیا اور بستر پر لیٹ گیا۔

سعید جب دوپہر دو بجے اوپر آیا تو فریدی واقعی سو رہا تھا۔اس نے دروازہ بند کرکے کھانے کی ٹرے میز پر رکھ دی اور فریدی کو جگانے لگا۔

''جیرا گجر کا ایک آدمی صبح تقریباً ڈیڑھ گھنٹے تک ریسٹورنٹ میں بیٹھا رہا تھا۔''سعید نے کھانے کے دوران میں انکشاف کیا۔''اس نے ایک ویٹر سے بھی تمہارے بارے میں دریافت کیا تھا لیکن ویٹر نے لاعلمی کا اظہار کر دیا۔''

''لیکن اسے کیسے اندازہ ہوا کہ میں یہاں آسکتا ہوں؟''فریدی کے لہجے میں تشویش تھی۔

''تم چونکہ پہلے بھی یہاں آتے رہے ہو، ہوسکتا ہے کہ جیرے کو یہاں تمہاری آمدورفت کا علم ہو اور اسے شبہ ہو کہ تم یہاں پناہ لے سکتے ہو۔''سعید بولا۔

''ایسا ممکن ہے......لیکن اگر......''

''ذہن کو اُلجھانے کی ضرورت نہیں۔'' سعید نے اسے ٹوک دیا۔''تم اس وقت میری پناہ میں ہو، کوئی میری لاش پر سے گزر کر ہی تم تک پہنچ سکتا ہے۔''

فریدی نے کوئی جواب نہیں دیا۔وہ خاموشی سے کھانا کھاتا رہا۔سعید کھانے کے بعد صوفے پر لیٹ کر کچھ دیر تک آرام کرتا رہا اور جب وہ نیچے جانے لگا تو فریدی نے کہا۔

''اگر کوئی اخبار مل سکے تو......''

''ارے......تمہیں اخبار دینا تو میں بھول ہی گیا۔'' سعید نے پتلون کی جیب سے تہ کیا ہوا شام کو شائع ہونے والا ایک اخبار نکال کر اس کی طرف بڑھا دیا۔''لو، تم اخبار پڑھو میں چلتا ہوں۔ پولیس نے پریس کو بڑی دلچسپ خبر جاری کی ہے۔''

سعید چلا گیا۔فریدی نے اخبار کھولا تو اس کی شہ سرخی اسی سے متعلق تھی۔شام کے اخبارات کی اشاعت کا انحصار سنسنی خیز سرخیوں پر ہی ہوتا تھا۔مکان کی آتشزدگی کی خبر کو بھی سنسنی خیز بنانے کی پوری کوشش کی گئی تھی۔ اخبارات کو یہ خبر پولیس نے جاری کی تھی جس کے مطابق منشیات کا بدنام اسمگلر فریدی دو آدمیوں کو قتل کرکے فرار ہوگیا تھا۔اس خبر کی تیاری میں پولیس نے واقعی بڑی محنت کی تھی۔کہانی کے مطابق فریدی منشیات کا دھندا کرتا تھا۔گزشتہ رات تین منشیات فروشوں پر مشتمل ایک پارٹی اس سے مال خریدنے کے لیے آئی تھی۔ان کے پاس بارہ لاکھ کی رقم تھی۔فریدی کی نیت بدل گئی اور اس نے رقم پر قبضہ کرنے کے لیے ان میں سے دو کو کلاشنکوف سے فائرنگ کرکے قتل کردیا جبکہ تیسرا زخمی حالت میں بھاگ نکلنے میں کامیاب ہوگیا۔فریدی نے اپنا جرم چھپانے کے لیے مکان کو آگ لگا دی اور یہ تاثر دینے کی کوشش کی کہ اس کے دشمنوں نے اسے زندہ جلانے کی کوشش کی تھی۔ممکن ہے اس کی کہانی پر یقین کرلیا جاتا لیکن مقتولین کا تیسرا ساتھی پولیس کو صبح سویرے موچی دروازے کے قریب پارک میں زخمی حالت میں پڑا ہوا مل گیا۔اس کے جسم پر دو گولیاں لگی تھیں۔

اس نے مرنے سے پہلے پولیس کو بتایا کہ فریدی نے اسے زخمی اور اس کے ساتھیوں کو قتل کر دیا ہے۔

اخبار میں جلے ہوئے مکان اور اس کلاشنکوف رائفل کی تصویریں بھی شائع ہوئی تھیں جس کے بارے میں پولیس کا کہنا تھا کہ اس کلاشنکوف سے فریدی نے دونوں کو قتل کیا تھا۔ پوری خبر میں جیرا گجر کا نام تک نہیں آیا تھا۔

یہ خبر پڑھنے کے بعد فریدی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی۔ پولیس نے جیرا گجر کو تحفظ فراہم کرنے اور اسے مجرم ثابت کرنے کے سلسلے میں حق نمک خوب ادا کیا تھا۔

فریدی دن بھر اس کمرے میں محدود رہا۔ اس کا زیادہ وقت مطالعے میں گزرا تھا۔ سعید بہت اچھے ادبی ذوق کا مالک تھا۔ اس نے بڑی اچھی اچھی کتابیں جمع کر رکھی تھیں۔

رات گیارہ بجے کے قریب سعید کمرے میں آگیا۔ اس نے لباس تبدیل کیا اور فریدی کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

''تم باہر والی سیڑھیوں سے نیچے اترو۔ میں ریسٹورنٹ کی طرف سے آرہا ہوں۔''

فریدی سیڑھیوں سے اتر کر گلی میں آگیا۔ اس کے چند ہی سیکنڈ بعد سعید بھی ریسٹورنٹ سے نکل کر آگیا۔ وہ دونوں محتاط نگاہوں سے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے ایک طرف چلنے لگے۔ چند گز کا فاصلہ طے کرنے کے بعد انہیں ایک رکشا مل گیا۔

''مزنگ تک چلنا ہے۔'' سعید نے رکشا پر بیٹھتے ہوئے ڈرائیور کو بتایا۔

سعید اور فریدی کا رکشا شہر کی مختلف سڑکوں پر ہوتا ہوا مزنگ کے علاقے میں آگیا۔ دونوں رکشے سے اتر کے ایک سال خوردہ عمارت کے سامنے کھڑے تھے۔

سعید نے آگے بڑھ کر گیٹ کے ایک تختے کو زور زور سے کھٹکھٹایا فوراً ہی ایک آدمی کسی طرف سے نکل کر سامنے آگیا۔ اس نے چادر کی بُکل مار رکھی تھی اور دونوں ہاتھ چادر میں چھپے ہوئے تھے۔

''کون ہے بھئی؟'' اس نے گیٹ کے ٹوٹے ہوئے تختوں سے جھانک کر دیکھا۔

''گیٹ کھولو...... میں ہوں سعید......'' سعید نے کہا۔ ''سعید انارکلی والا۔''

''اوہو...... باؤ سعید...... خیر ہے نا؟'' اس شخص نے کہتے ہوئے جلدی سے گیٹ کھول دیا۔

''ہاں، خیریت ہی ہے۔ علی مہر موجود ہے نا۔'' سعید نے فریدی کے ساتھ اندر داخل ہوتے ہوئے کہا۔ اس شخص نے گیٹ فوراً ہی بند کر دیا تھا۔

''ہے جی...... آپ چلیں میرے ساتھ۔'' اس شخص نے جواب دیا اور وہ دونوں اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگے۔

بہت وسیع و عریض احاطہ تھا۔ فضا میں لید کی بُو رچی ہوئی تھی۔ کئی تانگے کھڑے نظر آرہے تھے۔ ایک طرف چند گھوڑے بھی بندھے ہوئے تھے۔ یہ تانگوں کا طویلہ تھا۔

احاطے کے آخر میں گنبد کے پچھلی طرف قدیم دیوار کے ساتھ تین چار کمرے بنے ہوئے تھے۔

وہ گنبد کے پچھلی طرف ایک کمرے میں داخل ہو گئے۔ کمرے میں دری بچھی ہوئی تھی اور تین آدمی بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک آدمی کے سامنے ہزار ہزار اور پانچ سو والے نوٹوں کے پانچ چھ بنڈل رکھے ہوئے تھے جبکہ دوسرے دونوں آدمیوں کے سامنے پلاسٹک کی تھیلیاں رکھی ہوئی تھیں جن میں سفید رنگ کا پوڈر بھرا ہوا تھا۔ یہ ہیروئن تھی۔ جس شخص کے سامنے نوٹوں کے بنڈل رکھے ہوئے تھے وہ علی مہر تھا۔ وہ سعید کو دیکھتے ہی اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

''آؤ باؤ سعید۔ آج کدھر راستہ بھول گئے؟'' اس نے سعید کو اس طرح گلے سے لگا لیا جیسے مدتوں بعد ملاقات ہوئی ہو۔ پھر وہ ان کے ساتھ آنے والے شخص کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

''اوئے گامے...... میرا یار آیا ہے۔ کوئی لسی پانی کا بندوبست کر...... گلو کو بھیج دے۔ چوک سے بوتلیں لے کر آئے اور تو گیٹ پر اپنی ڈیوٹی سنبھال۔''

مہر نے وہاں بیٹھے ہوئے دونوں آدمیوں کی طرف اشارہ کیا۔ وہ بھی اپنی اپنی تھیلیاں اٹھا کر کمرے سے نکل گئے۔

''بیٹھو میرے یار، بڑی مدتوں بعد درشن کرایا ہے۔'' مہر نے انہیں دری پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

''کام میں مصروفیت کی وجہ سے کہیں جانے کا موقع ہی نہیں ملتا۔'' سعید نے بیٹھتے ہوئے جواب دیا پھر فریدی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ''یہ میرا دوست ہے فریدی، بالکل بھائیوں جیسا۔''

''پھر تو اپنا بھی بھائی ہوا۔ کہو کیسے آنا ہوا؟'' مہر نے کہا۔

''معاملہ کچھ سنگین ہے۔ فریدی کو تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔'' سعید بولا۔

''جان لکی بھی حاضر ہے باؤ سعید۔ تُو بات تو کر کے دیکھ..... علی مہر بھی پیچھے ہٹا ہے۔ لعنت ہے اس آدمی کی زندگی پر جو یاروں کے کام نہ آئے۔'' مہر نے کہا۔

سعید کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ اسی وقت ایک آدمی کمرے میں داخل ہوا۔ اس نے پہلے سعید اور فریدی کی طرف دیکھا پھر جیب سے نوٹوں کا ایک بنڈل نکال کر مہر کی طرف بڑھا دیا۔ مہر نے نوٹ گنے پھر اپنے قریب رکھے ہوئے لکڑی کے ایک صندوقچے میں سے ہیروئن کی ایک تھیلی نکال کر اس شخص کے حوالے کر دی۔ وہ شخص فوراً ہی باہر نکل گیا۔

''ہاں باؤ سعید، بتاؤ کیا بات ہے؟'' مہر، سعید کی طرف متوجہ ہوگیا۔

سعید چند لمحے خاموش رہا پھر فریدی کے بارے میں بتانے لگا۔ بیچ بیچ میں فریدی بھی بولتا رہا تھا۔

''کوئی بات ہی نہیں باؤ سعید۔'' اس کے خاموش ہونے پر مہر نے کہا۔ ''جیرا گجر سے مجھے ابھی اپنا حساب لینا ہے۔ میں اپنے چھوٹے بھائی کو ابھی تک نہیں بھولا جسے اس نے تڑپا تڑپا کر مارا تھا۔ میرے بھائی نے اس خبیث کے لیے بڑی قربانیاں دی تھیں۔ اس کے لیے پولیس کی مار کھائی تھی، جیل کاٹی تھی، اسے کاروبار میں لاکھوں کا فائدہ پہنچایا تھا مگر ایک معمولی سی غلطی پر جیرے نے اسے تڑپا تڑپا کر مار ڈالا۔ اگر میں اس کے شکنجے سے نہ بھاگ نکلتا تو وہ مجھے بھی زندہ نہ چھوڑتا۔ میں اس شہر میں اب اس کا سب سے بڑا کاروباری حریف ہوں لیکن میں نے ابھی تک اس کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی کیونکہ میں جانتا ہوں کہ وہ مجھ سے زیادہ طاقتور ہے لیکن وقت آنے پر میں اس پر ہاتھ ضرور ڈالوں گا۔ دو دن پہلے جب مجھے پتا چلا کہ اس کے اڈے پر زبردست چھاپا پڑا ہے تو مجھے بڑی حیرت ہوئی تھی کہ کون ایسا مائی کا لعل تھا جس نے اس کی مخبری کی تھی۔ اب اس مائی کے لعل کو دیکھ کر مجھے بڑی خوشی ہو رہی ہے۔ دل خوش کر دیا ہے تم نے باؤ فریدی۔ مجھے اپنا بھائی ہی سمجھو۔ اگر ہم اکٹھے رہے تو تھوڑے ہی عرصے میں جیرے بدمعاش کو سڑکوں پر بھیک مانگنے پر مجبور کر دیں گے۔''

''فریدی اب تمہارے ہی ساتھ رہے گا مہر۔'' سعید نے کہا۔ ''جیرا گجر کے آدمی شکاری کتّوں کی طرح پورے شہر میں اس کی بُو سونگھتے پھر رہے ہیں۔ پولیس بھی اس کی تلاش میں ہے۔ اس کی حفاظت کی ذمے داری تم پر ہوگی۔''

''کوئی فکر کی بات ہی نہیں سعید باؤ۔'' مہر نے جواب دیا۔ ''میرے ہوتے ہوئے کوئی اس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھ سکتا۔ اس کی طرف اٹھنے والے ہاتھ کاٹ دیے جائیں گے۔''

''بس تو ٹھیک ہے..... اب میں چلتا ہوں۔'' سعید کہتے ہوئے اٹھ گیا۔

اسی وقت بارہ تیرہ سال کی عمر کا ایک لڑکا کولڈ ڈرنکس کی بوتلیں لے کر اندر داخل ہوا۔ وہ بوتلیں پینے لگے۔ اسی دوران ... مہر کا ایک اور گاہک آ گیا۔ وہ بھی ان دونوں کو دیکھ کر جھجکا تھا۔

''اوئے ڈرتے کیوں ہو۔ یہ اپنے ہی آدمی ہیں۔ جیب ڈھیلی کر اور مال لے جا۔'' مہر نے گاہک کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

اس شخص نے نوٹوں کا ایک بنڈل نکال کر مہر کی طرف بڑھا دیا۔ مہر نے نوٹ گنے اور صندوقچے میں سے ایک چھوٹی تھیلی نکال کر اس شخص کے ہاتھ میں تھما دی۔ وہ فوراً ہی باہر نکل گیا۔

''اچھا باؤ سعید، تم بھی چلو اور اپنے یار کی طرف سے بے فکر ہو جاؤ —'' وہ سعید کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

اب سمجھا میں آیا کہ پرفیوم کی وجہ سے میرے کپڑوں میں کیڑے مکوڑے گھستے ہیں

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

سعید، مہر اور فریدی سے ہاتھ ملا کر رخصت ہو گیا۔ مہر نے آواز دے کر ایک لڑکے کو بلایا اور اسے ہدایت کی کہ کونے والے کمرے میں فریدی کے لیے بستر لگا دیا جائے پھر اس نے فریدی سے کہا کہ وہ کمرے میں جا کر آرام کرے۔ کچھ دیر بعد وہ بھی اس کے پاس آ جائے گا اور وہ اطمینان سے باتیں کریں گے۔

فریدی اس لڑکے کے ساتھ کمرے سے نکل آیا۔ اس طویل و عریض احاطے میں تاریکی تھی۔ لیکن نجانے کیوں فریدی کو یہ احساس ہو رہا تھا کہ اس تاریکی میں کچھ آنکھیں اسے گھور رہی ہیں۔ احاطے میں بہت سے لوگوں کی موجودگی کا احساس بڑھتا جا رہا تھا۔

وہ اس لڑکے کے ساتھ آخری کمرے میں آ گیا۔ وہاں بھی فرش پر دری بچھی ہوئی تھی اور سامنے والی دیوار کے ساتھ ایک چارپائی بھی تھی جس پر صاف ستھرا بستر بچھا ہوا تھا۔ لڑکے نے چادر جھاڑ دی اور فریدی کی طرف دیکھتا ہوا باہر نکل گیا۔

گہرے سناٹے میں کبھی کبھی کسی گھوڑے کے ہنہنانے کی آواز عجیب سا تاثر پیدا کر دیتی۔ فریدی چھت کو گھورتا ہوا علی مہر کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اس کے کہنے کے مطابق وہ ایک شریف آدمی تھا۔ محنت کر کے عزت کی روزی کماتا تھا مگر جیرا گجر جیسے آدمیوں اور پولیس نے اسے مجرم بنا دیا تھا۔ اس نے کئی مرتبہ جرائم کی دنیا سے نکلنے کی کوشش کی تھی مگر پولیس نے اس کے گرد ایسا مضبوط جال بُن رکھا تھا کہ وہ کوشش کے باوجود اس سے نہیں نکل سکتا تھا اور اب وہ گردن تک اس دلدل میں پھنس چکا تھا۔ فریدی کی اپنی کہانی مہر سے مختلف نہیں تھی۔

فریدی اپنی سوچوں میں گم تھا کہ مہر دروازے میں داخل ہوا۔ اس کے ساتھ ایک اور آدمی بھی تھا اور پھر تھوڑے تھوڑے وقفے سے کچھ اور آدمی اس کمرے میں جمع ہوتے گئے۔ ان کی تعداد سات تھی۔ علی مہر نے فریدی سے ان سب کا تعارف کرایا پھر اپنے آدمیوں کو مخاطب کرتے ہوئے بولا۔

''تم سب لوگ کان کھول کر سن لو...... آج سے باؤ فریدی ہمارا ساتھی ہے۔ میرے بعد اسی کو سب سے زیادہ حیثیت حاصل ہوگی جس نے فریدی کا حکم ماننے سے انکار کیا اسے غدار سمجھا جائے گا اور غداری کی سزا تم سب لوگ جانتے ہو۔ فریدی وہ شخص ہے جس نے جیرا گجر پر ایسی کاری ضرب لگائی ہے جسے وہ قیامت تک نہیں بھول سکے گا۔ مجھے یقین ہے کہ جیرے کا انجام بھی اسی کے ہاتھوں ہوگا۔ اس کے دشمن آج سے ہمارے دشمن ہیں اور جیرا گجر تو ویسے بھی ہمارا پرانا دشمن ہے۔ میں نے باؤ فریدی کو اپنا نائب بنایا ہے کسی کو کوئی اعتراض تو نہیں۔''

''نہیں استاد مہر۔'' گامے نے گویا سب کی نمائندگی کرتے ہوئے کہا۔ ''تم نے یہ فیصلہ کچھ سوچ سمجھ کر ہی کیا ہوگا۔ ہم میں سے کسی کو اعتراض نہیں ہے۔''

''مجھے یہی امید تھی۔'' مہر نے کہا۔ ''گامے! کل سے تم باؤ فریدی کے ساتھ رہو گے۔ اسے ساتھ لے جا کر تمام اڈے دکھا دینا اور یہ بات ذہن میں رکھنا کہ جیرے گجر کے علاوہ بھاٹی کی پولیس بھی اس کی تلاش میں ہے۔ اسے کوئی نقصان نہیں پہنچنا چاہیے۔''

''فکر ہی نہ کرو استاد۔ گاما اس پر کوئی آنچ نہیں آنے دے گا۔'' گامے نے جواب دیا۔

ٹھیک اسی لمحے ایک آدمی کمرے میں داخل ہوا۔ اس کے چہرے پر بدحواسی کے تاثرات نمایاں تھے۔

''کیا بات ہے باٹی پہلوان۔ بدحواس کیوں ہو رہے ہو؟ کوئی طوفان آ گیا ہے کیا؟'' مہر نے نووارد کو گھورا۔

''غضب ہو گیا استاد۔'' نووارد باٹی پہلوان نے جواب دیا۔ ''کچھ لوگ احاطے کو گھیرے میں لینے کی کوشش کر رہے ہیں۔ دو آدمی دائیں طرف والے موٹر ورکشاپ پر چڑھ کر پچھلی طرف گئے ہیں اور دو آدمیوں کو میں نے دائیں طرف بھی جاتے ہوئے دیکھا ہے اور مجھے یقین ہے کہ احاطے کے پچھلی طرف کی گلی میں بھی کچھ لوگ اوپر آنے کی کوشش کر رہے ہوں گے۔''

''پولیس؟'' مہر نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

''نہیں، میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ وہ پولیس والے نہیں ہیں۔'' باٹی پہلوان نے جواب دیا۔

''یہاں آتے ہوئے کسی نے تمہارا تعاقب تو نہیں کیا تھا؟'' اس مرتبہ مہر نے سوالیہ نگاہوں سے فریدی کی طرف دیکھا۔

''ہم نے اس طرف آتے ہوئے پوری احتیاط سے کام لیا تھا لیکن یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ البتہ صبح جیرا گجر کے ایک آدمی کو سعید کے ریسٹورنٹ میں دیکھا گیا تھا۔'' فریدی نے جواب دیا۔

''اوہ۔'' مہر بولا۔ ''تو پھر یہ یقیناً اسی کے آدمی ہوں گے مگر یہ بچ کر نہیں جا سکتے۔'' مہر نے بات ختم کی ہی تھی

کہ احاطے کے دائیں طرف کی چھتوں پر سے فائرنگ شروع ہوگئی۔ فائرنگ کا رخ انہی کمروں کی طرف تھا جن میں روشنی ہورہی تھی۔

''بتی بجھا دو اور دلاور تم انہیں روکنے کی کوشش کرو اور باقی لوگ مقبرے میں پہنچنے کی کوشش کریں۔''

کمرے کی بتی بجھا دی گئی۔ دلاور کے پاس کلاشنکوف تھی۔ وہ کمرے سے نکل کر تاریکی میں دوڑتا ہوا ایک طرف نکل گیا اور پوزیشن لے کر جوابی فائرنگ کرنے لگا۔ چھت پر سے فائرنگ کرنے والے بھی اب اسی طرف فائرنگ کرنے لگے۔ موقع سے فائدہ اٹھا کر تمام آدمی کمرے سے نکل کر مقبرے کی طرف دوڑے۔ مقبرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ سب لوگوں کے اندر آتے ہی دروازہ بند کردیا گیا اور بتی جلادی گئی۔

مہر وسط میں قبر کے قریب جھک کر بیٹھ گیا۔ قبر کا تعویذ تقریباً دو فٹ اونچا تھا۔ مہر نے قبر کے قریب فرش کی ایک اینٹ نکال دی۔ اس کے نیچے ایک چھوٹا سا گڑھا تھا اور ایک کنڈے میں تالا لگا ہوا تھا۔ فریدی کو یہ تالا اور کنڈا دیکھ کر حیرت ہوئی۔ مہر نے جیب سے چابی نکال کر تالا کھول دیا اور کنڈے کو پکڑ کر اوپر کھینچنے لگا۔ قبر کا تعویذ صندوق کے ڈھکنے کی طرح اوپر اٹھتا چلا گیا۔ اس کے ساتھ ہی فریدی کی آنکھیں بھی حیرت سے پھیلتی چلی گئیں۔

قبر خاصی گہری تھی۔ فریدی نے قبر میں جھانک کر دیکھا تو اسے حیرت کا ایک اور جھٹکا لگا۔ قبر کے اندر چبوترے کے نیچے چاروں طرف غار سے بنے ہوئے تھے اور ان میں لکڑی کی پیٹیوں کے علاوہ اسلحہ بھی بھرا ہوا تھا۔ کلاشنکوف رائفلوں کے علاوہ کارتوسوں کی پیٹیاں، میگزین اور راکٹ بھی کثیر تعداد میں موجود تھے۔

ایک آدمی قبر میں اتر گیا اور کلاشنکوف رائفلیں اٹھا اٹھا کر اپنے ساتھیوں کو دینے لگا۔ ایک کلاشنکوف فریدی کے ہاتھ میں بھی تھمادی گئی۔

''کلاشنکوف چلا لیتے ہونا؟'' مہر نے پوچھا۔

''زندگی میں پہلی مرتبہ کل رات کلاشنکوف ہاتھ میں پکڑی تھی۔'' فریدی نے جواب دیا۔ مہر نے اس سے کلاشنکوف لے کر اسے چیک کیا۔ سیفٹی کیچ ہٹا دیا اور کلاشنکوف دوبارہ اس کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے بولا۔

''اب تمہیں ٹریگر دبانے کے سوا اور کچھ نہیں کرنا۔''

سب لوگوں کے ہاتھوں میں رائفلیں پہنچ چکی تھیں۔ مہر نے قبر کا تعویذ گرا کر کنڈے میں تالا لگا دیا اور پھر بتی بجھتے ہی سب لوگ مقبرے سے باہر نکل کر اِدھر اُدھر دوڑتے ہوئے چاروں طرف پھیل گئے۔

احاطے پر تین اطراف سے فائرنگ ہورہی تھی۔ مہر کے آدمیوں نے بھی پوزیشن لے کر فائرنگ شروع کردی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہاں ایک پورا محاذ کھل گیا ہو۔ فضا فائرنگ کی خوفناک آوازوں سے گونج رہی تھی۔

فریدی، گامے کے ساتھ تھا۔ وہ دونوں اینٹوں کے ایک ڈھیر کے پیچھے پوزیشن سنبھالے احاطے کے پچھلی طرف مکان پر فائرنگ کررہے تھے جس کی چھت پر تین آدمی اُن پر جوابی فائرنگ کررہے تھے۔

دفعتاً فضا میں ایک خوفناک چیخ گونج اٹھی۔ وہ مہر تھا جس کے بازو میں گولی لگی تھی۔ فریدی چیخ سن کر اس کی طرف دوڑا۔ ابھی اس نے چار گز کا فاصلہ طے کیا تھا کہ وہ خود بھی چیختا ہوا ڈھیر ہوگیا۔ اس کی پنڈلی میں گولی لگی تھی جو گوشت کو چیرتی ہوئی نکل گئی تھی۔ وہ کلاشنکوف سنبھالے گھسٹتا ہوا دوبارہ اینٹوں کے ڈھیر کی آڑ میں آگیا اور اندھا دھند فائرنگ کرنے لگا۔ فضا میں ایک اور خوفناک چیخ گونجی۔ چھت سے فائرنگ کرنے والا مخالف پارٹی کا ایک آدمی فریدی کی گولی کا نشانہ بن کر قلابازی کھاتا ہوا احاطے کے اندر کی طرف گرا تھا۔

عجیب قیامت کا منظر تھا۔ فائرنگ کے شور سے احاطے میں بندھے ہوئے گھوڑے بھی بدک گئے تھے اور ہنہناتے ہوئے اپنی اپنی جگہوں پر اچھل رہے تھے۔

فائرنگ میں کچھ اور شدت آگئی تھی۔ فریدی کی ٹانگ سے خون بہہ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر کرب کے آثار تھے۔ اس نے تکلیف کو دبانے کے لیے سختی سے دانت بھینچ رکھے تھے لیکن اس نے کلاشنکوف ہاتھ سے نہیں چھوڑی تھی۔

تقریباً ایک گھنٹے تک دونوں طرف سے مسلسل فائرنگ ہوتی رہی اور بالآخر مخالف پارٹی کے آدمی چھتوں سے کود کر فرار ہوگئے۔ وہ اپنے دو ساتھیوں کی لاشیں وہیں چھوڑ گئے تھے۔ مہر کے آدمی گنبد کے سامنے جمع ہوگئے۔ مہر کا اپنا بازو زخمی تھا لیکن اسے فریدی کی زیادہ فکر تھی۔

''اوئے گامے۔'' مہر چیخا۔ ''باؤ فریدی کو وین میں بٹھا کر نسبت روڈ والے اڈے پر پہنچ جا۔ جلدی کر...... پولیس آنے والی ہوگی۔''

گاما احاطے کے پچھلی طرف چلا گیا جہاں تانگوں کے پیچھے سیاہ رنگ کی ایک پرانی سی اسٹیشن ویگن کھڑی تھی۔ اس نے پھرتی سے انجن اسٹارٹ کردیا۔ اسٹیشن ویگن اگرچہ

دیکھنے میں کھٹارا سی نظر آرہی تھی لیکن اس کا انجن اے ون کنڈیشن میں تھا۔ پہلی مرتبہ سیلف دباتے ہی انجن اسٹارٹ ہوگیا تھا۔

”چل باؤ...... بیٹھ جا جلدی سے۔ رحمت، جیدی تم لوگ بھی بیٹھ جاؤ اور دشمنوں کی یہ دونوں لاشیں بھی ڈال لو۔ راستے میں کہیں پھینک دینا، جلدی کرو۔“ مہر بولا۔

”لیکن مہر تم......“ فریدی بولا۔ ”تمہارا بازو زخمی ہے اور خون بہہ رہا ہے۔“

”میری فکر مت کرو......“ مہر چیخا۔ ”جیدی، لاشوں کو وین میں ڈالو۔“

جیدی اور رحمت نے مخالف پارٹی کے دونوں آدمیوں کی لاشیں اٹھا کر وین کے فرش پر ڈال دیں اور اوپر پرانی بوریاں پھینک دیں۔ وہ دونوں بھی وین کے پچھلے حصے میں سوار ہوگئے۔

اس وقت رات کا ڈیڑھ بج رہا تھا۔ سڑکیں سنسان پڑی تھیں۔ کبھی کوئی اکا دکا گاڑی گزر جاتی۔ تقریباً ایک میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد گامے نے ایک ویرانی سڑک پر ویگن روک لی۔

”جیدی!“ گامے نے پیچھے مڑ کر کہا۔ ”لاشوں کو اٹھا کر اس گندے نالے میں پھینک دو، جلدی کرو۔“

وہ دونوں دروازہ کھول کر پھرتی سے نیچے اترے اور بوریوں کے نیچے چھپی ہوئی لاشیں باہر کھینچنے لگے۔ فریدی کھڑکی سے باہر جھانک رہا تھا۔ وہ گندا نالا تقریباً چھ فٹ چوڑا تھا۔ اس کے دوسری طرف ایک میدان سا تھا اور میدان کے بعد رہائشی علاقہ تھا جہاں اونگھتی ہوئی سی روشنیاں نظر آرہی تھیں۔

رحمت اور جیدی نے ایک منٹ سے بھی کم وقت میں دونوں لاشیں ویگن سے نکال کر نالے میں پھینک دیں اور ہاتھ جھاڑتے ہوئے ویگن میں بیٹھ گئے اور ویگن حرکت میں آگئی۔ فریدی اس وقت اپنے آپ میں عجیب سی کیفیت محسوس کر رہا تھا۔ انسان کی زندگی بے معنی ہو کر رہ گئی تھی اور پھر ان لاشوں کو کس قدر سنگدلی سے گندے نالے میں پھینک دیا گیا تھا۔ جیسے وہ انسان نہ ہوں، کتے ہوں، جن کی لاشوں کو گھسیٹ کر گندے نالے میں پھینک دیا جاتا ہے۔ کیا اس کا بھی یہی انجام ہوگا؟ یہ سوچتے ہی وہ کانپ اٹھا۔

اسٹیشن ویگن مختلف سڑکوں پر دوڑتی رہی۔

اسٹیٹ بینک اور جنرل پوسٹ آفس کے درمیان والی سڑک سے نکل کر شاہدرہ قائد اعظم عبور کرتے ہوئے ٹیلی گراف آفس والی بلڈنگ کے قریب ایک پولیس پارٹی نے انہیں روک لیا۔

”کون ہو تم لوگ اور اس وقت کہاں سے آرہے ہو؟“ پولیس پارٹی کے ہیڈ کانسٹیبل نے ویگن میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔

”اداکار ہیں سرجی۔ اسٹوڈیو سے آرہے ہیں۔ فلم کی شوٹنگ ہو رہی تھی۔“ گامے نے جواب دیا۔

”کہاں کے اداکار ہو تم لوگ۔ کسی فلم میں تم لوگوں کی صورت تو نہیں دیکھی۔ میں نے تو کبھی کوئی فلم نہیں چھوڑی۔ ساری فلمیں دیکھتا ہوں۔“ ہیڈ کانسٹیبل نے باری باری سب کو گھورا۔

”ہم ایکسٹرا لوگ ہیں سرجی۔ تھوڑی دیر کے لیے اسکرین پر آتے ہیں۔ ہمارا چہرہ کون یاد رکھتا ہے مگر کیا یہ چہرہ بھی تم نے کبھی نہیں دیکھا سرجی، اپنا پردیسی باؤ تو ہر دوسری فلم میں سلطان راہی کے ساتھ ہوتا ہے۔“ گامے نے فریدی کی طرف اشارہ کیا۔

”ہاں...... یہ چہرہ کچھ جانا پہچانا تو لگتا ہے مگر اس کا رنگ کیوں اڑا ہوا ہے؟“ ہیڈ کانسٹیبل فریدی کو گھورنے لگا۔

”سرجی، شوٹنگ کے دوران دیوار سے گر کر اپنا پردیسی باؤ زخمی ہو گیا تھا۔ ہم اسے لے کر میو اسپتال جا رہے ہیں۔ اب اگر آپ اجازت دیں تو......“

”اوہ...... ٹھیک ہے، جاؤ...... زیادہ چوٹ تو نہیں لگی پردیسی باؤ۔“ ہیڈ کانسٹیبل نے آخری جملہ فریدی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”نہیں، ٹانگ پر چوٹ لگی ہے۔ شاید کوئی کیل وغیرہ پنڈلی میں گھس گئی ہے۔“ فریدی نے جواب دیا۔

”ٹھیک ہے۔ جلدی سے اسپتال جا کر مرہم پٹی کراؤ۔“ ہیڈ کانسٹیبل کہتے ہوئے پیچھے ہٹ گیا۔

گامے نے انجن اسٹارٹ کر کے ویگن آگے بڑھا دی۔

”دیکھا تم نے باؤ فریدی۔ کیسے بے وقوف بنایا ان پولیس والوں کو؟“ گاما نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔

”اگر وہ ویگن کی تلاشی لے کر سیٹوں کے نیچے سے کلاشنکوف رائفلیں برآمد کر لیتے تو تمہاری ساری اداکاری دھری کی دھری رہ جاتی۔“ فریدی نے جواب دیا۔

”ہم بھی کچے اداکار نہیں ہیں باؤ فرید۔“ گامے نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ ”تم بھی آہستہ آہستہ یہ سب سیکھ جاؤ گے۔“

کچھ دور جانے کے بعد ویگن ہال روڈ پر میو اسپتال

کی طرف مڑ گئی۔ میو اسپتال وہاں سے زیادہ دور نہیں تھا۔ اسپتال کے گیٹ کے سامنے چوک پر بیشتر میڈیکل اسٹور کھلے ہوئے تھے۔

گامے نے چوک پر اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے ویگن دائیں طرف موڑ لی۔ چند گز آگے چوک عبور کرتے ہی اس نے رفتار بڑھا دی۔ نسبت روڈ پر سناٹا تھا۔ لکشمی چوک سے تقریباً دو فرلانگ پہلے اس نے ویگن کی رفتار کم کر کے اسے ایک کھنڈر نما عمارت کے گیٹ کی طرف موڑ دیا۔

یہ بھی ایک بہت بڑا احاطہ تھا اور اس میں بھی بہت سے تانگے کھڑے تھے اور کئی گھوڑے بندھے ہوئے تھے۔ ویگن جیسے ہی گیٹ کے اندر داخل ہوئی، ایک آدمی تاریکی سے نکل کر سامنے آ گیا۔

''کیا بات ہے گامے استاد، تم اس وقت یہاں کیسے؟'' اس شخص نے ویگن رکتے ہی پوچھا۔

''ہونا کیا ہے۔'' گامے نے گاڑی سے اترتے ہوئے جواب دیا۔ ''جیرے گجر کی پارٹی نے حملہ کر دیا تھا۔ دو بندے ہمارے ہاتھوں خرچ کروا کے بھاگ گئے اور ہمارا باٹی پہلوان بے چارہ اللہ کو پیارا ہو گیا۔ بہت اچھا آدمی تھا وہ...... یاروں کا یار تھا۔''

''باٹی پہلوان!'' اس شخص نے ایک گہرا سانس لیا۔ ''اپنے ایک باٹی پہلوان کے بدلے میں جیرے گجر کے دو آدمی نہ پھڑکائے تو حمیدا پہلوان نہ کہنا۔''

''اللہ باٹی پہلوان کو جنت نصیب کرے، تو جا کے ساتے کو جگا دے۔ باؤ فریدی کی مرہم پٹی کرنی ہے۔ ٹانگ میں گولی لگی ہے۔'' گامے نے کہا۔

''یہ باؤ فریدی کون ہے اوئے گامے؟'' حمیدے نے کہا۔

''اب تم بلاوجہ وقت برباد کر رہے ہو، جاؤ اسحاق کو جگا دو۔'' گامے نے کہا۔

حمیدا پہلوان احاطے کے اندرونی حصے میں دوڑ گیا۔ فریدی، جیدی اور رحمت ویگن سے اتر آئے۔ یہاں بھی فضا میں لید کی بُو رچی ہوئی تھی۔ کئی تانگے کھڑے تھے اور گھوڑے بھی بندھے ہوئے تھے۔ وہ احاطے کے پچھلے حصے میں ایک کمرے میں آ گئے۔ یہ کمرا لکڑی کی پرانی پیٹیوں کے تختوں سے بنایا گیا تھا۔ چھت بھی تختوں ہی کی تھی لیکن اس کے اوپر ترپال ڈالی ہوئی تھی۔

فریدی ان لوگوں کے ساتھ کمرے میں داخل ہوا تو حمیدے نے بتی جلا دی اور چٹائی پر سوئے ہوئے ایک شخص کو جھنجوڑ جھنجوڑ کر جگا دیا تھا۔ وہ اسحاق تھا جسے گامے نے ساتے کے نام سے مخاطب کیا تھا۔

''کیا بات ہے گامے...... تم نہ خود چین سے بیٹھتے ہو اور نہ دوسروں کو بیٹھنے دیتے ہو۔'' ساتے نے جماہی لیتے ہوئے کہا۔

''ڈاکٹر صاحب! آنکھیں کھول کے بیٹھو۔ ایک مریض آیا ہے۔ اپنا تھیلا نکالو اور جلدی سے مرہم پٹی کرو۔ خون پہلے ہی بہت ضائع ہو چکا ہے۔'' گامے نے اسے کندھے سے پکڑ کر جھنجوڑ دیا۔

ساقا پہلوان کو سنبھلنے میں ایک دو منٹ لگ گئے پھر اس نے کمرے کے کونے میں پڑا ہوا ایک صندوق کھولا۔ پہلے فریدی کے زخم کا جائزہ لیا پھر صندوقچے میں سے اسپرٹ نکال کر زخم صاف کرتے ہوئے بولا۔

''شکر کرو گولی گوشت چیرتی ہوئی نکل گئی ہے۔ اگر ہڈی کو چھو جاتی تو بڑا مسئلہ ہو جاتا۔''

فریدی چونک گیا۔ اس نے زخم دیکھتے ہی بتا دیا تھا کہ گولی لگی ہے۔ اس نے زخم اچھی طرح صاف کر کے بڑے سلیقے سے ڈریسنگ کر دی اور دو گولیاں نکال کر اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔

''یہ دونوں گولیاں ابھی کھا لو۔ فکر کی بات نہیں ہے۔ تمہارے جیسے جوان مرد کے لیے تو معمولی سا زخم ہے۔''

گامے نے ایلومینیم کے ایک میلے سے گلاس میں پانی لا دیا۔ فریدی نے دونوں گولیاں کھا لیں۔

ساقا پہلوان نے اپنا صندوقچہ سنبھال کر ایک طرف رکھ دیا اور اٹھ کر کمرے سے باہر نکل گیا۔ حمیدا اور رحمت بھی باہر چلے گئے تھے۔ گاما، فریدی کے پاس بیٹھ گیا۔

''یہ ساقا پہلوان ہے نا۔'' گامانے فریدی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''بڑا قابل آدمی ہے بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ قابل آدمی تھا لیکن ہیروئن نے اس کا سب کچھ چھین لیا۔''

''ہیروئن نے تو ہزاروں گھر اجاڑے ہیں اور لاکھوں لوگوں کو برباد کیا ہے لیکن ساقا پہلوان واقعی ایک دلچسپ آدمی ہے۔ اس کے بارے میں بتاؤ۔ یہ کون ہے، اس نے جس طرح میری ڈریسنگ کی ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ کسی ڈاکٹر کے پاس کام کر چکا ہے۔''

''کام کر چکا ہے۔'' گامے کے لہجے میں حیرت تھی۔ ''باؤ فریدی! یہ خود ڈاکٹر ہے وہ کیا کہتے ہیں۔ ایم بی بی ایس۔ سرکاری اسپتال میں تھا پھر اسے ہیروئن کی لت پڑ گئی۔ بس دو تین سال کے اندر اندر اس کا سب کچھ ہیروئن

کی نذر ہو گیا۔نوکری ختم ہو گئی۔ یہ سارا دن مُردوں کی طرح لکشمی چوک پر پڑا رہتا تھا۔اس کے ماں باپ نے اس کا علاج کرانے کی بہت کوشش کی لیکن ہیروئن کا نشہ ایک ایسی لعنت ہے جس سے پیچھا چھڑانا آسان نہیں ہوتا۔ماں باپ اسحاق کو ہیروئن کی لعنت سے تو نجات نہ دلا سکے البتہ انہوں نے اسحاق کو چھوڑ دیا۔ یہ چوک پر پڑا رہتا۔لوگ بھکاری سمجھ کر کچھ دے دیتے۔ بالآخر مہر کو اس پر ترس آ گیا اور اسے اٹھا کر ڈیرے پر لے آیا۔اس نے بڑا علاج کرایا ہے اس کا۔اب تو یہ بالکل ٹھیک ہے۔سائیں لوک بن گیا ہے۔ یہاں پڑا اللہ اللہ کرتا رہتا ہے۔ یہاں سے جانے کو تیار ہی نہیں ہوتا۔ہمارا کوئی ساتھی بیمار پڑ جاتا ہے تو اس کا علاج کر دیتا ہے۔ ویسے اللہ نے بڑی شفا دی ہے اس کے ہاتھ میں۔''

فریدی کے دل پر ایک گھونسا سا لگا۔ ایک ڈاکٹر ہیروئن کا شکار ہو کر اپنے آپ کو تباہ کر بیٹھا تھا۔اس سے بڑی بدقسمتی اور کیا ہوگی کہ پڑھے لکھے اور سنجیدہ قسم کے لوگ بھی اس لعنت کا شکار ہو رہے تھے۔

فریدی باتیں کرتے کرتے اونگھنے لگا پھر شور کی آواز سن کر اس کی آنکھ کھل گئی، کمرے میں مہر کے علاوہ اس کی پارٹی کے دو تین آدمی اور بھی موجود تھے۔فریدی سنبھل کر بیٹھ گیا۔مہر نے جو کچھ بتایا، وہ واقعی ایک دلچسپ کہانی تھی۔ اس نے مزنگ پولیس کو جو بیان دیا تھا اس کے مطابق وہ تانگے کرائے پر دیتا ہے۔ وہ کئی برسوں سے مقبرے کے احاطے میں اپنا یہ شریفانہ کاروبار چلا رہا ہے مگر جیرا گجر اس سے یہ جگہ ہتھیانا چاہتا ہے۔ اس نے کئی مرتبہ دھمکیاں بھی دی تھیں۔ رات اس نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ احاطے پر حملہ کر دیا جس کے نتیجے میں ایک گھوڑا اور ایک کوچوان ہلاک ہوا۔ پولیس نے جیرا گجر اور اس کے ساتھیوں کے خلاف رپورٹ درج کر لی تھی۔

''باٹی پہلوان کی لاش......''

''وہ پولیس نے میو اسپتال پہنچا دی ہے۔'' مہر نے اس کی بات کاٹ دی۔''ہم نے پولیس کو بتا دیا ہے کہ باٹی پہلوان ایک لاوارث آدمی ہے۔اس کا آگے پیچھے کوئی نہیں ہے۔ پولیس نے ایدھی والوں کو اطلاع کر دی ہے۔ وہ لوگ اس کے کفن دفن کا بندوبست کر دیں گے۔''

فریدی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ جس شخص نے ان لوگوں کے لیے اپنی جان دے دی تھی یہ لوگ اس سے اس طرح لاتعلق ہو گئے تھے کہ اس کی لاش کو کندھا دینے کو بھی تیار نہیں تھے۔

فریدی تین چار دن اس اڈے پر ہی رہا شروع کے دو دن تو اس کی ٹانگ میں خاصی تکلیف رہی۔ زخم میں انفیکشن ہو گیا تھا مگر ساقا پہلوان کی توجہ سے تکلیف پر قابو پا لیا گیا۔ ہفتہ دس دن بعد وہ آزادی سے چلنے پھرنے کے قابل ہو گیا۔ وہ اکثر سکینہ اور رخشندہ کے بارے میں سوچتا، انہیں جب سے وہ مکان لے کر دیا تھا فریدی نے اس طرف کا رخ نہیں کیا تھا۔ دس بارہ دن ہو گئے تھے اور پھر اس رات فریدی نے گھر جانے کا فیصلہ کر لیا۔

فریدی نے مہر کو بتا دیا کہ وہ ایک دو روز کے لیے کہیں جا رہا ہے اور پھر احاطے سے باہر نکل گیا۔

اس وقت رات کے گیارہ بجے تھے۔گلیاں تقریباً سنسان پڑی تھیں۔فریدی مختلف گلیوں میں چلتا ہوا مکان کے سامنے پہنچ گیا۔ دستک کے جواب میں دروازہ رخشندہ ہی نے کھولا تھا، وہ اسے دیکھتے ہی لپٹ گئی۔

''تم کہاں غائب ہو گئے تھے بھیا، ہم لوگ پریشان ہو رہے تھے۔ اماں بیمار پڑ گئی ہیں۔ ہر وقت تمہارے بارے میں پوچھتی رہتی ہیں۔''

''مجھے افسوس ہے میں تم لوگوں کو اطلاع نہیں کر سکا۔ بہرحال اب میں آ گیا ہوں'' فریدی کہتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

''اماں کہاں ہے؟''

''اپنے کمرے میں۔'' رخشندہ نے جواب دیا۔ ''ابھی ہم تمہارے بارے ہی میں باتیں کر رہے تھے۔''

فریدی کمرے میں داخل ہو گیا۔ سکینہ بستر پر لیٹی ہوئی تھی۔فریدی کو دیکھتے ہی اٹھ کر بیٹھ گئی۔

''ارے بیٹا! کہاں چلے گئے تھے؟'' سکینہ نے یہ کہتے ہوئے اسے لپٹا لیا۔

''پریشان نہ ہو ماں، اب میں آ گیا ہوں۔'' فریدی بولا۔

رخشندہ نے فریدی سے کھانے کے لیے پوچھا۔ اس کے انکار پر چائے بنا کر لے آئی۔ چائے کی چسکیاں لیتے ہوئے فریدی نے سکینہ کو مکان پر جیرے کے آدمیوں کے حملے اور آتشزدگی کے بارے میں بتا دیا۔سکینہ اور رخشندہ کے چہرے پیلے پڑ گئے۔

''میں اپنے ایک دوست کے گھر چلا گیا تھا۔'' فریدی کہہ رہا تھا۔''اس سے اگلی رات جیرا گجر کے آدمیوں نے وہاں بھی حملہ کر دیا۔ میری ٹانگ میں گولی لگی تھی اور میں کئی دن سے ایک پرائیویٹ ڈاکٹر کے زیرِ علاج تھا۔''

''تم پر اتنا کچھ بیت گیا اور تم نے ہمیں اطلاع تک نہیں بھجوائی۔'' سکینہ نے کہا۔

''میں نے مصلحتاً ایسا نہیں کیا تھا۔'' فریدی نے جواب دیا۔ ''میں نہیں چاہتا کہ جیرا گجر یا کسی اور کو آپ لوگوں کے بارے میں معلوم ہو۔ میں اس مکان کے بارے میں بھی کسی کو کچھ نہیں بتانا چاہتا۔ اب بھی میں چھپ کر آیا ہوں۔''

فریدی تین چار دن گھر پر رہا۔ اس دوران رخشندہ اس کی خاطر مدارات کرتی رہی۔ فریدی نے انہیں اچھی طرح سمجھا دیا تھا کہ وہ چند روز بعد اپنے ایک دوست کے ساتھ مل کر بزنس شروع کرنے والا ہے۔ کاروبار کے سلسلے میں اسے زیادہ تر شہر سے باہر ہی رہنا پڑے گا اس لیے وہ لوگ اس کے لیے بالکل پریشان نہ ہوا کریں۔

تین چار روز گھر پر رہنے کے بعد فریدی ایک بار پھر مزنگ والے اڈے پر مہر کے پاس پہنچ گیا۔ مہر کے بازو کا زخم بھی اب مندمل ہو چکا تھا۔ ہنگامے کے بعد ایک دو روز تک اس اڈے پر کاروبار بند رکھا گیا تھا لیکن اب پھر وہ دھندا شروع ہو چکا تھا۔

فریدی دو دن تک خاموشی سے گاہکوں سے ڈیلنگ کا جائزہ لیتا رہا۔ تیسرے دن مہر نے اسے بھی ایک کام سونپ دیا۔

''یہ دو پیکٹ باغبانپورہ میں بالی کے اڈے پر پہنچانے ہیں۔ گاما تمہارے ساتھ جائے گا۔ سات لاکھ روپے وصول کرنے ہیں۔ میں تمہیں گامے کے ساتھ اس لیے بھیج رہا ہوں کہ سب لوگوں سے متعارف ہو جاؤ۔ تاکہ آگے چل کر تمہیں کوئی پریشانی نہ ہو۔'' مہر نے کہا۔

ہیروئن کے دو پیکٹ کالے رنگ کے ایک شاپنگ بیگ میں تھے اور شاپنگ بیگ فریدی کے ہاتھ میں تھا۔ فریدی کا دل بڑی تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ ہیروئن کی فروخت پر اس نے جیرا گجر سے دشمنی مول لی تھی اور اب خود ہیروئن سپلائی کرنے جا رہا تھا۔ اگر راستے میں پکڑا گیا تو سیدھا جیل پہنچ جائے گا۔

بہرحال دونوں پُرپیچ راستوں سے گزرتے ہوئے وہ اپنے مطلوبہ ہدف تک پہنچ گئے۔

فریدی اور گاما ایک عمارت کے گیٹ کے سامنے پہنچے ہی تھے کہ دو آدمی چادروں کی بُکلیں مارے گیٹ سے باہر نکلے اور اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے دائیں طرف مڑ گئے۔ وہ یقیناً مال لے کر جا رہے تھے۔ فریدی اور گاما گیٹ میں داخل ہو گئے۔ انہوں نے محرابی راستہ عبور کیا ہی تھا کہ ایک آدمی تاریکی میں کاٹھ کباڑ کے ڈھیر کے پیچھے سے نکل کر ان کے سامنے آ گیا۔

''کون ہو تم لوگ؟ رک جاؤ۔''

آواز میں ہلکی سی غراہٹ تھی اور اس کی کلاشنکوف کا رخ ان دونوں کی طرف تھا۔

''ہم تاج بالی کے دوست ہیں۔ علی مہر کا پیغام لے کر مزنگ سے آئے ہیں۔'' گامے نے جواب دیا۔ ''تاج بالی کو بتا دو کہ گاما آیا ہے۔''

''تم لوگ یہیں رکو۔'' اس شخص نے کہا پھر پچھلی طرف رخ کر کے سرگوشیانہ لہجے میں کچھ کہا۔ ایک اور آدمی تاریکی سے نکل کر احاطے کے اندر کی طرف چلا گیا۔

اس آدمی کو واپس آنے میں دو منٹ سے زیادہ نہیں لگے۔

''میرے ساتھ آؤ۔ تاج بالی تم لوگوں کا انتظار کر رہا ہے۔'' اس شخص نے کہا۔

وہ دونوں اس کے پیچھے چلتے ہوئے لوہار خانے کے پچھلی طرف ایک کمرے میں پہنچ گئے۔ کمرے میں دو آدمی تھے جو ریگزین کے ایک پرانے سے صوفے پر بیٹھے تھے۔ اس کمرے میں صوفہ سیٹ کے علاوہ دو تین کرسیاں اور ایک چارپائی بھی بچھی ہوئی تھی۔ اس کمرے کے پچھلی طرف بھی ایک دروازہ تھا جو بند تھا۔

تاج بالی کی عمر پچاس کے لگ بھگ رہی ہوگی۔ سر پر مشین پھری ہوئی تھی اور ایسا لگتا تھا جیسے کھوپڑی پر سفید گھاس اُگی ہوئی ہو۔ چوہے کی دم کی طرح سفید مونچھیں ہونٹوں کے کناروں سے لٹکی ہوئی تھیں۔ اس کا چہرہ بارعب اور آنکھوں میں سرخی تھی۔ دائیں رخسار پر زخم کا ایک پرانا نشان بھی نظر آ رہا تھا۔

تاج بالی نے اپنی جگہ پر بیٹھے بیٹھے ان دونوں سے ہاتھ ملایا اور انہیں سامنے کرسیوں پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

''ہاں بھئی گامے، تم بہت دنوں بعد آئے ہو اور یہ نوجوان کون ہے؟'' تاج بالی نے فریدی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''یہ باؤ فریدی ہے استاد بالی۔'' گامے نے جواب دیا۔ ''یہ استاد مہر کا رائٹ ہینڈ ہے۔ آئندہ باؤ فریدی ہی تم سے لین دین کیا کرے گا۔''

''باؤ فریدی۔'' تاج بالی گہری نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔ ''یہ وہی لڑکا تو نہیں جس نے جیرا گجر کو نچا رکھا ہے۔''

''وہی ہے استاد بالی۔'' گاما خوش ہوتے ہوئے بولا۔''ابھی تو جیرا گجر کا ناچ شروع ہوا ہے۔ آگے دیکھنا کیا ہوتا ہے۔''

''اس نوجوان نے تو آتے ہی بڑا رعب جمالیا ہے۔ ہر طرف اس کی باتیں ہو رہی ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ ایک دن پورے لاہور میں اسی کے نام کا ڈنکا بجے گا۔'' تاج بالی نے کہا۔

''آپ کے تابعدار ہیں استاد بالی۔'' گامانے کہا۔

''اچھا...... اب ذرا کام کی بات ہو جائے۔ مال لائے ہو؟'' تاج بالی نے کہا۔

''مال لے کر ہی تو آئے ہیں استاد۔'' گامے نے کہتے ہوئے فریدی کو اشارہ کیا۔

فریدی نے شاپنگ بیگ تاج بالی کی طرف بڑھا دیا۔ تاج بالی نے شاپنگ بیگ میں سے ہیروئن کی دونوں تھیلیاں نکال لیں۔ اس نے دونوں تھیلیوں میں سوئی سے سوراخ کر کے تھوڑی تھوڑی ہیروئن نکال کر چکھا پھر تھیلیاں شاپنگ بیگ میں ڈال دیں۔

''مال تو بہت اچھا ہے لیکن تمہارے استاد نے ریٹ بہت زیادہ لگایا ہے۔'' بالی نے کہا۔

''مال اچھا ہے تو ریٹ زیادہ ہے استاد۔ گاہک کو مال کے بارے میں تو شکایت نہیں ہوگی نا۔'' گامے نے کہا۔

''ٹھیک ہے بھئی۔ تمہاری مرضی۔ ایک منٹ بیٹھو۔ میں ابھی آتا ہوں۔ تاج بالی شاپنگ بیگ لے کر اندرونی دروازے میں داخل ہو گیا۔ اس کی واپسی میں تقریباً پانچ منٹ لگے تھے۔ اس نے کپڑے کا ایک میلا سا تھیلا گامے کی طرف بڑھا دیا۔

''سات لاکھ ہیں، گن لو۔''

گامے نے تھیلا میز پر پلٹ دیا، پانچ سو اور ہزار والے نوٹوں کی گڈیاں تھیں۔ ہر گڈی پر بینک کی .. مہر لگی ہوئی تھی۔ فریدی نے تمام گڈیوں کو اٹھا کر چیک کیا پھر گامے کو اشارہ کیا جس نے تمام گڈیاں تھیلے میں ڈال لیں اور تھیلا فریدی کے حوالے کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی وہ دونوں اٹھ گئے۔

''مہر سے کہنا انڈیا کی ایک پارٹی سے میری بات چل رہی ہے۔ چند روز میں معاملہ فائنل ہو جائے گا۔ معاملہ طے ہوتے ہی مجھے کم از کم بیس کلو کی ضرورت ہوگی۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ عین وقت پر جواب مل جائے۔'' بالی نے کہا۔

''کیسا جواب استاد۔'' گاما بولا۔''تمہیں مال ملے گا۔ بیس کلو کیا بیس من بھی کہو گے تو مل جائے گا جب اور جس وقت چاہو۔''

''ٹھیک ہے۔ مہر کو میرا پیغام دے دینا۔'' بالی نے کہا۔

وہ دونوں ہاتھ ملا کر کمرے سے نکل آئے۔ جب وہ گیٹ سے نکل رہے تھے تو ایک آدمی کو انہوں نے کباڑ کے ڈھیر کے پیچھے جاتے ہوئے دیکھا تھا۔

سڑک پر سناٹا تھا۔ قبرستان کی وجہ سے فضا میں کچھ عجیب سا تاثر تھا۔ وہ دونوں چوک کی طرف چلنے لگے۔

''کیا پیدل ہی چلنا پڑے گا۔'' فریدی نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے کہا۔

''بھوگیوال کے چوک والی گھاٹی پر ہر وقت ایک آدھ ٹیکسی ضرور کھڑی رہتی ہے۔ کہیں تم ڈر تو نہیں رہے باؤ فریدی۔'' گاما اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

''نن...... نہیں...... ڈر کس بات کا۔'' فریدی بولا۔ حالانکہ حقیقت یہ تھی کہ اس کے دل پر ہلکا سا خوف طاری تھا۔ جب وہ آئے تھے تو اس کے ہاتھ میں ہیروئن کا تھیلا تھا اور اب تھیلے میں سات لاکھ کی رقم تھی۔

وہ احاطے سے نکل کر تاریک..... سڑک پر تقریباً بیس گز چلے تھے کہ قبرستان کی تاریکی سے اچانک ہی دو آدمی نکل کر ان کے سامنے آگئے۔ ان میں سے ایک کے پاس کلاشنکوف تھی اور دوسرے کے ہاتھ میں پستول نظر آرہا تھا۔ ان دونوں کو اس طرح اچانک اپنے سامنے دیکھ کر فریدی کا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔

''یہ تھیلا میرے حوالے کر دو مسٹر۔'' پستول والے نے فریدی کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

''کک...... کچھ نہیں ہے اس تھیلے میں۔'' فریدی ہکلا کر رہ گیا۔ اگرچہ اس کی جیب میں پستول موجود تھا۔ پستول گامے کے پاس بھی تھا لیکن موجودہ صورتِ حال میں وہ کچھ بھی نہیں کر سکتے تھے۔

''میں کہتا ہوں یہ تھیلا مجھے دے دو۔'' پستول والا غرایا۔

فریدی نے گامے کی طرف دیکھا اور پھر تھیلے والا ہاتھ آگے بڑھا دیا۔ اسے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ ان لوگوں کو معلوم تھا کہ اس تھیلے میں خطیر رقم موجود ہے۔ انہیں صرف تھیلے سے دلچسپی تھی۔ انہوں نے کسی اور چیز کا مطالبہ نہیں کیا تھا۔

پستول والے نے تھیلا لینے کے لیے ہاتھ آگے بڑھایا۔ فریدی نے اچانک ہی اس کے پستول والے ہاتھ پر ٹھوکر ماردی۔ وہ شخص شاید کسی ایسی صورتِ حال کے لیے تیار نہیں تھا۔ پستول اس شخص کے ہاتھ سے نکل کر دور جا گرا۔ دوسری طرف ٹھیک اسی لمحہ گامے نے بھی کلاشنکوف والے کے ہاتھ پر ٹھوکر ماردی تھی لیکن کلاشنکوف پر اس شخص کی گرفت خاصی مضبوط تھی۔

کلاشنکوف تو اس کے ہاتھ سے نہیں چھوٹی البتہ ٹریگر دب گیا اور کئی گولیاں گامے کے پہلو کے قریب سے گزر گئیں۔ گامے نے نیچے جھکتے ہوئے اس کی کلاشنکوف پر ہاتھ ڈال دیا۔ ان دونوں میں کلاشنکوف کے لیے کشمکش ہونے لگی۔ کلاشنکوف کا رخ اوپر کی طرف تھا۔ ٹریگر ایک مرتبہ پھر دبا۔ تڑتڑاتی ہوئی کئی گولیاں آسمان کی طرف چلی گئیں۔

فریدی اپنے حریف سے لپٹا ہوا تھا۔ اس کے ہاتھ میں پکڑا ہوا نوٹوں سے بھرا۔۔تھیلا نیچے گر گیا تھا۔ وہ دونوں ایک دوسرے کو زیر کرنے کی کوشش کررہے تھے۔ فریدی کو موقع مل گیا اور اس نے اپنے حریف پر ٹھوکروں کی بارش کر دی مگر اس کا حریف جلد ہی سنبھل گیا۔ اس نے اٹھتے ہی فریدی کی ٹانگوں کے درمیان زوردار ٹھوکر ماری۔ ٹھوکر نازک جگہ پر لگی۔ فریدی کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی اور وہ جھکتا چلا گیا۔

فریدی کے حریف کو موقع مل گیا۔ اس نے فریدی کے پہلو پر ایک اور زوردار ٹھوکر ماری، فریدی کراہتا ہوا الٹ گیا۔ اس شخص نے زمین پر پڑا ہوا تھیلا اٹھایا اور قبرستان کی طرف چھلانگ لگادی۔

گاما اپنے حریف پر قابو پانے کی کوشش کررہا تھا۔ ٹریگر پر اب اس کا ہاتھ تھا۔ رائفل کی نال اس کے حریف کے نرخرے کو چھو رہی تھی۔ گامانے ٹریگر دبا دیا۔ کئی گولیاں اس شخص کے حلق میں داخل ہو کر کھوپڑی کے پرخچے اڑاتی ہوئی باہر نکل گئیں۔

صورتِ حال کی نزاکت کا احساس ہوتے ہی فریدی سنبھل گیا۔ اسے تھیلے کی عدم موجودگی کا احساس ہوا تو وہ اپنی تکلیف بھول کر اچھل پڑا۔

''گامے! وہ شخص تھیلا لے گیا۔'' فریدی چیخا۔

گامانے رائفل پھینک دی اور پھر ان دونوں نے قبرستان میں دوڑ لگادی۔ اس دوران وہ شخص قبرستان کے دوسرے کنارے پر پہنچ چکا تھا۔ فریدی نے جیب سے پستول نکال کر فائر کیا مگر وہ شخص قبرستان سے نکل کر سامنے والی گلی میں گھس چکا تھا۔ وہ دونوں بھی دوڑتے ہوئے گلی میں گھس گئے۔ تاریک اور تنگ سی گلی تھی۔ دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ وہ آواز کے تعاقب میں دوڑتے رہے۔

''کہاں گیا وہ...... اسی طرف آیا تھا۔'' فریدی بڑبڑایا۔

ایک طرف تنگ اور تاریک گلیوں کا جال سا بچھا ہوا تھا۔ یہاں تو دن کے وقت کسی کو تلاش کرنا مشکل تھا اور رات کے وقت کسی کا سراغ لگا لینے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

وہ دونوں کچھ دیر مختلف گلیوں میں بھٹکتے رہے پھر گلیوں میں گھومتے ہوئے چوک پر نکل آئے۔ یہاں چائے کی ایک دکان کھلی ہوئی تھی۔ پانچ چھ آدمی جمع تھے۔ جس جگہ فریدی وغیرہ کے ساتھ یہ واقعہ پیش آیا تھا، وہ جگہ اسی سڑک پر تقریباً پانچ سو گز دور تھی لیکن چائے والا اپنی میزیں کرسیاں وغیرہ سمیٹ رہا تھا۔

فریدی اور گاما وہاں رکے بغیر اسی سڑک پر مخالف سمت میں چلتے ہوئے شالیمار باغ کے قریب جی ٹی روڈ پر نکل آئے۔ یہاں .... کئی دکانیں اور چھوٹے چھوٹے تین چار ریسٹورنٹ تھے جو تقریباً رات بھر کھلے رہتے تھے۔ تین چار ٹیکسیاں بھی کھڑی تھیں۔ ڈرائیور ایک ہوٹل کے سامنے میز پر بیٹھے گپ شپ کررہے تھے۔ ان دونوں کو ایک ٹیکسی کے قریب رکتے دیکھ کر ایک ڈرائیور اٹھ کر ان کے قریب آگیا۔

''کہاں جانا ہے استاد جی؟'' ڈرائیور نے باری باری دونوں کی طرف دیکھا۔

''لکشمی۔'' گامے نے جواب دیا۔

''بیٹھو استاد جی۔'' ڈرائیور اشارہ کرتا ہوا اسٹیئرنگ کے سامنے بیٹھ گیا۔

وہ دونوں پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئے اور ٹیکسی حرکت میں آگئی۔ وہ دونوں بڑے اطمینان سے بیٹھے فلموں کے بارے میں باتیں کرتے رہے۔ وہ ڈرائیور کو اپنی باتوں سے یہ تاثر دینا چاہتے تھے کہ ان کا تعلق کسی فلمساز ادارے سے ہے۔

وہ لوگ ٹیکسی سے اتر کر اِدھر اُدھر گھومتے ہوئے نسبت روڈ پر آگئے اور پھر اپنے اڈے تک پہنچنے میں دس منٹ سے زیادہ نہیں لگے۔

مہر اس وقت اسی اڈے پر موجود تھا۔ انہوں نے جب اسے صورتِ حال سے آگاہ کیا تو اس کے چہرے پر

درندگی کے تاثرات اُبھر آئے۔

''مجھے یقین ہے کہ اس میں تاج بالی کا ہاتھ ہے۔'' فریدی نے کہا۔''صرف تاج بالی کو معلوم تھا کہ ہم رقم لے کر وہاں سے نکلے ہیں۔ میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ انہوں نے ہم سے رقم چھیننے کا منصوبہ پہلے سے بنا رکھا تھا کیونکہ اگر وہ عام رہزن یا لٹیرے ہوتے تو ہماری جیبیں خالی کرواتے، گھڑیاں اتروا لیتے لیکن انہوں نے ہم سے صرف اس تھیلے کا مطالبہ کیا تھا جس کا صاف مطلب یہ ہے کہ انہیں معلوم تھا کہ اس تھیلے میں ایک بڑی رقم موجود ہے۔''

''میں سمجھ گیا۔'' مہر کے حلق سے غراہٹ سی نکلی۔ ''تاج بالی کو تو میں ایسا سبق سکھاؤں گا کہ اس کی آنے والی نسلیں بھی یاد کریں گی۔''

''دھوکا اس نے مجھ سے کیا ہے اس لیے سزا بھی اسے میں ہی دوں گا۔'' فریدی نے کہا۔''تاج بالی پر یہ ظاہر نہ ہونے دیا جائے کہ ہمیں اس پر شبہ ہے۔ میں جو کچھ بھی کروں گا وہ تمہیں بتا کر ہی کروں گا۔ میری کارروائی سے نہ صرف تمہارا نقصان پورا ہو جائے گا بلکہ تاج بالی کی کمر ٹوٹ جائے گی اور وہ اٹھنے کے قابل نہیں ہو سکے گا۔''

''کیا کرو گے تم؟'' مہر نے اسے گھورا۔

''یہ وقت آنے پر بتاؤں گا جو کچھ بھی ہو گا تمہارے سامنے ہو گا لیکن...... تاج بالی کو شبہ نہ ہونے پائے کہ ہم اسے اس واردات کا ذمے دار سمجھتے ہیں اور مجھے یقین ہے کہ وہ کل تمہارے پاس ضرور آئے گا تاکہ اس واقعے پر تم سے افسوس کا اظہار کر سکے۔ اس کا ایک آدمی بھی گاہے کے ہاتھوں خرچ ہو گیا ہے۔ اسے اس کا بھی افسوس ہو گا۔''

فریدی کا خیال درست نکلا۔ صبح دس بجے کے قریب تاج بالی، مہر کے اڈے پر پہنچ گیا۔ اس وقت گاما موجود نہیں تھا لیکن فریدی، مہر کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔

''یہ کیسے ہوا فریدی؟ کون تھے وہ لوگ؟'' تاج بالی نے پوچھا۔

''پتا نہیں استاد۔'' فریدی نے گہرا سانس لیتے ہوئے جواب دیا۔''ہم تمہارے اڈے سے رقم لے کر نکلے تھے کہ اچانک ہی دو آدمی قبرستان سے نکل کر ہمارے سامنے آ گئے۔ ان میں سے ایک کے ہاتھ میں کلاشنکوف تھی اور دوسرے کے ہاتھ میں پستول۔ انہوں نے رقم والے تھیلے کا مطالبہ کیا۔ شاید انہیں پتا چل گیا تھا کہ ہم خطیر رقم لے کر تمہارے اڈے سے نکلے ہیں اور وہ رقم اس تھیلے میں موجود ہے۔''

''لیکن تمہارے پاس رقم کی موجودگی کا میرے سوا کسی اور کو علم نہیں تھا۔ تم جانتے ہو کہ جب میں نے تم لوگوں کو رقم ادا کی تھی تو اس کمرے میں میرے اور تم لوگوں کے سوا اور کوئی نہیں تھا لیکن کہیں تم مجھ پر تو......''

''نہیں استاد۔'' فریدی نے اس کی بات کاٹ دی۔ ''ایسی کوئی بات نہیں ہے بلکہ ہو سکتا ہے کہ کسی کو پہلے ہی سے یہ معلوم ہو کہ آج ڈیل ہونے والی ہے اور وہ پہلے ہی سے ہماری تاک میں ہوں۔''

''ہاں یہ ہو سکتا ہے۔'' تاج بالی نے کہا۔''میں یہ معلوم کرنے کی کوشش ضرور کروں گا۔ اگر میرے کسی آدمی کا ہاتھ ثابت ہوا تو میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔''

''ایک تو پہلے ہی ختم ہو چکا ہے۔ تم نے اس کی لاش تو دیکھی ہو گی۔ آج اخبار میں تصویر بھی چھپی ہے، کیا تم اسے پہچانتے ہو؟'' فریدی نے اخبار اس کے سامنے رکھ دیا۔ پہلے ہی صفحے پر باغبانپورہ میں پُراسرار فائرنگ کی خبر اور مقتول کی تصویر چھپی تھی۔

''میں نے رات کو لاش بھی دیکھی تھی اور آج اخبار میں تصویر بھی دیکھی ہے۔'' تاج بالی نے جواب دیا۔ ''لیکن یہ چہرہ میرے لیے اجنبی ہے۔ کیا یہ جیرا گجر کا آدمی تو نہیں؟''

''یہ کسی کا بھی آدمی ہو، میں پتا چلا لوں گا۔ اس کا دوسرا ساتھی سات لاکھ کی رقم چھین کر بھاگ جانے میں کامیاب ہو گیا۔ ہم نے اگرچہ دور تک اس کا پیچھا کیا تھا لیکن وہ تنگ اور تاریک گلیوں میں ہمیں دھوکا دے کر نکل گیا۔ رات کو تو وہ ہم سے بچ نکلا لیکن میں اسے تلاش کر لوں گا اور سات لاکھ کی یہ رقم کسی کو ہضم نہیں ہونے دوں گا۔'' فریدی نے کہا۔ بات کرتے ہوئے اس کے چہرے پر سختی سی آ گئی تھی۔

تاج بالی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ کچھ دیر اور وہاں بیٹھا ان سے باتیں کرتا رہا پھر رخصت ہو گیا۔

اس کے ٹھیک دس دن بعد فریدی کو یہ ثبوت مل گیا کہ انہیں لوٹنے والے تاج بالی کے آدمی ہی تھے اور ان سے رقم چھیننے کا پروگرام تاج بالی ہی نے بنایا تھا۔ یہ ثبوت مل جانے کے بعد فریدی موقع کی تلاش میں رہنے لگا۔ تاج بالی سے ان کا کاروباری لین دین معمول کے مطابق جاری تھا۔ فریدی یا مہر نے اسے شبہ تک نہیں ہونے دیا تھا کہ وہ اس کے خلاف ثبوت حاصل کر چکے ہیں۔

اس کے چند ہی روز بعد فریدی کو موقع بھی مل گیا۔ تاج بالی کو انڈیا کی پارٹی سے پندرہ کلو ہیروئن کا آرڈر ملا تھا اور

تاج بالی نے مال کی سپلائی کے لیے مہر سے رابطہ کیا تھا۔ معاہدے کے مطابق آدھی رقم ایڈوانس لے لی گئی تھی، اور آدھی رقم کی ادائیگی تاج بالی کو مال کی ڈیلیوری کے وقت ہونا تھی۔ مال اور رقم کے تبادلے کے لیے وقت اور مقام طے کر لیا گیا۔

پروگرام کے مطابق ہیروئن اور رقم کا تبادلہ رات دس بجے ریلوے اسٹیشن کے سامنے ٹرانسپورٹ سروس کے اڈے پر ہونا تھا۔ طے یہ پایا تھا کہ بالکل ایک جیسے دو بریف کیس خریدے جائیں گے۔ ایک بریف کیس تاج بالی کو بھجوایا جائے گا اور دوسرا فریدی کے پاس ہوگا۔ جب فریدی اور تاج بالی کا آدمی اڈے پر پہنچیں گے تو دونوں کے پاس بریف کیس ہوں گے۔ فریدی کے بریف کیس میں ہیروئن ہوگی اور تاج بالی کے ایجنٹ کے بریف کیس میں رقم۔ دونوں مقررہ وقت پر بس اسٹیشن کے ٹی اسٹال پر ایک دوسرے کے قریب کھڑے ہوں گے اور بریف کیس تبدیل کرلیں گے۔

فریدی ٹھیک دس بجے جی ٹی ایس کے اڈے پر پہنچ گیا۔ اس کے ساتھ دو اور آدمی بھی تھے جو اس سے لاتعلق سے بنے دور کھڑے تھے۔ ان دونوں نے اپنے جسموں پر چادریں لپیٹ رکھی تھیں۔ مقررہ وقت پر تاج بالی کا ایجنٹ بھی پہنچ گیا۔ ان دونوں نے بریف کیسوں سے ہی ایک دوسرے کو شناخت کیا تھا۔ فریدی کو یقین تھا کہ اس شخص کے ساتھ بھی ایک دو آدمی ضرور ہوں گے۔

فریدی ٹی اسٹال کے کاؤنٹر کے سامنے کھڑا بدمزہ چائے کی چسکیاں لے رہا تھا۔ بریف کیس اس نے اپنے پیروں کے قریب کھڑا کر دیا تھا۔ اس وقت ٹی اسٹال پر دو تین اور گاہک بھی تھے۔ لباس اور شکلوں سے وہ دیہی علاقوں کے باشندے لگتے تھے جو اپنی اپنی بس کی روانگی کے انتظار میں تھے۔ چند منٹ بعد ایک اور آدمی فریدی کے قریب آکر کھڑا ہو گیا۔ اس کے ہاتھ میں بھی گرے رنگ کا بریف کیس تھا جسے اس نے پیروں کے قریب رکھ دیا اور چائے لے کر ہلکی ہلکی چسکیاں لینے لگا۔ اس دوران میں اس نے صرف ایک مرتبہ فریدی کی طرف دیکھا تھا۔ فریدی نے نظریں جھکا کر نیچے رکھے ہوئے دونوں بریف کیسوں کی طرف دیکھا۔ دونوں بریف کیس بالکل ایک جیسے تھے۔

فریدی نے چائے کا آخر گھونٹ بھر کر پیسے ادا کیے۔ جھک کر دوسرے آدمی کا رکھا ہوا بریف کیس اٹھایا اور اطمینان سے چلتا ہوا بس اسٹیشن کی حدود سے باہر نکل گیا۔ اس کے باڈی گارڈ بھی کچھ فاصلہ دے کر اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگے۔

وہ ابھی اگلے چوک پر نہیں پہنچے تھے کہ پیچھے سے آنے والی ایک ٹیکسی ان کے قریب رک گئی۔ انہوں نے مڑ کر ٹیکسی کی طرف دیکھا اور پھر بڑی پھرتی سے دروازے کھول کر اندر بیٹھ گئے۔ ٹیکسی کی ڈرائیونگ سیٹ پر گاما بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے مسکرا کر فریدی کی طرف دیکھا اور رفتار بڑھا دی۔

وہ سیدھے مزنگ والے اڈے پر پہنچے تھے جہاں مہر ان کا منتظر تھا۔ بریف کیس کھول کر دیکھا گیا۔ رقم پوری تھی۔ ... مہر نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔

''تاج بالی بریف کیس کھولے گا تو اس میں ہیروئن کے بجائے چونا بھرا ہوا دیکھ کر ناچ اٹھے گا۔ ہوسکتا ہے وہ کچھ دیر بعد چیختا ہوا یہاں پہنچ جائے۔'' مہر نے کہا۔

''تم اسے یہی بتاؤ گے کہ فریدی کو پندرہ کلو ہیروئن دے کر یہاں سے بھیجا گیا تھا۔ تاج بالی کا سودا چونکہ مجھ سے ہوا تھا اس لیے تم سارا الزام مجھ پر عائد کر دینا۔ میں خود ہی اس سے نمٹ لوں گا۔'' فریدی نے جواب دیا۔

''ٹھیک ہے۔'' مہر نے کہا۔ ''وہ کسی بھی وقت یہاں آسکتا ہے۔ تم یہاں سے پھوٹ لو اور یہ رقم بھی اپنے ساتھ لے جاؤ۔ دو چار دن بعد ملاقات کر کے حساب کرلیں گے۔ اب نکل چلو۔ گاما تمہیں چھوڑ آئے گا۔''

''گاما مجھے صرف چوک تک پہنچا دے گا۔ وہاں سے آگے میں کوئی اور ٹیکسی لوں گا۔'' فریدی نے جواب دیا۔

گاما نے اسے ٹیکسی پر مزنگ چوک تک چھوڑ دیا۔ وہاں سے فریدی ایک رکشے میں بیٹھ کر ریلوے اسٹیشن پہنچ گیا اور وہاں سے ایک اور ٹیکسی پر بیٹھ کر چوبرجی آگیا۔ ٹیکسی اس نے چوبرجی چوک پر چھوڑ دی اور پیدل چلتا ہوا شام نگر والے مکان میں آگیا۔ یہاں آکر اس نے بریف کیس میں بھری ہوئی نوٹوں کی گڈیاں نکال کر پلنگ پر ڈال دیں۔ الماری کے نچلے خانے سے ہیروئن کے پیکٹ نکال کر بریفک کیس میں رکھے اور پر نوٹوں کی گڈیاں جمائیں اور بریف کیس بند کر کے اسے فالس سیلنگ کے اندر چھپا دیا۔ پچاس لاکھ روپے نقد اور دو کروڑ مالیت کی ہیروئن اب محفوظ ہو چکی تھی۔

وہ اس مکان میں زیادہ دیر نہیں رکا۔ وہ رات اس نے انارکلی میں سعید کے ریسٹورنٹ کے اوپر والے رہائشی کمرے میں گزاری۔ صبح وہ گہری نیند میں تھا کہ سعید نے اسے جھنجوڑ کر جگا دیا۔

''کیا بات ہے، کیا ہوا؟'' وہ آنکھیں ملتا ہوا اٹھ گیا۔ اس وقت صبح کے ساڑھے چھ بجے تھے۔

''غضب ہو گیا فریدی۔'' سعید نے کہا۔ اس کے

لہجے میں تھرتھراہٹ تھی۔

''ہوا کیا، کچھ بتاؤ بھی۔'' فرید جھنجلا گیا۔

''یہ لو، خود ہی پڑھ لو۔'' سعید نے کہتے ہوئے اخبار اس کی طرف بڑھا دیا۔

فریدی نے اخبار کھول کر اپنے سامنے پھیلا لیا۔ پہلے صفحے پر وسط میں ایک چار کالمی سرخی پر نظر پڑتے ہی وہ اچھل پڑا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے آنکھیں ملیں مگر سرخی کے الفاظ وہی تھے جو وہ پہلے پڑھ چکا تھا۔ اس خبر کے ساتھ تین چار تصویریں بھی تھیں۔ فریدی وہ خبر پڑھتا چلا گیا۔

اخبار کی اس اطلاع کے مطابق گزشتہ رات مزنگ کے علاقے میں منشیات فروشوں کی دو پارٹیوں میں زبردست تصادم ہو گیا جس میں دونوں طرف سے آتشیں اسلحے کا آزادانہ استعمال کیا گیا۔ اسمگلروں کی اس لڑائی میں دستی بم بھی استعمال کیے گئے جس کے نتیجے میں فریقین کے گیارہ آدمی ہلاک ہو گئے۔ ہلاک ہونے والوں میں علی مہر اور گاما کے نام بھی شامل تھے۔ فائرنگ بموں کے دھماکوں اور اس قتل و غارت سے پورے علاقے میں خوف و ہراس پھیل گیا اور پولیس کی بھاری نفری نے پورے علاقے کو گھیرے میں لے رکھا ہے۔

فریدی خبر پڑھنے کے بعد سر تھام کر بیٹھ گیا۔ مہر اور گامے کے علاوہ ڈپ پارٹی کے پانچ اور آدمی مارے گئے تھے جبکہ تین شدید زخمی ہوئے تھے جنہیں پولیس نے گرفتار کر لیا تھا۔ حملہ آور پارٹی کے چار آدمی ہلاک ہوئے تھے۔

اخباری اطلاع کے مطابق پولیس حملہ آور پارٹی کے بارے میں اندازہ نہیں لگا سکی تھی کہ وہ کون لوگ تھے تاہم پولیس کا خیال تھا کہ یہ حملہ جیرا گجر نے کیا تھا کیونکہ چند ہفتے پہلے بھی مہر اور جیرا گجر کے آدمیوں میں مسلح تصادم ہو چکا تھا۔ پولیس جیرا گجر کی تلاش کے علاوہ دیگر مشتبہ لوگوں کی تلاش میں بھی چھاپے مار رہی ہے اور مزید سنسنی خیز انکشافات کی توقع بھی ظاہر کی گئی تھی۔

"یہ...... یہ کیا ہو گیا سعید؟" فریدی نے اخبار ایک طرف رکھتے ہوئے کہا۔

"ایک نہ ایک دن تو یہ ہونا ہی تھا۔" سعید نے گہرا سانس لیتے ہوئے جواب دیا۔ "مجھے اب تمہاری فکر ہو رہی ہے۔ اگر یہ کارروائی واقعی جیرا گجر نے کی ہے تو وہ تمہارا پیچھا نہیں چھوڑے گا۔ ایسی صورت میں میرا مشورہ ہے کہ تم کچھ عرصے کے لیے لاہور سے باہر چلے جاؤ۔"

"تمہارا مطلب ہے کہ بھاگ جاؤں؟" فریدی نے اسے گھورا۔ "میں بزدل نہیں ہوں کہ ڈر کر بھاگ جاؤں اور پھر یہ کارروائی جیرا گجر کی نہیں۔"

"تو پھر کون ہو سکتا ہے؟" سعید نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"تاج بالی۔" فریدی نے کہا اور پھر اسے تفصیل سے تاج بالی کے بارے میں بتانے لگا۔ آخر میں وہ کہہ رہا تھا۔

"کروڑوں کے اس نقصان پر وہ بُری طرح تلملا گیا ہے۔ یہ اس کی زندگی بھر کی کمائی تھی۔ جسے دگنا کرنے کے لیے اس نے سب کچھ داؤ پر لگا دیا تھا لیکن وہ یہ بازی ہار گیا۔ یہی موقع ہے کہ میں اس زخمی سانپ کا سر کچل دوں اور تم مجھے بھاگ جانے کا مشورہ دے رہے ہو؟"

"میں تمہارا دوست ہوں فریدی، مجھے تمہاری زندگی عزیز ہے۔" سعید نے کہا۔

"بھاگنے کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ جہاں بھی جاؤں گا درجنوں تاج بالی اور جیرا گجر مجھے گھیرنے کی کوشش کریں گے۔ یہ وہ دلدل ہے جس سے نکلنا ممکن نہیں.... میں بھی اس دلدل میں پھنس چکا ہوں اور اب اگر چاہوں بھی تو اس سے نہیں نکل سکتا۔ تاج بالی اور جیرا گجر جیسے لوگ پیچھے بھی ہٹ جائیں تو پولیس مجھے اس دلدل سے نہیں نکلنے دے گی۔ وہ مجھے بار بار اس میں دھکیلتے رہیں گے۔ اس لیے اب بھاگنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ اس دنیا میں ڈر اور خوف کے کوئی معنی نہیں ہوتے۔"

"تو پھر دو چار دن کے لیے شہر سے باہر چلے جاؤ کسی محفوظ جگہ پر۔ یہ ہنگامے ذرا سرد پڑ جائیں تو واپس آ جانا۔" سعید نے مشورہ دیا۔

"تمہارا یہ دو چار دن والا مشورہ مان سکتا ہوں لیکن کہاں جاؤں؟" فریدی بولا۔

"سرحدی گاؤں بھینی کے قریب ایک چھوٹی سی بستی ہے۔ میرا ایک دوست انور اس علاقے کا زمیندار ہے۔ اس کے گھر والے شہر میں رہتے ہیں۔ گاؤں والی حویلی خالی پڑی رہتی ہے۔ انور بھی کبھار ایک آدھ دن کے لیے وہاں چلا جاتا ہے اگر تم چاہو تو میں آج ہی انور سے بات کرتا ہوں۔ تم چند روز کے لیے حویلی میں جا کر رہ لو۔"

"ٹھیک ہے تم بات کر لو، میں چلا جاؤں گا۔" فریدی نے جواب دیا۔

"ناشتے کے بعد میں فون پر انور سے بات کر لوں گا۔ تم اٹھ کر منہ ہاتھ دھو لو۔ میں ناشتا لے کر آ رہا ہوں۔" سعید کہتے ہوئے نیچے چلا گیا اور فریدی اٹھ کر باتھ روم میں گھس گیا۔

اسی شام فریدی گاؤں والی حویلی میں منتقل ہو گیا۔ شہر سے گاؤں تک آتے ہوئے اس بات کا پورا خیال رکھا گیا تھا کہ ان کا تعاقب نہ کیا جائے۔

سعید اور فریدی جب حویلی پہنچے تو انور وہاں موجود تھا۔ اس نے ملازموں کو بتایا کہ فریدی اس کا دوست ہے اور کراچی سے آیا ہے۔ چند روز حویلی میں رہے گا۔ اس کی خدمت میں کوئی کمی نہ چھوڑی جائے۔

سعید اور انور تو واپس شہر چلے گئے اور فریدی ٹی وی کے سامنے بیٹھا مختلف پروگرام دیکھتا رہا۔

فریدی کو اس حویلی میں آئے ہوئے پانچواں دن تھا۔ اس وقت رات کے گیارہ بجے تھے۔ وہ ٹی وی کے سامنے بیٹھا ایک پرانی فلم دیکھ رہا تھا۔ اچانک ایک چیخ کی آواز سن کر وہ چونک گیا۔ چند سیکنڈ بعد چیخ کی ایک اور آواز سنائی دی۔ وہ اٹھ کر دروازے کی طرف بڑھا۔ ابھی وہ دروازے سے دو قدم دور ہی تھا کہ لمبے قد کا ایک آدمی دروازے میں داخل ہوا۔ اس کے ہاتھ میں رائفل تھی جس کا رخ فریدی کی طرف تھا۔ فریدی اس شخص کا چہرہ دیکھتے ہی اچھل پڑا۔ وہ قادر تھا۔ تاج بالی کا کارندہ...... بالآخر انہوں نے اسے ڈھونڈ ہی لیا تھا۔

"اپنے آپ کو بہت چالاک سمجھتے تھے باؤ فریدی۔" قادر نے معنی خیز انداز میں مسکراتے ہوئے کہا۔ "تمہیں شاید یہ اندازہ نہیں تھا کہ تاج بالی کی آنکھیں زمین کے اندر بھی دیکھ لیتی ہیں۔ جس دن تم یہاں آئے تھے ہمیں اس سے اگلے ہی روز پتا چل گیا تھا۔ تمہیں شاید معلوم نہیں کہ اس علاقے میں تاج بالی کے کئی ایجنٹ موجود ہیں جو سرحد پر اپنے کاروبار میں مصروف رہتے ہیں۔ تمہیں دوسرے ہی دن یہاں دیکھ لیا گیا تھا۔ تاج بالی صرف اسی انتظار میں تھا کہ شہر کے ہنگامے ذرا سرد پڑ جائیں تو تم سے حساب کتاب کیا جائے۔ تمہیں پتا چل گیا ہوگا کہ مہر اور اس کے چھ ساتھی جہنم رسید ہو چکے ہیں۔ تاج بالی یاروں کا یار ہے لیکن وہ

دھوکے بازوں کو کبھی معاف نہیں کرتا۔ یہ تو اچھا ہی ہوا کہ تم اس رات مزنگ والے اڈے پر موجود نہیں تھے ورنہ تم بھی ختم ہو چکے ہوتے۔ ویسے تاج بالی تمہارا بہت معترف ہے۔ تم واقعی ایک بہادر آدمی ہو اور ہم بہادروں کی قدر کرتے ہیں۔ اگر تم وہ پندرہ کلو ہیروئن واپس کر دو تو ہو سکتا ہے تاج بالی تمہیں معاف کر دے۔‘‘

’’ہیروئن میرے پاس نہیں ہے، وہ مہر ہی کے پاس تھی جو بعد میں شاید پولیس کے قبضے میں چلی گئی۔‘‘ فریدی نے جواب دیا۔

’’میں جھوٹ بالکل نہیں سننا چاہتا۔‘‘ قادر نے کہتے ہوئے اچانک ہی رائفل کی نال سے اس کے کندھے پر زوردار ضرب لگائی۔ فریدی کراہ اٹھا۔ ’’میں سچ جاننا چاہتا ہوں اگر تم وہ ہیروئن ہمارے حوالے کر دو تو تمہیں زندہ چھوڑ دیا جائے گا۔‘‘

’’مم...... میں کچھ نہیں جانتا۔‘‘ فریدی نے جواب دیا۔

اسی لمحے قادر کا دوسرا ساتھی ایک مزارع کو دھکیلتا ہوا کمرے میں داخل ہوا۔ قادر کے اس ساتھی کا نام بھی انور تھا اور اس کے پاس بھی کلاشنکوف رائفل تھی۔ وہ مزارع کو ٹھوکریں مارتا ہوا اندر لا رہا تھا اور مزارع چیخ چیخ کر اپنی بے گناہی ثابت کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

’’اس نے کچھ بتایا؟‘‘ قادر نے سوالیہ نگاہوں سے انور کی طرف دیکھا۔

’’نہیں، بستی کے سب ہی لوگ بتا رہے ہیں کہ یہ جب یہاں آیا تھا تو خالی ہاتھ تھا، اس کا مطلب ہے کہ اس نے ہیروئن شہر ہی میں کسی جگہ چھپا رکھی ہوگی۔ اب ہمیں یہ معلوم کرنا ہے کہ اس نے ہیروئن کہاں چھپائی ہے۔‘‘ انور نے جواب دیا۔

’’تو پھر...... شروع ہو جاؤ۔‘‘ قادر نے کہا۔ ’’تمہیں بڑا دعویٰ ہے کہ تم مردوں کو بھی زبان کھولنے پر مجبور کر دیتے ہو۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ تم باؤ فریدی کو زبان کھولنے پر مجبور کرتے ہو یا نہیں۔‘‘

’’اس کے تو فرشتے بھی زبان کھولیں گے۔‘‘ انور نے کہتے ہوئے اپنی رائفل ایک طرف رکھ دی۔ اس کے ساتھ ہی اس نے جیب سے انسٹافون کا سیٹ بھی نکال کر رکھ دیا تھا۔

’’ہاں بھئی باؤ فریدی، کیا خیال ہے؟‘‘ انور نے دو قدم آگے بڑھ کر اسے گھورا۔ ’’یہ سوچ لینا کہ اس وقت تمہارا واسطہ تھرڈ ریٹ غنڈے جیرا گجر کے آدمیوں سے نہیں، تاج بالی کے آدمیوں سے ہے اور ہم جس مشن پر جاتے ہیں اس میں ناکام نہیں ہوتے۔ بتاؤ ہیروئن کہاں ہے؟‘‘

’’مجھے نہیں معلوم۔‘‘ فریدی دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔

انور بھی آگے بڑھ رہا تھا اور پھر اس نے اچانک ہی فریدی پر حملہ کر دیا۔ فریدی کوشش کے باوجود اس کی زد میں آنے سے نہ بچ سکا۔ انور گھونسوں اور ٹھوکروں سے اس کی تواضع کرتا رہا۔

فریدی تقریباً دس منٹ تک پٹتا رہا۔ ہر گھونسے اور ٹھوکر کے بعد انور اس سے ہیروئن کے بارے میں پوچھتا۔ فریدی کا جواب ہر مرتبہ نفی میں ہوتا۔ انور کا آخری گھونسا فریدی کی گردن پر لگا۔ وہ لڑکھڑاتا ہوا قادر کی طرف آیا۔ قادر نے اسے ٹھوکر مارنا چاہی مگر فریدی اچانک ہی پوری قوت سے اس سے ٹکرا گیا۔ قادر اس کے لیے تیار نہیں تھا۔ وہ لڑکھڑا کر نیچے گرا۔ فریدی کے لیے یہ بہترین موقع تھا۔ اس نے ایک لمحہ ضائع کیے بغیر باہر کی طرف چھلانگ لگا دی۔

’’پکڑو...... جانے نہ پائے۔‘‘ قادر چیخا۔

انور نے اپنی رائفل اٹھائی اور دروازے کی طرف لپکا۔ زمین پر پڑے ہوئے مزارع نے اپنی ٹانگ آگے کر دی۔ انور منہ کے بل گرا۔ اس کے منہ سے گندی گالی نکل گئی۔ وہ سنبھل کر مزارع کی طرف دوڑا۔ اس کے چہرے پر بے پناہ درندگی تھی۔ اس نے رائفل کی نال مزارع کے سینے پر رکھ کر ٹریگر دبا دیا۔ کئی گولیاں مزارع کے سینے میں اتر گئیں۔

انور اور قادر باہر کی طرف دوڑے۔ فریدی اس دوران حویلی سے نکل کر کافی دور پہنچ چکا تھا۔ اس کا رخ کھیتوں کی طرف تھا۔ گہری تاریکی میں اسے فرار ہونے کا موقع مل گیا تھا۔

انور اور قادر کا خیال تھا کہ فریدی ابھی بستی ہی میں موجود ہوگا۔ وہ اسے بستی میں تلاش کرتے رہے پھر پکی سڑک پر آ گئے جہاں ان کی کار کھڑی تھی۔ انور نے موبائل فون پر تاج بالی کو فریدی کے فرار کی اطلاع دی اور پھر وہ دونوں فریدی کی تلاش میں کھیتوں کی طرف دوڑے۔

رات بھر کھیتوں میں چوہے بلی کا کھیل کھیلتے ہوئے رات کے آخری پہر وہ راوی کے پل کے قریب پہنچ گئے۔ اس کا خیال تھا کہ وہ موت کے ان فرشتوں سے نجات حاصل کر چکا ہے لیکن وہ اس کے تعاقب میں تھے اور بالآخر فریدی ان کے گھیرے میں آ گیا۔

فریدی کی قسمت اچھی تھی۔ وہ نہ صرف ان کا گھیرا توڑ کر اپنے آپ کو بچانے میں کامیاب ہو گیا بلکہ انور بھی مارا گیا۔ میوہ منڈی میں قادر نے اسے ختم کر دینے کی کوشش کی مگر قسمت نے یہاں بھی فریدی کا ساتھ دیا۔

لیکن فریدی کا ستارہ ابھی شاید پوری طرح گردش سے نہیں نکلا تھا۔ وہ صبح دن چڑھے جب شام نگر میں اپنے خفیہ ٹھکانے پر پہنچا تو موت کا ایک اور فرشتہ اس کا منتظر تھا۔

فریدی کی قسمت نے ایک بار پھر اس کا ساتھ دیا اور وہ اپنے دشمن کو ٹھکانے لگانے میں کامیاب ہوگیا لیکن یہ خفیہ ٹھکانا بھی اب مخدوش ہو چکا تھا۔ فریدی نے فالس سیلنگ کے اندر چھپا ہوا رقم اور ہیروئن سے بھرا ہوا بریف کیس نکالا اور محمد نگر والے مکان میں پہنچ گیا۔ یہ اس کا محفوظ ترین ٹھکانا تھا۔ ماں کی آغوش کی طرح پُرسکون اور محفوظ...... یہاں آنے کے کچھ ہی دیر بعد فریدی گہری نیند سو گیا۔

فریدی کی آنکھ کھلی تو شام کے چھ بج رہے تھے۔ وہ کچھ دیر تک آنکھیں بند کیے لیٹا رہا پھر اٹھ کر کمرے سے باہر نکل آیا۔

''شکر ہے تم اٹھ گئے۔ میں تو سمجھی تھی کہ تم دو تین دن تک سوئے رہو گے۔'' رخشندہ نے اسے دیکھتے ہی کہا۔ وہ صحن میں بیٹھی رات کا کھانا پکانے کے لیے سبزی کاٹ رہی تھی۔

''میں سو رہا تھا، بے ہوش نہیں ہوا تھا۔'' فریدی نے جواب دیا۔

''اللہ نہ کرے۔ کیوں ایسی باتیں منہ سے نکالتے ہو بھیا۔'' رخشندہ جلدی سے بولی۔

''اچھا، میں باتھ روم جا رہا ہوں جب میں نہا کر نکلوں تو مجھے چائے تیار ملنی چاہیے۔'' فریدی کہتے ہوئے باتھ روم میں گھس گیا۔

بیس منٹ بعد جب وہ باتھ روم سے باہر نکلا تو برآمدے میں میز بچھی ہوئی تھی اور رخشندہ چائے کے برتن لگا رہی تھی۔ اس نے ایک پلیٹ میں گرم گرم سموسے بھی لا کر رکھ دیے اور پھر چائے دانی میز پر رکھتے ہوئے بولی۔

''دیکھ لو...... تمہارے حکم کی تعمیل میں ذرا بھی تاخیر نہیں ہوئی۔''

''خوش رہو...... لیکن اماں کہاں ہے؟'' فریدی نے کہا۔

''اپنے کمرے میں۔ لو وہ آگئیں۔'' رخشندہ نے ماں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا جو کمرے سے نکل کر اسی طرف آرہی تھی۔

فریدی نے اماں کو سلام کیا۔ سکینہ اسے دعائیں دیتی ہوئی کرسی پر بیٹھ گئی۔ رخشندہ بھی کرسی پر بیٹھ کر کپوں میں چائے انڈیلنے لگی۔ فریدی نے ایک سموسہ اٹھا لیا اور ایک چھوٹا سا ٹکڑا کاٹ لیا لیکن دوسرے ہی لمحے وہ اچھل پڑا۔

''کیا ہوا بھیا؟'' رخشندہ نے گھبرا کر اس کی طرف دیکھا۔

''تو نے بتایا نہیں کہ سموسہ گرم تھا۔'' فریدی بولا۔

رخشندہ نے ایک زوردار قہقہہ لگایا۔

''ایسے بے صبرے ہو رہے ہو کہ دو منٹ انتظار بھی نہیں ہو سکتا۔''

''چپ رہ لڑکی، بڑے بھائی سے مذاق کرتے ہوئے شرم نہیں آتی تمہیں؟'' سکینہ نے اسے ڈانٹ دیا۔

''بولنے دو اماں، خود ہی چپ ہو جائے گی۔'' فریدی بولا۔

ایسے ہی خوشگوار ماحول میں وہ چائے پیتے رہے۔ فریدی، رخشندہ سے اس کی پڑھائی کے بارے میں پوچھتا رہا۔ وہ سی ٹی کر رہی تھی اور دو مہینے بعد امتحان ہونے والے تھے۔ اس کے بعد وہ استانی لگ جاتی۔ فریدی اسے سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا کہ سی ٹی تو وہ کر لے لیکن استانی بننے کے بجائے بی اے میں داخلہ لے لے اور اعلیٰ تعلیم کا حصول جاری رکھے۔

''دیکھا جائے گا، پہلے میں سی ٹی تو کر لوں۔'' رخشندہ نے جواب دیا۔

چائے پینے کے بعد فریدی ڈرائنگ روم میں آگیا جہاں ٹیلی فون رکھا ہوا تھا۔ ٹیلی فون بہت کم استعمال ہوتا تھا۔ کبھی کبھار رخشندہ ہی اپنی دوستوں سے بات کر لیا کرتی تھی۔ فریدی تو آج پہلی مرتبہ یہ فون استعمال کر رہا تھا۔ وہ سارا دن سوتا رہا تھا، اسے باہر کی صورتِ حال کا کچھ علم نہیں تھا اور اب وہ سعید سے رابطہ قائم کر کے صورتِ حال معلوم کرنا چاہتا تھا۔ اس نے ریسیور اٹھا کر سعید کے ریسٹورنٹ کا نمبر ملایا۔ دوسری گھنٹی پر ہی کال ریسیو کر لی گئی۔

''ہیلو...... سعید ریسٹورنٹ جی۔''

''کون بول رہا ہے؟'' فریدی نے پوچھا۔

''بکا بول رہا ہوں جی۔ آپ کو کس سے بات کرنی ہے۔'' دوسری طرف سے آواز سنائی دی۔ برکت (بکا) سعید کا ملازم تھا۔ سعید کی عدم موجودگی میں کاؤنٹر وہی سنبھالتا تھا۔

''سعید کہاں ہے؟''

''تھانے میں جی۔'' جواب ملا۔

''کیا مطلب...... کیا بکتے ہو؟'' فریدی نے ڈانٹنے والے لہجے میں کہا۔

''میں سچ کہہ رہا ہوں جی۔ ایک گھنٹے پہلے پولیس والے انہیں پکڑ کر لے گئے ہیں مگر آپ کون بول رہے ہیں جی؟''

فریدی نے جواب دینے کے بجائے ریسیور رکھ دیا۔

اس کے چہرے پر پریشانی کے تاثرات ابھر آئے تھے اور دل کی دھڑکن تیز ہوگئی تھی۔ سعید کی گرفتاری والی بات اس کی سمجھ میں نہیں آئی تھی اور یہ معلوم کرنا ضروری تھا کہ پولیس اسے کیوں پکڑ کر لے گئی ہے۔ وہ ڈرائنگ روم سے نکل کر اپنے کمرے میں آ گیا اور لباس تبدیل کرنے لگا۔ تیار ہونے کے بعد اس نے اٹیچی کیس کھول کر دو لاکھ روپے کی رقم نکالی اور اٹیچی کیس بند کر کے اسے پلنگ کے نیچے دھکیل دیا۔ پھر دروازہ کھول کر سکینہ کو اندر بلا لیا۔

''کہیں جا رہے ہو؟'' سکینہ اسے تیار دیکھ کر بولی۔

''جی ہاں، میں ایک ضروری کام سے جا رہا ہوں۔ ہو سکتا ہے واپسی میں دیر ہو جائے۔ میں آپ کو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ میری عدم موجودگی میں کوئی اجنبی آئے تو دروازہ کھولنے سے پہلے اطمینان کر لیجیے کہ وہ کون ہے۔ کوئی میرے بارے میں پوچھے تو کہہ دیں کہ ہم نہیں جانتے۔''

''یہ کیوں بیٹا؟'' سکینہ نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

''یہ میں آپ کو پھر کسی وقت تفصیل سے بتاؤں گا اور ایک بات اور...... میرے سوٹ کیس میں رقم رکھی ہوئی ہے۔ ذرا خیال رکھیے۔'' فریدی نے کہا۔

''کتنی رقم ہے بیٹا۔ مجھے دے دو۔ میں سنبھال کر رکھ دوں گی۔'' سکینہ نے کہا۔

''پچاس لاکھ روپے اور کچھ قیمتی چیزیں بھی ہیں۔''

''پپ...... پچاس لاکھ روپے...... تم مذاق تو نہیں کر رہے بیٹا۔'' سکینہ ہکلا کر رہ گئی۔

''نہیں ماں جی...... یہ مذاق نہیں ہے۔'' فریدی نے جواب دیا۔

''اتنا پیسا تمہارے پاس کہاں سے آیا بیٹا؟'' سکینہ نے مشتبہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

''کاروبار کرتا ہوں ماں، پیسا تو آئے گا۔ اچھا، میں جا رہا ہوں۔'' فریدی کہتا ہوا دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

وہ بڑی احتیاط سے گھر سے نکلا تھا۔ مختلف گلیوں میں گھومتا ہوا وہ مین روڈ پر نکل آیا۔ اسے فوراً ہی رکشا مل گیا۔

ایبٹ روڈ کے ایک سنیما کے سامنے اس نے رکشا چھوڑ دیا۔ سنیما کا دوسرا شو شروع ہونے والا تھا۔

فریدی ہجوم میں چلتا ہوا دفتر میں گھس گیا۔ دفتر میں بھی بہت سے لوگ بھرے ہوئے تھے۔ اسسٹنٹ منیجر فریدی کو دیکھتے ہی چونک گیا۔ وہ لوگوں کو دھکیلتا ہوا تیزی سے باہر نکل آیا۔ وہ فریدی کو بھی ہاتھ سے پکڑ کر اپنے ساتھ باہر کھینچ لایا تھا۔

''کیا بات ہے۔ تم یہاں کیوں آئے ہو؟'' اسسٹنٹ منیجر بشیر نے ایک کونے میں پہنچ کر کہا۔

''میرے ایک دوست کو پولیس نے گرفتار کر لیا ہے۔ تمہیں یہ معلوم کرنا ہے کہ اسے کس الزام میں گرفتار کیا گیا ہے اور کس تھانے میں ہے؟'' فریدی نے کہا۔

''دیکھ رہے ہو یہاں کتنا رش ہے، میں کیسے......''

''بشیر!'' فریدی کے منہ سے ہلکی سی غراہٹ نکلی۔ ''میں کنگ سرکل ریسٹورنٹ میں تمہارا انتظار کروں گا اور زیادہ سے زیادہ تمہیں آدھا گھنٹا دے سکتا ہوں۔''

وہ سنیما سے نکل کر ٹہلتا ہوا لکشمی چوک پر آ گیا۔ چوک کی رونق اس وقت عروج پر تھی۔

فریدی کنگ سرکل ہوٹل میں کونے والی ایک میز پر بیٹھ گیا۔ ہوٹل میں بھی رش تھا لیکن کونے والی میز خالی مل گئی تھی۔ اس نے کافی منگوالی اور ہلکی ہلکی چسکیاں لیتے ہوئے ہال میں بیٹھے ہوئے چہروں کا جائزہ لینے لگا۔

پچیس منٹ بعد بشیر کو دروازے میں داخل ہوتے دیکھ کر فریدی نے اپنی سیٹ چھوڑ دی۔ ہال میں رش تھا اور یہاں بیٹھ کر بات کرنا مناسب نہیں تھا۔ کافی کا بل وہ پہلے ہی ادا کر چکا تھا۔ وہ بشیر کو لے کر باہر نکل گیا۔ چند قدم کے فاصلے پر مرغ چھولے والے کا ٹھیلا تھا۔ وہ ٹھیلے کے پیچھے عمارت کے قریب نیم تاریکی میں کھڑے ہو گئے۔

''کیا رہا؟'' فریدی نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

''تمہارا دوست سعید اس وقت بھینی کے علاقے کے تھانے میں ہے۔'' بشیر کہنے لگا۔ ''چند روز پہلے وہ اپنے کسی جاننے والے کو اپنے ایک دوست انور کی حویلی میں چھوڑ کر آیا تھا۔ کل رات حویلی میں کوئی ہنگامہ ہو گیا جس میں انور کا ایک مزارع مارا گیا بستی والوں کا بیان ہے کہ کلاشنکوف رائفلوں سے مسلح دو آدمی کل رات بستی میں آئے تھے۔ وہ انور کے مہمان کے بارے میں پوچھ رہے تھے۔ پھر انہوں نے حویلی میں گھس کر انور کے مہمان کو پکڑ لیا۔ وہ ایک مزارع کو بھی مارتے پیٹتے ہوئے حویلی میں لے گئے تھے۔ کچھ دیر تک حویلی سے مار پیٹ کی آوازیں سنائی دیتی رہیں پھر انور کا مہمان حویلی سے بھاگ نکلا اور وہ دونوں آدمی بھی اسے پکڑنے کے لیے دوڑے۔ بستی والے جب حویلی میں داخل ہوئے تو

مزارع کی لاش وہاں پڑی تھی۔ ایک آدمی نے شہر آکر انور کو اس واقعے کی اطلاع دے دی اور انور نے متعلقہ تھانے میں اطلاع دی پولیس کو حملہ آوروں کے علاوہ اس شخص کی بھی تلاش تھی جو مہمان کی حیثیت سے حویلی میں ٹھہرا ہوا تھا۔ پولیس نے انور کے کہنے پر سعید سے رابطہ قائم کیا۔ سعید نے مہمان کے بارے میں کچھ بتانے سے انکار کر دیا جس پر پولیس اسے پکڑ کر لے گئی۔''

''ٹھیک ہے، تم جاؤ۔'' فریدی نے اس کے خاموش ہونے پر کہا۔

کچھ ہی دیر بعد فریدی ایک ٹیکسی میں سوار بھینی کی طرف جا رہا تھا۔ متعلقہ تھانے پہنچنے میں اسے تقریباً ایک گھنٹا لگا۔ جب وہ تھانے کے سامنے ٹیکسی سے اترا تو چیخوں کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ فریدی نے ڈرائیور کو رکنے کا کہا اور تھانے میں داخل ہو گیا۔ دو پولیس والے برآمدے میں ایک دیہاتی کی خاطر تواضع کر رہے تھے جس پر مویشی چوری کرنے کا الزام تھا۔

فریدی ایس ایچ او کے کمرے میں داخل ہو گیا۔ جہاں تین چار پولیس والے اور دو زمیندار قسم کے آدمی بیٹھے ہوئے تھے۔

''جی فرمائیے؟'' ایس ایچ او نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

''آپ فارغ ہو لیں تو بات کی جائے۔'' فریدی نے جواب دیا۔

ایس ایچ او نے عجیب سی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا پھر زمینداروں کی طرف متوجہ ہو گیا۔ چند منٹ بعد اس نے دونوں زمینداروں کو رخصت کر دیا اور فریدی کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھنے لگا۔

''سعید نامی ایک شخص آپ کی کسٹڈی میں ہے؟'' فریدی بولا۔

''اوہ!'' ایس ایچ او چونک گیا۔

''کیا آپ بتائیں گے کہ سعید کے خلاف کیا چارج لگایا گیا ہے؟''

''آپ کون ہیں؟'' ایس ایچ او نے اسے گھورا۔

''سعید کا دوست لیکن آپ نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔'' فریدی بولا۔

''معاملہ ایک قتل کا ہے، کوئی بھی چارج لگ سکتا ہے۔''

''میں آپ کو یہ یقین دلانا چاہتا ہوں کہ سعید بے قصور ہے۔ اس کا اس معاملے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ میں یہ بھی بتا سکتا ہوں کہ انور کے مزارع کا قاتل کون ہے اور حویلی کا وہ مہمان کون تھا۔ لیکن کیا...... میں تنہائی میں بات کر سکتا ہوں۔'' فریدی بولا۔

ایس ایچ او کچھ دیر تک مشتبہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتا رہا پھر اس نے اپنے ماتحتوں کو اشارہ کیا۔ وہ اٹھ کر باہر چلے گئے۔ فریدی نے پتلون کی جیب سے ہزار روپے والے نوٹوں کی گڈیاں نکال کر ایس ایچ او کے سامنے رکھ دی۔

''یہ کیا ہے؟'' ایس ایچ او نے اسے گھورا۔

''ایک لاکھ روپے۔'' فریدی نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ''سعید کا اس معاملے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ انور کے مزارع کا قاتل تاج بالی کا آدمی ہے اس کا نام بھی انور ہے۔ بعد میں وہ راوی کے پل کے قریب قادر نامی اپنے ہی ایک ساتھی کے ہاتھوں مارا گیا تھا۔ سبزی منڈی میں ہونے والا ہنگامہ بھی اسی سلسلے کی کڑی ہے۔ وہاں تین آدمی مارے گئے تھے اور ان کا قاتل بھی قادر ہے۔ سعید کو بلاوجہ پکڑا گیا ہے۔ میں اسے لینے آیا ہوں۔''

''تم کون ہو؟'' ایس ایچ او بولا۔

''میں کوئی بھی نہیں۔'' فریدی نے کہتے ہوئے نوٹوں کی ایک اور گڈی نکال کر اس کے سامنے رکھ دی۔ یہ بھی ایک لاکھ تھے۔ ''تم نے سعید کے بارے میں اپنی تفتیش مکمل کر لی ہے۔ اس کے خلاف کوئی الزام نہیں ہے اور تم نے اسے چھوڑ دیا ہے۔ آئندہ اسے اس معاملے میں ملوث کرنے کی کوشش بھی نہیں کرو گے۔ میں سعید کا دوست ہوں اس کے لیے یہ رقم خرچ کر رہا ہوں اگر تم میری طرف دوستی کا ہاتھ بڑھاؤ تو فائدے میں رہو گے۔'' فریدی نے مسکراتے ہوئے ہاتھ اس کی طرف بڑھا دیا۔

ایس ایچ او چند لمحے اس کی طرف دیکھتا رہا پھر اس نے بڑی گرمجوشی سے فریدی کا ہاتھ تھام لیا۔ یہ دوستی فریدی سے نہیں دو لاکھ کے ان نوٹوں سے تھی جو اس کے سامنے میز پر پڑے تھے۔

اور پھر تقریباً ایک گھنٹے بعد فریدی اور سعید پولیس اسٹیشن سے نکل رہے تھے۔ بالآخر فریدی نے ان راستوں کو اپنا لیا تھا جن راستوں نے اس کی زندگی کو چھلنی کر دیا تھا۔

کچھ لوگ ہمیشہ ایسی زندگی گزار دیتے ہیں... جسے صرف ناکام... نامراد ہی کہا جا سکتا ہے... اس کی زندگی بھی ناہمواریوں اور ناکامیوں سے بھری تھی... وہ بزدل اور کمزور تھا... زندگی کی تیز رفتاری کا ساتھ دینا اس کے لیے ناممکن تھا... اس کے باوجود وہ ان لوگوں کے درمیان دن گزارتا تھا... جو کامیاب تھے... زندگی سے بھرپور خوش نصیب باکمال لوگ تھے... اچانک ہی اس کے یکسانیت سے لبریز روز و شب میں ایک ہلچل بپا ہو گئی...

کونے کھدروں میں جمع فاضل اشیا سے جڑی ایک منفرد کہانی کے حیرت انگیز موڑ

کان چور

مختار آزاد

میں اپنی گزر بسر کے لیے کینٹ کی گینزین اسٹریٹ پر واقع چار منزلہ رہائشی عمارت کے مکینوں کا دلی مشکور رہا ہوں۔ اگر وہ چوکیدار نہ رکھتے تو مجھ جیسے آرام طلب انسان کے لیے شاید کوئی اور ملازمت کرنا بہت مشکل ہو جاتا۔ میں اپنے دونوں کانوں کی سلامتی کے لیے گراؤنڈ فلور کے اپارٹمنٹ نمبر 03 کے رہائشی رمائی ڈی سوزا اور اس کی ننھی بیٹی ماریہ کا احسان مند ہوں۔ نظریں کمزور ہونے لگی ہیں۔ جلد چشمے کی ضرورت پڑے گی۔ سوچتا ہوں کہ اگر ماریہ نہ

ہوتی تو پھر میں چشمہ کہاں رکھتا۔

میں ان سب کو بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔ اُن کے تمام تر معمولات سے اچھی طرح آگاہ ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ اس بلڈنگ کے کس اپارٹمنٹ میں کون رہتا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ اپارٹمنٹ نمبر 13 میں مقیم بوڑھا ہر ہفتے اپنا کچرا باہر لے کر آتا ہے لیکن ہمیشہ غلط دن پر۔ جس دن کچرا گاڑی نہیں آنے والی ہوتی، اُس دن بوڑھا اپنے اپارٹمنٹ سے باہر ضرور آتا تھا مگر کبھی اسے اپنی غلطی کا احساس نہیں ہوا۔

دن کے آغاز پر جو سب سے پہلی چیز دیکھتا ہوں، وہ اپارٹمنٹ نمبر 107 سے نکلنے والی لڑکی ہوتی ہے۔ وہ گرل فرینڈ ہرگز نہیں ہوسکتی۔ اُس اپارٹمنٹ سے ہر صبح ایک نئی لڑکی برآمد ہوتی تھی۔ اُس اپارٹمنٹ میں ایک نوجوان رہتا ہے جو چہرے مہرے سے کسی ہیرو کی طرح دکھتا ہے لیکن ہے پکا شکاری۔

اپارٹمنٹ نمبر 121 میں بوڑھی اور تقریباً معذور مسز کولنز رہتی ہیں۔ پوری گرمیوں میں صبح سے لے کر سورج کی تمازت تیز ہونے تک وہ بالکونی میں بیٹھی رہتی ہیں۔ سہ پہر ڈھلنے کے بعد سورج غروب ہونے تک پھر وہی نظارہ ہوتا ہے۔ مجھے یقین تھا کہ مسز کولنز کی نرس بہت اچھی طرح دیکھ بھال کرتی ہوگی۔ کوئی غافل یا سست قسم کی نرس ہوتی تو شاید انہیں سورج چڑھنے تک دھوپ میں بیٹھنا پڑتا لیکن میں دیکھتا تھا کہ سورج کے ساتھ ساتھ مسز کولنز کی وہیل چیئر بھی سائے میں سرکتی رہتی تھی۔ یہ کام تو کوئی ذمے دار نرس ہی کرسکتی تھی ورنہ نحیف ونزار اور تنہا رہنے والی بیوہ کے ہاتھ تو شاید ایک گلاس پانی کا بوجھ تھام لیتے تو وہی بڑی بات ہوتی، وہیل چیئر کو کس طرح چلا سکتی تھی۔

جب اپارٹمنٹ نمبر 143 کے بچے اپنی سائیکلیں بلڈنگ کے داخلی دروازے پر پھینک کر اوپر بھاگ جاتے تھے تو مجھے ہی اٹھ کر ان سائیکلوں کو اٹھا کر ترتیب کے ساتھ ایک طرف کھڑی کرنا پڑتی تھیں تاکہ اندر جانے یا باہر آنے والوں کو کوئی تکلیف نہ ہو۔ اس بلڈنگ کے رہائشیوں کی دیکھ بھال میری مجبوری نہیں بلکہ میرا کام تھا۔ میں وہاں پر چوکیدار جو تھا۔

بلڈنگ کے عقبی حصے میں ایک سڑک تھی جس کے کنارے گاڑیاں پارک کرنے کے لیے ایک قطار میں چالیس گیراج بنائے تھے۔ اپارٹمنٹس کے رہائشیوں کی ملکیت یہ گیراج سرخ اینٹوں سے تعمیر کیے گئے تھے جن پر ٹین کی موٹی موٹی چادروں والی چھتیں پڑی ہوئی تھیں۔

بلڈنگ بہت پرانی ہوچکی تھی اور اس کے ساتھ ساتھ گیراج کی چھتیں بھی۔ جب کبھی بوندا باندی ہوتی وہ بھی آدھی رات کو تو ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے چھت پر سیکڑوں بڑے بڑے چوہے چہل قدمی کررہے ہوں۔ بارش تیز ہوتی تو یہ چہل پہل بھاگ دوڑ کی بے ہنگم آوازیں پیدا کرنے لگتی اور اگر بارش موسلا دھار ہوتو بڑا خوف محسوس ہوتا تھا۔ ایسا لگتا جیسے سیکڑوں مشین گنیں بنا رکے گولیاں فائر کررہی ہوں۔ کبھی کبھی تو میں ان آوازوں سے خوفزدہ بھی ہوجاتا تھا۔

لوہے سے بنے گیراج کے دروازے زنگ آلود ہوچکے تھے۔ ان کے ہینڈل بھی تقریباً ناکارہ تھے۔ کھلنے پر اتنا شور کرتے تھے کہ آس پڑوس کے تمام رہنے والوں کو خبر ہوجاتی تھی۔ ان گیراجوں کو زیادہ تر بلڈنگ کے رہنے والے ہی استعمال کرتے تھے۔ کچھ ایسے تھے جنہیں مالکان نے ایسے لوگوں کو کرائے پر دے رکھا تھا، جو اپنے کام کاج کے لیے مضافاتی علاقوں سے شہر کا رخ کرتے تھے۔ وہ یہاں اپنی گاڑیاں پارک کرکے، سیدھا سینٹ پیٹرز اسٹیشن کا رخ کرتے تاکہ ٹرین پکڑ کر برسلز میں اپنے دفاتر اور دیگر کام کی جگہوں پر پہنچ سکیں۔

میں ان گیراجوں میں کھڑی کی جانے والی تمام گاڑیوں کو اچھی طرح پہچانتا تھا۔ یہاں تک مجھے علم تھا کہ کس گیراج میں کس ماڈل کی گاڑی کھڑی کی جاتی ہے، اس کا ڈرائیور کون ہے اور اس میں کون کون لوگ سفر کرتے ہیں۔ چوکیدار کی حیثیت سے میرے پاس ان تمام گیراجوں کی ایک، ایک چابی رہتی تھی، تاکہ کسی ایمرجنسی کی صورت میں کوئی مشکل نہ ہو۔

گیراج نمبر 27 باقی سب سے منفرد تھا۔ دن ہو یا رات، اس کا دروازہ ہمیشہ کھلا رہتا تھا۔ میں تیس سال کا تھا جب گینزین اسٹریٹ پر کام کرنے پہنچا تھا اور اب مجھے یہاں گیارہ سال بیت چکے لیکن اس گیراج کو کبھی استعمال ہوتے نہیں دیکھا تھا۔ گیارہ برس پہلے بھی وہ گیراج خالی اور کھلا ہوا تھا اور آج بھی ویسا ہی پڑا ہے۔ حتیٰ کہ کبھی کسی ذی نفس کو بھی اس کے اندر جاتے نہیں دیکھا تھا ماسوائے اپنے آپ کے یا اُس رات کے۔

رات کو میں بلڈنگ کے اطراف گشت پر نکلتا تھا۔ یہ میرا روز کا معمول تھا۔ کبھی کبھار بارش ہوجاتی یا طوفانی ہوائیں چل رہی ہوتیں تو میں ان سے بچنے کے لیے کچھ دیر تک اسی گیراج میں بیٹھا رہتا تھا۔ اُس وقت ٹین کی چھت پر

پڑنے والی بارش کی بوندیں ایسی ایسی آوازیں پیدا کرتی تھیں کہ کئی بار تو میں ٹارچ کی روشنی میں بننے والے اپنے ہی سائے سے بُری طرح خوفزدہ ہو چکا تھا۔

خزاں کے موسم میں اسفلٹ کی پختہ اور تنگ سڑک پر تیز طوفانی ہواؤں سے درختوں کے اڑتے ہوئے سوکھے پتے ایسا خوفناک سماں باندھ دیتے تھے کہ کیا کسی ہارر مووی کا ساؤنڈ ایفیکٹس ہوتا ہوگا۔ کئی بار یوں لگا کہ جیسے سیکڑوں بھوت کسی کی میت پر آہ و بکا کر رہے ہوں۔ اکثر دل میں عہد کرتا تھا کہ بارش اور طوفانی ہواؤں کی رات گشت پر نہیں نکلوں گا لیکن اگلی دفعہ پھر ارادہ ٹوٹ جاتا تھا۔ رات کا گشت اور مفت کی کافی میری عادات میں اس طرح شامل ہو چکی تھیں کہ انہیں بدلنا ناممکن تو نہیں شاید مشکل ضرور بن چکا تھا۔

اسی طرح کی ایک رات تھی۔ میں گشت پر تھا کہ بارش شروع ہوگئی۔ جب کافی دیر تک نہ تھمی تو وقت گزاری کے لیے ٹارچ کی روشنی میں گیراج نمبر 27 میں پڑے کاٹھ کباڑ کا جائزہ لینا شروع کر دیا۔ ایک کونے میں ترتیب سے پرانے ٹائر پڑے تھے۔ ایک جانب انجن آئل کے خالی ڈبے، اس کے ساتھ ٹوٹے ہوئے عقبی بمپر تھے۔ ایک کونے میں الماری پڑی تھی۔ میں نے درازیں کھولیں، سب خالی تھیں۔ ٹارچ کی روشنی شیلف پر ڈالی۔ وہاں لکڑی پر گول گول نشان بنے ہوئے تھے۔ ان پر مٹی بھی جم چکی تھی۔ لگ رہا تھا کہ قابلِ استعمال حالت میں اُن پر جام جیلی جیسی چھوٹی چھوٹی شیشیاں رکھی جاتی ہوں گی۔

ایک دم مجھ میں احساسِ تنہائی جاگ اٹھا۔ کاش میری بھی کوئی بیوی ہوتی، اس وقت میں تنہائی دور کرنے کے لیے اُسے فون تو کر لیتا مگر عورتوں کے معاملے میں میری قسمت کچھ زیادہ اچھی نہیں۔ لاکھ کوششوں کے باوجود زندگی بھر کوئی لڑکی گرل فرینڈ نہ بن سکی۔ بیالیس سال کی عمر تھی مگر اب تک غیر شادی شدہ تھا۔ اب تو جسمانی ہیئت ایسی ہے کہ شاید کوئی بوڑھی بیوہ بھی میری طرف دیکھنا پسند نہ کرے۔

میرا وزن ڈھائی سو پونڈ ہو چکا تھا، سر کے بال گھنے تھے لیکن چند یا بالکل صاف تھی۔ مردانہ گنج پن کا عارضہ لاحق تھا۔ اگلے چند برسوں میں پورا سر پورے چاند کی طرح لگنے والا تھا۔ یہ صرف میرا خدشہ نہیں بلکہ میرے ڈاکٹر کا یقین ہے۔ بڑی بڑی مونچھوں میں سفیدی اتر آئی تھی۔ اب تو میری ماں کا بھی یہ کہنا تھا کہ اس جسمانی بناوٹ کے ساتھ میں کسی عورت کو ڈرانے کے تو کام آسکتا ہوں، اسے رجھانے کے نہیں۔ بہرحال یہ میری ماں کی رائے تھی لیکن

میں سمجھتا ہوں کہ بڑی بدقسمتی میرے اوپری لب پہ بنا پیدائشی نشان تھا جو موٹے لب پر کسی بڑے لال بیگ کے مانند دور سے ہی دکھائی دیے جاتا تھا۔ میری نظر میں یہی وہ چیز ہے جس کے باعث بھری جوانی میں بھی کوئی بدصورت حسینہ نظر بھر کر میری طرف دیکھنے کی روادار نہیں رہی تھی۔

ہر رات گشت پر نکلتے ہوئے میں سینٹ پیٹرز ریلوے اسٹیشن کے سامنے بنے سوزانے اسنیکس بار سے کافی لیتا اور گشت کرتے ہوئے گرما گرم کافی کی چُسکیاں بھرتا جاتا تھا۔ یہاں کافی کے علاوہ چائے بھی ملتی تھی۔ ریلوے اسٹیشن کی وجہ سے اچھے خاصے گاہک آتے تھے۔ یہاں وقت بے وقت ڈسپوزایبل گلاس، کپ، چمچ اور پلیٹ کی قلت ہو جاتی تھی۔ اسی کے پیشِ نظر میں نے اضافی آمدنی کا ایک اچھا راستہ تلاش کر لیا تھا۔

بلیک مارکیٹ میں میری کچھ جان پہچان تھی۔ وہاں سے یہ سامان خاصی بڑی تعداد میں خرید کر گیراج نمبر 27 کے اندر دیوار گیر الماری میں رکھ کر تالا لگا دیتا تھا۔ یہ اسنیکس بار ایک بوڑھی اور حد سے زیادہ موٹی تھائی عورت سوزانے چلاتی تھی۔ وقتِ ضرورت وہ فون کر دیتی اور میں یہ سامان تھوڑا سا منافع رکھ کر اُس کے ہاتھوں فروخت کر دیتا تھا۔

سوزانے کے لیے بھی یہ فائدے کا سودا تھا۔ میرے ریٹس مارکیٹ سے اچھے خاصے کم تھے، اوپر سے اُسے ٹیکس بھی نہیں دینا پڑتا تھا۔ یوں خوشی خوشی ہم دونوں کے درمیان بہترین کاروباری رشتہ قائم ہو چکا تھا۔ وہ مجھے 'بیٹا' کہتی تھی۔ اس کاروباری ڈیل کے نتیجے میں ملنے والی رعایت کا اس نے بدلہ بھی چکا دیا۔ مجھے رات کو لارج کافی مگ مفت ملتا تھا۔ یاد نہیں پڑتا کہ کوئی رات ایسی گزری ہو جب اس سنہری پیشکش سے لطف اندوز نہ ہو سکا ہوں۔

اپارٹمنٹس بلڈنگ کے مکین بڑے ناشکرے تھے۔ انہیں کبھی خیال نہ آیا کہ میں کس طرح روزانہ، ہفتہ وار چھٹی کیے بنا ان کی خدمت کرتا تھا۔ کس طرح رات رات بھر جاگ کر ان کے اپارٹمنٹس اور گاڑیوں کی حفاظت کرتا تھا۔ یہ لوگ میرے ساتھ عام طور پر اس طرح کا سلوک روا رکھتے تھے کہ جیسے میں تو دنیا میں ہوں ہی نہیں۔

دن ہو یا رات میں کسی وقت بلڈنگ کے عقب میں گیراجوں پر نظر ڈالنے کے لیے وہاں جاتا تو اکثر گراؤنڈ فلور پر رہنے والے مجھ پر نظر پڑتے ہی اپنی کھڑکیوں کے پردے تان دیتے تھے۔ اوپری منزل پر بالکونی میں

کپڑے سکھانے کے لیے آنے والی عورتیں بھی مجھ پر نظر پڑتے ہی فوراً منہ دوسری طرف کرلیتی تھیں یا لپک کر اندر چلی جاتیں۔ بلڈنگ کے احاطے میں کھیلنے کودنے والے بچے بھی اکثر مجھ پر پتھر پھینکتے اور نہایت حقارت آمیز لہجے میں پکارتے: ''موٹا، پاگل، بے وقوف......''

بچوں کے چھیڑنے پر میں جھوٹ موٹ میں غصے والا منہ بناتا، مٹھیاں بھینچتا اور کبھی کبھار انہیں پکڑنے کے لیے اٹھنے کی اداکاری بھی کرتا تھا۔ یہ دیکھ کر وہ اپنی سائیکلیں پھینک کر، شور مچاتے ہوئے اِدھر اُدھر بھاگ جاتے تھے۔ ننھے شیطان کہیں کے......

برسوں سے یہی سب کچھ چلا آرہا تھا۔

وقت گزرتا چلا جارہا تھا۔ اس دوران اپارٹمنٹ نمبر 121 میں رہائش پذیر بوڑھی مسز کولنز کا انتقال ہوگیا۔ مجھے سب سے زیادہ تنگ کرنے والے بچے اُس کے اپارٹمنٹ میں منتقل ہوچکے تھے۔ اپارٹمنٹ 143 میں رہنے والے بچے اب بڑے ہوچکے تھے۔ اُن کی چھوٹی چھوٹی سائیکلیں اب موٹر سائیکلوں میں تبدیل ہوچکی تھیں۔ اپارٹمنٹ نمبر 107 میں رہنے والے نوجوان کے فلیٹ سے ہر صبح نئی لڑکی کے نکلنے کا سلسلہ بند ہوچکا تھا۔ اس نے بازوؤں پر ٹیٹو والی ایک پکی گرل فرینڈ پال لی تھی۔ کئی برسوں سے دونوں ساتھ رہتے تھے۔ جب بھی اس اپارٹمنٹ کے سامنے سے گزرا، اگر کھڑکی کھلی ہوتی تو وہ عورت لڑتے جھگڑتے ہی ملی۔ البتہ ایک چیز نہیں بدلی تھی۔ کچرا اٹھانے والی گاڑی ہر جمعے کو آتی تھی لیکن اپارٹمنٹ نمبر 113 کا بوڑھا ریٹائرڈ ہر منگل کو کچرے سے بھرا بڑا سا تھیلا کچرا کنڈی میں ڈالنے کے لیے ہانپتا کانپتا باہر نکل آتا تھا۔

موسمِ گرما کی تیز ہوائیں گیراج کی چھت سے ٹکراتیں تو ایسا لگتا تھا کہ ٹین کی چھت میں چھید کردیں گی۔ سردیوں میں برف گرتی تو اپارٹمنٹ اور گیراج کی درمیانی چھوٹی سڑک برف سے ڈھک جاتی۔ رات کو گشت پر نکلتا تو میرے بھاری جوتوں کے نیچے وہ کُرکُر کر کے ٹوٹتی تھی بالکل خستہ چپس کی طرح۔ یہ آواز سن کر مجھے بڑا مزہ آتا تھا۔

کرسمس کے موقع پر جب اپارٹمنٹس کے مکین اپنی بالکونیوں کو رنگ برنگ کی روشنیوں سے سجاتے تو پاؤں تلے کچلتی برف پر پڑتی ہوئی رنگ برنگی روشنیوں میں گشت کرنا نوکری سے زیادہ تفریح لگتا تھا۔ اب بھی ہر رات مفت کی کافی پیتا تھا۔ اسنیکس بار کا کاروبار بھی بڑھ گیا تھا اور اس کے ساتھ ساتھ سوزانے سے لین دین میں ترقی آچکی تھی۔ میرا سائڈ بزنس بدستور ترقی پذیر تھا۔ اب گیراج نمبر 27 کی الماری میں سپلائی کا سامان ہر وقت وافر مقدار میں موجود رہتا تھا۔ دن ہو یا رات، ایک فون پر پانچ منٹ میں اسنیکس بار کو سپلائی فراہم کردیتا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ میں اب بھی بدستور چوکیدار تھا۔

سب کچھ ٹھیک ٹھاک چل رہا تھا لیکن اس سال موسمِ سرما کی شدت اور غیر معمولی برف باری کو دیکھتے ہوئے نہ جانے کیوں دل میں ایک کھٹکا تھا کہ کچھ نہ کچھ غیر معمولی ہونے والا ہے۔

وہ اکتوبر کا پہلا ہفتہ تھا اور دو راتوں سے مسلسل برف باری ہورہی تھی۔ اگرچہ یہ موسمِ سرما کی ابتدا تھی لیکن سردی اور برف باری، دونوں غیر معمولی تھیں۔ شاید یہ عالمی موسمیاتی تبدیلیوں کا ہی کوئی اثر ہوگا۔ میں نے اخبار میں اس کے بارے میں ایک طویل رپورٹ پڑھی تھی۔ انہی دنوں ایک شام جب میں عقبی گارڈن میں درختوں کی ٹوٹی ہوئی شاخوں کو اکٹھا کررہا تھا تو بہت برسوں بعد پہلی بار مجھے آکسیجن کی کمی محسوس ہوئی۔ پہلی بار ایسا ہوا کہ اکتوبر کے پہلے ہفتے میں سانس خارج کرتے ہوئے منہ، ناک سے بھاپ نکل رہی تھی۔

گیراج کی حالت بھی کچھ ٹھیک نہیں تھی۔ ٹین کی زنگ خوردہ چھت موسموں کی شدت کا مقابلہ کرتے کرتے اب تھک چکی تھی۔ ہر سال موسمِ سرما میں اس کی مرمت کا سوچتا تھا اور ہر بار یہ معاملہ جوں کا توں ہی رہ جاتا تھا۔ اب تو اس کی چھت میں اتنا بڑا سوراخ ہوچکا تھا کہ اُس میں سے آسمان پر چمکتا سورج صاف نظر آتا تھا۔ بارشوں میں بھی پانی اندر ٹپکتا تھا۔ اطمینان کی صرف ایک بات تھی کہ میری الماری اب تک بارش کے پانی سے بالکل محفوظ تھی، شاید اسی لیے مرمت میں سستی ہورہی تھی۔

دوپہر کو اسنیکس بار کی مالکن سوزانے نے مجھے فون کرکے سامان کی ڈلیوری کا آرڈر دیا تھا۔ میں بڑی احتیاط سے کام لیتا تھا تاکہ کسی کی نگاہوں میں نہ آسکے کہ گیراج کی الماری میں کیا کچھ رکھا ہے۔ رات اچھی خاصی ہوچکی تھی۔ سردی کڑاکے کی تھی۔ میں پوری طرح تیار ہوکر، ہاتھ میں ٹارچ تھامے گیراج کی طرف چل دیا۔

جیسے ہی گیراج کے سامنے پہنچا۔ میرے قدم جہاں تھے، وہیں جم گئے۔ ٹارچ کی روشنی میں اچھی طرح دیکھا۔ پچھلے گیارہ سالوں کے دوران پہلی بار گیراج کا دروازہ بند پڑا تھا۔ میں نے حیرت سے اِدھر اُدھر دیکھا، دور دور تک

کوئی نہ تھا۔ ذہن پر زور ڈالا۔ دن میں اپارٹمنٹس کے احاطے میں بھی کوئی غیر معمولی بات نہیں ہوئی تھی۔ خود کو تسلی دینے کے لیے دروازے کو ہلکے سے چھوا۔ وہ واقعی بند تھا۔

اسی دوران کسی کے کھنکھارنے کی آواز سنائی دی۔ میں نے چاروں طرف دیکھا۔ وہ آواز دوبارہ آئی۔ کوئی شخص گیراج کے اندر تھا۔ میں نے دروازے سے کان لگائے۔ وہ زور زور سے سانس لے رہا تھا۔ میرا دماغ چکرا کر رہ گیا۔

''اندر کون ہوسکتا ہے؟'' خود سے سوال کیا۔ ''شاید کوئی بے گھر بوڑھا، کوئی بھٹکتا ہوا آوارہ نشہ باز، کوئی چور یا پھر......'' میں نے ایک لمحے کو سوچا۔ ''کہیں گیارہ برسوں کے بعد گیراج کا مالک تو واپس نہیں آگیا۔''

میرا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ چند قدم پیچھے کو ہٹا اور خود کو کسی نہ کسی طرح اندھیرے کی اوٹ میں لیتا ہوا بلڈنگ کے عقبی گیٹ کے ساتھ واقع بائیکس روم کی طرف بڑھنے لگا۔ یہ دراصل یہاں کے مکینوں کی موٹر سائیکلیں پارک کرنے کے لیے بنایا گیا ہال نما گیراج تھا۔

میں بنا آہٹ کیے قدم اٹھانے کی کوشش کررہا تھا، ساتھ ہی میری نگاہیں تیزی سے اطراف کا جائزہ بھی لے رہی تھیں۔ ہر طرف سناٹا تھا۔ چند لمحوں بعد میں بائیکس روم میں تھا۔ دروازے کے ساتھ ایک اوٹ میں پناہ لی اور سامنے کی طرف دیکھا۔ یہاں سے گیراج نمبر 27 کے دروازے کو اچھی طرح دیکھ سکتا تھا۔

بائیکس روم میں شدید ٹھنڈ تھی لیکن اس کے باوجود مجھے پیشانی پر پسینا بہتا ہوا محسوس ہورہا تھا۔ کچھ دیر بعد میں نے دروازے کی اوٹ سے گیراج کی سمت جھانکا۔ لوہے کی پتلی چادر سے بنے مگر زنگ خوردہ دروازے کی جھریوں سے روشنی باہر آرہی تھی۔

میرا دل اور تیزی سے دھڑکنے لگا۔ سوچ رہا تھا کہ جو شخص بھی اندر ہے، وہ کیا کررہا ہوگا۔ کیا کہیں میرے سامان کی الماری کا تالا تو نہیں توڑا جارہا تھا۔ یہ سوچتے ہی دل دھک کر کے رہ گیا۔ سمجھ نہیں آرہا تھا کہ کیا کروں۔ کیا بلڈنگ انتظامیہ کو بتادوں لیکن اگلے ہی لمحے یہ خیال رد کردیا۔ ایسی صورت میں تو وہ مجھے ہی ذمّے دار ٹھہرا کر نوکری سے نکال سکتے تھے۔ اس عمر میں، میں اپنی جمی جمائی نوکری سے محروم نہیں ہونا چاہتا تھا۔ یہ نوکری میری عادت بن چکی تھی اور عادات میں بدلاؤ مجھے کبھی پسند نہیں رہا تھا۔

اچانک غیر متوقع طور پر دروازہ کھلنا شروع ہوا۔ مدتوں سے بند نہیں ہوا تھا، اس لیے کھلنے پر بھی تیز کھڑکھڑاہٹ کی آواز پیدا ہورہی تھی۔ کچھ دیر میں اندر موجود شخص بھی روشنی میں آگیا۔ میں اسے صاف طور پر دیکھ سکتا تھا۔ اس کے کپڑے بہت پرانے اور میلے کچیلے لگ رہے تھے، جسم نڈھال دکھائی دے رہا تھا۔ داڑھی اور سر کے بال بڑھے ہوئے تھے۔ میں نے اس کی عمر کا اندازہ لگانے کی کوشش کی لیکن ناکام رہا۔

گیراج میں بجلی تھی لیکن اس کا بلب برسوں سے فیوز تھا۔ ہفتہ بھر پہلے ہی میں نے وہاں بلب لگایا تھا۔ اس وقت گیراج کے اندر بلب روشن تھا اور زرد روشنی میں اندرونی منظر اور دروازے پر کھڑا بوڑھا اجنبی، دونوں بالکل واضح دکھائی دے رہے تھے۔ وہ تیزی سے اردگرد دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں حلقوں کے اندر دھنسی ہوئی تھیں۔ چہرہ کیا، اس پر بس برائے نام ہی گوشت تھا۔ لگتا تھا کہ ہڈیوں پر جیسے صرف کھال منڈھی ہو۔

جہاں میں خود کو چھپائے کھڑا تھا، وہاں سے صاف نظر آرہا تھا کہ گیراج کے اندر گتے کے خالی ڈبے اور استعمال شدہ شاپنگ بیگز فرش پر ہر طرف بکھرے پڑے تھے۔ اطمینان کی بات یہ تھی کہ میرے سامان والی الماری بدستور مقفل تھی۔ اجنبی کے پاؤں میں ٹول بکس پڑا ہوا تھا۔ اگر وہ چاہتا تو چند منٹوں میں ہی الماری کا تالا توڑ سکتا تھا۔ ''لیکن اس نے تالا کیوں نہیں توڑا۔'' میرے ذہن میں سوال کلبلا رہا تھا۔

اجنبی نے میل سے اَٹی جیکٹ کے بٹن بند کیے۔ مفلر سر اور کانوں پر لپیٹا اور گیراج کی روشنی بجھائے یا دروازہ بند کیے بغیر ایک طرف کو چل دیا۔ میں نے دل ہی دل میں گنتی گننا شروع کی اور سو تک گننے کے بعد نہایت احتیاط سے قدم اٹھاتا ہوا بائیکس روم سے باہر نکل آیا۔ میں ٹارچ کی روشنی اِدھر اُدھر ڈالتا ہوا احتیاط سے گیراج کی طرف بڑھ رہا تھا۔ ہر طرف سناٹا چھایا تھا۔ گھڑی پر نظر ڈالی۔ رات کے ساڑھے نو بج رہے تھے۔ چند اپارٹمنٹس کے لاؤنج میں روشن لائٹس کھڑکیوں کے پردوں سے جھلک رہی تھیں۔

اسی دوران میرے موبائل فون نے وائبریٹ کرنا شروع کردیا۔ میں رات کو اس کی گھنٹی آف کردیتا تھا۔ یقیناً سوزانے اپنے سامان کا پوچھ رہی ہوگی۔ فون جیکٹ کے اندر تھا۔ میں اُس وقت فون اٹینڈ کرنے کے موڈ میں نہ تھا۔

گیراج کے دروازے پر پہنچا تو فرش پر بکھرے گتے کے خالی ڈبوں اور شاپنگ بیگز کو دیکھ کر اندازہ ہوا کہ اجنبی

نے اپنے لیے بستر بنایا ہوگا۔ یہ سامان، میرا مطلب ہے کہ کچرا، پہلے گیراج میں نہیں تھا، یقیناً وہی اسے کہیں سے اٹھا کر یہاں لایا ہوگا۔ شاید اسے کچھ دیر آنکھیں موندنے کے لیے آرام دہ جگہ کی ضرورت ہوگی۔ بستر دیکھ کر میں نے اپنا یہ خیال مسترد کر دیا کہ شاید گیراج کا مالک لوٹ آیا ہوگا۔ اجنبی کب کا تاریکی میں گم ہو چکا تھا۔ ''شکر خدا کا وہ چلا گیا۔'' میں زیرِ لب بڑبڑایا۔ ''ورنہ تو نوکری اور شاید الماری میں رکھے مال، دونوں سے ہاتھ دھونا پڑ سکتا تھا۔''

اگر اس واقعے کی خبر انتظامیہ کو ہو جاتی تو وہ ضرور سوال پوچھتے کہ میرے ہوتے ہوئے کوئی اجنبی کس طرح وہاں داخل ہوا، کیا میری آنکھیں بند تھیں۔ انکار کرتا یا اقرار اس سوال کا نتیجہ صرف مجھے ملازمت سے فارغ کرنے کی صورت میں ہی نکلتا۔ ''چلو...... نوکری بچ گئی۔'' میں نے گیراج میں داخل ہوتے ہوئے خود کلامی کی۔ ''اور مال بھی......'' الماری کو بند دیکھ کر سکون کی سانس لی۔

میں نے ایک گہری سانس لی اور اندر داخل ہو گیا۔ جب اجنبی نے دروازہ بند کیا ہوگا تو اس سے کافی شور ہوا ہوگا اور جب کھولا گیا تو وہ ناخوشگوار آوازیں میں خود سن چکا تھا۔ خوش قسمتی سے کسی رہائشی نے یہ شور سن کر اپنی کھڑکی سے نیچے جھانک کر دیکھنے کی زحمت نہیں کی تھی۔ مجھے ڈر تھا کہ اگر گیراج کی حالت سدھارنے لگ گیا تو کہیں شور شرابے پر کوئی رہائشی عقبی بالکونی سے جھانکنے نہ آ جائے۔ اگر کسی نے گیراج میں غیر معمولی سرگرمی دیکھ کر اپارٹمنٹس انتظامیہ کو فون کر دیا تو پھر نوکری تو چھوڑو میرا سائڈ بزنس بھی تباہ ہو جاتا۔ مجھے اور شاید سوزانے کو بھی ٹیکس فری خرید و فروخت بند ہونے سے پہنچنے والا مالی نقصان کسی صورت قبول نہ ہوتا۔

گیراج کی حالت ٹھیک کرنے کا خیال مناسب موقع پر چھوڑ کر پتلون کی بیلٹ سے بندھی چابی نکالی اور الماری کا تالا کھولا۔ میرا سارا سامان محفوظ تھا لیکن اب یہ جگہ میرے سامان کے لیے غیر محفوظ ہو چکی تھی۔ بہتر تھا کہ میں یہ سارا سامان کسی اور محفوظ مقام پر منتقل کر دیتا، وہ بھی ایک ہی ہلّے میں لیکن کس طرح؟ کیا کچرا رکھنے والے پلاسٹک کے بڑے سے سیاہ تھیلے میں بھر کر؟ بائیکس روم کے برابر میں مینٹی نینس روم تھا۔ وہاں ایسی محفوظ جگہ ہو سکتی تھی لیکن مسئلہ یہ تھا کہ کس طرح یہ سارا سامان ایک ساتھ اٹھا کر وہاں تک لے کر جاؤں۔ اسی دوران میری نظر فرش پر بکھرے کچرے پر موجود ایک بڑے سے گتے کے ڈبے پر پڑی۔ باقی ڈبے کھول کر فرش پر بچھا لیے گئے تھے، وہی ایک ثابت حالت میں تھا۔

میں آگے بڑھا۔ ڈبے کا منہ ٹیپ سے بند تھا۔ میری جیب میں چاقو تھا۔ چاقو سے پلاسٹک کاٹ کر اس کا ڈھکن کھولا۔

ڈبے کے اندر ایک ہی سائز کی کانچ کی کئی بوتلیں اوپر تلے ترتیب سے رکھی تھیں۔ یہ ویسی ہی تھیں جن میں جام جیلی آتا ہے لیکن ان بوتلوں پر کسی بھی قسم کا لیبل نہ تھا۔ میں نے ایک شیشی نکالی۔ اسے دیکھ کر لگ رہا تھا کہ کچرے سے جمع کر کے، دھو دھلا کر صاف کی گئی ہوں گی۔ میں نے پیندا دیکھا۔ مجھے یاد آیا کہ گیراج میں خالی پڑی اُس الماری کے خانوں پر بھی تقریباً اسی سائز کے لگ بھگ نشانات بنے ہوئے تھے۔ یہ ویسے ہی نشانات تھے کہ جیسے کسی بوتل کو بہت عرصے تک ایک جگہ رہنے دیا جائے تو پیندے سے گول نشان بن جاتا ہے۔

میں نے ایک بوتل کا ڈھکن کھولا۔ اندر مٹیالے رنگ کا پانی تھا اور اس میں کوئی سفید جیسی چیز تیر رہی تھی۔ میں نے ٹارچ نکال کر روشنی بوتل پر ڈالی اور اگلے ہی لمحے میرے ہوش اڑ گئے۔ بوتل کے اندر مٹیالے پانی میں تیرتی ہوئی سفید چیز کٹا ہوا انسانی کان تھا۔ میں نے جلدی سے اس کا ڈھکن بند کیا۔ دوسری بوتل کو کھول کر دیکھا۔ ایک کے بعد ایک بوتل دیکھتا چلا گیا۔ سب میں کٹے ہوئے انسانی کان تیر رہے تھے، بالکل ویسے ہی جیسے کسی میڈیکل کالج کی لیبارٹری میں رکھے کانچ کی چھوٹی بڑی بوتلوں میں طالب علموں کو سمجھانے کے لیے انسانی اعضا محفوظ حالت میں رکھے جاتے ہیں۔

میرے اوسان خطا ہو رہے تھے۔ فرش پہ نظر دوڑائی۔ ایک ڈبا ذرا بہتر حالت میں تھا۔ میں نے اسے کسی طرح ٹھیک کیا اور جلدی جلدی الماری سے سارا سامان نکال کر اس میں رکھنا شروع کیا۔ ڈر تھا کہ گیراج میں بلب روشن تھا، کوئی بھی رہائشی اگر اپنے بیڈ روم کی کھڑکی یا بالکونی میں آ جاتا تو یہ صورتِ حال اُسے خطرے کا احساس دلا دیتی، میں خود کو کوسنے دے رہا تھا کہ کس مشکل میں پھنسا لیا ہے خود کو۔

میں ڈبا تھام کر، احتیاط سے اِرد گرد نظریں ڈالتا ہوا بائیکس روم کی طرف بڑھا۔ اکثر بائیک والوں کے ڈبے وہاں کافی دنوں تک رکھے رہتے تھے۔ فی الحال وہی جگہ سب سے محفوظ تھی۔ میں نے ڈبا لے جا کر وہاں رکھے بڑے سے دھاتی ریک کے سب سے اوپری خانے میں، دیوار کے ساتھ ٹکا کر رکھ دیا۔ اب میرا سامان محفوظ تھا۔

اس دوران ایک بار پھر میرا فون وائبریٹ ہوا۔ مجھے یقین تھا کہ سوزانے ڈلیوری کا پوچھ رہی ہوگی۔ اس وقت

میرے اپنے ہاتھ پاؤں پھول رہے تھے۔ جیکٹ سے فون نکالنے کا ارادہ ملتوی کر دیا۔ بائیکس روم میں اندھیرا تھا البتہ گیراج کا بلب روشن تھا۔ میں ایک کونے میں اس طرح دُبکا بیٹھا تھا کہ نظریں گیراج پر جمی تھیں۔ کانوں والی بوتلیں دیکھنے کے بعد یقین تھا کہ وہ اجنبی دوبارہ ضرور آئے گا۔

تقریباً ڈیڑھ گھنٹے کے بعد وہ واپس آتا دکھائی دیا۔ روشنی میں آیا تو دیکھا کہ اس نے دو بڑے شاپنگ بیگز اٹھا رکھے تھے۔ وہ انہیں اس طرح پکڑے ہوئے تھا جیسے کافی بھاری ہوں۔ وہ اندر داخل ہوا، شاپنگ بیگز فرش پر رکھے اور اگلے ہی لمحے کمر پر ہاتھ رکھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کی پشت میری طرف تھی۔ میں سمجھ گیا کہ وہ ڈبے کی طرف دیکھ رہا ہوگا جسے میں نے کھولا تھا یا پھر الماری کی طرف جس کے پٹ جلدی میں کھلا چھوڑ آیا تھا۔ تقریباً دو منٹ بعد وہ تیزی سے گیراج کے باہر آیا اور سڑک کے دونوں جانب دیکھنے لگا۔ وہ تیزی سے اِدھر اُدھر گردن گھمائے دیکھے جا رہا تھا۔

کچھ دیر بعد وہ دوبارہ اندر چلا گیا۔ میں دیکھ سکتا تھا کہ وہ پہلے الماری کی طرف گیا اور اس کے اندر جھانکتا رہا، پھر واپس ڈبے کی طرف آیا۔ لگ رہا تھا جیسے اُسے اپنی آنکھوں پر یقین نہ آ رہا ہو۔ وہ بے چینی سے کبھی ڈبے کی طرف اور کبھی کھلی الماری کی طرف آ جا رہا تھا۔ میں سمجھ سکتا تھا کہ کسی کے یہاں آنے کے شواہد دیکھ کر وہ کس قدر پریشان ہو رہا ہوگا۔ شاید اس سے بھی زیادہ، جتنا اسے گیراج میں پا کر میں پریشان ہوا تھا۔

کچھ دیر بعد اس نے ڈبا کھینچا اور ایک ایک کر کے بوتلیں نکالیں اور انہیں الماری کے خانوں میں قطار سے رکھنے لگا۔ جس طرح وہ بوتلیں رکھ رہا تھا، اسے دیکھ کر مجھے خیال آیا کہ خانوں کی تہ پر پہلے بھی بوتلوں کے پیندے کے نشانات اسی ترتیب سے بنے ہوئے تھے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ پہلے بھی یہاں اسی طرح رہ چکا ہو، ممکن ہے کہ میرا خیال غلط ہو، وہ پہلی بار ایسا کر رہا ہو۔ جو حالات تھے، اُن میں یقین سے کچھ کہنا ممکن ہی نہ تھا۔

''کہیں یہ ہی اس گیراج کا مالک تو نہیں......'' میں بڑبڑایا۔ ''شاید اس کی بیوی نے اسے گھر سے نکال دیا ہے تو وہ یہیں رہنے چلا آیا۔'' مجھے اس پر حیرت نہ تھی۔ اس طرح کے نکمے، ہڈحرام اور نشہ باز شوہروں کے ساتھ ایسا ہونے کی کہانیاں ہم سب نے کئی بار سنی تھیں۔ مجھے حیرت تھی کہ کانوں سے بھری بوتلیں اس کے پاس کیسے اور کیوں ہیں؟ وہ کان کن کے تھے اور وہ انہیں اتنی حفاظت سے ساتھ ساتھ لیے کیوں پھر رہا ہے۔

بوتلیں الماری میں رکھنے کے بعد وہ گیراج کی حالت درست کرنے میں لگ گیا۔ میں اسے دیکھتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ اب کیا کرنا چاہیے۔ کچھ دیر کے بعد اُس شخص نے گیراج کے پٹ اندر کی طرف کھینچنا شروع کیے۔ آخر شور مچاتا دروازہ بند ہو گیا۔ دروازے کی جھریوں سے اندر کی روشنی باہر آ رہی تھی۔ کچھ دیر کے بعد لائٹ بھی بند ہو گئی۔

اس کے کچھ دیر بعد تک میں دم سادھے بائیکس روم میں بیٹھا رہا اور پھر بنا آہٹ کیے بڑی احتیاط سے چلتا ہوا گیراج نمبر 27 کے سامنے سے گزرا۔ میں سوزانے سے ملنے اسنیکس بار جا رہا تھا۔ فی الحال میرا سامان محفوظ تھا لیکن دھندا جاری رکھنے کے لیے متبادل انتظامات کرنے کی بھی ضرورت تھی۔

''میرے پاس سامان رکھنے کی جگہ نہیں رہی ہے۔'' سوزانے کو جا کر بتایا تو اس نے فوراً اس مقصد کے لیے بار کی ایک الماری استعمال کرنے کی اجازت دے دی لیکن ایک شرط بھی لگا دی۔

سوزانے نے سامان رکھنے کی جگہ فراہم کرنے کے بدلے قیمت میں کمی اور رات کو مفت کافی کی فراہمی بند کرنے کی شرط لگا دی تھی۔ پہلے تو میں نے دونوں شرطیں ماننے سے انکار کر دیا البتہ جب وہ مذاکرات کو طول دینے لگ گئی تو قیمت میں کچھ کمی پر آمادہ ہو گیا، مفت کافی پر اس نے سمجھوتا کر لیا تھا۔

میں پچھلے کئی سال سے اُس کے ساتھ دھندا کر رہا تھا۔ وہ میری اچھی دوست بن چکی تھی۔ اس کی ٹوٹی پھوٹی تھائی نما انگریزی سے میں کافی لطف اندوز ہوتا تھا۔ رات کو جب مفت کی کافی لینے جاتا اور بار خالی ہوتا تو ہم دونوں اکثر باتیں کرنے بیٹھ جاتے تھے۔ میں اُسے بولنے پر اُکساتا رہتا۔ اس کے لب و لہجے سے انگریزی سننا بڑا دلچسپ لگتا تھا۔ وہ مجھ سے میری ماں سے متعلق باتیں پوچھتی رہتی تھی۔ وہ میرے نرم رویے اور ماں کی دیکھ بھال کرنے کا سن کر بہت خوش ہوتی تھی۔

اُس رات جب میں نے بائیکس روم سے سامان اسنیکس بار منتقل کیا تو وہ اکیلی بیٹھی تھی۔ اس نے کافی کی پیشکش کی اور پھر ہم دونوں کافی دیر تک اکیلے بیٹھے اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے۔ اس نے بہت پوچھا کہ مجھے اپنا سامان یہاں منتقل کرنے کی ضرورت کیوں پیش آئی۔ میں نے بہانے بنا کر مطمئن کر دیا۔ اُسے کٹے کانوں سے بھری

بوتلوں سے متعلق کچھ نہیں بتایا تھا۔

اگلے چند ہفتوں تک گیراج نمبر 27 کا دروازہ دن میں بند ہی رہتا تھا۔ میں بھی اس طرف غروبِ آفتاب کے وقت چکر لگانے جاتا لیکن کبھی ہمت نہ ہو سکی کہ بند دروازے سے کان لگا کر اندر کی سُن گُن لینے کی کوشش کرتا۔ رات کو معمول کے مطابق مفت کی کافی لینے اسنیکس بار جاتا رہا۔ کچھ دنوں تک تو یہ سوچ کر گشت پر نہ نکلا، نہ ہی بائیکس روم کی طرف گیا کہ مباداوہ اجنبی مجھے نہ دیکھ لے۔ مجھے اپنے کان بہت عزیز تھے۔

آخر میں نے اپنے خوف پر قابو پایا اور ایک رات بلڈنگ کے عقبی دروازے سے نکل کر بائیکس روم کی طرف چلا گیا۔ گیراج کا دروازہ کھلا تھا اور وہ اجنبی بدستور استعمال شدہ شاپنگ بیگز، گتّے کے خالی ڈبوں اور اسی طرح کے کچرے میں الجھا ہوا تھا۔ اُس کے بعد میں ہر رات بائیکس روم جانے لگا۔

ہر رات وہ اسی طرح کی مصروفیات میں مشغول نظر آتا تھا۔ ایک رات وہ الماری کھول کر ایک ایک کر کے بوتلیں نکال کر ڈبّے میں پیک کرنے لگا۔ مجھے حیرانی تھی کہ وہ کیا کرنے جا رہا ہے، کہیں واپس تو نہیں جا رہا لیکن اچانک اس نے ڈبّے میں رکھی بوتلیں نکال کر واپس الماری میں سجانا شروع کر دیں۔

مجھے وہ اجنبی بیک وقت پُراسرار، پاگل اور جنونی قاتل لگنے لگا تھا۔ جس طرح گزشتہ چند راتوں میں اسے کاٹھ کباڑ اور کچرے کو صاف کرتے اور سنبھالتے ہوئے دیکھا تھا، اس سے محسوس ہوتا تھا کہ وہ اسے کسی خزانے کی طرح عزیز ہے۔ جو کچھ اس کے پاس تھا، سب بے قیمت تھا۔ یہ سب کچھ دیکھ کر میں سوچ رہا تھا کہ ہو سکتا ہے اسے گھر سے نکالتے ہوئے بیوی نے ایسا کچھ ساتھ لے جانے نہ دیا ہو، جس کی کوئی قیمت ہوتی، شاید اسی لیے وہ کچرے کے ڈھیر کو متاعِ جاں سمجھ کر سینے سے لگائے بیٹھا تھا۔ ’’لیکن وہ کان کہاں سے آئے۔‘‘ چاہے دن ہو یا رات، یہ خیال آتے ہی میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے، بے دھیانی میں اپنے کان سہلانے لگ جاتا تھا۔

دن بھر بند رہنے والا دروازہ رات گئے کھلتا، روشنی ہوتی اور پھر وہ اجنبی اسی طرح کی بے مقصد مصروفیات میں الجھ جاتا۔ صبح کے چار پانچ بجے تک یہی بے مصرف سرگرمی جاری رہتی اور پھر پہلے دروازہ اور اس کے بعد لائٹ بند ہو جاتی تھی۔ جب صبح سویرے کام پر آنے جانے والے وہاں کے دوسرے گیراجوں سے اپنی گاڑیاں نکالنے یا پارک کرنے آتے تو انہیں کچھ بھی غیر معمولی محسوس نہیں ہوتا تھا۔ اُس رات کے بعد سے سب کچھ ایسے ہی چلتا رہا۔

اسی طرح کئی راتیں گزر گئیں۔ میرے سوا کسی کو گیراج نمبر 27 میں دلچسپی نہ تھی۔ کسی نے نوٹس نہیں لیا کہ ہمیشہ کھلا رہنے والا گیراج کا دروازہ اب بند کیوں رہنے لگا تھا۔ کسی کو خبر ہو یا نہ ہو چوکیدار کی حیثیت سے میں بدستور گیراج کی نگرانی کرتا رہا۔ اُس کی طرح میں بھی دن میں اپنی نیند پوری کرتا اور آدھی رات کو مفت کی کافی لے کر بائیکس روم میں بیٹھ کر گیراج نمبر 27 کے اندر ہونے والی سرگرمیوں پر نظر جمائے رکھتا۔

تین ہفتے اسی طرح گزر گئے اور پھر وہ اچانک غائب ہو گیا۔ کئی راتوں تک جب مجھے بائیکس روم سے گیراج نمبر 27 میں کوئی سرگرمی نہ دکھائی دی تو آگے بڑھا اور جب جی کڑا کر کے پہنچا تو دروازے پر تالا لگا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ شاید اس نے ٹھنڈ سے بچاؤ کی زیادہ بہتر جگہ تلاش کر لی ہوگی یا پھر وہ بیوی سے معافی تلافی کر کے دوبارہ گھر لوٹ گیا ہو۔ صورت خواہ کوئی بھی ہوتی لیکن اچھی بات یہ تھی کہ وہ جا چکا تھا۔ بائیکس روم کے مقابلے میں گیراج بہت بہتر تھا۔ میں اسنیکس بار میں رکھا اپنا سامان واپس گیراج منتقل کر کے دوبارہ سامان کی قیمت بڑھانا چاہتا تھا لیکن بدقسمتی یہ تھی کہ گیراج مقفل تھا۔

اجنبی کو گیراج سے گئے وہ پانچویں رات تھی۔ میں ایک بار پھر نہ صرف گیراج کو اپنی رات کی چوکیداری کا عارضی مسکن بنانا چاہتا تھا بلکہ اپنا سامان بھی دوبارہ وہیں منتقل کرنا چاہتا تھا تاکہ اتنے دنوں میں قیمت کم کر کے سوزانے کے ہاتھوں جو نقصان اٹھا چکا ہوں، اس سے بچا جا سکے۔

مجھے سخت تعجب تھا کہ اگر وہ گیرج کا مالک تھا، جیسا کہ میں نے فرض کر لیا تھا اور مقفل دروازے کو دیکھ کر اس پر یقین بھی کر بیٹھا تھا، تو پچھلے گیارہ برس تک اسے دروازہ مقفل کرنے کا خیال کیوں نہیں آیا تھا۔ مجھے لگتا تھا کہ اندر کچھ نہ کچھ ایسا ہے، جس کی پردہ داری کی گئی تھی۔ میں اپنے تجسس کے ہاتھوں مجبور تھا۔ آخر فیصلہ کر لیا کہ اندر جا کر دیکھنا چاہیے کہ وہ دروازہ مقفل کر کے کیوں گیا ہے۔ ویسے بھی اب تک بوتلوں میں رکھے کان بدستور ایک راز تھے۔

میرے پاس یہاں کے تمام گیراجوں کے تالوں کی ایک، ایک چابی موجود تھی۔ اجنبی کے غائب ہونے کی چھٹی رات، دیر گئے گیراج نمبر 27 کے دروازے پر پہنچا اور

چابیوں کے گچھے سے ایک ایک کر کے چابیاں لگانے کی کوشش کی۔ خوش قسمتی سے ایک چابی لگ گئی۔ تالا کھل گیا۔ میں نے دروازے کو کھینچا تو توقع کے عین مطابق وہ شور مچاتا ہوا کھل گیا۔ اُس وقت مجھے دروازے کے شور مچانے کی کوئی پروا نہ تھی۔ نومبر کے آخری دنوں کی اُس سرد رات میں طوفانی ہوائیں اتنا شور مچا رہی تھیں کہ اُن کے بیچ دروازے کا شور دب گیا تھا۔

جیسے ہی اندر داخل ہوا، نہایت شدید بدبو کا بھبکا میری ناک سے ٹکرایا۔ جی متلا کر رہ گیا۔ فوراً باہر نکلا۔ سرد ہوا میں گہری سانسیں لیں پھر ایک ہاتھ میں ٹارچ تھامی اور دوسرے سے ناک بند کر کے دوبارہ اندر داخل ہوا۔ چند منٹ تک دروازہ کھلا رہنے سے بدبو کچھ کم ہوگئی تھی۔ میں نے ٹارچ روشن کی۔ پورا گیراج کچرے کا ڈھیر بنا ہوا تھا۔

میں نے پلٹ کر دروازہ بھیڑا اور ٹارچ کی روشنی اِدھر اُدھر ڈالتے ہوئے الماری کی طرف بڑھا کہ اسی اثنا میں دروازے کی چرچراہٹ سنائی دی۔ جیسے ہی پلٹا اور سامنے ٹارچ کی روشنی ڈالی، وہی خبیث اجنبی سامنے کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں پستول تھا۔

''ہینڈز اپ......'' اس کے حلق سے عجیب طرح کی آواز نکلی۔ پستول دیکھتے ہی میرے اوسان خطا ہوگئے تھے۔ تابعداری کی طرح فوراً ہاتھ اوپر اٹھا دیے۔ دروازہ بند ہو چکا تھا۔ ایک دم کمرے کا بلب روشن ہوگیا۔ میں روشنی میں پہلی بار اسے اتنے قریب سے دیکھ رہا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر شیطانی مسکراہٹ رقصاں تھی۔

''تو وہ تم تھے......''

''وہ کون......'' میں نے ہکلاتے ہوئے پوچھنے کی کوشش کی۔

''جو میری غیر موجودگی میں یہاں آیا اور میرے سامان کی تلاشی لی۔'' اس نے ناراض لہجے میں کہا۔

کوئی اور موقع ہوتا تو کچرے کو سامان کہنے پر زور سے ہنستا لیکن یہاں پستول میرے سر کا نشانہ لیے ہوئے تھا۔

بڑی دقت سے میرے منہ سے نکلا۔ ''سوری......''

وہ خباثت سے ہنسا۔ ''تم جیسے منحوسوں کو بڑی اچھی طرح جانتا ہوں۔'' اس نے نفرت سے فرش پر تھوکا۔ ''یہ تم نہیں کہہ رہے بلکہ پستول کہلوا رہا ہے ورنہ تو تم میرا مذاق اڑاتے۔ مجھے بہرا کہتے، پاگل کہتے......'' یہ کہہ کر اس نے پستول پر اس طرح گرفت سخت کی کہ جیسے گولی چلانے والا ہو۔

سخت ٹھنڈ میں بھی پسینے میں نہائے جا رہا تھا۔ کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں۔

''یہ لو......'' اس نے جیب سے پولیس والوں جیسی ہتھکڑی نکال کر میری طرف پھینکی۔ ''اسے اپنے پاؤں میں پہن لو۔''

مجھے کچھ سمجھ نہیں آیا۔ اپنی جگہ کھڑا رہا۔

''اٹھاؤ اسے اور پاؤں میں پہنو۔''

مجھے ساکت دیکھ کر وہ سخت غصہ ہو رہا تھا۔ میں جلدی سے آگے بڑھا اور جھک کر ہتھکڑی اٹھائی۔

''بیٹھ کر دونوں پاؤں میں......''

میں نے جوتے اتارے۔ فرش پر پاؤں رکھتے ہی ٹھنڈ کی لہر پورے جسم میں دوڑ گئی۔

''جلدی کرو یا چلاؤں اسے۔'' اُس نے پستول والا ہاتھ لہرایا۔

میں نے جلدی جلدی ہتھکڑی دونوں پاؤں میں ڈالی اور ذرا سا دبایا تو وہ ایک جھٹکے سے بند ہوگئی۔

اس نے دوبارہ جیکٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالا۔ دوسری ہتھکڑی نکال کر میری طرف پھینکی۔ ''اسے کلائی میں پہن لو۔''

چند لمحوں بعد میرے ہاتھ پاؤں ہتھکڑی میں جکڑے جا چکے تھے۔ اب میں مکمل طور پر اس شیطان کے رحم و کرم پر تھا۔ دل خوف کے مارے تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرنے جا رہا ہے۔

''تو اب تمہاری باری ہے۔'' وہ میری طرف بڑھا۔

میں حیران تھا کہ میری باری آئی ہے تو اب کیا ہوگا۔ یہ بھی سوچ رہا تھا کہ باری کس چیز کی ہوسکتی ہے۔ اسی دوران کان میں خارش ہونے لگی۔ میں بے چین ہو رہا تھا۔ موٹاپے کے باعث اکڑوں بیٹھنے میں بھی بہت تکلیف ہو رہی تھی، دھپ سے فرش پر بیٹھ گیا۔ وہ میری نگاہوں کے عین سامنے کھڑا تھا۔ میرا حلق خشک ہو رہا تھا۔

اس نے پستول جینز میں اڑس لیا۔ یہ دیکھ کر سانس میں سانس آئی کہ فی الحال وہ مجھے قتل نہیں کرنے جا رہا لیکن اگلی باری...... میں پھر خوف کی وادی میں گرنے لگا۔

اچانک وہ میری طرف بڑھا، اس کے ہاتھ میں ٹینس کی گیند جیسا کپڑے کا گولا تھا، جسے اس نے میرے منہ میں ٹھونس دیا۔ اس سے اتنی بو آ رہی تھی کہ جی بُری طرح متلانے لگا۔

وہ پلٹا اور گتے کے ڈبے سے کانچ کی ایک بوتل نکالی۔ یہ ویسی ہی تھی، جن میں کٹے کان تیرتے ہوئے دیکھ چکا تھا۔ میں دم بخود تھا۔ اب کچھ کچھ سمجھ آنے لگا تھا کہ کس چیز کی

باری ہے۔

بوتل فرش پر رکھ کر اس نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور اسپتالوں میں استعمال ہونے والے دستانوں کی جوڑی نکال کر پہننے لگا۔ میری حالت ذبح ہونے والی گائے جیسی تھی۔ بس چھری کی کمی تھی اور اگلے ہی لمحے وہ بھی پوری ہوگئی۔

اجنبی نے جیکٹ کی جیب میں ہاتھ ڈال کر استرا نکالا اور کھول کر میری طرف بڑھنے لگا۔ پہلے ہی بچے مجھے طرح طرح کے ناموں سے چڑاتے تھے۔ اب کن کٹا ہونے جارہا تھا۔ یقین ہوگیا کہ اس دنیا میں میرے لیے کوئی عورت بنی ہی نہیں تھی۔ بالائی لب پر بنے لال بیگ جیسے پیدائشی نشان نے پہلے ہی قسمت اندھیر کردی تھی۔ کن کٹے کے قریب کون آتی۔

اجنبی نے جیسے ہی میری طرف قدم بڑھایا، میں نے خوف کے مارے آنکھیں بند کرلیں لیکن اس سے پہلے کہ استرا کان کی طرف پہنچتا، دروازہ پیٹنے کی آواز آئی۔ میں نے جلدی سے آنکھیں کھولیں۔ ایک دم خیال آیا کہ کیا کوئی بچانے آگیا۔ مدد کی کوئی امید نہیں تھی لیکن اس دستک سے لگا کہ جیسے میرے کان بچ گئے ہوں۔

میں نے اُس کی طرف دیکھا۔ وہ بھی پھٹی پھٹی نگاہوں سے دروازے کی سمت ہی دیکھ رہا تھا۔

صورتِ حال اچانک تبدیل ہوگئی تھی۔

''پولیس......'' اس کے ساتھ ہی دروازے پر دو چار زوردار لاتیں پڑیں۔ زنگ خوردہ دروازہ بھاری بوٹوں کی مار کیا سہتا، گر ہی پڑا۔ سامنے کئی پولیس والے پستول سیدھی کیے کھڑے تھے۔

دومنٹ بعد میں قید سے آزاد تھا، اجنبی کے ہاتھوں کو پشت پر کرکے ہتھکڑی پہنائی جاچکی تھی۔

جیسے ہی پولیس والے نے میرے منہ میں ٹھنسا گولا نکالا، میں نے زوردار قے کی۔ پہلے سے گندا فرش تھوڑا سا اور گندا ہوگیا تھا۔

اجنبی فرنینڈز مارکوس تھا۔ ایک نفسیاتی مریض جو مہینوں پہلے پاگل خانے سے فرار ہوا تھا۔ کبھی وہ اسی بلڈنگ میں اپارٹمنٹ کا مالک تھا اور گیراج 27 میں اس کی چم چم کرتی سیاہ مرسڈیز کھڑی ہوتی تھی۔ پولیس ریکارڈ کے مطابق اس کی جھگڑالو بیوی اتنا شور مچاتی تھی کہ ایک دن مارکوس نے بیوی کو نشہ آور دوا پلاکر اس کے دونوں کان کاٹے اور جیل پہنچ گیا۔

مارکوس کا علاج کرنے والے ڈاکٹروں نے پولیس کو بتایا کہ وہ سمجھتا تھا کہ اس کی جھگڑالو بیوی نے چلّا چلّا کر اُسے بہرا کردیا تھا۔ تب سے وہ لوگوں کے کانوں کے پیچھے پڑگیا تھا۔ جیل میں اس نے سوئے ہوئے ساتھی قیدی کا کان چبانے کی کوشش کی تھی، جس کے بعد عدالت نے اسے نفسیاتی اسپتال بھیجنے کا حکم دیا تھا۔

گزشتہ بارہ برس کے دوران اس نے کئی مریضوں کے کان چبانے کی کوشش کی تھی، جس کے بعد اُسے خطرناک قرار دے کر تنہائی میں رکھا جارہا تھا۔ بارہ برس میں پہلی دفعہ اسے عملے کی اتفاقی غلطی سے فرار کا موقع ملا تو مارکوس نے اس کا پورا فائدہ اٹھایا۔

دوسری طرف مقامی پولیس کا کہنا تھا کہ انہیں شکایتیں ملی تھیں کہ گزشتہ چند مہینوں کے دوران شہر کے تین قبرستانوں میں ایسی کم از کم بارہ قبریں کھلی ملی تھیں، جن میں مردے دفنائے چوبیس گھنٹے بھی نہیں گزر رہے تھے کہ کسی نے قبریں کھول کر مردوں کے کان بڑی صفائی سے کاٹ لیے تھے۔

مجھے سخت حیرانی تھی کہ پولیس کے پہنچنے کا معجزہ کیسے ہوا۔

پولیس کے مطابق گراؤنڈ فلور کے اپارٹمنٹ نمبر 03 کے مکین رمائی ڈی سوزا نے شور کی آواز سن کر باہر جھانکا تو گیراج نمبر 27 میں اسے کچھ غیر معمولی حرکات نظر آئیں اور پھر گھبرا کر اس نے جاری سے پولیس کو اطلاع دے دی۔ گیراج اور اپارٹمنٹس بلڈنگ کے درمیان ایک پتلی سی سڑک حدِ فاصل قائم کرتی تھی۔ ایسا ممکن ہی نہ تھا کہ سڑک کے اِس پار شور ہو لیکن وہ دوسری طرف واقع کسی اپارٹمنٹ والے کو سنائی نہ دے۔

اصل میں تو پانچ برس کی ننھی ماریہ نے میرے کان بچائے تھے۔ وہ اُس رات طوفانی ہواؤں سے اپنی پیاری گڑیا کو بچانے کے لیے باپ کو مجبور کرکے ٹیرس پر نہ لاتی تو شاید میں کن کٹا ہونے والا تھا۔ ماریہ شام کو اپنی پیاری گڑیا ٹیرس کے جھولے پر ہی بھول گئی تھی۔ سوتے سوتے اس کی آنکھ کھلی تو گڑیا کی ضد کرنے لگی، جس پر باپ نے سوتے سے اٹھ کر ٹیرس کا رخ کیا تھا۔

''شکر اللہ کا......'' اب جب بھی کبھی کان میں خارش محسوس ہوتی ہے، پہلے میں اللہ کا اور اس کے بعد اپارٹمنٹس والوں کا شکریہ ادا کرتے ہوئے دونوں کان کی لوئیں چھوتا ہوں۔ بچے اب بھی چڑاتے ہیں...... پاگل، موٹا...... لیکن مجھے ان کا یہ کہنا برا نہیں لگتا البتہ اس کے مقابلے میں کن کٹا کہلانا زیادہ اچھا نہیں لگتا اور پھر بڑھاپے میں عینک کہاں ٹکاتا۔ ویسے بھی اب تو عینک کی ضرورت پڑ ہی چکی ہے۔

رچرڈ اور میکلین گھاس دار طویل پہاڑی چوٹی پر ایک ساتھ کھڑے نیچے خطِ ساحل کو دیکھ رہے تھے۔

''اگر وہ آج صبح یہاں سے روانہ ہوا تھا تو اسے اب تک واپس آجانا چاہیے تھا۔'' میکلین نے کہا۔

''وہ واپس ضرور آئے گا۔'' رچرڈ نے جواب دیا۔

''میں اس بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ اس نے سوزن کو بتایا تھا کہ یہاں اطراف میں بحری قذاق بھی ہو سکتے ہیں۔'' میکلین ایک بیساکھی کا سہارا لیے ہوئے تھا جو

خودگرفتہ

سلیم انور

بھوک کسی بھی قسم کی ہے... انسان سے وہ کچھ کروا دیتی ہے... جسے ان ہونی ہی کہا جا سکتا ہے... دیدہ و دانستہ کی جانے والی کارروائی رفتہ رفتہ وہ اپنے اردگرد کے ماحول کو صاف شفاف کررہی تھی... خودگرفتگی کا شکار ہو جانے والے کلاکار کا انجام۔

خواب ناک زندگی کے بے مول ہونے کا الم ناک ماجرا......

اس نے ایک درخت کی بڑی سی شاخ سے بنائی تھی۔اس کی نظریں اس مقام پر مرکوز تھیں جہاں ساحل مغرب کی سمت ایک میل کے فاصلے پر ایک جزیرہ نما کے پار غائب ہو رہا تھا۔

انہیں علم تھا کہ مغرب کس سمت پر ہے...... کم از کم سورج کی پوزیشن دیکھ کر وہ سمت کا اندازہ لگا سکتے تھے۔اس کے سوا انہیں اور کچھ بھی معلوم نہیں تھا کہ وہ کس مقام پر ہیں۔

''ہم بس یہی امید کر سکتے ہیں کہ اسے کشتی مل جائے۔''

میکلین نے اثبات میں سر ہلا دیا۔''یا مزید بچ جانے والے لوگ۔درست؟''

''غلط! ہمیں مزید بچ جانے والوں کی ضرورت نہیں۔ ہمارے پاس صرف اتنی غذا ہے کہ ہم چاروں کو بمشکل پوری ہو سکے گی۔ ہمیں جس چیز کی ضرورت ہے وہ کشتی ہے۔'' رچرڈ نے کہا۔

وہ انہیں گزشتہ شب اندھیرا پھیلنے سے ذرا پہلے دکھائی دی تھی۔ربر کی ایک خالی لائف بوٹ جو کہ جزیرہ نما کے پار سمندر میں پانی کی سطح پر تیر رہی تھی۔

''اگر اسے لائف بوٹ مل جاتی ہے اور وہ ہمیں یہیں چھوڑ کر چلا جاتا ہے تو پھر کیا ہوگا؟'' میکلین نے خدشہ ظاہر کیا۔

''میں نہیں سمجھتا کہ یہ کوئی پریشانی کی بات ہے۔'' رچرڈ نے ایک اچٹتی نگاہ سوزن میکلین کی طرف ڈالتے ہوئے کہا جو ان سے تقریباً پچاس گز کے فاصلے پر کھڑی ہوئی تھی۔وہ بھی مغرب کی سمت دیکھ رہی تھی۔اس کے دونوں ہاتھ اس کے کولھوں پر تھے اور سمندری ہوا اس کی زلفوں کو لہرا رہی تھی۔

''اس بات سے تمہارا کیا مطلب ہے؟''

''میرا مطلب ہے کہ میں نے گزشتہ شب تمہاری دلکش بیوی کو کیمپ فائر سے اس دوران جاتے ہوئے دیکھا تھا جب انٹونیو جنگل میں کسی جگہ گیا ہوا تھا۔تمہاری بیوی کافی دیر تک غائب رہی تھی۔'' رچرڈ نے بتایا۔

یہ سن کر میکلین کا چہرہ سرخ ہوگیا۔''تم بے وقوف ہو، رچرڈ میں بوڑھا ہوسکتا ہوں لیکن سوزن اتنی زیادہ اسمارٹ ہے کہ وہ انٹونیو پر یا تم پر ریجھ نہیں سکتی۔ کیونکہ یہ خیال تمہارے ذہن میں بھی منڈلا رہا ہے۔کیا ایسا نہیں ہے؟''

رچرڈ نے کوئی جواب نہیں دیا۔

میکلین نے اپنی نظریں رچرڈ پر جمائے رکھیں اور اپنی بیساکھی کو ایڈجسٹ کرتے ہوئے بولا۔''وہ یہاں سے ٹھیک کس وقت روانہ ہوا تھا؟ اور اس نے کیا لباس پہنا ہوا تھا؟''

''کیا؟''

''میں انٹونیو کے بارے میں پوچھ رہا ہوں۔ وہ یہاں سے کس وقت روانہ ہوا تھا؟''

رچرڈ کی تیوریوں پر بل نمایاں ہوگئے۔''میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ سورج چڑھتے ہی وہ یہاں سے روانہ ہوگیا تھا۔اس نے اپنی سرخ قمیص اور جینز پہنی ہوئی تھی۔''

''کیا تم اس بارے میں پُریقین ہو؟''

''تمہاری اس بات کا کیا مطلب ہے؟''

''ہوسکتا ہے کہ وہ یہاں سے گیا ہی نہ ہو۔'' میکلین نے کہا۔''ہوسکتا ہے کہ تم نے مجھے اور سوزن کو یہ بات صرف کہنے کی حد تک بتائی ہو تاکہ ہمیں کسی قسم کا شبہ نہ ہو۔''

''کس چیز کا شبہ؟''

میکلین کے ہونٹوں پر معنی خیز مسکراہٹ ابھر آئی۔

رچرڈ حیرت سے پلکیں جھپکانے لگا۔ پھر اچانک چونکتے ہوئے بولا۔''تمہارا خیال ہے میں نے اسے مار ڈالا ہے؟''

''تم خود ہی کہہ چکے ہو کہ ہمارے پاس غذا ناکافی ہے۔ایک منہ کے کم ہونے سے کسی کو نقصان نہیں ہوگا اور اگر اگلی باری میری ہوئی تو پھر سوزن مکمل طور پر تمہاری ہوگی۔''

رچرڈ غصے سے اسے گھورتے ہوئے بولا۔''ہوسکتا ہے کہ......''

اس کا جملہ نامکمل رہ گیا کیونکہ سوزن کی بلند آواز نے انہیں اپنی جانب متوجہ کرلیا تھا۔

''وہ رہا!'' وہ چیخی تھی۔وہ ایک ہاتھ سے آنکھوں پر سایہ کیے اکڑوں بیٹھی دوسرے ہاتھ سے مغرب کی سمت اشارہ کررہی تھی۔

رچرڈ اور میکلین نے مغرب کی سمت رخ پھیر لیا۔ زرد رنگ کی ایک لائف بوٹ جزیرہ نما سے گھوم کر ان کی جانب آرہی تھی۔ لائف بوٹ میں سرخ رنگ کی قمیص میں ملبوس ایک شخص ایک بڑی سی باد آور دلکڑی کی مدد سے بوٹ کو کھیے رہا تھا۔

سوزن نے اس کی جانب دیکھتے ہوئے ہاتھ لہرایا۔ جواباً انٹونیو نے بھی دور سے ہاتھ لہرا دیا۔

وہ تینوں لائف بوٹ پر اس وقت تک نظریں جمائے رہے جب تک وہ لمبی پہاڑی چوٹی کے چھجے تلے نگاہوں سے اوجھل نہیں ہوگئی۔ ان سب کے ذہنوں میں ایک ہی خیال گردش کر رہا تھا۔ اب ہم بچ جائیں گے یا یہ کہ اب ہمارے زندہ بچ جانے کا امکان ہوگیا ہے۔

انہیں اپنی سمت کا بخوبی اندازہ ہو چکا تھا۔ اگر انہیں کھانے اور پینے کے لیے خاصی مقدار میں غذا اور پانی مل جاتا ہے اور وہ اسے پیک کر کے لائف بوٹ میں مشرق کی سمت روانہ ہوتے ہیں تو وہ یقینی طور پر کسی نہ کسی برِاعظم کے ساحل تک پہنچ جائیں گے۔

سوزن دوڑتی ہوئی ان دونوں کے پاس پہنچی اور ہانپتے مسکراتے ہوئے بولی۔ ''اسے یہاں اوپر تک پہنچنے میں کچھ وقت لگے گا۔ آؤ میں تم دونوں کو ایک چیز دکھاتی ہوں۔''

وہ دونوں سوزن کے پیچھے اس مقام تک آگئے جہاں وہ کچھ دیر پہلے موجود تھی۔ وہاں پہاڑی کی چوٹی کی ڈھلان بالکل عمودی تھی۔

''وہاں نیچے دیکھو!'' سوزن نے ان دونوں سے کہا۔

دونوں مرد محتاط قدموں سے چٹان کے کنارے تک پہنچے اور جھانک کر نیچے دیکھنے لگے۔ نیچے سو فٹ کی گہرائی میں نشیبی سطح پر سیاہ رنگ کے بڑے بڑے بے ترتیب پتھر پڑے ہوئے تھے۔

''وہاں کیا ہے؟'' میکلین نے پوچھا۔

اچانک سوزن نے بغیر کسی وارننگ کے اپنے شوہر کی بیساکھی کھینچ لی اور اسے چٹان پر سے نیچے دھکیل دیا۔

رچرڈ ایک لمحے کے لیے سناٹے میں رہ گیا۔ وہ منہ پھاڑے سوزن کو دیکھ رہا تھا۔

پھر دھیرے دھیرے اس کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ اس کے ہونٹوں پر بے ساختہ ایک مسکراہٹ اُبھر آئی۔

''مجھے معلوم تھا۔'' اس نے کہا۔ ''اب ہمیں بس یہ کرنا ہے کہ انٹونیو سے چھٹکارا حاصل کر لیں اور بوٹ لے کر یہاں سے نکل پڑیں، ٹھیک؟''

سوزن کا چہرہ تمتمانے لگا۔ ''کیا تمہارے خیال میں اسے کسی قسم کا شبہ تو نہیں ہوگا؟ تم کیا کہتے ہو؟''

''اسے شبہ کیوں ہوگا؟'' رچرڈ نے احتیاط سے قدم آگے بڑھاتے ہوئے کہا اور کنارے پر پہنچ کر نیچے جھانکنے لگا۔ ''ہم بس یہی کہیں گے......''

بھاری بھرکم بیساکھی کی ضرب رچرڈ کے داہنی کان کے عین عقب میں پڑی تھی۔ گو وہ بے ہوش تو نہیں ہوا لیکن

یہ ضرب کافی تھی۔ ایک لمحے بعد وہ توازن کھو بیٹھا اور چٹان کے کنارے سے نیچے لڑھک گیا۔

سوزن گہرے گہرے سانس لیتے ہوئے ان دونوں کو دیکھتی رہی جو نیچے بھاری پتھروں پر بے حس و حرکت پڑے ہوئے تھے۔ وہ کچھ دیر تک ان کے بے جان جسموں پر نظریں جمائے رہی۔ پھر ایک بلند قہقہہ لگاتے ہوئے اس نے بیساکھی بھی نیچے پھینک دی اور پلٹ گئی۔

انٹونیو پہاڑی کی چوٹی پر پہنچ چکا تھا اور اس کی جانب بڑھ رہا تھا۔

''کام ہوگیا۔'' وہ چیختے ہوئے اس کی سمت دوڑ پڑی۔ ''اب ہم......'' اس کا جملہ ادھورا رہ گیا اور وہ اچانک رک گئی۔

سرخ قمیص والا جو شخص اس کی جانب بڑھ رہا تھا وہ قطعی طور پر انٹونیو نہیں تھا۔ وہ عمر میں بڑا اور اس کا جسم دبلا پتلا تھا۔ وہ چہرے سے دنیا بیزار لگ رہا تھا اور اس کی پتلون پھٹی پرانی تھی۔ جب وہ سوزن کے نزدیک پہنچا تو اس نے اپنی کمر سے ایک چھوٹا خطرناک سا پستول نکال لیا۔

سوزن پیچھے ہٹی تو ایک بڑے سے پتھر سے الجھ کر دھم سے زمین پر گر پڑی۔

وہ شخص سوزن سے پانچ فٹ کے فاصلے پر رک گیا۔

''کیا تم بحری قزاق ہو؟'' سوزن نے پھٹی آنکھوں سے سرگوشی کے انداز میں پوچھا۔

''لگتا ہے کہ تم بہت زیادہ ٹی وی دیکھتی رہی ہو۔'' اس شخص نے اپنا پستول لہراتے ہوئے کہا۔ ''کھڑی ہوجاؤ۔''

سوزن اٹھ کھڑی ہوئی۔ ''تو پھر تم کون ہو؟''

''میں اس بحری جہاز کی کمپنی سے وابستہ ہوں جو سیر و تفریح کراتی ہے اور جس کے جہاز میں تم لوگ سمندری سیر کے لیے نکلے تھے' میں جہاز کا ہیڈ آف سیکیورٹی ہوں۔ بحری جہاز کے عملے کے دو افراد اور میں بچ کر چند میل پرے ساحل پر پہنچنے میں کامیاب ہوگئے تھے۔ ہمارا خیال تھا کہ جہاز تباہ ہونے کے بعد بچ نکلنے والے ہم ہی تینوں لوگ ہیں لیکن پھر تمہارا دوست ہمیں دکھائی دے گیا۔ وہ بھی اسی بحری جہاز میں سوار تھا۔''

''تم نے اس کی قمیص کیوں پہنی ہوئی ہے؟''

''اس لیے کہ میرے پاس کوئی قمیص نہیں تھی۔ وہ ڈی ہائیڈریشن کا شکار تھا۔ اس کے جسم میں پانی کی کمی واقع ہوچکی تھی لیکن وہ ٹھیک ہوجائے گا۔ اس کی دیکھ بھال ہورہی ہے۔'' اس شخص نے کہا اور پھر چند لمحوں تک سوزن کا بہ غور جائزہ لینے کے بعد بولا۔ ''اس نے ہمیں بتایا کہ تم چار افراد ہو۔''

''باقی دو یہاں موجود نہیں ہیں۔'' سوزن نے کہا۔

''مجھے معلوم ہے۔ میں نے انہیں جاتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔''

''اوہ!'' سوزن کا حلق خشک ہوگیا۔ وہ اپنے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے چاروں طرف دیکھنے لگی پھر دوبارہ اس شخص کی جانب متوجہ ہوکر بولی۔ ''کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ میں خود کو زیرِ حراست سمجھوں؟''

''تم زیرِ حراست ہوجاؤ گی۔ مجھے یقین ہے کہ تلاش کرنے والے چھوٹے ہوائی جہاز نکل چکے ہوں گے کیونکہ ہم نے لائف بوٹ میں وہ فلیئر دیکھے تھے جو سمندر میں متوجہ کرنے کے لیے فضا میں چھوڑے جاتے ہیں اور روشنی کے ذریعے مدد کا پیغام دیا جاتا ہے۔ کوئی نہ کوئی جلد ہم تک پہنچ جائے گا۔''

سوزن سر سے پیر تک اس شخص کا جائزہ لیتے ہوئے کچھ سوچنے لگی۔ پھر قدرے توقف کے بعد بولی۔ ''میں نہیں سمجھتی کہ میں اس معاملے میں...... تمہارا ذہن تبدیل کرنے کے لیے کچھ کرسکتی ہوں؟''

''تم مجھے بھی پہاڑی پر سے دھکیلنے کی کوشش کرسکتی ہو لیکن میں تمہیں اس کا مشورہ نہیں دوں گا۔'' اس شخص نے کہا۔

یہ سن کر سوزن کا چہرہ تاریک ہوگیا۔ ''اگر تمہیں حیرت نہ ہو تو میں بتادوں کہ انٹونیو بھی اس میں شامل تھا۔''

''مجھے یقین ہے، اسے جان کر خوشی ہوگی کہ تم نے مجھے سب کچھ بتادیا۔'' اس نے قدم پیچھے ہٹاتے ہوئے کہا۔ ''آؤ اب چلتے ہیں، مس......''

''میکلین، سوزن میکلین۔ اور تمہیں پستول تانے رکھنے کی ضرورت نہیں۔'' سوزن نے اپنی ٹھوڑی بلند کرتے ہوئے کہا۔ ''میں ایک کارپوریٹ ایگزیکٹو ہوں، چاہے تم یقین کرو یا نہ کرو۔''

''اوہ، مجھے یقین ہے۔'' اس شخص نے کہا اور اسے چلنے کا اشارہ کیا۔

پھر ساحل تک پہنچنے، لائف بوٹ میں سوار ہونے اور اپنے ساتھیوں تک پہنچنے تک وہ سوزن کو اپنے پستول کی زد میں لیے رہا۔ وہ سوزن کو اپنی آنکھوں سے دو افراد کو ٹھکانے لگانے کا منظر دیکھ چکا تھا۔ اس لیے اس خطرناک عورت سے کسی قسم کی رعایت برتنے یا اس کی جانب سے کسی بے پروائی کا مظاہرہ کرنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔

بھول

جمال دستی

بھول چوک معمولاتِ زندگی کا حصہ ہیں... مگر سنگین صورتِ حال میں بھول کی گنجائش نہیں ہوتی... اس شخص کی بدنصیبی جس سے چھوٹی سی بھول سرزد ہوگئی تھی...

سراغ رساں شرمین کے نئے کارناموں میں سے ایک نیا کیس.....

جرائم کے کیسز حل کرنے کا لطف اور پولیس کے ہمراہ تمام دن رات مصروف رہنے کے باوجود سراغ رساں شرمین ہومز خود کو کبھی بھی پولیس اسٹیشنوں میں مطمئن محسوس نہیں کرتا تھا۔

لہٰذا ایک شب جب اس کے دوست سارجنٹ ولسن نے اس سے پولیس اسٹیشن نمبر پانچ میں ملنے کے لیے کہا تو وہ وہاں پہنچ کر نروس زدہ انداز میں لابی کے عین باہر ڈیوڑھی میں ٹہلتے ہوئے اپنے دوست کا انتظار کرنے لگا۔

''ہیلو مسٹر شرمین! تم سارجنٹ ولسن کا انتظار کر رہے ہو؟'' ایک آواز آئی۔ یہ تحیم تحیم تومند پولیس افسر میلونی تھا جس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ رقصاں تھی۔ ''اندر کرسیاں موجود ہیں۔ وہاں بیٹھ جاؤ۔''

''اس کی ضرورت نہیں ہے۔ ولسن نے کہا تھا کہ وہ ساڑھے دس بجے پہنچ جائے گا۔'' شرمین نے جواب دیا۔

''اور اس وقت کیا بجا ہے؟''

لوگ اس زمانے میں دستی گھڑیاں کیوں نہیں پہنتے؟ سراغ رساں شرمین نے دل ہی دل میں کہا۔ ساتھ ہی اپنی جیب میں سے سلور کی بنی ہوئی پاکٹ گھڑی نکال کر اسے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''دس بج کر چھبیس منٹ ہو رہے ہیں۔ سارجنٹ کی آمد میں چند ہی منٹ باقی ہیں۔''

''کیا یہ کوئی اینٹیک ہے؟'' ایک اور پولیس افسر نے جو اسی وقت پولیس اسٹیشن میں داخل ہوا تھا، شرمین کے ہاتھوں میں موجود قدیمی ٹائم پیس پر نظر پڑتے ہی بے ساختہ پوچھا۔

''اوہ، ہیلو آفیسر والڈیز۔'' شرمین نے وہ نادر گھڑی معائنے کے لیے پولیس افسر کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''ہاں، حقیقت یہی ہے۔ یہ میرے پردادا شرلاک ہومز کی ملکیت تھی۔''

والڈیز قدرے سیاہ رنگت والا ایک متین اور جہاں دیدہ پولیس افسر تھا جو متعدد کیسوں میں سراغ رساں شرمین کے ساتھ کام کر چکا تھا۔ ''کیا تمہیں یہ ٹائم پیس خاندانی ورثے میں ملا ہے یا تم نے اسے کسی مرتہن کی دکان سے خریدا ہے؟'' والڈیز نے شرارت آمیز لہجے میں چٹکلا کسا۔

اس سے قبل کہ شرمین کوئی جواب دیتا، ایک تیسرا پولیس افسران سے آن ملا۔ ان کی شفٹ شروع ہونے والی تھی۔ شرمین کو علم تھا کہ جلد ہی مزید درجن بھر پولیس افسران ڈیوڑھی سے گزر کر لاکر روم کا تالا کھول کر اپنا یونیفارم اتارنے یا پہننے کے لیے اندر جائیں گے اور یہ سلسلہ نئی شفٹ کے آغاز تک جاری رہے گا۔

''ہیلو آفیسر لونگو۔'' شرمین نے ہاتھ لہراتے ہوئے ایک نئے آنے والے پولیس افسر کو مخاطب کیا۔ شرمین کو اس بات پر فخر تھا کہ نیلی یونیفارم والے بیشتر پولیس نوجوانوں کے نام سے وہ بخوبی واقف تھا۔

''ہائے، شرمی۔'' دراز قامت دوستانہ مزاج پیٹرول مین نے اپنی کی چین میں لاکر کی چابی ٹٹولتے ہوئے جواب دیا۔ ''تم لوگ رات بھر یہیں کھڑے رہو گے یا کام پر بھی جاؤ گے؟'' یہ کہہ کر اس نے دروازے کا تالا کھول دیا اور خوش خرامی سے اندر چلا گیا۔ میلونی اور والڈیز بھی اس کے پیچھے پیچھے کیوبیکلز کی بھول بھلیوں میں داخل ہو گئے تاکہ اپنی یونیفارم تبدیل کر سکیں۔

شوقین سراغ رساں شرمین ایک بار پھر تنہا رہ گیا اور اپنے دوست سارجنٹ ولسن کا انتظار کرنے لگا۔

ابھی ایک منٹ بھی نہیں گزرا تھا کہ لاکر روم کے دروازے کا تالا کھلا اور آفیسر والڈیز اور آفیسر لونگو نے گردن باہر نکالی۔ ''شرمی؟'' لونگو نے کھسیانے لہجے میں پکارا۔ ''کیا تم یہاں اندر آ سکتے ہو؟''

سراغ رساں شرمین ان کے پیچھے لاکر روم میں داخل ہو گیا۔ وہاں ایک کھلے ہوئے لاکر کے پاس لیفٹیننٹ وھیلر فرش پر پڑی ہوئی تھی۔ اس کی چٹخی ہوئی کھوپڑی سے چند انچ کے فاصلے پر ایک خون آلودہ پولیس افسران کا مخصوص چھوٹا ڈنڈا ابھی دکھائی دے رہا تھا۔ آفیسر میلونی لاش کے سر پر کھڑا پہرا دے رہا تھا۔ وہ اپنے باقی دونوں ساتھیوں کے مانند غم زدہ نظر آ رہا تھا۔

''اسے ہم نے اندر قدم رکھتے ہی دیکھ لیا تھا۔'' لونگو نے افسردگی سے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''اس کا جسم ابھی بھی گرم ہے۔''

''ہم جانتے ہیں کہ ہمیں ضابطے کے مطابق عمل کرنا ہے۔'' والڈیز نے کہا۔ ''لیکن پولیس اسٹیشن کے اندر ایک پولیس افسر کا قتل اور وہ بھی ایک پولیس افسر کے ہاتھوں......''

''پولیس افسر کے ہاتھوں؟'' سراغ رساں شرمین یہ سن کر ششدر رہ گیا اور اپنی حیرانی کا اظہار کیے بغیر نہ رہ سکا۔

''لاکر روم کی چابیاں صرف پولیس افسران کے پاس ہوتی ہیں۔'' میلونی نے بتایا۔ ساتھ ہی اس دروازے کی جانب اشارہ کیا جس پر خروج لکھا ہوا تھا۔ ''یہ باہر نکلنے کا ایمرجنسی دروازہ ہے لیکن یہ صرف اندر سے کھلتا ہے۔ اس میں باہر سے کوئی بھی داخل نہیں ہو سکتا۔''

''تو اندر آنے کا واحد راستہ ڈیوڑھی میں سے ہے؟ وہی دروازہ جس سے ہم اندر آئے ہیں؟'' شرمین نے کہا۔

''درست۔'' لونگو نے کہا۔ ''ماسوائے اس کے کہ تم اپنے جادو کے زور سے ہمیں یہ نہیں بتا دیتے کہ کوئی باہر والا یہاں کس طرح اندر آیا ہوگا، ہم اس بارے میں کچھ نہیں بتا سکتے۔''

شرمین ہمیشہ اس لمحے کا خواب دیکھا کرتا تھا کہ کب بہت سے پولیس افسران اس کے گرد گھیرا ڈالے اس سے مدد کی التجا کر رہے ہوں گے اور آج وہ لمحہ آ گیا تھا۔

شرمین نے بھرپور نظروں سے نصف لباس پہنے ہوئے افسر

کو دیکھا جس کی لاش فرش پر پڑی ہوئی تھی۔ ''اس کی شفٹ ختم ہو چکی تھی یا شروع ہونے والی تھی؟'' اس نے پوچھا۔

''میرا خیال ہے کہ اس کی شفٹ ختم ہو چکی تھی۔'' لونگو نے کہا۔ ''لیفٹیننٹ انٹرنل افیئرز میں کام کرتا تھا اور پولیس میں بُرے افسران کی کھوج میں تھا۔''

''کیا وہ یہاں کسی افسر سے ملاقات کرنے والا تھا؟''

''ایسا ممکن ہو سکتا ہے۔'' والڈیز نے کہا۔ ''ایک شفٹ کے اختتام پر اور دوسری شفٹ کے آغاز پر۔''

''کیا تم میں سے کسی کی اس کے ساتھ حال ہی میں کوئی بات چیت ہوئی تھی؟'' شرمین نے پوچھا۔ ''وہ کون سے معاملے پر کام کر رہا تھا؟''

میلونی نے شانے اچکا دیے۔ ''یہ چھٹیوں کے بعد میری پہلی شفٹ ہے۔ میری کئی ہفتوں سے لیفٹیننٹ وھیلر سے ملاقات نہیں ہوئی۔''

''میری کل ہی اس سے ملاقات ہوئی تھی۔'' والڈیز نے بتایا۔ ''اس نے کچھ زیادہ تو نہیں بتایا لیکن میں نے محسوس کیا کہ وہ کوئی بڑا بھانڈا پھوڑنے والا ہے۔''

''اس نے ایک ہفتے قبل مجھ سے پوچھ گچھ کی تھی۔'' لونگو نے کہا۔ وہ نوجوان پولیس افسر بے چین سا دکھائی دے رہا تھا۔ ''وہ کسی پولیس افسر پر جوئے خانے سے رشوت لینے کے الزامات کی تحقیقات کر رہا تھا۔''

''وہ نائٹ شفٹ کا کوئی پولیس افسر ہے؟'' شرمین نے جاننا چاہا۔

''شاید وہی افسر ہو جس سے وہ ملاقات کر رہا تھا۔'' والڈیز نے اپنی آواز دھیمی کرتے ہوئے کہا۔ ''نائٹ شفٹ کا وہ گندہ افسر جو یہ سمجھ رہا تھا کہ لیفٹیننٹ وھیلر سچ کے بے حد نزدیک پہنچ چکا ہے۔''

لاکر روم میں ایک طویل خاموشی چھا گئی۔

''آہ...... ہم۔'' بالآخر میلونی نے کھنکھارتے ہوئے اس خاموشی کو توڑا۔ اس نے اپنی دستی گھڑی پر نگاہ ڈالی اور بولا۔ ''اس شفٹ کے باقی لوگ بھی کسی لمحے آنا شروع ہو جائیں گے۔ تمہارے خیال میں ہمیں کیا کرنا چاہیے مسٹر شرمین؟''

شرمین کے ذہن میں ایک عمدہ آئیڈیا جنم لے چکا تھا۔ اس آئیڈیے کا مرکز اس کے سامنے موجود تینوں پولیس افسران میں سے ایک تھا۔

شرمین نے انگلی کو خم دیتے ہوئے لونگو کو قریب آنے کا اشارہ کیا۔ دراز قامت نوجوان افسر اس کے پاس آ گیا اور جھک کر اپنا کان شرمین کے منہ کے پاس لگا دیا۔

''جو میں کہوں تمہیں وہی کرنا ہے۔'' شرمین نے سرگوشی کی۔

لونگو نے اثبات میں سر ہلایا۔

''آفیسر میلونی کو گرفتار کر لو۔''

لونگو دھیرے دھیرے سیدھا کھڑا ہو گیا۔ اس نے اپنا بغلی ریوالور نکالنے میں دیر نہیں لگائی اور اس کا رخ گیم تھیم افسر کی جانب کرتے ہوئے بولا۔ ''میلونی تم زیرِ حراست ہو۔''

''کیا؟'' میلونی پھٹ پڑا۔ ''کیا تم مذاق کر رہے ہو؟''

''ایسا ہرگز نہیں ہے۔'' شرمین نے کہا۔ ''تم آج اپنی شفٹ کے لیے جلدی آ گئے تھے کیونکہ تمہیں لیفٹیننٹ وھیلر سے ملاقات کرنی تھی۔ تم نے اسے قتل کر دیا۔ میرا قیاس یہ ہے کہ تمہارے کپڑے اور تمہارا جسم خون آلود ہو گیا تھا، اس لیے تم جلدی سے نہا لیے۔ ہم تمہارے لاکر میں موجود تمہارا لباس چیک کر لیں گے۔''

''یہ سب مضحکہ خیز اور لغو باتیں ہیں۔'' میلونی نے کہا۔

''تم ایمرجنسی دروازے سے باہر نکل گئے تھے۔ لیکن تم سے ایک غلطی ہو گئی!''

''ساتھیو! اس پستہ قد خبطی کی باتوں پر یقین مت کرنا۔''

''تم اپنی دستی گھڑی بھول گئے تھے۔'' شرمین نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔

''یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟ میری گھڑی تو یہاں میرے ہاتھ میں موجود ہے۔'' میلونی نے جواب دیا۔

''مجھے معلوم ہے لیکن جب مجھ سے باہر ڈیوڑھی میں ملے تھے تو اس وقت گھڑی تمہارے ہاتھ میں موجود نہیں تھی۔ تم نے مجھ سے وقت بھی پوچھا تھا۔ جب تمہارے دونوں ساتھی مجھے بلانے کے لیے لاکر روم سے باہر آئے تھے تو تم نے فوراً اپنی گھڑی اٹھا کر اپنے ہاتھ میں باندھ لی تھی۔''

''نہیں۔'' میلونی نے احتجاج کیا۔ ''میں اپنی گھڑی کل شام کی شفٹ ختم ہونے پر یہیں بھول کر چلا گیا تھا۔''

''لیکن تم تو ایک ہفتے کی چھٹی پر گئے ہوئے تھے۔'' آفیسر لونگو نے مسکراتے ہوئے کہا۔ پھر شرمین کی جانب گھوم گیا۔ ''بہت عمدہ، شرمی!''

''شکریہ۔'' شرمین نے قدرے کورنش بجا لاتے ہوئے کہا۔ ''کم از کم اب تو تم میرا پورا نام لیا کرو اور مجھے شرمی کہنا چھوڑ دو۔''

''او کے، سراغ رساں شرمین ہومز!'' آفیسر لانگو بھی کورنش بجا لایا اور شرمین مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔

انگارے

طاہر جاوید مغل

اکیسویں قسط

نیکی کر دریا میں ڈال... بات محاورے کی حد تک ٹھیک ہو سکتی ہے لیکن خود غرضی اور سفاکی کے اس دور میں نیکی کرنے والے کو ہی کمر میں پتھر باندھ کر دریا میں ڈال دیا جاتا ہے۔ انسان بے لوث ہو اور سینے میں دردمند دل رکھتا ہو تو اس کے لیے قدم قدم پر ہولناک آسیب منہ پھاڑے انتظار کررہے ہوتے ہیں۔ بستیوں کے سرخیل اور جاگیرداری کے بے رحم سرغنہ لہو کے پیاسے ہو جاتے ہیں... اپنوں کی نگاہوں سے نفرت کے انگارے برسنے لگتے ہیں... امتحان درامتحان کے ایسے کڑے مراحل پیش آتے ہیں کہ عزم کمزور ہو تو مقابلہ کرنے والا خود ہی اندر سے ریزہ ریزہ ہو کر بکھرتا چلا جاتا ہے لیکن حوصلہ جوان ہو تو پھر ہر سازش کی کوکھ سے دلیری اور ذہانت کی نئی کہانی ابھرتی ہے۔ وطن کی مٹی سے پیار کرنے والے ایک بے خوف نوجوان کی داستان جسے ہر طرف سے وحشت و بربریت کے خون آشام سایوں نے گھیر لیا تھا مگر وہ ان پیاسی دلدلوں میں رکے بغیر دوڑتا ہی چلا گیا... اثرورسوخ اور درندگی کی زنجیریں بھی اس کے بڑھتے ہوئے قدم نہیں روک سکیں۔ وقت کی میزان کو اس کے خونخوار حریفوں نے اپنے قدموں میں جھکا لیا تھا مگر وہ ہار مان کر پسپا ہونے والوں میں سے نہیں تھا...

گذشتہ اقساط کا خلاصہ

میں ڈنمارک سے پاکستان لوٹا تھا۔ مجھے کسی کی تلاش تھی۔ یہ تلاش شروع ہونے سے پہلے ہی ایک ایسا واقعہ ہوگیا جس نے میری زندگی کو تہ وبالا کر دیا۔ میں نے سرراہ ایک زخمی کو اٹھا کر اسپتال پہنچایا جسے کوئی گاڑی ٹکر مار کر گزر گئی تھی۔ مقامی پولیس نے مجھے مددگار کے بجائے مجرم ٹھہرایا اور یہیں سے جبر و ناانصافی کا ایسا سلسلہ شروع ہوا جس نے مجھے شکیل داراب اور لالہ نظام جیسے خطرناک لوگوں کے سامنے کھڑا کر دیا۔ یہ لوگ ایک قبضہ گروپ کے سرخیل تھے جو رہائشی کالونیاں بنانے کے لیے چھوٹے زمینداروں اور کاشت کاروں کو ان کی زمینوں سے محروم کررہا تھا۔ میرے چچا حفیظ سے بھی زبردستی ان کی آبائی زمین ہتھیانے کوشش کی جارہی تھی۔ چچا کا بیٹا ولید اس جبر کو برداشت نہ کرسکا اور شکیل داراب کے دست راست انسپکٹر قیصر چودھری کے سامنے سینہ تان کر کھڑا ہوگیا۔ اس جرأت کی سزا اسے یہ ملی کہ ان کی حویلی کو اس کی ماں اور بہن فائزہ سمیت جلا کر راکھ کر دیا گیا اور وہ خود دہشت گرد قرار پاکر جیل پہنچ گیا۔ انسپکٹر قیصر اور لالہ نظام جیسے سفاک لوگ میرے تعاقب میں تھے، وہ میرے بارے میں کچھ نہیں جانتے تھے۔ میں MMA کا یورپی چیمپئن تھا، وسطی یورپ کے کئی بڑے بڑے گینگسٹر میرے ہاتھوں ذلت اٹھا چکے تھے۔ میں اپنی پچھلی زندگی سے بھاگ آیا تھا لیکن وطن پہنچتے ہی یہ زندگی پھر مجھے آواز دینے لگی تھی۔ میں یہاں سے بیزار ہو کے واپس ڈنمارک جارہا تھا کہ ایک انہونی ہوئی۔ وہ جادوئی حسن رکھنے والی لڑکی مجھے نظر آگئی جس کی تلاش میں، میں یہاں پہنچا تھا۔ اس کا نام تاجور تھا اور وہ اپنے گاؤں چاند گڑھی میں نہایت پریشان کن حالات کا شکار تھی۔ میں اس کے گاؤں جا پہنچا اور ایک ٹریکٹر ڈرائیور کی حیثیت سے اس کے والد کے پاس ملازم ہوگیا۔ انیق بطور مددگار میرے ساتھ تھا۔ تاجور کا غنڈا صفت منگیتر اسحاق اپنے ہمنواؤں زمیندار عالمگیر اور پیر ولایت کے ساتھ مل کر تاجور اور اس کے والد دین محمد کے گرد گھیرا تنگ کررہا تھا۔ پیر ولایت نے گاؤں والوں کو باور کرا رکھا تھا کہ اگر تاجور کی شادی اسحاق سے نہ ہوئی تو چاند گڑھی پر آفت آجائے گی۔ ان لوگوں نے چاند گڑھی کے راست گو امام مسجد مولوی فدا کو بھی اپنے ساتھ ملا رکھا تھا۔ تاجور کے گھر میں آئی مہمان نمبردارنی کو کسی نے زخمی کر دیا تھا۔ اس کا الزام بھی تاجور کو دیا جارہا تھا۔ ایک رات میں نے چہرے پر ڈھاٹا باندھ کر مولوی فدا کا تعاقب کیا۔ وہ ایک ہندو میاں بیوی رام پیاری اور وکرم کے گھر میں داخل ہوئے۔ مولوی فدا یہاں وکرم اور رام پیاری کی مدد کے لیے آئے تھے۔ نمبردارنی کو زخمی کرنے والا مولوی صاحب کا شاگرد طارق تھا۔ وہ تاجور کی جان لینا چاہتا تھا کیونکہ اس کی وجہ سے مولوی صاحب کسی بلیک میلنگ کا شکار ہورہے تھے۔ طارق سے معلوم ہوا کہ مولوی جی کی بیٹی زینب ایک عجیب بیماری کا شکار ہے۔ وہ زمیندار عالمگیر کے گھر میں ٹھیک رہتی ہے لیکن جب اسے وہاں سے لایا جائے تو اس کی حالت غیر ہونے لگتی ہے۔ اسی دوران میں ایک خطرناک ڈاکو سجاول نے گاؤں پر حملہ کیا۔ حملے میں عالمگیر کا چھوٹا بھائی مارا گیا۔ میں تاجور کو حملہ آوروں سے بچا کر ایک محفوظ جگہ لے گیا۔ ہم دونوں نے کچھ اچھا وقت گزارا۔ واپس آنے کے بعد میں نے بھیس بدل کر مولوی فدا سے ملاقات کی اور اس نتیجے پر پہنچا کہ عالمگیر وغیرہ نے زینب کو جان بوجھ کر بیمار کررکھا ہے اور یوں مولوی صاب کو مجبور کیا جارہا ہے کہ وہ اپنی بچی کی جان بچانے کے لیے اسحاق کی حمایت کریں۔ میں نے مولوی صاحب کو اس بلیک میلنگ سے نکالنے کا عہد کیا مگر اگلی رات مولوی صاحب کو قتل کر دیا گیا۔ ایک دن میں اور انیق پیر ولایت کے والد پیر سائیں تاجی کے اس ڈیرے پر جا پہنچے جو کسی زمانے میں جل کر خاکستر ہوچکا تھا اور اس سے متعلق متعدد کہانیاں منسوب تھیں۔ اس ڈیرے پر لوگ دم درود وغیرہ کرانے آتے تھے۔ تاجور کی قریبی دوست ریشمی شادی کے بعد دوسرے گاؤں چلی گئی تھی۔ اس کا شوہر شکی مزاج اور تشدد پسند شخص تھا۔ اس نے ریشمی کی زندگی عذاب بنا رکھی تھی۔ ایک دن وہ ایسی غائب ہوئی کہ اس کا شوہر ڈھونڈتا رہ گیا۔ میں تاجور کی خاطر ریشمی کی تلاش میں ایک الگ ہی دنیا میں جا پہنچا۔ ریشمی ایک ملنگ کا روپ دھار چکی تھی اور آستانے پر اپنی دلکش و سریلی آواز کے باعث پاک بی بی کا درجہ حاصل کرچکی تھی۔ درگاہ کے منافقت آمیز ماحول نے مجھے بہت مایوس کیا اور اس پورے نیٹ ورک کو نیست و نابود کر کے ہم فرار ہونے میں کامیاب ہوگئے۔ آگ و خون کا دریا عبور کر کے ہم بالآخر پہاڑوں کے دامن میں جا پہنچے۔ اس دوران انیق وغیرہ ہم سے بچھڑ گئے۔ میں اور تاجور بھاگتے ہوئے سجاول ڈکیت کے ڈیرے پر پہنچ گئے۔ یہاں سجاول کی ماں (ماؤ جی) مجھے اپنا ہونے والا جوائی سمجھی۔ جس کی پوتی مہناز عرف مانی سے میری بات طے تھی۔ یوں سجاول سے ہماری جان بچ گئی۔ یہاں سجاول نے میرا مقابلہ باقرے سے کرا دیا۔ سخت مقابلے کے بعد میں نے باقرے کو چت کر دیا تو میں نے سجاول کو مقابلے کا چیلنج کر دیا۔ میرے چیلنج نے سجاول سمیت سب کو پریشان کر دیا تھا۔ اس دوران ایک خط میرے ہاتھ لگ گیا جسے پڑھ کر چاند گڑھی کے عالمگیر کا مکروہ چہرہ سامنے آگیا۔ اس خط کے ذریعے میں سجاول اور عالمگیر میں دراڑ ڈالنے میں کامیاب ہوگیا۔ متوقع مقابلے کے بارے میں سوچتے سوچتے میرا ذہن ایک بار پھر ماضی کے اوراق پلٹنے لگا۔ جب میں ڈنمارک میں تھا اور ایک کمزور پاکستانی کو گورے اور انڈین غنڈوں سے بچاتے ہوئے خود ایک طوفان کی لپیٹ میں آگیا۔ وہ غنڈے ٹیکساری گینگ کے لوگ تھے جس کا سرغنہ جان ڈیرک تھا۔ مجھ سے بدلہ لینے کے لیے انہوں نے میری یونیورسٹی دوست ڈیزی کے ساتھ اجتماعی کھیل کھیلا، پھر ڈیزی غائب ہوگئی۔ اس واقعے کے بعد میری زندگی میں ایک انقلاب آگیا۔ مجھے چھ ماہ جیل ہوئی۔ پھر میرا رجحان مارشل آرٹ کی طرف ہوگیا اور ایسٹرن کنگ کی حیثیت سے MMA کی فائٹس میں تہلکہ مچاتا رہا اور دوسری طرف اسکائی ماسک کی اوٹ میں ٹیکساری گینگ کے غنڈوں سے برسرپیکار رہا۔ اسی مارشل آرٹ کی بدولت میں نے سجاول سے مقابلہ کیا اور سخت مقابلے کے بعد برابری کی بنیاد پر ہار مان کے سجاول کا دل جیت لیا۔ سجاول سے کہہ کر میں نے انیق کو بلوالیا۔ سجاول ایک حسین دوشیزہ سنبل کو نوبیاہتا دلہن کی طرح سجا سنوار کر ریان فردوس (وڈے صاحب) کی خدمت میں تحفے کے طور پر پیش کرنا چاہتا تھا۔ میں، انیق اور جاناں ساتھ تھے۔ ہم وڈے صاحب کے محل نما بنگلے پارا ہاؤس پہنچے۔ وڈا صاحب اپنے دو بیٹوں کے ہمراہ برونائی سے پاکستان شفٹ ہوا تھا۔ برونائی میں اس کی خاندانی دشمنی چل رہی تھی۔ سب ٹھیک تھا

کہ اچانک چند نقاب پوشوں نے پارا ہاؤس پر حملہ کر دیا جن کا سرغنہ ناقب تھا۔ سخت مقابلہ ہوا۔ سجاول نے جان جوکھوں میں ڈال کر بڑی بیگم صاحبہ کی جان بچائی لیکن سرغنہ ناقب نے اس کے بیٹے ابراہیم اور ایک مہمان کو یرغمال بنالیا، مہمان کا نام سن کر میں چونک گیا یعنی شکیل داراب! پھر میں نے اور سجاول نے چھوٹے صاحب کو اغوا کاروں کے چنگل سے نجات دلائی۔ اس معرکے میں کچھ اغوا کار مارے گئے اور کچھ پکڑے گئے۔ سجاول کو پارا ہاؤس میں کلیدی حیثیت حاصل ہوگئی تھی۔ پارا ہاؤس میں کوئی بڑا چکر چل رہا تھا۔ کھوج لگانے پر پتا چلا کہ بڑے صاحب کے دونوں بیٹوں میں زہریلا عنصر پایا جاتا ہے۔ زینب والا معاملہ بھی اسی طرف اشارہ کررہا تھا۔ اسی وجہ سے زینب کو بھی اغوا کرلیا گیا تھا۔ یہیں مجھ پر انکشاف ہوا کہ ڈاکٹر ارم پارا ہاؤس کے ذاتی اسپتال میں موجود ہے اور اس نے دھوکے سے رضوان ٹی کو دوبارہ قابو کرلیا ہے۔ ابراہیم اور کمال احمد کے لیے جو لڑکیاں تیار کی گئی تھیں، وہ پارا ہاؤس پہنچ چکی تھیں۔ ایک تقریب میں دونوں لڑکیوں کی رونمائی کی گئی تو ان میں ایک زینب تھی۔ ابراہیم نے مجھ پر اور سجاول پر اعتماد کا اظہار کیا تھا۔ ابراہیم نے بتایا کہ دونوں بھائیوں میں زہریلا پن موجود ہے اسی لیے ان کے لیے ایسی لڑکیاں ڈھونڈی گئی ہیں۔ میں نے ابراہیم کو آگاہ کیا کہ زینب پوری طرح محفوظ نہیں ہے اور شادی کی صورت میں اسے نقصان پہنچ سکتا ہے۔ یہ سن کر ابراہیم پریشان ہوگیا۔ ادھر آقا جان جو پارا ہاؤس کا کرتا دھرتا تھا، اس نے سرغنہ ناقب کے فرار کا ڈراما رچایا۔ ایک بار پھر پارا ہاؤس میں دھماکے گونج اٹھے۔ تابڑتوڑ گولیاں چلنے لگیں اور مقابلے میں سرغنہ ناقب اور اس کا ساتھی عبرت ناک موت مارے گئے۔ میرے کہنے پر ابراہیم نے زینب کا خون ٹیسٹ کرایا تو حقیقت کھل کر سامنے آگئی۔ اس تمام قتل وغارت میں آقا جان ملوث تھا مگر کوئی اس پر شک کرنے کو تیار نہ تھا۔ ناقب کی موت کے بعد برونائی میں مخالفین نے بڑی کارروائی کر کے وڈے صاحب کے برادر نسبتی کو مار ڈالا تھا۔ بڑی بیگم صاحبہ کا رو رو کر برا حال تھا، ان حالات سے نبرد آزما ہونے کے لیے میں اور سجاول وڈے صاحب کے ساتھ برونائی جانے کے لیے تیار تھے۔ برونائی جانے سے پہلے میں ایک نظر تاجور کو دیکھنا چاہتا تھا۔ ایک طویل فاصلہ طے کر کے میں تاجور کی ایک جھلک ہی دیکھ پایا تھا کہ گاؤں کے چند لڑکوں نے مجھے گھیر لیا۔ میرے سامنے وہ بچے تھے۔ اپنی ہار کے بعد ایک دلیر لڑکا میرے گلے کا ہار بن گیا اور میرا پیچھا کرتا ہوا پارا ہاؤس تک آگیا۔ سیف عرف سیفی کی شیخی نکالنے کے لیے ہم اسے اپنے ساتھ برونائی لے آئے تھے یہاں حالات بہت خراب تھے۔ آقا جان کا بیٹا مخالف پارٹی بن چکا تھا اور امریکن ایجنسی کے ساتھ مل کے پورے علاقے پر قبضہ کرنا چاہتا تھا۔ آقا جان کی بھتیجی قسطینا کمانڈر اور جی دار آفیسر تھی۔ وہ مجھے پہچان چکی تھی کہ میں ایسٹرن کنگ ہوں۔ وہ ایک خفیہ منصوبہ ترتیب دے چکی تھی اور تنہا اپنے مشن پر جانا چاہتی تھی۔ وہ ہر صورت اپنے والد کے قاتل کو انجام تک پہنچانا چاہتی تھی، وہ ریان فردوس کی پہلی اور اس کے بیٹے کی دشمن بن چکی تھی۔ باپ اور بیٹے آمنے سامنے تھے۔ قسطینا دشمن کے علاقے میں مالن بن کے پہنچ چکی تھی، میں اس کے ہمراہ تھا۔ زینب محل سے غائب تھی اور انیق کی وجہ سے ہماری گرفت میں تھی۔ ابراہیم کا زینب کے بغیر برا حال تھا۔ آگے دشمن کے علاقے میں جگہ جگہ ناکا بندی تھی۔ میں، قسطینا، رائے زل کے ایک کلب تک جا پہنچے تھے اور بڑی کارروائی کر کے اسے تباہ کر ڈالا۔ ہمارا مشن کامیابی سے مکمل ہوا۔ مگر میں اور قسطینا بنکر میں پناہ لینے پر مجبور ہوگئے۔ امدادی کارروائی کرنے والوں نے ہمیں اس بنکر سے نجات دلائی۔ انیق کی حالت دیدنی تھی۔ وہ مجھے دیکھ کر لپٹ گیا۔ قسطینا سے غیر محسوس طور پر تعلقات بڑھتے جارہے تھے...... جو کئی سرکردہ عہدے داروں کو قبول نہیں تھے اور کمانڈر افغانی نے مجھے طلب کرلیا تھا۔ افغانی نے مجھ سے انتہائی ترشی اور دھمکی آمیز انداز میں بات کی اور باور کرایا کہ میں قسطینا سے دور رہوں۔ مگر زینب کی بات بتا کر میں بازی پلٹ چکا تھا اب افغانی کو میرے بارے میں اپنی رائے بدلنا پڑی۔ ابراہیم کا برا حال تھا۔ مجھے اس کی جان بچانے کے لیے اسے زینب کے بارے میں بتانا پڑا۔ مجھے شروع سے آقا جان پر شک تھا۔ وہ مجھے اغوا کر کے اپنے ٹارچر سیل لے گیا۔ میرے ساتھ جاناں بھی اس کی لپیٹ میں آگئی۔ میں قید میں تھا اور زخموں سے چور تھا۔ جاناں کسی طرح میرے قید خانے تک آپہنچی مگر اس کی اپنی حالت ناگفتہ بہ تھی۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

اس کے نیم عریاں جسم کے گرد لپٹی ہوئی چادر خون آلود ہو چکی تھی اور اب قطرے لکڑی کے فرش پر بھی ٹپک رہے تھے۔ میں نے اس کا سر اپنی گود سے نکال کر اٹھنا چاہا۔ اس نے مجھے روک دیا۔ ''نہیں شاہ زیب! کوئی فائدہ نہیں۔ مجھے نہیں لگتا کہ میں اب بچوں گی۔ آپ کسی کو مدد کے لیے پکار کر...... اس کے سوا...... اور کچھ نہیں کریں گے کہ اپنا چانس ختم کرلیں گے۔ یہاں سے نکل نہیں سکیں گے...... پلیز رہنے دیں۔''

اس نے جیسے مجھے جکڑ لیا۔ ''لیکن تمہارا خون بند ہونا چاہیے جاناں۔'' میں نے کہا۔

''یہ لیں، میں اس پر یہ تولیا رکھ لیتی ہوں۔'' اس نے ایک تولیا پکڑ کر اپنے پیٹ کے زخم کے اوپر دبا لیا۔ پھر ذرا وقفے کے بعد بولی۔ ''آپ کو پتا ہے...... مجھے کراچی نہیں جانا تھا۔ یہاں سے جانا میرے پروگرام میں ہی نہیں تھا۔ میرا ارادہ کچھ اور تھا۔'' میں نے حیرت سے اسے دیکھا۔ وہ میری حیرت کو نظر انداز کرتے ہوئے کہنے لگی۔ ''میں اپنی جان لینے کا پکا ارادہ کر چکی تھی شاہ زیب...... لیکن...... سچی بات نہیں چھپاؤں گی...... جوں جوں وقت قریب آرہا تھا میں خوف زدہ ہوتی جارہی تھی۔ اپنی جان خود لینا آسان تو نہیں ہوتا نا۔ میرا ارادہ ڈانواں ڈول ہورہا تھا۔''

''میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا۔ تم...... کس وقت کی بات کررہی ہو؟''

''48 گھنٹے کی۔'' وہ عجیب لہجے میں بولی۔ ''یہ 48 گھنٹے میں نے آپ سے اسی خاطر لیے تھے کہ پھر...... میں نے بھی نہیں رہنا تھا۔''

میں چکرا گیا۔ مجھے یاد آیا کہ دوسری رات جوں جوں اپنے اختتام کو پہنچ رہی تھی، جاناں سوچ کے کسی گہرے بھنور میں ڈوبتی جارہی تھی۔ وہ مجھ سے ہی نہیں اپنے آپ سے بھی دور ہوگئی تھی۔ بارش کی اس رات کا ہر ہر لمحہ مجھے یاد تھا۔ جاناں کی آواز نے مجھے خیالوں سے چونکایا۔ ''ہاں شاہ زیب! یہ دیکھیں...... یہ کیا ہے؟'' اس نے اپنا خون آلود ہاتھ اوپر اٹھایا۔ کانپتے ہوئے ہاتھ کی ایک انگلی میں انگوٹھی تھی۔ وہ بولی۔ ''یہ تھا میری موت کا سامان...... اسے کھول کر دیکھیں۔''

میں نے جاناں پر حیرت کی نگاہ ڈالی، پھر انگوٹھی کو دیکھا۔ یہ وہی انگوٹھی تھی جو میں نے بے ہوشی والی رات کو اس کے ہاتھ میں دیکھی تھی۔ میرا خیال تھا کہ یہ ان تحائف میں شامل ہے جو جاناں کو الوداع کہتے ہوئے بیگم نورل اور میڈم لورین نے دیے تھے مگر ایسا نہیں تھا۔ میں نے انگوٹھی کو غور سے دیکھا۔ اس کے اوپر ایک ڈھکنا سا تھا۔ میں نے ناخن کی مدد سے ڈھکن کا کلپ کھولا۔ اندر کوئی زرد پاؤڈر تھا۔ میرے دل نے گواہی دی کہ یہ زہر ہے۔

میں بے حد حیرت سے جاناں کی نیم وا آنکھوں کو دیکھنے لگا۔ وہ ایک بار پھر کربناک انداز میں بولی۔ ''یہ سچ ہے شاہ زیب! میں اب واپس جانا نہیں چاہتی تھی۔ وہاں میرے لیے خطروں اور ملامتوں کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ ماں باپ شاید میرا منہ دیکھنے کے روادار بھی نہ ہوتے...... اب دیکھیں، ہے نا خوشی کی بات۔ میری زندگی بیکار سہی لیکن موت بیکار نہیں ہے۔ کچھ نہ کچھ تو آپ کے کام آرہی ہے۔''

پھر اس نے نہایت مختصر الفاظ میں مجھے بتایا کہ وہ یہاں تک کیسے پہنچ پائی۔

آج رات یہ سارے لوگ بڑی ترنگ میں تھے۔ آرب پہلی رات سے جاناں کی طرف متوجہ تھا۔ آج اس نے اور اس کے ایک دوست نے ڈرنک کی اور پھر اس پر چڑھ دوڑے۔ جاناں کوئی چھوئی موئی لڑکی نہیں تھی۔ نوجوان ہونے کے باوجود بہت سے خطرناک مرحلوں سے گزر چکی تھی۔ اس نے آرب اور اس کے ''تھائی'' ساتھی کو خود میں الجھائے رکھا۔ (اس تھائی کا ایک ہاتھ کہنی کے نیچے سے کٹا ہوا تھا اور وہ بوالہوسی میں شیطان کو بھی مات دیتا تھا۔ میں نے ہوٹل واشنگٹن والے واقعے میں بھی اس کی گھناؤنی مصروفیات دیکھی تھیں) جاناں کی حکمت عملی سے، آرب اور اس کا ساتھی ضرورت سے زیادہ پی گئے۔ تب جاناں نے آرب کے لباس تک رسائی حاصل کی جو ایک ہینگر پر لٹکا ہوا تھا۔ لباس کے نیچے ایک چرمی بیلٹ تھی، جس میں دودھاری خنجر اڑسا ہوا تھا۔ کمرے میں میوزک کی دھنا دھن گونج رہی تھی۔ آرب اور اس کا ''ہم نوالہ و پیالہ ساتھی'' بالکل مدہوش پڑے تھے۔ آنکھیں بند کر کے اپنی بالادستی کا سُرور لے رہے تھے۔ جاناں نے پہلے آرب اور پھر اس کے ساتھی کی گردن پر پے در پے وار کیے اور انہیں موقع پر ہی بے جان کر ڈالا۔ آوازیں سن کر ایک تیسرا شخص دروازہ کھٹکھٹانے لگا۔ جاناں نے دروازہ اس طرح کھولا کہ خود دروازے کی اوٹ میں ہوگئی۔ اندر آنے والا ایک ادھیڑ عمر گارڈ تھا۔ جاناں نے دونوں ہاتھوں سے اس کی پسلیوں پر دودھاری خنجر کا گہرا وار کیا۔ وہ گر گیا تو جاناں اس کے سینے پر چڑھ گئی اور اوپر تلے وار کر کے اسے وہیں ختم کر دیا۔

جاناں نے یہاں تین دن کے قیام میں جہاں اور بہت سی معلومات حاصل کی تھیں، وہاں یہ بھی جان لیا تھا کہ یہی ادھیڑ عمر گارڈ اس عقوبت خانے کی نگرانی کر رہا ہے جہاں میں موجود ہوں۔ اس نے اس ادھیڑ عمر شخص کی جیبیں ٹٹولیں اور چابیاں ڈھونڈنے میں کامیاب رہی۔ جب وہ اس مقتول گارڈ کی جیبوں سے چابیاں ڈھونڈ رہی تھی اس سے غلطی ہوئی۔ اس نے اپنا خون آلود خنجر فرش پر رکھ دیا تھا۔ پہلے دونوں بندوں میں سے آرب تو ختم ہو چکا تھا مگر دوسرا زندہ تھا۔ اس کے گلے کی بہت سی رگیں کٹ گئی تھیں مگر وہ سانس لے رہا تھا۔ اس نے خنجر اٹھایا اور فرش پر پڑے پڑے جاناں پر کاری وار کیا۔ جاناں یہ زخم کھانے کے بعد اٹھ کر بھاگی۔ اس نے دروازہ باہر سے لاک کر دیا تھا۔ اسے معلوم نہیں کہ بعد میں کیا ہوا۔ اندازہ یہی تھا کہ وہ کٹے گلے والا مدہوش گارڈ بھی دوبارہ نہیں اٹھ سکا اور نہ ہی کسی کو پکار سکا۔ جاناں اپنا زخمی پیٹ دبا کر میرے کمرے یعنی ٹارچ سیل تک پہنچی۔ پہلی چابی تو تالے میں نہیں لگی لیکن دوسری کارآمد رہی۔ وہ تالا کھول کر اندر آگئی۔

جاناں کا مختصر بیان ختم ہوگیا۔ گھڑی کی سوئیاں سرک رہی تھیں۔ وہ 12 کے ہندسے پر گلے ملنے جارہی تھیں اور مجھ سے گلے ملنے والی مجھ سے دور ہوتی جارہی تھی۔

''مم...... مجھے پانی پلائیں شاہ زیب!'' وہ بمشکل بولی۔

میں نے اس کا سر بہ آہستگی اپنی گود سے نکالا اور لنگڑاتا ہوا ٹارچ سیل کے گوشے میں گیا۔ یہاں پلاسٹک

بوتل میں پینے کا پانی تھا، ساتھ میں اسٹیل کا گلاس رکھا تھا۔ میں پانی بھر کر لایا اور جاناں کا سر پھر گود میں رکھ کر بیٹھ گیا۔ سردی کے باوجود وہ قریباً سارا گلاس پی گئی۔ خون بہت زیادہ بہہ جائے تو اسی طرح نسیں خشک ہو جاتی ہیں۔ وہ ماڈل گرل بننے کے لیے گھر سے نکلی تھی...... بری طرح لوٹی کھسوٹی گئی تھی......شاید وہ ٹھیک ہی کہتی تھی۔ واپسی پر اس کے لیے ملامتوں کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔

یکا یک مجھے لگا کہ وہ چپ ہو گئی ہے۔ یہ بے ہوشی کی علامت تھی۔ میں نے اسے ہلایا۔ ''جاناں...... جاناں...... آنکھیں کھولو۔''

چند سیکنڈ بعد مجھ پر یہ انکشاف ہوا کہ...... وہ زندہ نہیں ہے۔ میں نے گردن پر انگلیاں رکھ کر اس کی نبض دیکھی، اس کی سانسوں کو محسوس کیا۔ وہ جو شوبز کی دنیا میں تہلکہ مچانے نکلی تھی، زندگی کے اسٹیج سے بڑی خاموشی کے ساتھ آؤٹ ہو گئی تھی۔ میری آنکھیں جل اٹھیں، سینہ دہک گیا۔ گھڑی کی سوئیاں متحرک تھیں۔ میرے پاس تو اتنا وقت بھی نہیں تھا کہ کچھ دیر اس کا سوگ ہی منا سکتا۔

میں نے خون آلود خنجر اٹھایا۔ اسے تولیے سے پونچھا اور ایک بڑے رومال میں لپیٹ کر نیفے میں اڑس لیا۔ میرے رگ و پے میں بجلیاں کوند رہی تھیں۔ یورپ کے نائٹ کلبوں میں مار دھاڑ کے دوران میں یہی کیفیت تھی جو مجھ پر طاری ہوا کرتی تھی۔ میں ''کبھی فاؤل نہ کرنے والا'' کھلاڑی نہیں رہتا تھا۔ سراسر فاؤل کھیلنے والا کھلاڑی بن جاتا تھا۔ یہ مارشل آرٹ سے ''گینگسٹری'' تک کا سفر تھا جو مجھے کرنا پڑتا تھا۔

میں نے کھڑکی تھوڑی سی کھول لی۔ میرا بالائی جسم عریاں تھا۔ سرد ہوا کے جھونکے سینے اور پیٹ سے ٹکرائے۔ شفاف آسمان پر تارے پلکیں جھپک رہے تھے۔ شاید انہیں بھی اس طوفان کی خبر تھی جو اس جزیرے کے طول و عرض میں بپا ہونے والا تھا۔ فاصلے پر وہ تین گھونسلے نظر آ رہے تھے جن میں مدھم روشنی چالیس پچاس گز کی دوری سے بھی صاف دکھائی دیتی تھی۔ گھڑی نے بارہ بجے کا اعلان کیا۔ دس پندرہ سیکنڈ بعد مجھے اندازہ ہوا کہ درختوں کی بلندی پر واقع ان گھونسلا نما کمروں کے دروازے یکے بعد دیگرے کھلے ہیں۔ چند سیکنڈ مزید گزرے پھر سیڑھیوں پر متحرک ہیولے نظر آنے لگے۔ جاناں نے یہی تو کہا تھا۔ نگراں گارڈز اپنی کمین گاہوں سے اتریں گے اور ان کی جگہ نئے گارڈز لیں گے اور یہی وقت ہوگا میرے حرکت میں آنے کا...... ہاں وہ یہی وقت تھا۔ میں نے پلٹ کر جاناں کی پیشانی پر الوداعی بوسہ دیا۔ اس کے جسم پر خون آلود چادر درست کی اور دروازے کا بولٹ گرا کر باہر نکل آیا۔

جاناں نے اس جگہ کی نشاندہی کر دی تھی جہاں وہ دو افراد کو مردہ اور ایک کو زخمی چھوڑ کر آئی تھی۔ وہ کمرا زیادہ فاصلے پر نہیں تھا اور وہاں سے موسیقی کی مدھم آواز بھی ابھر رہی تھی۔ لیکن میرے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ میں کوئی آتشیں ہتھیار حاصل کرنے کے لیے ادھر کا رخ کر سکتا۔ میں دائیں طرف مڑا اور ایک دیوار کے ساتھ ساتھ جھک کر چلتا گیا، پھر بلند درختوں کی مخالف سمت میں بھاگنے لگا۔ میں ان تین مچان نما پوستوں سے جلد از جلد دور نکل جانا چاہتا تھا مگر جاناں نے کہا تھا کہ نکلنا اتنا آسان نہیں ہوگا اور اس نے ٹھیک کہا تھا۔

''ہالٹ...... کون ہے؟'' ایک کرخت آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔

پکارنے والا دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ میں اپنی جگہ رک گیا۔ میں نے خنجر کو اس طرح پکڑا کہ وہ میرے ہاتھ میں ہی رہا لیکن کلائی کے ساتھ لگ کر نظروں سے اوجھل بھی ہو گیا۔ حسبِ توقع دوسرا حکم ملا۔ ''ہاتھ اوپر اٹھاؤ...... سیدھے کھڑے رہو۔''

میں نے ایک ہاتھ اوپر اٹھا دیا۔ دوسرا ہاتھ مجروح تھا اور اس قابل ہی نہیں تھا کہ میں اسے اٹھا سکتا۔

دو باوردی سپاہی لپک کر میری طرف آئے۔ دونوں کے ہاتھوں میں آٹومیٹک رائفلیں تھیں۔ لیکن وہ اتنے چوکس نہیں تھے یا پھر یہ کہ ان کی خود اعتمادی ضرورت سے زیادہ تھی۔ انہوں نے میرے قریب آنے کی غلطی کی۔ میں نے اچانک جھک کر ایک شخص کے پیٹ... میں خنجر کا بے رحم وار کیا۔ دوسرے نے بدحواسی میں مجھ پر فائر کھولا۔ میں خود کو زمین پر گرا چکا تھا۔ اس کی چلائی ہوئی گولیاں اس کے ساتھی کے گھٹنوں میں لگیں۔ جب تک وہ رائفل کا رخ پھیرتا میری ٹانگ کی مہلک ضرب اس کی گردن توڑ چکی تھی۔ وہ لہراتا ہوا میرے اوپر گرا اور جیسے اپنی رائفل خود میرے سپرد کر دی۔ خنجر سے زخمی ہونے والے کے ہاتھ سے رائفل نکل چکی تھی۔ وہ پہلو کے بل کچی زمین پر گرا ہوا تھا۔ اس کی سبز قمیص پر ایک بڑا ''کٹ'' آ چکا تھا اور اس ''کٹ'' کے اندر سے اس کے اندرونی اعضا لٹک رہے تھے۔ جب زندگی اور موت ٹکراتی ہیں تو پھر ایسے ہی لرزہ خیز مناظر دیکھنے میں آتے ہیں۔ اس بری حالت میں بھی اس نے کچھ کارکردگی

دکھائی اور اپنے گلے میں جھولتی ہوئی سیٹی بجادی۔
یہ سیٹی رائگاں نہیں گئی۔ یکا یک اردگرد ہلچل نظر آئی۔ ایک دو سرچ لائٹس بھی چمک اٹھیں۔ تب میرے کانوں سے وہ پُرخطر آواز ٹکرائی جس کا اندیشہ تھا۔ یہ رکھوالی کے کتوں کی آوازیں تھیں۔ وہ تیر کی طرح میری ہی طرف لپک رہے تھے۔ ابھی وہ کافی فاصلے پر تھے مگر آوازوں سے پتا چلتا تھا کہ وہ پانچ دس سیکنڈ کے اندر میرے سر پر ہوں گے۔ ان کی تعداد کم از کم دو تو تھی، ان کے آگے لگ کر بھاگنا تو بیکار تھا۔ میرا زخمی جسم اور ٹخنا مجھے اس بات کی ہرگز اجازت نہیں دیتا تھا کہ تیز بھاگوں۔ میں نے وہیں رکنے اور انتظار کرنے کا فیصلہ کیا۔ ہلاک ہونے والے گارڈ کی رائفل اب میرے ہاتھ میں تھی۔ اس کی رسٹ واچ میرے ٹراؤزر کی جیب میں منتقل ہو چکی تھی۔ زخمی کی رائفل کا میگزین بھی میں نے اتار کر اپنے ٹراؤزر کے نیفے میں اڑس لیا۔ میری نگاہیں سامنے جمی ہوئی تھیں اور پھر مجھے پہلا مشتعل کتا دکھائی دیا۔ وہ ایک ''سلوکی ہاؤنڈ'' تھا۔ اس کا دبلا پتلا لیکن مہلک ہیولا بلا کی رفتار سے میری طرف بڑھ رہا تھا۔ اس کے پیچھے ایک اور تھا اور اس کے پیچھے بھی ایک دو مزید تھے شاید۔ میں نے رائفل مردہ گارڈ کے فربہ جسم پر رکھ کر شست باندھ لی۔ آخر وقت تک انتظار کیا اور جب سلوکی ہاؤنڈ صحیح نشانے پر آیا تو ٹریگر دبا دیا۔ اکلوتے ہاتھ سے ایسی طاقتور رائفل کو کنٹرول کرنا آسان نہیں تھا مگر کامیابی ہوئی۔ پانچ گولیوں کا مختصر برسٹ ہراول کتے کے سر کے چیتھڑے اڑا گیا۔ دوسرے برسٹ نے دوسرے کتے کو چاٹ لیا۔ لیکن تیسرا میرے اوپر آپڑا۔ اس کی بدبودار قاتل تھوتھنی میری گردن کی طرف بڑھی، مگر رائفل کے بیرل کی طوفانی ضرب سے میں نے اسے دور پھینک دیا۔ اسی دوران میں مجھے چوتھے کتے کو شوٹ کرنے کا موقع مل گیا۔ ضرب کھانے والا مجھ پر دوبارہ نہیں جھپٹا۔ کچھ فاصلے پر چکرانے لگا اور اپنی آواز سے میرے کانوں کے پردے پھاڑنے لگا۔ میں اٹھ کر دوڑا۔ ٹخنا گرم ہو کر کچھ رواں ہو گیا تھا مگر لنگڑاہٹ باقی تھی۔ کتا میرے ساتھ ساتھ دوڑنے لگا۔ جیسے اپنے مالکوں کے پہنچنے تک مجھے گھیر کر رکھنا چاہتا ہو۔ میری رائفل سے نکلنے والے سنگل شاٹ نے اسے بھی لوٹ پوٹ ہونے پر مجبور کیا۔ تب تک مجھے درجن بھر ٹارچوں کی روشنیاں نظر آنے لگی تھیں۔
اب مسئلہ گمبھیر تھا۔ میں تقریباً کھلی جگہ پر تھا۔ صرف ایک گرے ہوئے درخت کا تنا تھا جس کا قطر بمشکل ڈھائی فٹ ہو گا۔ اس تنے کی آڑ مجھے زیادہ دیر حملے سے محفوظ نہیں رکھ سکتی تھی۔ دائیں طرف ناریل اور کیلے کے درختوں کے پاس ایک بڑا سا اسٹائلش بورڈ نظر آرہا تھا، اس پر ''آشیانے'' کا لفظ انگلش حروف میں لکھا تھا۔ پروپرائٹر کے طور پر حلمی کا نام تھا۔ (یہ ساری جگہ ہی آشیانوں کی طرز پر بنائی گئی تھی اور ماضی میں عیاشیوں کے لیے استعمال ہوتی تھی، لیکن اب یہاں غالباً حلمی اور آقا جان کے ذاتی دشمنوں کی ''مہمان نوازی'' ہوتی تھی) مجھے ہوا کے دوش پر للکارتی ہوئی آواز سنائی دی۔ کسی غیر ملکی نے انگلش میں کہا۔
''وہاں ڈھلوان پر ہے...... جانے نہ پائے۔''
ایک دوسری آواز نے ہندی لہجے کی اردو میں پکارا۔ ''زندہ پکڑنا ہے۔ بھاگے تو ٹانگوں پر گولی مارو۔''
پہلی آواز نے پھر کچھ کہا لیکن الفاظ سمجھ میں نہیں آئے۔ میں جانتا تھا، میرے پاس ایمونیشن زیادہ نہیں ہے۔ میں نے رائفل کو سنگل شاٹ پر سیٹ کر لیا۔ ایک ٹارچ کا نشانہ لے کر میں نے سیدھا فائر کیا۔ دھماکے کے ساتھ ہی شعلہ لپکا اور ٹارچ اوجھل ہو گئی۔ جواب میں آٹھ دس فائر ہوئے۔ ان میں سے کچھ تو ہوائی تھے اور دو تین گولیاں درخت کے تنے سے ٹکرائیں۔
میں نے پھر دو فائر کیے۔ مقصد یہی تھا کہ یہ لوگ میرے قریب آنے سے گھبرائیں۔ میرے دماغ میں چنگاریاں سی چھوٹ رہی تھیں لیکن یہ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کروں۔ اندھا دھند بھاگ اٹھنا میرے بس میں نہیں تھا۔ اکلوتا ہاتھ رائفل کو ٹھیک سے سنبھال نہیں پا رہا تھا مگر دماغ میں بھڑکنے والی چنگاریوں نے توانائی میں خاطر خواہ اضافہ کر دیا تھا۔
قریباً دو منٹ تک یہ چاند ماری جاری رہی۔ اس دوران میں پاس ہی آوارہ گھومتے ہوئے ایک خچر کو گولی لگی اور وہ کربناک آواز میں چلا کر گر گیا۔ گارڈ لحظہ بہ لحظہ قریب آتے جا رہے تھے۔ پھر غیر ملکی لہجے میں انگلش بولنے والے نے صدا لگائی۔ ''تم بچ نہیں سکتے ہو۔ اسی جگہ مرنے سے بچنا چاہتے ہو تو خود کو حوالے کر دو۔''
میں نے اس کا جواب یوں دیا کہ آٹھ دس گولیوں کا لمبا برسٹ چلایا اور نشیب میں بھاگ کھڑا ہوا۔ یہ ساری ''ڈھلوان'' گھاس سے اٹی ہوئی تھی۔ ٹخنے پر دباؤ نہیں پڑ رہا تھا مگر جان بچانے کی فطری خواہش بھگائے لیے جا رہی تھی۔ ذہن میں یہ بات تھی کہ شاید آگے گھنے درختوں میں گھس کر بچنے کا کوئی موقع مل جائے۔
''ہالٹ...... رک جاؤ...... گولی ماردیں گے۔'' دور

سے ایک للکارتی ہوئی آواز نے پیچھا کیا۔

بھاگتے بھاگتے میری پنڈلی میں ایک ناقابلِ برداشت ٹیس اٹھی۔ یہی لگا کہ پگھلا ہوا سیسہ ٹانگ میں اتر گیا ہے لیکن ایسا نہیں تھا۔ ٹخنا بے طرح مڑا تھا۔ میں چند میٹر ڈھلوان پر لڑھک کر کسی نرم چیز پر گرا۔ یہ دو گھوڑوں والی ایک چھکڑا نما گاڑی تھی۔ اس پر بھوسا لدا ہوا تھا۔ میرے گرتے ہی گاڑی نے ایک شدید جھٹکا کھایا۔ دونوں گھوڑے اچھلے۔ ہنہنائے اور تیزی سے بھاگنے لگے۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ اسے غیبی مدد کہوں یا کسی نئی مصیبت کا پیش خیمہ۔

زمین قدرے ڈھلوان تھی۔ گھوڑے سرپٹ دوڑتے جا رہے تھے۔ گاڑی بان انہیں روکنے کی کوشش میں تھا۔ وہ ملائی زبان میں چلّا رہا تھا۔ ”رک جاؤ...... حرام زادو رک جاؤ۔“

مگر ”حرام زادے“ کچھ بھی سننے کے موڈ میں نہیں تھے۔ گاڑی کئی کئی بالشت اچھل رہی تھی پھر میں نے گاڑی بان کو قلابازی کھا کر سرسبز ڈھلوان پر گرتے اور لڑھکتے دیکھا۔ اس کا یہ حال دیکھ کر میں نے خود کو پوری طاقت سے گاڑی کے چوبی جنگلے سے چمٹا لیا تھا۔ ایک ڈیڑھ منٹ کے اندر ہی اردگرد کا منظر تبدیل ہو گیا۔ تاروں کی چھاؤں میں اب ٹیلوں کے بجائے قدرے ہموار زمین نظر آ رہی تھی۔ درخت بھی یہاں کم تھے، ہاں سبزہ ہر جگہ ایک سا ہی تھا۔ مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ اب گاڑی کسی بھی وقت الٹ جائے گی یا پھر سرپٹ بھاگتے ہوئے گھوڑے اپنا توازن برقرار نہیں رکھ پائیں گے۔

میں نے عقب میں دیکھا۔ کسی ٹارچ کی روشنی یا کوئی اور لائٹ دکھائی نہیں دی۔ تاہم اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ کوئی پیچھے نہیں آ رہا۔ وہ لوگ یقیناً آ رہے تھے مگر درمیانی فاصلہ بہت زیادہ تھا۔ ایک دم دل اچھل کر رہ گیا۔ سامنے ایک پل نظر آ رہا تھا مگر چوڑائی ہرگز اتنی نہیں تھی کہ یہ دو گھوڑوں والی گاڑی اس پر سے گزر سکتی۔ گھوڑے تیر کی طرح پل کی طرف بھاگے جا رہے تھے۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ سوچتا یا کرتا ایک زوردار دھماکے کے ساتھ گھوڑا گاڑی پل سے ٹکرائی۔ مجھے جیسے کسی عفریت نے اپنے نہایت طاقتور ہاتھوں سے ہوا میں اچھال دیا۔ مجھے کچھ پتا نہیں کہ میں کتنی دیر ہوا میں رہا اور پھر قلابازی کھا کر ایک زوردار چھپاکے سے نیم سرد پانی میں گرا۔ پانی میں گرنے کے بعد پہلا احساس یہی تھا کہ میں اتنے تیز رفتار حادثے کا شکار ہونے کے باوجود زخمی ہونے سے محفوظ رہا ہوں...... یا یوں کہہ لیا جائے کہ مزید زخمی ہونے سے محفوظ رہا ہوں۔

ڈبکی کھا کر سطحِ آب پر آنے کے بعد میں نے اوپر بلندی کی طرف دیکھا۔ پل کم و بیش تیس فٹ کی اونچائی پر تھا۔ گاڑی کا ایک پہیا میرے قریب ہی پانی میں تیر رہا تھا، باقی گاڑی پل میں پھنسی ہوئی تھی اور اسے نامعلوم وجہ سے آگ لگ چکی تھی۔ اس آگ کا سبب کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ تصادم سے پیدا ہونے والی چنگاریاں یا پھر گاڑی سے جھولتا ہوا کوئی آئل لیمپ وغیرہ۔ بہرحال بھوسے میں سے شعلے نکل رہے تھے اور پوری گاڑی کو لپیٹ میں لے رہے تھے۔ گھوڑوں کا کچھ پتا نہیں تھا۔

تیراکی میں میری مہارت کام آئی۔ میں ایک ہاتھ سے تیرتا ہوا کنارے تک پہنچا۔ یہ آبی گزرگاہ ایک ندی کی طرح تھی اور دونوں طرف کے کنارے کافی اونچے تھے۔ خوش قسمتی سے میں ایسی جگہ گرا تھا جہاں سے نکلنا زیادہ مشکل ثابت نہیں ہوا۔ ہموار زمین پر پہنچتے ہی میں نے مڑ کر دیکھا، دور فاصلے پر وہ روشنیاں نظر آنا شروع ہو گئی تھیں جو میرے تعاقب میں تھیں۔ مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ اس سخت ناہموار زمین پر یا تو ہیوی ڈیوٹی جیپیں چلتی ہوں گی یا پھر گھوڑے وغیرہ۔ جو روشنیاں مجھے دکھائی دے رہی تھیں وہ گاڑیوں کی تو نہیں تھیں۔ یہ پیدل افراد ہو سکتے تھے یا گھڑسوار...... روشنیاں ٹارچوں اور سرچ لائٹس کی تھیں۔

ایک گھوڑا جو حادثے کے وقت گھوڑا گاڑی سے علیحدہ ہو گیا تھا پل کے بیچوں بیچ ساکت کھڑا تھا، جیسے حیران ہو کہ یہ سب کیا ہوا ہے؟ جلتی ہوئی گھوڑا گاڑی نے پل کو بلاک کر رکھا تھا۔ اپنی رائفل کا خیال آیا تو پتا چلا کہ وہ اب میرے پاس نہیں ہے۔ حادثے کے دوران میں نجانے وہ کب مجھ سے جدا ہو گئی تھی۔ کاٹرائے کے ٹراؤزر میں اڑسا ہوا میگزین بھی کہیں پانی میں بہہ گیا تھا۔ میرے پاؤں ننگے تھے اور بھیگا ہوا بالائی جسم بھی عریاں تھا۔ اپنی شدید جسمانی تکلیف کی پروا کیے بغیر میں نے دوڑنا شروع کر دیا۔ میں جانتا کہ میرا دوڑنا کتنا ضروری ہے۔ مجھے جلد از جلد کسی ذمے دار شخص تک پہنچنا تھا اور اسے بتانا تھا کہ اگلے آدھ پون گھنٹے میں یہاں کیا ہونے جا رہا ہے۔ ایک بہت بڑی سازش تھی جو ڈی پیلس کے لیے شکست اور تباہی کا پیغام لے کر آ رہی تھی، اس کے ساتھ ساتھ بے شمار عام لوگوں کی زندگیاں بھی داؤ پر لگنے والی تھیں۔ جو کچھ جاناں نے مجھے اپنے آخری لمحوں میں بتایا تھا وہ کسی بھی صورت نظرانداز نہیں کیا جا سکتا

تھا۔ وہ ایک مرتی ہوئی لڑکی کی باتیں تھیں، وہ جو کہہ رہی تھی اپنے علم کے مطابق سچ کہہ رہی تھی...... اور یہ بڑا ہولناک سچ تھا۔ آقا جان اپنے سارے بھید کھول کر اور ننگا ہو کر سامنے آ گیا تھا۔ وہ اور اس کے حواری ایمونیشن کے تین مرکزی گودام تباہ کر کے موجودہ لڑائی کا پورا نقشہ تبدیل کرنے والے تھے اور جن کے ساتھ یہ عظیم الشان دھوکا ہونے والا تھا۔ وہ یکسر بے خبر تھے۔ وہ اپنے زعم میں رائے زل پر ایک فیصلہ کن اٹیک کرنے جا رہے تھے۔

جاناں کے آخری جملے میرے کانوں میں گونجنے لگے...... ''آپ میری فکر چھوڑو شاہ زیب! مجھے کچھ نہیں ہو گا۔ آپ کو کچھ اور فکر کرنا ہو گی۔ کچھ بہت بُرا ہونے جا رہا ہے۔ بہت زیادہ بُرا......''

پھر اس نے اٹکتی ہوئی سانسوں میں کہا تھا...... ''آج رات عزت مآب کی فورس، نیوسٹی پر زوردار حملہ کرنے جا رہی ہے لیکن یہ حملہ بری طرح ناکام ہو گا...... سب کچھ برباد ہو جائے گا...... ہو سکتا ہے کہ عزت مآب، ابراہیم، بیگم نورل اور قسطینا سب مارے جائیں۔''

میں نے کہا تھا۔ ''یہ تم کیا کہہ رہی ہو جاناں۔ ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟''

اس کے جواب کی بازگشت میری سماعت میں گونجنے لگی۔ ''گھر کا بھیدی ہی سب کچھ اجاڑ رہا ہے...... آقا جان بداخلاق اور ظالم ہی نہیں بہت بڑا غدار بھی ہے۔ ڈی پیلس والے اس پر اندھا اعتماد کرتے ہیں لیکن آج کی رات ان کے اعتماد کا خون ہو جائے گا۔ میں سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ چکی ہوں۔''

تو یہ ایک دیرینہ اعتماد کے خون کی رات تھی۔ مجھے لگا کہ میرے زخمی جسم اور زخمی کندھوں پر ایک نہایت گراں ذمّے داری ہے۔ مجھے کسی نہ کسی صورت یہ اطلاع بیگم نورل، عزت مآب، قسطینا یا ان کے کسی بھی وفادار تک پہنچانی ہے۔ میں سوچ رہا تھا، ہانپ رہا تھا اور اپنے زخمی جسم کے ساتھ ناہموار راستوں پر بھاگ رہا تھا۔ ٹخنا ہر قدم پر درد سے بھر جاتا تھا لیکن اب میں نے اس پر دھیان دینا چھوڑ دیا تھا۔ خون آلود پلاستر والے زخمی بازو کو میں نے دائیں ہاتھ سے سہارا دے رکھا تھا۔ یہ ویران جگہ تھی لیکن کافی دور فاصلے پر درختوں کے درمیان سے آبادی کی روشنیاں جھلکتی تھیں۔ یقیناً یہ شہر کی مضافاتی روشنیاں تھیں۔ درمیانی فاصلہ معلوم نہیں کتنا تھا...... دو کلومیٹر یا تین کلومیٹر...... یا اس سے بھی زیادہ۔

میرا دل چاہا، میں بھاگتے بھاگتے پکارنا شروع کر دوں...... کوئی ہے...... کوئی ہے......

لیکن اس پکار کا نتیجہ الٹا بھی نکل سکتا تھا۔ کوئی ایسا شخص یا اشخاص میری راہ میں آ سکتے تھے، جو مجھے درکار نہ ہوتے۔ مجھے اپنے تعاقب کی بھی مسلسل فکر تھی۔ وہ لوگ کسی بھی وقت مجھ تک پہنچ سکتے تھے۔ تاہم ابھی عقب میں دور تک ان کے آثار نہیں تھے۔

بھاگتے ہوئے میری نگاہ بار بار گھڑی کی سوئیوں کی طرف اٹھتی تھی۔ منٹوں کی سوئی بتدریج ایک کے ہندسے کی طرف بڑھ رہی تھی۔ اب وہ چھ کو کراس کر چکی تھی۔ مطلب یہ تھا کہ جاماجی میں قیامت برپا ہونے میں تیس منٹ سے زیادہ نہیں ہیں۔

ذہن میں کئی سوال ابھر رہے تھے...... کیا مجھے راستے میں کوئی ایسی سواری مل جائے گی جو جلد از جلد شہر کی حدود میں پہنچا سکے؟

کیا کوئی ایسا وفادار افسر یا اہم شخص مل جائے گا جسے میں حقیقتِ حال سے آگاہ کر سکوں؟

کیا میں اسی طرح زخمی ٹخنے کے ساتھ بھاگتے بھاگتے تھک کر گر تو نہیں جاؤں گا؟

مجھے یہ سب کچھ میراتھن ریس جیسا لگ رہا تھا۔ میراتھن ریس میں یونان کی ''جنگ میراتھن'' کا ایک زخمی سپاہی فتح کی خبر لے کر بھاگتا ہوا میدان جنگ سے ایتھنز کی طرف گیا تھا۔ میں بھی ایک خبر لے کر بھاگ رہا تھا لیکن یہ فتح کی خبر نہیں تھی۔ یہ ایک خطرناک سازش کی خبر تھی۔ یہ ایک ''وفادار'' کی بے وفائی اور غداری کی اطلاع تھی۔ اس کا بروقت پہنچنا ضروری تھا ورنہ بہت کچھ ختم ہو جانا تھا۔

میری پنڈلیاں شل ہونے لگیں، ہمت جواب دینے لگی۔ دل سے آواز آئی۔ ''شاہ زیب! تم نہیں پہنچ پاؤ گے۔ اسی ویرانے میں بھاگتے بھاگتے کسی کھائی میں گر و گے اور اٹھ نہ سکو گے۔ اچانک میں سرچ لائٹ میں نہا گیا۔ دائیں طرف ٹیلوں سے کسی نے پکار کر کہا۔ ''رک جاؤ، تم گن پوائنٹ پر ہو۔''

میں چند قدم بھاگ کر رک گیا۔ سینہ دھونکنی کی طرح چل رہا تھا۔ بالائی جسم پسینے سے شرابور تھا۔ تین باوردی سپاہی لپک کر میرے سامنے آ گئے۔ ان کی وردیاں سبز تھیں اور ان میں سے ایک سینئر نظر آتا تھا۔ میں نے اس سے انگلش میں کہا۔ ''میرا نام شاہ زیب ہے۔ میں ڈی پیلس کے مہمان خانے میں ٹھہرا ہوا ہوں۔ میرے پاس عزت مآب

کے لیے ایک بہت ہی اہم اطلاع ہے۔ پلیز...... مجھے جلد سے جلد کسی ذمے دار شخص تک یا پھر عزت مآب تک پہنچائیں۔''

''لیکن......تم کہاں سے آرہے ہو؟'' آرمی آفیسر نے اجنبی لہجے میں کہا۔ یقیناً وہ مجھے نام اور شکل سے نہیں پہچانتا تھا۔

میں نے کہا۔ ''دیکھو آفیسر! میرے پاس وقت نہیں ہے۔ بلکہ ہم میں سے کسی کے پاس بھی وقت نہیں ہے۔ پندرہ بیس منٹ کے اندر یہاں بہت کچھ ہوجائے گا۔ کیا تم موبائل فون پر کسی بڑے افسر سے میری بات کرا سکتے ہو۔ وہ یقیناً مجھے پہچان جائے گا۔''

''موبائل فون تو بند پڑے ہیں۔'' آفیسر نے جاناں کی اطلاع کی تصدیق کی۔

''کوئی وائرلیس سیٹ نہیں ہے تمہارے پاس؟''

''نہیں، اس وقت تو نہیں ہے۔'' آفیسر نے جواب دیا۔ تاہم اس کے تاثرات بتا رہے تھے کہ اس نے بھی معاملے کی اہمیت کو محسوس کرلیا ہے اور مجھے پوری سنجیدگی سے لے رہا ہے۔

میں نے کہا۔ ''آفیسر میرے پیچھے کچھ لوگ ہیں۔ وہ یہاں تک بھی پہنچ سکتے ہیں۔ مجھے یہاں سے نکلنا ہے۔''

اس نے چند لمحے تک بغور میرا جائزہ لیا پھر مجھے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کر کے درختوں کی طرف بڑھا۔ یہاں ایک فوجی جیپ موجود تھی۔ ان لوگوں نے مجھے جیپ پر سوار کیا اور حتی الامکان رفتار سے شہر کی طرف بڑھے۔ راستے میں وہ بار بار مجھ سے پوچھتے رہے کہ معاملہ کیا ہے؟ اور میری یہ درگت کیسے بنی ہے؟ لیکن میں ان کے سامنے زبان کھولنا نہیں چاہتا تھا۔ مجھے شکوک نے گھیرا ہوا تھا۔ ان تینوں میں سے بھی کوئی آقا جان کا وفادار ہوسکتا تھا۔

جیپ شہر میں داخل ہوئی اور آندھی کی رفتار سے ڈی پیلس کی طرف بڑھنے لگی۔ رات کے اس پہر بھی سڑکوں پر فوجی گاڑیوں کی غیر معمولی نقل و حرکت جاری تھی۔ تاریک آسمان پر کسی ہیلی کاپٹر کی پراسرار پھڑپھڑاہٹ بھی سنائی دے رہی تھی۔ ایک اسپتال کے باہر بے شمار خالی ایمبولینسز قطار میں کھڑی تھیں۔ میں نے اندازہ لگایا کہ یہ سب اسی فیصلہ کن حملے کی تیاریاں ہیں جو آج رات گرین فورس کی طرف سے گرے فورس پر کیا جانا ہے۔ ہم ڈی پیلس کے پہلو سے ہوتے ہوئے مین گیٹ کی طرف بڑھے۔ میں نے دیکھا کہ ڈی پیلس کے ایک مغربی گیٹ کو اینٹوں کی چنائی سے بند کیا جارہا ہے۔

ڈی پیلس کے بیرونی ناکے کے سامنے پہنچ کر جیپ کے بریک زور سے چرچرائے۔ شناخت کے لیے دو شاہی گارڈز جیپ کی طرف بڑھے، میں ان کے پہنچنے سے پہلے ہی نیچے اتر آیا۔ یہ لوگ مجھے پہچانتے تھے لیکن میرے ابتر حلیے نے انہیں بری طرح چونکایا۔

''سر! آپ یہاں اس حال میں؟'' ایک گارڈ کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

''مجھے فوراً ملنا ہے۔ عزت مآب، قسطینا صاحبہ یا کمانڈر افغانی......کوئی بھی ہو۔''

میری عجلت اور میرے حلیے نے گارڈز کو ٹھٹکا دیا تھا۔ ان کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ مجھے فوری طور پر اندر جانے دیں یا سوال جواب کریں۔

سینئر گارڈ نے ملائیشین لہجے کی انگلش میں کہا۔ ''جناب! آپ مناسب لباس میں نہیں ہیں۔ آپ گاڑی میں تشریف رکھیں۔ میں آپ کے لیے کپڑے فراہم کرتا ہوں۔''

میں نے تڑخ کر کہا۔ ''میرے کپڑوں کو چھوڑو۔ یہ موسٹ ارجنٹ معاملہ ہے۔ میں کسی بڑے افسر سے بات کرنا چاہتا ہوں......فوراً۔''

میں آگے بڑھا تو گارڈ میرے راستے میں حائل ہوا۔ میں نے اسے الٹے ہاتھ کا تھپڑ رسید کیا۔ گارڈز ہکا بکا رہ گئے۔ یہی وقت تھا جب کسی گاڑی کے بریک بلند آواز میں چرچرائے۔ میں نے مڑ کر دیکھا اور سناٹے میں رہ گیا۔ یہ آقا جان کی بلیک مرسیڈیز گاڑی تھی۔ کھڑکی میں سے آقا جان کا چہرہ نظر آرہا تھا۔ ٹیوب لائٹس کی روشنی میں اس کے تاثرات صاف نظر آرہے تھے۔ اس کی آنکھوں میں حیرت ہی حیرت تھی۔ میں سمجھ گیا کہ اب صورتِ حال خراب تر ہونے جارہی ہے۔ وہ تڑپ کر گاڑی میں سے نکلا اور سیدھا میری طرف آیا۔

ہماری آنکھیں چار ہوئیں۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا ورنہ وہ سیدھی گولی میرے ماتھے پر مارتا تاکہ میں ایک لفظ بولے بغیر راہی عدم ہوتا۔

وہ ششدر تھا کہ میں اس کے عقوبت خانے کے نہایت سخت حصار کو توڑ کر یہاں موجود تھا۔ موبائل سروس بند تھی ورنہ اب تک یقیناً اس کو خبر مل چکی ہوتی کہ میں ''آشیانوں'' سے فرار ہوچکا ہوں۔

''کیا ہو رہا ہے یہاں؟'' آقا جان غیظ و غضب کے

عالم میں چنگھاڑا اور بالکل میرے مقابل آن کھڑا ہوا۔

''میرے راستے سے ہٹو۔ میں اندر جانا چاہتا ہوں۔''

''مجھے بتاؤ، تم آ کہاں سے آئے ہو۔تمہارے حواس ٹھیک نہیں لگتے۔''

''تمہیں بھی پتا ہے کہ میرے حواس ٹھیک کیوں نہیں ہیں؟'' میں نے بھی نفرت سے جواب دیا۔

''اس کو سنبھالو۔'' آقا جان نے اپنی ناک کے بل کو کچھ اور موٹا کرتے ہوئے ذاتی گارڈز کو حکم دیا۔

اس سے پہلے کہ آقا جان کا فقرہ پوری طرح مکمل ہو پاتا۔ میرے دائیں ہاتھ کا طوفانی تھپڑ آقا جان کے گال پر پڑا۔ تھپڑ کی آواز اتنی زوردار تھی کہ دور تک گونجی۔ آقا جان کے نیم گنجے سر سے پی کیپ اچھل کر دور جا گری۔ وہ خود بھی لڑکھڑا کر دو قدم پیچھے چلا گیا۔ چند لمحوں کے لیے جیسے ہر کوئی سناٹے میں رہ گیا تھا۔ کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ جاما جی کے بااثر ترین شخص کے منہ پر اس طرح سرعام زنانے کا تھپڑ رسید کیا جائے گا۔ یہ تھپڑ، عزت و احترام اور مرعوبیت کے اس طویل سلسلے کا اختتام تھا جس نے لوگوں کی گردنیں آقا جان کے سامنے جھکا رکھی تھیں، وہ اس کی غیر مشروط اطاعت کرتے چلے جارہے تھے...... اور یہ تھپڑ آقا جان کے منہ پر ہی نہیں پڑا تھا اس پورے غدار ٹولے کے منہ پر پڑا تھا جس نے بڑی رازداری سے ایک بھیانک سازش کے تانے بانے بنے تھے۔

چند لمحوں بعد آقا جان کو اور اس کے اردگرد موجود لوگوں کو جیسے ہوش آیا۔ گارڈز شہد کی مکھیوں کی طرح مجھ سے چمٹ گئے۔ یہی وقت تھا جب میری نگاہ ڈی پیلس کے مین گیٹ کی طرف اٹھی۔ میں نے پروٹوکول کی گاڑیوں کے درمیان قسطینا کی بلٹ پروف لینڈ کروزر دیکھی۔ وہ خود بھی اس میں موجود تھی۔ وہ شاید اگلے مورچوں کی طرف جارہی تھی۔

میں نے اپنا رخ اس کی طرف پھیرا اور پھیپھڑوں کی پوری طاقت سے چلّایا۔ ''قسطینا...... قسطینا......'' خود کو چھڑانے کی کوشش میں، میں گرا اور میرے ساتھ کئی گارڈز گرے۔

میری آواز موٹر سائیکلوں کے ہوٹرز میں دب رہی تھی۔ میں نے ایک بار پھر قسطینا کو پکار کر اپنی طرف متوجہ کرنا چاہا مگر اس سے پہلے ہی آقا جان نے میرے ہونٹوں پر اپنی ہتھیلی مضبوطی سے جما دی۔ میرا باقی جسم گارڈز نے جکڑا ہوا تھا۔ آقا جان کے اکہرے جسم میں اتنی طاقت تو نہیں تھی لیکن ان لمحوں میں شاید اس کے اندر اضافی طاقت آگئی تھی۔ اس نے ایک ہاتھ سے میرے بال جکڑ رکھے تھے اور دوسرے سے منہ دبا رکھا تھا۔ مجھے شدید ترین بے بسی کا احساس ہوا۔ قسطینا اور اس کے پروٹوکول کی گاڑیاں مجھ سے پچیس تیس فٹ کی دوری سے گزر گئیں۔ جونہی یہ گاڑیاں نگاہوں سے اوجھل ہوئیں، آقا جان کے اشارے پر اس کے ایک تنومند ذاتی گارڈ نے رائفل کے آہنی کندے سے میرے سر پر دو بھرپور ضربیں لگائیں، میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ پہلی ضرب عین کنپٹی پر لگی تھی۔ (نیم بے ہوشی کی کیفیت میں بھی اس ضرب کی اذیت محسوس ہورہی تھی)

یہ ویسی ہی عارضی بے ہوشی تھی جو Ring میں بھی فائٹرز پر طاری ہوجاتی ہے۔ خاص طور سے باکسرز پر۔ مجھے احساس ہورہا تھا کہ کچھ لوگ مجھے بے رحمی سے گھسیٹ کر کسی گاڑی وغیرہ میں ڈال رہے ہیں۔ دور افتادہ آوازیں بھی کانوں تک پہنچ رہی تھیں۔ پھر دماغ پر چھایا ہوا اندھیرا چھٹنا شروع ہوگیا۔ گاڑی تیز رفتاری سے جارہی تھی لیکن ابھی شہر کے اندر ہی تھی۔ لگتا تھا کہ ڈی پیلس سے زیادہ دور نہیں گئی۔ مجھے اندازہ ہوا کہ میں گاڑی کے فرش پر اوندھا پڑا ہوں۔ میرے ہاتھ پشت پر کسی چیز سے جکڑے ہوئے ہیں اور میری پشت پر کئی ایک فوجی بوٹ ہیں۔ گاڑی میں بیٹھے ہوئے سپاہیوں نے مجھے پاؤں تلے دبا رکھا تھا۔ یقیناً یہ آقا جان کے وفادار جتھے کے افراد تھے۔

کیا یہ لوگ مجھے پھر اسی منحوس جگہ لے جارہے ہیں جسے ''آشیانے'' کا نام دیا جاتا ہے؟ یا پھر کہیں آگے جا کر یہ لوگ مجھے شوٹ کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں؟ اچانک گاڑی رک گئی۔ گاڑی ایک شدید جھٹکے سے رکی تھی۔ جیسے اسے زبردستی روکا گیا ہو۔ پھر ایک ہنگامہ سا شروع ہوگیا۔ میری نگاہ بدستور دھندلائی ہوئی تھی۔ سر بے طرح چکرا رہا تھا۔ میں بس یہی دیکھ سکا کہ کچھ لوگ گاڑی میں موجود فوجیوں پر پل پڑے ہیں۔ میں نے دھندلائی نگاہوں سے انیق کی جھلک دیکھی۔ وہ ایک سپاہی کے سر پر رائفل کا دستہ رسید کررہا تھا پھر میں نے کرخت سنگھ کو دیکھا جو ایک دوسرے سپاہی سے لپٹا ہوا تھا۔ گاڑی میں للکارے گونج رہے تھے۔ ان للکاروں میں شاید کبڈی شاہ، سیف کی آواز بھی شامل تھی۔ مجھے احساس ہوا کہ اس بدترین وقت میں میرے دوست پہنچ گئے ہیں۔ دو تین گولیاں چلیں...... پھر ایک برسٹ فائر ہوا۔

چاہتوں کے دل فریب گداز میں پل پل رنگ بدلتی فسوں خیز کہانی...... ماں پر ہونے والے اندوہناک ظلم کا انتقام لینے پر تلا ہوا نوجوان اندر کی شرربار آگ میں جل رہا تھا۔ اسے حالات نے قہربار اور صف شکن بنا دیا تھا۔ ظلم کی چنگاریاں اس کے وجود میں ہولناک شعلوں کا روپ دھار چکی تھیں۔ وہ دشمنوں کو خاک و خون میں نہلا کر ساری رکاوٹوں کو روندتا جا رہا تھا پھر اس کی شناسائی ایک سیمیں بدن، غنچہ دہن، شیریں سخن دوشیزہ سے ہوئی اور کیوپڈ کا تیر چل گیا۔ عزت سے رسوائی اور پھر سرخ روئی کے اس روح فرسا سفر میں وقت اس کے ساتھ تھا۔

سنسنی اور تحیر میں لپٹی دل گداز داستان

بہت جلد

کے صفحات پر ملاحظہ کریں

میں نے کرخت سنگھ کو گرتے ہوئے دیکھا۔
دفعتاً ''ہالٹ ...... ہالٹ'' کی بہت سی آوازیں بلند ہوئیں۔
میرا ذہن اندھیرے اجالے کے بھنور میں تھا۔
نیم بے ہوشی کی کیفیت میں یہ احساس بھی ہوا کہ کچھ اور مسلح افراد یہاں پہنچ گئے ہیں اور انہوں نے اس شدید ہنگامے کو کنٹرول کر لیا ہے۔ تب میرے کانوں میں کمانڈر افغانی کی گونجدار آواز بھی پڑی۔ وہ کسی سے مخاطب ہو کر کہہ رہا تھا۔ ''سب اپنا اپنا ہتھیار نیچے رکھ دو۔ نہیں نہیں، تم بھی رکھ دو۔''
پھر اس نے شاید میرے ساتھیوں میں سے کسی کو مخاطب کیا تھا۔ ''اماری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا۔ تم لوگ جانوروں کے ماپق (مافق) آپس میں لڑ رہا ہے۔ اوپر سے لڑائی کا وقت امارے سر پر کھڑا ہے۔ کیا تم لوگ دیوانہ ہو گیا ہے؟''
کمانڈر افغانی کے کسی ساتھی کی آواز آئی۔ وہ افغانی سے کہہ رہا تھا۔ ''خاناں! یہ سردار بہت زخمی ہے۔ اس کو پورا اسپتال پہنچانا پڑے گا۔''
یہ فقرہ غالباً کرخت سنگھ کے بارے میں کہا گیا تھا۔
میری آنکھوں کے سامنے چنگاریاں سی اڑ رہی تھیں مگر اتنا ضرور تھا کہ اب میں اردگرد کے مناظر دیکھ سکتا تھا۔ میں گاڑی کے اندر ہی تھا۔ کمانڈر افغانی مجھ پر جھکا ہوا تھا۔ ''یہ سب کیا ہے برادر! تم ٹھیک تو ہونا؟'' اس نے میرے ہاتھ کھولتے ہوئے کہا۔
''مجھے چھوڑو افغانی صاحب، تم دوسروں کی فکر کرو۔ ہم سب پر بہت بڑا ظلم ہونے والا ہے...... اور یہ ظلم آقا جان کروا رہا ہے۔ ہمارے پاس ٹائم بہت کم ہے۔ میں آپ کو تفصیل نہیں بتا سکتا۔ اگلے چند منٹ کے اندر ہماری فورس کے تینوں بڑے ایمونیشن ڈپوز میں دھماکے ہونے والے ہیں، سب برباد ہو جائے گا۔''
''خو، تم کیا بات کرتا ہے۔ تم کو کس نے بتایا ہے؟''
''افغانی صاحب! میں آپ کو پھر بتاتا ہوں، یہ سوال جواب کا وقت نہیں ہے۔ مجھے بتائیں، یہاں آپ کے پاس وائرلیس موجود ہے؟''
''ہاں، یہ سامنے میرا گاڑی کھڑا ہے۔ اس میں ہے وائرلیس۔''
''آپ ایک سیکنڈ ضائع کیے بغیر ان تینوں جگہوں پر رابطہ کریں۔ وہاں پر اس وقت جو انچارج ہیں، ان کو بتائیں کہ یہاں دھماکا خیز مواد ہے۔ وہ اسے فوراً ڈھونڈیں۔''
کمانڈر افغانی ایک پیدائشی جنگجو اور جہاندیدہ شخص تھا۔ میرے تاثرات نے اسے سمجھا دیا کہ معاملہ سنگین ہی نہیں سنگین تر ہے۔
میں نے دیکھا کہ آقا جان کے وہ وفادار گارڈز جنہوں نے مجھے دوبارہ اغوا کرنے کی ناکام کوشش کی تھی سڑک پر اوندھے لیٹے تھے اور کمانڈر افغانی کے لشکریوں نے ان پر رائفلیں تان رکھی تھیں۔
کمانڈر افغانی کا چہرہ دھواں ہو گیا تھا۔ اس نے مجھ سے دو تین مختصر سوال مزید پوچھے اور پھر وائرلیس کرنے کے لیے اپنی ہائی ایکس گاڑی کی طرف لپکا۔ میرے جسم پر جیسے زخموں اور چوٹوں کی بہار آئی ہوئی تھی۔ اس بہار میں ایک شگوفہ اور کھلا تھا۔ یہ میری کنپٹی کی وہ مہلک چوٹ تھی جس نے مجھے تین چار منٹ کے لیے قرب وجوار سے بیگانہ کر ڈالا تھا۔
انیق نے مجھے سہارا دے کر بٹھایا۔ پانی پلایا۔ سیف بھی میرے بارے میں بے حد فکرمند دکھائی دے رہا تھا۔
میں نے پوچھا۔ ''کرخت سنگھ کو کیا ہوا ہے؟''
''ایک گولی لگی ہے جی پیٹ میں ...... اسپتال لے گئے ہیں۔ انشاء اللہ سنبھل جائے گا۔'' انیق بولا۔ اس کی آنکھوں میں سوال ہی سوال تھے۔ وہ جاننا چاہتا تھا کہ پچھلے تین دن میں کہاں اور کس حال میں رہا ہوں۔ ابھی میں نے اسلحہ گوداموں میں دھماکوں کی جو بات کہی تھی وہ بھی انیق اور سیف نے سنی تھی اور اس حوالے سے بھی وہ شدید الجھن اور پریشانی میں تھے۔
''کیا ٹائم ہوا ہے؟'' میں نے پوچھا۔
''ایک بجنے میں دس منٹ ہیں۔'' انیق نے میری ہی رسٹ واچ دیکھ کر جواب دیا۔
''اوگاڈ ...... بہت تھوڑا وقت ہے ...... شاید ہی یہ لوگ ''پلانٹڈ مواد'' ڈھونڈنے میں کامیاب ہو سکیں۔''
اگلے آٹھ دس منٹ بے حد اضطراب انگیز تھے۔ کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ مجھے پتا چلا کہ کمانڈر افغانی مسلسل وائرلیس پر مصروف ہے، اس نے ہر بائی نس قسطینا سے بھی رابطہ کر لیا ہے۔ وہ دونوں متعلقہ لوگوں کو مسلسل ہدایات دے رہے ہیں۔ زمین پر لیٹے ہوئے گارڈز کے ہاتھ پشت پر باندھ دیے گئے تھے اور مسلح رضاکاروں نے انہیں ایک بند گاڑی میں ڈال دیا تھا۔ بہت سے ہتھیار بند لشکری میرے گرد بھی حفاظتی گھیرا ڈالے کھڑے تھے۔ آخر وہ وقت آیا جب گھڑی

کی سوئیوں نے ایک بجے شب کا وقت بتایا۔ سیکنڈوں کی سوئی آگے کو سرکتی رہی۔ اس نے ایک چکر مکمل کیا، پھر دوسرا پھر تیسرے چکر میں داخل ہوگئی۔ اب امکان پیدا ہو رہا تھا کہ شاید کمانڈر افغانی حالات کو سنبھالنے میں کامیاب ہوگیا ہے۔ اسلحہ گوداموں کے اندر دھماکا خیز مواد کی نشاندہی ہوگئی ہے...... ایک دوسرا امکان یہ بھی ذہن میں آ رہا تھا کہ شاید...... شاید جاناں تک جو معلومات پہنچیں، وہ درست نہ ہوں یا ان کی ٹائمنگ کے حوالے سے کوئی کمی بیشی ہو۔ لیکن پھر...... سیکنڈوں کی سوئی کا تیسرا چکر مکمل نہیں ہوسکا۔ شہر کے کنٹونمنٹ ایریا کی طرف سے ایک دھماکا سنائی دیا اور یہ ایسا دھماکا تھا جو محاورتاً نہیں حقیقتاً کانوں کے پردے پھاڑ سکتا تھا۔ یوں لگا جیسے پورا جزیرہ بارود سے اڑ گیا ہے۔ میں نے گاڑی کی کھڑکی میں سے ایک ہیبت ناک شعلہ آسمان کی طرف اٹھتے دیکھا۔

اردگرد موجود لشکری جیسے چلّا اٹھے تھے۔ انیق میرے بالکل قریب بیٹھا تھا، وہ پکارتا جا رہا تھا۔ ''او مائی گاڈ...... او مائی گاڈ۔''

شبہے کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ جاناں کی معلومات بالکل درُست تھیں۔ ایک ایمونیشن ڈپو تباہ ہوچکا تھا۔

ابھی ہم اس دھماکے سے سنبھل بھی نہ پائے تھے کہ دوسرا فلک شگاف دھماکا ہوا۔ یہ شہر کے مغربی مضافات میں کہیں ہوا تھا۔ اس دھماکے کی آواز ہم تک بعد میں پہنچی، پہلے وہ خیرہ کن چمک پہنچی جو اس بہت بڑے بلاسٹ کا نتیجہ تھی۔ تب سماعت شکن آواز کانوں سے ٹکرائی اور زمین دہل گئی۔

میں بے قرار ہوکر گاڑی سے باہر نکل آیا۔ میں نے دیکھا کمانڈر افغانی اپنی ہائی ایکس گاڑی کے اندر، اپنا سر دونوں ہاتھوں میں پکڑے بیٹھا ہے۔ اس کے اردگرد موجود بڑے بڑے پگڑوں والے لشکری بھی سکتہ زدہ کھڑے تھے۔ ''یہ کیا ہوگیا جی؟'' انیق نے سراسیمہ لہجے میں مجھ سے پوچھا۔

ہم کمانڈر افغانی کے قریب پہنچے۔ اس کا چہرہ مسمار کھنڈر کا نمونہ پیش کر رہا تھا، آنکھیں سرخ تھیں، اس کے قریب رکھے وائرلیس سیٹ سے مسلسل ایک پکارتی ہوئی آواز آ رہی تھی۔ کمانڈر افغانی کا کوئی ماتحت دردناک آواز میں کہہ رہا تھا۔ ''دونوں ڈپو تباہ ہوگئے ہیں جناب...... اوور۔''

چند سیکنڈ بعد وہ پھر بولا۔ ''دونوں ڈپو تباہ ہوگئے جناب...... ہر طرف آگ لگی ہوئی ہے۔ چھوٹے دھماکے بھی ہو رہے ہیں...... اوور۔''

افغانی اس کال کا کوئی جواب نہیں دے رہا تھا شاید وہ دینے کے قابل ہی نہیں تھا۔ اس کا دماغ کہیں اور تھا...... مجھے بھی پتا تھا کہ اس کا دماغ کہاں ہے یقیناً دوسروں کی طرح اس کی ''سماعت'' بھی ایک تیسرے دھماکے کے خوف سے سہمی ہوئی تھی۔

میں نے دیکھا کنٹونمنٹ ایریا کی طرف شعلے آسمان سے باتیں کر رہے ہیں، ان کی سرخی رات کی تاریکی پر حاوی ہوتی چلی جا رہی تھی۔ تباہ ہونے والا دوسرا ڈپو کچھ فاصلے پر تھا، مگر وہاں کے شعلے بھی صاف دکھائی دیتے تھے۔

اور پھر تیسرا دھماکا ہوا۔ یہ دھماکا حیرت انگیز طور پر زیادہ شدید نہیں تھا، حالانکہ یہ بھی کنٹونمنٹ میں ہی ہوا تھا۔ اس کا مقام کنٹونمنٹ کا شمالی حصہ تھا۔ یہاں بھی پھنکارتے ہوئے شعلوں اور دھوئیں کے بادلوں کی ''رونمائی'' ہوئی۔ اب پورے شہر میں خطرے کے سائرن گونج رہے تھے۔ فضا میں ہیلی کاپٹر چکراتے نظر آئے اور سڑکوں پر ایمبولینسز اور فائر فائٹرز کی گاڑیاں شور مچانے لگیں۔

اسی دوران میں کمانڈر افغانی کا سکتہ ٹوٹ گیا۔ وائرلیس پر اس سے قسطینا نے رابطہ کیا۔ وہ اگلے مورچوں سے بول رہی تھی۔ اس کی لرزتی کانپتی آواز وائرلیس سیٹ پر ابھری۔ ''ہیلو افغانی...... قسطینا اسپیکنگ...... ہیلو افغانی...... یہ سب کیا ہوا ہے...... اوور۔''

افغانی نے ملائی زبان میں جواب دیا۔ ''یہ گہری سازش ہے قسطینا بی بی، شاہ زیب یہاں موجود ہے آپ بات کریں، اوور۔''

میں نے وائرلیس پر آکر کہا۔ ''یور ہائی نس! میرے پاس مکمل ثبوت ہیں۔ یہ سب کچھ آقا جان کا کیا ہوا ہے۔ وہ غدار ہے۔ وہ جہاں کہیں بھی ہے، آپ اسے فوراً گرفتار کریں۔ اوور۔''

''شاہ زائب! تم یہ کیسی بات کہہ رہے ہو، انکل کے بارے میں اس طرح کی زبان استعمال نہ کرو۔ یہ تو......''

''پلیز یور ہائی نس!'' میں نے بڑی درشتی سے اس کی بات کاٹی۔ ''آپ یہ کیا کہہ رہی ہیں۔ کیا آپ سب لوگوں نے اپنی آنکھیں اور کان بالکل بند کرلیے ہیں۔ ایک بندہ آپ کو برباد کر رہا ہے۔ آپ کی آنکھوں کے سامنے آپ کے گلے پر چھری چلا رہا ہے اور آپ اس پر اپنا اعتماد اور اپنی محبتیں نچھاور کر رہی ہیں، ٹھیک ہے تو پھر کرتی رہیں محبتیں

نچھاور۔ کافی کچھ آپ نے دیکھ لیا ہے اور بہت کچھ ابھی تھوڑی دیر میں دیکھ لیں گی۔ وہ خبیث شاید آج رات ہی رائے زل کے کندھے سے کندھا ملا کر کھڑا نظر آئے گا۔ آج رات ہی......'' میں نے اپنے الفاظ دہرائے۔ میری آواز غصے سے چیخ رہی تھی۔

''آقا جان ہیں کہاں؟ اوور۔'' قسطینا نے پوچھا۔

''آپ سپریم کمانڈر ہیں۔ یہ آپ کو پتا ہونا چاہیے۔ مجھے یقین ہے، اگر آپ نے اگلے چند منٹ میں اس غدار کو گرفتار نہ کر لیا تو وہ آپ کو نظر نہیں آئے گا اور میں آپ کو یہ بھی بتا رہا ہوں، تھوڑی دیر کے اندر ہی رائے زل کی فورس ''کنٹرول لائن'' پار کرنے والی ہے...... اور یہ جو کچھ ہو رہا ہے...... آپ کے اسی چہیتے...... بدبخت انکل کی وجہ سے ہو رہا ہے، اوور اینڈ آل۔'' میں نے رابطہ منقطع کر دیا۔ میرے سینے میں شعلے بھڑک رہے تھے۔

ڈی پیلس والے اندھے بہرے تھے کہ سب کچھ دیکھ کر بھی کچھ نہیں سمجھ رہے تھے؟ میں نے یہی سوال کمانڈر افغانی سے کیا۔

وہ بولا۔ ''تم ٹھیک کہہ رہا ہے برادر! اب تو اس بات میں کوئی گنجائش نہیں رہا کہ آقا جان وہ نہیں جو نظر آتا ہے، یہ دو چہرے والا بندہ ہے۔''

''اور یہ دو چہرے والا بندہ آپ سب کا بیڑا غرق کر چکا ہے۔ آپ کو کچھ کچھ تو سمجھ میں آ ہی گیا ہوگا کہ اب آپ کے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔ گرے فورس بس تھوڑی ہی دیر میں آپ لوگوں پر چڑھ دوڑنے والی ہے۔''

کمانڈر افغانی جیسے جنگجو کا چہرہ بھی زرد نظر آنے لگا تھا، وہ بولا۔ ''امارا خیال ہے کہ ام کو وہ بڑا پل اڑا دینا چاہیے جو ہوائی اڈے سے ڈی پیلس کی طرف آتا ہے۔''

''اڑا نہیں دینا چاہیے اڑا دو...... ابھی اڑا دو۔'' میں نے تقریباً چلاتے ہوئے کہا۔

ایک دوسرے وائرلیس سیٹ پر بھی کوئی پیغام آ رہا تھا۔ کمانڈر افغانی کا ایک ماتحت یہ پیغام سننے میں مصروف تھا۔ انیق بھی پاس ہی کھڑا تھا۔ اس نے آ کر مجھ سے کہا۔ ''شاہ زیب بھائی! ان بری خبروں کے درمیان ایک چھوٹی سی اچھی خبر بھی ہے۔ تیسرا ایمونیشن ڈپو مکمل طور پر تباہ ہونے سے بچ گیا ہے۔ آپ نے سنا ہی ہے۔ وہاں ہونے والا دھماکا زیادہ شدید نہیں تھا۔''

''کیا خبر آئی ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''بتایا جا رہا ہے کہ ڈپو کے صرف ایک بیرونی حصے میں دھماکا ہوا ہے۔ اندرونی حصوں سے دھماکا خیز مواد ہٹایا جا چکا تھا۔''

اگر یہ خبر درست تھی تو کسی حد تک امید افزا تھی۔ جاناں کی قربانی اور میری بھاگ دوڑ مکمل طور پر رائگاں نہیں گئی تھی۔ جو کچھ یہاں ہو چکا تھا اس کے مطابق تو اب ایک ایک گولی کی قدر و قیمت تھی۔ اگر تیسرے ڈپو کا بڑا حصہ بلاسٹ ہونے سے بچ گیا تھا تو پھر گرین فورس کو اپنا دفاع کرنے کے لیے کچھ نہ کچھ گولا بارود تو مہیا ہو ہی سکتا تھا۔

کمانڈر افغانی اپنے بکھرے بالوں کے ساتھ میری طرف آ رہا تھا۔ ''قسطینا صاحبہ سے رابطہ ہوا؟'' میں نے پوچھا۔

''وہ ادھر ہی آ رہا ہے۔'' کمانڈر افغانی نے جواب دیا۔

''پل اڑانے کا کیا بنا؟'' میں نے ذرا جھنجلا کر پوچھا۔

''امارے ایک دو دستے پل کی دوسری طرف ہے۔ قسطینا بی بی نے ان کو پورا پیچھے آنے کا آرڈر دیا ہے۔ اس کے بعد بلیک ہاک ہیلی کاپٹرز کے ذریعے پل پر بم گرائے جائیں گے۔''

شہر کے اردگرد تین جگہوں پر شعلے آسمان سے باتیں کر رہے تھے۔ افق بالکل سرخ نظر آ رہا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ ان خوفناک دھماکوں کے سبب پورے شہر کا درجۂ حرارت بڑھ گیا ہے۔ سردی میں کمی محسوس ہو رہی تھی۔ چھوٹے چھوٹے دھماکوں کی آواز اب بھی آ رہی تھی۔ پورے شہر میں ایمبولینسز اور فائر بریگیڈ کی گاڑیوں کے سائرن گونج رہے تھے۔ لیکن یہ تو ابتدا تھی۔ میں جانتا تھا کہ ابھی کچھ دیر میں شہر پر کیا قیامت ٹوٹنے والی ہے۔ گرین فورس کا بیشتر گولا بارود برباد ہو چکا تھا۔ رائے زل اور اس کی ماں ہانا وانی، ایجنسی کی مدد سے اپنا کاری وار کرنے میں کامیاب رہے تھے۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ انہوں نے یہ وار ایک غدار کی مدد سے کیا تھا تو بالکل غلط نہ ہوگا۔ غیر ملکی آقا اور قابضین ہمیشہ ''مقامی غداروں'' سے مل کر ہی کاری وار کرتے ہیں...... تاریخ اس امر کی گواہ ہے۔ گرین فورس کے چھوٹے چھوٹے کانوائے سڑک پر سے گزر رہے تھے۔ وہ ابھی عزت مآب، جاماجی اور قسطینا کے نام کے پُرجوش نعرے لگا رہے تھے۔ انہیں ٹھیک سے معلوم نہیں تھا کہ لڑائی شروع ہونے سے پہلے ہی انہیں ناقابلِ تلافی نقصان پہنچایا جا چکا ہے۔ اب ان کا سامنا ''بڑے کڑے وقت'' سے ہونے

والا ہے۔

ہیوی بائیکس کے ہوٹر سنائی دیے اور پروٹوکول کی سبز گاڑیاں نظر آئیں۔ پتا چلا کہ قسطینا پہنچ گئی ہے۔ وہ بڑی تیزی کے ساتھ اپنی گاڑی سے اتری۔ وہ مکمل وردی میں تھی...... لیکن افغانی کی طرح اس کا رنگ بھی اڑا ہوا تھا۔

وہ حیرت سے میرے ابتر حلیے کو دیکھنے لگی پھر جلدی سے مجھے اپنی بلٹ پروف گاڑی کے اندر لے گئی بولی۔ ''شاہ زائب! پوچھنے والے سوال تو بہت سے ہیں۔ لیکن مجھے بتاؤ کہ انکل کے خلاف تمہارے پاس کوئی ثبوت ہے؟''

میں نے اپنے طیش کو سنبھالتے ہوئے کہا۔ ''قسطینا ایک نہیں ''ایک سو ایک'' ثبوت ہیں، لیکن یہ وقت ثبوتوں کا نہیں۔ آپ فوراً آقا جان کو گرفتار کریں۔''

''ان کا کہیں پتا نہیں چل رہا۔''

''تو پھر ثبوتوں کی جان کو کیوں رو رہی ہیں۔ اس نمک حرام کو پتا چل گیا ہوگا کہ اس کا پول کھل گیا ہے۔ وہ اپنے وفادار جتھے کے ساتھ غائب ہو گیا ہوگا۔ اب وہ لڑائی کے دوران میں ہی سامنے آئے گا اور میں آپ کو گارنٹی دیتا ہوں۔ وہ گرین فورس کی گاڑی پر نہیں گرے فورس کی گاڑی پر سوار ہوگا...... اب یہ ساری بیکار کی باتیں ہیں قسطینا! اب اس کام پر توجہ فرمائیں جو آپ کر سکتی ہیں ورنہ بڑے افسوس سے کہتا ہوں، آپ لوگوں کو پچھتانے کا موقع بھی نہیں ملے گا۔ کمانڈر افغانی نے پل اڑانے والی جو بات کہی ہے اس سے بہتر اور کوئی کام نہیں ہو سکتا۔ آپ فوراً اسے اڑانے کا حکم دیں۔ سو پچاس فوجی دوسری طرف رہ بھی جاتے ہیں تو کوئی بات نہیں۔'' میرا زخم زخم جسم اور میرے لہجے کی عجلت قسطینا پر اثر انداز ہو رہی تھی۔ ناگواری کے باوجود وہ میری گفتگو سننے اور اسے اہمیت دینے پر مجبور ہو رہی تھی۔

وہ ایک بار پھر وائرلیس سیٹ کی طرف متوجہ ہو گئی اور متعلقہ لوگوں کو احکامات دینے لگی۔ میری نگاہ قسطینا کی سہیلی ڈاکٹر ماریہ پر پڑی۔ وہ بھی قسطینا کے ساتھ ہی گاڑی پر یہاں پہنچی تھی اور اب میری طرف آ رہی تھی۔ اس کا لباس حسبِ معمول پینٹ شرٹ ہی تھا۔ پاؤں میں جوگرز تھے۔ وہ بے حد ذہین اور چست دکھائی دیتی تھی۔ اس نے پاس آ کر میری چوٹوں کو دیکھا اور شستہ انگلش میں پوچھا۔ ''مسٹر شاہ زیب! یہ سب کیسے ہوا ہے؟ ہم لوگ تین دن سے آپ کے لیے پریشان تھے اور میڈم لورین کو ناول سنانے والی لڑکی...... اسے بھی یہاں بہت ڈھونڈا گیا ہے۔ لگتا ہے کہ آپ دونوں اکٹھے ہی تھے اور آپ کو زبردستی یہاں سے لے جایا گیا تھا۔''

''تم درست کہہ رہی ہو ڈاکٹر ماریہ! لیکن اس وقت ایسے سوال جواب کی مہلت نہیں، ہمیں اور بہت کچھ کرنا ہے۔''

''مثلاً کیا؟'' وہ پریشان لہجے میں بولی۔

''مثلاً یہ کہ میرا یہ ٹخنا...... یہ درد سے پھٹا جا رہا ہے...... اور یہ بازو۔''

اس نے سوچتے ہوئے ٹخنے کو دھیان سے دیکھا۔ ''مسٹر شاہ زیب! مجھے لگتا ہے بہت بُری موچ ہے۔ ایکسرے کی ضرورت ہے۔''

''اس ''لاڈ پیار'' کا وقت نہیں ہے ڈاکٹر ماریہ! ہم سب اس وقت ایمرجنسی میں ہیں۔ آپ ''سن کرنے والا'' انجکشن دے دیں اور میرے اس بازو کو چھاتی کے ساتھ اس طرح باندھ دیں کہ یہ میری مومنٹ میں رکاوٹ نہ ڈالے۔''

''لیکن مسٹر شاہ زیب......''

''پلیز شٹ اپ...... پلیز۔'' میں نے جھنجلا کر اس کی بات کاٹی۔ ''اگر تم کر سکتی ہو تو وہ کرو جو میں کہہ رہا ہوں، ورنہ کوئی اور انتظام کرتا ہوں۔''

میرا لب و لہجہ دیکھ کر ڈاکٹر ماریہ کو مزید بولنے کا حوصلہ نہیں ہوا۔ وہ اپنا سر اثبات میں ہلا کر قسطینا کی بلٹ پروف لینڈ کروزر کی طرف گئی اور چند لمحے بعد ایک میڈیکل باکس لے کر میری طرف آ گئی۔ اس نے میرے ٹخنے پر سن کرنے والا انستھیٹک اسپرے کیا اور پھر زیادہ طاقت کا درد کش انجکشن دے دیا۔ میرے خون آلود پلاستر والے مفلوج بازو کو ایک لچکدار پٹی کے ذریعے میرے سینے سے باندھ دیا۔ وہ میری کنپٹی کے گومڑ پر آئس بیگ کی ٹکور کرنا چاہتی تھی لیکن میں نے منع کر دیا۔

اس دوران میں قسطینا وائرلیس سیٹ سے فارغ ہو کر میری طرف آ گئی۔ وہ جو عام حالات میں ایک خوبرو لڑکا دکھائی دیتی تھی۔ اب سرتاپا فوجی کمانڈر نظر آ رہی تھی۔ اس نے ہانپی ہوئی سی آواز میں کہا۔ ''تمہاری معلومات درست ہیں شاہ زائب! انٹیلی جنس کی اطلاعات بتا رہی ہیں کہ رائے زل کی فورس حرکت میں آ رہی ہے۔ وہ کنٹرول لائن عبور کرنے کے لیے پوری طرح تیار ہیں۔''

''آپ نے پل اڑانے کے آرڈر کیے؟''

''ہاں، پانچ منٹ کے اندر ہیلی کاپٹر فلائی کرنے

والے ہیں یا شاید اس سے بھی پہلے۔
قسطینا کی دوسری بات درست تھی۔ ابھی بمشکل دو تین منٹ ہی ہوئے تھے کہ ائرپورٹ کی طرف ہیلی کاپٹرز کی پروازیں نظر آئیں اور پھر زبردست چمک کے ساتھ دھماکے شروع ہو گئے۔ پل پر بمباری ہو رہی تھی۔
قسطینا نے اپنے سامنے جنگی نقشہ پھیلا لیا تھا۔ کمانڈر افغانی سمیت دو تین اور فوجی آفیسر اس پر جھکے ہوئے تھے۔ قسطینا ان لمحوں میں سرتاپا ایک سپہ سالار دکھائی دے رہی تھی۔ اس نے ایک جگہ اپنی انگلی رکھتے ہوئے کہا۔ ''یہ دوسرا پل قریباً چھ کلومیٹر کے فاصلے پر ہے لیکن اس پر اس طرح بمباری نہیں کی جا سکتی۔ پل کے دونوں سروں پر گنجان آبادی ہے۔''
''پہلے یہاں سے شہریوں کو نکالنا پڑے گا۔'' کمانڈر افغانی نے کہا۔
''مگر اتنی دیر میں رائے زل پل پر قبضہ کر لے گا۔ وہ اس پل کی جنگی اہمیت سے آگاہ ہے...... اور ائرپورٹ والے پل کی تباہی کے بعد تو یہ پل اور بھی اہم ہو گیا ہے۔'' قسطینا نے پُرسوچ لہجے میں کہا۔
ابھی وہ یہ بات کہہ ہی رہی تھی کہ وائرلیس پر سگنل آنے لگے۔ اس نے کال ریسیو کی۔ دوسری طرف قسطینا کا ایک گھبرایا ہوا میجر تھا۔ اس نے بتایا کہ گرے فورس نے کنٹرول لائن پار کر لی ہے اور تیزی سے ''کالے پل'' کی طرف بڑھ رہی ہے۔'' (اس دوسرے پل کو مقامی طور پر کالے پل کا نام دیا جاتا تھا)
یہ اطلاع ملتے ہی قسطینا اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ ''ہمیں اس پل کا دفاع کرنا ہوگا یا اسے گرانا ہوگا۔'' وہ پُرعزم لہجے میں بولی۔
''میں بھی آپ کے ساتھ جاؤں گا۔'' میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔
''تم زخمی ہو۔ کسی نے بہت برا حال کیا ہے تمہارا......''
''جس نے کیا ہے اس کا نام میں نے آپ کو بتایا ہے لیکن جو کچھ بھی ہے میں اس اہم ترین موقع پر پیچھے رہنا نہیں چاہتا اور نہ ہی میرے ساتھی رہیں گے۔ عزت مآب ہمیں یہاں لائے تھے تو کسی مقصد سے ہی لائے تھے۔''
قسطینا نے نظر بھر کر میری طرف دیکھا اور سمجھ گئی کہ یہ ویسی ہی صورتِ حال ہے جیسی کچھ دن پہلے سرنگ میں پیش آئی تھی اور میں اپنے فیصلے پر ڈٹ گیا تھا۔ وہ ایک گہری سانس لے کر اپنی ٹویوٹا لینڈ کروزر میں بیٹھ گئی۔ میں نے دوسری گاڑی کی طرف بڑھنا چاہا تو اس نے مجھے روکتے ہوئے کہا۔ ''اگر تم کو جانا ہی ہے شاہ زائب! تو میرے ساتھ آ جاؤ۔''
میں نے دیکھا۔ ''انیق اور سیف ایک دوسری فوجی گاڑی میں سوار ہو رہے تھے۔ میں نے کہا۔ ''نہیں یور ہائی نس۔ میں اپنے دوستوں کے ساتھ رہنا چاہوں گا۔''
میرے لہجے کی رکھائی اس رویے کا ردِعمل تھی جو قسطینا ابھی تک اپنے ''انکل آقا جان'' کے حوالے سے دکھا رہی تھی۔
اس روکھے پن کو محسوس کر کے اس نے ''اوکے'' کہا اور ڈاکٹر ماریہ وغیرہ کے ساتھ بلٹ پروف گاڑی میں سوار ہو گئی۔ سوار ہونے سے پہلے اس نے ایک واکی ٹاکی پر اپنے آفیسرز کو اطلاع دی کہ وہ کالے پل کی طرف آ رہی ہے۔ اس کے پہنچنے تک وہاں موجود لوگ ہر صورت میں پل کا دفاع کریں۔ کمانڈر افغانی کی ہائی ایکس سب سے آگے تھی۔ گاڑیوں کا یہ قافلہ برق رفتاری سے بلیک برج یعنی کالے پل کی طرف روانہ ہوا۔ ائرپورٹ والے پل پر ہونے والی بمباری اب ختم ہو چکی تھی اور اس جگہ سے بھی شعلے اور دھواں بلند ہو رہا تھا۔ ہم نے بے شمار پرائیویٹ گاڑیوں کو سڑکوں پر دیکھا، یہ لوگ جنگ کے بادلوں کو دیکھ کر مغربی ساحل کی طرف نکل رہے تھے۔ ہم ان کی مخالف سمت میں جنگ کے بادلوں کی طرف بڑھ رہے تھے۔ چند ہی ہفتے پہلے جب میں اور انیق کوٹلی سے آگے سردار سجاول کے ڈیرے پر تھے ہم نے سوچا بھی نہ تھا کہ اس قسم کے حالات کا سامنا کرنا پڑے گا۔ زیادہ سے زیادہ یہی خیال تھا کہ کوئی گینگ وار قسم کی صورتِ حال ہوگی لیکن یہاں تو کچھ اور ہی نقشے تھے، جزیرے کی حد تک باقاعدہ جنگ کی شکل نظر آ رہی تھی۔ بھاری اسلحہ، اینٹی ائرکرافٹ گنیں، مارٹر اور بوفر توپیں، راکٹ لانچرز...... یہاں تک کہ ہیلی کاپٹرز کے ذریعے بمباری بھی کی جا رہی تھی۔ میں اپنی دائیں جانب پرائیویٹ گاڑیوں کی طویل قطار دیکھ رہا تھا۔ گاڑیوں کی کھڑکیوں میں بچے سہمے دکھائی دیتے تھے، جیسے خاموشی کی زبان میں گرین فورس کے سپاہیوں سے پوچھ رہے ہوں۔ ''کیا تم ہم کو بچا پاؤ گے؟'' مردوں کے چہرے بجھے ہوئے تھے۔ بہت سی عورتیں دعائیہ انداز میں کچھ بڑبڑاتی نظر آتی تھیں۔ جاماجی میں اکثریت شریف النفس مسلمانوں کی تھی۔ اگر ان کا سربراہ (ریان فردوس) اچھا مسلمان اور

اچھا انسان نہیں تھا تو اس میں ان کا کیا قصور تھا۔ دوسری طرف نیوسٹی میں رائے زل توسرے سے خدا کو مانتا ہی نہیں تھا۔ اس کی والدہ نے بھی عیسائیت، بدھ مت اور عملیات کو ملا کر اپنا کوئی علیحدہ ہی شوشہ چھوڑا ہوا تھا اور اس سے بھی تشویشناک بات یہ تھی کہ یہ لوگ جارحیت پسند تھے۔ امریکنوں کے ساتھ مل کر جا ماجی والوں سے جینے کا حق چھین رہے تھے۔

ابھی ہم دوڈھائی کلومیٹر آگے ہی گئے تھے کہ قسطینا کی گاڑی رک گئی۔ اس کے عقب میں فوجی گاڑیاں بھی رک گئیں۔ فوجی گاڑیوں کے پیچھے قریباً درجن بھر گاڑیوں میں رضا کار یعنی لشکری بھی آرہے تھے۔ انہیں بھی ٹھہرنا پڑا۔

میں نے ڈیڑھ دومنٹ انتظار کیا پھر گاڑی سے اتر کر قسطینا کی گاڑی تک پہنچا۔ وہ کچھ پریشان نظر آرہی تھی۔ اس کا ماتحت وائرلیس پر کسی سے رابطہ کرنے کی کوشش کررہا تھا۔ میرے پوچھنے پر ڈاکٹر ماریہ نے بتایا۔ ''کمانڈر افغانی کے ایک ماتحت کی کال آئی ہے۔ اس نے کہا ہے کہ ابھی آگے نہ آئیں۔ آگے خطرہ ہے۔''

''کیسا خطرہ؟ ابھی تو ہم پل سے چارمیل دور ہیں۔'' میں نے کہا۔

''شاید کوئی گڑبڑ ہے۔''

میں نے دیکھا کچھ دور کمانڈر افغانی بھی اپنی ڈاڑھی میں انگلیاں چلارہا تھا اور وائرلیس پر بات کرنے کی کوشش کررہا تھا۔ ''ہیلو ام افغانی بول رہا ہے اوور...... ہیلو ام افغانی بول رہا ہے اوور۔'' وہ بار بار یہ فقرہ دہرا رہا تھا۔ وائرلیس میں سے شور کے سوا کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا۔

مارٹر توپوں کی گھن گرج سنائی دینے لگی تھی اور یہ آوازیں کالے پل کی جانب سے ہی آرہی تھیں۔ بارُود کی چمک سے تاریک افق پر مسلسل جھماکے سے ہورہے تھے۔ میں کمانڈر افغانی کی ہائی ایکس گاڑی کے پاس جاکر کھڑا ہوا تھا۔ دفعتاً افغانی کا اپنے ماتحت سردار سے پھر رابطہ ہوگیا۔ ماتحت سردار کی خاصی گھبرائی ہوئی آواز آئی۔ ''خاناں! ادھر بہت گڑبڑی ہوگیا۔ ابھی آپ لوگ وہیں رکے رہیں۔ اوور۔''

''اوئے خدائی خوار! کچھ بکو گے بھی کہ کیا آپت (آفت) ٹوٹا ہے؟''

''خاناں! پل پر موجود سپاہیوں نے بالکل بھی مقابلہ نہیں کیا۔ ایک گولی بھی نہیں چلایا حرامی کے بچوں نے۔ وہ سب کا سب دشمن سپاہیوں کے ساتھ مل گیا ہے۔ پل پر قبضہ ہوچکا ہے۔ رائے زل کے سپاہیوں کی بکتر بند گاڑیاں بڑی تیزی سے پل کراس کر کے اماری طرف آرہا ہے۔ ام اپنی سیکنڈ ڈیفنس لائن پر ہے اوور۔''

کمانڈر افغانی دانت پیس کر رہ گیا۔ اس نے یہ اطلاع جاکر قسطینا کو دی۔ قسطینا کے چہرے کا رنگ بھی بدل گیا۔ میں نے انہیں مشورہ دیتے ہوئے کہا۔ ''میری ناقص رائے یہ ہے کہ یہ خبر پھیلنی نہیں چاہیے۔ خاص طور سے کمانڈر افغانی کے لشکریوں میں۔''

''کیا کہنا چاہتے ہو شاہ زائب؟'' قسطینا نے پوچھا۔

''آپ کو پتا ہی ہے کہ مقامی رضا کار (لشکری) ہیلی کاپٹرز کی بمباری والے واقعے سے کتنے خوف زدہ ہوئے تھے۔ وہ اسے ہاناوانی کی ''جادوگری'' سے جوڑنا شروع ہو گئے تھے۔''

قسطینا اور کمانڈر افغانی سمجھ گئے کہ میں کس واقعے کا ذکر کررہا ہوں (اپنے ہی ہیلی کاپٹروں نے ڈی پیلس پر بم گرادیے تھے۔ بعدازاں یہ دونوں ہیلی کاپٹر نیوسٹی میں جا اترے تھے)

وائرلیس پر جو تشویش ناک اطلاع ملی تھی، اس کی تصدیق ہونا شروع ہوگئی تھی۔ صاف پتا چل رہا تھا کہ اب لڑائی کالے پل کی دوسری جانب نہیں ہماری جانب ہورہی ہے۔ مارٹرز اور بوفرز وغیرہ کے گولے جو بہ آسانی چار پانچ کلومیٹر کا فاصلہ طے کر سکتے ہیں ہمارے قرب وجوار میں گر رہے تھے۔ قسطینا کے اندر کی جنگجولڑکی پوری طرح بیدار ہو چکی تھی۔ اس نے وائرلیس سیٹ پر پہلے عزت مآب کو صورتِ حال سے آگاہ کیا، پھر اپنے سپاہیوں سے مخاطب ہو کر بولی۔ ''ہم اپنے ایک ایک انچ کا دفاع کریں گے۔ ہم لڑنے کے لیے آگے بڑھ رہے ہیں۔''

قسطینا کا حکم سننے کے فوراً بعد کمانڈر افغانی نے متعلقہ افسران کو کال کی کہ فوراً انفنٹری کے دستے پل کی طرف روانہ ہوں۔ اس کے ساتھ ساتھ اس نے ایمونیشن مورچوں تک پہنچانے کی ہدایت بھی کردی۔ یہ وہی ایمونیشن تھا جو تیسرے ڈپو میں موجود تھا۔ اگر یہ ڈپو بھی تباہ ہوگیا ہوتا تو گرین فورس گولا بارود کی نایابی کے سبب نہتی تصور ہوتی۔

گاڑیاں پھر برق رفتاری سے آگے بڑھنا شروع ہوئیں۔ صاف پتا چل رہا تھا کہ کھلی جنگ شروع ہوگئی ہے۔ ہر طرف دھماکے اور چھوٹے ہتھیاروں کی گونج تھی۔ سمندر کی طرف سے بھی راکٹ لانچر وغیرہ فائر ہورہے تھے۔ ہمارا فوجی کانوائے آٹھ دس منٹ کے اندر اس مقام پر پہنچ گیا جہاں

گرین اور گرے فورس میں گھمسان کی جنگ ہو رہی تھی۔ میں نے سیف عرف سیفی کی طرف دیکھا، اس کا سینہ پھولا ہوا تھا اور آنکھوں میں تیز چمک تھی جیسے اسے اپنا من پسند ماحول ملا ہو اور وہ اپنی صلاحیتوں کو آزمانے کے لیے بے تاب ہو۔ رضا کاروں کی وردی بھی یوں تو سبز رنگ کی تھی تاہم وہ پینٹ قمیص سے زیادہ شلوار قمیص سے مشابہ تھی۔ سیف کے پاس وہ رائفل بھی موجود تھی جو اسے بھرتی کے وقت دی گئی تھی۔ وہ جیسے ایک اشارے پر میدان جنگ میں کود پڑنا چاہتا تھا مگر کودنا اتنا آسان نہیں تھا۔ یہ شہر کی کوئی سڑک نہیں تھی، یہ دہکا ہوا بارڈر تھا۔ یہاں آگ برس رہی تھی اور موت ناچ رہی تھی۔ ایسے مناظر میں نے اس سے پہلے صرف جنگی فلموں میں دیکھے تھے۔ بھروسا نہیں ہو رہا تھا کہ آج ہم بھی اس کا حصہ ہیں۔ اگلے مورچوں میں گرین فورس کے جانبازوں نے سر دھڑ کی بازی لگائی ہوئی تھی اور رائے زل کی گرے فورس کو روکنے کی پوری کوشش کر رہے تھے۔

قسطینا نے جنگی ہیلمٹ پہن لیا تھا، وہ اگلے مورچوں میں جانے کا ارادہ رکھتی تھی مگر کمانڈر افغانی، کمانڈر فارس اور کیپٹن سعد وغیرہ اس کے راستے میں ڈٹ گئے۔ کمانڈر افغانی نے ملائی زبان میں صاف کہہ دیا کہ وہ قسطینا کو آگے نہیں جانے دے گا۔ اس نے کہا۔ ''آپ ہمارے سپہ سالار ہیں۔ آپ کو کچھ ہو گیا تو ہم لڑنے سے پہلے ہی ہار جائیں گے۔''

قسطینا بولی۔ ''اگر ہم رائے زل کو یہاں روکنے میں کامیاب نہ ہوئے تو بھی ہار ہمارا مقدر بن جائے گی۔ یہ بڑی اہم گھڑیاں ہیں۔''

کمانڈر افغانی نے سینہ تان کر کہا۔ ''آپ ان اہم گھڑیوں میں ہماری رہنمائی کریں۔ ہم اگلے مورچوں میں جا رہے ہیں۔ اگر ہم زندہ نہ رہے تو پھر جو چاہے کر لیجیے گا۔''

کمانڈر فارس، کیپٹن سعد اور کئی دیگر اہم فوجی افسران نے بھی قسطینا کا راستہ روک دیا۔ آخر قسطینا کو بات ماننا پڑی۔ وہ پچھلے مورچوں میں رہی اور سیکڑوں جنگجو، کمانڈر افغانی کی قیادت میں فلک شگاف نعرے لگاتے اگلے مورچوں کی طرف لپک گئے۔ ہم قسطینا اور ڈاکٹر ماریہ وغیرہ کے ساتھ پچھلے مورچوں میں رہے، لیکن یہ مورچے بھی کچھ ایسے محفوظ نہیں تھے۔ خندقیں کھود کر ان کے سامنے ریت کی بوریوں کی دیواریں کھڑی کی گئی تھیں۔ یہاں شیل پھٹ رہے تھے اور گولیاں سیٹیاں بجاتی سروں کے اوپر سے گزر رہی تھیں۔ کسی وقت روشنی کا کوئی گولا فضا میں بلند ہوتا اور چند سیکنڈ کے لیے قرب و جوار جیسے دن کی روشنی میں نہا جاتے۔ صاف پتا چلتا تھا کہ جنگ لحہ بہ لحہ ہماری طرف بڑھتی چلی آ رہی ہے۔

ایک وائرلیس سیٹ قسطینا کے پاس رکھ دیا گیا تھا۔ قسطینا اس پر مصروف ہو گئی۔ وہ اپنی فورس کے نبرد آزما یونٹوں کو مسلسل ہدایات دینے لگی۔ وہ ان کا حوصلہ بڑھا رہی تھی اور انہیں برابر آگے بڑھنے کے لیے کہہ رہی تھی۔ اس کے عقب میں اس کا ذاتی باڈی گارڈ براڈے چٹان کی طرح کھڑا تھا۔

میں اب کسی حد تک ملائی سمجھنے لگا تھا پھر بھی ''بڑے فقرے'' میرے پلے نہیں پڑتے تھے۔ میری سہولت کے لیے انیق ان کا مفہوم مجھے بتاتا تھا اس نے کہا۔ ''گرین فورس کی پیش نہیں چل رہی۔ وہ بہادری سے لڑ رہے ہیں لیکن پیچھے بھی ہٹ رہے ہیں۔''

''اس کا مطلب ہے کہ جلد ہی حملے کا رخ ڈی پیلس کی طرف ہو جائے گا۔ اگر ایسا ہے تو پھر ہمارے پیچھے ایک اور دفاعی لائن تیار ہو جانی چاہیے۔''

''آپ قسطینا صاحبہ سے بات کریں۔'' انیق نے کہا۔

قسطینا کی گفتگو میں ذرا وقفہ آیا تو میں نے کہا۔ ''یور ہائی نس! اس طرح کی لڑائی کا مجھے کوئی تجربہ نہیں اور نہ ہی کوئی دعویٰ ہے، لیکن میرا خیال ہے کہ آپ کے جاں نثار سپاہی پوری کوشش کے باوجود یہ حملہ روک نہیں پا رہے، آپ کو اپنی تھرڈ دفاعی لائن مضبوط کر لینی چاہیے۔''

اس نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ ''تم بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو شاہ زائب! میرے ذہن سے یہ بات نکلی ہوئی تھی۔ میں ابھی حلمی کو آرڈر کرتی ہوں۔''

میرا پارا پھر چڑھنے لگا۔ میں نے خود پر حتی الامکان کنٹرول کرتے ہوئے کہا۔ ''قسطینا! آپ اتنی اہم ذمے داریاں سنبھالے ہوئے ہیں لیکن آپ سمجھ نہیں پا رہیں۔ حلمی اور آقا جان ایک ہی سکے کے دو رخ ہیں۔ یہ آپ کو بہت زیادہ نقصان پہنچا چکے ہیں اور ابھی مزید پہنچانے والے ہیں۔ بہت جلد آپ کو سب پتا چل جانا ہے مگر تب تک بہت دیر ہو چکی ہوگی۔''

میں نے خود کو بہت حد تک سنبھالا تھا لیکن میرے لہجے میں جو غم و غصہ اور تپش تھی وہ لہجے سے چھلک کر باہر آ رہی تھی۔

قسطینا نے کچھ دیر تک خاموشی سے مجھے گھورا پھر بحث کا ارادہ ترک کر کے طویل سانس لی اور بولی۔ ”ٹھیک ہے، اس بارے میں پھر بات کریں گے۔ میں کسی اور بندے کو آرڈر کرتی ہوں۔“

رائے زل کے حملے میں شدت آتی جا رہی تھی۔ گھسان کا رن پڑ گیا تھا۔ بزوکا، مارٹر ملٹی بیل راکٹ لانچرز (MRL) دونوں طرف سے بے دریغ استعمال ہو رہے تھے۔ شاید قسطینا نے یہ بات ٹھیک ہی کہی تھی کہ یہ بڑی اہم لڑائی ہے۔ اس جگہ جو جیت جاتا اس کا پلڑا غیر معمولی طور پر بھاری ہو جاتا تھا۔ گرین فورس کے تازہ دم دستے بھی جوق در جوق یہاں پہنچ گئے تھے اور قسطینا کی ہدایت پر مختلف جگہوں پر ڈٹ گئے تھے۔

قسطینا بے حد بے قراری سے خندق کے اندر ٹہلنے لگی۔ اس کی بے چینی عروج پر تھی۔ مجھ سے مخاطب ہو کر بولی۔ ”شاہ زائب! میں یہاں پیچھے نہیں رہ سکتی۔ میرے سپاہیوں کو میری ضرورت ہے۔ مجھے آگے جانا ہی ہوگا۔“

”آگے کمانڈر افغانی اور کمانڈر فارس جیسے لوگ موجود ہیں۔ وہ بڑے اچھے طریقے سے لڑ رہے ہیں اور لڑا رہے ہیں۔ آگے جا کر آپ کو کچھ ہو گیا تو آپ کی فوج الٹے پاؤں بھاگے گی اور مڑ کر نہیں دیکھے گی۔“

مارٹر یا بزوکا کا ایک شیل ہمارے مورچوں کے بالکل پاس گرا۔ زبردست چمک اور دھماکے کے ساتھ بہت سی مٹی اور ریت ہم پر گری۔ اس کے ساتھ ہی مشین گن کی گولیوں کی باڑیں ریت کی بوریوں سے ٹکرانے لگیں۔

میں نے کہا۔ ”میری سمجھ میں تو ایک اور بات آ رہی ہے قسطینا۔ یہی مورچے اب اگلے مورچے بننے والے ہیں۔ ہمارے دستے پیچھے ہٹ رہے ہیں۔“

میری بات تلخ اور تشویشناک تھی مگر حقیقت تھی۔ بے حد جرأت اور بے جگری سے لڑنے کے باوجود گرین فورس پیچھے ہٹ رہی تھی۔ فوجی ایمبولینسز زخمیوں اور لاشوں کو پیچھے لا رہی تھیں۔ آرٹلری بھی آہستہ آہستہ پیچھے آ رہی تھی۔ اب گولے اور راکٹ ہمارے سروں کے اوپر سے گزر کر پیچھے ٹیلوں پر گر رہے تھے۔

قسطینا مسلسل وائرلیس سیٹ پر چلانے لگی۔ وہ اہم کمانڈروں کا حوصلہ بڑھا رہی تھی۔ انہیں ہدایات دے رہی تھی۔ وہ بار بار کمانڈر افغانی سے بھی رابطہ کرنے کی کوشش کر رہی تھی مگر اس کا رابطہ کٹ چکا تھا۔ جلد ہی وہی کچھ ہوا جیسے ہم سب محسوس کر رہے تھے۔ ہم اپنے مورچوں میں رہتے ہوئے بھی لڑائی کا حصہ بن گئے۔ ہمارے اردگرد دائیں بائیں ہر طرف لڑائی ہونے لگی۔ مجھے موت سے کبھی خوف نہیں آیا تھا۔ اب بھی نہیں آیا، لیکن یہ خیال ضرور آیا کہ اگر ہم اسی جگہ لڑتے ہوئے ختم ہو گئے تو میرے کئی کام ادھورے رہ جائیں گے۔ یورپی گینگسٹر ڈیرک سے بدلہ کون چکائے گا؟ زینب اپنے گرداب سے کیسے نکلے گی؟ ابراہیم کا کیا بنے گا؟ زہریلے آقا جان کا سر کون کچلے گا...... اور پھر...... وہ دور ریشمی لٹوں والی لڑکی شاید کبھی نہ جان پائے گی کہ جزیرہ جاماجی کے ایک تاریک مورچے میں اپنی زندگی ہار جانے والا اس کے بارے میں کیا کیا سوچتا تھا۔

بہرحال میرے ان سارے خیالوں کی عمر آٹھ دس سیکنڈ سے زیادہ نہیں تھی۔ میں فوراً مستقبل سے حال میں آ گیا۔ حال...... جہاں زندگی موت کی جنگ ہو رہی تھی۔ آگ برس رہی تھی اور خون اچھل رہا تھا۔ قسطینا نے اپنے باڈی گارڈ براڈے کو حکم دیا۔ ”شاہ زائب صاحب کے لیے لباس اور بلٹ پروف جیکٹ لاؤ۔ بلکہ تین جیکٹس لاؤ۔ دو ان کے ساتھیوں کے لیے۔“

براڈے حکم کا بندہ تھا۔ ہر بات پر صرف سر جھکانا جانتا تھا۔ وہ ایک لمحہ ضائع کیے بغیر مورچے سے باہر رینگ گیا اور عقب میں ان گاڑیوں کی طرف چلا گیا جہاں رسد کا سامان موجود تھا۔ جاماجی میں میری آمد کے تین دن بعد ہی براڈے نے مجھے زبردست رنج پہنچایا تھا۔ میرے بازو کی اب جو حالت تھی اس کا آغاز براڈے کے ہتھوڑا نما گھونسوں اور ٹھوکروں سے ہی ہوا تھا۔ تاہم بعد میں اس نے قسطینا کے کہنے پر مجھ سے معافی مانگی تھی۔ وہ ایک سچے جاں نثار کی تمام تعریفوں پر پورا اترتا تھا۔ چار پانچ منٹ میں ہی وہ برستی گولیوں کے درمیان...... سے مطلوبہ چیزیں لے کر مورچے میں پہنچ گیا۔ مورچے کی گہرائی اتنی ضرور تھی کہ اس میں حفاظت کے ساتھ کھڑا ہوا جا سکتا تھا۔ میں نے اپنے ٹراؤزر کے اوپر سے ہی گرین پتلون پہن لی۔ قمیص اور بلٹ پروف جیکٹ پہننے میں انیق نے میری مدد کی۔ سیف بھی بلٹ پروف جیکٹ پہن چکا تھا اور اس کا چہرہ جوش سے تمتمایا ہوا تھا۔ دھماکے اور شعلے اس کے لیے جیسے کسی تہوار کی آتش بازی کی طرح تھے۔ پنجاب کی ساری دلیری اور توانائی اس کے مضبوط پیکر میں جمع تھی۔ مجھ سے مخاطب ہو کر بولا۔ ”استاد صاحب! میں آسانی سے مرنے والا نہیں ہوں۔ لیکن اگر یہاں لڑتے ہوئے مجھے کچھ ہو گیا تو آپ میرے گاؤں ضرور جانا اور میرے گھر والوں کو بتانا کہ سیفی نے ایک فوجی

کی طرح کافروں سے لڑتے ہوئے جان دی ہے۔''
لڑائی کا زور کچھ اور بڑھ گیا تھا۔ روشنی کا گولا پھٹتا تھا، تو تین چار سو میٹر کے فاصلے پر گرے فورس کی بیسیوں بکتر بند گاڑیاں نظر آتی تھیں۔ ان کے عقب میں انفنٹری کے لوگ پیش قدمی کرتے چلے آرہے تھے۔
تو یوں ہوتی ہیں لڑائیاں...... یوں اپنی سرزمینوں کا دفاع کیا جاتا ہے...... یوں جانیں ہتھیلیوں پر رکھی جاتی ہیں۔ سیکڑوں مرتبہ ستمبر 65ء، اور دسمبر 71ء کی جنگوں کے بارے میں سنا تھا لیکن آج جو کچھ تھا آپ بیتی کے زمرے میں آرہا تھا۔ آج پتا چل رہا تھا کہ کیسے پاکستانی فوجیوں نے اپنے سے کئی گنا بڑی طاقت کے حملوں کو روکا ہوگا۔ کیسے اپنے بڑے بڑے شہروں کے سامنے اپنے سینوں کی دیوار کھڑی کی ہوگی۔ یہ زندگی اور آگ کا ٹکراؤ تھا۔ یہ انسانی گوشت اور بارود کا تصادم تھا۔
میں نے دیکھا قسطینا کے ہاتھوں میں امریکن میڈیم مشین گن M240 نظر آرہی تھی۔ اس نے پوزیشن لے لی اور فائرنگ شروع کردی۔ جونہی اس نے خود فائرنگ شروع کی اس کے اردگرد موجود اس کے ذاتی گارڈز اور جان نثار فوجیوں نے تکبیر کا نعرہ بلند کیا اور پوری شدت سے جنگ کا حصہ بن گئے۔ کمانڈر افغانی کے دستے پسپا ہوتے ہوتے اب ہماری دائیں جانب ٹیلوں تک پہنچ چکے تھے۔ پتا چل رہا تھا کہ ایک کمانڈر واحد کی قیادت میں ہلا بولنے والے بہت سے فوجی اپنی جان کا نذرانہ پیش کر چکے ہیں یا زخمی ہو چکے ہیں۔ جو باقی تھے وہ مختلف ٹکڑیوں میں بٹ کر لڑ رہے تھے۔ درختوں کے درمیان گرے فورس کی بکتر بند گاڑیاں اب صاف نظر آرہی تھیں۔ عقب سے آرٹلری ان کو بھرپور COVER دے رہی تھی۔
قسطینا نے وائرلیس پر ''براڈ کاسٹ کال'' کرتے ہوئے دستوں کو حکم دیا کہ وہ پوری فائر پاور استعمال کریں اور بکتر بند گاڑیوں کی پیش قدمی روکیں۔
وائرلیس کے شور میں سے جو جوابات ابھر رہے تھے وہ اس طرح کے تھے۔
''ہم کھلی جگہ پر ہیں یور ہائی نس۔ ہمارے سامنے کوئی آڑ نہیں، اوور۔''
''ہمارا ایمونیشن ختم ہورہا ہے یور ہائی نس۔ ایمونیشن کی سخت ضرورت ہے اوور۔''
''ہم اپنی جگہ ڈٹے ہوئے ہیں یور ہائی نس، دشمن کو ہماری لاشوں پر سے گزرنا ہوگا، اوور۔''

اگلے آٹھ دس منٹ، قسطینا کی قیادت میں ایک زوردار جوابی حملے کے تھے۔ انیق اور سیف بھی فائرنگ پاور کا حصہ بنے ہوئے تھے۔ میں نے "MI6" رائفل کی نال بوریوں کے درمیان رخنے میں رکھی ہوئی تھی اور اپنے سامنے فائر کر رہا تھا۔ ہدف وہ بکتر بند گاڑیاں اور ان کے پیچھے پیچھے پیش قدمی کرتے ہوئے پیدل فوجی ہی تھے۔
اسی دوران میں کم و بیش پانچ بکتر بند گاڑیاں آرٹلری کے گولوں اور راکٹوں سے تباہ ہوئیں۔ کچھ پیچھے ہٹ کر درختوں میں روپوش ہونے لگیں۔ حملہ رک گیا تھا یا کم از کم وقتی طور پر وقفہ آگیا تھا۔ جب دھماکوں سے روشنی پھیلتی تھی تو سامنے کھلی جگہ پر لاشیں نظر آتی تھیں۔ اتنے میں قسطینا کا رابطہ کمانڈر افغانی سے ہوگیا۔ اس نے بتایا کہ وہ اپنے لشکریوں اور باقاعدہ فوجیوں کے ساتھ دائیں جانب کے ٹیلوں پر موجود ہے۔
''کیا تم زخمی ہو؟'' قسطینا نے اس کی آواز کی لرزش محسوس کر کے پوچھا۔
اس نے نفی میں جواب دیا۔ (بعدازاں پتا چلا کہ اس کا یہ جواب درست نہیں تھا) کمانڈر افغانی نے قسطینا سے میری اور دیگر لوگوں کی خیریت کے بارے میں بھی دریافت کیا۔ میں نے افغانی سے خود مخاطب ہوتے ہوئے اردو میں کہا۔ ''کمانڈر اگر آپ بلندی پر ہیں تو سامنے بھی دیکھ سکتے ہوں گے۔ بکتر بند گاڑیاں کچھ پیچھے ہٹ گئی ہیں۔ اب یہ لوگ کیا کر رہے ہیں؟''
افغانی نے کہا۔ ''جہاں تک ام کو پتا چل رہا ہے یہ لوگ سمجھ گیا ہے کہ بکتر بند کے اندر ان کا نقصان ہوگا۔ اب وہ ان مورچوں میں گھس کر بیٹھ رہا ہے جو ابھی ام لوگوں نے خالی کیا ہے۔''
افغانی کی آواز کے پس منظر میں لشکریوں کے جنگی نعرے اور زخمیوں کی کراہیں بھی سنائی دے رہی تھیں۔ پتا چل رہا تھا کہ افغانی کے دستوں میں بھی کافی جانی نقصان ہوا ہے۔ فائرنگ کی آوازیں اور دھماکوں کی گونج ایک بار پھر شدت اختیار کرتی جارہی تھی۔ یہ ایک اور بھرپور حملہ تھا جو رائے زل کی فوج ''ڈی پیلس'' کی طرف بڑھنے کے لیے کر رہی تھی۔ یہ حملہ کم و بیش آدھ گھنٹا جاری رہا۔ دونوں طرف سے بے تحاشا بارود برسایا گیا۔ ایجنسی کے سیکڑوں امریکن گارڈز رائے زل کی گرے فورس کی بھرپور مدد کر رہے تھے۔ امریکنوں کی للکارتی ہوئی آوازیں کسی وقت ہمارے مورچوں تک پہنچ جاتی تھیں۔ دشمن کی فائر پاور

زیادہ تھی اور ہتھیار بھی نسبتاً جدید تھے۔ اس لیے ان کا دباؤ بڑھتا جارہا تھا۔ مگر آسانی ان کے لیے بھی نہیں تھی۔ انہیں ایک ایک انچ زمین کے لیے لڑنا پڑا تھا اور اب پچھلے آدھے گھنٹے سے وہ بالکل آگے نہیں بڑھ پا رہے تھے۔ اچانک وہ کچھ ہوا جس کی توقع ہم نے ہرگز نہیں کی تھی۔ پہلے شدید ترین فائرنگ اور شیلنگ ہوئی پھر درجنوں بکتر بند گاڑیاں ہماری طرف برق رفتاری سے بڑھیں۔ ان کے پیچھے مسلح افراد لپکتے چلے آرہے تھے۔ یہ کمپنی کے ماہر ترین گارڈز تھے اور گرے فورس کے چنے ہوئے آزمودہ کار سپاہی تھے۔ فوجی زبان میں اسے ''چارج'' کرنا کہتے ہیں۔ اس میں حریف کو حیران اور خوف زدہ کرنے کا ارادہ شامل ہوتا ہے۔ چند سیکنڈ کے اندر سیکڑوں مسلح افراد ہمارے سروں پر تھے۔ یہ ایک طرح سے دست بدست لڑائی کا آغاز تھا۔ ہم اب بھی اپنے مورچوں میں رہتے تو وہ ہم پر ہینڈ گرینیڈز پھینکتے اور اندھا دھند فائرنگ سے ہمیں مورچوں میں ہی بھون کر رکھ دیتے۔

''باہر نکلو۔'' قسطینا چلّائی اور خود بھی کسی شیرنی کی طرح باہر نکلی۔

نعروں سے فضا گونجی اور دونوں طرف کے سیکڑوں افراد ایک دوسرے پر پل پڑے۔ اب گرینیڈ استعمال نہیں ہوسکتے تھے، نہ ہی بڑی رائفلیں...... سنگینیں چل رہی تھیں۔ پستول استعمال ہو رہے تھے۔ خنجر جنہیں عرف عام میں آرمی ڈیگرز کہا جاتا ہے چمک رہے تھے۔ یہ دست بدست لڑائی تھی...... ہاں یہ میرا میدان تھا...... یہ مارشل آرٹ کی ایک شکل تھی۔ میں زخمی تھا، ایک بازو بالکل کام نہیں کررہا تھا لیکن میں پورے جوش وخروش سے اس لڑائی میں کود پڑا۔ خود کو ایک امریکن کی قاتل سنگین سے بچاتے ہوئے میں نے اس کے چہرے پر سر کی ٹکر رسید کی اور پھر 38 بور پسٹل کی گولی اس کے سینے میں اتار دی۔

کسی نے مجھے عقب سے اپنی بانہوں میں جکڑا۔ انیق نے خنجر کا نو انچ لمبا پھل اس کے پہلو میں اتارا اور ٹانگ مار کر اسے دور پھینک دیا۔ ہم اپنے سامنے آنے والے افراد سے بھڑ گئے۔ پورے جوش اور توانائی کے ساتھ۔ جاناں کی خون آلود لاش کا تصور میری نگاہوں میں تھا۔ اس دن پتا چلا کہ وسیع پیمانے پر ہونے والی عام جنگ میں لڑنے والوں پر کبھی کبھی ایک وحشت سی طاری ہوجاتی ہے، ایک جنون...... ایک خود فراموشی...... زخم اور موت اپنی حقیقت کھو دیتے ہیں۔ کم از کم تین گولیاں میری بلٹ پروف جیکٹ میں لگ چکی تھیں۔ ایک سنگین نے زخمی بازو کے پلاسٹر کو مزید ادھیڑ کر رکھ دیا تھا۔

سیف کی پکارتی ہوئی آواز میرے کانوں میں پڑی۔ ''وہ دیکھو جی...... بی بی جی مشکل میں ہیں۔''

وہ واقعی مشکل میں تھی۔ ایجنسی اور رائے زل کے درجنوں سپاہی اس کی طرف بڑھ رہے تھے۔ چند جاں نثاروں کے سوا اس کے اردگرد اور کوئی نہیں تھا۔ گھمسان کا رن پڑا ہوا تھا۔

''آجاؤ انیق۔'' میں نے پکار کر کہا۔

ہم اس خطرناک صورتِ حال کی طرف لپکے۔ ہم نے اس کے اردگرد گھیرا بنانے کی کوشش کی لیکن گھیرا توڑ دیا گیا...... کمانڈر واحد کے سینے پر مشین پسٹل کا ایک پورا برسٹ لگا اور میں نے اسے ایک کھائی میں گرتے دیکھا۔ میں نے دیکھا سیف کے ساتھ دو امریکن پوری وحشت کے ساتھ گتھم گتھا تھے۔ اس بدترین صورتِ حال میں ایک موقع ایسا بھی آیا جب قسطینا کے سامنے فقط براڈے، میں اور انیق رہ گئے تھے۔

''ماردوں گا۔'' براڈے بڑی وحشت سے چلّایا اور اس نے قسطینا کی طرف بڑھنے والے ایک خنجر بردار ملائیشین کو سنگین میں پرو کر دور پھینک دیا۔

وہ میری زندگی کی یادگار مزاحمت تھی...... اور یہ ایک ہاتھ سے کی جانے والی مزاحمت تھی۔ اس دوران میں ایک امریکن رائفل بردار کی سنگین براڈے کے پہلو میں لگی اور اس کی پسلیاں چیرتی ہوئی دوسری طرف نکل گئی۔ وہ قربان ہوکر اپنی مالکہ کے قدموں میں گرا۔ مجھے بھی لگا شاید اب ہم بھی بچ نہیں سکیں گے۔ لیکن غالباً یہ ایک امتحان تھا۔ ہم تین چار افراد کی ثابت قدمی نے صورتِ حال کو تیزی سے تبدیل کیا۔ قسطینا کے اردگرد مزاحمت کرنے والوں کی تعداد ایک بار پھر بڑھنے لگی۔ وہ خود بھی جلالی کیفیت میں تھی۔ پسپا ہونے والوں کو پکار رہی تھی۔

یہی وقت تھا جب تاریک آسمان پر گرین فورس کے گن شپ ہیلی کاپٹرز نمودار ہوئے۔ انہوں نے گرے فورس کی صفوں پر فائرنگ اور بمباری شروع کردی۔ یہ موقع بہت مختصر تھا لیکن غنیمت تھا۔ ہم قسطینا کو حصار میں لے کر پیچھے ہٹتے چلے گئے اور تھرڈ ڈیفنس لائن پر پہنچ گئے۔

یہ ڈیفنس لائن کافی مضبوط تھی اور ذرا بلندی پر بھی تھی۔ بہت سی خندقیں کھودی جا چکی تھیں اور کچھ کھودی جارہی تھیں۔ درجنوں نیم پختہ مورچے بھی ڈھلوانوں پر

موجود تھے۔ گرین فورس کی یہ ڈیفنس لائن ڈی پیلس سے فقط تین کلومیٹر کی دوری پر تھی۔

ہم ایک محفوظ مورچے میں پہنچ گئے تھے۔ قسطینا نے وائرلیس پر کمانڈر افغانی سے رابطہ کرتے ہوئے کہا۔ ''افغانی! ہم پچھلی ڈیفنس لائن پر پہنچ گئے ہیں۔ تم بھی آہستہ آہستہ پیچھے ہٹو اور جہاں جہاں موقع ملے بارودی سرنگیں رکھتے آؤ۔''

افغانی نے جواب دیا کہ اس کے دستے بکھرے ہوئے ہیں۔ وہ انہیں اکٹھا کرنے اور پیچھے ہٹانے کی کوشش کررہا ہے۔ اس نے کمانڈر رواحد کی شہادت کی بھی تصدیق کی۔

اسی دوران میں وائرلیس پر عزت مآب ریان فردوس کی کال آگئی۔ وہ تین کلومیٹر پیچھے ڈی پیلس کی محفوظ چاردیواری میں بیٹھا تھا مگر یوں ہانپا ہوا تھا جیسے میدانِ جنگ میں ہو۔ اس نے کہا۔ ''یہ میں کیا سن رہا ہوں قسطینا، کہا جارہا ہے کہ رائے زل ''بلیک برج'' سے کافی آگے آگیا ہے؟ اوور۔''

''جی ہاں عزت مآب! پل پر موجود حفاظتی دستے نے دھوکا دیا ہے۔ وہ لوگ رائے زل کے ساتھ مل گئے ہیں۔ ہمیں پیچھے ہٹنا پڑا ہے۔ اب ہم اپنی تھرڈ ڈیفنس لائن پر ہیں۔ امید ہے ہم انہیں یہاں سے آگے نہیں بڑھنے دیں گے، اوور۔''

ریان فردوس کی گھبرائی ہوئی آواز ابھری۔ ''مجھے پتا چلا ہے کہ کمانڈر رواحد اور کیپٹن سعد وغیرہ بھی شہید ہوگئے ہیں، اوور۔''

''آپ کی اطلاع درست ہے عزت مآب۔ لیکن آپ پریشان نہ ہوں۔ آپ کی آن پر کٹ مرنے کے لیے ''تیار لوگوں'' کی تعداد ہزاروں میں ہے۔ رائے زل کو آپ تک پہنچنے کے لیے آگ اور خون کا دریا پار کرنا ہوگا، اوور۔''

''یہاں ڈی پیلس میں بہت خوف پایا جارہا ہے۔ عورتوں اور بچوں کا زیادہ بُرا حال ہے۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ عورتوں اور بچوں کو ہیلی کاپٹر کے ذریعے یہاں سے نکال دینا چاہیے، اوور۔'' ریان فردوس کی آواز میں جھنجلاہٹ تھی۔

انیق نے معنی خیز نظروں سے میری طرف دیکھا۔ میری طرح وہ بھی ریان فردوس کی اس بات کا مطلب اچھی طرح سمجھ رہا تھا۔ عورتوں اور بچوں میں ریان فردوس خود کو بھی شامل کررہا تھا اور یہاں سے نکل جانا چاہتا تھا۔ قسطینا نے جلدی سے کہا۔ ''گستاخی معاف عزت مآب! آپ یہ غلطی ہرگز نہ کیجیے گا۔ ہر طرف بارود برس رہا ہے۔ ہیلی کاپٹر ڈی پیلس سے نکل نہیں پائے گا اور دوسری بات یہ جناب...... کہ آپ کو ہر صورت ڈی پیلس میں رہنا ہے۔ آپ کی یہاں موجودگی سے ہی سپاہیوں اور لشکریوں کے حوصلے بلند رہیں گے، اوور۔''

''میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا۔'' ریان فردوس نے جھلائے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''یہ آقا جان اور حلمی وغیرہ کہاں دفع ہوگئے ہیں۔ ان سے رابطہ کیوں نہیں ہو پارہا؟ اوور۔''

قسطینا نے گڑبڑا کر میری طرف دیکھا، پھر بولی۔ ''میرا رابطہ بھی نہیں ہو پارہا لیکن لگتا ہے کہ کچھ دیر میں صورتِ حال واضح ہوجائے گی۔'' اسی دوران میں زوردار دھماکوں کے ساتھ راکٹ ہمارے مورچوں کے آس پاس گرنا شروع ہوگئے۔ قسطینا نے کہا۔ ''سوری عزت مآب! ہم پر پھر حملہ ہورہا ہے، اوور اینڈ آل۔''

اس نے سلسلہ منقطع کیا اور وائرلیس پر اپنے کسی آفیسر کو حکم دیا کہ وہ MRL والی گاڑیوں کو آگے لائیں اور گرے فورس پر جوابی ''راکٹ حملہ'' کیا جائے۔

یہ نیا حملہ اور جوابی حملہ قریباً دس منٹ جاری رہا۔ دونوں طرف سے راکٹ لانچر، توپیں اور بھاری مشین گنز استعمال ہوئیں۔ اسی دوران میں کمانڈر افغانی بھی اپنی درجنوں گاڑیوں اور سیکڑوں سپاہیوں و لشکریوں کے ساتھ پیچھے ہٹ کر تھرڈ ڈیفنس لائن پر پہنچ گیا۔ وہ زخمی شیر کی طرح دکھائی دے رہا تھا۔ وہ قسطینا کے پاس مورچے میں پہنچا تو اس کے چہرے اور ڈاڑھی پر خون کے چھینٹے تھے۔ اس کی ایک ران بری طرح زخمی تھی اور خون آلود پٹیوں میں جکڑی ہوئی تھی۔ بڑی بڑی پگڑیوں والے درجنوں قبائلی جاں نثار اس کے اردگرد تھے۔

یہ رات کے قریباً تین بجے کا عمل تھا۔ لڑائی میں ایک مختصر وقفہ آگیا تھا۔ کمانڈر افغانی کی زبانی مجھے معلوم ہوا کہ اسپتال میں کرخت سنگھ کی حالت اب کچھ سنبھل گئی ہے (درحقیقت کرخت سنگھ، سیف اور انیق نے مجھے آقا جان کے وفاداروں کی مہلک گرفت سے نکالنے کے لیے بہت دلیرانہ مزاحمت کی تھی۔ اسی دوران میں وہاں کمانڈر افغانی کا دستہ بھی پہنچ گیا تھا)

کمانڈر افغانی اور قسطینا مورچے کے ایک گوشے میں رازداری سے گفتگو کرنے لگے۔ دونوں کے چہرے تمتما

رہے تھے۔ میرا دل گواہی دے رہا تھا کہ یہ گفتگو آقا جان کے اسی نئے روپ کے بارے میں ہے جس نے ہائی کمان کو ششدر کر دیا ہے۔

کچھ دیر بعد قسطینا میری طرف آئی۔ اس کے چہرے پر جنگ کی افراتفری کے ساتھ ساتھ دکھ کی پرچھائیاں بھی نظر آرہی تھیں۔ وہ جاناں کی موت سے آگاہ ہو چکی تھی۔ اس نے مجھ سے اظہار افسوس کیا۔ اسی دوران میں وائرلیس پر دوبارہ سگنل آنے شروع ہو گئے۔ چند سیکنڈ کے توقف کے بعد وائرلیس سیٹ کے شور میں ریان فردوس کی آواز دوبارہ ابھری۔ ”ہمارے پاس کتنا ایمونیشن ہے، ہم کب تک لڑ سکتے ہیں؟ اوور۔“

قسطینا نے کہا۔ ”مسٹر شاہ زائب کی ہمت اور کوشش کی وجہ سے، ہمارا ایک ڈپو تباہ ہونے سے بچا رہا ہے جناب۔ مجھے پوری امید ہے کہ ہم تین چار روز تک ڈٹ کر رائے زل کا مقابلہ کر سکتے ہیں، اوور۔“

وہ تین چار روز کی بات کر رہی تھی لیکن مجھے نہیں لگتا تھا کہ اگر لڑائی اسی شدت سے جاری رہی تو ہم دو دن سے زیادہ نکال سکیں گے۔

کافی دنوں بعد میں نے ابراہیم کی آواز سنی۔ وہ اور کمال احمد بھی باپ کے پاس ہی موجود تھے۔ ابراہیم نے کہا۔ ”ہم کوشش کر رہے ہیں کہ برونائی سے مزید ایمونیشن اور کمک ہمیں پہنچ سکے۔ اس کے علاوہ میں، شاہ زیب بھائی سے بھی بات کرنا چاہتا ہوں، کیا وہ کہیں قریب ہی موجود ہیں؟ اوور۔“

قسطینا نے مجھے اشارہ کیا۔ میں مائیک پر آ گیا۔ ”جی یور ہائی نس، میں شاہ زیب عرض کر رہا ہوں، اوور۔“

”شاہ زیب بھائی! ہمیں خبریں مسلسل پہنچ رہی ہیں۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے آپ نے قسطینا کو جس طرح مشکل صورت حال سے نکالا ہے۔ اس نے ہم سب کو بہت متاثر کیا ہے۔ ڈی پیلس میں بھی آپ کی اور آپ کے ساتھیوں کی تعریف ہو رہی ہے، اوور۔“

”بہت شکریہ یور ہائی نس، میں خود کو اتنی ستائش کے قابل نہیں سمجھتا، اوور۔“

”شاہ زیب بھائی، تین دن پہلے جب آپ ڈی پیلس سے اوجھل ہوئے تو آپ کے ساتھ ہی آپ کی پاکستانی ساتھی جاناں بھی اوجھل ہوئی، وہ کہاں ہے اوور۔“

”ابھی تھوڑی دیر پہلے ”ہر ہائی نس قسطینا“ نے ڈپو کے بچ جانے کے حوالے سے جو تعریف کی ہے اس کی اصل مستحق وہی ہے۔ ڈپوز کے حوالے سے ساری معلومات اسی نے دی تھیں۔ اس وقت وہ شدید زخمی تھی۔ اس نے میرے ہاتھوں میں دم توڑا ہے، اوور۔“

”کیسے ہوا یہ سب کچھ؟ اوور۔“ ابراہیم کی آواز میں دکھ تھا۔

”شاید یہ تفصیل بیان کرنے کا موقع نہیں۔ لیکن یہ جو کچھ بھی ہوا آقا جان......“ ابھی میرا فقرہ مکمل نہیں ہوا تھا کہ قسطینا نے پھرتی سے سیٹ آف کر دیا۔

”نہیں شاہ زائب! یہ وقت ایسی باتیں کرنے کا نہیں۔ انکل کے بارے میں جو بھی صحیح یا غلط ہے وہ بہت جلد سامنے آنے والا ہے۔ ہم اپنے آپ کو مایوسی سے جتنی دیر تک دور رکھ سکتے ہیں، ہمیں رکھنا چاہیے۔“

میں ایک بار پھر دانت پیس کر رہ گیا۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا مورچے سے باہر کمانڈر افغانی کا معاون سیکنڈ کمانڈر فارس جان نظر آیا۔ اس کے آگے پیچھے کچھ اور چہرے بھی تھے جو مورچے میں جھانک رہے تھے۔ چند ایک باقاعدہ فوجی بھی دکھائی دیے۔ ”کیا بات ہے فارس جان؟“ قسطینا نے انگلش میں پوچھا۔

فارس جان انگلش روانی سے بولتا تھا۔ اس نے کہا۔ ”یور ایکسی لینسی! یہ لوگ مسٹر شاہ زیب کو دیکھنا چاہتے ہیں۔ یہ ان کو اپنے درمیان دیکھ کر بہت خوش ہیں...... ان میں سے کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو ان کو ایک فائٹر چیمپئن کی حیثیت سے جانتے ہیں۔“

کئی لوگوں نے باہر کھڑے جھک کر مجھ سے ہاتھ ملایا۔ ایک گھنی ڈاڑھی والا پرجوش قبائلی جس کے ماتھے پر تازہ زخم تھا اردو میں بولا۔ ”خدا گواہ ہے ام جھوٹ نہیں بول رہا۔ آپ نے ام سب کو اپنا گرویدہ کیا ہے۔ آپ نے بہت مشکل وقت میں امارے سپہ سالار کا حفاظت کیا، امارا خون سیروں کے حساب سے بڑھ گیا ہے۔ انشاءاللہ ام ان ”پرنگیوں“ (فرنگیوں) کے سامنے اور ان کے جوڑی داروں کے سامنے دیوار بن کے دکھائے گا۔“

وہ لوگ پرجوش نعرے لگانے لگے۔ قسطینا نے انہیں بمشکل چپ کرایا اور کہا کہ لڑائی رکی نہیں۔ اس میں چھوٹا سا وقفہ آیا ہے۔ وہ لوگ صفیں درست کر رہے ہیں، ہمیں بھی صفیں درست کرنی چاہئیں۔ بہت سی جگہوں پر خندقیں بھی پوری گہرائی میں نہیں کھودی جا سکیں۔ سب لوگ اس وقفے کو غنیمت سمجھیں اور اس ڈیفنس کو مضبوط کریں۔ جو لوگ زخمی ہیں انہیں پیچھے بھیجنے کا انتظام کیا جائے۔

سپریم کمانڈر کی ہدایت پر افسر اور جوان مختلف اطراف میں منتشر ہو گئے۔ جس وی ٹائپ مورچے میں ہم موجود تھے، وہ لمبائی میں پندرہ بیس فٹ کے قریب تھا۔ اس کے اوپر نو دس انچ موٹے کنکریٹ کا "شیڈ" تھا۔ انیق نے مجھے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا، ہم مورچے کے آخری گوشے میں پہنچ گئے۔ یہاں گولیوں کے بکس اور خشک راشن کے پیکٹ دکھائی دے رہے تھے۔ ہم ان کے قریب ہی بیٹھ گئے۔ انیق نے کہا۔ "شاہ زیب بھائی! جاناں کی موت کا بہت صدمہ ہے، میں آپ کو مزید پریشان کرنا نہیں چاہتا، لیکن ایک بات ایسی ہے جو آپ کو بتانا بھی ضروری ہے......"

"تمہید بھی کیا ضروری ہے؟"

"شاید ضروری ہے، کیونکہ یہ بات ایسی ہی عجیب ہے۔"

"اب کچھ بک بھی چکو۔"

وہ پوری سنجیدگی سے بولا۔ "بھائی! میں نے سجاول کو دیکھا ہے۔"

میرے سر پر جیسے مارٹر کا گولا آن گرا۔ میں نے ششدر ہو کر اسے گھورا۔ "کیا کہہ رہے ہو...... کہاں دیکھا ہے؟"

"ابھی تھوڑی دیر پہلے لڑائی میں۔ جب ہم پر چارج ہوا اور دست بدست لڑائی ہوئی۔ وہ مجھ سے کافی فاصلے پر تھا لیکن...... میری نگاہیں دھوکا نہیں کھا سکتیں۔ وہ سجاول ہی تھا۔ میرے اندازے کے مطابق اس نے بلٹ پروف جیکٹ بھی پہن رکھی تھی، میری آنکھوں کے سامنے اس نے ہمارے ایک لشکری کے سینے میں رائفل کی سنگین گھونپی۔ پھر میں نے اس کا وہ طوفانی مکا بھی دیکھا، جس کا ذکر آپ کئی بار کر چکے ہیں۔ مجھے لگتا ہے کہ دست بدست لڑائی میں اس کے اس مہلک "پنچ" نے دو تین جبڑے تو ضرور توڑے ہوں گے۔"

"میں نہیں مانتا انیق! تمہیں دھوکا ہوا ہے......"

"نہیں شاہ زیب بھائی! وہ سجاول ہی تھا۔ میں آپ سے کہتا تھا نا...... کہ یہ بندہ اندر سے کچھ اور ہے...... یہ کسی بھی وقت بدل سکتا ہے۔ ایسے لوگوں کی وفاداری کا بس ایک ہی پیمانہ ہوتا ہے...... دولت۔ جہاں دولت زیادہ نظر آتی ہے یہ ادھر ہی رخ پھیر لیتے ہیں۔ آقا جان اور حلمی جیسے لوگوں کی مثال آپ کے سامنے ہی ہے۔"

"تم...... سجاول کو آقا جان وغیرہ سے کیوں ملا رہے ہو؟"

"اس لیے بھائی کہ وہ ان جیسا ہی ہے۔ میری ناقص عقل تو یہی کہہ رہی ہے کہ اس نے پاراہاؤس میں قادر خان سے جو چوری کا مال واپس کرایا تھا وہ بھی صرف اپنا اعتماد قائم کرنے کے لیے تھا۔ ایسے لوگ بڑے فائدے کے لیے چھوٹے نقصان برداشت کیا ہی کرتے ہیں۔"

"انیق! تمہاری رائے اس کے بارے میں کبھی بھی اچھی نہیں رہی۔ اب بھی اچھی نہیں ہے۔ جو کچھ تمہیں نظر آیا ہے وہ بھی تمہاری اسی "رائے" کا شاخسانہ لگتا ہے۔ یہ بات کسی صورت مانی جانے والی نہیں کہ تم نے جس شخص کو رائے زل کے سپاہیوں کے ساتھ دیکھا ہے وہ سجاول ہے......"

اس سے پہلے کہ میں کچھ مزید کہتا، کسی قریبی مورچے سے کسی سپاہی نے جوش کے عالم میں ایک اونچی تان بلند کی۔ عجب تان تھی، جس میں زخموں کا کرب بھی تھا اور محاذِ جنگ کا انوکھا جوش بھی۔ اس تان کا جواب ایک دو دیگر مورچوں سے آیا۔ پھر اس تان میں کچھ مزید لوگ شامل ہو گئے۔ دیکھتے ہی دیکھتے یہ تان ایک جنگی ترانے کا روپ دھار گئی۔ یہ ترانہ اردگرد کے مورچوں میں کورس کی شکل میں گونجنے لگا (ایسا ہی ایک ترانہ رائے زل کی فوج میں بھی مقبول تھا...... ہم بزدل دشمن کو اس کے بل میں سے نکال کر ماریں گے اور ہماری بہادری دیکھ کر وہاں کی خوبرو عورتیں، وغیرہ وغیرہ......) گرین فورس کے بہت سے سپاہی اور لشکری احتیاطی پہلو کو نظرانداز کرتے ہوئے مورچوں میں کھڑے ہو گئے اور ترانہ گانے لگے۔ ملائی زبان کے اس ترانے کے سارے الفاظ تو میری سمجھ میں نہیں آرہے تھے۔ انیق نے میرے لیے اس کا ترجمہ کیا۔ یہ ترجمہ کچھ یوں تھا۔

ہم نے جی جان سے جینا ہے
اور سینہ تان کے جینا ہے
ہم نے عزم کرلیا
جنگ میں قدم دھرلیا
جس دشمن نے ہمارے بچوں کی مسکراہٹ چھینی
جس دشمن نے ہم پر زندگی حرام کی
ہم اس سے لڑیں گے
آخری گولی تک اور آخری سر تک
ہم پیچھا کریں گے اس کا قبر تک
ہم سروں پر کفن باندھ کر نکلے ہیں
ہم جاتے اندھیرے تک لڑیں گے
ہم سچے سویرے تک لڑین گے اور اگر ہم واپس نہ

آسکے تو ہمارے بچوں سے کہنا ہم سرخرو ہوئے۔

قسطینا خود بھی اس جنگی نغمے سے متاثر نظر آتی تھی۔ وہ بلند آواز سے تو نہیں گا رہی تھی مگر زیر لب یہ بول دہراتی چلی جارہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں عزم تھا اور شاید اپنے پیارے والد کی خونچکاں لاش کا منظر بھی۔

رات کا باقی حصہ صف بندیاں کرتے ہوئے ہی گزرا۔ مزید گولا بارود مورچوں میں پہنچا دیا گیا تھا اور کچھ تازہ دم دستے بھی آگئے تھے۔ میرے ذہن میں مسلسل انیق کی کہی ہوئی بات گونج رہی تھی۔ وہ اپنی دی ہوئی اطلاع پر قائم تھا اور پورے وثوق سے کہہ رہا تھا کہ اس نے سجاول کو گرے سپاہیوں کی طرف سے لڑتے ہوئے دیکھا ہے۔

میرے ذہن میں بھی کبھی کبھی شک کی لہر سی اٹھنے لگی۔ رائے زل اور ایجنسی والے جوڑ توڑ کے ماہر لگتے تھے۔ انہوں نے آقا جان اور حلمی جیسے لوگوں کو عزت مآب کے لیے آستین کا سانپ بنا ڈالا تھا، سجاول کی حیثیت تو پھر ایک ''نئے آدمی'' کی تھی۔ سجاول کے حوالے سے لالچ والی بات بھی اپنی جگہ درست تھی، اس میں پیسے کی ہوس بدرجۂ اتم موجود تھی۔ میں سوچتا رہا اور الجھتا رہا۔

کچھ چلاتی ہوئی سی آوازوں نے مجھے خیالوں سے چونکایا۔ یہ آوازیں کسی پاس والے مورچے سے بلند ہورہی تھیں۔ ان میں ایک آواز کمانڈر افغانی کی تھی۔ دوسری کسی مقامی شخص کی۔ افغانی دہاڑا۔ ''تم بزدل ہو، تمہارے خون میں بزدلی ہے۔''

دوسرا شخص بولا۔ ''ہم بزدل ہوتے تو اپنے خرچے پر لڑنے مرنے کے لیے گھروں سے نہ نکلتے......''

افغانی نے کوئی اور بات کہی۔ یہ ملائی جملہ پوری طرح میری سمجھ میں نہیں آیا۔ جواب میں دوسرا شخص بھڑک اٹھا۔ دونوں گتھم گتھا ہوگئے۔ قسطینا انہیں چھڑانے کے لیے مورچے سے نکلی۔ میں اور انیق وغیرہ بھی نکلے۔ لحیم شحیم کمانڈر افغانی اپنے ہی جیسے ایک توانا شخص سے برسرِ پیکار تھا۔ دونوں گر گئے تھے اور ایک دوسرے کو مُکے رسید کررہے تھے۔

''رک جاؤ...... میں کہتی ہوں پیچھے ہٹ جاؤ۔'' قسطینا چلّائی۔

ان دونوں پر کچھ اثر نہیں ہوا۔ دونوں اب اٹھ کھڑے ہوئے تھے اور دست و گریباں تھے۔ کمانڈر افغانی نے اپنے حریف کو ٹانگ رسید کی۔ وہ لڑکھڑا کر کئی قدم پیچھے گیا، پھر اس نے اپنا ہاتھ پستول کے ہولسٹر کی طرف بڑھایا۔ یہ خطرناک صورتِ حال دیکھ کر سیف نے پھرتی دکھائی اور افغانی کے حریف کو عقب سے اپنے بازوؤں میں جکڑ لیا۔ اس کے دونوں بازو بھی سیف کی گرفت میں آگئے تھے۔ وہ بہت مچلا پھڑکا لیکن یہ کبڈی کے کھلاڑی کا جپھا تھا، وہ کامیاب نہیں ہوسکا، کمانڈر افغانی کو قسطینا نے روک لیا تھا۔

یہ کوئی اچھا شگون نہیں تھا۔ عین لڑائی کے دوران میں آپس کی جنگ؟ کمانڈر افغانی کا حریف بھی کوئی کمانڈر ہی تھا۔ وہ مسلسل بول رہا تھا، دوسری طرف افغانی بھی گالم گلوچ کررہا تھا۔ قسطینا نے دونوں کو بمشکل ٹھنڈا کیا۔ اپنے ہاتھوں سے دونوں کے ہتھیار ان کے جسموں سے علیحدہ کرکے ایک ماتحت کے حوالے کیے۔ پھر ان دونوں کو لے کر ایک قریبی مورچے میں اُتر گئی۔ غالباً ان کے درمیان تصفیہ کرانا چاہ رہی تھی۔ جھگڑا کس بات پر شروع ہوا، یہ ابھی تک معلوم نہیں ہوسکا تھا۔

دس پندرہ منٹ بعد وہ کمانڈر فارس کے ساتھ مورچے سے باہر آئی اور اپنے مورچے میں پہنچی تو اس کا چہرہ لال بھبوکا ہورہا تھا۔ تاہم اس نے بتایا کہ معاملہ ٹھنڈا ہوگیا ہے اور کمانڈر افغانی واپس اپنے مورچے میں چلا گیا ہے۔ لڑائی کی وجہ کا اس نے گول مول جواب دیا۔ میں نے بھی دوسروں کے سامنے اصرار مناسب نہیں سمجھا۔

اب سورج نکل آیا تھا۔ پام کے درخت اور سرسبز ٹیلے دور تک روشن تھے۔ جو مناظر رات کی تاریکی میں چھپے رہے تھے وہ اب واضح نظر آرہے تھے۔ جگہ جگہ جلی ہوئی فوجی گاڑیوں کے ڈھانچے تھے۔ کسی کسی گاڑی یا بکتر بند میں اب بھی آگ سلگ رہی تھی۔ سرسبز ڈھلوانوں پر جہاں جہاں کوئی گولا یا راکٹ گرا تھا وہاں بڑے بڑے گول نشان بن گئے تھے اور یہ نشان سیکڑوں کی تعداد میں تھے۔ بہت سے درخت جڑوں سے اکھڑ کر زمین پر پڑے تھے۔ چند مقامات پر لاشیں بھی دکھائی دیں۔

ناشتا مورچوں میں ہی ہوا۔ دونوں طرف دفاع اور حملے کی تیاری بھی ساتھ ساتھ جاری تھی۔ اپنے قریبی ساتھیوں اور خاص طور سے باڈی گارڈ براڈے کی ہلاکت پر قسطینا افسردہ نظر آتی تھی۔ لیکن جب لڑنے والے حالتِ جنگ میں ہوتے ہیں تو مرنے والے ساتھیوں کا سوگ منانے کا وقت بھی کہاں ہوتا ہے۔ میرے ٹخنے اور مفلوج بازو میں پھر شدید درد شروع ہوگیا تھا۔ میں نے ڈاکٹر ماریہ

سے ایک دردکش انجکشن مزید لگوالیا۔

ناشتے کے بعد قسطینا مورچے سے باہر نکل آئی اور اس ڈیفنس لائن کا معائنہ کرنے لگی۔ میں بھی اس کے ساتھ تھا۔ وہ ایک سرسبز ڈھلوان پر کھڑی تھی اور سبزے سے ڈھکی ہوئی ایک چٹان کی اوٹ لے رکھی تھی۔ ہم دونوں کے پاس ٹیلی اسکوپس تھیں۔ میں نے ٹیلی اسکوپ میں ان مورچوں کا جائزہ لیا جو رات کو ہمیں چھوڑنا پڑے تھے۔ وہاں اب رائے زل کی گریے آرمی کا قبضہ تھا اور اگلے حملے کے لیے ان کی بھرپور تیاری نظر آرہی تھی۔ ایجنسی کے سفید فام ان کے شانے سے شانہ ملا کر کھڑے تھے۔

میں نے قسطینا سے کہا۔ ''اگلے 48 گھنٹے میں کچھ بھی ہوسکتا ہے قسطینا! میں زینب کے حوالے سے فکرمند ہوں۔''

''وہ بالکل محفوظ ہے شاہ زائب! ڈی پیلس کے اندر ہی ہے۔ ماریہ کی ہائش گاہ کے سیکنڈ فلور پر۔''

''اب اس کی دیکھ بھال کون کررہا ہے؟''

''ماریہ کی دو خاص ملازمائیں۔ وہ دونوں پوری طرح قابلِ بھروسا ہیں۔''

میں نے دل میں سوچا، قابلِ بھروسا تو وہ خبیث ہیجڑا خیام مانش بھی تھا۔ قسطینا نے جیسے میرا ذہن پڑھ لیا بولی۔ ''شاہ زائب! دل میں کوئی وہم نہ لاؤ۔ میں بھی جانتی ہوں کہ زینب کی حفاظت کتنی ضروری ہے۔ سمجھو اب وہ میری ذمے داری ہے۔''

وہ ایک بار پھر ٹیلی اسکوپ کے ذریعے فرنٹ کا جائزہ لینے لگی۔ میں نے بھی آنکھیں ٹیلی اسکوپ کے عدسوں سے لگادیں۔ کہیں کہیں ریت کی بوریوں کے عقب میں گریے فورس کے سپاہیوں کی نقل و حرکت دکھائی دیتی تھی۔ میرے ذہن میں ایک بار پھر سجاول کا خیال آگیا۔ کیا انیق کی نظر نے درست کام کیا تھا؟ کیا سجاول سیالکوٹی واقعی گریے فورس کے جنگ بازوں میں کہیں موجود تھا...... انہی بکتر بند گاڑیوں کے آس پاس کہیں گھوم رہا تھا؟

فارس جان کی آواز نے مجھے اور قسطینا کو چونکایا۔ وہ مورچے کے پاس اسٹین شین کھڑا تھا اور قسطینا کو بتا رہا تھا کہ وائرلیس پر اس کی کال ہے۔ وہ سپاہیانہ چال چلتی مورچے میں چلی گئی۔ دو چار منٹ بعد اس نے مجھے بھی مورچے میں بلایا اور بتایا کہ مجھے ڈی پیلس جانا ہے۔

''کس سلسلے میں یور ہائی نس؟'' میں نے پوچھا۔

''ابراہیم تم سے ملنا چاہتا ہے ابھی۔''

''لیکن...... اس وقت تو میں یہاں رہنا چاہتا ہوں۔''

''نہیں شاہ زائب! وہ پریشان ہے۔ شاید تم اس کی ڈھارس بندھا سکو۔ میرا خیال ہے کہ بیگم پھوپھو (بیگم نورل) بھی تم سے ملنا چاہیں گی۔'' پھر قسطینا کی نگاہ میرے بازو کے ٹوٹے ہوئے خون آلود پلاستر پر مرکوز ہوگئی۔ وہ رنجیدہ لہجے میں بولی۔ ''شاہ زائب! میں تمہارے بازو کی طرف سے بھی سخت فکرمند ہوں۔ تم پین کلر انجکشن سے کام چلا رہے ہو۔ یہ کسی طور بھی درست نہیں۔ تم واپس جارہے ہو تو متعلقہ ڈاکٹر کو بھی چیک کراؤ۔ میں اس حالت میں تمہیں اپنے ساتھ دیکھنا نہیں چاہ رہی۔''

''لیکن میں اس حالت میں بھی یہاں رہنا چاہتا ہوں۔'' میں نے زیرلب کہا۔

''کیا کہہ رہے ہو؟'' اس نے چونک کر پوچھا۔

''کچھ نہیں۔''

وہ میری طرف خفگی بھری نظروں سے دیکھ کر رہ گئی۔

کچھ ہی دیر بعد میں اور انیق ایک اسپیشل فوجی جیپ پر سوار ڈی پیلس کی طرف جارہے تھے۔ جیپ ایک کیپٹن ڈرائیو کررہا تھا۔ مورچوں میں موجود سپاہی اور لشکری ہماری طرف دلچسپی کی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ خصوصاً وہ میری طرف دیکھ کر ہاتھ ہلا رہے تھے۔ کچھ نے پُرجوش نعرے بھی بلند کیے۔ حقیقت یہ تھی کہ مجھے یہ ''پروٹوکول'' زیادہ بھا نہیں رہا تھا۔ خوامخواہ کندھوں پر ایک بوجھ سا پڑتا محسوس ہورہا تھا۔

ہم شہری حدود میں داخل ہوئے تو ہر طرف جنگی حالات نظر آئے۔ مقامی باشندے شاید راشن وغیرہ اکٹھا کرنے کے لیے بازاروں میں نکل آئے تھے۔ فلنگ اسٹیشنوں پر بھی گاڑیوں کا رش تھا۔ کہیں کہیں خندقیں کھودی جارہی تھیں۔ پتا چلا کہ جاماجی کے سول اور آرمی اسپتالوں میں بڑی تعداد میں لاشیں اور زخمی پہنچے ہیں۔ تین چار دن پہلے ہونے والی بمباری کے اثرات بھی جگہ جگہ دکھائی دیتے تھے۔

ایک جگہ بہت سی کرینیں اور لفٹیں مصروفِ کار تھیں۔ کیپٹن نے بتایا۔ ''یہی وہ بڑا مواصلاتی ٹاور ہے جو تین دن پہلے ہونے والی بمباری میں تباہ ہوا ہے۔ اسے ٹھیک کرنے کی کوشش ہورہی ہے۔ ممکن ہے کہ آج دوپہر تک موبائل فون سروس بحال ہوجائے۔

ہم ڈی پیلس کے قریب پہنچے تو وہاں بھی زبردست حفاظتی انتظامات نظر آئے۔ کوشش کی جارہی تھی کہ ڈی پیلس

کے اردگرد خاردار تاروں اور بارودی سرنگوں کا ایک حصار سا قائم کر دیا جائے۔ ڈی پیلس کے گرد موجود پختہ مورچوں کو بھی سامانِ حرب سے لیس کیا جا رہا تھا۔ ڈی پیلس کے مین گیٹ کے قریب ایک اور منظر نے مجھے چونکایا۔ یہاں دیواروں پر کچھ پوسٹرز لگے ہوئے تھے جن میں عزت مآب ریان فردوس، قسطینا، ابراہیم اور کمال، آقا جان اور کمانڈر افغانی وغیرہ کی تصویریں تھیں۔ ان میں سے مجھے آقا جان کی تصویریں پھٹی ہوئی نظر آئیں۔ پوسٹرز کے ٹکڑے زمین پر پڑے تھے۔ مجھے اندازہ ہوا کہ آقا جان کی تاریخی بے وفائی کا پردہ چاک ہونا شروع ہو گیا ہے۔

سیکیورٹی کے مختلف مراحل سے گزر کر میں ڈی پیلس کے اندر پہنچا۔ ڈی پیلس کی پُرشکوہ عمارت کے اندر بھی جنگ کی سراسیمگی نظر آ رہی تھی۔

اچانک ایک طرف سے ایک لڑکی نمودار ہوئی جو ساڑی میں ملبوس تھی۔ اس کے لمبے بال ہوا میں لہرا رہے تھے۔ اس نے ایک عجیب حرکت کی۔ وہ لپک کر آگے بڑھی۔ گھٹنوں کے بل بیٹھی اور میرا پاؤں چومنے کی کوشش کی۔ میں جلدی سے ایک قدم پیچھے ہٹ گیا...... سیکیورٹی اہلکاروں نے لڑکی کو تھام لیا۔ وہ ڈی پیلس کی انڈین ملازماؤں میں سے کوئی تھی۔ اس کا چہرہ اندرونی جوش سے تمتما رہا تھا۔ آنکھوں میں چمک تھی۔ وہ پکار کر بولی۔ ”میں آپ کو مبارک باد دیتی ہوں...... مبارک دیتی ہوں۔ آپ نے میرا کلیجا ٹھنڈا کیا...... آپ نے بہت سے لوگوں کا کلیجا ٹھنڈا کیا۔ اس خبیث کے منہ پر تھپڑ مارا۔ آپ عظیم ہو...... آپ نے عظیم کام کیا۔“ وہ دیوانوں کی طرح چلّا رہی تھی۔ اہلکار اسے بمشکل سنبھال کر اور سمجھا بجھا کر پیچھے لے گئے۔

میں سمجھ گیا کہ وہ کس تھپڑ کا ذکر کر رہی تھی۔ وہی جو کل رات مین گیٹ کے سامنے آقا جان کے گال پر پڑا تھا۔

میں سیکیورٹی اہلکاروں کے ساتھ چلتا مختلف کوریڈورز سے گزرا اور ابراہیم کے پاس اس کی شاندار نشست گاہ میں پہنچ گیا۔ ہنگامی حالات کی سنگینی اس کے دبلے پتلے چہرے سے بھی نظر آ رہی تھی مگر وہ مردنی نہیں تھی جو اپنی دلہن زینب سے جدائی کے بعد اس کے چہرے پر دکھائی دی تھی۔ ایک جدید وائرلیس سیٹ اس کے پاس رکھا تھا جس پر میدانِ جنگ کی اطلاعات موصول ہو رہی تھیں۔ میرے پہنچنے پر اس نے سیٹ کی آواز بہت دھیمی کر دی۔ اٹھ کر مجھے گلے لگایا۔ میرے بازو اور ٹخنے کی حالت نے اسے پریشان کیا، وہ بولا۔ ”بہت کچھ ثابت ہو چکا ہے۔ اس کے باوجود یقین نہیں آ رہا کہ یہ سب کچھ آقا جان کا کیا دھرا ہے۔ دماغ ہی کام نہیں کر رہا...... ہم انہیں کیا سمجھتے رہے اور وہ کیا نکلے۔“

میں خاموش رہا۔ وہ کہنے لگا۔ ”کل رات جب ڈی پیلس میں یہ چرچا ہوا کہ آپ زخمی حالت میں مین گیٹ پر پہنچے ہیں اور آپ نے آقا جان کے منہ پر تھپڑ مارا ہے تو ڈی پیلس میں سنسنی پھیل گئی۔ والدہ محترمہ بہت غصے میں تھیں۔ عزت مآب بھی ششدر تھے مگر پھر جب دو گھنٹے بعد یہ پتا چلا کہ آقا جان اور حلمی غائب ہیں اور ان کے تین سو کے لگ بھگ قریبی ساتھی بھی یہاں سے فرار ہو گئے ہیں تو حقیقت کھلنا شروع ہو گئی۔ وہ سب کچھ سچ ثابت ہونے لگا جو آپ کئی روز پہلے سے کہہ رہے تھے۔ پھر آپ کا وہ تھپڑ بھی ہر ایک کی سمجھ میں آنے لگا......“

میں نے کہا۔ ”اس بات پر شکر ہی کیا جا سکتا ہے...... آپ کے بزرگوں کی آنکھیں دیر سے کھلیں لیکن کھلی تو ہیں۔“

کوئی جاں سوز دکھ ابراہیم کو جیسے اندر سے کاٹ رہا تھا۔ وہ دل فگار لہجے میں بولا۔ ”شاہ زیب بھائی! بہت غیر یقینی حالات ہیں۔ کچھ پتا نہیں کل کیا ہو جائے۔ میں ہر صورت زینب سے ملنا چاہتا ہوں۔ اس خطرناک سچویشن میں اسے ہر گھڑی اپنے سامنے دیکھنا چاہتا ہوں۔“

”لیکن ابراہیم آپ نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ ابھی صبر و تحمل کا مظاہرہ کریں گے۔ کوئی ایسا اصرار نہیں کریں گے جس کی وجہ سے اس کی زندگی پھر خطرے میں پڑ جائے۔“

”شاہ زیب بھائی! وہ وعدہ عام حالات کے لیے تھا، اب تو زندگی موت کا سوال پیدا ہو رہا ہے۔“ اس کی آنکھوں میں نمی تیر گئی۔ مجھے اس نوخیز دولھا پر ترس آنے لگا۔ جب ابراہیم کا اصرار بڑھ گیا تو میں نے کہا۔ ”ابراہیم! میری ایک شرط ہے۔ میں کچھ بھی کرنے سے پہلے ایک بار آپ کی محترم والدہ سے ملنا چاہوں گا۔“

”میں آپ کی شرط مانتا ہوں۔“ وہ فوراً بولا۔ ”لیکن اس کے بعد آپ کو مجھے زینب سے ملانا ہے۔“

”میری پوری کوشش ہو گی لیکن بات صرف ملانے کی ہو رہی ہے ابراہیم! مجھے لگتا ہے کہ آپ کی یہ خواہش کہ اسے ہر وقت نگاہوں کے سامنے رکھیں، پوری نہیں ہو گی۔“

وہ جز بز نظر آنے لگا مگر بحث بھی کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے انٹرکام پر اپنی والدہ بیگم نورل سے رابطہ کیا اور انہیں بتایا کہ شاہ زیب بھائی ڈی پیلس میں ہیں اور آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔ دوسری طرف سے بتایا گیا کہ کچھ اہم

سول اور ملٹری آفیسرز سے میٹنگ ہو رہی ہے۔ وہ آدھ گھنٹے بعد کال کرتی ہیں۔

اسی دوران میں خطرے کے سائرن بجنے لگے۔ فضائی حملے کا خدشہ تھا۔ ایسے سائرن دن میں کئی بار بجتے تھے اور پھر خطرہ ٹلنے کے سائرن گونجنے لگتے تھے۔ اس دفعہ بھی ایسا ہی ہوا۔ ڈی پیلس کی راہداریوں اور غلام گردشوں میں ہلچل کے آثار محسوس ہوئے۔ خواتین اور خواجہ سراؤں کی چلاتی ہوئی سی آوازیں نشست گاہ تک پہنچیں۔ کچھ دیر کی افراتفری کے بعد خطرہ ٹلنے کا اعلان ہو گیا۔

ابراہیم نے کہا۔ ''شاہ زیب بھائی! آپ پر بہت اعتماد کرنے لگا ہوں، آپ سے وہ باتیں بھی کہہ دیتا ہوں جو کسی اور سے نہیں کہتا۔ لگتا ہے کہ آپ سے برسوں کا ساتھ ہے۔'' اس نے چند لمحے توقف کے بعد بات جاری رکھی۔ ''شاید آپ کو پتا نہ ہو رائے زل اور اس کی والدہ ہم سے براہِ راست بھی رابطہ کر رہے ہیں۔ میرا مطلب ہے کہ سسٹر قسطینا، کمانڈر افغانی اور دوسرے بڑے کمانڈروں سے ہٹ کر ہم سے بات کر رہے ہیں۔''

''کیا کہہ رہے ہیں؟''

''وہ کہہ رہے ہیں کہ ہم گرے فورس اور ایجنسی کے اتحاد کا مقابلہ نہیں کر سکیں گے ہم ہتھیار پھینک دیں۔ ہماری سلامتی کی ضمانت دی جائے گی۔ ہماری عزت اور مرتبے پر کوئی آنچ نہیں آئے گی۔''

میں نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''وہ عزت مآب کی نرم طبع اور امن پسندی سے آگاہ ہیں۔ وہ انہیں دھوکا دے رہے ہیں۔ جہاں تک ان کے وعدوں کا تعلق ہے۔ آپ خود ہی کہتے ہیں کہ مکاری اور عیاری میں رائے زل کا الگ مقام ہے۔ وہ شہر میں گھس گیا تو کسی کو رحم کے قابل نہیں سمجھے گا۔ گن گن کر اپنی محرومیوں کے بدلے لے گا۔ ابراہیم! مجھے یہاں کے حالات کا زیادہ تجربہ نہیں مگر جہاں تک میں دیکھ رہا ہوں آپ لوگوں کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ پوری طاقت سے شہر کا دفاع کریں۔''

''کچھ سمجھ میں نہیں آرہا۔'' ابراہیم نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری۔ ''وہ مقامی جو رضا کاروں کی حیثیت سے اس لڑائی میں شامل ہوئے ہیں، اندر سے کچھ بے چین ہیں۔ ان میں کچھ افواہیں پھیل رہی ہیں۔ کل رات پل پر موجود حفاظتی دستے نے کوئی مزاحمت نہیں کی اور اس کا ہمیں بہت نقصان اٹھانا پڑا۔ اب یہ واقعہ بھی راز نہیں رہا ہے۔ کچھ توہم پرست لوگ اسے بھی پائلٹوں والے واقعے سے ملا رہے ہیں، ان کا خیال ہے کہ حفاظتی دستے کے لوگ بھی ہانا وانی کی سحر کاری کا شکار ہوئے ہیں۔ ہانا وانی کی پُراسرار صلاحیتیں کام دکھا رہی ہیں اور رائے زل کے خلاف لڑنے والے سب لوگ اس کی زد میں آرہے ہیں۔''

''یہ سب بکواس ہے ابراہیم...... یہ سب کچھ ہمارے واہموں اور اندرونی خوف کی کارستانیاں ہوتی ہیں۔ اگر ہانا وانی اتنی ہی بڑی پیش گو اور غیب داں تھی تو یہ کیوں نہ جان سکی کہ یکے بعد دیگرے اس کے تین شوہر اسے لات مار کر چلے جائیں گے۔ وہ ہرہائی نس قسطینا کے ان جاسوسوں کے بارے میں کیوں نہیں جان سکی جو نیوسٹی میں اس کے اردگرد ہی موجود ہیں۔ اگر ایسی بات ہوتی تو چند دن پہلے وہ برج کلب پر ہونے والے مہلک فضائی حملے سے پہلے ہی اپنے بہترین فوجی کمانڈروں کو وہاں سے نکال لیتی یا انہیں وہاں جانے ہی نہ دیتی، ایسا کچھ نہیں ہے ابراہیم۔''

اسی دوران میں وائرلیس سیٹ پر سگنل آنے لگے۔ ابراہیم نے منہ میں کچھ پڑھا۔ جیسے کسی اچھی خبر کے لیے دعا مانگ رہا ہو۔ لیکن یہ اچھی خبر کا وقت نہیں تھا۔ میجر صولت کی آواز وائرلیس پر ابھری۔ ''سر یہاں ایک اَپ سیٹ ہوا ہے؟''

''کہو۔''

''کمانڈر افغانی اور کمانڈر اوان میں کچھ دیر پہلے سخت جھگڑا ہوا تھا۔ کمانڈر اوان کا کہنا ہے کہ وہ مزید لڑائی جاری نہیں رکھ سکتا۔''

''وہ کیوں؟''

''جناب! وہ اسی کل رات والے واقعے کو بنیاد بنا رہا ہے۔ پُل کا حفاظتی دستہ ایک بھی گولی چلائے بغیر رائے زل کی فورس سے مل گیا تھا۔ اسے پُراسرار کہا جا رہا ہے، کمانڈر اوان اور اس کے ساتھی اس حوالے سے خوف میں مبتلا ہیں۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے کمانڈر اوان اپنے بہت سے ساتھیوں کے ساتھ واپس چلا گیا ہے۔''

''اوہ خدایا۔'' ابراہیم نے اپنا سر پکڑ لیا۔ وہ کچھ دیر تک بول ہی نہیں سکا پھر ''اوور اینڈ آل'' کہہ کر وائرلیس سیٹ بند کر دیا۔

''ہزار ڈیڑھ ہزار افراد تو ضرور اس کے ساتھ چلے گئے ہوں گے۔'' ابراہیم نے افسردہ لہجے میں کہا۔

''کوئی فرق نہیں پڑتا ابراہیم۔'' میں نے اسے تسلی دی۔ ''جو لوگ آدھے دل کے ساتھ لڑتے ہیں، وہ لڑائی میں نہ ہی ہوں تو بہتر ہوتا ہے۔''

MEDICAM
Whiteness in 14 days
*No Side Effects
MEDICAM
BLEACH CREAM
MEDICAM
Bleach Cream
MEDICAM
BLEACH CREAM
Skin Whitening Cream
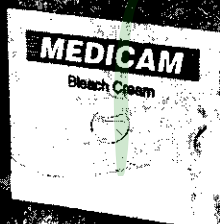
ابراہیم اپنی پیشانی مسل رہا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ یہ کمانڈر داوان وہی ہے جس نے ابھی تھوڑی دیر پہلے میرے سامنے افغانی سے جھگڑا کیا تھا اور پستول نکالنے تک نوبت آگئی تھی۔ افغانی نے اسے بزدلی کا طعنہ بھی دیا تھا۔

ابراہیم نے کہا۔ ''یہ افواہیں بھی پھیلی ہوئی ہیں کہ لڑائی شروع ہونے سے ایک رات پہلے ہانا وانی نے ایک کھلی قبر میں بیٹھ کر صبح تک عملیات کیے ہیں اور اب بھی وہ اپنی فورس کے ساتھ ہے اور پیچھے پیچھے آرہی ہے۔''

یہ باتیں جاری تھیں کہ وائرلیس پر بیگم نورل کا پیغام آگیا۔ وہ مجھے بلا رہی تھیں۔ پروگرام کے مطابق اکیلے ہی ان کے پاس جانا تھا۔ میں اٹھ کر چل دیا۔ ایک خواجہ سرا اور ایک ترک پھریرے دار خاتون میرے ساتھ ہو لیے تاکہ مجھے بیگم نورل تک پہنچا سکیں۔ ڈی پیلس کے اندر سراسیمگی کی کیفیت تھی۔ وہ وسیع ہال جہاں عزت مآب ریان فردوس کے لیے راگ رنگ کی محفلیں سجتی تھیں، ویران پڑا تھا۔ پری پیکر رقاصائیں بجھی بجھی تھیں۔ میں نے عزت مآب کی دو حسین وجمیل خواصوں کو دیکھا، وہ ہمیشہ بے باک لباس میں نظر آئی تھیں، لیکن آج انہوں نے دوپٹے مضبوطی سے سروں پر جمائے ہوئے تھے اور کسی ایسی محفل میں شریک تھیں جس میں بلا ٹالنے کے لیے کچھ پڑھا جارہا تھا۔ ایک ملنگ نما خواجہ سرا مختلف کمروں میں کالی مرچوں کی دھونی دیتا پھر رہا تھا۔

کچھ ہی دیر بعد میں سیکیورٹی کے مراحل سے گزرنے کے بعد بیگم نورل کی وسیع نشست گاہ میں موجود تھا۔ وہ حسبِ معمول ایک برقع نما لبادے میں نظر آئیں۔ چہرہ حجاب میں تھا۔ ہاتھ میں تسبیح گردش کررہی تھی۔ رسمی کلمات کے بعد انہوں نے میرے زخمی بازو کا احوال پوچھا اور اس امر پر میری اور میرے ساتھیوں کی تعریف کی کہ ہم دلیری سے لڑے اور ہم نے ایک مشکل وقت میں قسطینا کو گھیرے سے نکالا۔ وہ بولیں۔ ''تم لوگوں نے ثابت کیا ہے کہ عزت مآب نے تمہیں یہاں اپنے ساتھ لانے کا جو فیصلہ کیا تھا...... وہ غلط نہیں تھا۔''

پھر وہ ایک دم افسردہ ہوگئیں۔ میں سمجھ گیا کہ ان کا دھیان کس طرف گیا ہے۔ وہ آہ بھر کر بولیں۔ ''کاش اس وقت سجاول بھی تمہارے ساتھ ہوتا۔ سجاول کا خیال آتا ہے تو دل پر ایک تیر سا لگتا ہے۔ اس نے پاکستان میں ہمارے لیے بہت کچھ کیا، لیکن یہاں آتے ہی اسے کسی کی نظر لگ گئی۔''

میں اسے کیا بتاتا کہ پاکستان میں بھی اس نے کارکردگی کم دکھائی تھی اور کریڈٹ زیادہ پایا تھا اور یہاں آکر بھی اب اس کے بارے میں کچھ زیادہ اچھی اطلاعات نہیں مل رہی تھیں۔ اگر بیگم نورل کو معلوم ہوجاتا کہ وہ گرے فورس کی طرف سے لڑتے ہوئے دیکھا گیا ہے تو شاید انہیں ہارٹ اٹیک ہی ہوجاتا۔

وہ آنسو پونچھ کر بولیں۔ ''تم کیا کہنا چاہ رہے تھے شاہ زائب۔'' وہ انگلش روانی سے بولتی تھیں مگر قسطینا کی طرح وہ بھی مجھے شاہ زیب کے بجائے شاہ زائب ہی پکارتی تھیں۔

میں کچھ کہنے کے لیے مناسب الفاظ ہی ڈھونڈ رہا تھا جب وہ بولیں۔ ''ایک منٹ...... پہلے مجھے یہ بتاؤ کہ ابراہیم اب تمہیں کیسا لگ رہا ہے؟''

''پہلے سے بہتر ہے یور ہائی نس۔''

''اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے۔ اب تھوڑا بہت کھانا بھی کھا رہا ہے۔ خود کو سنبھالنے کی بہت کوشش کررہا ہے۔''

''آپ کو معلوم ہے وہ کیوں بہتر ہورہا ہے؟'' میں نے ڈرامائی انداز میں پوچھا۔ وہ سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھنے لگیں۔ میں نے کہا۔ ''یور ہائی نس...... میں آپ کو ایک بہت اہم بات بتانا چاہتا ہوں۔ شاید میں یہ بات ابھی کچھ دیر اور راز ہی رکھتا لیکن جنگ شروع ہوگئی ہے۔ حالات غیر یقینی ہیں۔ ابراہیم کا اصرار بڑھتا جارہا ہے۔ وہ اپنی دلہن زینب سے ملنا چاہتا ہے۔''

بیگم نورل کا چہرہ تاریک ہوگیا۔ وہ جیسے خاموشی کی زبان میں کہہ رہی تھیں...... مرجانے والوں کو زندہ کون کر سکتا ہے۔

میں نے کہا۔ ''ابراہیم کی حالت اس لیے بہتر ہورہی ہے کہ میں نے ابراہیم کو زینب سے ملنے کی آس دلائی ہے۔''

بڑی بیگم کا چہرہ کچھ اور تاریک ہوگیا۔ حیران نظروں سے میری طرف دیکھ کر بولیں۔ ''تم اپنے حواس میں تو ہو شاہ زائب! یہ کیا کہہ رہے ہو تم، تم...... اس طرح...... اسے جھوٹی آس کیوں دلا رہے ہو؟''

''آپ کو کچھ بھی مزید بتانے سے پہلے میں آپ سے ایک وعدہ چاہتا ہوں بڑی بیگم...... اور وہ یہ کہ آپ کمانڈر افغانی کا قصور جانے بغیر اسے پیشگی معاف کریں۔''

بیگم نورل کی حیرت بڑھتی جارہی تھی اور اس کے ساتھ ساتھ شدید الجھن بھی۔ اگلے چار پانچ منٹ میں جو

گفتگو ہوئی اس میں، میں نے بیگم نورل کو کچھ بھی بتائے بغیر ان سے کمانڈر افغانی، قسطینا، ماریہ اور اپنے لیے پیشگی معافی لے لی۔ جب وہ معافی دے چکیں تو میں نے کہا۔ ”بڑی بیگم! میں ابراہیم کو جھوٹی آس نہیں دلا رہا۔ آپ کی بہو زینب زندہ ہے۔“

حسب توقع بیگم نسا نورل پر حیرت کا شدید ترین حملہ ہوا۔ میں نے دھیرے دھیرے اور درجہ بدرجہ سب کچھ بیگم نورل کے گوش گزار کر دیا۔ انہیں بتا دیا کہ یہ سازش کس نے اور کیسے کی۔ آقا جان نے کس طرح کمانڈر افغانی کو مجبور کیا کہ وہ دلہن زینب کو پاکستان بھیجنے کے بجائے جان سے مار ڈالے۔ کمانڈر افغانی نے اسے کس طرح خواجہ سرا خیام کے پاس چھپانا چاہا اور وہاں اس پر کیا بیتی۔

بیگم نورل حیرت اور دکھ کے شدید بہاؤ میں تھیں اور گاہے گاہے سوالات بھی پوچھ رہی تھیں۔ ان کی سمجھ میں یہ بات نہیں آرہی تھی کہ اگر یہ سب کچھ آقا جان نے کیا تو کیوں؟ میں نے انہیں بتایا۔ ”وہ یہی چاہتا تھا یور ہائی نس جو کچھ ہوا۔ زینب کی نقلی لاش دیکھنے کے بعد ابراہیم شدید ترین صدمے کا شکار ہوئے۔ ابراہیم کی حالت کی وجہ سے آپ اور عزت مآب میں سنگین اختلافات ہوئے۔ عین جنگ کے موقع پر ایک خطرناک بحران ڈی پیلس میں پیدا ہو گیا اور اگر خدانخواستہ...... میرے منہ میں خاک ابراہیم کو کچھ ہو جاتا تو آپ اور عزت مآب کہاں کھڑے ہوتے؟“

چند منٹ بعد جب طویل گفتگو اختتام کو پہنچی تو بیگم نورل زار و قطار رو رہی تھیں۔ انہوں نے کہا۔ ”کہاں ہے میری بہو، میں اس سے ملنا چاہتی ہوں۔“

”وہ یہیں ڈی پیلس میں ہے بڑی بیگم۔ لیکن پہلے آپ کو یہ دیکھنا ہوگا کہ اس کی موجودگی یہاں راز رہ سکتی ہے یا نہیں اور کیا عزت مآب کی طرف سے اس کی زندگی کو خطرہ لاحق تو نہیں ہو جائے گا؟ آپ اچھی طرح جانتی ہیں وہ ڈی پیلس میں اس کا وجود برداشت نہیں کر سکتے۔“

”میں سب کچھ سمجھ رہی ہوں شاہ زائب! میں اب اس کے سلسلے میں ہر طرح کی ذمے داری لیتی ہوں۔“ بیگم نورل نے اشک بار لہجے میں کہا۔ وہ دیوانی سی ہو رہی تھیں اور جلد از جلد زینب کو دیکھنا چاہتی تھیں۔

☆☆☆

اگلا ایک ڈیڑھ گھنٹا کافی سنسنی خیز تھا۔ بڑی بیگم نورل بڑی رازداری سے ڈاکٹر ماریہ کی رہائش گاہ پر پہنچیں (یہ رہائش گاہ ڈی پیلس کے اندر ہی تھی) وہ قریباً آدھ گھنٹا وہاں رہیں۔ اس کے بعد ابراہیم کی باری آئی۔ وہ جیسے اپنی اندرونی خوشی اور اضطراب کو سنبھال نہیں پا رہا تھا۔ اس کے ہونٹ بار بار خشک ہو رہے تھے اور گردن کی شریانیں دھڑکتی ہوئی نظر آتی تھیں۔ ڈاکٹر ماریہ کی رہائش گاہ کی طرف جانے سے پہلے وہ بے ساختہ مجھ سے بغل گیر ہو گیا، اور بس اتنا ہی کہہ سکا۔ ”شکریہ۔ آپ کا بہت شکریہ۔“

میں واپس قسطینا کے پاس مورچوں میں جانا چاہ رہا تھا لیکن دل یہ بھی چاہ رہا تھا کہ جب ابراہیم اپنی زندہ سلامت دلہن سے مل کر واپس آئے تو میں اس کا مطمئن چہرہ دیکھ سکوں۔ بہرحال مورچوں میں پہنچنا زیادہ ضروری تھا۔ جس بارشی رات میں مجھے اور جاناں کو انیکسی سے اٹھا کر آقا جان کے خفیہ عقوبت خانے میں پہنچایا گیا، میرا سارا سامان انیکسی میں ہی پڑا رہ گیا تھا۔ ان ذاتی اشیا میں میرا موبائل فون اور پرس بھی شامل تھا۔ انیق باہر والے کمرے میں بیٹھا میرا انتظار کر رہا تھا۔ میں نے اسے ساتھ لیا اور ڈی پیلس کے اندرونی حصے سے نکل کر انیکسی کی طرف بڑھا۔ وسیع و عریض احاطے میں جا بجا تین دن پہلے ہونے والی بمباری کے آثار تھے۔ پانی کی کچھ پائپ لائنیں پھٹ گئی تھیں جن کی مرمت کی جا رہی تھی۔ وہ جگہ بھی بری طرح متاثر ہوئی تھی جہاں سپریم کمانڈر قسطینا کا آفس تھا۔ شکر تھا کہ اس حملے کے وقت قسطینا یا کوئی دوسرا اہم عہدے دار آفس میں موجود نہیں تھا۔

میں اور انیق انیکسی میں پہنچے۔ میں نے اپنی چیزیں سمیٹیں۔ جاناں کی کئی اشیا نظر آئیں، جنہیں دیکھ کر دل ملول ہوا۔ سیل فون کو آن کیا۔ اس پر چند میسج تھے جو ابراہیم نے میری تلاش کے دوران میں کیے تھے۔ اچانک مجھے اس اسپائی کیمرے کا خیال آیا جو میں نے قسطینا کے آفس کے ریٹائرنگ روم میں لگایا تھا۔ آفس اور ریٹائرنگ روم بمباری سے متاثر ہوئے تھے۔ پتا نہیں کہ میرے کیمرے کا کیا بنا تھا۔

میں نے کیمرے کا انجام جاننے کے لیے اپنے سیل فون کو ریسیور میں تبدیل کیا۔ یہ جان کر حیرانی ہوئی کہ یہ باکمال اسپائی کیمرا اب تک سگنل دے رہا ہے۔ میں نے اسے ایکٹو کیا۔ موبائل کی اسکرین پر کمرے کا منظر دکھائی دینے لگا۔ لیکن میں بری طرح چونکا۔ یہ قسطینا کے ریٹائرنگ روم کا منظر نہیں تھا۔ یہ کسی اور کمرے کا منظر تھا۔ یہ کمرا میں نے پہلے نہیں دیکھا تھا۔ میں ششدر رہ گیا۔ کیا کیمرے کو وہاں سے اتار کر اس دوسرے کمرے میں لایا گیا تھا یا پھر وہ ڈیکوریشن پیس ہی وہاں سے نکال کر کسی دوسرے کمرے میں پہنچا دیا گیا تھا؟

چند سیکنڈ بعد مجھے حیرت کا دوسرا دھچکا لگا۔ مجھے ایک مدھم آواز سنائی دی۔ یہ آواز ابراہیم کے علاوہ اور کسی کی نہیں تھی۔ الفاظ میری سمجھ میں نہیں آئے لیکن جواب میں جو آواز سنائی دی وہ شناخت ہوئی اور اس کے الفاظ بھی سمجھ میں آئے۔ یہ زینب کی شرگیں آواز تھی۔ اس نے کسی بات پر ابراہیم کو "تھینک یو" بولا تھا۔

میں ہکا بکا تھا۔ (بعدازاں پتا چلا، قسطینا کے ریٹائرنگ روم کو نقصان پہنچا تھا۔ وہاں موجود کئی چیزیں برباد ہو گئی تھیں لیکن کچھ بچی بھی تھیں، جن میں یہ ڈیکوریشن پیس بھی تھا۔ اسے ڈاکٹر ماریہ نے اٹھا کر اپنی رہائش گاہ میں رکھ دیا تھا۔ اب یہ ایک زبردست اتفاق تھا کہ یہ ڈیکوریشن پیس اسی کمرے میں پڑا تھا جہاں زینب نے پناہ لے رکھی تھی) چند سیکنڈ بعد مجھے زینب نظر آئی۔ اس کے بال ڈھیلی ڈھالی چوٹی کی صورت بندھے ہوئے تھے۔ برونائی طرز کے لمبے گلابی چغے میں وہ پیاری لگ رہی تھی۔ سر پر سفید اور گلابی پھولوں والا کامدار دوپٹا تھا۔ کانوں میں بڑے بڑے آویزے اور گلے میں طلائی ہار۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر ایک کھڑکی کا مخملی پردہ درست کیا۔ یہی وقت تھا جب ابراہیم بھی کیمرے کے فریم میں داخل ہوا۔ یوں لگا کہ اس کی آنکھیں نم ہیں۔ وہ بڑے جذباتی انداز میں زینب کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ محبوب دلہن جو اس کی ہو کر بھی اس کی نہیں تھی۔ اس نے انگلش میں ٹھہر ٹھہر کر کہا۔ "زینب! تم نہیں جانتیں یہ گھڑیاں میرے لیے کتنی بڑی خوشی لے کر آئی ہیں...... اور تم یہ بھی نہیں جانتیں کہ میں نے تمہاری جدائی کے دن کس طرح کاٹے ہیں۔"

ان الفاظ میں سے شاید دو چار لفظ ہی زینب کی سمجھ میں آئے ہوں گے۔ ابراہیم نے اپنے جذبات کے اظہار کے لیے اردو کے ٹوٹے پھوٹے الفاظ کا سہارا لیا۔ "تم سے محبت...... بہت بہت...... آنسو...... انتظار......"

وہ بولی۔ "میں بھی...... بہت روئی ہوں...... کئی بار تو دل چاہتا تھا کہ اپنی جان لے لوں۔"

وہ اسے شانوں سے تھام کر بولا۔ "بہت محبت...... تم نہیں...... تو سب خالی...... میں...... میں......" اس کی اردو ساتھ چھوڑ گئی۔ وہ اشکبار لہجے میں، انگلش میں بولتا چلا گیا۔ "تمہاری موت کی خبر نے مجھے زندہ درگور کر دیا تھا۔ مجھے موت بہت آسان لگنے لگی تھی۔ اب بھی اپنی قسمت پر یقین نہیں آ رہا۔ کیا میں واقعی اتنا خوش قسمت ہوں؟ تمہیں پھر سے جیتا جاگتا اپنے سامنے دیکھ رہا ہوں۔ کہیں یہ نگاہوں کا دھوکا تو نہیں ہے؟" اس نے زینب کو اپنے گلے سے لگا کر بھینچ لیا۔ جیسے یقین کرنا چاہ رہا ہو کہ وہ واقعی اس کے سامنے اس کمرے میں موجود ہے۔

یہ ایک رومانی منظر تھا۔ میں نے کچھ دیر کے لیے اسکرین سے نگاہیں ہٹالیں۔ دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے دروازہ کھولا۔ سامنے انیق کھڑا تھا۔ "چلیں جی؟" اس نے پوچھا۔

"نہیں، پانچ دس منٹ ٹھہرو۔" میں نے جواب دیا۔ "ایک ضروری کال کرنی ہے۔"

وہ "اوکے" کہتا ہوا دوسری طرف چلا گیا۔ دروازہ بند کر کے میں دوبارہ موبائل فون کی اسکرین کی طرف متوجہ ہوا تو منظر کچھ اور جذباتی ہو چکا تھا۔ وہ دونوں گلے لگے ہوئے تھے اور شاید دونوں رو رہے تھے۔

شہر میں ایک بار پھر خطرے کے سائرن بجنے شروع ہو گئے تھے۔ کہیں دور ہیلی کاپٹرز کے پروں کی پھڑپھڑاہٹ بھی سنائی دی۔ اینٹی ائرکرافٹ گنوں نے فائرنگ کی اور پھر خاموشی چھا گئی۔ خطرہ ٹلنے کے سائرن گونجنے لگے۔ دو تین منٹ کے لیے ابراہیم اور زینب کیمرے کے فریم سے نکل گئے تھے۔ تب ابراہیم دوبارہ فریم میں آیا۔ اس نے کھڑکی کا پردہ ذرا سا ہٹا کر باہر جھانکا اور اسے دوبارہ برابر کر دیا۔ اب کنٹرول لائن کی طرف سے پھر توپوں کی گھن گرج سنائی دینے لگی تھی۔ یہ رات کی طرح شدید تو نہیں تھی مگر مسلسل سنائی دے رہی تھی۔ زینب فریم میں داخل ہوئی اور بڑے جذب کے ساتھ ابراہیم کی بانہوں میں سما گئی۔ اس کی مدھم آواز بڑی وضاحت سے میری سماعت تک پہنچی۔

"میں آپ کی ہو جانا چاہتی ہوں ابراہیم! مجھے اپنا بنا لیں۔ میں آپ کو خود سے اور دور نہیں رکھ سکتی۔ مجھے ایسی زندگی نہیں چاہیے جو آپ کو تڑپاتی رہے...... اور اب زندگی کا بھروسا بھی کیا ہے۔ کسی بھی وقت کچھ بھی ہو سکتا ہے۔" اس نے اپنا چہرہ ابراہیم کے بازوؤں میں گھسا دیا۔

وہ اردو بول رہی تھی۔ لیکن محبت کی اپنی زبان ہوتی ہے۔ وہ ایک دوسرے کی باتیں بہت کم سمجھ پا رہے تھے لیکن پھر بھی سب کچھ سمجھ رہے تھے۔ میں نے حیران ہو کر دیکھا...... زینب نے اپنا شال نما دوپٹا سر سے سرکا دیا۔ وہ فرش پر گر گیا۔ اس نے سامنے کی طرف اپنے ریشمی چغے کی کسی ڈوری کو ڈھیلا کر دیا تھا۔ وہ ایک دوسرے کی بانہوں میں الجھے تو ریشمی چغا سرسرا کر اس کے شانوں سے نیچے چلا

گیا۔ یہ وقت ابراہیم کے لیے بھی ایک کڑے امتحان کی طرح تھا۔ وہ جیسے ایک مدوجزر میں ڈوب ابھر رہا تھا۔ جیسے ایک ہی جسم کے ساتھ دو مختلف راستوں پر سفر کرنا چاہ رہا تھا۔ اپنے ''زہریلے خون'' کے ساتھ زینب سے دور بھی جانا چاہ رہا تھا اور آنکھیں بند کر کے اس کی بانہوں میں کھونا بھی چاہتا تھا۔

اس نے خود کو پیچھے ہٹانے کی کوشش کی لیکن محبوب دلہن کی کشش بے پناہ تھی۔ مجھے اس کا چہرہ دکھائی نہیں دے رہا تھا مگر وہ مکمل خود سپردگی کی کیفیت میں تھی۔ ایک مشرقی بیوی کی محبت کی یہ ایک بے بدل مثال تھی۔ وہ جانتی تھی کہ اس کے شوہر کے پاس اس کے لیے موت ہے مگر وہ شوہر کی تڑپ کو اپنی زندگی سے زیادہ اہمیت دے رہی تھی۔

وہ دونوں کیمرے کے بالکل نزدیک تھے۔ کیمرے کا نہایت حساس آڈیو سسٹم ان کی مدھم سرگوشیاں بھی ''پک'' کر رہا تھا۔ ''نو زینب! آئی کانٹ ڈو دس۔ نہیں زینب۔'' اس نے آخری ایک دو لفظ اردو میں کہے۔

وہ عجب لہجے میں بولی۔ ''نہیں، مجھے کچھ نہیں ہوگا۔ آپ ان باتوں کا نہ سوچیں۔ اگر اللہ کو زندگی منظور ہے تو......'' بعد کے الفاظ سمجھ میں نہیں آسکے۔

چند لمحوں کے لیے مجھے لگا کہ وہ کچھ ہونے جا رہا ہے جو ہرگز نہیں ہونا چاہیے۔ وہ دونوں ایک طوفان کی زد میں تھے۔ میں اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ میں انیکسی میں سے نکلتا تو صرف ایک منٹ میں اس کمرے تک پہنچ سکتا تھا جہاں وہ دونوں موجود تھے لیکن میری دلی خواہش تھی کہ مجھے مداخلت نہ کرنا پڑے...... اور میری یہ خواہش پوری ہوئی۔

ابراہیم کی کراہتی ہوئی سی آواز میرے کانوں میں پڑی۔ ''میں...... یہ نہیں کرسکتا زینب...... میں تمہاری زندگی سے نہیں کھیل سکتا......''

اس نے بمشکل خود کو اپنی محبوب بیوی سے علیحدہ کیا اور اس کے دونوں مرمریں ہاتھ تھام کر چومنے لگا۔ اس کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ ''میری زینب...... میری پیاری زینب...... اگر ہماری محبت سچی ہے تو ہم ضرور ملیں گے۔ ہزار رکاوٹوں کو عبور کر کے بھی ملیں گے اور اگر خدانخواستہ...... بدقسمتی نے ساتھ نہ چھوڑا...... ہمارے جسم نہ بھی مل سکے...... تو روحیں تو ملی ہوتی ہیں۔'' وہ بہ زبان انگریزی بولتا چلا گیا۔

زینب کچھ دیر بھیگی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھتی رہی۔ اس کے چہرے پر دکھ اور خوشی کی ملی جلی کیفیت تھی۔ پھر وہ دوبارہ اپنے شوہر سے چمٹ گئی لیکن اب اس کا انداز مختلف تھا۔ ابراہیم نے اس کی پیشانی پر بوسہ دیا اور بڑی محبت سے اس کا شال نما دوپٹا اس کے سر پر رکھ دیا۔

چند کلومیٹر دور فرنٹ پر جو فائرنگ ہو رہی تھی، اس سے پتا چل رہا تھا کہ حملے کی شدت بڑھتی چلی جا رہی ہے۔ دوسری طرف یہ پتا بھی چل رہا تھا کہ رائے زل کی فائرنگ پاور بہت زیادہ ہے جبکہ قسطینا اور کمانڈر افغانی سنبھال سنبھال کر ایمونیشن استعمال کر رہے ہیں۔ ان کی طرف سے اگر چار شیل فائر ہوتے تھے تو ادھر سے شاید ایک جاتا تھا۔

''ہمارا فوراً محاذ پر پہنچنا ضروری ہے۔'' میں نے انیق سے کہا۔

''میں تو کب سے تیار بیٹھا ہوں، آپ کی کال ہی لمبی ہوتی جا رہی تھی۔'' اس نے چبھتے لہجے میں کہا۔

ہم باہر نکلے۔ ایک بار پھر درجنوں رضا کار اور سپاہی میری طرف لپکے اور مجھے دیکھ کر پُرجوش نعرے لگانے لگے۔ دو فوجی افسر تیزی سے میری طرف بڑھے اور انہوں نے مجھے روک لیا۔ ''سوری جناب! آپ کے راستے میں آ رہے ہیں، آپ کو عزت مآب نے طلب فرمایا ہے۔'' ایک آفیسر نے شستہ انگلش میں کہا۔

میں اور انیق ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے۔ ساتھ ہی ذہن میں خطرے کی گھنٹی بھی بجی...... بہرحال انکار کی گنجائش نہیں تھی۔ پانچ منٹ بعد ہم ڈی پیلس کے اس اہم ترین حصے میں موجود تھے جہاں ریان فردوس کی رہائش تھی۔ انیق ایک بار پھر بیرونی نشست گاہ میں رہا تھا۔ یہاں مرتبے کے لحاظ سے ڈی پیلس کے بہترین گارڈز اور مسلح ترک خواتین موجود تھیں۔ دو تین ڈری سہمی خواصیں بھی نظر آئیں جن میں سنبل بھی شامل تھی۔ آج ہر وقت اس کے سینے سے چمٹا رہنے والا مینا بھی کہیں دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ تھوڑی ہی دیر پہلے مجھے انیق کی زبانی یہ جان کر حیرت ہوئی تھی کہ ان سنگین ترین حالات میں بھی تین چار دن پہلے ریان فردوس ایک نئی لڑکی کو حرم میں داخل کرنے سے باز نہیں آیا۔ یہ وہی بھارتی حسینہ تھی جو آج کل سنبل کی جگہ لینے کی کوشش کر رہی تھی۔ میں عزت مآب کی پُرشکوہ نشست گاہ میں داخل ہوا تو اس سترہ اٹھارہ سالہ کافر ادا حسینہ کی ایک جھلک نظر آئی۔ جونہی ہم اندر گئے وہ خادماؤں کے جھرمٹ میں ایک عقبی دروازے میں اوجھل ہوگئی۔

''تخلیہ۔'' میرے اندر داخل ہوتے ہی ریان فردوس نے حکم دیا۔

چند ہی سیکنڈ بعد وسیع نشست گاہ میں صرف ریان

فردوس ایک مترجم اور دو گارڈز رہ گئے لیکن گارڈز اتنی دوری پر کھڑے تھے کہ ہماری آواز آسانی سے ان تک نہیں پہنچ سکتی تھی۔ میرے اور ریان فردوس کے درمیان مترجم کے ذریعے جو گفتگو ہوئی وہ کچھ اس طرح تھی۔

ریان فردوس نے پوچھا۔ ''تم کیا لینے آئے تھے یہاں، تم تو محاذ پر دادِ شجاعت دے رہے تھے؟'' اس کے لہجے میں طنز کی کاٹ تھی۔

میں نے ادب سے کہا۔ ''عزت مآب! مجھے ہز ہائی نس ابراہیم نے طلب فرمایا تھا۔''

''تم سے جاننا چاہ رہا ہوگا کہ رائے زل اور چیف گیرٹ کے سپاہی کتنی دیر تک ڈی پیلس میں داخل ہوں گے...... اور کب تک ہماری عورتوں کے سروں سے چادریں اور ہمارے قدموں کے نیچے سے زمین کھینچنا شروع کر دیں گے؟'' ریان فردوس کا لہجہ مسلسل زہر آلود تھا۔

''گستاخی معاف! میں عزت مآب کے غصے کی وجہ سمجھ نہیں پا رہا۔ آپ کے وفادار سر دھڑ کی بازی لگائے ہوئے ہیں۔ آپ کی آن پر کٹ مرنے کے لیے تیار ہیں۔''

''بکواس بند کرو۔'' ریان فردوس دہاڑا۔ ''یہ باتیں سن سن کر میرے کان پک گئے ہیں۔ میری آن پر کٹ مرنے سے کیا ہوگا؟ کیا وہ خونی طوفان رک جائے گا جو ڈی پیلس کے دروازوں پر دستک دے رہا ہے۔ تم جیسے لوگوں نے...... اور قسطینا اور افغانی جیسے لوگوں نے خود اپنے گلے میں موت کا پھندا ڈالا ہے۔ اب وہ لوگ تمہیں جاماجی کی گلیوں میں گھسیٹتے پھریں گے۔ تم بے وقوفوں نے کیا سمجھا تھا، برج کلب کو تباہ کر لیا تو فتح کا راستہ کھل گیا تمہارے لیے؟ پھولوں کے ہار پڑ گئے تمہاری گردنوں میں؟''

میں نے کہا۔ ''عزت مآب! میں آپ کا ایک ادنیٰ سپاہی ہوں۔ میری یہ حیثیت نہیں کہ آپ کے سامنے دلیلیں پیش کروں، لیکن اتنا ضرور کہوں گا کہ برج کلب کی تباہی نے رائے زل اور ایجنسی کی کمر توڑ دی تھی۔ جاماجی کا فیصلہ کن حملہ ان کے تابوت میں آخری کیل ٹھونک سکتا تھا لیکن اپنوں کی غداری نے دشمن کو چوکس کر دیا اور گرین فورس کو ایمونیشن سے محروم کر کے کمزور کرنے کی کوشش کی مگر دشمن کے سامنے سینہ تان کر کھڑی ہونے والی گرین فورس اور ہزاروں رضا کار اب بھی ناامید نہیں ہیں۔ وہ ایک ایک انچ کا دفاع کر رہے ہیں۔''

''بکواس بند کرو۔'' وہ چنگھاڑا۔ ''یہ گھسے پٹے جملے مجھے مت سناؤ۔ وہ ایک ایک انچ کا دفاع کریں یا ایک ایک ملی میٹر کا، وہ رائے زل اور ایجنسی کی مشترکہ طاقت کو روک پا رہے ہیں یا نہیں۔ بولو...... روک پا رہے ہیں یا نہیں؟''

ریان فردوس کی چنگھاڑیں سن کر بیگم نورل بھی اندر چلی آئیں۔

بیگم نورل نے میرا دفاع کرنا چاہا تو ہمارے سامنے ہی بیگم نورل اور ریان فردوس میں تند و تیز جملوں کا تبادلہ شروع ہو گیا۔ یہ ملائی زبان کا مکالمہ تھا جو کچھ میری سمجھ میں آ رہا تھا وہ کچھ اس طرح سے تھا۔ ریان فردوس غیظ و غضب کے عالم میں بیگم نورل اور دوسرے عاقبت نااندیشوں کو لتاڑ رہا تھا۔ وہ بیگم نورل سے کہہ رہا تھا کہ اس کی خودسر بھتیجی (قسطینا) اس ساری صورتِ حال کی اصل ذمے دار ہے۔ طیش میں ریان فردوس کی جلد کے سرخ داغ اور سرخ ہو گئے تھے۔

دوسری طرف بیگم نورل بھی پھٹ پڑی تھی۔ وہ کہہ رہی تھی کہ بے موت مرنے سے لڑ کر جان دینا بہتر ہے اور صورتِ حال کی بات کرتے ہوئے ہم اپنے اندر کے غداروں کو کیوں بھول جاتے ہیں۔ آقا جان اور حلمی جیسے لوگوں نے کیا کیا ہے ہمارے ساتھ۔

میں یہ جان کر دنگ رہ گیا کہ ریان فردوس اب بھی آقا جان کی حمایت کر رہا تھا۔ اس کو شک کی گنجائش دے رہا تھا۔ بیگم نورل کا پیمانۂ صبر بھی لبریز ہو گیا۔ وہ آقا جان کو کوسنے دینے لگی۔

ریان فردوس گرجا۔ ''تم لوگوں کا اندھا جوش تمہیں موت کے گڑھے میں دھکیلے گا۔ میں تو اب بھی کہتا ہوں اس عقل کی اندھی کو سمجھاؤ...... وہ ہتھیار پھینک دے۔ وہ لوگ اب بھی صلح کی آفر کر رہے ہیں۔''

بیگم نورل نے کہا کہ وہ جانتی ہے یہ صلح کیسی ہوگی۔ آپ کے وفاداروں کو آپ کے سامنے چن چن کر موت کے گھاٹ اتار دیا جائے گا۔

اس بحث کے دوران میں ہی مارٹرز اور بزوکا وغیرہ کے شیل ڈی پیلس سے تقریباً نصف کلومیٹر کے فاصلے پر پھٹنے لگے۔ اس کا صاف مطلب تھا کہ رائے زل اور ایجنسی کا اتحاد پیش قدمی کر رہا ہے۔ قسطینا اور کمانڈر افغانی بے جگری سے لڑنے کے باوجود پسپا ہو رہے ہیں۔ شیل پھٹنے کی ہولناک آوازوں سے ڈی پیلس میں کہرام سا مچ گیا۔ بالائی منزل سے بھی بے شمار خواتین کے چلانے کی آوازیں آ رہی تھیں۔

اس افراتفری کا فائدہ اٹھا کر میں عزت مآب کی

نشست گاہ سے باہر نکل آیا۔ میں اب انیق کو لے کر جلد از جلد ''فرنٹ'' پر قسطینا کے پاس پہنچنا چاہتا تھا۔ ابھی میں نشست گاہ سے بیس پچیس قدم دور ہی آیا تھا کہ ایک طرف سے سنبل نکلی۔ اس نے مجھے روک لیا۔

''تم بہت جلدی میں ہو لیکن میری ایک بات سن لو۔'' وہ میرے سامنے کھڑی ہوگئی تھی۔

''جلدی کہو۔'' اس کے التجا آمیز لہجے نے مجھے رکنے پر مجبور کردیا۔

''یہاں بڑی ڈراؤنی باتیں ہو رہی ہیں۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ جن لوگوں نے حملہ کیا ہے، ان میں سے کچھ جادو اور کالا علم جانتے ہیں۔ وہ اس کے زور پر سب کو ختم کردیں گے۔ یہ بھی کہا جا رہا ہے کہ..... کہ.....'' وہ بول نہ سکی۔ گلا رندھ گیا۔

''کیا کہا جا رہا ہے؟''

''یہ بڑے ظالم لوگ ہیں۔ کل رات انہوں نے جن جگہوں پر قبضہ کیا ہے، وہاں عورتوں اور لڑکیوں کو پکڑ کر لے گئے ہیں۔ ان کے ساتھ بہت برا کر رہے ہیں۔ بہت سی عورتوں کو مار دیا گیا ہے۔'' سنبل کی آواز لرز رہی تھی۔

''تم فکر نہ کرو سنبل! ہم تمہاری حفاظت کریں گے۔ یہاں ہزاروں لوگ ہیں جو آخری آدمی اور آخری گولی تک لڑنے کے لیے تیار ہیں۔''

''م..... میں کسی بھی طرح یہاں سے نکلنا چاہتی ہوں۔ سنا ہے کہ تمہاری یہاں بہت مانی جا رہی ہے۔ کیا تم میری مدد کرسکتے ہو۔ عزت مآب نے مجھے جو تحفے دے رکھے ہیں ان کی قیمت بہت زیادہ ہے۔ پورا ایک صندوق بھرا پڑا ہے۔''

''بے وقوفی کی باتیں مت کرو۔ یہاں بہت سے لوگوں کے پاس بہت سے صندوق بھرے پڑے ہیں۔ حوصلہ رکھو اور وقت کا انتظار کرو۔'' میں نے ترش لہجے میں کہا اور آگے بڑھ گیا۔

وہ چھوٹے دل دماغ کی پیشہ ور لڑکی تھی۔ اس سے ایسی ہی بات کی توقع کی جاسکتی تھی۔ میں انیق کو لے کر اندرونی پورشن سے نکلا اور ایک بار پھر احاطے میں پہنچا۔ کچھ ہی دیر بعد ہم کیپٹن کے ساتھ اسپیشل فوجی گاڑی میں بیٹھے تیزی سے محاذ کی طرف جا رہے تھے۔ شہری آبادی پر گولے گرنے کا آغاز ہوا تھا تو خود بخود ہی لوگوں کا انخلا شروع ہوگیا تھا۔ سڑکوں پر گاڑیوں کی قطاریں لگی ہوئی تھیں۔ لوگ جزیرے کے محفوظ مقامات کی طرف جانے کی کوشش کر رہے تھے مگر راستے مسدود تھے۔ ہماری گاڑی خصوصی پروٹوکول کے ذریعے آگے بڑھی اور ایمرجنسی گاڑیوں والی لین میں سفر کرتی ہوئی آگے بڑھتی چلی گئی۔ زندگی میں کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ اس قسم کے حالات کا سامنا ہوگا۔ یہ اسٹریٹ فائٹنگ اور گینگ وار سے بہت آگے کی چیز تھی۔ شہر کی بیشتر آبادی راہ فرار اختیار کر چکی تھی، اب مارٹرز اور بزوکا وغیرہ کے گولے خالی گھروں کو کھنڈر بنا رہے تھے۔ جگہ جگہ گھروں اور گاڑیوں کو آگ لگی ہوئی تھی۔

''مجھے لگتا ہے بھائی کہ سچویشن ہمارے اندازے سے زیادہ خراب ہے۔'' انیق نے ایک جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

میں نے دیکھا..... ایک موبائل فوجی اسپتال کے قریب قسطینا کی خاص بم پروف گاڑی کھڑی تھی۔ یہ موبائل اسپتال ایک بڑے ٹریلر میں قائم تھا اور اس پر ریڈ کراس کا جھنڈا لہرا رہا تھا۔ ساتھ میں گرین فورس کا جھنڈا بھی تھا۔

انیق نے کہا۔ ''اگر ہر ہائی نس قسطینا کی گاڑی یہاں موجود ہے تو عین ممکن ہے کہ وہ مورچوں میں زخمی ہونے کے بعد یہاں پیچھے آگئی ہوں۔''

انیق کی بات میں وزن تھا۔ موبائل اسپتال کے اردگرد پروٹوکول کی گاڑیاں نظر آرہی تھیں اور دو چار ایسی گاڑیاں بھی تھیں جو اعلیٰ فوجی افسران کے استعمال میں لائی جا رہی تھیں۔ موبائل اسپتال ایک ٹیلے کی آڑ میں پارک کیا گیا تھا۔ میرے کہنے پر کیپٹن نے گاڑی کا رخ اسپتال کی جانب کردیا۔ ہمارے اوپر سے توپوں کے شیل ایک باریک گونج پیدا کرتے ہوئے گزر رہے تھے۔

ہمیں کمانڈر فارس نظر آیا۔ اس نے سراسیمہ لہجے میں کہا۔ ''ہر ہائی نس زخمی ہوگئی ہیں۔ بازو اور گھٹنے پر زخم آئے ہیں۔ زخم تو زیادہ سنگین نہیں لیکن خون کافی بہا ہے۔''

میں ٹریلر کے اندر پہنچا۔ خون کا اخراج روکنے کے لیے قسطینا کے بازو اور ٹانگ پر بینڈیج کی جا چکی تھی۔ زیادہ خون بہہ جانے سے اس کا رنگ زرد ہو رہا تھا مگر وہ بے قرار نظر آرہی تھی۔ اس نے ڈاکٹر سے کہا۔ ''میں باہر جانا چاہتی ہوں۔ میرے سپاہیوں کو میری ضرورت ہے۔''

''لیکن آپ کو آرام کی ضرورت ہے۔ یہ عارضی بندوبست ہے۔ آپ کا خون پھر رسنا شروع ہوجائے گا۔'' ڈاکٹر نے ادب سے کہا۔

قسطینا ڈاکٹر کا ہاتھ جھٹک کر اٹھ بیٹھی۔ لیکن اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتی ایک شیل ٹریلر سے صرف پچاس ساٹھ فٹ

کی دوری پر گرا اور اس کے پرخچے کنٹینر کی دیواروں سے ٹکرائے۔ ابھی ہم اس دھماکے سے سنبھل بھی نہ پائے تھے کہ دوسرا شیل آیا اور اس نے اس گاڑی کو نشانہ بنایا جس پر دو چار منٹ پہلے ہم یہاں پہنچے تھے۔ گاڑی تباہ ہو گئی اور اس کے ساتھ ہی وہ کیپٹن بھی اپنی سرزمین پر قربان ہو گیا جو ہمیں یہاں تک لے کر آیا تھا۔ اس کے جوان جسم کے ٹکڑے ہمارے سامنے بکھرے ہوئے تھے۔ اس کی گرین شرٹ کی دھجیاں ایک درخت پر ٹنگی نظر آئیں۔

''لگتا ہے کہ دباؤ بڑھتا جا رہا ہے۔'' میں نے قسطینا سے مخاطب ہو کر کہا۔

میری بات کی تائید گولیوں کی ایک بوچھاڑ نے کی جو 18 پہیوں والے اس دیوہیکل ٹریلر سے ٹکرائی تھی۔ تب ہماری نگاہ دائیں جانب اٹھی۔ گرین فورس کی چند بکتر بند گاڑیاں اور ملٹی بیل راکٹ لانچرز آہستہ آہستہ پیچھے ہٹ رہے تھے۔ یہ مزید پسپائی کے آثار تھے۔ یہی وقت تھا جب دو ہائی ایکس گاڑیاں آندھی کی رفتار سے موبائل اسپتال کے قریب آ کر رکیں۔ ان میں سے ایک گاڑی کے اندر سے کمانڈر افغانی برآمد ہوا اور بھاگتا ہوا موبائل اسپتال کے اندر پہنچ گیا۔ اس نے کہا۔ ''یور ہائی نس قسطینا! کمانڈر اوان کوئی ڈیڑھ ہزار لشکریوں کے ساتھ لڑائی سے باہر ہو گیا ہے۔ دشمن کا دباؤ بڑھتا جا رہا ہے۔ ہمیں اب آخری دفاعی لائن پر پہنچنا ہو گا۔''

آخر دفاعی لائن کا سن کر قسطینا کا زرد رنگ مزید زرد ہو گیا۔ وہ بھی سمجھ رہی تھی کہ آخری دفاعی لائن ڈی پیلس ہی ہے۔

''رائے زل کے دستے کتنی دور ہیں؟'' قسطینا نے پوچھا۔

''جنوب کی طرف سے وہ دو کلومیٹر سے زیادہ نہیں ہیں۔ میرا مشورہ ہے کہ آپ فوراً ڈی پیلس تک پیچھے ہٹ جائیں اور ڈی پیلس کے دروازے اندر سے بند کر لیں۔ میں اور میرے ساتھی رائے زل کو آگے بڑھنے سے روکتے ہیں۔'' افغانی کا لہجہ چٹان تھا۔

''نہیں کمانڈر افغانی! میں میدان چھوڑ کر ڈی پیلس میں پناہ نہیں لوں گی۔ آپ سب کے ساتھ لڑوں اور مروں گی۔''

''ہم ڈی پیلس میں مورچا بند ہو کر رائے زل کو اور ایجنسی والوں کو کئی دن تک روک سکتے ہیں۔ اس دوران میں برونائی سے کمک آ جائے گی۔'' افغانی نے دلیل دی۔

چند منٹ تک افغانی اور قسطینا میں زوردار بحث ہوئی۔ آخر افغانی نے قسطینا کو قائل کر لیا کہ وہ اپنے دستوں کے ساتھ پیچھے ہٹتی چلی جائے اور ڈی پیلس کی بلند فصیلوں کے اندر پہنچ جائے۔ طے ہوا کہ کمانڈر افغانی، کمانڈر فارس اور ان کے سب سے تربیت یافتہ دستے جن کو پاسبان کہا جاتا تھا، آخری دفاعی لائن پر دشمن کی پیش بندی روکیں گے، کم از کم ..... اس وقت تک، جب تک قسطینا اپنے دستوں اور باقی محفوظ فوج کے ساتھ ڈی پیلس میں داخل نہیں ہو جاتی۔''

میں نے افغانی سے مخاطب ہو کر اردو میں کہا۔

''کمانڈر افغانی! میں تمہارے ساتھ رہنا چاہوں گا۔''

''برادر! امارے خیال میں تمہارا ضرورت بی بی قسطینا کے ساتھ زیادہ ہے۔''

''آپ نے سارے خطرے مول لینے کا ٹھیکا نہیں لے رکھا۔ کچھ ہاتھ پاؤں ہمیں بھی چلانے دیں۔''

''اوئے میرے برادر! تم یہ کیا کہہ رہا ہے؟ تم نے ہاتھ پاؤں ہلایا ہے تو اللہ نے مدد فرمایا ہے اور بی بی قسطینا دشمن کے گھیرے سے نکلا ہے۔ اب بھی تم اس کی حفاظت کا ذمے داری اٹھاؤ۔''

''میں سمجھتا ہوں کہ بی بی قسطینا کی حفاظت وہی لوگ کریں گے جو ان کو سلامتی سے ڈی پیلس میں داخل ہونے کا موقع دیں گے اور میں ان لوگوں میں ہی شامل رہنا چاہتا ہوں۔''

قسطینا نے عجیب نظروں سے میری طرف دیکھا۔ ان میں غصہ بھی تھا، ستائش بھی تھی اور محبت بھی۔ لیکن وہ کچھ بولی نہیں۔ وہ اب تک اچھی طرح جان چکی تھی کہ میں بے شک اس کو یور ہائی نس اور یور ایکسی لینسی کہتا ہوں لیکن کرتا وہی ہوں جو میری مرضی ہوتی ہے۔ درحقیقت میں نے یہاں اپنا آپ منوایا تھا اور یہ لوگ میری بات کو اہمیت دینے پر مجبور تھے۔ ویسے بھی اب یہ لڑائی مجھے اپنی لڑائی لگ رہی تھی۔ میں نے زینب کی حفاظت کی ذمے داری اپنے کاندھوں پر لی ہوئی تھی، میں نے جاناں کی لاش اپنے ہاتھوں میں اٹھائی تھی، میں نے آقا جان سے نفرت اور دشمنی کا بیج لڑایا ہوا تھا اور یہ حریص امریکن ..... ان کے لیے میرے دل میں انگارے تھے..... ہاں میرا دشمن اول جان ڈیرک بھی تو ایک امریکن ہی تھا۔

☆☆☆

اور یہ سہ پہر کے بعد کا وقت تھا۔ ڈی پیلس کے عین سامنے فیصلہ کن لڑائی ہو رہی تھی۔ یہ ڈی پیلس کا مشرقی مین گیٹ تھا۔ جیسا کہ میں نے پہلے بتایا ہے کہ ڈی پیلس کے باقی دو گیٹس کو موٹی دیواریں لگا کر قریباً بیس فٹ بلندی تک چن دیا گیا تھا۔ اب وہ گیٹ ڈی پیلس کی قلعہ نما فصیل کا حصہ بن چکے تھے۔ اب صرف یہی مین گیٹ تھا۔ اس گیٹ

کو بھی چند دن پہلے بے حد محفوظ شکل دی جا چکی تھی۔ یہ خاص قسم کے اسٹین لیس اسٹیل کی کئی انچ موٹی چادر تھی جو دو طرف سے سلائیڈ کر کے بند ہوتی تھی۔ گولی تو کیا اسے راکٹ اور ہیوی شیل بھی نقصان نہیں پہنچا سکتے تھے۔ اس کی دو پرتیں تھیں اور دونوں پرتوں کے درمیان شدید دھماکوں کا دباؤ برداشت کرنے والے ''ویکیومز'' تھے۔

آگے اور پیچھے کے وسیع و عریض احاطوں والا ڈی پیلس عملی طور پر ایک قلعے کی شکل اختیار کر گیا تھا۔ اس کے سب سے اونچے برج پر جاماجی کا ایک دیوہیکل پرچم لہرا رہا تھا۔ بیس فٹ اونچی دیوار پر M16 اور ''بیلٹ فیڈڈ'' ٹائپ کی ہیوی مشین گنیں نصب تھیں۔ اندر کی طرف پختہ چبوتروں پر مارٹر اور بزوکا وغیرہ کی قطاریں تھیں۔

گرین فورس کے دستے پیچھے ہٹتے ہوئے ڈی پیلس میں داخل ہوتے جا رہے تھے...... اور سامنے والے وسیع احاطے میں پوزیشنیں سنبھال رہے تھے۔ کچھ چھتوں پر مورچا زن ہو گئے تھے۔ (لشکری یعنی رضا کار اس سے پہلے ہی ڈی پیلس میں پہنچ گئے تھے یا پھر ساحل کی طرف نکل گئے تھے)

افغانی اور دیگر کمانڈر، پاسبان نامی جانبازوں سمیت تقریباً دو درجن پختہ مورچوں میں موجود تھے اور حملہ آور گرے فورس کے سامنے دیوار بنے ہوئے تھے۔ میں اور انیق بھی ان لوگوں کے ساتھ ہی موجود تھے۔ سیف کو بہت سی جھاڑیں پلا کر میں نے ڈی پیلس میں بھیج دیا تھا۔ جب تک قسطینا اپنے خاص دستوں سمیت ڈی پیلس میں نہیں پہنچ گئی، ہم پر بے پناہ دباؤ رہا۔ اس کے بعد ہم نے خود کو قدرے ''ایزی'' محسوس کیا۔ مگر بارود اب بھی بارش کی طرح ہم پر برس رہا تھا۔ جلتے گوشت اور بارود کی بو مل جل کر دماغ پر عجیب اثر کرتی ہے۔ کانوں کے پردے مسلسل لرزتے رہتے ہیں اور کسی وقت بہرے پن کی کیفیت محسوس ہوتی ہے۔ ہم نے آخر وقت تک ڈی پیلس میں داخل ہونے والے ساتھیوں کو COVER دیا۔ پھر پاسبان بریگیڈ کے جانباز بھی چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں ڈی پیلس میں داخل ہونے لگے۔

آخر وہ اسٹیج آئی جب کمانڈر افغانی نے مجھ سے کہا۔ ''برادر! اب ام کو بھی پیچھے ہٹنا ہے۔ لیکن یہ کافی مشکل کام ہے۔ جونہی ام مورچوں سے نکلے گا اور پیچھے جائے گا یہ خنزیر کا بچہ ام پر چڑھائی کرے گا۔''

''یہ بات تو ہے۔'' میں نے تائید کی۔ ''ہم قریباً سو میٹر تک کھلی جگہ پر ہوں گے۔''

افغانی نے وائرلیس پر ڈی پیلس کے اندر رابطہ کیا اور اپنے کسی ساتھی سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''ہیلو رازی خان! اب ام کو آرٹلری کا ہیوی فائر کا ضرورت ہے۔ میجر وارث کے ساتھ مل کر بھرپور حملہ کرو تا کہ ام پیچھے ہٹ سکے۔''

دوسری طرف سے پُرجوش جواب ملا۔ ''ام تیار ہے۔ کیا ام ٹھیک دو منٹ بعد حملہ شروع کر دے؟''

افغانی نے کہا۔ ''ہاں...... اور اس کے ساتھ ہی گیٹ بھی کھلوا دینا۔''

یہ واقعی نازک ترین صورتِ حال تھی۔ دباؤ بڑھتا جا رہا تھا۔ ہم پانچ دس منٹ سے زیادہ، ڈی پیلس سے باہر نہیں رہ سکتے تھے اور اندر جاتے ہوئے بھی شدید ترین خطرے سے گزرنا تھا۔

میری پریشانی دیکھ کر کمانڈر افغانی نے جوش سے میرا کندھا تھپتھپایا۔ ''ام کو تمہارے حوصلے نے بہت متاثر کیا۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

اِمارا زندگی رہا اور ام جیسے لوگوں کا ساتھ رہا تو ام ان ''پرتگیوں'' کو ناکوں چنے چبوا دے گا۔''

کمانڈر افغانی نہیں جانتا تھا اور مجھے بھی معلوم نہیں تھا کہ یہ آخری ''بات'' ہے جو ہم ایک دوسرے سے کر رہے ہیں۔

ٹھیک دو منٹ بعد افغانی کے آرڈر کے مطابق ڈی پیلس کی فصیل نما دیوار کے اوپر سے ہیوی مشین گنز، مارٹرز اور ایم آر ایل کا شدید ترین اٹیک گرے فورس پر ہوگیا۔ ہمارے سامنے گرد اور دھوئیں کی دیواری سی کھڑی ہوگئی، اس گرد اور دھوئیں میں مسلسل دھماکے اور شعلے تھے۔ میں نے مڑ کر دیکھا ڈی پیلس کا عظیم الشان سلائڈنگ دروازہ کھلنا شروع ہوگیا تھا۔

افغانی اور اس کے قریباً ایک سو ساتھی مورچوں سے نکل کر دروازے یعنی گیٹ کی طرف بڑھے، میں اور انیق بھی اس جتھے میں شامل تھے۔ بیشتر افراد الٹے پاؤں، فائرنگ کرتے ہوئے جا رہے تھے۔ کچھ منہ پھیر کر بھی دوڑ رہے تھے۔ یہ موت کا سفر تھا۔ میرے سامنے کئی افراد زخمی ہو کر گرے۔ بالآخر ہم گیٹ میں داخل ہوگئے۔ گیٹ اب پورا کھلنے کے بعد بند ہونا شروع ہوگیا تھا۔ میں نے مڑ کر دیکھا۔ افغانی اب بھی گیٹ کی دوسری طرف موجود تھا۔ بحری جہاز کے کپتان کی طرح وہ اب بھی خطرے کے بھنور میں تھا۔ میں نے دیکھا، وہ ایک زخمی ساتھی کو بازو سے گھسیٹتا ہوا گیٹ کی طرف لا رہا ہے۔ وہ دوسرے ہاتھ سے کلاشنکوف کا فائر کر رہا تھا۔ پھر میں نے اسے بھی زخمی ہو کر گھٹنوں کے بل گرتے دیکھا۔ میں نے بے قرار ہو کر اس کی طرف لپکنا چاہا مگر انیق نے مجھے پکڑ لیا۔ اسی دوران میں گیٹ بھی سلائڈ کر کے مکمل بند ہوگیا۔

ہم نے سائڈ پر لگے سی سی ٹی وی مانیٹر پر دیکھا۔ کمانڈر افغانی اور اس کے دو تین ساتھی سینہ تان کر حملہ آوروں کے سامنے کھڑے تھے۔ گولیوں کی باڑیں ان کے جسموں سے ٹکرائیں اور انہیں چھلنی کر گئیں۔ لیکن مرتے دم تک وہ بھی جوابی فائرنگ کرتے رہے۔ یہ بہادروں کی موت تھی، یہ سرفروشوں کا اندازِ سفر تھا...... تاریخ کے صفحات ایسے لوگوں کی رودادِ شجاعت سے بھرے پڑے ہیں۔

☆☆☆

ڈی پیلس گھیرے میں آچکا تھا۔ رات کا اندھیرا چھا گیا تھا اور لڑائی وقتی طور پر رک گئی تھی۔ یہ ایک بڑے سخت دن کا اختتام تھا۔ ڈی پیلس کے اطراف میں اَن گنت لاشیں بکھری ہوئی تھیں۔ ان میں دشمن کی لاشیں تھیں اور اپنی بھی۔ زخمی ہونے والے بھی سیکڑوں میں تھے۔

مقامی لوگوں کے مطابق بھی افغانی کی شہادت کنفرم ہو چکی تھی مگر اس شہادت نے لشکریوں اور سپاہیوں کے حوصلے توڑے نہیں تھے مزید مضبوط کیے تھے۔ قسطینا نے فوری طور پر کمانڈروں اور انتظامی عہدیداروں کی ایک میٹنگ طلب کی۔ بیگم نورل اور ریان فردوس کی نمائندگی کرتے ہوئے ابراہیم بھی یہاں موجود تھا۔

قسطینا نے کہا۔ ''اب یہ زندگی اور موت کی جنگ بن چکی ہے۔ آج ہمارے شہید ہونے والے ساتھیوں نے ہمارے سامنے ایک ہی راستہ کھلا چھوڑا ہے اور وہ راستہ ہے لڑ کر جینے کا یا مرنے کا...... اور میرا خیال ہے یہاں موجود سب لوگ بے توقیری کی زندگی سے عزت کی موت کو ترجیح دیں گے۔ آخری سانس تک لڑنا چاہیں گے۔''

بہت سے پُرجوش نعرے ہال کمرے میں گونجنے لگے۔ کچھ لوگوں نے افغانی کے بڑے بڑے پوسٹرز فضا میں بلند کیے اور اسے زبردست خراج تحسین پیش کیا۔ افغانی کا دست راست کمانڈر فارس جان اپنی نشست پر کھڑا ہوگیا اور اس نے تقریر کرنے والے انداز میں کہا۔ ''آج ہم اس شہید کے وارث بن گئے ہیں جس نے ڈی پیلس کے دروازے کے سامنے آخری سانس تک مزاحمت کی اور اپنی جان کا نذرانہ پیش کیا۔ اس نے ہمارے سینوں میں نہ بجھنے والی آگ کو کچھ اور ہوا دی ہے۔ ہم انشاء اللہ اس آگ میں رائے زل اور اس کے خانوادے کو راکھ کر کے چھوڑیں گے......''

کمانڈر افغانی کے برعکس فارس جان انگلش بھی ٹھیک بول لیتا تھا۔ اس کی پُرجوش تقریر کے بعد سپریم کمانڈر قسطینا نے صلاح مشورے شروع کیے۔ قسطینا نے سب سے آرا طلب کیں۔ میری باری آئی تو اس نے مجھے بھی بولنے کے لیے کہا۔

ذرا تذبذب کے بعد میں نے کہا۔ ''میں کوئی عسکری تجربہ نہیں رکھتا اور نہ اس حوالے سے میرا کوئی دعویٰ ہے۔ ہاں میں نے کچھ گینگ وارز دیکھی ہیں اور لڑنے والوں کی نفسیات سمجھتا ہوں۔ مجھے لگتا ہے کہ ہم اس وقت ایک محدود جگہ پر کثیر تعداد میں موجود ہیں۔ ہمیں نشانہ بنایا جانا آسان ہے اور یقیناً بنایا بھی جائے گا۔''

''ام آپ کی بات کی تائید کرتا ہے۔'' کمانڈر فارس جان نے کہا۔ ''ام پر زمین سے گولا باری ہوگا اور پضائی (فضائی) حملہ بھی بہت نقصان دہ ہوسکتا ہے۔''

میں اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''جہاں تک

مجھے یاد پڑتا ہے، کچھ دن پہلے لڑائی کی شروعات میں ایجنسی کے بہت سے امریکی پکڑ کر ڈی پیلس میں لائے گئے تھے۔ ان میں عورتوں اور بچوں کے علاوہ کافی تعداد مردوں کی بھی تھی۔ عزت مآب نے ان سب لوگوں کو اپنی حفاظت میں لے لیا تھا۔ یقیناً وہ لوگ اب بھی یہیں ڈی پیلس میں ہوں گے۔''

''تم کیا کہنا چاہتے ہو مسٹر شاہ زائب؟''

''جہاں تک میں ان گوروں کو جانتا ہوں، وہ خود کو آسمان سے اُتری ہوئی مخلوق سمجھتے ہیں۔ ان کے نزدیک ان کے ایک ''ہم قوم'' کی جان عام لوگوں کی سو جانوں سے زیادہ قیمتی ہوتی ہے۔''

ابراہیم نے کہا۔ ''کیا آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ ان مرد قیدیوں کو بارگیننگ کے لیے استعمال کیا جائے؟''

''ایسا ہوسکتا ہے۔ یہ سب کے سب بہت اہم لوگ ہیں۔ ایجنسی والے ہر صورت ان کی جان بچانا چاہیں گے۔ بلکہ ہوسکتا ہے کہ اگر ہم اپنے اس ''آپشن'' کو اچھے طریقے سے استعمال کریں تو رائے زل اور ایجنسی میں اختلاف بھی پیدا ہو جائے۔''

کسی نے کہا۔ ''لیکن عورتیں اور بچے......؟''

''میں عورتوں اور بچوں کی نہیں صرف مردوں کی بات کررہا ہوں۔ وہ مرد جو ہماری آستینوں کے سانپ بنے ہوئے تھے اور ہم سے جنگ کرنے کے لیے یہاں موجود تھے۔ میری رائے میں، رائے زل تک یہ پیغام پہنچایا جائے کہ وہ لوگ زندہ سلامت ہیں اور ہمارے پاس یہاں ڈی پیلس میں ہیں۔''

''بات تو ٹھیک ہے۔'' قسطینا نے کہا۔ اس سے پہلے کہ وہ اپنا فقرہ مکمل کرتی ایک زوردار دھماکے نے اس ہال کمرے کے درودیوار لرزا دیے۔

اور یہ ایک دھماکا نہیں تھا۔ یکے بعد دیگرے ساعت شکن دھماکے شروع ہوگئے۔ کمانڈر فارس جان چلایا۔ ''وہ حرامی ہر حد تک جانے کے لیے تیار ہے۔ وہ ڈی پیلس پر حملہ کررہا ہے......'' اس کی آواز دھماکوں کے شور میں دب کر رہ گئی۔

میٹنگ ادھوری ہی چھوڑ دی گئی۔ سب لوگ ہال کمرے سے نکل کر پناہ گاہوں کی طرف لپکے۔ قسطینا بالائی منزل کے ایک مضبوط بنکر میں چلی گئی۔ وہ بھی زخمی تھی مگر اس نے اپنی چوکسی میں کوئی فرق نہیں آنے دیا تھا۔ بالائی منزل سے وہ ڈی پیلس کی فصیل نما دیوار اور دیوار سے آگے بھی دیکھ سکتی تھی۔ میں اور کمانڈر فارس جان بھی اس کے ساتھ تھے۔ اب رات کے قریباً نو بج چکے تھے۔ شدید گولا باری ایک مہلک آتش بازی کا منظر پیش کررہی تھی۔ ہمارے سامنے درجنوں گولے ڈی پیلس کے مختلف حصوں پر گرے۔ شعلے بھڑکنے لگے اور آہ و بکا کی آوازیں ایک بلند و بالا شور کا روپ دھار گئیں۔

یہ دوطرفہ ہیوی شیلنگ قریباً دس منٹ جاری رہی۔ ڈی پیلس کی فصیل کا ایک حصہ منہدم ہوگیا لیکن یہ جزوی نقصان تھا۔ یہاں سے اندر نہیں آیا جاسکتا تھا۔ گولا باری تھمی تو میں بنکر سے نکل کر اس حصے کی طرف دوڑا جہاں ڈاکٹر ماریہ کی رہائش گاہ تھی۔ وہاں سے بھی دھواں اٹھ رہا تھا۔ بھاگتے ہوئے میرا انگ انگ چیخ رہا تھا۔ مجھے سب سے زیادہ فکر زینب کی تھی۔ ابراہیم مجھ سے پہلے ہی یہاں پہنچ چکا تھا۔ وہ اندرونی حصے میں چلا گیا۔ ایک منٹ بعد باہر آکر اس نے مجھے سرگوشی میں بتایا۔ ''اللہ کا شکر ہے وہ بالکل محفوظ ہے۔ ایک ملازمہ کو کچھ زخم آئے ہیں۔''

ہم ڈی پیلس کے اس حصے کی طرف بڑھے جہاں زیادہ تباہی ہوئی تھی اور باقاعدہ آگ لگی ہوئی تھی۔ ڈی پیلس کی بلندیوں پر لہرانے والا جاماجی کا جہازی سائز کا جھنڈا ٹوٹ کر احاطے میں گرا پڑا تھا۔ شعلوں کی روشنی میں کچھ لاشیں بھی نظر آئیں۔

''مائی گاڈ۔'' میرے منہ سے بےساختہ نکلا۔

سامنے خانساماں ازمیر طیب مردہ حالت میں پڑا تھا۔ کسی شیل کا پرخچا اس کی فربہ گردن کو چیر کر نکل گیا تھا۔ اس کی پالتو بندریا لوسی اس کے چاروں جانب چکرا رہی تھی۔ اس کے اپنے پاؤں سے بھی خون بہہ رہا تھا۔ ہم ملبے کو پھلانگتے ہوئے آگے بڑھے۔ ایک لاش سے ابراہیم کو ٹھوکر لگی۔ وہ گرتے گرتے بچا۔ میں نے دیکھا، یہ اس لڑکی کی لاش تھی جس نے مجھے ایک دن پہلے ڈی پیلس کے ایک کوریڈور میں روکا تھا اور میرے پاؤں چومنے کی کوشش کی تھی۔ اس کا کلیجا اس بات پر ٹھنڈا ہوا تھا کہ میں نے آقا جان کے منہ پر سرعام ایک یادگار تھپڑ رسید کیا ہے اور اب وہ ہر خوشی غمی سے آزاد ہوچکی تھی۔

''یہ دیکھیں شاہ زیب بھائی!'' ابراہیم نے کہا۔ مجھے شنبل کے سفید میمنے کی خونچکاں لاش نظر آئی۔ اس کی انتڑیاں پیٹ سے باہر تھیں...... تو کیا شنبل کی لاش بھی یہیں کہیں پڑی ہوگی؟ میں نے بڑے کرب کے ساتھ سوچا۔

یہاں روشنی بہت کم تھی۔ ڈی پیلس کے اس حصے میں بجلی کا نظام درہم برہم ہوچکا تھا۔ ایک سیکیورٹی گارڈ نے ایک ٹارچ ابراہیم کو اور دوسری مجھے تھما دی۔ میں ٹارچ کی

روشنی میں اردگرد کے مناظر دیکھنے لگا۔ اگر میسنا یہاں موجود تھا تو سنبل بھی مردہ یا زخمی حالت میں یہاں پائی جاسکتی تھی۔

سنبل تو کہیں دکھائی نہیں دی مگر جو دیگر مناظر نظر آئے وہ لرزہ خیز تھے۔ درحقیقت یہ ڈی پیلس کا وہ حصہ تھا جہاں بڑی تعداد میں عورتوں اور بچوں نے پناہ لے رکھی تھی۔ مارٹرز وغیرہ کے کئی شیل یہاں گرے تھے۔ پتا چلا تھا کہ یہ شیل 300 پونڈ سے زائد وزنی ہوتے ہیں اور ایک قوس بناتے ہوئے بلندی سے نیچے آتے ہیں۔ ان شیلز نے زبردست جانی نقصان کیا تھا۔ ننھی کلیاں خون میں لتھڑی ہوئی تھیں۔ ایک چھ سات سالہ نازک اندام لڑکا ایک بھاری ستون کے نیچے یوں پچکا ہوا تھا کہ اس کی صرف پنڈلیاں اور جوتے ہی نظر آرہے تھے۔ کئی عورتوں کی کٹی پھٹی لاشیں یہاں موجود تھیں۔ ایک عورت اوندھی پڑی تھی اور اس نے اپنے شیرخوار کو آخری دم تک سینے سے چمٹائے رکھا تھا۔ ماں بچہ دونوں ختم ہو چکے تھے۔

سینہ شق ہونے لگا۔ سماعت سن ہوگئی۔ ہر طرف ماتمی آوازیں گونج رہی تھیں۔ پاسبان بریگیڈ کے جوان زخمیوں کو ملبے کے نیچے سے نکالنے کی کوششوں میں مصروف تھے۔ ان میں کچھ عام لوگ بھی شامل ہوگئے تھے۔ مجھے ان مددگاروں میں انیق اور سیف بھی دکھائی دیے۔ ابراہیم کا رنگ ہلدی ہو رہا تھا۔ حرکات وسکنات سے نقاہت ٹپکتی تھی۔ مجھے ڈر لگا کہ اس لڑکے کو کچھ ہو نہ جائے۔ میں اسے لے کر وہاں سے نکل آیا۔ ہم ڈی پیلس کے فرسٹ فلور پر پہنچے۔ یہاں بلندی سے ڈی پیلس کے اردگرد کے مناظر نظر آئے۔ قریباً نصف کلومیٹر کے فاصلے پر ان گنت روشنیاں چمک رہی تھیں۔ بے شمار ''توپ گاڑیاں'' اور بکتر بند دستے ڈی پیلس کو گھیر چکے تھے۔ کسی بھی وقت دوبارہ اندھا دھند گولا باری شروع ہو سکتی تھی۔ میرے بدن میں آگ سی دہک رہی تھی۔ میں سیدھا قسطینا کے پاس پہنچا۔ جواں سال کمانڈر فارس جان بھی قریب ہی موجود تھا۔

میں نے کہا۔ ''یور ہائی نس! یہ لوگ درندگی پر اتر آئے ہیں۔ ان کو روکنے کا اب ایک ہی طریقہ ہے۔ ان امریکیوں کو ان کے سامنے لایا جائے۔''

''کیا کہنا چاہتے ہو شاہ زائب؟''

''امریکن قیدیوں میں جو مرد ہیں، انہیں علیحدہ کیا جائے اور ان کو اپنے بچوں، عورتوں کے تحفظ کے لیے استعمال کیا جائے۔ ان کو انسانی ڈھال بنایا جائے۔''

قسطینا کی آنکھوں میں سوچ ابھری اور کمانڈر فارس کا چہرہ تمتما اٹھا۔ میں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''کہتے ہیں کہ محبت اور جنگ میں سب کچھ جائز ہوتا ہے اور جب دشمن ایسے بے رحم ہتھکنڈوں پر اتر آئے تو پھر دفاع کرنے والے کو بھی ہر طریقہ اختیار کرنا پڑتا ہے۔ ان کے مردوں کو تہ خانوں سے نکال کر ڈی پیلس کے مختلف حصوں میں باندھ دیا جائے۔ اس شیطان رائے زل اور چیف گیرٹ کو بتایا جائے کہ اگر وہ ڈی پیلس کے رہائشی حصوں پر گولا باری کریں گے تو سب سے پہلے ان امریکنوں کے چیتھڑے اڑیں گے۔''

کمانڈر فارس جوش سے دایاں ہاتھ اٹھا کر بولا۔ ''ام آپ کی بات کی پوری حمایت کرتا ہے۔ یہ بھیڑیے ہیں...... ان کو چیر پھاڑ سے روکنے کا یہ بہت مناسب طریقہ ہے۔ امارا دھیان پہلے ہی اس طرف جانا چاہیے تھا۔''

قسطینا نے کہا۔ لیکن اگر......''

''لیکن...... کچھ نہیں یور ہائی نس۔ آپ ذرا جا کر زنان خانے کا منظر ملاحظہ فرمائیں۔ دیکھیں وہاں کیسے عورتوں اور بچوں کے چیتھڑے اڑے ہوئے ہیں...... اور ابھی اور اڑنے والے ہیں۔''

کمانڈر فارس جان نے کہا۔ ''گستاخی معاف یور ہائی نس! اب ہمیں یہ کرنا ہی پڑے گا۔''

قسطینا کی خاموشی نیم رضامندی کی طرح تھی۔ کمانڈر فارس نے اسے زوردار سیلیوٹ کیا اور باہر نکل گیا۔

تھوڑی ہی دیر بعد ہم ڈی پیلس کے تہ خانوں میں تھے۔ اب یہاں قریباً چار سو امریکی مرد و زن جمع ہو چکے تھے۔ ان میں نصف تعداد عورتوں اور بچوں کی تھی۔ ان امریکنوں میں کئی بڑے صنعت کار اور تاجر تھے جو اس جزیرے میں بہتر موقعوں کی تلاش میں پہنچے ہوئے تھے۔ کچھ ریسرچر تھے۔ یہ بات خاص و عام میں کہی سنی جارہی تھی کہ اس چھوٹے سے جزیرے میں معدنیات کا خزانہ موجود ہے۔ قیدیوں میں کچھ ایسے مال دار سیاح بھی تھے جو اہلِ خانہ سمیت یا تنہا اس جزیرے کی سیاحت کو آئے ہوئے تھے لیکن اس وقت یہ سب کے سب مصیبت میں تھے۔ ان کی حالت قیدیوں جیسی ہی تھی۔ لباس وہی تھے جو کئی دن پہلے بھی ان کے جسموں پر دکھائی دیے تھے۔ اکثر مردوں کی شیو بڑھی ہوئی تھی۔ تاہم ان لوگوں کو خوراک وغیرہ کی کمی محسوس نہیں ہوتی تھی۔ دیگر سہولتیں بھی انہیں حاصل تھیں۔

جب گرین فورس کے سپاہیوں نے مردوں کو عورتوں سے علیحدہ کرنا شروع کیا تو شور برپا ہوگیا۔ عورتیں چلّانے لگیں۔ بچے اپنے باپوں سے لپٹنے لگے، کئی خواتین نے مزاحمت

شروع کر دی۔ ان کا خیال یہ تھا کہ ان کے مردوں کو قتل کرنے کے لیے باہر لے جایا جارہا ہے۔

''عزت مآب ہم پر رحم کرو...... عزت مآب ہماری بات سنو...... تم کہاں ہو عزت مآب......'' ایک درمیانی عمر کی عورت دردناک انداز میں پکاری۔

میں نے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔ ''واویلامت مچاؤ۔ ہم انہیں پھانسی چڑھانے نہیں لے جارہے۔ بس ان کو دوسری جگہ رکھنے کا حکم ہے۔''

''تم جھوٹ بول رہے ہو...... بکواس کررہے ہو۔'' وہ عورت انگلش میں چلا کر بولی اور میرا گریبان پکڑنے کے لیے آگے بڑھی۔ راستے میں ہی کمانڈر فارس کا زبردست تھپڑ اس کے منہ پر پڑا اور وہ عورتوں پر جاگری۔

فارس انگلش میں گرجا۔ ''ابھی ان حرام زادوں کو کچھ نہیں ہوگا لیکن اگر دنگا کروگی تو پھر ہم واقعی ان کو شوٹ کر دیں گے۔''

فارس جان کے تاثرات دیکھ کر عورتیں سہم گئیں، تاہم کئی ایک نے مزاحمت جاری رکھی۔ گرین فورس کے جوان، مردوں کو دھکیلتے ہوئے باہر لے آئے۔ عورتوں اور بچوں کو وہیں بند رہنے دیا گیا۔ پروگرام کے مطابق ہم وہ خاص جگہیں پہلے ہی چن چکے تھے جہاں ان تقریباً ڈیڑھ سو افراد کو باندھا جانا تھا۔ ان میں سے قریباً سو افراد کو بالائی منزل کی کھڑکیوں کے قریب اور باقی افراد کو نیچے باندھنے کا پروگرام تھا۔ یہ ساری کارروائی بڑی شتابی سے پندرہ بیس منٹ کے اندر مکمل ہوگئی۔ کمانڈر فارس نے اس سے پہلے ہی رائے زل سے وائرلیس پر رابطہ کیا اور اسے بتادیا کہ اب اگر ڈی پیلس پر گولا باری ہوگی تو پہلے ڈیڑھ سو امریکنوں کی جان جائے گی۔

اس کارروائی کا نتیجہ عین ہماری توقع اور منشا کے مطابق نکلا۔ گرے فورس اور ایجنسی کا اتحا، ڈی پیلس پر گولا باری کے دوسرے دور کے لیے بالکل تیار نظر آتا تھا، لیکن اس بندوبست کے بعد وہاں خاموشی چھاگئی۔ یہ تدبیر کارگر ہوتے دیکھ کر گرین فورس کے جوانوں اور رضاکاروں کے چہرے دمک اٹھے۔ ان میں اعتماد دکھائی دینے لگا۔ جابجا کے گرے ہوئے جھنڈے کی جگہ ایک نیا جھنڈا لہرایا گیا اور ایک بار پھر جنگی نعرے سنائی دینے لگے۔ اسی دوران میں مجھے تابوتوں کی ایک طویل قطار دکھائی دی۔

انیق نے بتایا۔ ''یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے لڑائی میں جان دی ہے۔ کمانڈر افغانی، کمانڈر رواحد اور براڈے کے جسد خاکی بھی ان میں شامل ہیں۔ ان تابوتوں کو آخری رسوم سے پہلے سردخانے کی طرف لے جایا جارہا ہے۔''

بہت سے لوگ ان تابوتوں کے پیچھے پیچھے چلنے لگے۔ اپنے کمانڈر افغانی کے لیے اور دیگر شہیدوں کے لیے ان کے جذبات چھلکے پڑرہے تھے۔ وہی جنگی ترانہ یہاں بھی کورس کی شکل میں پڑھا جانے لگا۔

ہم جاتے اندھیرے تک لڑیں گے
ہم سچے سویرے تک لڑیں گے
اور اگر ہم واپس نہ آسکے
تو ہمارے بچوں سے کہنا ہم سرخرو ہوئے

قسطینا نے ایک بار پھر کمانڈرز اور آفیسرز کی میٹنگ طلب کی۔ اس مرتبہ بیگم نورل بھی اس میں شریک ہورہی تھیں (وہ عزت مآب کی نمائندگی کررہی تھیں جو مبینہ طور پر صدمے کی کیفیت میں تھے) اس میٹنگ میں رائے زل اور امریکن افسروں سے لینڈ لائن یا وائرلیس کے ذریعے بات چیت ہونے جارہی تھی۔ قسطینا نے مجھے بھی طلب کیا تھا لیکن میری حالت بُری تھی۔ یہ اور بات ہے کہ میں کسی کو بتا نہیں رہا تھا۔ بازو اور ٹخنے سے مسلسل درد کی ناقابلِ بیان ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔ اب لڑائی میں کچھ وقفہ آیا تھا تو میرا دل چاہ رہا تھا کہ بازو کا پلاستر اترواؤں اور دیکھوں کہ اس کی کیا درگت بنی ہے۔ انیق کا خیال بھی یہی تھا کہ مجھے فوراً سے پیشتر بازو کا معائنہ کرانا چاہیے۔

میں نے کہا۔ ''معائنہ کراؤں گا تو وہ مجھے پکڑ کر وہیں اسپتال میں بٹھالیں گے اور یہ میں ابھی نہیں چاہتا۔''

''کیا مطلب؟''

''اگلے دو تین دن کافی نازک ہیں۔ میں ابھی بستر پر لمبا لیٹنے کا پروگرام نہیں رکھتا۔''

''نازک دنوں سے کیا مطلب؟''

''کچھ بھی ہوسکتا ہے۔'' میں نے کہا۔ پھر انیق کو بتایا کہ میں چاہتا ہوں، ڈاکٹر ماریہ کو اعتماد میں لے کر اسے بازو کی صورتِ حال دکھادوں۔''

قریباً پندرہ منٹ بعد میں اس کشادہ کمرے میں موجود تھا جہاں ہمیں رات گزارنا تھی۔ میں نے بڑی رازداری سے ماریہ کو بلایا تھا اور اس سے کہا تھا کہ وہ مجھے ''پرائیویٹلی'' دیکھے اور جو عارضی بندوبست ہوسکتا ہے وہ کرے۔ وہ اپنا میڈیکل باکس اور ایک دوسر جیکل اوزار ساتھ لائی تھی۔ اس نے خون آلود پلاستر کو کاٹا اور بازو سے علیحدہ کیا۔ بازو کی حالت نے اس کی تشویش میں اضافہ کیا۔

''نہیں شاہ زیب صاحب۔'' وہ شستہ انگریزی میں بولی۔ ''آپ نے تو بہت بیڑا غرق کر لیا ہے..... یہ تو فوری آپریشن کا کیس ہے۔''

اسی دوران میں کمرے میں موجود لینڈ لائن فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ میں نے دایاں ہاتھ بڑھا کر ریسیور اٹھایا۔ دوسری طرف قسطینا کے سیکریٹری کی آواز تھی، وہ بولا۔ ''مسٹر شاہ زیب بات کر رہے ہیں؟'' میں نے اثبات میں جواب دیا۔ اس نے اطلاع دی۔ ''ہر ہائی نس آپ سے بات کرنا چاہتی ہیں۔'' چند سیکنڈ بعد ریسیور میں قسطینا کی رعب دار آواز سنائی دی۔ ''ہیلو شاہ زائب! تم میٹنگ میں کیوں نہیں آئے۔ سب نے تمہارے بارے میں پوچھا۔''

میں نے ڈاکٹر ماریہ کو آنکھ مارتے ہوئے کہا۔ ''بس ایک بہت ضروری کام تھا، بعد میں بتاؤں گا۔''

وہ بولی۔ ''تمہارے لیے اطلاع ہے کہ 72 گھنٹے کے لیے لڑائی روکنے کی ہماری تجویز رائے زل اور اس کی امی جان صاحبہ نے مان لی ہے۔ اس دوران میں ہم بات چیت کے ذریعے خونریزی ٹالنے کی کوشش کر سکتے ہیں۔''

''ویل ڈن۔''

''ویل ڈن تمہارے لیے بھی۔ مجھے یہ تسلیم کرنے میں کوئی عار نہیں کہ تمہاری اس بروقت تجویز نے کام کیا ہے..... اور مجھے امید ہے تمہاری تجویزیں آئندہ بھی کام کریں گی۔''

''شکریہ..... لگتا ہے کہ یہ وقفہ ہمارے لیے کافی فائدہ مند ثابت ہوگا۔''

وہ بولی۔ ''معلوم ہوا ہے کہ رائے زل اور اس کی والدہ تو فوراً حملہ کرنے کے حق میں تھے مگر ایجنسی والوں کو ہم وطن امریکنوں کی جانیں عزیز ہیں۔ انہی کے دباؤ پر لڑائی تھمی ہے۔''

قسطینا کا دھیان کئی سمتوں میں بٹا ہوا تھا، پھر بھی اس نے میرے بازو کے زخم کے سلسلے میں بات کی اور مجھے فوری معائنہ کرانے کا حکم دیا۔

کال ختم ہوئی تو ڈاکٹر ماریہ سر پکڑے بیٹھی تھی۔ بولی۔ ''مسٹر شاہ زیب! تم نے اپنے بازو کا حشر خراب کر لیا ہے۔ میں بہت دکھ کے ساتھ یہ محسوس کر رہی ہوں کہ شاید ''مکس مارشل آرٹ'' کا میدان ایک بڑے کھلاڑی سے محروم ہو چکا ہے۔''

میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ ''یہ تو بعد کی باتیں ہیں ڈاکٹر ماریہ! فی الحال ڈنگ ٹپاؤ کارروائی کیا ہو سکتی ہے؟ میں کسی بھی صورت اگلے دو تین دن تک آپریشن کے چکر میں پڑنا نہیں چاہتا۔''

''لیکن خدانخواستہ..... خدانخواستہ اگر تمہیں بازو کٹوانا پڑ گیا تو پھر؟''

کافی بحث مباحثے کے بعد ڈاکٹر ماریہ مجھے عارضی ''ٹریٹ منٹ'' دینے کے لیے تیار ہوئی۔ اس نے طاقتور قسم کا اینٹی بائیوٹک انجکشن لگایا کیونکہ کندھے بلکہ پورے بازو میں سوجن اور انفیکشن موجود تھی۔ اس نے درد کش انجکشن بھی دیا۔ اس کے بعد ایک دو زخم صاف کیے اور کندھے سمیت بازو کو اس طرح پلاسٹک کے خول اور پٹیوں میں جکڑ دیا کہ ٹوٹی اور کھسکی ہوئی ہڈی کا مزید نقصان نہ ہو۔ آخر میں اس نے کہا۔ ''یہ سب کچھ آپ کے مجبور کرنے پر ہے مسٹر شاہ زیب! میں بری الذمہ ہوں۔''

انیق، انجکشن اور انفیوژن وغیرہ اچھی طرح لگا دیتا تھا۔ ماریہ نے اسے سمجھا دیا کہ اینٹی بائیوٹک اور پین کلرز کس طرح اور کتنے وقفے سے لگنے ہیں۔

وہ رات نسبتاً پرسکون تھی۔ مگر اس سکون کے پیچھے طوفان کی پھنکاریں بھی موجود تھیں۔ دونوں طرف کی فورسز مورچوں کے اندر آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بیٹھی تھیں اور انگلیاں ٹریگرز پر رکھی ہوئی تھیں۔ ڈی پیلس کے اندر تین سو کے قریب کمرے تھے پھر بھی یہ کم پڑ رہے تھے۔ میں، انیق اور سیف ایک ہی کمرے میں تھے۔ کئی لوگ مجھ سے ملنا چاہ رہے تھے اس لیے اس کمرے سے باہر گارڈز کا پہرا لگا دیا گیا تھا۔ بہت طاقتور اور مرغن قسم کا فوجی کھانا کھانے کے بعد ہم لیٹ گئے۔ خاص طور سے مجھے تو یہی لگا کہ ایک عرصے بعد آرام دہ بستر اور خطرے سے خالی رات نصیب ہوئی ہے۔ انجکشنز کی وجہ سے درد کو بھی آرام تھا۔ راوی ''کافی حد تک'' چین لکھ رہا تھا۔

جزیرے میں جو ڈاک آتی تھی، آج اس میں ایک خط انیق کے لیے بھی تھا بلکہ یہ دو خط تھے جو اس دور دراز جگہ تک پہنچے تھے۔ ایک خط کا ذکر میں آگے جا کر کروں گا، ایک خط کا ذکر کر دیتا ہوں۔ اس خط نے ان سنگین اور دکھی حالات میں بھی ہمارے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ بکھیر دی۔ یہ پہلوان حشمت کا خط تھا۔ میں اس کا کچھ حصہ بیان کرتا ہوں۔

''یہاں سب خیریت ہے۔ حقیقت بتاتا ہوں، تم اور شاہ زیب بہت یاد آتے ہو۔ میرا بہت دل چاہتا تھا کہ تم لوگوں کے ہمراہ اس طویل سفر پر نکلوں مگر قسمت کو منظور نہیں تھا۔ یہاں مجھے عالمگیر اور پیر ولایت کی طرف سے شدید خطرات لاحق رہتے ہیں۔ سوچتا ہوں بیوی بچوں کے ساتھ شہر کی طرف نکل جاؤں لیکن شہر مجھ کو راس آئے گا نہ میری

شاعری کو۔ میری شاعری کی ساری جڑیں تو میری دھرتی اور کھیتوں کھلیانوں میں ہیں۔ بڑی عمر کے پودے کو اس کی جگہ سے پٹ کر کہیں اور لگایا جاوے تو اس کا سواسطیاناس ہو جاوت ہے۔

ہر پودا ہر زمیں پر نا ہیں ہوتا
کہیں پر ہوتا ہے کہیں پرنا ہیں ہوتا
کچھ بستیوں میں انسان بھی مرجھاتے ہیں
بکریوں کی طرح سر اپنے جھکاتے ہیں
نہ کچھ پیتے ہیں، نہ کچھ کھاتے ہیں

میں بھی بیمار بکری بننا نا ہیں چاہتا۔ اس سے تو بہتر ہے کہ اسی گاؤں کے کسی گوشے میں چپ چاپ پڑا رہوں اور اگر میری قسمت میں عالمگیر کے ہاتھوں ذبح ہونا ہی لکھا ہے تو ہو جاؤں۔ تم لوگوں کی واپسی کا ہر گھڑی انتظار رہتا ہے۔ پتا نا ہیں کن غور کھ دھندوں میں پھنسے ہوئے ہو۔ تاجور چلی گئی، ریشمی کا بھی دیاہ ہو گیا ہے۔ آہستہ آہستہ چاند گڑھی ویران ہوتا جار ہا ہے۔ تم آؤ گے تو شاید کچھ رونق ہووے گی...... وہ کیا شعر ہے

غلوں میں رنگ بھرے، بادِ نو بہار چلے
چلے بھی آؤ کہ گلشن کا کاروبار چلے

آگے جا کر ایک جگہ پہلوان حشمت راہی صاحب یوں رقمطراز تھے...... پہلے چنگا ویلا تھا، ہمارے حساب سے...... ڈانگ سوٹے کی لڑائی میں ہڈیاں شڈیاں ٹوٹتی تھیں۔ مریض آتے تھے۔ اب تو فائرنگ کا دور ہے، ٹھاہ گولی اندر جان باہر۔ بس تھوڑا بہت موٹر سائیکل کا آسرا ہے۔ کبھی کبھی تو سوچت ہوں کہ ہڈی جوڑ کے کام کو خیر آباد کہہ دوں، اپنی ساری طوانائی شاعری پر لگاؤں۔ اب خیر سے مجھے، میلوں ٹھیلوں میں ہونے والے مشاعروں میں دعوت دی جانے لگی ہے...... تم لوگ آؤ گے تو تمہیں دکھاؤں گا۔''

خط پڑھنے کے بعد میں اور انیق دیر تک پہلوان کی باتیں کرتے رہے۔ سادہ لوح لیکن محبت سے لبالب بھرا ہوا شخص۔ پہلوان کے بعد گفتگو کا رخ سجاول کی طرف مڑ گیا۔ ایک بار پھر انیق کا یہ سنسنی خیز دعویٰ زیرِ بحث آیا کہ اس نے گھمسان کی لڑائی میں سجاول سیالکوٹی کی جھلک دیکھی ہے، پندرہ بیس منٹ کی گفتگو کے بعد ہم کسی حتمی نتیجے پر نہیں پہنچ سکے۔ ہماری گفتگو کے دوران میں ہی سیف سو گیا (اس نے دو چھوٹے پیگ لگائے تھے) ویسے بھی وہ بہت تھکا ہوا تھا۔ انیق بھی تھوڑی ہی دیر میں سو گیا، مگر میں جاگتا رہا۔ ذہن میں خیالات کا ہجوم تھا۔ واقعات اتنی تیزی سے رونما ہو رہے تھے کہ سوچیں درہم برہم ہو گئی تھیں۔ سجاول کی گمشدگی، جاناں کی غم ناک موت، آقا جان کی کھلی غداری، گرین فورس کی پسپائی، کمانڈر افغانی کی جدائی...... اور بہت کچھ۔ اچانک مجھے اپنے سیل فون کا خیال آیا۔ تجسس جاگا کہ اپنے اسپائی کیمرے کو دیکھوں، میں نے سیل فون کی مطلوبہ ''ایپلی کیشن'' میں جا کر وڈیو ریسیور کو فعال کیا۔ میرے لیے یہ ایک خوشگوار اتفاق تھا کہ کیمرا ابھی تک سگنل دے رہا تھا اور شادی شدہ جوڑا ابھی کمرے میں موجود تھا۔ ابراہیم ایک شاندار صوفے پر بیٹھا تھا۔ زینب اس کے عقب میں موجود تھی اور بڑی محبت سے اس کے سر میں کسی چیز کی مالش کر رہی تھی۔ دونوں کا بس سائڈ پوز دکھائی دے رہا تھا۔ وہ کچھ فاصلے پر تھے اس لیے گفتگو پلے نہیں پڑ رہی تھی۔ نئی دلہنوں جیسے خوش رنگ لباس میں سرو قد زینب دلکش نظر آ رہی تھی۔ اس کی ست رنگی چوڑیاں چھنچھنا رہی تھیں۔ ابراہیم نے اس کا نازک ہاتھ اپنے سر سے ہٹا کر اپنے چہرے کی طرف کیا اور پشت کی طرف سے چوم لیا۔ وہ شرما گئی۔ پھر اس نے عقب سے ابراہیم کے گلے میں بانہیں ڈال دیں اور اس پر جھک گئی، اس کے رخسار پر اپنا رخسار رکھ دیا۔ میں نے ایک خوش گوار احساس کے ساتھ رابطہ منقطع کر دیا۔ ان دونوں کو ملا کر مجھے ایک انجانی مسرت ہوئی تھی۔ مگر ابھی یہ ملاپ ادھورا تھا۔ ابھی ان کے درمیان سے ایک خوفناک رکاوٹ کا ہٹایا جانا ضروری تھا...... زینب اور ابراہیم کو مسرور دیکھ کر میرا دھیان ایک بار پھر اپنی اس ''محبت'' کی طرف چلا گیا جو مجھ سے دور ہو چکی تھی۔ کاش کسی نے ہم کو بھی ملانے کی کوشش کی ہوتی، جدائی سے بچا لیا ہوتا۔

کھڑکیوں سے باہر خنک اندھیرا تھا۔ فضائی حملے وغیرہ کا اندیشہ نہیں تھا۔ پھر بھی احتیاطاً ڈی پیلس کی بہت سی روشنیاں بند تھیں۔ میری توجہ اپنی دائیں طرف سوئے پڑے گبرو جوان سیف پر مرکوز ہو گئی۔ زندگی کے ہر رنگ سے بھرا ہوا، زندہ دل شخص تھا۔ اس کے پاس ہی اس کا موبائل فون بھی پڑا تھا۔ پتا نہیں کیوں میں نے وہ فون اٹھا لیا۔ اس کے مختلف فولڈرز میں جھانکتا رہا۔ اخلاقی طور پر یہ غلط تھا مگر نجانے کیوں، میں یہ کر رہا تھا۔ میسج، کونٹیکٹس، کال لاگ...... گیلری...... وائس ریکارڈر...... میں کئی آپشنز میں گیا۔ گیلری میں موجود تصویروں اور وڈیوز میں بھی کئی دیہی منظر نظر آئے۔ ایک وڈیو کبڈی کے کسی سنسنی خیز میچ کی تھی۔ ایک انعامی تقریب کی جس میں سیف ٹیم کے کپتان کی حیثیت سے ایک بڑا کپ اٹھائے کھڑا تھا۔ کئی چھوٹے بڑے وڈیو کلپس ایک میلے کے تھے۔ یکا یک مجھے حیرت کا

شدید دھچکا محسوس ہوا۔ ایک کلپ میں مجھے تاجور اپنی کسی سہیلی کے ساتھ نظر آئی۔ میری رگوں میں خون سنسنا اٹھا۔

میں نے چور نظروں سے پہلے سیف اور پھر انیق کی طرف دیکھا۔ دونوں دنیا و مافیہا سے بے خبر تھے۔

میں نے ہیڈ فون لگا کر یہ کلپ پلے کیا۔ میں دنگ رہ گیا۔ مجھے اندازہ ہوا کہ یہ وڈیو کلپ تاجور کی بے خبری میں بنایا گیا ہے۔ کسی جگہ پہلے سے موبائل سیٹ کر دیا گیا تھا اور ریکارڈنگ کی گئی تھی۔ کمرے میں روشنی کم تھی پھر بھی دونوں لڑکیوں کے چہرے قریباً صاف نظر آتے تھے۔ ساتھی لڑکی نے مدھم آواز میں کہا۔ ''تاجو...... دیکھ میں نے تو اپنی ساری ''اے جی، پی جی'' تجھے بتا دی ہے۔ کچھ بھی چھپایا نہیں۔ اب تو بھی کچھ بتا نا...... کون تھا وہ؟''

''بس اتنا ہی ہے، جتنا بتا دیا تجھے...... اور اب کچھ بھی نہیں ہے۔ اب تو وہی کچھ ہے جو ماں پیو نے میرے لیے چُنا ہے۔''

''اوئے، تو میں کب کہہ رہی ہوں تو پھر اس کے پاس جا بیٹھ۔ یہی پوچھ رہی ہوں نا کہ کب ملا تھا؟ کیسے ملا تھا؟'' وہ شوخی سے بولی۔

تاجور نے ایک لمبی سانس لی۔ ''بس کوئی تھا بانو، چاند گڑھی کا نہیں تھا۔ باہر سے آیا تھا۔ کچھ دیر وہاں رہا۔ پھر وہ اپنے راستے، میں اپنے راستے۔'' وہ عجیب لہجے میں بولی اور اس کی لٹیں چہرے پر ڈھلک آئیں۔

''کوئی بات...... کوئی ملاقات؟''

''بس ایک دو دفعہ...... دور دور سے۔ اور اب تو تا چھوڑ اس گل کو۔ جو ختم ہو گئی اس کو دہرانے سے فائدہ؟''

''میں نہیں مانتی۔'' وہ مکئی کا بھٹا کھاتے ہوئے بولی۔

''کیا نہیں مانتی؟''

''یہی کہ پہلی محبت کبھی ختم ہوتی ہے۔ لڑکی کے دل کے اندر تو رہتی ہے نا ہمیشہ...... کئی بچوں کی ماں بن کر بھی۔''

ایک دم جیسے تاجور بھی کھو سی گئی۔ اپنے اٹھے ہوئے گھٹنے پر ٹھوڑی ٹیک کر بولی۔ ''ایسا کیوں ہوتا ہے بانو؟ کچھ لوگ پاس ہو کر بھی دور...... کچھ دور ہو کر بھی پاس۔ ان کو جتنا بھلاؤ...... بھولتے نہیں۔''

''تو پھر اس کو روک لینا تھا، منا لینا تھا......؟''

''کیسے روکتی...... کیسے مناتی...... وہ میرے لیے نہیں تھا، نہ میں اس کے لیے تھی۔ وہ کسی اور دنیا کا رہنے والا تھا۔ بڑی اچی اڈاری تھی اس کی۔ میرے پروں میں اتنی طاقت کہاں تھی؟''

''تو نے اس کو کہہ کے تو دیکھنا تھا۔ کیا پتا وہ اپنی اڈاری ختم کر دیتا۔''

''ہاں...... شاید یہ غلطی تو ہوئی۔'' اس نے بھرائی ہوئی سی آواز میں کہا۔

''دل کرتا ہے کہ وہ پھر ملے؟''

تاجور نے جیسے چونک کر سہیلی کی طرف دیکھا اور بدلے لہجے میں بولی۔ ''بانو! تو نے کن باتوں میں لگا لیا ہے مجھ کو۔ چھوڑ دے بس اس بات کو۔ جو چیز نہیں ہے، وہ بس نہیں ہے۔ آگے سے میرے نال اس طرح کی باتیں نہ کرنا...... اب جو کچھ ہے میرے لیے وہی ہے جس کے گھر میں نے جانا ہے...... اور کچھ نہیں۔'' وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

سہیلی نے ہاتھ پکڑ کر اسے بٹھانا چاہا مگر پھر دونوں کیمرے کے فریم سے آؤٹ ہو گئیں۔ ان کی آوازیں بھی فیڈ آؤٹ ہو گئیں۔ گاؤں کی گلی میں کسی کتے کی آواز سنائی دی۔ پھر کسی مرغ نے بے وقت کی بانگ لگائی اور خاموشی چھا گئی۔ وڈیو کلپ ختم ہو گیا۔

میں اپنی جگہ سکتہ زدہ سا بیٹھا تھا۔ میں اس سے کتنی دور چلا آیا تھا، مگر وہ پھر بھی کسی نہ کسی صورت، کسی نہ کسی طور میرے سامنے آ جاتی تھی۔ یہ الفاظ بار بار میرے کانوں میں گونج رہے تھے۔ ''ہاں، یہ غلطی تو ہوئی ہے...... یہ غلطی تو ہوئی ہے۔'' اس کے لہجے کا کرب...... اداسی...... دکھ...... سب کچھ میری سماعت کو گھائل کر رہا تھا۔

میں نے کن انکھیوں سے سیف کی طرف دیکھا جو بیڈ پر پھیل کر لیٹا ہوا تھا۔ اس کے مدھم خراٹے سنائی دے رہے تھے۔ مجھے سیف پر بھی حیرت ہوئی۔ وہ اس طرح کا وڈیو کلپ کتنی بے پروائی سے اپنے موبائل فون میں لیے پھر رہا تھا۔ یقیناً یہ اس نے اس بانو نامی لڑکی کی مدد سے بنوایا تھا۔ کیوں بنوایا تھا؟ کیا وہ تاجور پر کسی طرح کا دباؤ ڈالنا چاہتا تھا یا پھر یہ ویسے ہی ''توجوان پریمیوں'' والی بے وقوفی تھی؟

ساحل کی طرف کوئی ہیلی کاپٹر پہرا دینے والے انداز میں مسلسل چکرا رہا تھا۔ اچانک فون کی گھنٹی بجی۔ میں نے نمبر دیکھا۔ یہ وہی فون تھا جس پر قسطینا نے دو گھنٹے پہلے بات کی تھی۔ اب وہ پھر کال کر رہی تھی۔ رات کے اس پہر کی کال کیا معنی رکھتی تھی......

خونریزی اور بربریت کے خلاف
صف آرا نوجوان کی کھلی جنگ
باقی واقعات آیندہ ماہ پڑھیے

گم گشتہ

محمد یاسر اعوان

انسان کے پاس ذہن بھی ہے اور روح بھی... یہ دونوں چیزیں ملی ہیں تاکہ وہ محبت اور نفرت کر سکے... نیک یا بد باطن... بے لوث یا مفاد پرست بن سکے... شکستوں کا اعتراف کر سکے... ایک ایسے ہی محاذ پر پہنچ جانے والے سپاہی کا قصہ... جس کے ذہن کے نہاں خانوں میں خزانہ بھی تھا اور پوشیدہ انسو بھی... جو اس کی پلکوں میں اس طرح چھپے تھے... جس طرح ڈرپوک پرندے شکاری کی آہٹ سنتے ہی روپوش ہو جاتے ہیں...

عام ڈگر سے ہٹ کر ایک منفرد کہانی...... گم گشتہ یادوں کی واپسی

جانسن کو آج بے چینی سے ٹرک کا انتظار تھا۔

ریوانڈا شہر سے سامان لے کر ٹرک پورے ایک بجے فارم پر پہنچتا تھا لیکن جانسن کے پاس گھڑی نہیں تھی کہ وہ صحیح طور پر جان سکتا کہ ٹرک کے آنے میں کتنا وقت باقی ہے۔ اس فارم پر کسی کو بھی گھڑی رکھنے کی اجازت نہیں تھی۔ انہیں صرف گارڈ کی وسل سے پتا چلتا تھا کہ کب انہیں کام شروع کرنا ہے اور کب ختم کرنا ہے۔ تاہم آج جانسن شدت سے گھڑی کی ضرورت محسوس کر رہا تھا۔ بالآخر اندازاً وقت کا تعین کر

کے وہ مسلح گارڈ کے عقب میں پہنچا۔ اس کی آہٹ پا کر گارڈ تیزی سے گھوما، لیکن جانسن کو دیکھ کر اس نے اطمینان کی سانس لی۔ اسے معلوم تھا کہ جانسن کبھی گڑبڑ نہیں کرتا، کبھی کوئی مسئلہ پیدا نہیں کرتا۔

''کیا بات ہے ہینڈسم؟ منہ کیوں بنا رہے ہو؟'' گارڈ نے دوستانہ لہجے میں پوچھا۔

''پیٹ میں کچھ تکلیف ہو رہی ہے۔'' جانسن پیٹ پکڑتے ہوئے بولا۔ ''میں کچھ دیر گودام میں آرام کر لوں؟''

گارڈ ایک لمحے کے لیے ہچکچایا پھر بولا۔ ''ٹھیک ہے، جاؤ آرام کر لو۔''

جانسن نے اس کا شکریہ ادا کیا اور گودام میں آ گیا۔ گودام میں ملگجا اندھیرا اور خنکی تھی۔ باہر صحرا کی طرح جھلستی ہوئی زمین سے ایک دم گودام میں آنا بہت خوشگوار ثابت ہوا تھا۔ اس نے سنک پر جا کر پہلے ہاتھ منہ دھویا۔ اس نے محسوس کیا کہ اس کے ہاتھوں میں لرزش تھی۔

آج وہ جو کچھ کرنے لگا تھا، اس کے لیے ہفتوں ذہنی تیاری کی تھی لیکن آج عمل کا وقت آیا تو وہ کچھ بدحواس سا تھا۔ اسے اپنی تدبیر کی ناکامی کا اندیشہ تھا۔

تقریباً دس منٹ بعد اس نے سپلائی ٹرک کی مانوس سی آواز سنی جو لحظہ بہ لحظہ قریب آتی جا رہی تھی۔ جانسن نے تیزی سے ایک ٹرالی کو ایک گوشے میں دھکیلا اور اس کی آڑ میں چھپ کر بیٹھ گیا۔ اسے معلوم تھا کہ ٹرک سیدھا گودام کے دروازے سے آ لگے گا اور سامان اتارنے کا عمل شروع ہو جائے گا۔

اس نے پورے دو ماہ اس عمل کا مشاہدہ کیا تھا۔ جب ٹرک سے تمام کریٹ گودام میں پہنچا دیے جاتے تھے تو ڈرائیور اور اس کا معاون فارم پر کھڑے ہو کر گارڈ یا کسی اور کے ساتھ گپ شپ کرتے ہوئے ایک ایک سگریٹ ضرور پیتے تھے۔ یہی وہ وقت تھا جس سے جانسن کو استفادہ کرنا تھا۔

ٹرک رک چکا تھا اور گودام کا دروازہ کھولا جا رہا تھا۔ دو مزدور مشینی انداز میں اپنا کام انجام دے رہے تھے، وہ کریٹ ٹرک سے اتار کر گودام میں پہنچانے لگے۔ آخرکار جب آخری کریٹ بھی اتارا جا چکا تو وہ گودام کا دروازہ بند کر کے واپس چلے گئے۔

جانسن نے چند لمحے انتظار کیا، پھر اپنی پناہ گاہ سے نکل کر وہ دروازے کے قریب پہنچا۔ باہر مکمل خاموشی تھی۔ اس نے آہستگی سے تھوڑا سا دروازہ کھولا۔ ٹرک الٹے رخ دروازے سے چند فٹ کے فاصلے پر کھڑا تھا۔ وہ لمبے لمبے ڈگ بھر کر ٹرک کے پچھلے حصے تک پہنچا اور اچک کر اندر بیٹھ گیا۔ اس حصے میں وہ آخر تک چلا گیا جہاں تقریباً تاریکی ہی تھی۔ یہاں ایک کونے میں ترپال بھی پڑی تھی۔ ترپال اٹھا کر وہ اس کے نیچے سکڑسمٹ کر لیٹ گیا۔ چند لمحے بعد اس نے ٹرک کا عقبی دروازہ بند ہونے کی آواز سنی۔ پھر ٹرک کو ہلکا سا جھٹکا لگا جس سے اس نے اندازہ لگایا کہ دونوں آدمی ٹرک کے اگلے حصے میں بیٹھ رہے ہیں۔ پھر اگلا دروازہ بند ہونے کی آواز آئی اور انجن اسٹارٹ ہو گیا۔

جانسن سانس روکے پڑا رہا۔ جب اس نے محسوس کر لیا کہ ٹرک سڑک پر پہنچ چکا ہے تو اس کے حلق سے بے اختیار سسکی سی نکل گئی۔ یہ عجیب خوشی تھی جسے محسوس کرتے ہوئے اس کا رونے کو دل چاہ رہا تھا۔ بالآخر وہ فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

جب اُس کے اندازے کے مطابق فارم کم از کم آٹھ، دس میل پیچھے رہ گیا تو وہ ترپال کے نیچے سے نکل آیا۔ اس نے ٹرک کا عقبی دروازہ کھول لیا اور سڑک کو دیکھنے لگا جو ٹرک کے پہیوں تلے سے گویا پھسلتی جا رہی تھی۔ وہ منتظر رہا، حتیٰ کہ چڑھائی شروع ہو گئی اور پھر ٹرک کی رفتار ایک موڑ پر جونہی کم ہوئی، جانسن نے چھلانگ لگا دی اور سڑک کے کچے نشیبی حصے کی طرف لڑھکتا چلا گیا۔

☆☆☆

الیگزا جب غصے میں ہوتی تھی تو کار کی رفتار بڑھاتی چلی جاتی تھی۔ جوں جوں کار کی رفتار بڑھتی توں توں غصے کا احساس اس کے لیے کم تکلیف دہ ہوتا جاتا تھا۔ اس موقع پر وہ انکل مارٹن کی یہ نصیحت قطعی فراموش کر دیتی تھی کہ غصے کی حالت میں نہ تو کبھی شراب پیو اور نہ ہی کبھی کار چلاؤ، حالانکہ انکل مارٹن خود کافی غصہ ور آدمی تھے اور اکثر کام غصے ہی کی حالت میں انجام دیتے تھے۔ انکل مارٹن، الیگزا کے سرپرست تھے اور الیگزا کے والدین کے انتقال کے بعد انہوں نے ہی الیگزا کو پالا تھا۔ وہ بچپن میں ہی ماں، باپ کے سائے سے محروم ہو گئی تھی۔

کسٹراک نامی قصبے میں انکل مارٹن کی ایک خاصی بڑی فیکٹری تھی۔ فرینک، انکل مارٹن کا بزنس پارٹنر تھا اور وہی ان کے لیے سب سے بڑا دردِسر بھی بنا ہوا تھا۔ پچھلے تین سال سے وہ پوری فیکٹری پر ہی قبضہ جما لینے کی فکر میں تھا اور اس کے لیے مختلف ہتھکنڈے استعمال کر رہا

تھا۔ ان کی چپقلش پورے قصبے میں موضوعِ سخن بنی رہتی تھی۔ بات یہیں تک ہوتی تو کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ الیگزا اس معاملے کو دفتر اور کاروبار سے متعلق سمجھتی اور اس کی ذاتی زندگی سے اس کا کوئی تعلق نہ ہوتا، مگر مصیبت یہ تھی کہ فرینک کا ایک جوان بیٹا بروشر فرینک بھی تھا، جو کلب میں، ہوٹل میں یا سرِراہ، کہیں بھی الیگزا کو مل جاتا تو گلے کا ہار بننے کی کوشش کرتا اور اسے سمجھاتا کہ انہیں اپنے بزرگوں کی عداوت کو بھول کر ایک دوسرے کا ہاتھ تھام کر اپنی زندگی سنوارنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ کسی زمانے میں ان کے بزرگوں کا یہی ارادہ تھا کہ وہ الیگزا اور بروشر کی شادی کردیں گے۔

الیگزا کو اس سے کوئی خاص نفرت بھی نہیں تھی۔ وہ اس کے ساتھ سیر و تفریح اور نشست و برخاست میں شریک رہتی تھی۔ مگر الیگزا کو غصہ اس بات پر آتا تھا کہ ایک طرف بروشر اتنا کشادہ دل اور اعلیٰ ظرف بنتا تھا کہ بزرگوں کی چپقلش کو فراموش کرنے کا مشورہ دیتا تھا اور دوسری طرف موقع ملتے ہی انکل مارٹن کی برائیاں شروع کردیتا تھا۔ کل رات بھی کلب میں ڈانس کے دوران اس نے یہی حرکت کی تھی اور الیگزا کو یہ منافقت پسند نہ تھی۔

ہائی وے کے ایک چوراہے پر اسے اپنی اسپورٹس کار کی رفتار کم کرنی پڑی، کیونکہ باربرداری کا ایک ٹرک سڑک کراس کر کے کسٹراک کی طرف جارہا تھا۔ رفتار کم ہوئی تو اس کے اعصاب کو کچھ سکون ملا۔ انکل مارٹن نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ وہ اسے اپنے ساتھ لنچ کے لیے کریسنٹ کلب لے چلیں گے۔ اس وقت وہ اسی غرض سے فیکٹری کی طرف جارہی تھی اور اپنے آپ کو بہلانے کی کوشش کررہی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ یہ کلب زندہ دل مردوں کی تفریح گاہ ہے، وہاں بہت سی دلچسپ شخصیات سے ملاقات ہونے کی امید تھی۔

دفعتاً اس نے غیر ارادی طور پر کار کی رفتار کچھ اور کم کر دی۔ سڑک کے کنارے ایک نوجوان کھڑا، انگوٹھے سے لفٹ کے لیے اشارہ کررہا تھا۔ الیگزا نے کار روک لی۔ اس وقت انکل مارٹن کی ایک اور نصیحت کی خلاف ورزی کررہی تھی۔ انکل کہتے تھے۔ ''ویران سڑک پر کبھی کسی کو لفٹ مت دو۔''

''آپ قصبے کی طرف جارہی ہیں؟'' نوجوان نے پوچھا اور قدرے لنگڑاتا ہوا کار کی طرف بڑھا۔ اس کا چہرہ دھول میں اٹا ہوا تھا اور وہ کاشت کاروں جیسا میلا لباس پہنے ہوئے تھا۔

''ہاں.....'' الیگزا نے جواب دیا پھر جیسے یکایک ہی اس کے دل میں شبہے نے سر ابھارا اور اس نے تیزی سے پوچھا۔ ''لیکن تم اس ویرانے میں کیا کررہے ہو؟''

''میری کار خراب ہوگئی ہے۔'' اس نے دور کہیں ٹیلوں کی جانب اشارہ کیا اور دروازہ کھول کر الیگزا کے ساتھ والی سیٹ پر آبیٹھا۔ الیگزا نے کار آگے بڑھانے سے پہلے ایک نظر میں اس کا تنقیدی جائزہ لیا۔ وہ ایک وجیہہ نوجوان تھا۔ چہرے پر خود ساختہ سی چالاکی کی جھلک تھی۔ اس کی رنگت بتاتی تھی کہ وہ کھلے آسمان تلے کام کرنے کا عادی رہا ہے۔

''ہم کسی گیس اسٹیشن پر رک کر کسی موٹر مکینک کو بھیج کر تمہاری کار منگوالیں گے اور اتنی دیر میں ہم کچھ کھا پی بھی لیں گے۔'' الیگزا نے ایکسیلیریٹر دباتے ہوئے کہا۔

''لعنت بھیجو کار پر۔'' نوجوان بیزاری سے بولا۔ ''میں اسے ہمیشہ کے لیے خیرباد کہہ آیا ہوں۔ اب اس میں رہ بھی کیا گیا ہے۔ بالکل کھٹارا ہے۔ اب تو اسے کسی مکینک کو دکھاتے ہوئے بھی شرم آتی ہے۔ میں تو سمجھ رہا تھا، میلوں پیدل چلنا پڑے گا۔ شکر ہے جلد ہی آپ نظر آگئیں اور آپ نے لفٹ دے دی۔ میں دراصل ابھی ابھی نوکری چھوڑ کر آرہا ہوں۔ سوچ رہا تھا، کسٹراک جاکر قسمت آزمائی کروں شاید کوئی بہتر کام مل جائے۔''

''کاشت کار ہو؟'' الیگزا نے پوچھا۔ وہ سڑک کی طرف دیکھتے ہوئے بات کررہی تھی۔

''کاشت کار تھا۔'' اس نے تصحیح کی۔ ''اب نہیں رہا اور نہ آئندہ کبھی کاشت کاری کروں گا۔''

الیگزا نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ ایک سخت چیز کی نوک اس کی پسلیوں میں چبھنے لگی۔ خوف کے مارے اس کے ہاتھوں سے اسٹیئرنگ وہیل چھوٹتے چھوٹتے رہ گیا۔

''یہ اسکریو ڈرائیور زیادہ تیز تو نہیں ہے لیکن بہرحال انسان کو ہلاک کرسکتا ہے۔'' نوجوان قدرے بدلے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''اگر تم آرام سے گاڑی سڑک سے اتار کر روک لو تو تمہیں کوئی گزند نہیں پہنچے گی۔ تم ایک رحم دل خاتون ہو، میں تمہیں کوئی نقصان پہنچانا نہیں چاہتا۔''

بے بسی سے الیگزا کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ کار ایک طرف روک کر اس نے نوجوان کے ہاتھ کی طرف دیکھا۔ اس کے ہاتھ میں موجود اسکریو ڈرائیور جس کی نوک

اس نے الیگزا کی پسلیوں پر ٹکا رکھی تھی۔ اسی کی کار کے اوزاروں میں سے نکالا گیا تھا۔

''احسان کا بدلہ اتارنے کا یہ بہت اچھا طریقہ ہے؟'' وہ زہریلے لہجے میں بولی۔

''کار سے اتر جاؤ۔'' نوجوان نے حکم دیا۔ الیگزا نے اس کی طرف دیکھا۔ وہ اس قدر پُرسکون اور پُراعتماد نظر آ رہا تھا کہ الیگزا خوف زدہ ہوگئی۔ وہ کار سے اتر گئی تو نوجوان نے حکم دیا۔ ''اپنا پرس یہاں پھینک دو۔''

الیگزا نے پرس گویا اس کے منہ پر دے مارا۔ ''اس میں زیادہ رقم نہیں ہے۔'' نوجوان نے اسٹیئرنگ وہیل سنبھالا، پرس اپنے پاس رکھا اور دوسرے ہی لمحے کار ایک جھٹکے سے آگے بڑھ گئی۔ کچھ گرد الیگزا پر آ پڑی۔

''بدمعاش...... خبیث!'' الیگزا پوری طاقت سے چلائی پھر وہ بے بسی سے رو دی۔

کسٹراک قصبہ ابھی پانچ میل دور تھا اور ہائی وے کے اس ٹکڑے پر لفٹ ملنے کا امکان بہت ہی کم تھا۔ چنانچہ دل مضبوط کر کے وہ پیدل ہی چل پڑی۔ سینڈل اونچی ایڑی کے تھے جنہیں اتار کر اس نے ہاتھوں میں تھام لیے۔ کیونکہ پیدل چلنے میں وہ خاصے تکلیف دہ ثابت ہو رہے تھے۔ جھلستی ہوئی سڑک اس کے نرم و نازک تلووں کو جلانے لگی تو ایک بار پھر بے بسی سے اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور وہ انکل مارٹن کی نصیحت پر عمل نہ کرنے پر اپنے آپ کو کوسنے لگی۔

دفعتاً اسے کافی فاصلے پر سامنے سے ایک کار آتی دکھائی دی۔ وہ اس کی مطلوبہ سمت میں نہیں جا رہی تھی مگر الیگزا اسے روکنے کے لیے سڑک کے وسط میں کھڑی ہوگئی۔ کار تیزی سے قریب آئی اور تب اس نے دیکھا، وہ اس کی اپنی ہی کار تھی۔ نوجوان نے یوٹرن لے کر کار عین اس کے قریب لا روکی۔ پھر وہ کار سے اتر گیا اور ڈرائیوروں کی طرح اس کے لیے دروازہ کھول کر کھڑا ہوگیا۔ الیگزا سیٹ پر جا گری۔

''میں...... میں معافی چاہتا ہوں۔'' نوجوان شرمندہ لہجے میں بولا۔ ''پتا نہیں مجھے کیا ہوگیا تھا جو میں یہ حرکت کر بیٹھا۔ شاید گرمی کی شدت سے میرا دماغ الٹ گیا تھا۔''

الیگزا اب اپنے آپ کو سنبھال چکی تھی۔ سینڈل پہن کر اس نے ایکسلیٹر پر پاؤں رکھ دیا، مگر گاڑی آگے نہیں بڑھائی۔ ''میں تمہاری اس حرکت کا مطلب نہیں سمجھ پائی؟''

''مطلب کچھ بھی نہیں...... دراصل میں کوئی چور یا لٹیرا نہیں ہوں۔'' وہ اٹک اٹک کر بولا۔ ''مجھ سے بس غلطی سرزد ہوگئی تھی۔ میں معذرت خواہ ہوں۔ تمہیں بڑی زحمت ہوئی اور ہاں، میں نے تمہارے پرس سے کچھ نہیں نکالا ہے، چاہو تو اپنی رقم گن لو۔''

''تمہاری واپسی تمہاری صداقت کا یقین دلانے کے لیے کافی ہے۔'' الیگزا کے الفاظ سے ملائمت لیکن آنکھوں سے سخت گیری عیاں تھی۔ وہ اسے گھورتے ہوئے تحکمانہ لہجے میں بولی۔ ''گاڑی میں بیٹھ جاؤ۔'' اس سڑک پر تمہیں دوبارہ مجھ جیسا فراخ دل انسان شاید ہی ملے۔

''واقعی؟'' نوجوان کی باچھیں کھل گئیں اور وہ دروازہ کھول کر ایک بار پھر اس کے برابر آ بیٹھا۔

کار فراٹے بھرنے لگی تو وہ بولا۔ ''میرا نام جانسن ہے۔'' الیگزا کو پتا تھا کہ وہ باتیں کرنا چاہتا ہے۔ بہتر یہی تھا کہ خود خاموش رہ کر اسے بولنے کا موقع دیا جائے۔

وہ بولتا رہا۔ ''میں نے اس سے پہلے کوئی ایسی حرکت نہیں کی۔ بس شاید مجھے کوئی مختلف کام کرنے کا شوق چرایا تھا یا شاید میں نے سوچا تھا کہ اس طرح مجھے کسی بہتر کام کے آغاز کا موقع مل جائے گا۔ میرے خیالات بے حد منتشر تھے۔ فارم کی نوکری سے میں بڑی مشکل سے جان چھڑا کر بھاگا تھا۔ میرے پاس ذہن ہے۔ میں کوئی اور کام کرنا چاہتا ہوں۔ فارم پر انسان کے سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں ختم ہو کر رہ جاتی ہیں۔''

''آج کل گریجویٹ نوجوان بھی فارمز پر کام کر رہے ہیں۔'' الیگزا بولے بغیر نہ رہ سکی۔

''ایسے فارمز پر نہیں، جس طرح کے فارم پر میں کام کرتا تھا۔ فارمز کی بھی قسمیں ہوتی ہیں۔'' وہ قدرے تلخی سے بولا۔ ''کچھ عرصے کے لیے میں بھی اپنے حالات میں تبدیلی چاہتا ہوں۔ میں بھی صاف ستھرے کپڑے پہننا چاہتا ہوں، لیکن جہاں بھی میں نوکری کے لیے جاتا ہوں وہاں دور ہی سے جھنڈی دکھائی جاتی ہے اور یہ جنگ کے اثرات ہیں۔''

''جنگ؟'' الیگزا نے حیرت سے دہرایا۔

''تمہیں تو شاید یاد بھی نہ ہو کہ میں کس جنگ کی بات کر رہا ہوں۔'' وہ بدستور تلخی سے بولا۔ ''میں جرمنی کی جنگ کی بات کر رہا ہوں۔ میں اس وقت پندرہ سولہ سال کا تھا جب فوج میں چلا گیا۔ اس مقصد کے لیے میں نے اپنی عمر

زیادہ بتائی تھی کیونکہ میں ہر حال میں گھر سے فرار چاہتا تھا۔ انیس سال کی عمر تک میں اس جنگ میں لڑتا رہا جس کے متعلق مجھے علم ہی نہیں تھا کہ وہ کیوں ہو رہی ہے۔ میں ایک سیدھا سادہ سا لڑکا تھا...... اور پھر میں جنگ میں شدید زخمی ہو گیا۔ بس یوں سمجھو کہ میرے جسم کے ٹکڑے ٹکڑے ہی ہو گئے تھے۔''

''بڑا افسوس ہوا، یہ سب سن کر۔'' الیگزا نے ہمدردانہ انداز میں کہا۔

''مجھے اسپتال، میدانِ جنگ کی نسبت کہیں زیادہ بہتر محسوس ہوا تھا۔ جانسن نے بات جاری رکھی۔'' وہاں میں سات سال رہا اور اس عرصے میں ڈاکٹر اور سرجن میرے تن کے ٹکڑوں کو جوڑنے کی کوششوں میں لگے رہے اور آخر کار کامیاب ہو گئے۔ جب انہوں نے مجھے اسپتال سے جانے کی اجازت دی، میری رنگت زرد اور جسم تنکے کی طرح تھا۔ ان کا مشورہ تھا کہ میں کھلی فضاؤں میں کام کروں، تبھی میری صحت بحال ہو گی۔ فارم پر مجھے پہلی ملازمت اسپتال والوں نے ہی دلائی تھی اور تب سے میں اسی کام میں پھنسا رہا۔ کافی عرصے سے میں اس کام سے چھٹکارا پانے کی فکر میں تھا۔''

''میرے دادا بھی زمیندار تھے۔'' الیگزا بولی۔ ''میرے والد انہی کے ساتھ کام کرتے تھے مگر میرے چچا مارٹن جو اس وقت میرے سرپرست بھی ہیں، زمین پر کام کرنے سے سخت چڑتے تھے۔ اسی لیے سترہ سال کی عمر میں گھر سے بھاگ گئے تھے۔''

''اب وہ کس حال میں ہیں؟'' جانسن نے دلچسپی سے پوچھا۔

''ٹھیک ٹھاک ہی ہیں۔ آج کل وہ ٹرانزٹ میشن کمپنی کے مالک ہیں...... میرا مطلب ہے، مینیجنگ ڈائریکٹر ہیں۔ ان کا ایک پارٹنر بھی ہے، فریٹک۔'' الیگزا نے بتایا۔ ''میں انکل مارٹن سے ہی ملنے کسٹراک جا رہی تھی جس وقت تم نے مجھے روکا اور لٹیرا بننے کی ناکام کوشش کی۔'' وہ اس کی طرف دیکھ کر مسکرائی۔ ''مجھے اندیشہ ہے کہ تم نے اگر یہ پیشہ اختیار کرنے کی کوشش بھی کی تو کامیاب نہیں ہو گے۔''

''اگر مجھے معلوم ہوتا کہ تم ایک دولت مند آدمی کی وارث وغیرہ ہو تو میں ذرا زیادہ سختی کرنے کی کوشش کرتا۔'' جانسن نے بھی جواباً مسکراتے ہوئے کہا۔ ''ورنہ کم از کم اس پرس پر تو ہاتھ صاف کر ہی لیتا۔ خاصی رقم ہو گی اِس میں؟''

''صرف تیس ڈالر ہیں۔'' الیگزا نے اس کی غلط فہمی دور کی۔

''میرے پاس تو وہ بھی نہیں ہیں۔'' جانسن نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ ''میں تو فارم پر اپنے واجبات لینے بھی نہیں گیا اور اس وقت یہ عالم ہے کہ نوکری کے سلسلے میں اگر کہیں انٹرویو کے لیے جاتا ہوں تو کوئی معقول قسم کا سوٹ بھی نہیں خرید سکتا۔ اس حلیے میں تو ظاہر ہے کوئی دربان مجھے فیکٹری یا دفتر میں گھسنے بھی نہیں دے گا۔''

الیگزا نے پرس اٹھا کر اس کی گود میں ڈال دیا۔ ''اس مقصد کے لیے تم اس میں موجود رقم لے سکتے ہو۔'' وہ بولی۔

''نہیں، نہیں۔'' جانسن گڑبڑا کر بولا۔ ''میرا یہ مطلب نہیں تھا۔''

''میں کہہ رہی ہوں رکھ لو......'' وہ سختی سے بولی۔ ''اس حلیے میں تم واقعی ڈھنگ کی کوئی نوکری تلاش نہیں کر سکو گے۔''

''مجھے تو یہ بھی نہیں معلوم کہ میں نوکری کی تلاش کا آغاز کہاں سے کروں؟''

الیگزا قدرے ہچکچاہٹ سے بولی۔ ''ایک جگہ جانے کا مشورہ تو میں تمہیں دے سکتی ہوں۔ باقی پتا نہیں وہاں تمہیں کس قسم کی نوکری مل سکے گی۔ بہرحال وہاں کے باس پر میرا تھوڑا بہت اثر و رسوخ ہے۔ ہو سکتا ہے وہاں تمہیں صرف فرش صاف کرنے کا کام مل سکے۔ بہرکیف میں باس سے تمہاری سفارش کر دوں گی۔''

سامنے کسٹراک ہوٹل کی اونچی عمارت دکھائی دینے لگی تھی۔ جانسن اُدھر دیکھتے ہوئے بولا۔ ''تمہارا مطلب ہے تمہارے انکل......؟ کیا تم اُن سے میری سفارش کرو گی؟'' اسے جیسے یقین نہیں آ رہا تھا۔

''آج دوپہر کا کھانا میں ان کے ساتھ کھا رہی ہوں اور کھانا کھاتے وقت عموماً ان کا موڈ خوشگوار ہوتا ہے۔ اس لیے پوچھ لینے میں کیا حرج ہے؟ یہ تیس ڈالر تم رکھ لو، ایک نیوی بلیو سوٹ خرید لینا...... نیوی بلیو رنگ انکل کا پسندیدہ رنگ ہے۔ میں انہیں بتا دوں گی کہ تم دو بجے دفتر میں ان سے ملنے آؤ گے۔ وہ تمہارے منتظر ہوں گے اور ہاں...... یہ رقم لیتے وقت شرمانے کی ضرورت نہیں۔ یہ میں قرض دے رہی ہوں نوکری مل جائے تو واپس کر دینا، یہ میرا ایڈریس ہے۔'' اس نے اپنا پتا بتایا اور مزید کہا۔

''انکل کے پاس ٹھیک وقت پر پہنچنا، وقت کے

معاملے میں بلکہ نئی دوسری چیزوں کے معاملے میں بھی وہ خاصے سنکی ہیں۔''

جانسن نے زیرِلب اس کا ایڈریس دہرایا۔ ''مفتھ۔ مین اسٹریٹ، ہل سائڈ کسٹراک۔ یہ ایڈریس اسے فوراً ہی یاد ہوگیا۔

☆☆☆

ٹرانزٹ میشن کمپنی کے دفاتر اور فیکٹری کی طویل و عریض عمارت دیکھ کر جانسن مرعوب ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ الیگزا کے انکل مارٹن تگڑے سرمایہ دار لگتے تھے۔ عمارتوں کا سلسلہ خاردار تاروں میں گھرا ہوا تھا۔ جانسن ان تاروں سے جھانکتا ہوا مین گیٹ پر پہنچا۔ وہ نیوی بلیو رنگ کے سستے سے سوٹ میں تھا۔ الیگزا کے دیے ہوئے تیس ڈالروں میں سے بیس ڈالر اس سوٹ پر خرچ ہو چکے تھے۔ مسلح محافظ، استقبالیہ کلرک اور پھر سیکریٹری سے گفت و شنید کے مراحل سے گزرنے کے بعد آخر کار وہ اس دروازے پر پہنچا جس پر پیتل کے حروف میں، مارٹن ٹرانزٹ کے نام کی تختی آویزاں تھی۔ اس نے ہولے سے دستک دی۔

''آجاؤ۔'' ایک بھاری آواز سنائی دی۔

جانسن کو توقع تھی کہ دفتر بہت عالی شان، آراستہ و پیراستہ ہوگا مگر وہاں قابلِ ذکر چیز بس دو بڑی بڑی میزیں تھیں۔ ایک پر فائلیں، کاغذ اور جانے کیا کیا کاٹھ کباڑ بکھرا ہوا تھا۔ دوسری پر بھی کچھ اسی قسم کی چیزیں موجود تھیں۔ میز کی دوسری جانب اونچی ریوالونگ چیئر پر جو شخص دھنسا بیٹھا تھا، اس کا صرف چہرہ ہی نظر آرہا تھا جو نہایت بے ہنگم تھا اور اس پر زخموں کے چھوٹے چھوٹے نشانات کے علاوہ غیظ و غضب اور درشتگی کا بھی مستقل ڈیرا تھا۔ یہ ایک ایسے سپاہی کا چہرہ لگتا تھا جو میدان جنگ میں ابھی تک برسرِ پیکار ہو۔ جانسن کو الیگزا کے حسین چہرے سے اس کھوسٹ چہرے والے کی کوئی خاندانی مناسبت نظر نہیں آئی۔

انکل مارٹن اسے گھورتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے۔

تب جانسن نے دیکھا کہ ان کا نیوی بلیو سوٹ بھی عام سا ہی تھا۔ جانسن نے شرمیلے سے انداز میں اپنا تعارف کروایا تو انکل مارٹن مسکراتے ہوئے اس کے مقابل آن کھڑے ہوئے اور اس کا سرتاپا جائزہ لیتے ہوئے بولے۔ ''اچھا تو تم ہو جانسن؟''

''جی۔'' جانسن نے انکساری سے کہا۔ دوسرے ہی لمحے اس کے سامنے تارے ناچ گئے۔ اس کی ٹھوڑی پر ایک زوردار گھونسا پڑا تھا۔ وہ دیوار سے جا ٹکرایا اور فرش پر گر پڑا۔ تاہم اس کا خیال تھا کہ چھت اس کے سر پر گر پڑی ہے۔

انکل مارٹن نے خود ہی آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ تھام کر اسے اٹھایا۔ جانسن اپنے آپ کو دوسرا مکا کھانے کے لیے تیار کر رہا تھا۔ مگر انکل مارٹن قدرے بدلے ہوئے لہجے میں بولے۔

''یہ گھونسا اُس حرکت کے سلسلے میں تھا جو تم نے پہلے پہل میری بھتیجی کے ساتھ کی تھی۔ اس کے بعد اگر تم ملازمت کے بارے میں بات کرنا چاہتے ہو تو کرسی پر بیٹھ جاؤ۔''

جانسن نے انکل مارٹن کی طرف بغور دیکھا۔ ان کے چہرے پر نہ تو درشتی کے آثار تھے اور نہ ہی معذرت خواہی کے۔ اس نے کرسی پر بیٹھ جانے میں ہی عافیت سمجھی۔

اس کا باقاعدہ انٹرویو شروع ہوگیا۔ انکل مارٹن اس پر سوالات کی بوچھاڑ کررہے تھے۔ آخر جب یہ طے پا گیا کہ وہ خاص طور پر کسی بھی کام کا نہیں تو انکل مارٹن اٹھ کر ٹہلتے ہوئے بولے۔

''میں تمہیں سپلائی ڈپارٹمنٹ میں کھپا سکتا ہوں۔ ایک بڈھا طوطا جس کا نام رابرٹ ہے، اس ڈپارٹمنٹ کا انچارج ہے۔ تم اس کی نگرانی میں اوزاروں کا شعبہ سنبھالو گے اور کارکنوں کو ان کی ضرورت کے مطابق اوزار دیا کرو گے۔ تنخواہ پچاس ڈالر فی ہفتہ ہوگی، منظور ہے۔''

''جی منظور ہے۔'' جانسن نے تھوک نگل کے کہا۔

انکل مارٹن نے پرس نکال کر دس دس ڈالر کے دو نوٹ نکالے اور اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''یہ ایڈوانس ہے۔ پہلی تنخواہ میں سے کٹ جائے گا۔ کل ٹھیک آٹھ بجے سپلائی ڈپارٹمنٹ پہنچ جانا۔''

جانسن اپنی ٹھوڑی سہلاتا ہوا فیکٹری سے باہر آگیا۔ شام تک گھوم پھر کر اس نے کم کرائے کا ایک کمرا تلاش کیا اور رات کو بیٹھ کر ایک رائٹنگ پیڈ پر لکھا۔ ''محترمہ امیرزادی الیگزا صاحبہ! پہلی قسط ارسال کر رہا ہوں۔ آپ کے اب انتیس ڈالر میرے ذمّے واجب الادا رہ گئے ہیں۔ مجھے ملازمت مل گئی ہے۔ سفارش کا بہت شکریہ۔ میں ذاتی طور پر رُوبرو بھی آپ کا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں۔ کیا منگل کو آپ سے ملاقات ہوسکتی ہے؟'' جانسن۔'' خط کے لفافے میں ایک ڈالر کا نوٹ رکھ کر اس نے لفافہ بند کردیا۔

☆☆☆

الیگزا اپنے کمرے سے باہر آئی تو مکان کے پورچ میں اسے انکل مارٹن کی گاڑی کھڑی نظر آئی۔ انکل مارٹن

عموماً کام کے دنوں میں روزانہ گھر نہیں آتے تھے۔ فیکٹری سے سیدھے کریسنٹ کلب چلے جاتے تھے۔ وہاں انہوں نے مستقلاً ایک کمرا لیا ہوا تھا۔ وہاں ان کا وقت اچھا گزر جاتا تھا۔ وہ صرف ہفتے کے اختتام پر گھر آتے تھے تو اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ پریشان ہیں، یا اُن کا موڈ بے حد خراب ہے۔ الیگزا ان کے کمرے میں جا پہنچی۔ ان کی میز پر وہسکی کی ایک سر بند بوتل اور ایک گلاس رکھا تھا اور وہ اپنا کوٹ اتار کر دیوار گیر الماری میں ٹانگ رہے تھے۔

''کیا آج پھر آپ کی پریشانی کی وجہ فرینک ہی ہے انکل؟'' الیگزا نے بلاتمہید پوچھا۔

''میری پریشانی کی وجہ عموماً وہی بدبخت ہوتا ہے۔'' انکل مارٹن نے گہری سانس لے کر کہا۔

''اس مرتبہ اس نے کیا کیا ہے؟'' الیگزا نے ہمدردانہ لہجے میں پوچھا۔

''جو کچھ وہ کر چکا ہے، میں اس سے پریشان نہیں۔'' انکل بولے۔ ''میں اس سے پریشان ہوں جو کچھ وہ کرنے کی تیاری کر رہا ہے۔ وہ آج پھر میرے دفتر میں آیا تھا اور از سرِنو اپنی پیشکش پر غور کرنے کے لیے کہہ رہا تھا۔ میں نے کہہ دیا کہ میں کسی قیمت پر بھی اپنے شیئرز نہیں بیچوں گا لیکن ہمیشہ کی طرح وہ بدبخت چپ نہیں ہوا۔ اپنی ہانکتا رہا۔''

''لیکن انکل! فیکٹری کا ایک عام کارکن بھی جانتا ہے کہ کمپنی آپ کے بغیر نہیں چل سکتی۔ اس کمپنی کی بنیاد آپ نے رکھی اور اس کو یہاں تک پہنچایا۔ کیا شیئر ہولڈرز کو اس حقیقت کا احساس نہیں ہوگا؟''

''دراصل فرینک کو فیکٹری یا دفاتر کا نظام چلانے کا تو مطلق تجربہ نہیں، لیکن لوگوں کو چکر دینے میں وہ بے حد ماہر ہے۔'' انکل مارٹن گہری سانس لے کر بولے۔ ''بہرحال تم اس کی فکر نہ کرو، میں اس سے نمٹ لوں گا۔''

کمرے سے نکلتے نکلتے الیگزا کو جیسے کچھ خیال آیا۔

''انکل! کیا جانسن نے آج سے کام شروع کر دیا ہے؟'' اس نے ہچکچاتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں۔'' میں نے اسے سپلائی ڈپارٹمنٹ میں رکھ لیا ہے اور رابرٹ سے کہہ دیا ہے کہ اس پر نظر رکھے۔ کہیں کوئی رقم وغیرہ ہی لے کر نہ بھاگ جائے۔'' انکل نے بتایا۔

''انکل......'' الیگزا کے لہجے میں احتجاج تھا۔ ''کیا وہ ثابت نہیں کر چکا کہ وہ چور نہیں ہے۔''

''تمہیں اس پر اعتماد ہے؟'' انکل نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔
''ہاں۔'' الیگزا نے ایک لمحے سوچ کر جواب دیا۔
''تم نے مجھے بتایا تھا کہ جنگ میں جسمانی طور پر اس کا خانہ خراب ہو گیا تھا۔'' انکل آرام کرسی پر نیم دراز ہوتے ہوئے بولے۔ ''اور آج جب فیکٹری میں قواعد و ضوابط کے مطابق اس کا جسمانی معائنہ ہوا تو اس کے جسم پر کسی زخم کا نشان تک نہ تھا۔ لگتا ہے ملٹری اسپتال کے ڈاکٹر اور سرجن جادوگر تھے۔'' پھر وہ سمجھانے والے انداز میں بولے۔ ''اس سے تمہیں سمجھ لینا چاہیے کہ ہر شخص کی ہر بات پر فوراً یقین نہیں کر لینا چاہیے۔ تم دنیا کو اتنی اچھی طرح نہیں جانتیں جتنا میں سمجھتا ہوں۔''
الیگزا کچھ نہ بول سکی۔ وہ دروازے کی طرف بڑھی تو انکل بولے۔ ''میل باکس میں تمہاری کچھ ڈاک تھی، وہ میں نے ہال کی میز پر رکھ دی ہے۔''
وہ ہال میں پہنچی ہی تھی کہ باہر کسی گاڑی کے رکنے کی آواز آئی۔ وہ باہر جھانکے بغیر ہی سمجھ گئی تھی کہ کس کی گاڑی ہے۔ آنے والا بروشر فرینک تھا۔
الیگزا دروازے کے قریب جا کر بولی۔ ''میں نے تم سے کہا تھا کہ میں آئندہ تمہاری صورت دیکھنا نہیں چاہتی۔ تم پھر آ گئے۔''
''میں معذرت کرنے آیا ہوں۔'' بروشر ملتجیانہ لہجے میں بولا۔ چند لمحوں کی ردّوکد کے بعد الیگزا نے دروازہ کھول دیا اور بروشر اندر آ گیا۔ بیش قیمت اسپورٹس شرٹ میں وہ خاصا وجیہہ لگ رہا تھا۔
''میں ہزار مرتبہ کہہ چکا ہوں کہ ہمارے بزرگ جو کچھ کر رہے ہیں ہمیں اس میں ٹانگ نہیں اڑانی چاہیے اور اپنے بارے میں سوچنا چاہیے۔'' وہ مضطربانہ انداز میں ہاتھ ملتے ہوئے بولا۔ ''کیا خیال ہے آئندہ منگل کی شام کلب میں گزاری جائے۔''
الیگزا نے کوئی جواب نہیں دیا اور منہ پھیر کر ڈاک دیکھنے لگی۔ اس نے سب سے اوپر والا لفافہ اٹھا کر کھولا اور خط کا مختصر سا مضمون پڑھ کر مسکرا دی۔
''مجھے افسوس ہے بروشر!'' وہ مڑتے ہوئے بولی۔ ''کہ آئندہ منگل کی شام میں تمہارے ساتھ کلب نہیں جا سکوں گی۔ میری کسی اور سے ملاقات طے ہو چکی ہے۔''

☆☆☆

سپلائی ڈپارٹمنٹ میں بوڑھا رابرٹ موجود نہ ہوتا تو جانسن دوسرے ہی دن ملازمت چھوڑ کر بھاگ جاتا۔ اوزاروں کے شعبے میں تقریباً دو ہزار بڑے ڈرم تھے جو اوزاروں سے بھرے ہوئے تھے۔ جب کوئی کارکن ڈیمانڈ سلپ لے کر آتا تو جانسن کو معلوم ہونا چاہیے تھا کہ کون سا اوزار کہاں ہے۔
''گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے۔'' بوڑھے رابرٹ نے ہنستے ہوئے اسے تسلی دی تھی۔ ''سب کچھ سمجھ میں آ جائے گا۔ جس طرح مجھے چالیس سال میں اس فیکٹری کی ایک ایک اینٹ سے واقفیت ہو گئی ہے۔ جمعے کی رات دیر تک کام کیا کرو۔ اوورٹائم بھی ملے گا اور کام کو سمجھنے میں بھی مدد ملے گی۔''
چونسٹھ سالہ رابرٹ کمپنی کا سب سے پرانا کارکن تھا۔ یہ اُس وقت سے یہاں کام کر رہا تھا جب صرف ایک خراد مشین کے ساتھ اس کمپنی کی بنیاد رکھی گئی تھی۔ مارٹن ٹرانزٹ کا ذکر وہ خاصے احترام سے کرتا تھا۔
''یہ فرینک کیسا آدمی ہے؟'' ایک دن جانسن نے بوڑھے رابرٹ سے پوچھا۔ ''لگتا ہے جیسے اسے یہاں زیادہ پسند نہیں کیا جاتا۔''
''وہ پسند کیے جانے کے قابل ہی نہیں۔'' رابرٹ ناگواری سے بولا۔ 60ء میں معاشی بحران کے زمانے میں کمپنی زبردست خسارے میں چلی گئی تھی۔ ادھر مارٹن کچھ نئی مشینری کا آرڈر دے بیٹھا تھا۔ نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ ملازمین کی تنخواہیں تک خطرے میں پڑ گئیں۔ اس وقت فرینک، مشینری کی قیمت اور تنخواہیں ادا کر کے پارٹنر بن گیا۔ اب جبکہ مارٹن کی دن رات کی محنت سے کمپنی اس مقام پر پہنچ چکی ہے تو فرینک اس کا پتّا صاف کرنا چاہتا ہے، بہرحال...... تم دیکھتے جاؤ کیا ہوتا ہے؟''
منگل کی شام جب جانسن، الیگزا سے ملنے کے لیے تیار ہوا تو وہ خاصا خوش لباس نظر آ رہا تھا۔ اس کی مکان مالکن خاصی شفیق اور مہربان ثابت ہوئی تھی، وہ اس کے کپڑے استری کر دیتی تھی۔ بٹن ٹانک دیتی تھی اور ماؤں کی طرح پیار بھرے انداز میں ڈانٹ ڈپٹ بھی کرتی رہتی تھی۔ زندگی گویا اچانک اس پر مہربان ہو گئی تھی۔ الیگزا نے اس کے پتے پر خط کا جواب دیتے ہوئے لکھا تھا کہ وہ اپنی کار میں اسے لینے کے لیے آ جائے گی اور وہ حسب وعدہ صحیح وقت پر آ گئی۔ جانسن اس کے ساتھ بیٹھتے وقت خوش بھی تھا اور کچھ شرما بھی رہا تھا۔
بیٹھنے کے لیے ریستوران کا انتخاب بھی الیگزا نے

کیا۔ وہ سڑک سے ہٹ کر ایک پُرسکون اور عمدہ ریستوران تھا۔ مینیو دیکھ کر جانسن نے مزید اطمینان کی سانس لی۔ اشیائے خوردونوش کی قیمت بھی زیادہ نہیں تھیں۔ پینے پلانے کے بعد گفتگو میں بڑی روانی اور بے تکلفی آگئی۔ کافی دیر تک جانسن کی نئی ملازمت اور اِدھر اُدھر کے موضوعات پر باتیں ہوتی رہیں۔ اچانک ہی الیگزا کو جیسے کچھ یاد آگیا ہو۔ کسی بات پر ہنستے ہنستے وہ سنجیدہ ہوکر بولی۔

''جانسن! ایک بات تو بتاؤ۔ اسپتال میں جب تمہارے زخموں کا علاج کیا گیا تو کیا اُن پر پلاسٹک سرجری بھی کی گئی تھی؟''

''ہاں، تم کیوں پوچھ رہی ہو؟'' اس کے لہجے میں ہلکا سا تناؤ آگیا۔

''دراصل انکل مارٹن بڑے حیران تھے کہ گروپ انشورنس کے لیے جب تمہارا معائنہ کیا گیا تو تمہارے جسم پر زخم کا کوئی نشان تک نہیں تھا۔'' الیگزا نے صاف گوئی سے کام لیا۔

''یہ پلاسٹک سرجری کا کمال ہے۔'' جانسن نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ''اور میں اس موضوع پر گفتگو کرنا پسند نہیں کرتا۔ کیوں نا ہم اپنے مستقبل کے بارے میں بات کریں۔''

الیگزا نے بھی موضوع بدلنا ہی بہتر سمجھا۔ وہ تقریباً نو بجے ریستوران سے نکلے۔ واپسی پر ڈرائیونگ کی ذمے داری الیگزا نے جانسن کو سونپ دی۔ وہ اس وقت ہائی وے کی طرف مڑ رہے تھے جب پیچھے سے مسلسل ہارن بجائے جانے کی آواز آنے لگی۔ الیگزا نے مڑ کر دیکھا اور اس کے حلق سے ایسی آواز نکلی جو اس کی حیرت اور بیزاری کا امتزاج لیے ہوئے تھی۔ جانسن کی نظر عقب نما آئینے پر تھی جس میں ایک سفید کار اُن کی گاڑی کے عقبی فینڈر کو تقریباً چھوتی ہوئی نظر آرہی تھی۔ جانسن کی پیشانی پر شکنیں ابھر آئیں۔

''یہ کون بدتمیز ہے؟'' وہ خود کلامی کے انداز میں بڑبڑایا۔

''ایسے ہی کوئی شرارت کررہا ہے، تم اس کی طرف توجہ مت دو۔'' الیگزا مضطرب سی ہوکر بولی۔ ''تم چلتے رہو۔'' جانسن نے کار کی رفتار بڑھادی مگر سفید کار نے تب بھی ان کا پیچھا نہ چھوڑا۔ جانسن نے کار روک لی تاکہ وہ آگے نکل جائے لیکن سفید کار بھی ان کا راستہ روکتے ہوئے رک گئی۔

جانسن دروازہ کھول کر اترنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں شعلے دمک اٹھے تھے۔ الیگزا اُس کا بازو تھامتے ہوئے ملتجیانہ سے لہجے میں بولی۔ ''چھوڑو جانسن!'' میں اس نوجوان کو جانتی ہوں، یہ بس اسی معمولی شناسائی کی بنیاد پر خوامخواہ بے تکلف ہونے کی کوشش کررہا ہے۔ اپنی دانست میں یہ مذاق کررہا ہوگا۔''

''میں اسے ذرا مذاق کا مزہ چکھاتا ہوں۔'' جانسن نے تند لہجے میں کہا۔ اس اثنا میں سفید کار کا ڈرائیور کار سے اتر کران کے قریب آگیا۔ وہ چھریرے بدن کا ایک دراز قد نوجوان تھا۔ اس کے بال سنہرے اور سوٹ بیش قیمت تھا۔

''کیسی ہو الیگزا؟'' اس نے بڑی بے نیازی سے پوچھا۔ جانسن کو جیسے اس نے دیکھا ہی نہیں تھا۔

''تم ہمارا پیچھا کررہے تھے؟'' الیگزا نے برہمی سے پوچھا۔ نوجوان نے اس کے سوال کا جواب دینے کے بجائے تحقیر آمیز انداز میں جانسن کی طرف دیکھا اور تمسخرانہ انداز میں بولا۔

''تم نے تعارف نہیں کرایا اِس سے۔ غالباً یہ وہی ہے جسے فیکٹری میں حال ہی میں جھاڑو وغیرہ دینے کے لیے رکھا گیا ہے۔'' پھر وہ جانسن کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولا۔ ''مجھے بروشر فرینک کہتے ہیں۔ الیگزا نے شاید میرا ذکر کیا ہوگا۔''

''ہاں......'' جانسن غرایا۔ ''الیگزا نے ریستوران میں سالم بھنا ہوا سؤر دیکھا تھا، جس کے منہ میں سیب بھی دبا ہوا تھا۔ الیگزا کہہ رہی تھی کہ اسے دیکھ کر اسے تمہاری یاد آنے لگتی ہے۔''

بروشر کا چہرہ سرخ ہوگیا۔ جیب میں ہاتھ ڈالے وہ جانسن کی طرف بڑھا لیکن اس سے پہلے کہ اس کا ہاتھ جیب سے باہر آتا جانسن کا گھونسا اس کے منہ پر پڑا اور وہ مٹی میں جا گرا۔ منہ پونچھتا ہوا وہ جب اٹھا تو اس کے ہاتھ میں چاقو نظر آرہا تھا، جس کا پھل چاندنی میں چمک رہا تھا۔

''نہیں......مت لڑو......'' الیگزا کار میں بیٹھے بیٹھے چیخی۔ بروشر جانسن پر جھپٹا مگر وہ نہایت صفائی سے جھکائی دے گیا اور ساتھ ہی اس نے بروشر کا بازو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر گاڑی کی کھڑکی پر دے مارا۔ چاقو اس کے ہاتھ سے نکل گیا اور وہ درد سے کراہ اٹھا۔

الیگزا نے چاقو اٹھانے کی کوشش کی مگر جانسن اس

سے زیادہ پھرتیلا نکلا۔ اس نے لپک کر چاقو اٹھالیا اور اس کی نوک بروشر کی گردن پر ٹکا دی۔ ''اب کیا خیال ہے۔'' وہ غرایا۔

''مجھے جانے دو۔'' بروشر گھٹی گھٹی آواز میں بولا۔

''اب تو یہاں سے تمہاری لاش ہی جائے گی۔'' جانسن غرایا اور اس نے بروشر کی گردن پر چاقو کی نوک کا دباؤ بڑھا دیا۔

''میں تمہیں مرغی کی طرح ذبح کر کے پھینکنے لگا ہوں۔''

بروشر کے گلے سے گھگیائی ہوئی آوازیں نکل رہی تھیں۔ الیگزا کار سے اتر آئی اور جانسن کا بازو پکڑ کر اسے کھینچ کر دور لے جانے کی کوشش کرنے لگی۔ مگر وہ چٹان کی طرح اپنی جگہ پر جما ہوا تھا۔

''الیگزا مجھے بچاؤ.....'' بروشر اپنی گردن کو جنبش دیے بغیر بولا۔ وہ ذرا بھی ہلتا تو چاقو کی تیز نوک اس کی گردن کاٹ چکی ہوتی۔

''میں کسی سے چھیڑ چھاڑ نہیں کرتا اور جو میرے ساتھ پنگا لے، اُسے معاف نہیں کرتا۔'' جانسن نے سرگوشی کی۔

''جانسن ..... جانسن!'' الیگزا رو دی۔ اس کے رونے کی آواز سن کر جانسن نے سر کو ہلکا سا جھٹکا دیا اور وہ گویا کسی اور دنیا سے واپس آ گیا۔ اس نے یوں آنکھیں جھپکائیں جیسے اس کے سامنے سے دھند چھٹ رہی ہو پھر بروشر کے بازو پر اس کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ اس نے بروشر کو پرے دھکیل دیا۔ بروشر فوراً اپنی گاڑی کی طرف دوڑا۔ چند لمحوں میں ہی اس کی کار نظروں سے اوجھل ہو چکی تھی۔

اسٹیئرنگ وہیل الیگزا نے سنبھال لیا تھا۔ جانسن نے اس کے برابر بیٹھ کر دونوں ہاتھوں میں اپنا منہ چھپا لیا اور خود کلامی کے سے انداز میں بڑبڑایا۔ ''میں..... میں اُسے قتل کرنے لگا تھا..... اس طرح جس طرح دوسروں کو قتل کر چکا ہوں۔''

''دوسروں کو؟'' الیگزا جیسے اپنی جگہ سکڑ کر رہ گئی۔

''ہاں..... وہ چار تھے۔'' جانسن اس کی طرف دیکھتے ہوئے سرگوشی میں بولا۔ ''میں نے اُن چاروں کو ہلاک کر دیا تھا۔ مجھے نہیں معلوم کس لیے.....بس میں نے انہیں ہلاک کر دیا تھا۔ میں نے تم سے جھوٹ بولا تھا یا یوں کہو کہ آدھا جھوٹ بولا تھا کہ میں فارم پر سے نوکری چھوڑ آیا ہوں۔ وہ فارم تو ضرور تھا مگر ویسا نہیں جیسا تم سمجھ رہی ہو گی۔ وہ ایسا فارم تھا جس پر قیدی خود اپنے لیے سبزی وغیرہ اگاتے ہیں اور میں وہاں ملازم نہیں، قیدی تھا۔ میں کوئی ملازمت چھوڑ کر نہیں آیا تھا۔'' وہ تنویمی سی کیفیت میں اعتراف کر رہا تھا۔

''میری معلومات کے مطابق تو اس علاقے میں آس پاس کوئی جیل نہیں۔'' الیگزا بولی۔

''وہ عام قسم کی جیل نہیں تھی۔ اُن جیلوں میں سے ایک تھی جن کے بڑے خوب صورت افسانوی سے نام رکھے جاتے ہیں۔'' جانسن تلخ لہجے میں بولا۔ ''اور میں بھی کوئی عام سا مجرم نہیں ہوں۔ میں اُن میں سے ہوں جنہیں مجرم کے ساتھ ساتھ ذہنی مریض بھی سمجھا جاتا ہے، جن کے قصے تم نے اکثر اخباروں، رسالوں میں پڑھے ہوں گے۔ اب تمہیں کیا محسوس ہو رہا ہے؟'' اس نے استہزائیہ سے انداز میں الیگزا کی طرف دیکھا۔ ''تم چیخنا اور مدد کے لیے پکارنا کب شروع کرو گی؟''

''میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں۔'' الیگزا نے پُرسکون انداز میں کہا۔

''کیوں؟ کیا تمہیں مجھ سے خوف محسوس نہیں ہو رہا؟'' جانسن نے قدرے حیرت سے پوچھا۔ ''میں ذہنی مریض ہوں اور مجرم بھی۔ جب مجھے جنون چڑھتا ہے تو لوگ میرے ہاتھوں مارے جاتے ہیں، جس طرح ابھی تمہارا وہ بوائے فرینڈ......''

''لیکن اُسے تم نے قتل تو نہیں کیا۔'' الیگزا بے تابی سے اس کی بات کاٹ کر بولی۔ ''اسے تم نے چھوڑ دیا تھا۔''

''ہاں۔'' وہ تلخی سے بولا۔ ''میں صحت یاب ہو رہا ہوں، تبھی تو ان لوگوں نے مجھے فارم پر کام کرنے کی اجازت دی تھی۔ میں کسی کے لیے پریشانی کا باعث نہیں بنتا تھا لیکن ابتدائی چند سال مشکل تھے۔ تاہم مجھے یاد نہیں کہ میں وہاں کب پہنچا تھا اور کیا کچھ کرتا رہا تھا۔ مجھے تو یہی محسوس ہوتا تھا کہ میں وہیں پیدا ہوا ہوں اور ہوش بھی وہیں سنبھالا تھا۔ وہیں رفتہ رفتہ میرے ذہن سے دھند چھٹنا شروع ہوئی تھی اور میں نے لوگوں کو پہچاننا، اپنے ہاتھ سے کھانا، پینا اور کپڑے بدلنا سیکھا تھا۔ ماضی مجھے کچھ اچھی طرح یاد نہیں تاہم حال میں، میں اچھی طرح گزار سکتا ہوں مگر یہ نہیں کہہ سکتا کہ مستقبل میں کیا ہوگا۔''

''مستقبل کے بارے میں بھی وہ پُرامید رہے ہوں

گے، تبھی انہوں نے تمہیں اتنی ڈھیل دی ہوگی جانسن۔‘‘ الیگزا نے خیال ظاہر کیا۔ ’’لیکن تم وہاں پہنچے کس لیے تھے؟ تمہیں کچھ یاد ہے؟‘‘

’’یہی ایک بات تو مجھے اچھی طرح یاد ہے۔‘‘ جانسن بولا۔ ’’پتا نہیں کس وجہ سے میں نے چار آدمیوں کو قتل کر دیا تھا۔ میرے اندر جیسے جنون سا اٹھا تھا، جس پر میں قابو نہیں پاسکا تھا۔ مجھے ان کے نام اور چہرے بھی یاد نہیں اور نہ ہی یہ یاد ہے کہ یہ کب کا واقعہ ہے اور کہاں پیش آیا تھا۔ تاہم اتنا مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ انہیں میں نے ہی قتل کیا تھا۔‘‘ اس نے تھکے تھکے انداز میں آنکھیں بند کرلیں۔

’’ایک کو میں نے چاقو سے ہلاک کیا تھا، ایک کو گلا گھونٹ کر اور باقی دو کو میں نے گولی ماری تھی۔‘‘

اس نے آنکھیں کھولیں اور الیگزا کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر یقیناً کوئی ایسا تاثر تھا کہ وہ دور ہٹ گئی۔ شاید وہ بہت دیر سے کسی چیخ کا گلا گھونٹ رہی تھی۔ اب اس کے حلق سے گھٹی گھٹی سی آواز نکلی، لیکن اس آواز میں خوف سے زیادہ کرب کا عنصر شامل تھا۔ وہ دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا کر سسکیاں لینے لگی۔

جانسن نے کار کا دروازہ کھولا اور اتر کر چل دیا۔ اس کا رخ کنسٹراک کی طرف نہیں تھا۔ الیگزا نے اسے نہیں روکا۔ جانسن چاہتا بھی نہیں تھا کہ وہ اسے روکے۔ وہ بہت دور نکل آیا تو عقب میں اس نے کار کا انجن اسٹارٹ ہونے کی آواز سنی جو لمحہ بہ لمحہ دور ہوتی گئی۔ ایک گھنٹے بعد وہ کنسٹراک بس ڈپو میں موجود تھا اور بسوں کا شیڈول دیکھ رہا تھا۔ شیڈول دیکھ کر اسے بے حد مایوسی ہوئی۔ چوبیس گھنٹے تک کوئی بس یہاں سے روانہ نہیں ہو رہی تھی۔ وہ انتظار گاہ کی بینچ پر لیٹ گیا اور چھت میں لگے ہوئے قمقموں کو بار بار گننے لگا اور پھر وہیں لیٹے لیٹے سو گیا۔

جب اس کی آنکھ کھلی تو انتظار گاہ میں روشنی پھیلی ہوئی تھی اور کوئی اس کی ٹانگ ہلاتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ ’’اب اٹھ بھی چکو۔‘‘

وہ تکلیف زدہ سے انداز میں اٹھ بیٹھا اور انکل مارٹن کو سامنے کھڑا دیکھ کر گڑبڑا گیا۔ وہ ناخوشگوار لہجے میں کہہ رہے تھے۔ ’’سونے کے لیے تمہیں یہی جگہ ملی تھی؟‘‘ کیوں اپنی ریڑھ کی ہڈی کے پیچھے پڑے ہو۔‘‘ انہوں نے ہاتھ پکڑ کر اسے اٹھایا اور وہ ایک لفظ کہے بغیر ان کے ساتھ چل دیا۔ باہر آکر وہ چند قدم چلے اور ایک ریستوران میں جا بیٹھے۔ گرم گرم کافی کے مگ ان کے آگے رکھے جا چکے تو انکل بولے۔

’’پہلی تنخواہ کا چیک ملا اور تم نوکری چھوڑ کر بھاگ نکلے۔ یہ کون سا انداز ہے نوکری کرنے کا؟‘‘

’’الیگزا نے آپ کو کچھ نہیں بتایا؟‘‘ جانسن نے دھیمی آواز میں پوچھا۔

’’وہ اُس بچے کی طرح روتی پیٹتی گھر پہنچی تھی جس کا اکلوتا غبارہ پھٹ گیا ہو۔‘‘ انکل نے بدستور کھردرے لہجے میں کہا۔ ’’اس نے مجھے سب کچھ بتا دیا تھا۔ بروشر سے تمہارا جھگڑا...... اور وہ تمہاری بیماری وغیرہ کا قصہ۔ بچپن میں غالباً تم کسی غلطی سے کسی اصلاحی جیل میں قید رہے ہو۔‘‘ اس کا مطلب تھا کہ الیگزا نے سب سے اہم بات اپنے انکل کو نہیں بتائی تھی۔ لیکن کیوں؟ جانسن نے حیرت سے سوچا۔ ایک لمحے کے توقف کے بعد اس نے پوچھا۔

’’آپ نے مجھے تلاش کرنے کا تردد کیوں کیا؟‘‘

’’مجھے کیا معلوم؟‘‘ انکل مارٹن غرائے۔ گویا یہ سوال اُن سے نہیں کسی اور سے کیا جانا چاہیے تھا۔ ’’شاید اس لیے کہ الیگزا یہی چاہتی تھی۔ ویسے بھی میرے ہاں سے کوئی شخص اس طرح بلاوجہ نوکری چھوڑ کر نہیں بھاگ سکتا اور پھر اس بڈھے طوطے رابرٹ کا بھی مسئلہ ہے۔ مدت بعد اُسے ایک ایسا اسسٹنٹ میسر آیا ہے، جس سے اس کی نبھنے لگی ہے۔ اپنے ماضی کے متعلق تمہیں تشویش زدہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ ہم تو اس معاملے میں زبان کھولنے سے رہے...... اور بروشر کے ساتھ جو کچھ تم نے کیا، ظاہر ہے اس کے بارے میں وہ بھی اپنی بے عزتی کے ڈر سے زبان نہیں کھولے گا۔‘‘

’’بہت بہتر باس، جیسے آپ کا حکم۔‘‘ جانسن گہری سانس لے کر بولا اور کافی ختم کرکے انکل مارٹن کے ساتھ جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔

اگلے چند دنوں میں جانسن نے سپلائی ڈپارٹمنٹ میں اوزاروں کی تلاش اور وصولی وغیرہ کا ایک ایسا نظام رائج کردیا جس سے کام بے حد آسان اور تیز ہوگیا۔ یہ نظام اس نے خود ہی غوروخوض کے بعد ترتیب دیا تھا۔ بوڑھا رابرٹ اس طریقہ کار پر تبصرہ کرتے ہوئے بولا۔

’’اگر تمہاری ذہانت کے مظاہرے اسی طرح جاری رہے تو باس تمہیں اٹھا کر آفیسر نہ بنا دے۔ پھر تم پچھتاؤ گے۔ کیونکہ جو مزے یہاں ہیں وہ آفیسر بننے میں نہیں۔‘‘ مگر اسے اپنی تھوڑی سی فاضل آمدنی کی پروا نہیں تھی اور اسے اپنے ذاتی مفاد کے بجائے کمپنی کا مفاد زیادہ عزیز

تھا۔

دفعتاً اسے خیال آیا کہ وہ کمپنی میں رہ بھی سکے گا کہ نہیں۔ کیونکہ عنقریب شیئرز ہولڈرز کی میٹنگ ہونے والی تھی۔ اگر اس کے بعد کمپنی کے اختیارات فرینک کے پاس آجاتے ہیں تو اس کے ملازمت برقرار رکھنے کے امکان کم ہی تھے۔

جانسن آٹھ بجے کام ختم کرکے فیکٹری سے نکلا اور مین گیٹ تک پہنچنے کے لیے مختصر راستہ اختیار کرنے کی غرض سے وہ دفتری عمارات کے درمیان سے چل دیا۔ اس راہداری میں جہاں اعلیٰ افسران کے کمرے تھے، اسے ایک کمرے کا دروازہ تھوڑا سا کھلا نظر آیا۔ زرد روشنی کھلے دروازے سے باہر آرہی تھی اور راہداری کا پالش شدہ فرش آئینے کی طرح چمک رہا تھا۔ جانسن کو قدرے حیرت ہوئی کہ اعلیٰ افسر بھی ابھی تک کام کررہا ہے۔ وہ قریب پہنچا تو کمرے کے دروازے پر اسے فرینک کے نام کی تختی نظر آئی۔ تجسس کے تحت وہ کچھ آہستہ چلنے لگا تاکہ کھلے دروازے سے اس شخص کی جھلک دیکھ سکے، جس نے انکل مارٹن، الیگزا اور نہ جانے کتنے کارکنوں کے ذہنوں میں ہلچل برپا کررکھی تھی۔

کھلے دروازے سے اُسے جو کچھ نظر آیا۔ اس نے اسے خوف زدہ کردیا۔ اندر بڑی سی ٹیبل کے عقب میں جو شخص ریوالونگ چیئر پر بیٹھا تھا، اس کا سر پشتے پر ٹکا ہوا ضرور تھا لیکن بے جان سے انداز میں ایک طرف کو ڈھلکا ہوا تھا۔ اس کی چندیا ٹیبل لیمپ کی روشنی میں چمک رہی تھی اور ٹھوڑی پر سیاہی مائل دھبا سا نظر آرہا تھا۔ جانسن نے کمرے میں داخل ہوکر آواز دی۔ ''مسٹر فرینک!'' مگر فرینک کے جسم میں کسی جنبش کے آثار دکھائی نہ دیے، تو اس نے آگے بڑھ کر اس کا کندھا ہلایا اور تب اسے واضح طور پر پتا چل گیا کہ وہ جواب دینے کی منزل سے گزر چکا ہے۔ اس کے چہرے کا وہ نصف حصہ جو سامنے سے نظر نہیں آرہا تھا کچلا ہوا تھا اور اس طرف سے اس کی کھوپڑی بھی چٹخی ہوئی تھی۔ اس طرف سے بہتا ہوا خون ٹھوڑی تک پہنچا تھا اور کچھ گردن سے ہوتا ہوا کپڑوں میں جذب ہورہا تھا۔

وہ ابھی شش و پنج میں تھا کہ راہداری میں چوکیدار کے بھاری قدموں کی آواز سنائی دی۔ اس لمحے جانسن کو خطرے کا احساس ہوا اور وہ دہشت سے سن ہوکر رہ گیا۔

چوکیدار کے قدموں کی آواز سنائی دینا بند ہوگئی۔ وہ دروازے پر پہنچ کر رک چکا تھا پھر چوکیدار کی بھاری آواز سنائی دی۔ ''مسٹر فرینک!'' کوئی جواب نہ پاکر اس نے اندر جھانکنے کی غرض سے دروازہ کچھ اور کھولنے کے لیے ہاتھ بڑھایا اور اسی لمحے جانسن گولی کی طرح کمرے سے نکلا۔ چوکیدار بھی مستعد تھا۔ اس نے جانسن کی کلائی پر ہاتھ ڈال دیا۔ جانسن نے گھوم کر اس کی ٹھوڑی پر گھونسا رسید کیا اور اپنے آپ کو چھڑا کر راہداری میں دوڑتا چلا گیا۔

''رک جاؤ...... ورنہ گولی ماردوں گا۔'' چوکیدار چلّا رہا تھا مگر جانسن رکا نہیں اور دوڑتا چلا گیا۔ اسے معلوم تھا کہ اصل ہنگامہ تو فرینک کی لاش دریافت ہونے کے بعد شروع ہوگا۔ ابھی تو چوکیدار نے لاش نہیں دیکھی تھی۔

ایک گلی میں پہنچ کر اس نے ٹیکسی روکی اور ڈرائیور کو الیگزا کا ایڈریس بتا کر بیٹھ گیا۔ راستے میں اس نے دیکھا کہ ٹیکسی میں وہ ریڈیو بھی موجود تھا جس پر پولیس کے نشر کردہ اعلانات سنے جاسکتے تھے۔ کسی بھی لمحے اس پر اعلان سنا جاسکتا تھا۔ ''تمام ڈرائیوروں کو خبردار کیا جاتا ہے کہ وہ اس حلیے کے ایک شخص کے بارے میں ہوشیار رہیں۔'' مگر اس کا سفر خیریت سے کٹ گیا۔ ریڈیو پر کوئی پیغام موصول نہیں ہوا۔ کال بیل بجانے پر دروازہ الیگزا نے ہی کھولا۔

وہ شب خوابی کے لباس میں تھی۔ جانسن نے اُسے سوال جواب کا موقع دیے بغیر ایک طرف ہٹا کر اندر پہنچ کر دروازہ بند کرلیا۔

''کیا بات ہے، تم گھبرائے ہوئے کیوں ہو؟'' الیگزا نے پوچھا۔

''میں تمہیں اور انکل مارٹن کو بتانے آیا تھا کہ...... کہ فرینک کو قتل کردیا گیا ہے......'' جانسن بولا۔

الیگزا نے خوف زدہ انداز میں منہ پر ہاتھ رکھ لیا اور ایک قدم پیچھے ہٹ گئی۔

''یہ مت سوچو کہ میں نے اُسے قتل کیا ہے۔'' جانسن جلدی سے بولا، پھر ساری بات بتانے کے بعد اس نے کہا۔ ''اب لازماً یہ سوچا جائے گا کہ میں ہی اُس کا قاتل ہوں۔ یقین کرو الیگزا! میں جھوٹ نہیں بول رہا...... میری بات کا یقین کرو۔ میں نے اُسے قتل نہیں کیا۔''

رہائشی کمرے میں رکھے ہوئے ٹیلی فون کی گھنٹی بجنے لگی تھی۔ الیگزا چونک کر کمرے کی طرف بڑھی۔ اس نے ایک نظر یوں جانسن کی طرف دیکھا...... جیسے جاننا چاہ رہی ہو کہ وہ اسے روکنے کی کوشش کرے گا یا نہیں۔ مگر جانسن

نے ایسی کوئی کوشش نہیں کی، البتہ اُس کے پیچھے پیچھے رہائشی کمرے میں آ گیا۔ الیگزا نے ریسیور اٹھایا اور ایک لمحے کی خاموشی کے بعد بولی۔

''جی انکل مارٹن......'' فوراً ہی جانسن نے ریسیور اس کے ہاتھ سے لے کر اپنے کان سے لگا لیا۔ انکل مارٹن کہہ رہے تھے۔ ''ٹیکسی ڈرائیور نے ہمیں یہی بتایا ہے کہ اس نے اسے ہل سائڈ کے قریب ہی چھوڑا تھا۔ میرا خیال ہے وہ کسی بھی لمحے ہمارے گھر پہنچنے والا ہوگا۔ تم اپنی کار نکالو اور فوراً کلب پہنچ جاؤ اور اس وقت تک وہیں رہو جب تک میں نہ پہنچ جاؤں، سمجھ گئیں؟''

جانسن نے ریسیور الیگزا کی طرف بڑھایا اور اشارے سے اسے بتایا کہ وہ اثبات میں جواب دے۔

''جی انکل......ٹھیک ہے۔''

جانسن نے بھی ریسیور سے کان لگایا ہوا تھا اور آواز کافی حد تک اسے بھی صاف سنائی دے رہی تھی۔ انکل مارٹن کہہ رہے تھے۔ ''کاش میں نے اُسے ملازم رکھا ہی نہ ہوتا۔ اب دیکھو ہم کتنی بڑی مصیبت میں پھنس گئے ہیں۔''

''ویسے مجھے یقین ہے انکل کہ قتل اس نے نہیں کیا۔'' الیگزا ہچکچاتے ہوئے بولی۔

''وہ رنگے ہاتھوں پکڑا گیا تھا لیکن فرار ہو گیا ہے۔'' انکل مارٹن نے زور دے کر کہا۔ ''تم خود بھی مجھے بتا چکی ہو کہ وہ پہلے بھی کئی قتل کر چکا ہے۔ ممکن ہے اُس احمق نے سوچا ہو کہ اس طرح وہ میرے کام آنے کی کوشش کر رہا ہے۔ اچھا اب وقت ضائع مت کرو اور فوراً گھر سے نکل آؤ۔''

الیگزا نے ریسیور رکھ دیا اور جانسن کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ''اب تم کیا کرنا چاہتے ہو؟''

''اپنی کار کی چابیاں مجھے دے دو۔'' جانسن نے کہا۔

وہ ہال کی دیوارگیر الماری کی طرف چل دی۔ جانسن یہاں بھی اس کے پیچھے پیچھے آ گیا۔ اس نے دیکھا وہ جھک کر الماری میں ہاتھ مار رہی ہے۔ چابیاں نکالنے میں اتنی دشواری تو نہیں ہونی چاہیے تھی۔ جانسن نے یہ سوچ کر اسے ایک طرف ہٹایا اور اسی جگہ ہاتھ مار کر دیکھا۔ لٹکے ہوئے کپڑوں کے عقب میں کھڑی ہوئی ایک ڈبل بیرل شارٹ گن اس کے ہاتھ میں آ گئی۔ اس نے شعلہ بار نظروں سے الیگزا کی طرف دیکھا۔

''ٹھیک ہے اب تلاش کرو۔'' جانسن نے اشارہ کیا۔ کار کی چابیاں الیگزا کو اپنے رین کوٹ سے ملیں۔ چابیاں لے کر جانسن دروازے کی طرف بڑھا مگر جیسے ہی اس نے دروازہ کھولا، تیز روشنی اچانک اس کی آنکھوں پر پڑی اور اس نے فوراً ہی تیزی سے دروازہ بند کر دیا اور گہری سانسیں لینے لگا۔

''کیا ہوا؟'' الیگزا نے پوچھا۔

''پولیس پہلے ہی باہر موجود ہے۔'' جانسن نے جواب دیا اور شارٹ گن سے الیگزا کو رہائشی کمرے میں چلنے کا اشارہ کیا۔ اس کی کنپٹیوں میں دھمک سی ہو رہی تھی اور کوئی غیبی طاقت گویا اس کی حرکات و سکنات کو کنٹرول کر رہی تھی۔ اس نے سامنے والے کمرے کی کھڑکی کا پردہ ہٹا کر باہر دیکھا۔ باہر گشتی پولیس کی ایک گاڑی موجود تھی جس کی اسپاٹ لائٹ کا رخ دروازے کی طرف تھا اور لائٹ آن تھی۔ میگافون پر ایک کرخت آواز ابھری۔

''جانسن! میں اسٹیٹ پولیس کا کیپٹن مورے تم سے مخاطب ہوں۔ ہم تمہیں گرفتار کرنے نہیں، تم سے بات کرنے آئے ہیں۔ باہر آؤ۔ ہم زیادہ دیر انتظار نہیں کر سکتے۔ جتنی دیر تم اندر رہو گے اتنا ہی یہ تمہارے مفاد میں بہتر نہیں ہوگا۔'' اس اثنا میں ایک اور کار پہلی کار کے عقب میں آ رکی اور اس سے گشتی پولیس کے سپاہی اترے۔ ان کے کندھوں پر ان کے ہتھیار نظر آ رہے تھے۔

''میں باہر نہیں آ رہا ہوں۔'' جانسن چلّایا۔

''تو پھر لڑکی کو باہر بھیج دو اور اپنے لیے دشواریاں پیدا نہ کرو۔''

جانسن نے مڑ کر الیگزا کی طرف دیکھا اور کرب زدہ ہو کر کہا۔ ''یہ میں نہیں کر سکتا الیگزا! اس وقت تم پر ہی میری زندگی کا دارومدار ہے لیکن تم ڈرو مت۔ مجھ سے تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔'' پھر وہ کھڑکی کی طرف منہ کر کے چلّایا۔ ''اندر گھسنے کی کوشش نہ کرنا۔ میرے پاس شارٹ گن ہے۔ میں لڑکی کو ہلاک کر دوں گا، اگر کسی نے اندر آنے کی کوشش کی۔''

اذیت کے لمحے گزرنے لگے حتیٰ کہ پورا ایک گھنٹا گزر گیا۔ قانون کے محافظ باہر جمع ہوتے رہے اور آپس میں صلاح مشورے کرتے رہے اور جانسن شارٹ گن گود میں رکھے رہائشی کمرے میں بیٹھا اپنے اعصاب کی شکست و ریخت کو برداشت کرتا رہا۔ دفعتاً میگافون پر انکل مارٹن کی آواز گونجی۔

''جانسن! تم میری آواز سن رہے ہو؟ گن پھینک کر باہر آجاؤ، کوئی بھی تمہیں گزند پہنچانا نہیں چاہتا۔''

''الیگزا رو دینے والے انداز میں بولی۔ ''انکل جو کہہ رہے ہیں وہی کرو جانسن! تمہیں معلوم ہے کہ وہ تمہیں پسند کرتے ہیں اور تمہارے خیر خواہ ہیں۔''

''تمہارا خیال ہے کہ میں اتنی جلدی وہ سب کچھ بھول جاؤں جو انہوں نے فون پر کہا تھا؟'' جانسن تلخی سے بولا۔ ''وہ کہہ رہے تھے میں قاتل ہوں...... پہلے ہی کئی قتل کر چکا ہوں۔ انہیں کیسے معلوم ہوا؟ کیا واقعی تم نے ہی انہیں بتایا تھا؟''

''ہاں، میں اُن سے کوئی بات نہیں چھپاتی۔'' الیگزا بلا تامل بولی۔

''لیکن جب وہ مجھے بس ڈپو پر لینے گئے تو انہوں نے یہ ظاہر نہیں کیا تھا کہ تم انہیں یہ بات بتا چکی ہو۔'' جانسن تیزی سے بولا۔ ''اگر انہیں اسی وقت پتا چل چکا تھا کہ میں ایک قاتل ہوں تو وہ مجھے ملازمت پر واپس کیوں لائے؟'' اس کے لہجے میں بے پناہ تلخی آچکی تھی۔ ''صرف اس لیے کہ انہیں قربانی کا ایک بکرا چاہیے تھا۔''

ایک بار پھر میگا فون پر اُسے پکارا گیا، وہ ایک کھڑکی کے پاس پہنچا اور چلّایا۔ ''مسٹر مارٹن کو اندر بھیج دو۔ ان کے سوا میں کسی سے بات نہیں کروں گا۔'' باہر سے ایک ہیولا دروازے کی طرف بڑھتا نظر آرہا تھا۔

''انکل کو کچھ مت کہنا جانسن......'' الیگزا سسکیاں لیتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

چند لمحوں بعد دروازے پر دستک ہوئی۔ انکل مارٹن کے انداز میں کسی قسم کی جھجک یا ہچکچاہٹ نہیں تھی۔ جانسن نے قفل کھولا اور شارٹ گن سنبھالے ایک طرف ہٹ کر کھڑا ہوگیا۔

انکل مارٹن کمرے میں داخل ہوئے تو الیگزا کسی خطرے کی پروا کیے بغیر دوڑ کر ان سے جا لپٹی۔ جانسن ان کا نشانہ لیتے ہوئے بولا۔ ''الیگزا سے دور ہٹ جاؤ۔''

''گن پھینک دو جانسن!'' انکل مارٹن اطمینان سے بولے۔ ''ہمیں معلوم ہو چکا ہے کہ فرینک کو کس طرح قتل کیا گیا تھا۔''

''یقیناً تمہیں تو معلوم ہونا ہی چاہیے تھا۔'' جانسن نے قہقہہ لگایا۔ ''کیونکہ تمہارا ہی تو یہ منصوبہ تھا۔ تمہیں پتا چل چکا تھا کہ میں ذہنی مریض ہوں اور قاتل بھی ہوں۔ مجھے قربانی کا بکرا بنانے کے لیے ہی تم دوبارہ مجھے فیکٹری میں لائے تھے۔''

''یہ جھوٹ ہے۔'' انکل مارٹن کے چہرے پر سرخی آگئی۔ ''الیگزا نے مجھے بتایا ضرور تھا مگر اس نے یہ بھی بتایا تھا کہ تمہارا علاج ہو چکا ہے اور اب تم صحت یاب ہو چکے ہو۔''

''تم جھوٹ بولتے ہو۔'' جانسن دہاڑا اور اس نے شارٹ گن سیدھی کرلی کہ میگا فون پر کسی کی آواز گونجی۔

''جانسن یہاں ابھی ابھی دو آدمی پہنچے ہیں۔ یہ ہماری مدد کے لیے آئے ہیں، تم سے بات کرنا چاہتے ہیں۔''

جانسن کھڑکی میں پہنچا اور دیکھا کہ ایک کار سے دو آدمی اتر رہے ہیں۔ ایک تو پستہ قد تھا وہ عام سوٹ میں تھا، دوسرا دراز قد تھا اور فوجی وردی میں تھا۔

''کرنل راڈو......'' اس بار جانسن کسی عجیب سے جذبے سے بے قابو ہو کر چلّایا۔ پھر شارٹ گن ایک ہاتھ میں بلند کیے دیوانوں کی طرح دوڑتا ہوا دروازہ کھول کر باہر نکلا۔ وہ غالباً دوڑتا ہوا ہی وردی والے نووارد سے ملنا چاہتا تھا مگر ابھی وہ مکان سے دو تین گز ہی دور گیا تھا کہ بدحواسی کے عالم میں کھڑے ہوئے پولیس آفیسر نے گولی چلا دی۔

جانسن اوندھے منہ بجری پر گرا اور ڈھیر ہوگیا۔

☆☆☆

الیگزا جب اسپتال کے وارڈ میں داخل ہوئی تو اس نے باوردی آفیسر کو جانسن کے قریب ہی بیٹھے دیکھا۔ پہلی بار اس نے آفیسر کے بیج سے اندازہ لگایا کہ اس کا تعلق فوج کے میڈیکل کے شعبے سے تھا۔ اس کے بال سفید تھے، مگر وہ چہرے مہرے سے جوان لگتا تھا۔

''تم یقیناً الیگزا ہو۔'' وہ مشفقانہ لہجے میں بولا۔ ''میں کرنل ڈاکٹر راڈو ہوں۔''

الیگزا نے جانسن کی طرف دیکھا تو وہ کمزور سے انداز میں مسکراتے ہوئے بولا۔ ''کرنل نے اس لیے تمہیں پہچان لیا کہ میں تمہارے متعلق بہت زیادہ باتیں کرتا رہا ہوں۔''

''اب طبیعت کیسی ہے؟ کیسا محسوس کر رہے ہو؟'' الیگزا نے پوچھا۔

''طبیعت خاصی بہتر ہے اور میں اپنے آپ کو اسپتال میں نہیں، گھر میں لیٹا ہوا محسوس کر رہا ہوں۔'' جانسن دھیمی آواز میں بولا۔ ''گولی میری ٹانگ سے نکال لی گئی ہے۔ تھوڑا عرصہ شاید میں لنگڑا کر چلوں پھر بالکل ٹھیک ہو جاؤں گا۔''

''ان ناخوشگوار واقعات کا سب سے خوشگوار پہلو یہ ہے۔'' کرنل راڈو بولا۔ ''کہ جانسن کی یادداشت واپس آنے لگی ہے۔فرار اس کے لیے علاج سے بہتر ثابت ہوا ہے۔''

''فرار۔'' الیگزا نے حیرت سے دہرایا۔

''ہاں الیگزا۔'' جانسن کمزور لہجے میں بولا۔ ''مجھے اس فارم سے رخصت نہیں کیا گیا تھا میں وہاں سے فرار ہوا تھا۔لیکن یہی بات تمہیں بتاتے ہوئے مجھے سب سے زیادہ خوف آتا تھا۔ میں نے تمہیں تاثر دیا تھا کہ میرا علاج مکمل ہوگیا ہے۔لیکن ایسا نہیں تھا۔''

الیگزا نے سوالیہ نظروں سے کرنل کی طرف دیکھا اور وہ اس کے سوال کو سمجھتے ہوئے مسکرا کر بولا۔

''نہیں، جانسن کو واپس نہیں جانا پڑے گا۔ کیونکہ گزشتہ چند دنوں میں پیش آنے والے واقعات اس کے لیے برسوں کے علاج سے بہتر ثابت ہوئے ہیں۔اب ہم اسے ایک طرح سے آؤٹ ڈور مریض شمار کریں گے جو تقریباً صحت یاب ہی ہوچکا ہے۔''

''مریض؟'' الیگزا ایک بار پھر اُلجھن میں پڑ گئی۔

''ہاں بھئی، وہ کوئی جیل یا کسی اور نوعیت کا قید خانہ تو نہیں تھا جہاں سے یہ بھاگا ہے۔وہ تو ایک نفسیاتی علاج گاہ ہے اور جانسن وہاں اس لیے داخل تھا کہ یہ اپنی یادداشت کھو بیٹھا تھا۔'' کرنل نے بتایا۔ ''قصہ دراصل یہ ہے کہ جانسن نہایت کم عمری میں اور بہت تھوڑی تربیت کے بعد جرمنی کے محاذ پر چلا گیا تھا۔ جہاں اسے بہت ہی خوفناک حالات کا سامنا کرنا پڑا۔ایک روز یہ دشمن کے علاقے میں جا گھسا اور ان کے نرغے میں پھنس گیا۔ چاروں طرف گولے پھٹ رہے تھے اور یہ تن تنہا دشمنوں کے نرغے میں تھا۔اس کے پاس ایمونیشن بھی ختم ہوچکا تھا صرف گن میں دو گولیاں باقی تھیں۔وہاں اسے پہلی بار دست بدست لڑائی سے واسطہ پڑا۔ یہ دشمن کے چار آدمیوں (سپاہیوں) کو ہلاک کرکے نکل تو آیا لیکن وہ رات عجیب انداز میں اس کے ذہن پر نقش ہوکر رہ گئی۔ایک احساسِ جرم اس کے دماغ میں بیٹھ کر رہ گیا اور باقی سب کچھ محو ہوگیا۔ یہ سمجھنے لگا کہ اس نے عام زندگی میں کہیں چار اشخاص کو قتل کیا ہے۔ آج جب میں نے ٹی وی پر خصوصی بلیٹن میں فرینک کے قتل کی خبر سنی اور فیکٹری کے ریکارڈ سے لی گئی جانسن کی تصویر دیکھی تو اسے پہچان لیا اور میں سمجھ گیا کہ پولیس کو غلط فہمی ہوئی ہے اور ناحق جانسن پر شبہ کیا جانا، کہیں حالات کو بدتر نہ بنا دے اور ہماری برسوں کی کوششوں پر پانی نہ پھیر جائے۔ چنانچہ میں نفسیاتی اسپتال کے ڈاکٹر جیکسن کو ساتھ لے کر فوراً یہاں پہنچا۔ جانسن ہم دونوں کے زیرِ علاج رہا ہے۔''

کرنل خاموش ہوا تو الیگزا نے مڑ کر جانسن کی طرف دیکھا اور مسرت و اطمینان کی ایک طویل سانس لے کر کہا۔

''خدا کا شکر ہے جانسن، سب ٹھیک ہوگیا۔''

''سب ٹھیک تو نہیں ہوا۔'' جانسن قدرے تلخی سے بولا۔ ''تمہارے انکل کے بارے میں تو میرا اندازہ غلط نہیں تھا۔ انہوں نے قتل کا منصوبہ بنا کر مجھے پھانسنے کی کوشش کی تھی۔''

''اوہ......'' الیگزا نے گہری سانس لے کر اُس کا ہاتھ تھام لیا۔ ''تو تمہیں ابھی تک کسی نے حقیقت سے آگاہ نہیں کیا جانسن؟ قتل انکل مارٹن نے نہیں، بوڑھے رابرٹ نے کیا تھا۔''

''رابرٹ نے؟'' جانسن نے بے یقینی اُس کی طرف دیکھا۔

''ہاں، بے چارہ رابرٹ...... وہ اپنی دانست میں انکل مارٹن کا سب سے بڑا ہمدرد بن کر فرینک سے بات کرنے اس کے دفتر گیا تھا۔کوئی بھاری اوزار بھی اس کے ہاتھ میں تھا۔ان کے درمیان بحث وتکرار، بہت تلخ صورت اختیار کرگئی اور رابرٹ نے وہ اوزار اس کے سر پر دے مارا۔ اسے خود بھی احساس نہیں تھا کہ اس کے وار سے فرینک مر جائے گا۔بعد میں جب اسے حقیقتِ حال کا علم ہوا تو وہ انکل مارٹن کے پاس آ پہنچا اور اس نے سب کچھ سچ سچ بتا دیا۔''

''بے چارہ...... رابرٹ......'' جانسن بڑبڑایا۔

''اب اس کا کیا بنے گا؟''

انکل مارٹن کا کہنا ہے کہ وہ اس کے لیے آخری مرحلے تک لڑیں گے۔ تمہیں اندازہ ہوچکا ہوگا کہ وفاداری انکل مارٹن کی نظر میں مذہب کی سی اہمیت رکھتی ہے۔''

''وہ اس وقت ہیں کہاں؟'' جانسن نے پوچھا۔

''وہ تین بجے اسپتال آئیں گے......اور ہاں، انہیں تمہارے ترتیب دیے ہوئے اس نئے نظام کے متعلق معلوم ہوچکا ہے اور وہ تمہاری کارکردگی سے بہت خوش ہیں۔ غالباً وہ تمہیں دفتر میں کوئی بڑی ملازمت دینے کی بات کریں گے۔تم انکار مت کرنا اور خوامخواہ کی نخرے بازی مت دکھانا......سمجھے؟''

اپناہائٹ کے لیے اپنے آپ کو بیمار سمجھنے کی کوئی وجہ نہیں تھی۔ پورے دن سکون سے کام ہوتا رہا۔ شراب خانے میں روزمرہ کی ضروریات پوری کرنے کے سوا کوئی مطالبہ سامنے نہیں آیا اور شام سے پہلے چند جھگڑوں کے بعد مجمع پُرسکون ہوگیا۔ کلارا جونز جو شراب کشید کرنے کی ذمّے دار تھی، اس نے جانے سے پہلے اطلاع دی کہ شراب کے کارخانے میں سب کچھ معمول کے مطابق ہے۔ اسی طرح بڑے ہال میں بھی سورج غروب ہونے کے ساتھ ہی

مہربان دوست

تنویر ریاض

دوستی نبھانا آسان نہیں ہوتا... راہ میں آنے والے کئی طوفانوں سے گزرنا پڑتا ہے... جذبۂ دوستی کا پیمان ہر طرح کے پیمان سے بالاتر ہوتا ہے... ایسا عہد وفا جسے دم آخر تک نبھانا پڑتا ہے... بے وفائی... کج ادائی سے دور ایثار پسندی اور بے خودی ہی اس کی اصل پہچان ہوتی ہے...

ایک ہی کشتی میں سوار دو متضاد عورتوں کے تصادم کا ماجرا

کاروبار بڑھنا شروع ہوگیا۔ اینا کو اپنے گاہکوں کی خدمت کرنے میں کوئی مشکل پیش نہیں آئی۔ وہ مسلسل سوچ بچار میں رہتی تھی۔ چاہے کسی کو بوتل چاہیے یا پورا بیرل، وہ ہر ایک سے یکساں سلوک کرتی۔ لوگوں سے پیسے لینا ہوں یا حساب کتاب کرنا ہو، وہ ہمیشہ پُرسکون انداز میں کام کرتی تھی۔ کبھی کبھی گاہکوں سے مختصر بات کر لیتی اور وقتاً فوقتاً ماحول کا جائزہ لینے کے لیے ہال پر ایک طائرانہ نظر ڈال لیتی۔ البتہ ایک واقعہ ایسا پیش آیا جس کی وجہ سے آج کا دن خراب ہوگیا۔ بھاری چابیوں کے وزن سے اس کی چابیوں کا گچھا ٹوٹ گیا اور تمام چابیاں فرش پر بکھر گئیں۔

شام ہوتے ہوتے اینا کے سر میں درد شروع ہوگیا۔ اسے یوں لگا جیسے اس کے سر میں شیشے کی کرچیاں بھری ہوئی ہیں اور اس کی بائیں آنکھ کے پیچھے درد بڑھتا جا رہا ہے۔ اسے دانت میں بھی درد محسوس ہو رہا تھا۔ اس نے سوچا کہ شاید دانت میں پیپ بھر گئی ہے لیکن جب اس نے گال کو چھوا تو وہاں سوجن نہیں تھی تاہم درد کا احساس باقی رہا۔

اگلی صبح تک درد مزید بڑھ گیا۔ اس نے ناشتے میں صرف دلیا اور بیئر لی گو کہ اسے کھانے میں کوئی تکلیف نہیں ہوئی لیکن سر اور جبڑے میں دکھن ہوتی رہی۔ اس نے چائے میں رم ملا کر پی تو درد میں کسی حد تک کمی واقع ہوگئی گو کہ وہ اپنے آپ کو بیمار محسوس کر رہی تھی۔ اس نے کام پر جانے کا ارادہ ترک کر دیا اور آرام کی غرض سے بستر پر لیٹ گئی۔ اس کی آنکھ کھلی تو اندھیرا پھیل چکا تھا۔ اس نے خواب میں اپنے شوہر کو دیکھا جسے مرے ہوئے ایک سال ہو چکا تھا۔ وہ اب کیوں خواب میں آ کر اسے تنگ کر رہا ہے۔ وہ ویسے ہی بہت پریشان تھی۔ صرف چند ماہ پہلے اسے جان گرس ولڈ اور ہاؤس ورتھ سے اپنی زندگی کی بقا کی جنگ لڑنا پڑی تھی۔

یہ یاد آتے ہی اس کے سر اور جبڑے میں دوبارہ درد شروع ہوگیا۔ ”میں پاگل ہو جاؤں گی۔“ اس نے اپنے آپ سے کہا۔ ”میں یہ پریشانی برداشت نہیں کر سکتی۔ مجھ پر گھبراہٹ کیوں طاری ہے۔ لگتا ہے کہ جیسے کسی نے سینے میں چاقو اتار دیا ہو۔“

دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی۔ ”اینا! یہ میں ہوں کلارا۔ میں تم سے مزید بیرل کا آرڈر دینے کے بارے میں پوچھنا چاہ رہی ہوں۔“

اینا بستر سے اُتر کر اپنی میز تک گئی اور بولی۔ ”اندر آجاؤ۔“

کلارا نے اسے چند کاغذات پکڑائے۔ اینا نے ان پر ایک نظر ڈالی۔ اسے پڑھنے میں دقت محسوس ہو رہی تھی۔ ”ٹھیک ہے۔ تم مزید بیس بیرل کا آرڈر دے دو۔ یہ مت بھول جانا کہ اب ہمارے پاس صرف پانچ بیرل باقی رہ گئے ہیں۔“

کلارا خاموش کھڑی رہی۔ اس نے عام سا لباس پہن رکھا تھا اور بال سلیقے سے بنائے ہوئے تھے۔ اس کے بیضوی چہرے میں کوئی غیر معمولی بات نظر آئی۔ تبھی اینا کی نظریں اس کی کلائی پر چمکتی ہوئی چیز پر گئیں۔ اس نے فوراً پہچان لیا کہ یہ بھٹی کی چابی تھی۔ اینا کو وہ رات یاد آگئی جب گرس ولڈ اور ہاؤس ورتھ نے اس پر حملہ کیا تھا۔ اسے لگا جیسے ساری دنیا اس کے گرد گھوم رہی ہو۔ کلارا منتظر تھی کہ اینا کچھ کہے۔ اینا کو اپنے تاثرات پر قابو پانے کی کافی مشق تھی۔ اس نے اپنا سر ہلایا اور چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ لاتے ہوئے بولی۔

”اس وقت مجھے کچھ یاد نہیں آ رہا۔ اس کے لیے معذرت چاہتی ہوں۔ اس پورے ہفتے کے دوران میں میری یہی کیفیت رہی۔“

”کوئی بات نہیں۔“ کلارا نے ہمدردی جتاتے ہوئے کہا۔ ”یہ کسی کے ساتھ بھی ہو سکتا ہے۔ تمہیں کچھ اور کہنا ہے......“

”نہیں، تم جا سکتی ہو۔“

کلارا کے جانے کے بعد اس نے دروازہ بند کیا اور اپنی میز پر واپس آگئی۔ اس کے دماغ میں چنگاریاں سلگ رہی تھیں۔ کلارا نے اسے دھوکا دیا تھا اور اپنی چابی سے تالا کھول کر گرس ولڈ کو اندر آنے دیا۔ کلارا جانتی تھی کہ اس نے اینا پر حملہ کر دیا ہے لیکن وہ کچھ نہیں بولی۔

اگلے روز اینا اپنے کمرے میں رہی۔ اسے اپنے آپ پر بھروسا نہیں تھا کہ کہیں وہ اپنے جذبات اور ارادوں کو عیاں نہ کر دے۔ اسے کلارا کی حرکت پر شدید غصہ تھا اور وہ اپنے آپ سے بھی ناراض تھی کہ اس نے کلارا پر زیادہ توجہ کیوں نہیں دی۔ وہ حیران تھی کہ کلارا نے کس طرح گرس ولڈ کے ساتھ مل کر اس کے خلاف سازش کی۔ کیا کسی اور شبے کا امکان تھا۔

لیکن جو کچھ اس نے دیکھا، وہی کافی تھا۔ اس حملے کے بعد بہت کچھ ہو چکا تھا۔ خاص طور پر اپنے نئے سرپرست مسٹر براؤن سے گفتگو کرنے کے بعد یہ سب باتیں اس کے ذہن سے محو ہو چکی تھیں لیکن اینا کی یادداشت

اتنی کمزور نہ تھی کہ وہ اتنی جلدی اسے بھول جاتی۔ جب اس نے بھٹی پر لگے ہوئے تالے کا معائنہ کیا تو ایسی کوئی علامت نظر نہیں آئی۔ جس سے پتا چلتا ہو کہ اسے توڑنے کی کوشش کی گئی تھی۔ کھڑکیاں بند تھیں اور اینا کی چابی اس کے پاس تھی۔ دوسری چابی کلارا کے استعمال میں رہتی تھی اور اینا نے اسے سختی سے ہدایت کر رکھی تھی کہ وہ کسی بھی قیمت پر یہ چابی کسی کے حوالے نہ کرے۔ اس نے اینا کی ہدایت کو نظر انداز کیا یا جان گرس ولڈ اور اس کے ساتھی کو اندر آنے کی اجازت دی تا کہ وہ اینا کی محنت سے بنائی گئی بھٹی اور اس کے کاروبار کو تباہ کر دیں اور شاید اسے بھی مار ڈالیں۔

کلارا نے ایسا کیوں کیا، شاید اس کی کوئی وجوہات ہوں لیکن اینا کبھی تصور بھی نہ کر سکتی تھی کہ وہ اس سے دھوکا کرے گی۔ اس نے کلارا کو تحفظ دیا۔ اسے معقول تنخواہ پر ملازمت دی۔ تھوڑا بہت اکاؤنٹنگ کے بارے میں سکھایا اور اسے شراب کشید کرنے کا نگراں بنا دیا۔ اس کی ہر ضرورت کا خیال رکھا اور اسے کبھی کوئی تکلیف نہیں ہونے دی پھر اس نے یہ دغا بازی کیوں کی۔ اینا کے پاس یہ جانچنے کا کوئی پیمانہ نہیں تھا۔

اینا نے بالآخر کلارا سے نمٹنے کا طریقہ دریافت کر ہی لیا اگر وہ واقعی غداری کی مرتکب ہوئی تھی، اس نے لمحہ بھر کے لیے غور کیا۔ اس نے یہ قیمتی سبق سیکھ لیا تھا کہ اسے اپنے کاروبار میں کس طرح رہنا ہے۔ بظاہر وہ ایک نرم مزاج اور عام عورت تھی جو باقاعدگی سے چرچ جاتی، ٹیکس اور واجبات بروقت ادا کرتی اور ہر ایک سے خندہ پیشانی سے ملتی جب تک کہ اس کے برعکس سلوک کرنے کی کوئی وجہ نہ ہو۔ اس خوفناک رات کو ہونے والے حملے کے بعد اس نے یہ سیکھا کہ اسے بھی ان لوگوں کے ساتھ زیادہ جارحانہ اور محتاط رویہ اختیار کرنا چاہیے جو اس کے لیے مشکلات پیدا کریں۔

اینا نے دوپہر کے کھانے کے بعد متبادل طریقوں پر غور کرنا شروع کیا اگر کلارا کو اس کے عہدے سے ہٹا دیا جائے تو اس کی جگہ کون لے گا۔ گو کہ اینا نے کلارا کو دیکھ کر کشید سازی کا عمل سیکھ لیا تھا لیکن اب اس کے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ وہ اپنے آپ کو اس کام کے لیے وقف کر سکے اسے کوئی اور ڈسگر تلاش کرنا ہوگا جو شاید اتنا آسان نہ ہو۔ اس لیے کہ اسے بالکل بھی اندازہ نہیں تھا کہ اس کام کے لیے کون کتنا اہل اور باصلاحیت ہے۔ اس کے لیے اسے مزید معلومات درکار ہوں گی۔

وہ جانتی تھی کہ اسے شراب خانے ضرور جانا چاہیے ورنہ لوگ تشویش میں مبتلا ہو جائیں گے۔ لہٰذا اس نے لباس تبدیل کیا اور مطمئن ہو گئی کہ وہ ٹھیک نظر آ رہی ہے۔ اس کا نام نہاد درد مکمل طور پر دور ہو چکا تھا۔ وہ پہلے بڑے ہال میں گئی۔ وہاں سب ٹھیک تھا پھر اس نے بھٹی کا رخ کیا۔

''میرے پاس ایک اور بھٹی حاصل کرنے کا موقع ہے۔'' اینا نے کلارا سے کہا۔ ''کیا تم سمجھتی ہو کہ اس کا انتظام بھی سنبھال لو گی یا تمہیں ایک دو معاونین کی ضرورت ہو گی؟''

''میں صبح سے شام تک یہاں کام کرتی ہوں اور میری مدد کے لیے صرف ایک لڑکا ہے۔'' کلارا نے جواب دیا۔

''یہ بھٹی کب شروع ہو گی اور کیا اس سے پہلے مجھے اپنے والدین کے پاس جانے کا موقع مل سکے گا؟''

''میں تمہیں فی الحال لمبی چھٹی نہیں دے سکتی۔ اگر میں اس منصوبے پر عمل کروں تو تمہیں کتنے معاونین درکار ہوں گے جو مطلوبہ اہلیت رکھتے ہوں؟''

اس سے پہلے کہ کلارا اپنی ضرورت بتاتی، اینا نے ایک کاغذ پر کچھ لکھنا شروع کر دیا۔ اب وہ کچھ اور سوچ رہی تھی۔ اگر کلارا یہ سمجھ رہی تھی کہ وہ اینا کو بے وقوف بنا سکتی ہے تو وہ اسے نقصان پہنچانے کے لیے کچھ بھی کر سکتی ہے چنانچہ اسے جلد ہی کوئی قدم اٹھانا ہوگا۔ اس نے دل میں سوچا۔ ''اب میں جان گئی ہوں کہ اس لڑکی کو ہٹانے کے لیے کیا کرنا ہے۔''

''کلارا! کیا تم میری مدد کرو گی؟'' اینا نے تہ خانے سے آواز لگائی۔ یہ کئی روز بعد کا واقعہ ہے۔

''مجھے برانڈی کے ایک پیپے کی ضرورت ہے۔''

جیسے ہی کلارا اسیڑھیاں اتر کر تہ خانے میں گئی اور اس کونے میں پہنچی جہاں برانڈی رکھی ہوئی تھی۔ اینا نے آگے بڑھ کر اسے اتنے زور سے تھپڑ مارا کہ اس کا سر پتھروں سے بنی ہوئی دیوار سے جا ٹکرایا۔ اس کا ہونٹ پھٹ گیا اور وہاں سے خون بہنے لگا۔ اس کی آنکھوں کی پتلیاں پھیل گئیں وہ کراہنے لگی اور لڑکھڑاتے ہوئے دیوار کا سہارا لے لیا۔

اینا نے لالٹین کی لو اونچی کی اور اپنا پستول نکال لیا۔

''تم نے مجھے دھوکا دینے کی جرأت کیسے کی، میرے دشمنوں کی مدد کر کے جو نہ صرف مجھے تباہ کرتے بلکہ قتل بھی کر دیتے۔ میں جانتی ہوں کہ تم نے ہی انہیں چابی دی تھی۔ اب اسے جھٹلانے کی کوشش مت کرنا۔''

کلارا نے گہری سانس لی اور بولی۔ ''کیا......؟'' پھر اسے احساس ہو گیا کہ وہ کہاں ہے اور اس کے ساتھ کیا

واقعہ پیش آیا ہے۔

''میں جانتی ہوں کہ تم نے مجھے جان گرس ولڈ کے ہاتھوں بیچ دیا تھا۔ کس قیمت پر؟ اس نے تم سے کیا وعدہ کیا تھا؟''

کلارا نے نفرت اور غصے سے اسے دیکھا اور بولی۔ ''کچھ زیادہ نہیں۔ بس دو چار باتیں ہی طے ہوئی تھیں۔ وہ یہ کہ مجھے زیادہ پیسے ملیں گے۔ میری اپنی بھٹی ہوگی اور وہ میری مدد کرے گا اور جب بھی تم شراب خانہ بیچنے کا فیصلہ کرو گی تو میں اسے چلاؤں گی اور مجھے اپنے گھر والوں سے بھی ملنے کا موقع ملے گا۔''

اینا نے اسے تھپڑ مارنے کے لیے ایک بار پھر اپنا ہاتھ اوپر اٹھایا لیکن کلارا نے اس کی کلائی پکڑ لی۔

''دوبارہ یہ حرکت مت کرنا۔ تم نے پہلا تھپڑ مارا کیونکہ اس وقت میں غیر محتاط تھی۔ تمہیں یہ بات کیسے معلوم ہوئی؟''

''تمہاری کلائی پر بندھی ہوئی چابی نے مجھے یاد دلایا کہ بھٹی کا دروازہ کس نے کھولا تھا اور یہ تمہاری چابی سے ہی کھولا گیا ہوگا کیونکہ میری چابی تو میرے پاس ہی تھی۔ یہ ایک افسوس ناک بات ہے جس سے مجھے تکلیف پہنچی۔ میں تمہیں کبھی معاف نہیں کرسکتی۔''

''میں نے ایسا کچھ نہیں کیا جو تم پہلے نہ کرچکی ہو۔'' کلارا زمین پر خون تھوکتے ہوئے بولی۔

''تم کسی کے لیے بھی ایک مثال نہیں ہو اور نہ ہی تم نے میری بہتری کے لیے کبھی کچھ کیا۔''

''کیا میں نے کبھی تمہیں نقصان پہنچایا؟'' اینا چلاتے ہوئے بولی۔ ''میں تمہیں ایک چھوٹے قصبے سے لے کر آئی جبکہ مجھے اس کی ضرورت نہیں تھی۔ میں نے تمہیں خوراک رہائش اور ایسا روزگار دیا جس پر تم فخر کرسکتی ہو۔ کیا میں نے کبھی تمہیں برا بھلا کہا۔ کبھی گالیاں دیں۔ میں نے کبھی تمہارے ساتھ ایسا سلوک نہیں کیا۔ تمہیں ہمیشہ میری طرف سے خلوص ہی ملا لیکن تم نے مجھے اس کا یہ صلہ دیا۔''

کلارا نے ناگواری سے کہا۔ ''میں نے دیکھا ہے کہ تم لوگوں کو کیا صلہ دیتی ہو۔ اگر میں سانپ ہوں تو تم سانپوں کی ملکہ ہو۔ میں نے تم سے بہت کچھ سیکھا ہے۔ لہٰذا تم مجھے اتنی آسانی سے نہیں مار سکتیں جیسا کہ تم سوچ رہی ہو۔ اب ہم اس ملازمت کے بارے میں نئی شرائط طے کریں گے ابھی اور اسی وقت۔''

اینا نے پستول کی نال اس کے چہرے کی طرف کرتے ہوئے کہا۔ ''تم مجھے حکم دینے یا اپنی شرائط منوانے کی پوزیشن میں نہیں ہو۔''

''اگر میں مرگئی تو تم بھی تباہ ہو جاؤ گی۔ میں نے مقامی تاجر مسٹر مارش کے سیف میں ایک خط رکھوا دیا ہے۔ اس میں تمہاری تمام قانونی اور غیر قانونی سرگرمیوں کی تفصیل درج ہے۔''

''جھوٹی۔'' اینا نے کہا۔

''اگر تمہیں شبہ ہے تو یہ دیکھ لو۔'' یہ کہہ کر کلارا نے اپنے گریبان میں ہاتھ ڈالا۔

اینا نے پستول اس کے قریب کرتے ہوئے کہا۔ ''اگر تم نے مجھے کوئی ایسی چیز دکھائی جسے میں دھمکی سمجھوں تو نتائج کی پروا کیے بغیر تمہیں گولی ماردوں گی۔''

کلارا نے بھویں اوپر اٹھاتے ہوئے کہا۔ ''اس میں کوئی دھمکی نہیں ہے۔'' اس نے ایک تہ کیا ہوا کاغذ اینا کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''اسے پڑھ لو۔''

''تم خود ہی پڑھ کر سنادو۔ اس وقت میں اپنی توجہ کسی اور جانب نہیں کرسکتی۔''

کلارا کندھے اچکاتے ہوئے بولی۔ ''جیسے تمہاری مرضی۔'' ''میں نے کلارا جونز سے یہ سربمہر لفافہ وصول کیا ہے جو اس کی موت یا اس کے کہنے پر کھولا جائے گا۔''

اس نے وہ کاغذ اینا کو دکھایا اور فرش پر پھینکتے ہوئے بولی۔ ''تم اس کاغذ پر دستخط اور مہر دیکھ سکتی ہو۔''

اینا اسے پہچانتی تھی اس لیے کچھ نہیں بولی۔

کلارا اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ ''اب ہم آگے بڑھتے ہیں۔ میں یہاں اس وقت تک کام کروں گی جب تک یہ فیصلہ نہ کرلوں کہ مجھے اپنی بھٹی کھولنا چاہیے اور تم میری پشت پر ہوگی۔ میں یہ ظاہر کروں گی کہ تمہارے لیے کام کررہی ہوں لیکن اب اس بھٹی کا سارا منافع میرا ہوگا۔ اگر مجھے کچھ ہوا تو تمہیں اس کا خمیازہ بھگتنا ہوگا۔ تمہارے دوسرے مخالفین کے برعکس میں نے پوری تیاری کی ہے۔ میں تمہارے طور طریقے اور ذہن سے واقف ہوں۔ اب جو کچھ ہوگا' اس کا انحصار تم پر ہے۔ تم کیا کہتی ہو اینا؟''

اینا نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کا دماغ تیزی سے کام کررہا تھا۔ بالآخر اس نے اپنا پستول نیچے کیا اور ایک طرف ہوگئی۔

''شکریہ۔'' کلارا دیوار سے ہٹتے ہوئے بولی۔ سیڑھیوں کی جانب چند قدم بڑھانے کے بعد وہ پلٹی۔

''میرا خیال ہے کہ اس معاہدے پر ابھی سے عمل

شروع ہوجانا چاہیے۔تم نے مجھ پر حملہ کیا اور میرے چہرے پر اس کے نشان موجود ہیں۔ میں کسی کو اس کی حقیقت نہیں بتاؤں گی بشرطیکہ تم مجھے پاؤنڈ دے دو۔"

اینا کے جبڑے بھنچ گئے۔یہ غیر معمولی مطالبہ تھا۔

کلارا نے اپنا سر ایک طرف جھکایا اور بولی۔"میں اسے عادت نہیں بناؤں گی لیکن میں سمجھتی ہوں کہ آئندہ تمہیں اس حرکت سے باز رکھنے کے لیے یہ کوئی ناجائز مطالبہ نہیں ہے۔"

اب کہنے اور کرنے کے لیے کچھ نہیں تھا۔اینا نے سر ہلایا اور کلارا سے پہلے سیڑھیاں چڑھنے لگی جب وہ بلندی پر پہنچی تو کلارا نے سیڑھی کو دھکا دے دیا اور اینا کو فوراً ہی چھت میں بنے ہوئے دروازے کو پکڑنا پڑ گیا۔

"یاد رکھو" کلارا نے نیچے سے باآوازِ بلند کہا۔ "تمہاری پوزیشن بہت نازک ہے۔تمہیں میری بات توجہ سے سننا چاہیے۔"

اینا نے اسے نفرت سے دیکھا اور آگے بڑھ گئی پھر اس نے بکس کا تالا کھول کر اس میں سے اپنا پرس نکالا اور کچھ کہے بغیر کلارا کو پیسے پکڑا دیے۔

کلارا نے مسکراتے ہوئے کہا۔"کیا میں کام شروع کرسکتی ہوں۔"

اینا نے اپنا غصہ ضبط کرتے ہوئے کہا۔"اگر تم چاہو۔"

کلارا کے جانے کے بعد اینا اپنے چیمبر میں گئی اور اس نے بار میں کام کرنے والے لڑکے سیلاس کو بلا کر کہا کہ وہ بار کی میزیں صاف کردے۔دروازہ بند کر کے اس نے گاؤ تکیے سے ٹیک لگائی۔وہ رونا چاہ رہی تھی لیکن اس نے اپنے آپ پر قابو پالیا۔کافی عرصہ پہلے اس نے اپنے آپ سے عہد کیا تھا کہ وہ مرجائے گی لیکن دنیا والوں پر اپنی کمزوری ظاہر نہیں ہونے دے گی۔

اینا کے لیے یہ صورتِ حال ناقابلِ برداشت تھی۔ اسے بہر صورت اپنے آپ کو کلارا کے پھندے سے نکلنے کے لیے کوئی راستہ تلاش کرنا تھا لیکن اس وقت وہ اپنے آپ کو بے یار و مددگار محسوس کر رہی تھی۔اسے لگا جیسے اس کا سینہ جکڑ گیا ہے اور سانس لینے میں دشواری محسوس ہو رہی ہے۔یہ ایک انتہائی خطرناک صورتِ حال تھی۔ مسٹر براؤن کے ساتھ اس کی شراکت ایک معاہدے کے تحت ہوئی تھی لیکن کلارا کے ساتھ ایسا کوئی معاہدہ نہیں ہوا تھا بلکہ وہ اس کی غیر تحریری شرائط ماننے پر مجبور ہوگئی تھی۔اینا نے سوچا کہ اگر وہ یرغمال بنالی گئی تو اس کی نجات کی کوئی امید نہیں ہوگی اور کلارا کے مرنے تک یا اس کے بعد بھی وہ رہا نہ ہوسکے گی۔

اینا جانتی تھی کہ وہ اس صورتِ حال کو زیادہ عرصہ برداشت نہیں کرسکے گی۔اس کا ثبوت اس وقت سامنے آگیا جب کلارا نے ملازمین کے سامنے اس کی تضحیک کی۔اینا نے غصے میں آکر اسے تھپڑ مارنا چاہا لیکن اس کا ہاتھ کلارا کے گال سے ایک انچ کے فاصلے پر رک گیا جب اس نے کلارا کی آنکھوں میں ایک خاص چمک دیکھی جو یہ ظاہر کر رہی تھی کہ وہ اینا پر تشدد کا الزام لگا کر اسے رسوا کردے گی۔

"میں اپنے یہاں اس قسم کی گستاخی برداشت نہیں کر سکتی۔" اینا نے اپنا بھرم رکھنے کے لیے کہا کیونکہ وہ جانتی تھی کہ سب کی آنکھیں اس پر ہیں۔ اس لیے یہ سرزنش ضروری تھی تاکہ اس کی ساکھ برقرار رہے۔ "دوبارہ ایسا نہیں ہونا چاہیے۔"

"بالکل نہیں مادام۔"

"میں تمہاری تنخواہ میں سے جرمانہ کاٹ لوں گی۔"

"ٹھیک ہے مادام۔"

یہ دھمکی اس نے لوگوں کو سنانے کے لیے دی تھی۔ ظاہر ہے کہ اس پر عمل کرنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا لیکن اس کے بعد حالات بگڑتے چلے گئے۔ کلارا اپنے ظاہری رکھ رکھاؤ، خوش اخلاقی اور تابعداری کی بدولت اپنے اردگرد رہنے والوں سے ہمدردی اور ستائش وصول کر رہی تھی جس کے نتیجے میں اینا کو بھی کلارا سے شفقت کا برتاؤ کرنا پڑتا لیکن اس کے سر پر ہر وقت تلوار لٹکتی رہتی تھی کیونکہ کلارا اسے ظاہراً یا خفیہ طور پر.... وہ زبانی معاہدہ یاد دلاتی رہتی تھی۔

اس وقت معاملہ اینا کی برداشت سے باہر ہوگیا جب کلارا نے اس کا وہ پسندیدہ ربن بغیر پوچھے اٹھا لیا جو اس نے لندن سے خریدا تھا۔ اینا کو اس قدر غصہ آیا کہ وہ اسے سوتے میں قتل کرنے کے بارے میں سوچنے لگی... اس طرح کہ وہ حادثہ نظر آئے۔ ویسے تو اینا کے پاس زہر بھی تھا اور وہ اسے استعمال کرنا بھی جانتی تھی۔ اس کے باوجود وہ کلارا کے خط کی وجہ سے اپنے ارادے کو عملی جامہ پہنانے کی ہمت نہ کرسکی۔ دوسری بار جب اس نے کلارا کے بالوں میں وہ نیلا اور سنہری ربن دیکھا تو بے اختیار اس اسٹور کی طرف چلی گئی جہاں مختلف جڑی بوٹیاں رکھی ہوئی تھیں جنہیں اس نے بڑی احتیاط سے چھپا رکھا تھا لیکن دونوں بار وہ رک گئی اور واپس چلی آئی۔

اینا نے مسٹر براؤن سے بھی مدد لینے کے بارے میں سوچا لیکن وہ اس پر اپنی کوئی کمزوری ظاہر کرنا نہیں چاہتی تھی کیونکہ اس کا اثر ان کی شراکت داری پر پڑ سکتا تھا اور ایسا کوئی طریقہ نہیں تھا کہ اپنی کمزوری ظاہر کیے بغیر کسی کی مدد لی جائے یا اس مسئلے کو حل کیا جاسکے۔ لہٰذا اس صورتِ حال کو برداشت کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔

اس شام جب وہ اپنی مخصوص جگہ پر بیٹھی ہوئی تھی کہ ایڈم سیور شراب خانے میں داخل ہوا اس کی موجودگی ہمیشہ اینا کو پریشان کر دیتی تھی۔ وہ کچھ دیر دروازے کے وسط میں کھڑا رہا پھر خالی کرسی پر بیٹھنے سے پہلے وہ اینا سے ملنے کے لیے اس کے پاس آیا۔ اینا نے اس کی پسندیدہ رم کی بوتل نکالی اور ایک گلاس بھر کر اس کے سامنے رکھ دیا۔

"شکریہ میڈم، کیا تم تھوڑی دیر کے لیے میرے پاس بیٹھنا پسند کرو گی؟"

اینا لمحہ بھر کے لیے خاموش ہوگئی۔ ایڈم سیور کے ساتھ اس کی گفتگو دوسرے لوگوں کی موجودگی میں نہیں ہوتی تھی۔ وہ ان لوگوں میں سے نہیں تھا جن کے ساتھ غیر سنجیدہ گفتگو یا خوش گپیاں کی جاسکتیں اور وہ لوگوں کی موجودگی میں اس کی توجہ سے لطف اندوز ہونا نہیں چاہتی تھی۔

اس نے اثبات میں سر ہلا دیا اور اس کے سامنے بیٹھ گئی۔ ایڈم نے پوچھا۔ "تم کیسی ہو مادام؟"

"بالکل ٹھیک مسٹر سیور اور مجھے امید ہے کہ تم بھی بخیر و عافیت ہوگے۔"

"ان دنوں کچھ معاملات میں الجھا ہوا ہوں۔" اس نے مشروب کا ایک بڑا گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔ "کیا میں امید کروں کہ شام کو دکان بند کرنے کے بعد تم میرے لیے کچھ وقت نکال سکو گی؟"

"یقیناً مسٹر سیور۔ دکان بند ہونے میں ایک گھنٹا رہ گیا ہے۔ کیا تم اس وقت تک انتظار کر سکتے ہو؟"

"شکریہ۔ میں تمہارا انتظار کروں گا۔"

اینا واپس اپنے کام پر چلی گئی اور یہ ظاہر کیا کہ جیسے یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی اور یہ حیرت کی بات تھی کیونکہ کچھ عرصہ قبل ایڈم سیور کی آمد اس کے لیے خوف اور پریشانی کا باعث ہوتی تھی جبکہ وہ اب بھی یہ سمجھتی تھی کہ سیور کتنا خطرناک شخص تھا لیکن اب وہ اسے اپنا مددگار سمجھ رہی تھی۔

اس نے غور کیا کہ بار میں موجود کچھ گاہکوں کا طرزِ عمل بھی تبدیل ہوگیا ہے۔ بجنس جو صرف بیئر پینے آتا تھا، سیور کو دیکھتے ہی اپنی جگہ سے اٹھا اور بار سے باہر چلا گیا۔ جوناتھن جورڈن نے بھی یہی کیا اور منہ ہی منہ میں شب بخیر کہتے ہوئے چلا گیا۔ بار کا وقت ختم ہونے میں آدھا گھنٹا باقی تھا کہ وہاں موجود آخری آدمی نے رخصت ہونے میں ہی عافیت جانی۔

"یہ بھی اچھا ہوا کہ وقت سے پہلے ہی لوگ چلے گئے۔" سیور نے مطمئن انداز میں کہا۔

"لیکن میرے لیے یہ نقصان دہ ہے۔" اینا نے بوتلیں سمیٹتے ہوئے کہا۔ "اگر تم اسی طرح یہاں آتے رہے تو ایک سال میں ہی دیوالیا ہو جاؤں گی۔"

"معافی چاہتا ہوں مسز ہائٹ۔" سیور نے ہلکا سا قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ "میرا خیال ہے کہ اب یہ بار

تمہارے لیے زیادہ منافع بخش نہیں رہا۔''

''اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں توجہ دینا چھوڑ دوں۔ مجھے اپنے گاہکوں اور آمدنی کا تو خیال رکھنا ہوگا۔'' اس نے ہلکے پھلکے انداز میں جواب دیا۔ ''اگر میں اتنی ہی بے پروا ہوتی تو تم مجھ سے مشورہ لینے نہیں آتے۔''

''میں مستقبل میں مزید محتاط رہوں گا۔'' اس نے کہا۔ ''کیا میں اپنے معاملے پر تمہاری رائے دریافت کرسکتا ہوں۔''

''بالکل۔'' اس نے اپنے لیے رم کا ایک گلاس بنایا اور سیور کے سامنے بیٹھ گئی۔

''میرا ایک ساتھی ہے جس کی وجہ سے میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہوتا جارہا ہے۔''

اینا کو اچانک ہی دروازہ بند کرنے اور ملازم لڑکے کو باہر بھیجنے پر پچھتاوا ہونے لگا۔ وہ یہ سوچ کر پریشان ہونے لگی کہ شاید اس کا اشارہ اسی کی جانب ہے۔ اب وہ سوچ رہی تھی کہ اگر سیور نے اس پر حملہ کردیا تو وہ کیسے اپنا بچاؤ کرے گی۔ اس نے اپنا اسکرٹ درست کیا اور بولی۔ ''کیا یہ شخص تمہارے کسی اور کام بھی آتا ہے؟''

''نہیں میں نے اسے ایک دو خفیہ کاموں میں استعمال کیا لیکن اس نتیجے پر پہنچا کہ وہ بالکل ناقابلِ اعتبار ہے۔''

''کیا تم اسے ایسے کاموں پر نہیں لگا سکتے جو زیادہ حساس نہ ہوں؟''

''میں یہ کوشش بھی کرچکا ہوں لیکن وہ آگے بڑھنا چاہتا ہے۔ اس نے ایسے کام میں ہاتھ ڈالنے کی کوشش کی جس کا اس سے کوئی تعلق نہیں تھا اور مجھے یہ تاک جھانک پسند نہیں۔''

''غیر موثر، غیر محتاط اور تاک جھانک کرنے والا۔'' اینا کرسی کی پشت سے ٹیک لگاتے ہوئے بولی۔

''اس کا ایک یہی حل ہے کہ تم اس سے دوری اختیار کرلو تاکہ وہ دوبارہ تمہارے لیے کوئی مشکل کھڑی نہ کرسکے۔''

''تمہارا مطلب ہے کہ اسے قتل کردوں۔''

''یا پھر تم کسی دور دراز علاقے میں اپنا کوئی کزن یا دوست تلاش کرو اور اسے وہاں ملازمت کی پیشکش کرو۔ اگر سمندر پار ہو تو بہتر رہے گا پھر تمہارا کزن خود ہی اس سے نمٹ لے گا۔''

''میرا خیال ہے کہ تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔'' اس نے کہا۔ ''گوکہ میں کسی ذریعے کو ضائع کرنا پسند نہیں کرتا۔''

میں نے تو پنیر کی ایک ٹکیہ کا آرڈر دیا تھا، تم پورا کارٹن اٹھا لائے

''کفایت شعاری ایک قابلِ تعریف خصوصیت ہے۔'' اینا نے کہا۔

''کیا تم مجھ سے مذاق کررہی ہو؟''

وہ سیدھی ہوتے ہوئے بولی۔ ''نہیں، میں نے کفایت شعاری کو اہم خوبی پایا ہے تاوقتیکہ یہ کاروبار کی ترقی پر اثر انداز نہ ہو۔ نہیں مسٹر سیور۔ میں نے تم سے مذاق نہیں کیا بلکہ حقیقت بیان کی ہے۔''

جب وہ بول رہی تھی تو اس نے دیکھا کہ سیور پُرسکون ہوگیا ہے چنانچہ اس نے بھی خوف کو جھٹک دیا اور فوراً ہی اس کے ذہن میں بھی ایک منصوبہ آگیا۔ اس نے ہمت کر کے کہا۔ ''میں خود آج کسی ایسے ہی کارآمد کزن کی خواہش کررہی تھی۔ میرے پاس بھی ایسی ہی ایک شریکِ کار ہے جو میرے خلاف سازشیں کررہی ہے وہ اپنی کوشش میں کامیاب نہ ہوسکی جس کی وجہ سے مجھے جسمانی اور معاشی طور پر نقصان ہوتا لیکن اب کلارا جونز جان گئی ہے کہ مجھے اس کی دھوکا دہی کے بارے میں معلوم ہوگیا ہے۔''

سیور نے اپنی بھویں چڑھائیں اور بولا۔ ''کیا تمہارے معاملات میں اس کی مداخلت اس نوعیت کی ہے کہ اسے بھی اس مہربان کزن کے پاس بھیجنے کی ضرورت ہے؟''

اینا مایوسی سے سر ہلاتے ہوئے بولی۔ ''یہ میری انتہائی بدقسمتی ہے کہ اس نے اپنے ساتھ پیش آنے والے کسی ممکنہ حادثے سے بچنے کے لیے پیشگی اقدامات کرلیے ہیں۔ اس کا کہنا ہے کہ اس نے ایک تاجر کے سیف میں وہ خط رکھوا دیا ہے جس میں میری سرگرمیوں کی تفصیل درج ہے اور اگر اسے کچھ ہوگیا تو وہ خط پولیس کو دے دیا جائے گا۔ اس نے

مجھے اس خط کی رسید بھی دکھائی جو اس تاجر کے کلرک نے دی ہے۔''

''ہم گھیر لیے گئے ہیں مسز ہائٹ۔'' سیور نے گلاس میز پر رکھتے ہوئے کہا۔ ''ہمیں اپنے ہی لوگوں کی ناپختگی اور بے اعتباری کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔''

''حالانکہ ہم اتنے بُرے مالک نہیں ہیں۔ جہاں تک میرا تعلق ہے تو میں دوسروں سے کسی ایسے کام کے لیے نہیں کہتی جو خود نہ کرنا چاہتی ہوں۔ جو وفادار ہیں ان کے ساتھ فیاضی سے پیش آتی ہوں اور اس کا مجھے فائدہ بھی ہوا ہے۔''

''میں نہیں سمجھتا کہ ہم زمین پر چلنے والے انسانوں کے مقابلے میں بہت بُرے ہیں۔''

''لیکن میں نے ان دونوں مسئلوں کا حل تلاش کرلیا ہے۔'' اینا نے کہا۔

''وہ کیسے؟ ہم دونوں میں سے کوئی بھی براہِ راست کارروائی کا متحمل نہیں ہوسکتا اور تمہارے معاملے میں تو بالکل بھی نہیں۔''

''اگر ہم احتیاط سے کام لیں تو ان دونوں ناپسندیدہ لوگوں سے چھٹکارا حاصل کرسکتے ہیں۔''

''مجھے بتاؤ کہ تمہارے ذہن میں کیا ہے؟''

''مشکل کام پہلے ہونا چاہیے۔'' اینا نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ''اور یہ کام کانسٹیبل کی موجودگی میں ہوگا۔''

''ہاں تاکہ تمہاری بے گناہی نظر آئے۔'' سیور نے اتفاق کرتے ہوئے کہا۔

اینا نے اپنا منصوبہ بتاتے ہوئے کہا۔ ''وہ خط ہمارے راستے کی سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔''

''یہ تم مجھ پر چھوڑ دو۔ کیا تم کلارا کی ہینڈ رائٹنگ کی نقل کرسکتی ہو؟''

''میں نے کبھی کوشش نہیں کی لیکن یہ میرے لیے مشکل نہیں ہوگا کیونکہ میں نے اس کے لکھے ہوئے کو کئی مرتبہ نقل کیا ہے اور اس کی ہینڈ رائٹنگ اچھی طرح پہچانتی ہوں لیکن تم کیوں پوچھ رہے ہو؟''

''میں اس کی طرف سے ایک خط لکھوں گا اور تم اس کی ہینڈ رائٹنگ میں اسے نقل کردینا۔ میں وہ خط لے کر اس کلرک کے پاس جاؤں گا اور اس سے کلارا کا خط لے کر واپس آجاؤں گا پھر ہم اسے جلادیں گے۔''

''تم اسے قائل کرسکو گے؟''

''بالکل اگر تم نے اسی طرح لکھا جیسے میں کہہ رہا ہوں۔''

اینا نے لمحہ بھر کے لیے سوچا کہ کیا کلارا کا خط سیور کے ہاتھ میں دینا عقل مندی ہوگی۔ کیا وہ کلارا سے ساز باز کرسکتا ہے پھر اس نے فیصلہ کیا کہ سیور بھی اسی کشتی میں سوار ہے اور اگر وہ پکڑی گئی تو سیور کے سارے راز افشا کردے گی۔

اس نے تائید میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''بہت خوب، ہم اس منصوبے پر کب عمل کریں گے؟''

''ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے لیکن کم از کم دو ہفتے تو لگ ہی جائیں گے تاکہ میلون اور کلارا ایک دوسرے سے واقف ہوجائیں۔ یہ نظر آنا چاہیے کہ میں اسے کلارا کو بھرتی کرنے کے لیے بھیج رہا ہوں۔''

آنے والے ہفتوں میں اینا نے میلون کو شراب خانے میں گھومتے دیکھا۔ اس کا قد عام لوگوں کے مقابلے میں زیادہ تھا جبکہ چہرہ اور ہاتھ دھوپ میں کام کرنے سے سیاہ پڑ گئے تھے۔ اینا نے اتنی احتیاط ضرور کی کہ وہ اور کلارا ایک دوسرے سے قریب نہ ہونے پائیں۔ لیکن وہ جان گئی تھی کہ وہ کوئی سازش کررہے ہیں۔ وہ انہیں سرگوشیاں کرتے دیکھتی اور ایک دو مرتبہ خطوط کا بھی تبادلہ ہوا۔

اینا کو اس بارے میں کوئی شبہ نہیں تھا کہ وہ دونوں شراب خانے کے باہر بھی ملتے ہیں۔ ایک بار پھر اسے یہ اندیشہ لاحق ہوا کہ سیور اسے دھوکا دے رہا ہے لیکن اس نے اس پر توجہ نہیں دی۔ کلارا سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے وہ سب کچھ برداشت کرسکتی تھی۔

بالآخر کافی وقت گزرنے کے بعد سیور نے اینا کی کوششوں کو کامیاب قرار دے دیا جو اس نے کلارا کی ہینڈ رائٹنگ کی نقل کرنے کے لیے کی تھیں۔ ''بہت خوب، کیا تم منصوبے پر عمل کرنے کے لیے تیار ہو جب تک میں اپنا پہلا کام مکمل کرلوں۔''

اینا نے تائید میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''ہاں، میں تیار ہوں۔''

''گڈ۔'' سیور نے کہا۔ ''مجھے مسٹر مارش کے کلرک سے بات کرنا ہوگی اور کانسٹیبل سے بھی کہہ دیا ہے کہ وہ قریب میں ہی موجود رہے اور کلارا پر نظر رکھے۔ ہمیں اتنا انتظار کرنا ہوگا کہ شراب خانہ لوگوں سے بھر جائے کیونکہ ہمیں گواہوں کی ضرورت ہوگی۔''

اینا نے اپنا ہاتھ اس کے بازو پر رکھا اور بولی۔ ''تمہیں یقین ہے کہ مسٹر مارش کا کلرک خط واپس کردے گا؟''

''بالکل، جب وہ کلارا کا خط دیکھے گا تو اس کے پاس اعتراض کی کوئی گنجائش نہیں ہوگی۔''

کئی گھنٹوں بعد سیور کے آدمیوں نے اینا کو کارروائی شروع کرنے کا اشارہ دے دیا۔ صبح سے ہی وہ تیار بیٹھی ہوئی تھی۔ اب وقت آ گیا تھا۔ اس کھیل میں ہار جیت کے امکانات برابر برابر تھے۔ اسے یقین نہیں تھا کہ وہ اس کام کو اطمینان سے سرانجام دے سکے گی۔ اس کے ہاتھ کپکپا رہے تھے اور خیالات منتشر۔ تاہم وہ اپنے آپ پر قابو پانے کی کوشش کر رہی تھی۔

اس نے یہ بندوبست کر لیا تھا کہ کلارا شراب خانے میں کام کرے اور اب وہ کچن میں بیٹھی دوپہر کا کھانا کھا رہی تھی۔ اینا نے دیکھا کہ اس نے اینا کا پسندیدہ ربن بالوں میں لگا رکھا ہے۔ کلارا نے اپنا مگ خالی کیا اور اینا سے نظریں ملائے بغیر اس کے سامنے رکھتے ہوئے بولی۔ ''مجھے اور بیئر چاہیے۔''

اینا نے اس کی طرف دیکھا اور سمجھی کہ شاید اس سے سننے میں غلطی ہوئی ہے وہ بولی۔ ''کیا؟''

''میں نے کہا مزید بیئر چاہیے۔'' اینا نے اس کی طرف دیکھا اور مگ ہلانے لگی۔

اینا نے ہاتھ بڑھایا لیکن کلارا نے جان بوجھ کر مگ زمین پر گرا دیا اور اس کے ٹکڑے فرش پر بکھر گئے۔

''اگلی بار مجھ سے دوبارہ مت پوچھنا۔''

اینا کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ تمام شکوک و شبہات اور الجھنیں دور ہو گئیں اور سب کچھ آئینے کی طرح صاف ہو گیا۔ اس نے چاقو نکالا اور اپنے دائیں ہاتھ کے نچلے حصے پر ہلکا سا کٹ لگایا پھر اس نے چاقو کی نوک کلارا کی ٹھوڑی پر رکھ دی۔

کلارا خوف زدہ ہو گئی اور بولی۔ ''یہ کیا کر رہی ہو؟''

اینا تیز آواز میں چلائی اور چاقو فرش پر پھینک دیا اور کلارا کے سر کے ایک جانب زور سے گھونسا مارا۔ کلارا کے چہرے پر تکلیف کے آثار نظر آنے لگے اور اس کے دانت بھنچ گئے اور وہ لڑکھڑانے لگی۔ اینا نے بار بار اس کے سر پر ضرب لگائی اور یہ بھی پروا نہیں کی کہ اس کے اپنے ہاتھ کو کتنی تکلیف ہو رہی تھی پھر اس نے کلارا کو وہ دوسری تحریر دکھائی جو اس نے کلارا کی ہینڈ رائٹنگ میں خود لکھی تھی اور اسے مضبوطی سے پکڑ لیا۔

کلارا اب رو رہی تھی۔ اینا نے اس کا کالر پکڑا اور اسے گھسیٹتے ہوئے شراب خانے کے مرکزی ہال میں لے آئی۔ ''کوئی کانسٹیبل کو بلا لائے۔'' وہ دروازے میں کھڑے ہو کر چلائی۔ ''ہوگ ولیمز کہاں ہے؟''

وہ حیران رہ گئی جب اس نے اسے ایک چھوٹی میز کے پاس کھڑے ہوئے دیکھا۔ اس نے بیئر مگ میز پر رکھا اور بولا۔ ''میں یہاں ہوں مسز ہائٹ، یہ گڑبڑ کیسی ہے؟''

''شکر ہے کہ تم یہاں موجود ہو۔ اس لڑکی نے جھوٹے وعدے کر کے مجھے بلیک میل کرنے کی کوشش کی ہے اور جب میں نے اس کی بلیک میلنگ میں آنے سے انکار کیا تو اس نے مجھ پر حملہ کر دیا۔''

ہوگ ولیمز نے باری باری انہیں دیکھا۔ دونوں ہی زخمی تھیں۔ اینا نے ابھی تک کلارا کا کالر پکڑا ہوا تھا اور وہ اپنے آپ کو چھڑانے کی جدوجہد کر رہی تھی۔ ولیمز نے کہا۔ ''تم دونوں کو میرے ساتھ مجسٹریٹ کے پاس جانا ہوگا۔''

''میرے ساتھ زیادتی ہوئی ہے۔'' اینا نے احتجاج کرتے ہوئے کہا۔ ''میرے پاس اس کے ہاتھ کا لکھا ہوا ایک خط ہے جس میں مجھ پر بے بنیاد الزامات لگاتے ہوئے پیسوں کا مطالبہ کیا گیا ہے۔ میں اس بدمعاش عورت کو مزید

علامہ شکم پرور لدھیانوی!

علامہ شکم پرور لدھیانوی میرے دیرینہ دوستوں میں سے ہیں، اتنے زبردست مہمان نواز ہیں کہ جب بھی میری طرف تشریف لاتے ہیں بیٹھتے ہی پوچھتے ہیں ''چائے پیو گے؟'' کھانے کا وقت ہو تو پوچھیں گے ''کھانا کھاؤ گے؟'' پھر میرے جواب کا انتظار کیے بغیر میرے خانساماں کو چائے یا کھانے کا آرڈر جاری کر دیتے ہیں۔ اسی طرح جب کبھی بھی ان کی طرف جاتا ہوں، وہ مجھے دیکھتے ہی کہتے ہیں۔ ''چائے پیو گے؟ نہیں؟ کیوں؟ اچھا۔'' اور یوں سارے مرحلے ایک ہی سانس میں خودبخود طے کر کے اطمینان سے بیٹھ جاتے ہیں۔ اگر کسی دن زیادہ موڈ میں ہوں تو مجھے کسی فائیو اسٹار ہوٹل کے کافی ہاؤس میں چلنے کی دعوت دیتے ہیں اور جب بل آتا ہے تو کہتے ہیں۔ ''ایک تو میں تمہاری اس عادت سے بہت تنگ ہوں کہ تم اپنی موجودگی میں کسی دوسرے کو بل ادا نہیں کرنے دیتے، خیر جیسے تمہاری مرضی!''

عطاء الحق قاسمی کی کتاب وصیت نامے سے ایک عاجزی پارہ

برداشت نہیں کر سکتی۔“

کلارا نے بھی جواب میں چلانا شروع کر دیا اور اپنے آپ کو چھڑانے کی جدوجہد میں اینا کے گال پر ضرب لگائی۔ اینا نے موقع غنیمت جانتے ہوئے اسے چھوڑ دیا اور خود زمین پر گر کر ہانپنے لگی۔ کلارا نے سڑک کی طرف دوڑ لگا دی۔ راستے میں اسے ٹھوکر لگی اور اس سے پہلے کہ وہ گر جاتی، ڈین میلون نے لپک کر اسے تھام لیا جو اسی وقت ایک گلی سے برآمد ہوا تھا۔ کلارا نے اس کی قمیص پکڑ لی اور کچھ کہا۔ میلون نے سر ہلایا اور وہ دونوں اسی راستے پر چل دیے جہاں سے وہ آیا تھا۔ ان کا رخ بندرگاہ کی جانب تھا۔

اینا کے گرد مجمع اکٹھا ہو گیا۔ خود ولیمز نے اسے پاس پڑے ہوئے اسٹول پر بٹھانے میں مدد کی اینا نے ایک کپڑے سے اپنا چہرہ صاف کیا اور بولی۔ ”کیا کسی نے دیکھا ہے کہ وہ کس طرف گئی؟“

ولیمز کا ساتھی بھی واپس آ گیا اور مایوسی سے سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ”میں انہیں نہیں پکڑ سکا۔ بندرگاہ کے راستے میں کافی رش تھا۔ لگتا ہے کہ وہ کسی گودام یا مکان میں چھپ گئے ہیں۔“

”مجھے یقین ہے کہ اس کے ساتھ اور بھی لوگ ہیں۔“ اینا نے کہا پھر اس نے وہ جعلی خط دکھاتے ہوئے کہا۔ ”اس کا کہنا تھا کہ وہ میری نگرانی کر رہی ہے اور اگر میں نے اس کے خلاف کوئی قدم اٹھایا تو مجھے اس کا خمیازہ بھگتنا ہوگا۔ وہ پاگل ہو گئی ہے۔ کہتی ہے کہ میں اس کے خلاف سازشیں کر رہی ہوں جبکہ میں اس کے لیے اتنا کچھ کیا ہے۔“

جیسے ہی ولیمز نے وہ خط پڑھا۔ اس کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا اور بولا۔ ”اس خط سے اس کی خباثت ظاہر ہو رہی ہے۔“

”وہ کچھ بھی کر سکتی ہے گو کہ شکل سے بہت معصوم نظر آتی ہے۔“ اینا نے کہا۔ ”اگر تم اسے پکڑ سکو تو مجھے ضرور بتانا۔ مجھے اس وقت تک چین نہیں آئے گا۔ جب تک وہ گرفتار نہ ہو جائے۔“

”ضرور بتاؤں گا مسز ہائٹ۔“ ولیمز نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اٹھاتے ہوئے کہا۔ ”کیا تمہیں اپنے کمرے تک جانے کے لیے کسی مدد کی ضرورت ہے۔“

گو کہ وہ بار سے جانا نہیں چاہ رہی تھی لیکن اس نے ولیمز کی ہمدردی حاصل کرنے کے لیے کہا۔ ”یس پلیز۔“

وہ دونوں سیڑھیوں کے ذریعے اوپر گئے۔ اینا کو حیرت ہو رہی تھی کہ ولیمز اس کی چوٹ کے بارے میں کچھ زیادہ ہی سنجیدہ تھا حالانکہ وہ اس کی عادی تھی۔ جب وہ اپنی کرسی پر بیٹھ گئی تاہم کانسٹیبل اب بھی جانے پر آمادہ نہیں تھا۔ اس نے کہا۔ ”میں کچھ عرصے سے یہ سوچ رہا تھا کہ تم اپنے ہاں کام کرنے والے لوگوں کی فطرت سے پوری طرح واقف نہیں ہو اور کلارا جونز اس کی حالیہ مثال ہے۔ میں تمہارے لیے پریشان ہوں۔“

اینا نے اسے غور سے دیکھا اور بولی۔ ”مسٹر ولیمز! تمہاری مدد اور توجہ کا شکریہ۔ تم اچھی طرح جانتے ہو کہ میں اسی جگہ پیدا ہوئی اور پلی بڑھی اور تم بھی یہیں پیدا ہوئے۔ یہاں کے لوگ میرے لیے اجنبی نہیں ہیں اور نہ ہی میں ان کے لیے۔ یہاں آنے والے زیادہ تر لوگوں کو میں جانتی ہوں۔ اور ان میں سے کئی ایک میرے دوست بھی ہیں۔“

اس نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔ ”میں اس وقت ڈر جاتی ہوں کہ جب باہر کا کوئی شخص یہاں آ کر لالچی ہو جائے۔ وہ ہم سب کے لیے برا ہے۔ میں نے عورت سمجھ کر کلارا کے ساتھ نرمی برتی لیکن میں اس کی اصلیت نہ جان سکی۔“

”تمہارا دل بہت نرم ہے۔“ ولیمز نے کہا۔ ”اور تمہیں ان لوگوں سے محتاط رہنا چاہیے جو اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں اور میں بھی ان میں سے ایک ہوں۔“

اینا کے کان کھڑے ہو گئے۔ کیا اسے حقیقت کا علم ہو گیا ہے اور اب وہ بھی اینا کو بلیک میل کرنا چاہ رہا ہے۔

”مجھے بتاؤ، تم کیا چاہتے ہو ولیمز اور اگر وہ میرے بس میں ہوا تو تم جیسے دوست کو بھی انکار نہیں کروں گی۔“

وہ گہری سانس لیتے ہوئے بولا۔ ”کیا میں تم سے کسی خوشگوار ماحول میں مل سکتا ہوں اگر تم اس میں خوشی محسوس کرو تو میں تم سے کچھ راز و نیاز کی باتیں کروں گا۔“

اینا اپنی جگہ پر منجمد ہو کر رہ گئی۔ اسے توقع نہیں تھی کہ وہ اتنی بڑی بات کہہ دے گا۔ پہلے اس نے سوچا کہ انکار کر دے پھر خیال آیا کہ موجودہ صورتِ حال میں یہ ضروری ہو گیا ہے۔

”تمہارا شکریہ۔ یہ میرے لیے ایک اعزاز ہوگا۔ جب بھی تمہیں سہولت ہو، مجھ سے مل سکتے ہو۔“

شام کو شراب خانہ بند ہونے کے بعد اینا کو کچن کے دروازے پر دستک سنائی دی۔ اینا نے دیکھا کہ وہاں ایڈم سیور ہاتھ میں ایک بنڈل لیے کھڑا ہوا تھا۔ وہ اسے جلدی سے اندر لے آئی اور سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اپنے کمرے میں لے گئی۔

”کیا بارش کے کلرک نے وہ خط تمہیں دے دیا؟“

وہ سوچ رہی تھی کہ کیا سیور وہ خط اس کے حوالے کرے گا۔

''کیا تم اسے اپنے ساتھ لائے ہو؟''

سیور نے وہ بنڈل فرش پر رکھا پھر اس نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈال کر خطوط کا ایک پیکٹ نکالا جو سرخ ربن سے بندھا ہوا تھا۔ اسے دیکھ کر اینا نے سکون کا سانس لیا۔

''حیرانی کی بات یہ ہے کہ وہاں اس طرح کے کئی خط تھے۔'' سیور نے وہ پیکٹ میز پر رکھتے ہوئے کہا۔ ''یہ تقریباً نصف درجن کے قریب ہیں۔''

''وہ کون سا خط ہے جس کے لیے ہم نے اتنی پریشانی اٹھائی۔''

''سب سے اوپر۔''

اس نے وہ خط اٹھا کر جلدی جلدی پڑھا اور اسے آگ میں پھینک دیا پھر بولی۔ ''اس کے علاوہ بھی کوئی ایسا خط ہے جو میرے یا میرے ساتھیوں کے لیے پریشانی کا باعث بن سکے۔''

''نہیں۔'' اس نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''تم نے کلارا کی طرف سے جو خط لکھا تھا، وہ کلرک نے میرے سامنے ہی جلا دیا۔''

''کلارا اور ڈین میلون کا کیا بنا؟''

''سب ٹھیک ہے۔ وہ اسے اپنے ساتھ لے گیا تھا اور پھر میری ہدایت کے مطابق اس کی ملاقات میرے آدمیوں سے ہوئی اور انہوں نے ان دونوں کو میرے کزن کے پاس بھیج دیا۔''

اینا نے مطمئن انداز میں اپنا سر ہلایا۔ اس کے سر سے ایک بڑا بوجھ اتر گیا تھا۔ اب وہ سکون کا سانس لے سکتی تھی۔ اس کے عوض یہ چھوٹے موٹے زخم کوئی حقیقت نہیں رکھتے تھے۔

''کیا اس بنڈل میں بھی کوئی ایسی چیز ہے جس کا تعلق ہمارے منصوبے سے ہو؟'' اینا نے پوچھا۔

''ہاں، کیا تم دیکھنا چاہو گی؟''

اینا نے اثبات میں سر ہلایا تو سیور نے احتیاط سے وہ بنڈل اٹھا کر میز پر رکھ دیا۔ اس نے پہلے اوپر کا ٹاٹ ہٹایا پھر ایک بڑے سے کپڑے کو کھولا۔ اس وقت اینا کو ایک خوفناک بو محسوس ہوئی جس میں سڑے ہوئے گوشت اور لوہے کی آمیزش تھی۔ اس کے نیچے خون میں لتھڑے ہوئے بال اور کھال نظر آ رہی تھی۔ سیور نے بڑی مشکل سے لینن کا بنڈل کھولا تو اینا کو لمبے سیاہ بال نظر آئے۔ سیور نے اس کھوپڑی کو تھوڑا سا اوپر اٹھایا تو اینا کے حلق سے چیخ نکل گئی۔ وہ کلارا کا سر تھا اور اس کے بالوں میں وہی اینا کا نیلا اور سنہری ربن بندھا ہوا تھا اور جب اس نے ڈین میلون کا ہاتھ دیکھا تو وہ بُری طرح دہشت زدہ ہو گئی۔ اس نے ایک قدم پیچھے ہٹتے ہوئے کہا۔

''یہ تم نے کیا کیا سیور؟''

''میں نے اپنے حصے کا کام کیا ہے۔ تم کیا توقع کر رہی تھیں کہ میں کیا کروں گا۔ یہی ہمارے مشترکہ مسئلے کا آخری حل تھا۔ یہ تم بھی جانتی تھیں۔''

''ہاں بالکل لیکن مجھے یہ امید نہیں تھی کہ تم اسے یہاں لا کر ہم دونوں کو خطرے میں ڈال دو گے۔''

سیور نے قہقہہ لگایا۔ ''میں نے سوچا کہ تم ثبوت مانگو گی اور تمہیں ایسا کرنا بھی چاہیے۔ لیکن اگر کوئی مجھے روکتا یا تلاشی لینے کی جرأت کرتا تو میں کہہ سکتا تھا کہ میں نے یہ بنڈل چوروں یا انڈینز سے چھینا ہے اور اسے شناخت کے لیے یہاں واپس لایا ہوں۔ تم پر کوئی شک نہیں کر سکتا۔''

''تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔'' اینا نے پُرسکون ہوتے ہوئے کہا۔ ''میں سمجھتی ہوں۔ تمہارے تعاون کا شکریہ۔ اب تم اس کا کیا کرو گے؟''

''میرا خیال ہے کہ ٹہلتا ہوا بندرگاہ تک جاؤں اور اس بنڈل کو سمندر میں پھینک دوں۔ شاید تم میرے ساتھ جانا نہ چاہو لیکن جب میں واپس آؤں تو ہاتھ دھونے کے لیے پانی اور پینے کے لیے ایک گلاس رم کا بندوبست کر دینا۔ میں تمہارا ممنون ہوں گا۔''

''یہ میرے لیے باعثِ مسرت ہوگا۔''

اینا نے جلدی جلدی دوسرے خط دیکھے اور ان لوگوں کے نام ایک الگ کاغذ پر لکھ لیے۔ جب سیور ہاتھ دھو رہا تھا تو وہ تیزی سے اپنے کمرے میں گئی اور ایک پرانی الماری میں وہ خطوط رکھ کر اسے مقفل کر دیا پھر مطمئن انداز میں واپس آ گئی۔ سیور نے اسے دیکھا اور بھویں چڑھا لیں۔ شاید وہ اس کی حرکت سے محظوظ ہو رہا تھا۔ اینا کا خیال تھا کہ شاید وہ اس بارے میں کچھ کہے گا لیکن وہ خاموش رہا۔

اینا نے کندھے اچکائے اور بولی۔ ''تم نہیں جانتے کہ اس طرح کی چیزیں کسی بھی وقت کارآمد ہو سکتی ہیں۔ میں تم سے بعد میں ملوں گی۔''

سیور خاموشی سے چلا گیا لیکن وہ دل ہی دل میں پچھتا رہا تھا کہ اس نے وہ خط اینا کے حوالے کیوں کر دیے جو اس کے اپنے لیے بھی کارآمد ہو سکتے تھے۔

آوارہ گرد

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

قسط:35

مندر، کلیسا، سینی گاگ، دھرم شالے اور اناتھ آشرم... سب ہی اپنے اپنے عقیدے کے مطابق بہت نیک نیتی سے بنائے جاتے ہیں لیکن جب بانیوں کے بعد نکیل بگڑے ذہن والوں کے ہاتھ آتی ہے تو سب کچھ بدل جاتا ہے... محترم پوپ پال نے کلیسا کے نام نہاد راہبوں کو جیسے گھناؤنے الزامات میں نکالا ہے، ان کا ذکر بھی شرمناک ہے مگر یہ ہو رہا ہے... استحصال کی صورت کوئی بھی ہو، قابل نفرت ہے... اسے بھی وقت اور حالات کے دھارے نے ایک فلاحی ادارے کی پناہ میں پہنچا دیا تھا... سکھ رہا مگر کچھ دن، پھر وہ ہونے لگا جو نہیں ہونا چاہیے تھا... وہ بھی مٹی کا پتلا نہیں تھا جو ان کا شکار ہو جاتا... وہ اپنی چالیں چلتے رہے، یہ اپنی گھات لگا کر ان کو نیچا دکھاتا رہا... یہ کھیل اسی وقت تک رہا جب اس کے بازو توانا نہ ہو گئے اور پھر اس نے سب کچھ ہی الٹ کر رکھ دیا... اپنی راہ میں آنے والوں کو خاک چٹا کر اس نے دکھا دیا کہ طاقت کے گھمنڈ میں راج کا خواب دیکھنے والوں سے برتر... بہت برتر قوت وہ ہے جو بے آسرا نظر آنے والوں کو نمرود کے دماغ کا مچھر بنا دیتی ہے... پل پل رنگ بدلتی، نئے رنگ کی سنسنی خیز اور رنگا رنگ داستان جس میں سطر سطر دلچسپی ہے...

[illegible]

گذشتہ اقساط کا خلاصہ

شہزاد احمد خان شہزی نے ہوش سنبھالا تو اسے اپنی ماں کی ایک ہلکی سی جھلک یاد تھی۔ باپ اس کی نظروں کے سامنے تھا مگر سوتیلی ماں کے ساتھ۔ اس کا باپ بیوی کے کہنے پر اسے اطفال گھر چھوڑ گیا جو یتیم خانے کی ایک جدید شکل تھی، جہاں بوڑھے بچے سب ہی رہتے تھے۔ ان میں ایک لڑکی عابدہ بھی تھی، شہزی کو اس سے انسیت ہوگئی تھی۔ بچے اور بوڑھوں کے سنگم میں چلنے والا یہ اطفال گھر ایک خدا ترس آدمی، حاجی محمد اسحاق کی زیرِ نگرانی چلتا تھا۔ پھر شہزی کی دوستی ایک بوڑھے سرمد بابا سے ہوگئی جن کی حقیقت جان کر شہزی کو بے حد حیرت ہوئی کیونکہ وہ بوڑھا لاوارث نہیں بلکہ ایک کروڑ پتی شخص تھا۔ اس کے اکلوتے بے حس بیٹے نے اپنی بیوی کے کہنے پر سب کچھ اپنے نام کروا کر اسے اطفال گھر میں پھینک دیا تھا۔ ایک دن اچانک سرمد بابا کو اس کی بہو عارفہ ادارے سے لے کر اپنے گھر چلی گئی۔ شہزی کو اپنے اس بوڑھے دوست کے یوں چلے جانے پر بے حد دکھ ہوا۔ اطفال گھر پر رفتہ رفتہ جرائم پیشہ عناصر کا عمل دخل بڑھنے لگا۔ شہزی نے اپنے چند ساتھیوں سمیت اطفال گھر سے فرار ہونے کی کوشش کی مگر ناکام رہا جس کے نتیجے میں دلشاد خان المعروف گگل خان اور اس کے حواری نے ان پر خوب تشدد کیا، اشرف اور بلال ان کے ساتھی شہزی گروپ کے دشمن بن گئے۔ گگل خان اپنے کسی دشمن گروپ کے ایک اہم آدمی اول خیر کو اطفال گھر میں یرغمال بنالیتا ہے، شہزی اس کی مدد کرتا ہے اور وہ اس کا دوست بن جاتا ہے۔ شہزی کا دوست اول خیر چوہدری ممتاز خان کے حریف گروپ جس کی سربراہ ایک جوان خاتون مختاری بیگم ہے، سے تعلق رکھتا تھا۔ وہاں وہ چھوٹے استاد کے نام سے جانا جاتا تھا۔ بڑا استاد کبیل دادا ہے جو زہرہ بانو کا خاص دستِ راست اور اس کا یکطرفہ چاہنے والا بھی تھا۔ زہرہ بانو درحقیقت ممتاز خان کی سوتیلی بہن ہے۔ دونوں بھائی بہنوں کے بیچ زمین کا تنازعہ عرصے سے چل رہا تھا۔ زہرہ بانو، شہزی کو دیکھ کر بے ہوش ہوجاتی ہے۔ کبیل دادا، شہزی سے خار کھانے لگتا ہے۔ اس کی وجہ زہرہ بانو کا شہزی کی طرف خاص التفات ہے۔ بیگم صاحبہ کے حریف، چوہدری ممتاز خان کو شہزی ہر محاذ پر شکست دیتا چلا آرہا تھا، زہرہ بانو، لئیق شاہ نامی ایک نوجوان سے محبت کرتی تھی جو درحقیقت شہزی کا ہم شکل ہی نہیں، اس کا بچھڑا ہوا بھائی تھا۔ شہزی کی جنگ پھیلتے پھیلتے ملک دشمن عناصر تک پہنچ جاتی ہے۔ ساتھ ہی شہزی کو اپنے ماں باپ کی بھی تلاش ہے۔ وزیر جان جو اس کا سوتیلا باپ ہے، اس کی جان کا دشمن بن جاتا ہے۔ وہ ایک جرائم پیشہ گینگ ''اسپیکٹرم'' کا زونل چیف تھا، جبکہ چوہدری ممتاز خان اس کا حلیف۔ رینجرز فورس کے میجر ریاض باجوہ ان ملک دشمن عناصر کی کھوج میں تھے لیکن دشمنوں کو سیاسی اور عوامی حمایت حاصل تھی۔ لوہے کو لوہے سے کاٹنے کے لیے شہزی کو اعزازی طور پر بھرتی کرلیا جاتا ہے اور اس کی تربیت بھی پاور کے ایک خاص تربیتی کیمپ میں شروع ہوجاتی ہے، بعد میں اس میں شکیلہ اور اول خیر بھی شامل ہوجاتے ہیں، ایک چھوٹی سی غلطی کی صورت میں پاور کو مصلحتاً ڈراپ کردیا جاتا ہے۔ عارفہ علاج کے سلسلے میں امریکا جاتے ہوئے عابدہ کو اپنے ساتھ لے جاتی ہے۔ اسپیکٹرم کا سربراہ لولوش، شہزی کا دشمن بن چکا ہے، وہ جے بی سی (جیوش بزنس کمیونٹی) کی ملی بھگت سے عابدہ کو امریکی سی آئی اے کے چنگل میں پھنسا دیتا ہے۔ اس سازش میں بالواسطہ عارفہ بھی شریک ہوتی ہے۔ باسکل ہولارڈ، ایک یہودی نژاد کٹر مسلم دشمن اور جے بی سی کے خفیہ دنیائے مسلم کے خلاف سازشوں میں ان کا دستِ راست ہے۔ باسکل ہولارڈ کی فورس ٹائیگر ٹیگ شہزی کے پیچھے لگ جاتی ہے۔ باسکل ہولارڈ کی لاڈلی بیٹی انجیلا، لولوش کی بیوی ہے۔ اڈیسہ کمپنی کے شیئرز کے سلسلے میں عارفہ اور سرمد بابا کے درمیان چپقلش آخری نہج پر پہنچ جاتی ہے، جسے لولوش اپنی ملکیت سمجھتا ہے، ایک نو دولتیا سیٹھ نوید ساپنچے والا مذکورہ شیئرز کے سلسلے میں ایک طرف تو لولوش کا ٹاؤٹ ہے اور دوسری طرف وہ عارفہ سے شادی کا خواہش مند ہے۔ اس دوران شہزی اپنی کوششوں میں کامیاب ہوجاتا ہے اور وہ اپنے ماں باپ کو تلاش کرلیتا ہے۔ اس کا باپ تاج دین شاہ، درحقیقت وطنِ عزیز کا ایک گمنام بہادر غازی سپاہی تھا۔ وہ بھارت کی خفیہ ایجنسی کی قید میں تھا۔ بھارتی خفیہ ایجنسی بلیوٹلسی کا ایک افسر کرنل سی جی بھجوانی، شہزی کا خاص ٹارگٹ ہے۔ شہزی کے ہاتھوں بیک وقت اسپیکٹرم اور بلیوٹلسی کو ذلت آمیز شکست ہوتی ہے اور وہ دونوں آپس میں خفیہ گٹھ جوڑ کرلیتے ہیں۔ شہزی، کبیل دادا اور زہرہ بانو کی شادی کرنے کی بات چلانے کی کوشش کرتا ہے جس کے نتیجے میں کبیل دادا کا شہزی سے نہ صرف دل صاف ہوجاتا ہے بلکہ وہ بھی اول خیر کی طرح اس کی دوستی کا دم بھرنے لگتا ہے۔ باسکل ہولارڈ، امریکا میں عابدہ کا کیس دہشت گردی کی عدالت میں منتقل کرنے کی سازش میں کامیاب ہوجاتا ہے۔ امریکا میں مقیم ایک بین الاقوامی مبصر اور رپورٹر آنسہ خالدہ، عابدہ کے سلسلے میں شہزی کی مدد کرتی ہے۔ وہی شہزی کو مطلع کرتی ہے کہ باسکل ہولارڈ، سی آئی اے میں ٹائیگر ٹیگ کے دو ایجنٹ اس کو اغوا کرنے کے لیے خفیہ طور پر امریکا سے پاکستان روانہ کرنے والا ہے۔ شہزی ان کے شکنجے میں آجاتا ہے، ٹائیگر ٹیگ کے مذکورہ دونوں ایجنٹ اسے پاکستان سے نکالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جہاز راں کمپنی اڈیسہ کے شیئرز کے سلسلے میں لولوش برما (رنگون) میں مقیم تھا۔ اس کا دستِ راست سے جی کوہارا، شہزی کو ٹائیگر ٹیگ سے چھین لیتا ہے اور اپنی ایک لگژری بوٹ میں قیدی بنالیتا ہے۔ وہاں اس کی ملاقات ایک اور قیدی، بشام چھلگری سے ہوتی ہے جو کبھی اسپیکٹرم کا ایک ریسرچ آفیسر تھا جو بعد میں تنظیم سے کٹ کر اپنے بیوی بچوں کے ساتھ روپوشی کی زندگی گزار رہا تھا۔ بشام اسے پاکستان میں موئن جو دڑو سے برآمد ہونے والے طلسم نور ہیرے کے راز سے آگاہ کرتا ہے جو چوری ہوچکا ہے اور تین ممالک ہٹلر کی طرح اس ہیرے کی آڑ میں تیسری عالمی جنگ چھڑوانا چاہتے ہیں۔ جسے انہوں نے ورلڈ بگ بینگ کا نام دے رکھا ہے۔ لولوش اور سی جی بھجوانی کے ایک مشترکہ معاہدے کے تحت سے جی کوہارا کی بوٹ میں بلیوٹلسی کے چندرناتھ، شیام اور کوریلا آتے ہیں۔ وہ شہزی کو آنکھوں پٹی باندھ کر بلیوٹلسی کے ہیڈکوارٹر لے جاتے ہیں، وہاں پہلی بار بلیوٹلسی کے چیف سی جی بھجوانی کو شہزی اپنی نظروں کے سامنے دیکھتا ہے، کیونکہ یہ وہی درندہ صفت شخص تھا جس نے اس کے باپ پر اس قدر تشدد کے پہاڑ توڑے تھے کہ وہ اپنی یادداشت کھو بیٹھا تھا۔ اب پاکستان میں شہزی کے باپ کی حیثیت ڈکلیئر ہوگئی تھی کہ وہ ایک محبِ وطن گمنام سپاہی تھا، تاج دین شاہ کو ایک تقریب میں اعلیٰ فوجی اعزاز سے نوازا جاتا ہے۔ اس لحاظ سے شہزی کی اہمیت بھی کم نہ تھی، یوں بھجوانی اپنے منصوبے کے مطابق اس کی رہائی کے بدلے شہزی کے ساتھیوں، زہرہ بانو اور اول خیر وغیرہ سے پاکستان میں گرفتار شدہ اپنے جاسوس سندرداس کو آزاد کروانا چاہتا تھا۔ ایک موقع پر شہزی، اس برمی قصاب، سے جی کوہارا اور اس کے ساتھی بھومک کو بے بس کردیتا ہے، وہاں سوشیلا کے ایل ایڈوانی سے اپنی بہن، بہنوئی اور اس کے دو معصوم بچوں کے قتل کا انتقام لینے کے لیے شہزی کی ساتھی بن جاتی ہے۔ دونوں ایک خونی معرکے کے بعد ایک ساحل پر جا پہنچتے ہیں۔ وہاں ایک بوڑھا جونکی بابا ان کو اپنی جھونپڑی میں لے جاتا ہے۔ شہزی کی حالت بے حد خراب ہوچکی تھی۔ جونکی بابا اس کا علاج کرتا ہے وہیں پتا چلتا ہے کہ یہ بوڑھا جونکوں کے ذریعے لوگوں کا خون نچوڑتا تھا۔ شہزی کے دشمن مسلسل تعاقب کرتے ہوئے اس جھونپڑی تک آپہنچتے ہیں مگر شہزی اس بوڑھے سمیت جھونپڑی کو آگ لگا دیتا ہے اور سوشیلا کے ہمراہ وہاں سے فرار ہوجاتا ہے...... اور بھٹکتے بھٹکتے ایک بستی میں جا پہنچتا ہے۔ پولیس ان دونوں کے تعاقب میں تھی مگر شہزی اور سوشی کا سفر جاری رہتا ہے۔ حالات کی مستقل پُرفریبیوں کے باوجود وہ اس چھوٹی سی بستی میں تھے کہ کوہارا اور چندرناتھ حملہ کردیتے ہیں۔ خونی معرکے کے بعد شہزی اور سوشیلا وہاں سے نکلنے میں کامیاب ہوجاتے ہیں۔ شہزی کا پہلا ٹارگٹ صرف سی جی بھجوانی تھا۔ اسے اس

تک پہنچنا تھا۔ ممبئی ان کی منزل تھی۔ موہن اوران دونوں کوایک ریسٹورنٹ میں ملنا تھا مگراس کی آمد سے پہلے ہی وہاں ایک ہنگامہ ان کا منتظر تھا۔ کچھ لوفر ٹائپ لڑکے ایک رینا نامی لڑکی کو تنگ کررہے تھے۔ شہزی کافی دیر سے یہ برداشت کررہا تھا۔ بالآخراس کا خون جوش میں آیا اوران غنڈوں کی اچھی خاصی مرمت کرڈالی۔ رینا اس کی مشکور تھی۔ اسی اثنا میں رینا کے باڈی گارڈ وہاں آجاتے ہیں اور یہ روح فرسا انکشاف ہوتا ہے کہ وہ ایل کے ایڈوانی کی پوتی ہے۔ ان کے ساتھ آسمان سے گرے کھجور میں اٹکنے والا معاملہ ہوگیا تھا۔ ابھی شہزی اس انکشاف کے زیراثر تھا کہ رینا کا سیل فون بج اٹھتا ہے۔ کال سنتے ہی رینا خوف زدہ نگاہوں سے شہزی کی طرف دیکھتی ہے اور قریب کھڑے بلراج سنگھ سے چلا کرکہتی ہے، یہ پاکستانی دہشت گرد ہے۔ پھر جیسے پل کے پل کایا کلپ ہوجاتی ہے۔ مگر شہزی چالاکی سے بلراج کو قابو کرلیتا ہے اور رینا کواپنے پاکستانی ہونے اوراپنے مقاصد کے بارے میں بتا کر قائل کرنے میں کامیاب ہوجاتا ہے۔ رینا، شہزی کی مدد کرتی ہے اور وہ اپنے ٹارگٹ بلیوٹلسی تک پہنچ جاتا ہے۔ پھر وہاں کی سیکیورٹی سے مقابلے کے بعد بلیوٹلسی کے ہیڈکوارٹر میں تباہی مچادیتا ہے اور سی جی بھجوانی کواپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ شہزی نے ایک بوڑھے کا روپ دھارا ہوا تھا۔ سی جی بھجوانی، شہزی کے گن کے نشانے پر تھا مگر اسے مار نہیں سکتا کہ شہزی کے ساتھی اول خیر، شکیلہ اور کبیل دادا اس کے قبضے میں تھے اور کالا پانی ”انڈیمان“ پہنچادیے گئے تھے۔ کالا پانی کا نام سن کر شہزی گنگ رہ جاتا ہے کیونکہ وہاں جانا ناممکنات میں تھا۔ اپنے ساتھیوں کی رہائی کے لیے سی جی بھجوانی کو ٹارچر کرتا ہے۔ بھجوانی مدد کے لیے تیار ہوجاتا ہے۔ اس اثنا میں کوریلا فون پر بتاتی ہے کہ تینوں کو ”کلی منجارو“ پہنچادیا گیا ہے۔ یہ نام سن کر شہزی مزید پریشان ہوجاتا ہے۔ اچانک بلراج سنگھ حملہ آور ہوتا ہے۔ مقابلے میں سی جی بھجوانی مارا جاتا ہے۔ پھر شہزی کی ملاقات نانا شکور سے ہوتی ہے، جو ممبئی کا ایک بڑا اسمگلر تھا۔ نانا شکور شہزی کی مدد کے لیے تیار ہوجاتا ہے اور پھر شہزی، سوشیلا اور نانا شکور کے ہمراہ کلی منجارو کی طرف روانہ ہوجاتا ہے۔ نانا شکور کی سربراہی میں رات کی تاریکی میں سفر جاری تھا۔ جمائی کے گھنے دلدلی جنگل کی حدود شروع ہوچکی تھی کہ اچانک جنگلی وحشی زہریلے تیروں سے حملہ کردیتے ہیں۔ نانا شکور کے گارڈ اور ڈرائیور مارے جاتے ہیں۔ سوشیلا کے پیر میں تیر لگ جاتا ہے اور وہ زخمی ہوجاتی ہے۔ شہزی اپنی گن سے جوابی فائرنگ کرکے کچھ جنگلی وحشیوں کو ختم کردیتا ہے۔ پھر وہ وہاں سے نکل بھاگنے میں کامیاب ہوجاتے ہیں مگر تاریکی کی وجہ سے نانا شکور دلدل میں پھنس کر ہلاک ہوجاتا ہے۔ اس سناٹے میں اب شہزی اور زخمی سوشیلا کا سفر جاری تھا کہ کوریلا اور سے جی کوہارا سے ٹکراؤ ہوجاتا ہے۔ غیبی مدد کے طور پر اژدھے کوریلا اور سے جی کوہارا کے رستے میں آجاتے ہیں۔ شہزی، سوشیلا کے ساتھ سے جی کوہارا کی جیپ میں بچ نکلنے میں کامیاب ہوجاتا ہے اور نیم صحرائی علاقے میں پہنچ جاتا ہے۔ جہاں حدنگاہ کالی چٹانوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ سوشیلا کو جیپ میں چھوڑ کر خود ایک قریبی پہاڑی کا رخ کرتا ہے تاکہ راستوں کا تعین کرسکے۔ واپسی کے لیے پلٹتا ہے تو ٹھٹک کررک جاتا ہے۔ کیونکہ ہرطرف رینگتے ہوئے کالے سیاہ رنگ کے موٹے اور بڑے ڈنک والے بچھو نظر آئے۔ یہ سیاہ پہاڑی بچھو تھے جنہیں دیکھ کر شہزی کے اوسان خطا ہوجاتے ہیں۔ بچھوؤں سے بچ نکلنے کے لیے وہ اندھادھند دوڑ پڑتا ہے۔ ڈھلوان پر دوڑتے ہوئے لڑکھڑا کر گر پڑتا ہے اور چٹانی پتھر سے ٹکرا کر بے ہوش ہوجاتا ہے۔ ہوش میں آنے پر خود کو ایک لانچ میں پاتا ہے۔ وہ لانچ میجر کیم کھلا اور اس کی بیٹی سونگ کھلا کی تھی۔ وہ نایاب کالے بچھوؤں کے شکاری تھے اور بچھوؤں کا کاروبار کرتے تھے۔ اچانک سونگ کھلا کی نظر بے ہوش شہزی پر پڑتی ہے اور اسے ان بچھوؤں سے بچالیتی ہے مگر سوشیلا کے بارے میں وہ کچھ نہیں جانتی تھی۔ شہزی خود کو ایک ہندو ظاہر کرکے فرضی کہانی سنا کر باپ بیٹی کو اعتماد میں لے لیتا ہے۔ اس اثنا میں بری مسلم گروپ کا مجاہد ٹولا ان پر حملہ کردیتا ہے۔ شہزی کو جب یہ معلوم ہوتا ہے کہ کیم کھلا کو بے گناہ اور مظلوم بری مسلمانوں کے قتل کا ٹاسک ملا ہوا ہے تو وہ کیم کھلا اور اس کے ساتھیوں کو جہنم واصل کردیتا ہے۔ پھر نارتھ انڈیمان کے ساحل کا رخ کرتا ہے۔ جہاں کلی منجارین سے ٹاکرا ہوجاتا ہے۔ شہزی گھات لگا کر ان کے ایک ساتھی دیال داس کو قابو کرلیتا ہے اور اس کا بھیس بھر کر ان میں شامل ہوجاتا ہے۔ وہاں پتا چلتا ہے کہ اس سارے چکر میں جنرل کے ایل ایڈوانی کا ہاتھ ہے اور اس کا نائب بلراج سنگھ بھی موجود ہے۔ وہیں لنگڑے کوڑھی کے بھیس میں کبیل دادا اس کے سامنے آجاتا ہے جسے دیکھ کر شہزی حیران رہ جاتا ہے۔ کبیل دادا کی زبانی معلوم ہوتا ہے کہ ممبئی ائرپورٹ پر بھارتی خفیہ ایجنسی کے ہاتھوں گرفتار ہونے کے بعد ان تینوں کو بلیوٹلسی کے ہیڈکوارٹر پہنچادیا جاتا ہے۔ وہاں سے سی جی بھجوانی انہیں انڈرورلڈ ڈان بھولا ناتھ کے نجی قیدخانے ڈیول کیج بھیج دیتا ہے، وہاں کا ایک قیدی بدمعاش داور شکیلہ پر نظر رکھتا ہے منصوبہ بندی کے تحت شکیلہ داور کو جھانسے میں لے لیتی ہے اور ہمارا کام آسان ہوجاتا ہے۔ داور کو قابو کرکے قیدخانے سے نکلنے میں کامیاب ہوجاتے ہیں۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

نوشابہ کے اچانک ذکر پر میرا چونکنا بے محل نہ تھا۔ ماضی کے حوالے سے میرے کئی دشمن تھے۔ کچھ روپوش تھے، کچھ میرے ساتھ نبرد آزما بھی۔ تیسری قسم میرے ایسے دشمنوں کی بھی تھی جو اندر تھے، یعنی قانون نافذ کرنے والے اداروں کی گرفت میں تھے۔ ان میں ایک چوہدری ممتاز بھی تھا اور نوشابہ اسی کی بیٹی تھی۔ وہ مجھے اپنے بھائی فرخ کا قاتل سمجھے ہوئے تھی۔ حالانکہ اس کا بھائی فرخ خود اسی کی چلائی ہوئی گولی سے ہلاک ہوا تھا مگر وہ اپنے بھائی کی موت کا ذمے دار مجھے سمجھے ہوئے تھی جبکہ میرا وہاں کسی کو بھی ہلاک کرنے کا کوئی ارادہ نہ تھا۔ یہ سب نوشابہ کی مہم جوئی کی وجہ سے ہوا تھا، جو خود کو کسی ”شوٹنگ کلب“ کا ممبر بھی بتاتی تھی۔ اپنے باپ ممتاز خان کی گرفتاری کے بعد اس نے میرے خلاف بھی مقدمہ قائم کردیا تھا، جس سے میں بری کردیا گیا تھا مگر نوشابہ نے پھر بھی میرا پیچھا نہیں چھوڑا تھا۔

اس کے بعد مجھے اس سے متعلق یہ شنید ملتی رہتی تھی کہ وہ اب اپنے باپ کی رہائی کے لیے اس کی سیاسی ساکھ کو ہتھیار کے طور پر استعمال کررہی تھی بلکہ اسے ”کیش“ بھی کررہی تھی جس کے تحت اس نے ”عوامی کارڈ“ کھیلنے کا منصوبہ بنایا۔ پھر کیا ہوا، وہ کہاں تک کامیاب ہوئی؟ مجھے اس کا علم نہ تھا۔

”کیوں شہزی؟ نوشابہ یاد آگئی؟“

مجھے کافی دیر تک سوچتا پا کر کبیل دادا نے مجھے سرگوشی کا ٹھوکا مارا۔

''ہاں! بھولی تو وہ مجھے کبھی نہیں تھی، مگر...... خیر! تم بتاؤ آگے...... مزید اس کے بارے میں کیا بتانا چاہ رہے تھے تم؟'' میں نے پوچھا۔ وہ ایک گہری ہمکاری خارج کرتے ہوئے بولا۔

''شہزی! ممکن ہے ایسا تمہاری غیر موجودگی کے سبب ہوا ہو کہ وہاں ہمارے دشمن پھر سے طاقت پکڑنے لگے ہیں۔ وزیر جان انڈر گراؤنڈ ہو گیا اور وہاں سے اس نے گل کھلانا شروع کر دیا۔ پہلے چوہدری ممتاز کی رہائی کے سلسلے میں اس نے نوشابہ کو ہتھیار بنایا جبکہ خود نوشابہ بھی کسی ایسے ہی سہارے کی متلاشی تھی۔ وہ اس کے زبردست اور پشت پناہی میں آ گئی۔

اب وزیر جان، نوشابہ اور اس کی (اس کے باپ کی) سیاسی پارٹی کے ذریعے عوامی کارڈ کھیل رہا ہے اور یہ دباؤ اس قدر بڑھا کہ چوہدری ممتاز خان کو رہا کرنا پڑ گیا۔''

''او...... میرے خدا!'' چوہدری ممتاز کی رہائی کا سن کر بے اختیار میرے منہ سے برآمد ہوا تو کبیل دادا دھیمی آواز میں مجھے سرزنش کرتے ہوئے بولا۔

''ماٹھا رہ شہزی! اور سنتا جا، وقت کم ہے۔'' کہتے ہوئے اس نے ایک ذرا جھونپڑی کے دروازے کی طرف دیکھا جہاں جھولتے ہوئے کھال کے ٹاٹ کی درزوں سے تاریکی کے سوا کچھ نہیں نظر آتا تھا۔

''چوہدری ممتاز بری نہیں ہوا، تاہم وہ ضمانت پر رہا ہوا ہے۔ ابھی اس پر غداری اور ملک دشمن عناصر کی سہولت کاری کے جرم میں کیس چل رہا ہے۔ تاہم اس نے خود کو دانستہ پس منظر میں کر لیا ہے اور دونوں باپ بیٹی پس پردہ وزیر جان کی ہدایات کو ہی فالو کیے ہوئے ہیں۔ وزیر جان ایک خطرناک دماغ کا حامل شخص ہے اور یہ دونوں باپ بیٹی مکمل طور پر اس کی ہدایات پر عمل پیرا رہتے ہوئے اپنی توپوں کا رخ ''بیگم ولا'' کی طرف کیے ہوئے ہیں۔

بیگم صاحبہ اور تمہارے خلاف نوشابہ نے میڈیا ٹرائل بھی کروایا اور یہ ڈکلیئر کرنے کی مذموم سازش میں بھی مصروف رہی کہ بیگم ولا کی عمارت اور تم اور بیگم صاحبہ غیر ملکی ایجنٹوں اور دہشت گردوں کے سہولت کار بنے ہوئے ہیں۔ جس کے نتیجے میں بیگم ولا پر پولیس اور رینجرز کا مشترکہ چھاپا بھی پڑا۔ تمہیں تو پتا ہی ہے کہ وہاں بیگم صاحبہ کے خدمت گاروں کا ہم سمیت ایک پورا اسلحہ پوش گروہ بھی موجود رہتا ہے۔ نتیجتاً وہاں اسلحہ بھی پکڑا گیا، اگرچہ وہ لائسنس یافتہ تھا، تاہم پوچھ گچھ کے لیے بیگم صاحبہ، مجھے اور اول خیر سمیت شکیلہ اور چند دیگر مشکوک (ان کی نظر میں) افراد کو گرفتار کر کے لے گئے۔''

کبیل دادا اتنا بتا کر رکا۔ میں جیسے ایک سکتے کی سی کیفیت میں بہ غور اس کی باتیں سن رہا تھا، لہٰذا جب وہ سانس لینے کو رکا تو میں نے کہا۔

''لیکن میجر ریاض...... تو ساری حقیقت جانتے تھے اور بیگم صاحبہ اُن سے مدد لے سکتی تھیں؟''

''بیگم صاحبہ نے یہی تو کیا تھا۔'' کبیل دادا بولا۔

''ریاض صاحب کے درمیان میں پڑنے سے ہی ہمیں رہائی ملی تھی اور معاملہ کچھ وقتی طور پر سہی، ٹھنڈا پڑا تھا۔ تاہم ان دنوں وہ علالت کے باعث طویل رخصت پر تھے اور ان کا چارج کسی اور نے سنبھالے رکھا تھا مگر نوشابہ کی اس مہم جوئی کے نتیجے میں ہمیں اور بیگم ولا کو مشکوک بنا دیا گیا ہے۔ خیر...... آگے سنو!''

وہ چند ثانیے کے لیے متوقف ہوا پھر آگے کہنا شروع کیا۔ ''اس واقعے کے بعد وزیر جان کی تلاش کے سلسلے میں بیگم صاحبہ نے میری سرکردگی میں ایک گروپ تشکیل دیا جبکہ اول خیر اور شکیلہ کو نوشابہ کے پیچھے لگا دیا گیا۔ خود بیگم صاحبہ خان جی (زبیر خان) سے چوہدری ممتاز اور وزیر جان کے سلسلے میں مدد لینے ان کے پاس جا پہنچیں۔''

''کیوں؟'' میں نے چونک کر درمیان میں کہا۔ ''بھلا خان جی سے بیگم صاحبہ کو کیا مدد کی ضرورت پیش آ گئی تھی؟''

''اعتراض تو مجھے بھی اس پر تھا، مگر...... شاید وجہ اس کی یہی رہی ہو کہ خان جی اس وقت چوہدری ممتاز خان کی مخالف سیاسی پارٹی سے تعلق رکھتے تھے۔ گویا جس طرح نوشابہ اور چوہدری ممتاز نے چالاکی سے سیاسی گود کی پناہ لے لی تھی اسی طرح شاید بیگم صاحبہ بھی اس کا توڑ نکالنے کے لیے کوشاں تھیں۔''

''مگر خان جی تو اپنے بیٹے کے قتل کے بعد سے ہی سیاست سے کنارہ کش ہو چکے تھے؟'' میں نے یاد دلایا۔

''ہاں! مگر اب وہ پھر فعال ہو گئے ہیں۔'' کبیل دادا نے جواب دیا۔

''لیکن جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے بیگم صاحبہ اور خان جی کے درمیان تو کبھی بھی کسی بھی سلسلے میں آج تک کوئی بات چیت نہیں ہوئی تھی؟''

''اس سلسلے میں بات چیت کے لیے تمہارا حوالہ کیا کم

تھا؟'' کبیل دادا مسکرایا اور میں نے پُرسوچ انداز میں اپنے ہونٹ بھینچ کر ہولے سے اپنے سر کو تفہیمی جنبش دی۔

''خان جی نے سب سے پہلے تمہارے بارے میں بیگم صاحبہ سے پوچھا تھا۔ میں بھی ساتھ تھا۔ تمہارے بارے میں ان کا اس قدر پریشان اور بے چین ہونا مجھے ہی نہیں بیگم صاحبہ کو بھی حیران کر گیا تھا۔'' وہ آگے بتانے لگا۔

''خیر......! انہوں نے بیگم صاحبہ کو اس سلسلے میں پوری تسلی اور مدد کی اپنی طرف سے یقین دہانی کے ساتھ وعدہ بھی کیا کہ وہ ان کے ساتھ ہیں۔

''لیکن شہزی! سچ تو یہ بھی ہے کہ چوہدری ممتاز جس سیاسی پارٹی سے تعلق رکھتا ہے وہ برسرِ اقتدار آچکی ہے۔ یہ ان دونوں باپ بیٹی کے لیے ایک بڑا ٹرننگ پوائنٹ ہے جو اُن کے حق میں جاتا ہے۔ ہماری جنگ ان سے جاری تھی کہ ہمیں یہاں تمہاری تلاش میں نکلنا پڑا......'' اس نے اتنا بتا کر اپنی بات ختم کی تو میں نے پوچھا۔

''عارفہ اور سیٹھ نوید سانچے والا...... ان سانپوں کی جوڑی کے بارے میں کوئی خبر؟''

کبیل دادا نے نفی میں اپنا سر ہلا دیا۔ البتہ ایڈووکیٹ خانم شاہ کے بارے میں اس نے فقط اتنا ہی بتایا تھا کہ وہ ابھی تک بسترِ علالت پر تھی۔

میں نے ایک گہری سانس لے کر وقت کا اندازہ کیا۔ رات نصف سے زائد گزر چکی تھی۔ مجھے اس بلیک کوئن کے پاس بھی جانا تھا، جس کا نام مجھے وجے نے باربہ بتایا تھا۔ چاہے خانہ پُری کے لیے ہی سہی، میرا باربہ سے ملنا ضروری تھا۔ ورنہ اگر وہ یا وجے اُس سے میرے بارے میں پوچھ لیتا تھا تو مسئلہ ہو جاتا کہ میں اس کے پاس نہیں آیا تھا تو پھر کہاں گیا تھا اتنی دیر؟

میں کبیل دادا کو اپنے اب تک کے حالات سے مختصراً ہی آگاہ کر پایا تھا پھر بولا۔ ''دادا! آج کے لیے اتنا ہی کافی ہے۔ وقت ابھی ہماری مٹھی میں ہے۔ یہ تب تک رہے گا جب تک کہ ہم کسی جلد بازی کا مظاہرہ کیے بغیر اپنا کام خاموشی اور رازداری سے کرتے رہیں۔ اب ہم چاروں کے لیے حالات بھی غیر یقینی نہیں رہے اس لیے کہ ہم اب مل گئے ہیں۔ بس! صبر اور استقامت سے باقی کے حالات سے بھی نمٹ لیں گے۔ میں اب چلوں گا...... تم یہی بہروپ بھرے رکھو اور ہاں! مجھے تمہاری ٹانگ کی فکر ہونے لگی ہے۔'' میں نے آخر میں فکرمند ہو کر اس سے کہا تو وہ ہنس کر اپنی ٹانگ میں بندھی کھپچی کو دیکھ کر بولا۔

''اس کی فکر نہ کر شہزی! یہ ٹھیک ہو جائے گی جلدی......تو جا اب! کل تک تو بھی کچھ آگے سوچ رکھ، میں بھی اب اس نئی صورتِ حال کے مطابق کچھ منصوبہ بناتا ہوں۔''

میں اور کبیل دادا ایک دوسرے کے گلے ملے اور جدا ہو گئے۔

بستی پر گہرا سناٹا طاری تھا۔ اطراف کے جنگل میں کالی بھٹ تاریکی کو ''سُپر مون'' کا سا منظر پیش کرتے ہوئے، آسمان پر ٹکے طباق چاند کی روشنی بھی چیرنے میں ناکام ہی محسوس ہوتی تھی، شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ آسمان پر کہیں کہیں بادلوں کی ٹکڑیاں تیرتی ہوئی اس سنہرے ارتھ جیسے ضوفشاں چاند کے سامنے آجاتی تھیں۔ دور پرے جنگل کے پار سیاہ چٹانوں کی طرف سے جنگلی جانوروں کے کبھی چلّانے کی آوازیں سناٹے کو کسی حد مجروح کرتیں، اس کے بعد پھر وہی آسیبی سناٹا منحوس گدھ کی طرح غلیظ پر پھڑپھڑائے اس جنگل بستی پر آ بیٹھتا تھا۔

میں کچھ اندازے سے بھی اس طرف بڑھتا چلا گیا، جدھر بلیک کوئن یعنی باربہ کی جھونپڑی تھی۔ باربہ کھوٹا سکہ سہی میرے لیے، مگر حالات اور تجربے سے میں نے بھی کھوٹے کو کھرا کرنا سیکھ لیا تھا، لہٰذا اس کے پاس جانے کا میرا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ میں اس سے ایک بار مل کر یہ ضرور دیکھنا چاہتا تھا کہ وہ آخر میرے کس کام آسکتی تھی۔

کبیل دادا بھی اسے جانتا تھا۔ اسی نے ہی مجھے اس کی مڑھی کے بارے میں بتایا تھا اور مختصراً یہ بھی کہ وہ بستی کی ایک چلتا پرزہ عورت ہے اور اس کے بارے میں جاوا بستی کے لوگ دبے لفظوں میں یہی کہتے ہیں کہ وہ غاصب دشمنوں کی جاسوس ہے۔ کیونکہ اسے ہر قسم کی سہولیات حاصل تھیں اور وہ دیگر جاوا قبائل کے ستم رسیدہ قبائلیوں کے برعکس بہت مزے کی زندگی گزار رہی تھی۔

میں نے یہ بات ذہن میں رکھی تھی۔ میں تھوڑی دیر میں اس بلیک کوئن کی جھونپڑی کے قریب جا پہنچا۔ اس کی جھونپڑی کے اردگرد چوڑے پتوں اور لانبی ٹہنیوں والے پودے پھیلے ہوئے تھے، کچھ خودرو جھاڑیاں بھی تھیں، ان میں بھی کہیں کہیں جنگلی پھول کھلے ہوئے تھے، جن کی مہک دل و دماغ کو مخمور سا کر رہی تھی۔ اندر روشنی تھی۔ دروازے پر ایک کھال کا ٹاٹ جھول رہا تھا۔ میں شش و پنج کے انداز میں قریب جا کر کھڑا ہو گیا۔

''اندر آجاؤ...... میرے شہزادے!'' دفعتاً ہی اندر

سے ایک مترنم سی آواز ابھری۔ لب و لہجہ مجھے ہندی لگا تھا۔ مگر بولنے کا انداز ایسا ہی تھا جیسے وہ ٹوٹے پھوٹے جملے جوڑ کر بول رہی ہو، وجے نے مجھے بتایا تھا کہ ہماری اس بلیک کوئن کو ہندی بھی آتی ہے، جو اس نے انہی کے درمیان (دوستی) سیکھی تھی۔ یوں بھی بہ قول وجے کے ہی..... جاوا قبیلے کو یوں بھی تھوڑی بہت ہندی آتی تھی۔ نیز وہ کلی منجارو جیسے وحشی اور جنگجو قبیلے کے مقابلے میں مہذب آبادیوں سے زیادہ قریب رہے ہیں، جبکہ کلی منجارو غیر متمدن اور مہذب دنیا سے دور دراز علاقوں میں رہنے کو ترجیح دیتے تھے۔ یہی سبب تھا کہ وہ صرف اپنی بولی کے اور کوئی زبان نہیں بول سکتے تھے۔

بہرحال پہلی بار اس تشویش آمیز خدشے نے میرے اندر سر اٹھایا تھا کہ کہیں یہاں آکر میں نے کوئی غلطی تو نہیں کرلی تھی۔ اگر وہ دشمن کی جاسوس نکلی تو مجھے پھنسا سکتی تھی۔ تاہم ابھی یہ یقینی بات نہ تھی کہ وہ ایسی کوئی جاسوس تھی بھی یا نہیں۔

میں ایک گہری سانس لے کر اور دھڑکتے دل سے اندر داخل ہوگیا۔ میری آنکھیں پھٹ گئیں۔ یہ محض کہنے کو جھونپڑی تھی۔ اندر سے وہ کسی آرام دہ اور پُرسہولت کمرے سے کم نہیں تھی۔ کہیں قریب ہی دھرے پڑے ایک چربی والے چراغ کی روشنی میں وہاں مجھے فرش پر ایک صاف ستھری کھال کی دری بچھی نظر آئی۔ موٹے کپڑوں کے نشستی گودڑ بھی دو تین رکھے ہوئے تھے جو عرف عام میں میٹریس یا فوم والے گدے ہوتے ہیں۔ کھانے پینے کی اشیا جس میں شراب کی بوتلیں اور پانی وغیرہ کی صراحیاں بھی رکھی نظر آئیں۔ ایک آرام دہ گودڑ پر مجھے وہ کالی حسینہ، ہوش اُڑا دینے والے انداز میں نیم درازسی بیٹھی ہوئی دکھائی دی، جو میری طرف مخمور نگاہوں سے دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔ اس کے ایک ہاتھ میں گلاس نما کوئی شے تھی۔ شاید اس میں شراب تھی۔ اس نے کھال کا ہی نہایت مختصر لباس پہن رکھا تھا۔ وہ پوری کالی نہیں تھی، سیاہ رنگت میں سانولے پن کا شائبہ دیتی تلچھٹ اس کے رنگ و روپ کو نرالی اور پرکشش چھب دیے ہوئے تھی۔ چراغ کی روشنی میں اس کا جسم تانبے کی طرح ہی چمکتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ اس کے لمبے سیاہ گھنے بال اس کی برہنہ پشت پر بکھرے ہوئے تھے۔ نرم و گداز لب بڑے سیکس اپیل انداز میں نیم وا تھے۔ اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں خمار اور بے اختیار اپنی طرف کھینچ لینے والی بڑی ''خطرناک'' کشش پھوٹ رہی تھی اور یہی ہوا بھی کہ میں نے اس کی جانب قدم بڑھا دیے۔

''کیا بات ہے؟ آج وہ پہلے والی بے چینی اور بے صبری تمہارے اندر نظر نہیں آرہی ہے۔'' وہ میری طرف اس بار کچھ عجیب انداز سے دیکھتے ہوئے بولی۔ ''کیا مجھ سے تمہارا دل بھر گیا ہے دیال داس؟''

''ایسی بات نہیں، میری شہزادی!'' میں نے اس کے قریب دبیز کھال والی فرشی نشست پر بیٹھتے ہوئے کہا اور بڑے پیار سے اس کا نرم و ملائم ہاتھ تھام کر اپنے ہونٹوں سے لگالیا تو اس کے نیم والبوں سے ایک سسکی سی پھوٹی۔

''آہ...... کتنے گرم ہوتے ہو تم انڈین لوگ...... ایک ذرا چھوتے ہی تن بدن میں آگ بھر دیتے ہو......'' مخمور اور ڈوبے ڈوبے لہجے میں کہتے ہوئے اس نے اپنی گھنیری پلکوں والی آنکھیں موند سی لیں۔

''آؤ ناں! اور قریب آجاؤ، دبوچ لو مجھے، بھینچ لو خود سے مجھے، تمہاری قربت، جانے کیوں سب مردوں سے زیادہ مجھے بھاتی ہے، اس کی وجہ شاید یہی ہے کہ تمہارے اندر بڑی بے صبری اور وارفتہ پن ہے......''

وہ اپنی کہے جا رہی تھی۔ مگر میں ایسے ہی اپنے چہرے پر دانستہ اداسی سی طاری کیے بیٹھا رہا۔

اس نے پٹ سے اپنی آنکھیں کھول دیں اور اس مرتبہ حیرت سے بولی۔ ''کیا ہوا تمہیں؟ تم اترے اترے کیوں نظر آرہے ہو؟ طبیعت ٹھیک نہیں تمہاری؟''

''ایسی بات نہیں۔'' میں نے مختصراً کہا۔

''تو پھر کیا بات ہے؟ کھنچے کھنچے سے کیوں ہو؟ تم تو آتے ہی مجھ سے لپٹ جاتے تھے، جھنجوڑ ڈالتے تھے مجھے۔'' اس کے انداز میں خود سپردگی تھی، وہ ایسے میں مجھے ایک جنگلی اپسرا کی صورت میں ہی نظر آرہی تھی۔

''باربیہ! جب سے میں نے تمہاری قربت کا مزہ چکھا ہے، سچ پوچھو تو مجھے تم سے محبت سی ہوگئی ہو، شاید یہی وجہ ہے کہ میں اب حصے داری برداشت نہیں کرسکتا، میری مردانگی اور محبت یہ گوارا نہیں کررہی ہے کہ میں اب تمہارے قریب اپنے سوا کسی اور مرد کو برداشت کروں......'' میں اس کے ساتھ ڈبل گیم کھیلنا چاہتا تھا۔

میری بات پر اس نے بہت گہری گہری سی نگاہوں سے میری طرف دیکھا تو مجھے چراغ کی روشنی میں اس کی آنکھوں کے سپیدڈیلوں میں گلابی اور سرخ ڈورے کھنچے ہوئے صاف نظر آنے لگے تھے اور میں اس کے قریب ہونے کے باوصف ایک ذرا فاصلہ کیے اس آگ کو اپنے

لفظوں کی گرمی سے، ہولے ہولے ہوا دے رہا تھا۔

''کیا تم میرے قریب اپنے سوا کسی اور مرد کو دیکھنا برداشت نہیں کر سکتے؟'' اس نے کچھ عجیب سے ہی انداز میں مجھ سے کہا تھا۔

''نہیں۔'' میں نے بدستور اپنے چہرے پر روکھے پن کا خول چڑھائے رکھا تو اس نے اچانک ہی اسی ہوشربا انداز میں کہنیوں کے بل سرک کر میرے گلے میں اپنی مرمریں بانہوں کا ہار ڈال دیا اور پھر جب اس نے بے اختیار اپنے لب میرے گال پر رکھے تو وہ مجھے دہکتے ہوئے محسوس ہوئے۔ اس کے پیاسے لبوں کی حلاوت نے پہلی بار مجھے بھی ایک لمحے کے لیے بے خود سا کر کے رکھ دیا۔ میں نے بھی اپنے اور اپنے ساتھیوں کے وسیع تر مفادات اور اہم منصوبوں کی تکمیل کی خاطر اس کی یہ جسارت برداشت کر لی۔ مگر پھر اس قبائلی حسینہ کی آورگی بڑھنے لگی تو میں نے آہستگی سے خود کو اس سے ذرا دور کر لیا۔

''مجھے نہیں معلوم تھا کہ تم مجھے پسند کرنے لگے ہو۔'' اس نے کہا۔

''کیا تمہیں محبت کے معنی آتے ہیں؟ کیا تم جانتی ہو کہ ایک مرد اور ایک عورت کا پیار کیا ہوتا ہے؟ اور...... اور کیا تم پیار صرف اسے ہی سمجھتی ہو کہ ایک عورت، کئی مردوں کے ساتھ اپنے تعلق کو استوار کرتی ہے، جس میں صرف جنسی بھوک کا حیوانی جذبہ ہی کار فرما ہوتا ہے، محبت کے جذبے کا کوئی تصور نہیں ہوتا؟''

میری بات اُس نے پہلی بار بہت غور اور دھیان سے سنی تھی شاید، اسی سبب وہ کچھ سوچتی ہوئی سی بن گئی تھی۔

''تم......! میری بات سمجھ رہی ہو؟ بس، یہی ایک پھانس ہے جو اَب مجھے تمہاری طرف بڑھنے سے روکتی ہے......''

میں نے اسے گم صم سی خاموشی میں پا کر دوبارہ کہا تو وہ جیسے اپنے پُرسوچ خیالات کے بھنور سے یک دم ابھر کر بولی۔

''ہاں! میں سمجھ رہی ہوں تمہاری بات...... تو کیا تم مجھ سے واقعی محبت کرنے لگے ہو؟''

اسے پہلی بار بے خودی و بے اختیاری سے ذرا سنجیدگی کی طرف آتے پا کر میں نے بھی من ہی من میں سکون کی سانس بھری تھی اور بولا۔ ''محبت صرف کہہ دینے سے ہی نہیں ہو جاتی باریہہ!'' میں دانستہ اب اسے اس کے نام سے ہی پکار رہا تھا۔ آسان لفظوں میں آگے بولا۔

''یہ ایک جذبہ ہے، بغیر کہے خود ہی ہو جاتا ہے۔ محبت سے پہلے انسیت ہوتی ہے، ایک لگاوٹ سی ہوتی ہے محبوب سے...... وہ اسے صرف اپنے لیے ہی دیکھنا چاہتا ہے۔ بس! یوں سمجھو تم سے کچھ اسی قسم کے ہی جذبات میں اپنے اندر محسوس کرنے لگا ہوں۔ میں تمہارے قریب ہوس کا پجاری بن کے نہیں ایک اچھا دوست بن کے رہنا چاہتا ہوں۔ دوستی، انسیت، لگاوٹ اور پھر محبت...... فردِ واحد سے محبت۔''

اس نے میری بات پورے دھیان سے سنی تھی اور اسی غور بھری نگاہوں سے وہ میرے چہرے، میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالے ہوئے تھی۔ پھر کیا ہوا اُس نے اپنی نگاہیں جھکا لیں اور چہرہ بھی......

شاید میں اسے اس کی بے راہ روی کا خاطر خواہ احساس دلانے میں کامیاب رہا تھا۔ میری بدستور مگر بھانپتی ہوئی نظریں اس کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔

میرے پاس اس کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا۔ میں اسے اور کیسے سمجھاتا اور کیسے خود سے دور رکھتا؟ کیونکہ اصل دیال داس نے اس کے ساتھ نجانے کتنی راتیں گزاری ہوں گی۔ وہ مجھے ...وہی دیال داس سمجھے ہوئے تھی اور اگر میں منصوبے کے تحت اس کے ساتھ روابط رکھتا تو مجھے بھی لامحالہ اس گندے جوہڑ میں آغشتہ ہونا پڑتا۔

لٰہذا اس سے بچنے اور باریہہ کے قریب رہنے کا ایک یہی طریقہ مجھے سمجھ میں آیا تھا کہ اسے ایک طرف بے راہ روی سے روک سکوں اور دوسری جانب اس سے اپنے نیک مقاصد کے لیے خاطر خواہ فائدے حاصل کر سکوں۔ میں تو محبت کے نام پر بھی کسی کو دھوکا دینا گناہ ہی سمجھتا تھا، مگر ایک نیک مقصد اور کسی کو بری راہ سے راہِ راست پر لانے کے لیے اگر میں باریہہ سے محبت کا کھیل کھیلنا چاہتا تھا تو یہ محبت جذبۂ انسانیت سے بھی تو تعبیر ہو سکتی تھی۔

تب ہی میں نے دیکھا کہ باریہہ اپنا منہ دوسری جانب کیے اپنا سر جھکائے ہوئے تھی، اس کی کشادہ آنکھوں سے آنسوؤں کے موٹے موٹے قطرے کھال کی دری پر ٹپک کر جذب ہو رہے تھے۔

وہ ایک عورت تھی، نازک اندام اور نازک سا دل رکھنے والی۔ قدرت نے عورت کو، خواہ وہ کسی بھی خطے کی ہو، شرم اور لجا کی جو چادر دے رکھی ہے، وہ حقیقت میں اس کا ہتھیار ہے، جو اسے ضمیر کے خلاف کوئی بھی ایسا قدم اٹھانے سے روکتا ہے۔ کوشش کرتا ہے، وہ جب تک اسے

اوڑھے رکھے گی، کوئی اس کی طرف ایک ذرا آنکھ اٹھا کر بھی دیکھنے کی جرأت نہیں کرسکتا۔ اس ہتھیار سے وہ کئی برائیوں سے بچی رہتی ہے۔

یہ سب باتیں اس سے کرنے کے دوران میں نے اس کے اندازِ تخاطب سے یہ بھی جانچنے کی کوشش چاہی تھی کہ آیا یہ واقعی میرے دشمنوں کی جاسوس تھی یا اس کی اپنی کوئی مرضی تھی؟

اب جبکہ میں نے دیکھا کہ باریہہ کے منہ زور اور بے راہ رو جذبات کا طوفان قابو میں آیا ہے تو میں بہت دھیرے سے اس کی طرف بڑھا اور پیار سے اس کے شانے پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ میرے ہاتھ کا لمس محسوس کرتے ہی وہ یک دم سسک پڑی۔

''تمہارے آنسو اس بات کا ثبوت ہیں کہ تمہیں غلط اور صحیح کا احساس ہو چکا ہے۔ میرا مطلب تمہیں دکھی کرنا ہرگز نہیں تھا۔ ہم اچھے دوست ہیں، بس تم یہ بے راہ روی کی روش چھوڑ دو...... اور میری طرف دوستی کا ہاتھ بڑھاؤ۔''

یہ کہہ کر میں نے اس کا اشکبار چہرہ اس کی ٹھوڑی کو چھو کر اپنی طرف موڑ دیا۔ اس نے میری طرف دیکھا اور میرے گلے لگ گئی۔ میں نے اسے کچھ لمحات خود سے لگائے رکھا پھر آہستگی سے علیحدہ کر دیا۔ اب میں اپنے مقصد کی طرف آیا اور ملائمت آمیزی سے بولا۔

''مجھے یقین ہے کہ تم نے یہ غلط راستہ اپنی کسی ذاتی مجبوری کے تحت ہی اختیار کیا ہوگا۔ اگر ایسی کوئی بات ہے تو مجھے بتاؤ۔ شاید میں تمہاری کوئی مدد کرسکوں؟''

وہ ایک دم میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ''کیا میں تم پر بھروسا کرسکتی ہوں؟''

میں اس کی بات پر ٹھٹکے بغیر نہ رہ سکا۔ اس کے کہنے کا انداز کچھ ایسا ہی تھا جیسے وہ مجھے کسی اہم راز سے آگاہ کرنا چاہ رہی ہو۔ میں نے فوراً اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''میرے دل میں جو تھا وہ سب کچھ میں نے تم پر بھروسا کر کے ہی کہہ دیا تھا، اب تم بھی مجھ پر اسی طرح کا بھروسا کر سکتی ہو، کیا خبر ہم ایک دوسرے کے کسی کام آسکیں، باقی یہاں کے حالات مجھے کچھ تسلی بخش نظر نہیں آتے۔'' کچھ اندازہ کرتے ہوئے اور لگے ہاتھوں میں نے اندھیرے میں تیر بھی چلا دیا۔ وہ بولی۔

''تم ان لوگوں کے ساتھی ہو، جنہوں نے ہماری زمین پر زبردستی قبضہ جما کر نہ صرف ہمیں اپنا غلام بنا لیا ہے بلکہ ہم پر ظلم و ستم کا بھی بازار گرم کر رکھا ہے۔ مگر میں نے یہ بھی محسوس کیا ہے کہ ان کے کچھ ساتھی ایسے ہیں جو اُن کے زرخرید ملازم سہی مگر وہ یہاں سے تنگ آئے ہوئے ہیں، شاید تمہارے علم میں یہ بات بھی ہو کہ کچھ ایسے لوگوں نے یہاں سے فرار ہونے کی بھی کوشش کی تھی، مگر وہ مارے گئے۔''

''ہاں!'' میں نے اِثبات میں اپنے سر کو جنبش دی۔ مجھے کبیل دادا نے یہ بتایا تھا، میں خود بھی انہی لوگوں میں سے ہوں۔'' میں نے اسے مزید اپنایا اور اس کا ہم خیال بناتے ہوئے کہا تو وہ مزید بتانے لگی۔

''یہ لوگ فقط ان لوگوں سے ہی سجے ہیں جو اُن کے قریبی ساتھی ہیں، اگرچہ ان کی تعداد کم ہے مگر وہ اتنی قوت میں ہیں کہ انہوں نے بڑی کامیابی کے ساتھ ان پر طاقت اور پیسے کے بل بوتے پر اپنا تسلط جما رکھا ہے۔'' وہ اتنا کہہ کر رکی تو میں نے اسے مزید کھولنے کے لیے یہ بھی بتایا۔

''میرے علم میں یہ بھی ہے کہ تمہارے قبیلے جاوا کے سردار موغا کو کلی منجارو اور اس کے حلیف جنرل ایڈوانی نے ہلاک کر ڈالا تھا۔ مگر خوش قسمتی سے اس کا جوان بیٹا شنگرال اور بیٹی نتالیہ اپنے چند جنگجو محافظ ٹولے سمیت فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے۔

اس کے چند روز بعد ہی ہمارے (ایڈوانی وغیرہ کے) جاسوسوں نے بتایا کہ جاوا کا یہ بچا کھچا ٹولا جزیرے کے کسی گمنام گوشے میں اپنی طاقت سمیٹنے میں مصروف ہے اور کسی وقت بھی حملہ کرنے والا ہے۔ لیکن...... میرا نہیں خیال کہ وہ لوگ ان کا مقابلہ کرسکیں، یہ لوگ (ایڈوانی وغیرہ) طاقت میں ان سے کئی گنا ہیں۔ اس لیے کہ ان کی سرکردگی میں بھارت کا ایک بڑا ریٹائرڈ آرمی آفیسر ہے اور اس کی پشت پر اس کے اپنے ہی لوگ نہیں بلکہ چند دوسرے ملکوں کے جرنیل شامل ہیں۔''

میں اتنا کہہ کر رکا تو یہ جاوا حسینہ پوری طرح کھل گئی، پھر اس نے مجھ سے کچھ نہیں چھپایا، الف سے ی تک ساری رام کتھا سنا ڈالی، جس کے مطابق باریہہ خود شنگرال اور نتالیہ کے جنگجو ٹولے کی جاسوس تھی اور یہاں دشمنوں کے بیچ میں ان کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کے لیے مجبوری کے تحت ایک فاحشہ عورت کا بہروپ بھرا تھا۔

''اگر یہ بات ہے تو پھر تم اپنی قوم اور قبیلے کے لیے بڑی قربانی دے رہی ہو، ان کی آزادی اور ان غاصبوں کو اپنی سرزمین سے نکالنے کے لیے تم اس مٹھی بھر جنگجو ٹولے

کے ہاتھوں کو مضبوط کررہی ہو۔ لیکن یہ کام اور طریقے سے بھی کرنے کا تم سوچ سکتی تھیں۔'' میں نے کہا۔

''میرے پاس اس کے سوا اور کوئی راستہ ہی نہیں تھا۔'' وہ سادہ انداز اور لب و لہجے میں بولی۔ ''ورنہ میں بھی ان کی قید میں ہوتی یا پھر ماردی جاتی۔''

میں نے اس بحث میں پڑے بغیر، تیزی سے سوچتے ہوئے ذہن کے ساتھ اس سے سنجیدہ لہجے میں پوچھا۔ ''ٹھیک ہے، مگر یہ تو بتاؤ کہ تم اپنی عزت کی اب تک کتنی قیمت چکا چکی ہو؟ میرا مطلب ہے تم اپنے اصل مقصد میں کہاں تک کامیاب ہوسکی ہو؟''

''میں وجے اور تمہیں شراب اور شباب کے نشے میں ان سے اپنے مطلب کے راز اگلوانے کی کوشش میں تھی۔ مگر تم چونکہ نئے بھرتی ہوئے تھے اس لیے تم سے ابھی تک میں خاطر خواہ اپنے مطلب کی باتیں نہیں اگلوا پائی تھی، کیونکہ تم کچھ زیادہ جان کاری نہیں رکھتے تھے، کم و بیش وجے کا بھی یہی حال تھا، البتہ رتن لال اور بلراج سنگھ کے قریب پہنچنا ہی درحقیقت میرا اصل ٹارگٹ تھا۔

یہاں کے اصل اور اندر کے رازوں سے ان دونوں کو ہی آگاہی تھی، مگر بدقسمتی سے میں ابھی تک ان دونوں میں سے کسی ایک تک بھی رسائی حاصل نہیں کرپائی ہوں، اگرچہ اپنی کوشش میں نے ترک نہیں کی ہے۔ اس میں ان دونوں کی غیر معمولی محتاط پسندی کا دخل تھا۔

بلراج سنگھ تو اپنی ناک پر مکھی تک نہیں بیٹھنے دیتا ہے، جبکہ رتن لال عیاش پرست تو ہے مگر وہ بلراج سنگھ سے بہت دبتا ہے۔ اگرچہ نیچے کے سارے معاملات رتن لال ہی دیکھتا ہے، ہدایات وہ بلراج سنگھ سے لیتا ہے۔

میں وجے اور تمہارے ذریعے رتن لال اور بلراج سنگھ تک رسائی حاصل کرنا چاہتی تھی، جس میں مجھے ابھی تک کوئی کامیابی نہیں حاصل ہوئی تھی، تاہم میں ناامید بھی نہیں تھی، پھر جلد ہی مجھے اندازہ ہونے لگا کہ میں تم دونوں سے کوئی اور کام تو لے ہی سکتی ہوں، یعنی اپنی دوستی کا دم بھرتے ہوئے ان سے انڈین آرمی آفیسر ایڈوانی کی ملازمت حاصل کرلوں۔ تم نے تو نہیں البتہ وجے نے اس کا وعدہ ضرور کررکھا ہے۔ دیکھو اب کب وہ اپنا وعدہ پورا کرتا ہے۔''

وہ یہاں تک بتا کر خاموش ہورہی۔ میں پُرغور انداز میں ہونٹ بھینچے اس کی سن رہا۔ وہ اب تک بالکل صحیح خطوط پر کام کررہی تھی۔ تنہا رہتے ہوئے اپنے جاوا قبیلے کے لیے اس کی اتنی کوششیں بھی کم نہ تھیں۔ اسے اپنی جان کی پروانہ تھی، وہ بس ان غاصبوں کو اپنی دھرتی سے نکالنا چاہتی تھی۔

اس حساب سے ہم دونوں اب ایک ہی کشتی کے سوار تھے۔ اب مجھے بھی اس سے کچھ نہیں چھپانا چاہیے تھا، ہم ایک دوسرے کے کام آسکتے تھے۔

اب میرے مطمحِ نظر فوری طور پر دو اہم مقاصد تھے۔ پہلا تو یہ کہ اپنے تینوں ساتھیوں سمیت مجھے یہاں سے نکلنا تھا اور دوسرا جنرل کے ایل ایڈوانی کو جہنم رسید کرنے سے پہلے اس کے قبضے سے اپنے وطنِ عزیز کی وہ امانت حاصل کرنا تھی، جس کی خاطر ہشام چھلگری نے اپنی جان قربان کردی تھی اور طلسم نور ہیرے کی آڑ میں جو بھیانک عالمی سازش کھیلی جارہی تھی، اسے ناکام بنانا بھی تھا۔ جبکہ یہاں وہ یعنی ایڈوانی کیا کھیل کھیل رہا تھا اسے بھی بے نقاب کرنا ضروری تھا۔

میں اب یہ غور کررہا تھا کہ جاوا قبیلے کی یہ بلیک کوئن باریہہ میرے کس حد تک کام آسکتی تھی۔ اس کا جواب اثبات میں تھا کہ وہ جن خطوط پر کام کررہی تھی، اسے کچھ ترامیم کے ساتھ کرنے دیا جاتا۔

یہی کچھ سوچتے ہوئے ایک خیال بجلی کی تیزی کے ساتھ میرے ذہن میں آیا اور میں نے باریہہ سے کہا۔ ''باریہہ! میں نے بھی تم سے کچھ نہیں چھپایا، اس لیے کہ میں سمجھ رہا ہوں، ہم دونوں ایک دوسرے کے بہتر طور پر کام آسکتے ہیں، یہاں میرے بھی کچھ ساتھی قید و بند کی زندگی گزار رہے ہیں، مگر میرا مقصد صرف انہیں رہائی دلانا ہی نہیں ہے، بلکہ اس خبیث آرمی آفیسر (جنرل کے ایل ایڈوانی) کو بھی ان کے حواریوں سمیت جہنم واصل کرنا ہے۔ مجھے لگتا ہے یہ تمہاری دھرتی پر اپنے کسی خاص مقصد کے لیے قابض ہوا ہے۔ اس کا بھی کھوج لگانا ضروری ہے۔'' یہ کہتے ہوئے میں اب اصل بات کی طرف آنے لگا۔ وہ بڑی توجہ سے میری بات سننے میں محو تھی۔ میں ایک ذرا توقف کے بعد بولا۔

''اب تم مجھے یہ بتاؤ کہ کیا تمہارا اب بھی شنگرال اور نتالیہ سے کوئی خفیہ رابطہ ہے؟''

یہ کہتے ہوئے میں نے اس کے چہرے پر اپنی نظریں جمادیں۔ اس نے جواب دینے کے لیے منہ کھولا مگر پھر رک گئی۔ ایک نگاہ مڑھی کے دروازے پر ڈالی اور پھر اپنے ہونٹوں پہ ایک انگلی رکھ کر وہ اپنی جگہ سے اٹھی، دروازے تک گئی، دروازے پر جھولتا کھال کا ٹاٹ

ذرا پرے کر کے باہر جھانکا اور پھر واپس پلٹ آئی۔ میں بڑے غور سے اس کی حرکات وسکنات کا جائزہ لینے میں محو تھا۔

''ہاں!'' اس نے میرے قریب آکر نیچی آواز میں کہا۔ ''شنگرال اور شالیہ سے میرا رابطہ رہتا ہے۔ میں جان پر کھیل کر ان کی خفیہ کمین گاہ میں جا کر ملتی ہوں اور انہیں یہاں کی تازہ صورتِ حال سے آگاہ کرتی رہتی ہوں۔ وہ دونوں بہن بھائی مجھے نئی ہدایات دیتے رہتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ جنرل ایڈوانی یہاں اپنی اسٹیٹ ڈارک کیسل بنا کر مہاراجا بننے کے خواب دیکھ رہا ہے۔''

''وہ بالکل ٹھیک کہتے ہیں، لیکن جنرل ایڈوانی کا اس کے پیچھے بھی بہت اہم مقصد ہے، ہمیں اصل میں اسے سبوتاژ کرنا ہے۔'' میں نے کہا۔

''جنرل کی پشت پہ ایک بہت بڑی عالمی طاقت ہے، وہی اسے سپورٹ کر رہی ہے۔ خیر! مجھے بتاؤ۔''

''تو تم ان کی خفیہ کمین گاہ سے بھی واقف ہو۔'' میں نے پُرغور لہجے میں اس سے کہا۔ ''وہ خود اب تک کیا کر رہے ہیں اور کتنی تعداد میں ہیں؟''

''وہ اپنی افرادی قوت جمع کرنے اور طاقت اکٹھی کرنے میں مصروف ہیں، مگر ابھی وہ ان پر حملہ کرنے کی قوت میں نہیں آئے ہیں۔'' باریہہ نے جواب دیا۔

''اس کی بڑی وجہ یہی ہے کہ بلراج سنگھ نے جاوا قبیلے کو اپنا قیدی رعایا بنا رکھا ہے۔ جان بوجھ کر ایسے لوگوں کو جو جوان اور توانا ہیں، ان سے بیگار لی جاتی ہے اور اپنی قید میں رکھا ہوا ہے۔ اس بات کا تو انہیں بھی پتا ہے کہ جاوا قبیلے کا سرداری ٹولا جو سردار موغا کے بچھڑے ہوئے اور بے خانماں خاندان سے تعلق رکھتا ہے وہ کسی دشوار گزار اور دور افتادہ گوشے میں کہیں چھپا ہوا ہے۔ یہ انہیں باوجود کوشش کے ابھی تک تلاش تو نہیں کر سکے ہیں مگر ان کی طرف سے اچانک حملے کے لیے بھی ہر وقت تیار رہتے ہیں۔ انہیں یقین ہے کہ وہ مٹھی بھر جاوا جنگجو ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گے۔''

''ہم......'' میں نے ایک پُرسوچ سی ہنکاری خارج کی اور پھر کچھ سوچ کر بولا۔ ''باریہہ! کیا تم ضرورت پڑنے پر مجھے شنگرال اور ان کے ساتھیوں سے ملوا سکتی ہو؟''

''ہاں! کیوں نہیں......'' اس نے فوراً اثبات میں اپنا سر ہلا دیا۔

''بس! تو پھر ٹھیک ہے، تم لوگ مجھے بھی اپنا ساتھی سمجھو۔'' میں نے فوراً کہا۔ ''اور...... یہ بھی سن لو کہ میں دیال داس نہیں ہوں، بلکہ میں نے اسے ہلاک کر کے اس کا بھیس بھر رکھا ہے۔ مجھے بس تم ایک دوست کہہ سکتی ہو۔ اب مجھے یہ بتاؤ کہ موجودہ حالات میں تمہارا اگلا منصوبہ کیا ہوگا؟''

میری بات پر وہ کچھ سوچتے ہوئے بولی۔ ''میرا جو منصوبہ ہے تم اس سے واقف ہو ہی چکے ہو۔ بلکہ اب تو تم بھی میرے ساتھ شامل ہو چکے ہو۔ ہم مل کر اگلا کوئی لائحہ عمل تیار تو کر ہی سکتے ہیں۔''

''یہ تم نے بہت اچھی بات کہی، دیکھو جب تک ہمارا راز آشکار انہیں ہوتا، سمجھو ہم نصف کامیاب ہیں، کیونکہ اس وقت ہم جلتے ہوئے آتش فشاں کے بالکل دہانے پر کھڑے ہیں۔ ہماری ذرا سی غلطی یا جلد بازی یا یوں سمجھ لو کہ معمولی سی تکرار اور باہمی اختلاف نہ صرف ہمیں ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا سکتا ہے بلکہ جان گنوانے کے ساتھ ساتھ ہمارا سارا منصوبہ بھی ناکام ہو سکتا ہے۔''

آخری بات میں نے پیشگی اور حفظِ ماتقدم کے طور پر اس سے کہی تھی۔ وہ بھی خاصی سمجھدار تھی، میرا اشارہ سمجھتے ہوئے اس نے فوراً اپنے سر کو اثبات میں جنبش دی تھی۔ تاہم اس کے بعد بھی میں نے اپنی اس آخری بات کی وضاحت کرتے ہوئے اس پر یہ باور کرا دیا کہ وہ موقع نکال کر پہلی فرصت میں شنگرال وغیرہ سے مل کر اس نئی صورتِ حال سے آگاہ کرے اور جب تک ہماری طرف سے کوئی ''اشارہ'' (گرین سگنل) نہ ملے وہ کوئی ایسی ویسی حرکت نہیں کریں گے جو قبل از وقت ہو اور ہمارے لیے مشترکہ نقصان کا بھی سبب بنے۔

اس نے میری بات کا ادراک کرتے ہوئے فوراً اپنے سر کو اثباتی جنبش دی تھی۔ اس کے بعد میں اس سے کچھ مزید گفتگو، ہدایات کی صورت میں کرنے کے بعد اس کی مڑھی سے چلا آیا۔

رات کی تاریکی میں اپنے پکّے والے جھونپڑے میں پہنچا تو وجے لمبی تانے سویا خراٹے لے رہا تھا۔ جنگل کی فضا رات میں مرطوب ہونے لگی تھی، جس کے باعث ٹھنڈ میں اضافہ ہونے لگا تھا۔ جزیروں کے موسم بھی صحراؤں جیسے ہوتے ہیں، یعنی دن میں جھلستی گرمی اور راتوں میں ٹھٹھرتی ہوئی ٹھنڈ۔

نیند کا خمار مجھے بھی چڑھا ہوا تھا مگر خیالات کی یلغار سے دماغ جاگا ہوا تھا۔ اول خیر اور شکیلہ سے بھی ملاقات ہو چکی تھی میری۔ کبیل دادا کے ساتھ تو میں آج تھا ہی،

بار یہ سے بھی اہم معاملات طے ہوچکے تھے۔ تقدیر ساتھ دے رہی تھی اور مجھے اس سنہری موقعے سے فائدہ اٹھانا تھا۔ بے شک یہ عمل سست رو سہی مگر نتیجہ خیز ثابت ہوسکتا تھا۔

رات کے شاید آخری پہر ہی میری آنکھ لگی تھی کہ علی الصباح اس کم بخت وجے نے مجھے پیروں کی ٹھوکریں مار کر جگا دیا۔ مجھے اس طرح جگانے پر غصہ تو بہت آیا مگر اسے مجبوریِ وقت جان کر پی گیا۔

''چل بے اٹھ! کیا دن چڑھے تک سوتا رہے گا۔ لگتا ہے اس کالی کتیا نے تمہیں ساری رات اپنے ساتھ بزی رکھا ہے۔'' وہ لوفرانہ ہنسی سے بولا۔ اس کے عامیانہ پن پر میں نے بھی سر جھٹک کر ہنسنا ضروری سمجھا اور اس سے بولا۔

''یار! اس نے تو شراب پلا کر مجھے سلا ہی دیا تھا۔ وہ مجھ سے کچھ زیادہ التفات نہیں جتا رہی تھی۔''

''کیا مطلب؟'' وہ بھویں اچکا کر بولا۔

''لگتا ہے کالی کوئن تجھے زیادہ پسند کرنے لگی ہے۔ تو شاید اسے پیاسا چھوڑ کر جلدی لوٹ آیا تھا۔ میرے ساتھ تو اس نے کسی خاص التفات کا اظہار نہیں کیا تھا۔'' میں نے جان بوجھ کر ایسا کہا تھا اس سے...... فخر و غرور سے اس کی باچھیں پھیل گئیں۔

''سچ بتا وجے جانی! تو نے اس کالی پری پر کیسا جادو کیا ہے؟'' میں نے اسے مزید چڑھایا تو وہ سینہ پھلا کر بولا۔

''ہاں، یار! کہتا تو سچ ہے تو بھی، سالی جب بھی میرے ساتھ ہوتی ہے، چپکتی ہے تو چھوڑتی ہی نہیں۔ اچھا چل اوپر جا...... ناشتا گاڑی آنے والی ہے۔ یہ لوگ بھی بلراج اور رتن کے جاسوس ہوتے ہیں۔ ہمیں پکٹے کے بجائے یہاں بیٹھا دیکھیں گے تو شکایت کردیں گے۔'' اس نے آخر میں کہا اور پھر ہم اپنی گنیں تھامے اوپر پکٹے کے چبوترے میں آگئے۔

ابھی ہمیں یہاں بیٹھے تھوڑی ہی دیر گزری ہوگی کہ میری سماعتوں سے ایک کھڑکھڑاتی ہوئی آواز ٹکرائی۔ وجے نے مجھ سے کہا۔ ''جا اوئے دیالے! نیچے جاکے ان سے ناشتا پکڑ لے، ورنہ نکل جائیں گے یہ لوگ آگے۔''

جیسا کہ میں بتا چکا ہوں کہ دیال داس نیا بھرتی ہوا تھا اور اسی لیے شاید یہ مردود وجے اس پر اپنا حکم چلاتا تھا۔ ناچار میں نے بھی اثبات میں اپنا سر ہلا دیا اور گن سنبھال کے پکٹے سے نیچے اترنے لگا۔ ایک پرانی سی جیپ تھی جس کے پیچھے ٹرالی لگی ہوئی تھی۔ اس پر دو افراد بیٹھے تھے، ان کے اریب قریب میں چھوٹے بڑے دیگچے رکھے ہوئے تھے۔ میں نے ان کی طرف دیکھ کر ہاتھ ہلایا اور جھونپڑے میں گھس کر برتن نکال لایا۔ گن میں نے اسٹریپ کے ساتھ کاندھے پر جھلا دی تھی۔ خالی برتن سنبھالے میں ان کے قریب آگیا۔ ایک موٹے سے آدمی نے بڑے سے کفگیر سے سوپ نکال کر بھرا، پھر چائے دی، ابلے ہوئے انڈے، بریڈ اور مکھن اور ایک بڑی سی پلیٹ میں حلوہ ٹائپ کی کوئی لیپ دار شے ڈال دی۔ اس کے بعد وہ آگے بڑھ گئے۔ میں یہ ساری چیزیں لیے اوپر آگیا۔

وجے اور ہم خاموشی سے ناشتا کرنے لگے۔ میں نے تو صرف ابلے ہوئے دو عدد انڈے کھائے اور چائے پی تھی، جبکہ وجے ندیدوں کی طرح ساری اشیا چٹ کر گیا تھا۔

اس کے بعد ہم اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگے۔ میں نے وجے کے ''ویوز'' لینے کے لیے اس سے خود کلامیہ انداز میں کہا۔ ''یار! میں نے سنا ہے ہمارے جیسے جو لوگ رتن لال اور چھوٹی سرکار (بلراج سنگھ) کے قریبی ملازم ہیں، ان کے بڑے عیش ہوتے ہیں۔ کاش! ہم بھی ایسے ہی ہوتے۔''

''اسی طرح کوئی شکایت کا موقع دیے بغیر اگر کام کرتے رہے تو ہماری بھی پیشی ہوجائے گی ایک دن......'' وجے سگریٹ کے کش لگاتے ہوئے بولا اور ایک میری طرف بھی بڑھا دی۔ کبھی کبھی شوقیہ میں بھی پی لیا کرتا تھا۔ سو میں نے لے لی اور سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھ کر بولا۔

''پیشی؟ کیسی پیشی؟''

''اس کا یہاں مطلب ترقی ہوتا ہے۔'' اس نے وضاحت کی۔ ''تیری تو ابھی دور دور تک کی آشا نظر نہیں آتی، پر تو مجھے تو ہے۔''

پتا نہیں وہ شیخی مار رہا تھا یا سچ بول رہا تھا، کیونکہ گزشتہ روز کی اس کے ساتھ ہونے والی گفتگو سے میں نے یہی اندازہ لگایا تھا کہ وہ خود بھی یہاں کی نوکری سے بیزار رہا تھا، مزید براں اس نے اپنے خوف کا بھی اظہار کیا تھا اور اپنے دوستوں، اشوک اور مہترا کی بھی مثال دی تھی۔ جو فرار کی کوشش میں خاموشی کے ساتھ موت کی نیند سلا دیے گئے تھے۔ مگر اس نے یہ بھی کہا تھا کہ یہاں آنے سے پہلے اس کی اپنی زندگی کسی تیسرے درجے کے رہزن کی سی تھی جسے عرف عام میں ''اسٹریٹ اسنیچر'' کہا جاتا تھا۔ وہ ممبئی کے تاریک ٹھٹھرتے فٹ پاتھوں پر راتیں بسر کرتا تھا، جبکہ یہاں اسے نسبتاً آرام تھا، مگر آزادی اس کی سلب ہوچکی تھی۔

بہرکیف...... ممکن تھا کہ یہاں اتنا عرصہ رہتے ہوئے اس نے اپنی کچھ ”ٹور“ بنالی ہو۔ لہٰذا میں نے قدرے چونک کر اس سے پوچھا۔

”پر یار! تُو تو خود یہاں کی نوکری سے بیزار تھا اب یہ اچانک کیسے تجھے یہاں رہتے ہوئے پیشی یا ترقی کا خیال آگیا؟“ تو وہ ہنس کر بولا۔

”کل رات کو جب تو اس بلیک کوئن کے پاس گیا تھا تو رام گوپال اور اجے سنگھ میرے پاس آئے تھے۔ وہ بتارہے تھے کہ باہر کے جن ملازموں نے اپنی اچھی کارکردگی دکھائی ہے ان میں سے سات افراد کی چھوٹے سرکار کے پاس پیشی ہونے والی ہے۔ ان میں ہم لوگ بھی شامل ہیں، اور پھر رتن لال تو سسرا ہمارا ہی آدمی ہے۔ وہ ہماری سفارش ضرور کرے گا۔ ہمارے اس کے ساتھ اچھے تعلقات جو رہے ہیں۔“

میں نے اس سے خوش آمدانہ لہجے میں کہا۔ ”یار وجے! میں نے بھی تیری خدمت کی ہے۔ یار! تیری اگر پیشی ہوجائے تو میری بھی رتن لال یا چھوٹی سرکار سے سفارش کر دیجیونا......“

وہ میری بات سن کر ہنسنے لگا۔ پھر اپنے سر کو اثبات میں جنبش دیتے ہوئے بولا۔ ”ہاں...... ہاں! کردوں گا تیری بھی سفارش، پہلے مجھے تو آگے بڑھ جانے دے۔“

”لگتا ہے تیرے چھوٹی سرکار سے اچھے تعلقات ہیں۔“

”ہاں...... ! چھوٹی سرکار سے تو نہیں پرنتو اس سسرے رتن لال سے میرے اچھے تعلقات ہیں۔“

”اچھا!“ میں نے قدرے توصیفی حیرت سے اس کی طرف دیکھ کر کہا تو وہ بولا۔

”رتن لال اپنا یار ہے۔ اسی نے تو مجھے یہ خوش خبری سنائی تھی کہ میں بہت جلد پیشی چڑھنے والا ہوں۔“ یہ سن کر میں نے فوراً اس کے کاندھوں کو دبانا شروع کردیا اور بولا۔

”ارے یار! پھر تو تیرا کام سمجھو ہوا پڑا ہے، پر یار اپنے اس خدمت گار کو مت بھول جانا، میری بھی رتن لال سے سفارش کردینا، تاکہ میں بھی پیشی چڑھ جاؤں۔“

”ہاہا...... ہاہا...... ضرور ضرور، کیوں نہیں......“ وہ بولا، پھر اس نے مجھے جھونپڑے سے شراب کی بوتل لے کر آنے کا کہا۔ میں اٹھ کر ڈھلان سے نیچے آگیا اور اس کے لیے بوتل لے آیا۔ وہ مے خوری میں لگ گیا۔ جب میں نے اسے دوسرا پیگ بنا کر دیا تو وہ دوسرا بھی نصف چڑھا کر ٹن ہونے لگا۔

”یار! ایک بات تو بتا، تیری رتن لال سے اتنی گہری یاری ہے تو تجھے پتا تو ہوگا کہ آخر یہاں ہو کیا رہا ہے؟ دوسرے لوگوں کی طرح مجھے بھی یہ تجسس ہوتا ہے کہ پتا تو چلے آخر یہاں کون سے اتنے بڑے پروجیکٹ پر کام ہورہا ہے؟“

اس نے ایک ہچکی لی اور ترنگ میں بولا۔ ”بڑے مزے ہیں بے اِدھر...... میں تو دعا کرتا ہوں کہ یہ پروجیکٹ اسی طرح چلتا رہے اور ہم بھی دھندے سے لگے رہیں۔“

وہ میری اصل بات گول کرگیا، میں نے بھی اس کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے دوبارہ کہا۔ ”یار! اسی لیے تو پوچھ رہا ہوں کہ یہاں کا ماحول اور کام اب مجھے بھی اچھا لگنے لگا ہے، چاہتا ہوں اِدھر ہی رہوں اور ان کا کام ختم ہی نہ ہو۔“

”ہاں! یہاں صرف قیدیوں کی زندگی ہی قابلِ رحم ہے، ہماری نہیں، اور اگر ہماری پیشی (ترقی) ہوجاتی ہے تو سمجھو پوہ بارہ......“ وہ تھوڑا رک کر نشے کی پینگ میں میرے آخری سوال کے جواب میں بولا۔

”ویسے اِدھر کا کام ختم کدھر ہوگا سسرے! ان سالوں نے یہاں بہت بڑا خزانہ دریافت کر رکھا ہے اور یہ سالے جزیرے کے اس حصے کو ایک اسٹیٹ بنانے والے ہیں، ڈارک کیسل کی تعمیر اس کی کھلی مثال ہے۔ اسی لیے تو رام گوپال اور اجے سنگھ کہہ رہے تھے کہ جتنی جلد ہماری پیشی ہوجائے اتنا ہی بہتر ہے، پھر ڈارک کیسل اور اسٹیٹ بن جانے کے بعد ہماری ٹور ہی نرالی ہوجائے گی اور ان سارے ملازموں کی جو اُن کے منظورِ نظر اور وفادار کہلاتے ہیں۔“

میں ابھی اس سے مزید کچھ پوچھنے والا تھا کہ اچانک نیچے سے کسی نے آواز لگائی۔ ہم نے چونک کر اپنی گردنیں موڑ کر عقب میں نیچے کی طرف دیکھا۔ ایک خاصا تیم شیم گن بردار شخص ڈھلان کے قریب کھڑا ہاتھ ہلا رہا تھا۔ میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا تھا۔

”اوئے، یہ تو اجے ہے۔“ دوسرے ہی لمحے وجے نے یہ کہہ کر میری پریشانی دور کردی۔

”آجاؤ...... آجاؤ......“ اس نے بھی اپنا ہاتھ ہلا دیا۔

”نیچے آؤ وجے! تم سے ایک ضروری بات کرنا ہے۔“ اجے نے دور ہی سے ہانک لگائی تو وجے نے مجھے ادھر ٹیلے پر ہی بیٹھے رہنے کی تاکید کی اور نیچے چلا گیا۔

اجے یقیناً اجے سنگھ ہی تھا۔ وجے کا دوست، ایک اور ان کا دوست تھا، رام گوپال۔

میں نے اپنی گن سنبھالی ہوئی تھی اور گردن ذرا موڑے ان کی طرف دیکھنے لگا۔ اجے سنگھ نے ایک نظر اوپر میری طرف ڈالی تو میں نے مسکرا کر خیر مقدمی انداز میں اپنا ہاتھ ہلا دیا۔ کیونکہ اگر اجے سنگھ اور رام گوپال وجے کے دوست تھے تو یقیناً ان کی دیال سنگھ کے ساتھ بھی دعا سلام ہو سکتی تھی، مگر میں نے دیکھا کہ اجے نے کوئی جواب نہ دیا اور وجے سے ہاتھ ملا کر اسے جھونپڑے کی طرف لے گیا۔

دونوں جب اندر چلے گئے تو جانے کیوں میری چھٹی حس نے مجھے کسی نامعلوم سی کھٹک کا ٹھوکا دیا۔ میں بے چین سا ہو گیا۔ اجے نے آخر صرف وجے کو ہی نیچے کیوں بلایا تھا؟ وہ اوپر بھی آ سکتا تھا، کہیں وہ وجے سے کوئی اہم بات تو نہیں کرنے آیا تھا؟

میں نے یونہی ایک نگاہ اطراف میں ڈالی اور پھر بہ ظاہر ایک مختصر سے گشت کے انداز میں ایک طرف کو اٹھ کر چل دیا، اس کے بعد مڑھی نما اس جھونپڑے کی عقبی سمت سے نیچے اترنے لگا اور بہت دبے پاؤں چلتا ہوا اس کی ایک دیوار کے قریب چلا گیا۔

سورج سوا نیزے پر چمکنے لگا تھا۔ گرمی بڑھتی جا رہی تھی اور بادِ سموم چہرے کو جھلسائے دے رہی تھی۔ اس کی وجہ یہی تھی کہ مغربی گوشے میں ایک بڑا صحرا تھا اور ہوا اب اسی سمت سے آرہی تھی۔

دیوار کے پاس ایک کھڑکی تھی۔ میں اس کے قریب جا پہنچا، سالخوردہ ساپٹ پہلے ہی ایک طرف کو ہٹا ہوا تھا، البتہ وہاں ایک چیتھڑا سا ٹاٹ جھول رہا تھا، میں نے ہاتھ آگے بڑھا کر اسے پرے ہٹا دیا تو سامنے ہی مجھے وہ دونوں بیٹھے آپس میں باتیں کرتے دکھائی دے رہے تھے۔ اجے اسے کچھ سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا جبکہ وجے کے چہرے پر بڑے پُرسوچ اور گمبھیر تاثرات تھے۔

''کیا سوچنے لگا رے......؟ چنتا مت کر، ہمت کر، پھر دیکھ پو بارہ ہیں تیرے میرے......'' اجے سنگھ اس سے نیچی آواز میں کہہ رہا تھا۔

''یہ جگہ بہت جلد ایک اسٹیٹ کی حیثیت بننے والی ہے۔ اس لیے کہ اسے چند بھارتی اہم شخصیات کی پشت پناہی حاصل ہے، جو اس اسٹیٹ کو ایک باقاعدہ آزاد ریاست کا درجہ دلوانے والے ہیں، اور بھارتی حکومت کو بھاری رائلٹی دینے کے علاوہ دیگر وسیع تر ملکی فوائد کا لالچ بھی اس میں کارفرما ہوگا۔ جنرل ایڈوانی مہاراجا بننے کے خواب دیکھ رہا ہے، ڈارک کیسل کا بھی کام آخری مراحل میں ہے۔ اسی لیے چھوٹی اور بڑی سرکار کو اپنے وفاداروں کی تعداد بڑھانے کی ضرورت پیش آگئی، اسی کارن عنقریب پیشی ہونے والی ہے۔'' اجے سنگھ نے اپنی بات پوری کی تو وجے بولا۔

''پر یار! ہمیں تو آشا ہے کہ ہم اس چھوٹی اور بڑی سرکار کی اس پیشی پر پورا اتریں گے، پھر ہمیں اس کھٹ راگ میں پڑنے کی کیا ضرورت ہے؟''

''یہی بات تو تیری بدھی میں نہیں سما رہی ہے بے وقوف! یہ تمہاری خوش فہمی ہے۔'' اجے سنگھ جواب میں بولا۔

میں دھڑکتے دل اور پورے دھیان سے اُن کی یہ خفیہ گفتگو سن رہا تھا اور مجھے ان کی باتوں سے بہت اہم اور سنسنی خیز انکشافات کی بُو آتی محسوس ہو رہی تھی۔

اجے سنگھ اس سے کہہ رہا تھا۔ ''یہ ضروری تو نہیں کہ ہمیں بھی پیشی کے لیے منتخب کیا جائے۔ آشا کی بات الگ ہے مگر ہم محض ایک امید کے سہارے پر تو ہاتھ پر ہاتھ رکھے نہیں بیٹھ سکتے ناں! فرض کرو پیشی ہو بھی جاتی ہے تو یہ کیا ضروری ہے ہمیں ہی منتخب کر لیا جائے؟ اور بھی تو بہت لوگ ہیں۔''

''تم آخر کہنا کیا چاہ رہے ہو؟ ذرا کھل کر بولو ناں اجے؟'' وجے نے اس سے نیچی آواز میں کہا۔

''پتے کی بات ہی کہوں گا جو میں سن رہا ہوں وجے!'' اجے سنگھ نے نہایت رازداری سے کہا۔ ''اس پیشی میں جو بھی انتخاب ہوگا، وہ صرف پرانے نمک خوار ملازموں کی کسوٹی پر ہی نہیں کیا جائے گا، بلکہ اس میں وفاداری اور ایسا کام دیکھا جائے گا جس سے انہیں اندازہ ہو سکے کہ ہم بننے والی اسٹیٹ اور ڈارک کیسل کے صحیح وفادار ہیں...... ایک بار ہم اسٹیٹ اور ڈارک کیسل کے وفادار ملازموں میں شامل ہو گئے تو سمجھو وارے نیارے...... بہت مراعاتیں اور دولت کمائیں گے ہم، تم نے وہ مثال سنی ہے ناں کہ شاہ کے نوکر بھی شاہ...... بس! ہم بھی شاہ کے نوکر کہلائیں گے تو سمجھو کیا حیثیت ہوگی ہماری، خوب ٹھکا ہوگا ان شاہی ملازمین کا۔''

''تو ہمیں آخر کس طرح اپنی وفاداری دکھانی ہوگی کہ ہماری ترقی یقینی ہو جائے؟''

وجے نے اس بار غیر معمولی دلچسپی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا تو اجے سنگھ مکروہ مسکراہٹ سے بولا۔ ''اب کی ناں سسرے تو نے بدھی سمان بات، سن رے! اشوک اور مہترا کے ساتھ کیا ہوا تھا؟ جانتے ہو ناں؟'' اس کی بات پر وجے نے ہونقوں کی طرح اپنا سر ہلا یا۔

''انہوں نے یہاں سے فرار ہونے کی کوشش کی تھی اور جن دو افراد نے انہیں گھیر کر ہلاک کیا تھا وہ اب کہاں ہیں؟''

''کہاں ہیں؟''

''وہ بغیر پیشی کے ہی ترقی پا چکے ہیں اور اس وقت اسٹیٹ اور ڈارک کیسل کی دوسری قطار کے وفاداروں میں اُن کا شمار ہونے لگا ہے، اس سے اندازہ کرو کہ یہاں سے فرار ہونے کی کوشش کرنے والے چھوٹی اور بڑی سرکار کی نظروں میں کس قدر خطرناک اور اہم مجرم تصور کیے جاتے ہیں۔''

''ہاں! یہ تو ہے، اسی لیے تو میں نے یہاں سے بھاگنے کا خیال ہی اپنے دل سے نکال دیا ہے۔'' وجے بولا۔

''جو بات میں تجھے سمجھانا چاہ رہا ہوں وہ سن بڑے غور سے......'' اجے سنگھ بولا۔ ''اگر ہم بھی ایسا کوئی کارنامہ انجام دے ڈالیں تو سمجھو اس بار کی پیشی میں ہمارے پو بارہ......''

''وہ کیسے؟''

''رام گوپال اور دیال داس (یعنی میں) کی بلی چڑھا کر......''

''کیا مطلب؟'' وجے کا منہ کھلا رہ گیا۔ مگر میں اس خبیث مردود اجے سنگھ کی اس مکروہ اور سفاک پلاننگ کو بھانپ گیا تھا اور میرے پورے رگ وپے میں سنسنی کی لہر دوڑ گئی تھی۔

''میں اب بھی نہیں سمجھا؟''

''ارے، گھامڑ! رام گوپال کو میں آج رات اُدھر لاؤں گا، دیال داس (میں) تو اِدھر ہی موجود ہے، تو اُبھی اس سے یہی کہنا کہ یہاں سے ہم نے فرار کا منصوبہ بنایا ہے اور میں اسی لیے یہاں آیا تھا، رات کو رام گوپال کو لے کر میں آؤں گا۔ یہ دونوں ہمارے شکار ہوں گے۔ بہ ظاہر ہم بھی ان کے ساتھ فرار ہونے کی کوشش کریں گے، مگر ان دونوں کو آگے نکل جانے کا موقع دے کر پیچھے سے ان کی پشت پر گولیوں کی باڑھ ماریں گے، ان کے مرتے ہی ہم کہہ دیں گے کہ ان دونوں نے یہاں سے فرار ہونے کی کوشش کی تھی۔ اب سمجھے تم میری رتنا کماری؟''

یہ کہتے ہوئے اجے سنگھ مکروہ انداز میں مسکرانے لگا۔ اس کی آنکھوں سے سفاکی برس رہی تھی۔ اگر وہ اپنے ذاتی مفاد کی خاطر اپنے ہی دو ساتھیوں کو قربان کر رہا تھا تو یہ اس کی مجرمانہ ذہنیت کے ساتھ انتہائی درجے کی غیر انسانی حرکت تھی، یہ بدمعاش اور تیسرے درجے کے مجرم تھے، ان سے ایسی توقعات رکھی جا سکتی تھیں۔ یہ تو شکر تھا کہ میری بروقت محتاط روی اور بیدار مغزی نے اس گھناؤنی سازش کو بے نقاب کر دیا۔

اس ذلیل اور مکروہ اجے سنگھ کی اس سازش کو وجے نے بھی پسند کیا اور پھر دونوں آج رات کو ہی اپنی اس گھناؤنی سازش پر عمل پیرا ہونے کے لیے لائحہ عمل تیار کرنے لگے۔ باقی باتیں عمومی تھیں، جو میرے کام کی نہ تھیں اور یوں بھی اب اجے سنگھ رخصت ہونے کے لیے تیار تھا تو میں خاموشی کے ساتھ دبے پاؤں اوپر ٹیکری پر آ کر بیٹھ گیا۔ اتنے میں وجے بھی اوپر آ گیا۔

''کیا کہہ رہا تھا اجے؟'' میں وجے کے چہرے پر بہ ظاہر ایک اچٹتی سی نظر ڈال کر بولا۔

''ایسے ہی ملنے آیا تھا۔'' وجے نے سرسری سا جواب دیا۔ اسی دوران دوپہر کا کھانا دینے والی گاڑی آ گئی۔ کھانے سے فارغ ہونے کے بعد میں اجے اور وجے کے اس گٹھ جوڑ اور آج رات ہونے والی اپنے اور رام گوپال کے خلاف سازش کے بارے میں سوچنے لگا۔

رام گوپال کو اس سازش کا پتا نہ تھا اور میں سوچ رہا تھا کہ اسے کس طرح اس سازش سے آگاہ کر سکتا ہوں؟ اس کے لیے رازداری اور اجے اور وجے سے تھوڑی دیر کے لیے دوری درکار تھی۔

میں آنے والے وقت کا انتظار کرنے لگا اور ساتھ ہی اس پر غور کرنے لگا کہ آیا اجے اور وجے کو ان کے منصوبے پر عمل پیرا ہونے سے پہلے ہی کیوں نہ جہنم واصل کر ڈالوں؟ لیکن اس پر جب میں نے تھوڑا اور غور کیا تو ایک پنتھ دو کاج کے مصداق ایک اور منصوبہ میرے ذہن میں آیا، یہ منصوبہ در منصوبہ والی بات تھی یعنی ان کی چال انہی پر الٹنا اور اسے اپنے لیے کارآمد بھی بنانا۔

اجے اور وجے جو گڑھا میرے اور رام گوپال کے لیے کھود رہے تھے... اس میں ہمارے بجائے انہی دونوں سازشیوں کو ہی گرا ڈالنا تھا، مگر مسئلہ اب رام گوپال کا تھا، مجھے اسے اعتماد میں لینا تھا، وگرنہ میرا یہ چال الٹنے کا کھیل خراب ہو جاتا۔ سوچ طلب بات تو یہ تھی کہ آخر رام گوپال میری بات پر کیسے یقین کر لیتا؟ شبہ تھا کہ وہ مجھ سے کہیں بددل ہو کر بدک نہ جاتا۔ نہ ہی مجھے اس کا اندازہ تھا کہ رام گوپال دیال داس سے کتنا قریب تھا، قرائن سے تو یہی لگتا تھا کہ وجے کی ہی ان کے ساتھ انڈر اسٹینڈنگ زیادہ تھی۔

میں یعنی دیال داس چونکہ نیا بھرتی ہوا تھا اسی لیے وہ مجھ پر کم ہی اعتبار رکھ سکتے تھے، بہت غور و خوض کے بعد میں اسی نتیجے پر پہنچا کہ رام گوپال کو بتانے یا بالفاظِ دیگر اپنا ہم

خیال بنانے کا مجھے بہر حال رسک لینا ہی پڑے گا۔ اس کے بغیر اجے اور وجے کی چال اُن پر نہیں اُلٹی جا سکتی تھی، بلکہ الٹا ان کے دام میں پھنس جانے کا خطرہ تھا۔

رات تک میں نے اس پر مزید غور کیا مگر اور کوئی صورت نظر نہیں آئی۔ بالآخر وہ خطرناک موڑ آن پہنچا جب وہ مرزدوا اجے سنگھ اپنے منصوبے کے مطابق اپنے ساتھی رام گوپال کو ہمارے جھونپڑے پر لے آیا۔

باتیں ہوتی رہیں، اس دوران میں بھی محتاط رہا۔ پھر پینے پلانے کا دور چلا۔ میں نے بہت کوشش کی کہ اصل وقت سے تھوڑی دیر قبل مجھے اتنا موقع مل جائے کہ میں ذرا تنہائی میں رام گوپال سے کوئی رازدارانہ گفتگو کر سکوں، مگر ایسا نہ ہو سکا، حتیٰ کہ وہ منحوس گھڑی سر پر آ گئی، جب اجے سنگھ نے اپنے فرار کا وہ منصوبہ ہمارے سامنے رکھ دیا جس کے در پردہ میرے اور گوپال کے قتل کے سوا اور کوئی مقصد نہ تھا۔

''لیکن کیوں؟ ہمیں بھلا اتنی اچھی نوکری چھوڑ کر یہاں سے بھاگنے کی کیا ضرورت ہے؟'' رام گوپال نے حیران ہو کر اجے سنگھ اور وجے کی طرف دیکھا۔ جسے سن کر ان دونوں سازشیوں کو تو نہیں البتہ مجھے ضرور خوشی ہوئی تھی۔

''میں نے تو سنا ہے، بلکہ..... یہ تو وجے نے بھی مجھے بتایا تھا کہ عنقریب یہ جگہ ایک بڑی ریاست بننے والی ہے اور ہم یہاں کے وفاداروں کی حیثیت سے ایک پیشی سے گزر کر بڑے عہدوں پر پہنچنے والے ہیں، اُدھر واپس ممبئی کی اندھیری گلیوں اور ٹھٹھرتے فٹ پاتھوں پر ہمارے لیے کیا رکھا ہے؟''

رام گوپال نے اپنی بات مکمل کی تو وجے نے منہ بنا کر اس کی طرف دیکھا اور پھر اجے سنگھ کے چہرے کو تکنے لگا، جیسے کہہ رہا ہو کہ ''اسے اب خود ہی رام کرو.....''

''کون سی دنیا میں رہ رہا ہے گوپالے تو؟'' اجے سنگھ نے اپنے لہجے میں طنز سموتے ہوئے کہا اور بڑی چالاکی سے اسے سمجھاتے ہوئے بولا۔ ''چھوٹی اور بڑی سرکار کے پاس اپنے ذاتی وفاداروں کی کوئی کمی نہیں ہے۔ وہ انہیں ہی اعلیٰ عہدوں پر رکھیں گے، ہم کس کھیت کی مولی ہیں بھائی! ہم اسی طرح ہی ان کے قیدی بنیں رہیں گے بعد میں بھی۔''

''مگر ہم قیدی کب ہیں؟ ہمیں تنخواہیں ملتی ہیں، اصل قیدی تو وہ ہیں جن سے یہ لوگ ہر روز بیگار لیتے ہیں۔'' گوپال نے مثال پیش کی، جو غلط نہ تھی۔ بیگار قیدیوں کے ذکر پر مجھے اول خیر اور شکیلہ یاد آ گئے، جن کا شمار ملازموں میں نہیں بلکہ بیگار کاٹنے والے قیدیوں میں ہوتا تھا۔ جبکہ گمیل دادا کا ابھی شمار نہ ملازموں میں ہوتا تھا نہ ہی قیدیوں میں، اگرچہ وہ بھی جاوا کے کمزور باشندوں اور قیدی رعایا کی فہرست میں شامل تھا۔ اپنے ساتھیوں کی حالت زار کا سوچ کر میرا دل دکھ سے بھر آیا تھا۔

ادھر رام گوپال ان کے جھانسے میں نہیں آ رہا تھا، جس کے باعث وجے تو پریشان تھا مگر اجے سنگھ نے ہمت نہیں ہاری تھی وہ ہنوز رام گوپال کو بڑی چالاکی سے سمجھاتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

''بے وقوف! یہ وجے بھی پہلے اسی خوش فہمی میں مبتلا تھا۔ پھر اس کی بدھی میں بات سمجھ آئی کہ ہم چاہے اِدھر کتنا بھی خون پسینا ایک کر دیں اپنا آخر کو ہم قیدی ہی کہلائیں گے۔ یہاں حالات غیر یقینی ہیں، جاوا قبیلے کا وہ روپوش جنگجو ٹولا بہت جلد طاقت پکڑنے والا ہے۔ وہ کسی وقت بھی یہاں حملہ کر دے گا اور پھر اس جنگ میں ہمیں ہی آگے جھونکا جائے گا، اب بھی تو ہمارے جیسے کتنے ہی مختلف ٹولوں سے لڑتے ہوئے ختم ہو چکے ہیں۔ یاد نہیں تمہیں، بھولا ناتھ جیسے ایک بڑے ڈان کا ٹولا یہاں حملہ آور ہوا تھا۔ بے شک ان سب کو ہلاک کر دیا گیا تھا مگر اس میں ہمارے بھی تو آدمی مارے گئے تھے اور یہ سب ہمارے ہی جیسے وہ ساتھی تھے جنہیں بڑی بڑی تنخواہوں کا لالچ دے کر یہاں لا کر پھنسایا گیا تھا، ہاں......! میں اسے پھنسنا ہی کہوں گا، مہترا اور اشوک نے بھی تو یہ صورتِ حال دیکھ کر یہاں سے فرار کی ٹھانی تھی، مگر ان کی منصوبہ بندی کچی تھی اسی لیے مار دیے گئے۔ یہ لوگ ہم پر کبھی بھی اتنا بھروسا نہیں کر سکتے کہ ہمیں اسٹیٹ اور ڈارک کیسل بن جانے کے بعد اس کے خاص اور مراعات یافتہ عہدوں پر رکھ لیں۔ میرا منصوبہ بے داغ ہے۔ اپنے دیس اور اپنے شہر میں ہم آزاد تھے۔ یہاں کیا رکھا ہے؟ سوائے ہر لمحہ موت کے دھڑکے کے......''

گویا مکار اجے سنگھ نے اس چالاکی سے نقشہ کھینچا کہ رام گوپال کو اس کی بات پر صاد کرنا ہی پڑا۔ یوں بھی ان جیسے لوگوں کے ساتھ ایسے ہی حالات پیش آ چکے تھے، مگر یہ بھی حقیقت تھی کہ اب صورتِ حالات کی تبدیلی کے امکانات (ان کے نزدیک) اچھے بھی نظر آنے لگے تھے۔ جس کے باعث ہی مکار اور سازشی ذہن اجے سنگھ نے یہ منصوبہ بنایا تھا۔ تاہم پھر بھی میں نے اِک نگاہ بہ غور اور بھانپتی ہوئی سی رام گوپال کے سوچتے چہرے پر ڈالی تھی، وہ اب بھی مجھے اندر سے کچھ ابہام کا شکار نظر آتا تھا۔

اس کے بعد اجے سنگھ ہمیں یہاں سے فرار کی ''ڈمی''

منصوبہ بندی سمجھانے لگا۔ ظاہر ہے میں اسے ڈمی ہی کہوں گا کیونکہ یہ سرے سے فرار کا منصوبہ تو تھا ہی نہیں، یہ تو میری اور رام گوپال کی ہلاکت کی منصوبہ بندی تھی۔ یہی وجہ تھی اس کے فرار کے منصوبے میں مجھے کئی خامیاں اور سقم محسوس ہوئے تھے، جسے رام گوپال نے بھی محسوس کیا تھا مگر وہ اس کا اظہار نہ کرسکا تھا۔

رات کی تاریکی گہری پڑتے ہی ہم سب اجے کے اشارے پر اٹھ کھڑے ہوئے اور پکٹے کی طرف بڑھ گئے۔ یہ اس کی جنوب مشرقی سمت تھی اور یہاں سے ہمیں آبادی کے عقبی رخ سے ہوکر آگے جنگل میں داخل ہونا تھا، جس کا یہاں سے مختصر سلسلہ ختم ہوتے ہی خودرو مگر قدِ آدم جھاڑیوں اور ٹیکریوں کا سلسلہ شروع ہوجاتا تھا۔ اس کے بعد ہم نے دم دبا کر بھاگنا تھا۔ کبیل دادا اور خود وجے کی بتائی گئی معلومات کے مطابق اس طرف بھی کم سخت پہرا نہ تھا۔ یہاں چھوٹی سرکار کے انتہائی قریبی وفاداروں کا جدید اسلحہ پوش ٹولا ہر وقت گشت کرتا رہتا تھا، جو خفیہ کہلاتا تھا۔

منصوبے کے مطابق اجے سنگھ نے پہلے مجھے اور رام گوپال کو ہی اس طرف قدم بڑھا کر تقریباً تیس، چالیس گز تک دور نکل جانے کی تاکید کی تھی اور اس کے بعد اجے اور وجے نے ہمارے پیچھے آنا تھا۔ مقامِ اتصال پر ہمیں رک کر دوبارہ اکٹھے ہوجانے کا کہا گیا تھا، اور یہی وہ مقام ہوتا جہاں اجے سنگھ کے گھناؤنے منصوبے کے مطابق ان دونوں نے ہمیں گولی مار کے ہلاک کرنا تھا۔

ہم چاروں تاریکی کا حصہ بنے اپنے قدم بڑھا چکے تھے۔ آبادی کے عقبی حصے سے ہوتے ہوئے ہم جنگلی جھاڑیوں اور بڑے بڑے چوڑے پتوں والے گھنگنے درختوں کی آڑ لیے بڑھتے ہوئے قریباً نصف کلومیٹر چلتے ہوئے جنگل کے اس مختصر سے سلسلے میں داخل ہوگئے، جس کے بعد مذکورہ ٹیکریوں اور قدِ آدم خودرو جھاڑیوں کا سلسلہ شروع ہوجاتا تھا۔

اس کے تھوڑی ہی دیر بعد بالآخر وہ خوفناک لمحہ آن پہنچا جسے میں موت کی ہی گھڑی کہہ سکتا تھا۔ یہاں تھوڑا موقع پاتے ہی اجے اور وجے نے مجھے اور رام گوپال کو اشارہ کردیا۔

ہر سُو ہولناک تاریک سناٹے کا راج تھا، ایسے میں یہ ماحول اور بھی تھرا دینے والا محسوس ہوتا تھا، جبکہ مجھے معلوم بھی تھا کہ مجھے اور رام گوپال کو بہیمانہ ہلاکت خیزی کے تارِ عنکبوت میں پھنسایا جانے والا تھا۔ جبکہ بے چارہ رام گوپال تو بے خبر تھا مگر اس کے چہرے سے نامعلوم سی بے چینی مترشح تھی۔

اب نجانے یہ فرار کے دوران مارے جانے کے ڈر کا سبب تھا یا پھر اس کی چھٹی حس، تاہم مجھے اس بات کا اندیشناک خدشہ تھا کہ کہیں یہ بدبخت اجے سنگھ ہمیں راستے ہی میں گولیوں کا نشانہ نہ بنادے۔ ایک آخری کوشش میں نے یہ کی تھی، تاکہ خون خرابا نہ ہوسکے کہ میں اجے سنگھ کو سمجھانے کی کوشش کرتا، مگر اس میں خطرہ بہت تھا۔

وہ مردود سازشی ذہن کا مالک ایک سفاک انسان ثابت ہوا تھا جو اپنے ذاتی مفاد کی خاطر کسی کے ساتھ تو کیا اپنے ہی ہم وطن ساتھیوں کی بھی جان لینے میں عار ہی نہیں محسوس کرتا تھا۔ بھلا ایسا خبیث انسان میرے سمجھانے میں کیا آتا؟

بہرکیف اجے سنگھ کا اشارہ پاتے ہی میں اور رام گوپال دوڑنے کے انداز میں تیزی سے قدم اٹھاتے ہوئے ٹیکریوں اور خودرو جھاڑیوں کی طرف بڑھنے لگے، اور جب ان سے قریباً کوئی بیس، پچیس گز دور ہوئے تھے کہ میں راستے ہی میں رام گوپال کا کاندھا دبوچ کر اسے ایک دم دائیں جانب کی ٹیکریوں کی طرف لے گیا۔

وہ میری اس اچانک حرکت پر بھونچکا سا رہ گیا تاہم پھر ایک جگہ ٹھہر کر تیز لہجے اور گھورتی ہوئی آنکھوں سے میری طرف دیکھ کر بولا۔ ”یہ اچانک تم نے راستہ کیوں بدل لیا؟“

”اس طرف آجاؤ پہلے...... ابھی بتاتا ہوں...... معاملہ تمہاری سوچ سے بھی زیادہ گڑبڑ ہے؟“ میں نے ہانپتی ہوئی سی سرگوشی میں اس سے کہا اور عقب میں ایک ذرا گردن موڑ کر دیکھا۔ چاندنی میں چمکتے آسمان کی مقدور بھر ضوفشانی میں اس طرف ان دونوں کے ہیولوں کو غائب پایا، جدھر ہمیں رخصت کرنے کے بعد اجے سنگھ اور وجے کھڑے تھے۔

”کیسی گڑبڑ؟ مجھے بتاؤ......“ رام گوپال اس بار قدرے درشت لہجے میں بولا اور ایک دم اپنے کاندھے سے خودکار گن اتار کر ہاتھ میں پکڑ لی۔ میں اس کی حرکت پر بے اختیار ایک ٹھنڈی سانس بھر کر رہ گیا اور بالآخر میں جس قدر جلدی اور مختصر ترین الفاظ میں اسے اجے سنگھ اور وجے کی اس گھناؤنی اور ہلاکت خیز سازش کے بارے میں آگاہ کرسکتا تھا وہ میں نے اس سے بتا ڈالا۔ جسے سن کر اس بے وقوف نے الٹا اپنی گن کی نال میرے سینے سے لگادی۔

”سچ سچ بتاؤ تم یہاں کیا کرنا چاہتے ہو میرے ساتھ؟“

”بے وقوف! میری نہیں تو اپنی ہی زندگی کی فکر کر

لو...... اجے سنگھ اور وجے ہم دونوں کو......'' ابھی میں نے اتنا ہی کہا تھا کہ رائفل کے ٹرائیگر پر اس کی انگلی نے جنبش کی...... میری آنکھیں پھیل گئیں، مگر دوسرے ہی لمحے رائفل سے گولی کے دھماکے کے بجائے ہلکی سی ''ٹرچ'' کی آواز برآمد ہوئی۔ مدھم مدھم سی روشنی میں، میں نے رام گوپال کے چہرے پر حیرانی کے تاثرات ابھرتے دیکھے، مگر وہ بے وقوف پھر بھی ان کی سازش نہ سمجھ سکا جبکہ میں پل کے پل اس کا ادراک کر بیٹھا تھا کہ ان دونوں خبیثوں ہی کی رائفل خالی کرنے کی حرکت ہو سکتی تھی اور کوئی بعید نہ تھا کہ میری رائفل کا بھی یہی حال کیا گیا ہو، مگر اس موٹے دماغ رام گوپال نے اسے بھی میری کسی خفیہ سازش سے تعبیر کیا اور بڑے زور کی لات میرے پیٹ پر جڑ دی۔ اس کی یہ حرکت میرے لیے اچانک تھی۔ میرے منہ سے ''اوغ'' جیسی کرب انگیز آواز خارج ہوئی اور میں پلٹ کر جھاڑیوں میں جا گرا۔ اس نے اپنی پتلون کی بیلٹ میں اُڑسا ہوا لمبے پھل والا خنجر نکال لیا۔ میری گن کاندھے پر تھی۔ اسی وقت میں نے اجے سنگھ اور وجے کو ایک طرف کی تاریک ٹیکری سے ابھرتے ہوئے دیکھ لیا۔ وہ ہمارے قریب آ گئے۔ میں نے غیر محسوس انداز میں لیٹے لیٹے اپنے ایک ہاتھ کو پشت کی جانب حرکت دینا شروع کر دی۔

''یہ...... یہ بدبخت دیال داس، کوئی چال چل رہا تھا۔'' رام گوپال نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے ان دونوں سے مخاطب ہو کر کہا اور پھر اسی وقت میں نے اجے سنگھ کو اس کے ساتھ کھڑے وجے کو ایک مخصوص اشارہ کرتے ہوئے پایا...... میرے وجود میں موت کی سنسنی دوڑ گئی۔ رام گوپال کے سر پر موت ناچ رہی تھی اور اس بے وقوف کو کچھ معلوم نہ تھا، بلکہ اس احمق نے مجھے بھی اپنے ساتھ پھنسا دیا تھا۔

اجے سنگھ کے بدہیئت ہونٹوں پہ لمحے بھر کو میں نے مکروہ مسکراہٹ ابھرتے دیکھی اور پھر اس نے اپنے ہاتھ میں پکڑی ہوئی رائفل کی نال رام گوپال کے پہلو سے لگا دی۔ اس کی اس غیر متوقع حرکت پر ایک ثانیے کے لیے رام گوپال کا چہرہ متغیر ہوا اور بالکل آخر میں اس احمق کو اپنی فاش غلطی کا احساس ہوا تھا پھر اس کے اگلے ہی ثانیے میں گولی چلنے کا سمع خراش دھماکا ہوا۔ گولی اس کے پہلو کے آر پار ہو کر قریب کھڑے وجے کے پیٹ میں گھس گئی، چونکہ گولی قریب سے چلائی گئی تھی اور وجے کریہہ ناک چیخ کے ساتھ اپنا پیٹ پکڑے گر کر تڑپنے لگا، جبکہ رام گوپال پہلے ہی کٹے ہوئے شہتیر کی طرح ڈھے چکا تھا۔

سفاک اجے سنگھ کو وجے کی موت کا بھی کوئی دکھ نہ تھا اور نہ ہی یہ حادثہ تھا بلکہ بدطینت اجے سنگھ نے وجے کو بھی ایک پنتھ دو کاج سے ''نمٹا'' دیا تھا۔ اب اس کا شکار صرف میں رہ گیا تھا، جبکہ اس نازک اور خطرناک صورت حالات کی سنگینی کے پیش نظر میرا پشت کی طرف جاتا ہاتھ رائفل پر پڑ چکا تھا لیکن اسے ابھی سیدھا ہاتھ میں لینے کا موقع نہیں رہا تھا۔ جبکہ اجے سنگھ اپنی دھواں اُڑاتی رائفل کی نال کا رخ میری جانب کیے ہوئے بڑے بڑے مکروہ انداز کی ہنسی ہنس رہا تھا۔ وہ کسی بھی لمحے مجھ پر بھی گولی چلا سکتا تھا مگر دوسرے ہی لمحے اس نے مجھ سے کہا۔

''میرا مقصد سب کو مارنا نہیں تھا۔ ایک کا میرے ساتھ بچنا ضروری ہے، تم نے شاید اس رات میری اور وجے کی باتیں چھپ کر سن لی تھیں، اسی لیے مجھے شک ہوا تھا کہ تم رام گوپال کو میرے بتائے ہوئے راستے پر لے جانے کے بجائے درمیان میں اچانک کیوں راستہ بدل گئے تھے، یہاں آ کر میں نے تمہاری وہ باتیں بھی سن لیں جو تم گوپال کو سمجھاتے ہوئے کر رہے تھے۔''

اس کی باقی بکواس پر تو میں نے لعنت بھیجی جو میرے لیے عمومی نوعیت کی ہی تھی تاہم کام کی بات کو میں نے پکڑا اور اس سے کہا۔ ''تمہارا خیال صحیح ہے اجے! اگر تم نے مجھے بھی مار ڈالا تو تمہاری اس بات کا کوئی بھی یقین نہیں کرے گا، جس کا منصوبہ تم وجے کے ساتھ بنا چکے ہو......'' میں نے بھی پل کے پل اس مکار کی کمزوری کو سمجھتے ہوئے کہا تو وہ بولا۔

''خبردار! اب یہ بات راز میں رکھنا...... میں فلش گن چلانے لگا ہوں، تھوڑی ہی دیر میں چھوٹی بڑی سرکار کے وفادار اہلکار یہاں پہنچ جائیں گے، بلکہ گولی کی آواز سن کر اسی طرف آ ہی رہے ہوں گے۔ ان سے یہی کہنا کہ وجے اور رام گوپال فرار کی کوشش کر رہے تھے۔ کھڑے ہو جاؤ......'' اس نے آخر میں کہا اور میں اٹھ کھڑا ہوا۔

اجے سنگھ نے اپنی بیک کٹ سے فلش گن نکالی اور سگنل فائر کر دیا۔

فضا میں ایک زوردار پٹاخا چھوٹا اور تاریک آسمان پر سرخ انگارا سی روشنی پھیلتی چلی گئی۔ میں ہنوز اس بدفطرت اجے سنگھ کی طرف سے محتاط تھا، کہ کیا خبر یہ میرے ساتھ اب بھی کوئی گل کھلا رہا ہو، اسی وقت مختلف گاڑیوں اور شور کی آواز سنائی دی۔ میرا ذہن تیزی کے ساتھ چال در چال اس

منصوبے پر غور کررہا تھا جواب میں اجے سنگھ کے ساتھ کھیلنے والا تھا۔

اس کا دھیان ذرا بٹا اور میں اس پر جھپٹا، سب سے پہلے اس کی گن دور پھینکی اور اس کی فلش گن پر قبضہ جمایا۔ پھر اس کی کنپٹی پر میں نے ایک مُکا جڑ دیا۔ وہ کم بخت سخت جان ثابت ہوا...... اتنا غفیل تو نہیں ہوا البتہ جھول گیا اور لگا لہرانے...... میں نے اسے دبوچ لیا۔ ٹھیک اسی وقت ہر طرف سے تیز سی سرچ لائٹیں مجھ پر پڑیں۔ روشنیوں کے اس سیلاب سے میری آنکھیں چندھیانے لگیں۔

میں چیخا۔ ''یہ لوگ فرار ہورہے تھے، دو کو میں نے ہلاک کردیا اور ایک کو پکڑ لیا ہے، میں سرکار کا وفادار ملازم دیال داس ہوں......''

مجھے ڈر تھا کہیں یہ لوگ مجھ پر فائر ہی نہ کھول دیں۔ مگر اسی وقت سرچ لائٹوں کی ''بیم'' لو کردی گئی...... گل نہیں کی گئی تھیں۔ میں نے اندر ہی اندر طمانیت بھری سانس لی۔

اجے سنگھ میری گرفت سے آزاد ہونے کے لیے تڑپ رہا تھا مگر میں نے اسے دبوچ رکھا تھا۔

''ی یہ...... جھوٹ بول رہا ہے، یہ خود ان دونوں کے ساتھ فرار ہورہا تھا۔''

تب ہی ایک بھاری اور رعب دار آواز ابھری۔

''دیال داس! چھوڑ دو اِسے اور اپنی گن پھینک کر دونوں ہاتھ اوپر اٹھالو، تم وفادار ہو یا غدار، اس کا فیصلہ سرکار کرے گی۔'' میں نے فوراً اس کے حکم کی تعمیل کی اور گن پھینک کر اپنے دونوں ہاتھ بلند کردیے۔

میری تھوڑی دیر پہلے چندھیائی ہوئی آنکھیں اب کچھ کچھ دیکھنے کے قابل ہوگئی تھیں، وہ سات افراد تھے، مخصوص چست وردیوں والے چار اسلحہ پوش اور باقی تین تنگ دھڑنگ جنگجو سنان بردار کلی منجارین......

دو چست وردی پوش میری طرف بڑھے، ایک نے اجے سنگھ کو گرفت میں لے لیا اور دوسرے نے مجھے، وہ میری جامہ تلاشی لینے لگا، میں خاموش مگر دھڑکتے دل کے ساتھ اپنے دونوں ہاتھ بلند کیے کھڑا رہا۔ جبکہ باقی چند دوسرے رام گوپال اور وجے کی لاشوں کو سنبھالنے لگے۔ ان کے عقب میں ایک بڑی سی جیپ کھڑی تھی جس کی ہیڈ لائٹس روشن تھیں۔ اس گروپ کی کمانڈ ایک لمبا اور قدرے چوڑے جبڑوں والا شخص کررہا تھا جس کی وردی کی بناوٹ میں بس اتنا ہی فرق تھا کہ وہ اس کے باقی ساتھیوں سے مختلف دکھائی دے۔ وہ میری ہی طرف گھورے جارہا تھا۔

اجے سنگھ کو اسی نے ہی جھڑک کر خاموش کرایا تھا۔

تاہم ہم دونوں کو ہی گرفت میں لے لیا گیا تھا اور ہمیں اس لمبی سی اوپن ہڈ والی گاڑی میں سوار کرادیا گیا۔

''ہٹ نمبر تھری کی طرف چلو......'' چوڑے جبڑوں والے نے ڈرائیور کے برابر والی سیٹ پر براجمان ہوتے ہوئے تحکمانہ کہا اور اس نے ایک جھٹکے سے گاڑی آگے بڑھادی۔

میرے سوچتے ذہن میں دھکڑ پکڑ مچی ہوئی تھی اور دل بے چینی سی محسوس کررہا تھا کہ نجانے اب یہ لوگ کیا فیصلہ کرنے والے تھے، مزید یہ کہ اب ہمیں کس کے سامنے پیش کیا جانے والا تھا؟ رتن لال یا پھر میرے دشمن نمبر ایک بلراج سنگھ۔

بلراج سنگھ کے سامنے پیش کرنے میں مجھے پہلا دھڑکا اپنے پہچان لیے جانے کا تھا، فیصلہ تو بعد کی بات تھی کہ وہ میرے حق میں ہوتا یا پھر اس مردود اجے سنگھ کے۔

ظاہر ہے اب تن بہ تقدیر ہونے کے سوا کیا چارہ تھا، سو دھڑکتی ہوئی خاموشی سے آنے والے وقت کا انتظار کرتا رہا۔

چوڑے جبڑے والے نے ڈرائیور کو ہٹ تھری کی طرف چلنے کا کہا تھا۔ گاڑی تھوڑے ہچکولے کھاتی تاریکی میں مناسب رفتار سے آگے بڑھ رہی تھی۔ یہی وہ وقت تھا جب ایک بپ کی تیز سی آواز ابھری جو کسی لاسلکی الارم کی ہی لگی تھی مجھے۔ میرا خیال درست ثابت ہوا، کیونکہ اگلے ہی لمحے چوڑے جبڑوں والے نے کوئی شے اپنے کان کے قریب لے جاکر، ''ہیلو، پیٹرولنگ بلیو آر، سچا نند از ہیئر کہا۔''

دوسری جانب سے کوئی اس سے کچھ پوچھ رہا تھا۔ جواب میں اس نے وہی کچھ بتایا جو یہاں ہوا تھا۔ کیونکہ رات کے اس خاموش پہر میں گولیاں چلنے کی آواز دور تک گئی تھی۔

''او کے! ہم اب ہٹ تھری کی طرف ہی جارہے ہیں، صورت حال قابو میں ہے، کوئی فرار نہیں ہوسکا ہے۔ مسٹر رتن لال کو خبر کردو...... کلیئرڈ......''

آخر میں یہ کہہ کر چوڑے جبڑوں والے نے، جس کا نام سچا نند تھا سلسلہ منقطع کردیا۔ مجھے اس کی مختصر جوابی گفتگو سے کچھ خوش کن اندازہ تو ہوا تھا کہ یہ لوگ مجھے اور اجے سنگھ کو رتن لال کی عدالت میں ہی پیش کرنے والے تھے۔

تھوڑی دیر بعد گاڑی آبادی والے حصے میں آگئی اور یہاں کھپریل کی مخروطی چھتوں والے جھونپڑوں سے جادوی قبائل باہر نکل کر ہماری طرف تکنے میں محو تھے۔ شاید

فائرنگ کا یہاں یہی مطلب لیا جاتا تھا کہ کسی نے فرار ہونے کی ہی کوشش کی ہوگی۔
انہی چند جادوی قبائلیوں کے درمیان سے مجھے ایک شخص لنگڑاتا ہوا ابھرتے دکھائی دیا۔وہ آبادی کے درمیان سے گزرتے ناپختہ کچے راستے کے بالکل قریب آن کھڑا ہوا تھا۔ یہ کبیل داوا تھا۔ دیگر قبائلیوں کی طرح اس کے ہاتھ میں بھی ایک سلگتی ہوئی مشعل تھی ہوئی تھی۔
جب ہماری گاڑی اس کے بالکل قریب سے گزری تو ہم دونوں کی نظریں چار ہوئیں۔ مجھے گاڑی پر اس حالت میں بیٹھے دیکھتے ہی اس کے چہرے پر تشویش کے سائے لرزاں ہوگئے۔ یقیناوہ بے چارہ مجھے اس طرح دشمنوں کے درمیان دیکھ کر پریشان ہوگیا تھا۔ مگر میں نے نظر بچا کر کبیل داوا کو آنکھ کا مخصوص اشارہ کر دیا اور تھوڑا مسکرایا بھی تھا تاکہ مجھے اس حالت میں دیکھ کر اس کا ذہنی تناؤ اور تفکر کم ہوسکے اور یہ اندازہ لگانے کی کوشش کرلے کہ میں کوئی چال چلنے لگا تھا۔
گاڑی میں عقبی بینچ نما لمبی سیٹوں پر بیٹھے ایک دو چست وردی پوشوں نے ہاتھ کے اشارے اور چلاتے ہوئے ان قبائلیوں کو واپس اپنے جھونپڑوں میں جانے کا حکم دیا تھا۔ مگر وہ وہیں رکے رہے اور دور ہوتی ہماری گاڑی کو تکتے رہ گئے۔
اس کے چند ثانیے بعد ہی ہماری گاڑی ایک فائبر تک ہٹ کے سامنے رک گئی۔ مجھے اور اجے سنگھ کو بازوؤں سے پکڑ کر نیچے اتارا گیا مگر آگے بڑھنے سے ابھی ہمیں روکے رکھا گیا تھا، دیگر افراد بھی وہیں چوکس سے کھڑے ہوگئے تھے۔
ان میں دو افراد کے ہاتھوں میں طاقت ور بیٹری کی چارجر لائٹیں بھی تھیں۔ جن کی روشنی میں، میں نے دیکھا کہ گاڑی سے رام گوپال اور وجے کی لاشیں بھی اتار کر ہٹ کے سامنے عین دروازے کے قریب رکھ دی گئی تھیں۔
وہاں ایک چھوٹی سی جیپ اور بھی کھڑی تھی۔
مجھے وجے سے زیادہ رام گوپال کے مرنے کا افسوس تھا۔ وہ اگر بروقت میری بات کا ادراک کر لیتا تو شاید یوں بے موت نہ مارا جاتا۔ اسی طرح وجے بھی مجھ سے غداری کا ثبوت دیتے ہوئے، بدطینت اجے سنگھ کی باتوں میں آ کر اپنی قیمتی جان گنوا بیٹھا تھا۔
سچانند گاڑی سے اتر کر اپنے ساتھیوں کو کوئی تحکمانہ ہدایت دینے کے بعد اور اپنی چست پتلون کی بیلٹ درست کرتا ہوا ہٹ کے اندر داخل ہو چکا تھا۔

مجھے اور اجے سنگھ کو ذرا فاصلے سے ساتھ کھڑا رکھا تھا۔ وہ میری طرف بار بار کھا جانے والی نظروں سے گھور رہا تھا۔ میں جانتا تھا کہ اپنی سازش کے ناکام جانے اور الٹا اس میں خود ہی پھنس جانے پر وہ مجھ سے بہت خار کھائے ہوئے تھا۔
ہمارے ہاتھ وغیرہ بندھے ہوئے نہیں تھے۔ تاہم گن پوائنٹ پر ہمیں ضرور لیا ہوا تھا۔ یوں بھی ہم بھلا کہاں اور کیسے بھاگ سکتے تھے؟ ان کے نرغے میں ہی تھے۔
یہ دشمنوں کا زعم سہی مگر ایک حقیقت بھی تھی۔ یہ سارا ان کا علاقہ تھا۔ یہاں سے وہاں میلوں تک ان کی ہی اجارہ داری تھی۔
تھوڑی دیر گزری تھی کہ اندر سے سچانند رتن لال کے ساتھ برآمد ہوا۔ اس کے ہمراہ گن بردار بھی تھے۔ رتن لال نے ڈھیلا ڈھالا لباس پہن رکھا تھا۔ مجھے اس سے امید تھی کہ یہ فیصلہ میرے حق میں دے گا۔ کیونکہ میں اس کی بٹالین سے تعلق رکھتا تھا اور یہ مجھے جانتا تھا۔ یہی سبب تھا کہ اس نے صرف ایک نگاہ مجھ پر ڈالی تھی اس کے بعد اجے سنگھ کی طرف بڑھ گیا تھا۔ اسے اپنی طرف متوجہ پاتے ہی اجے سنگھ نے وہی راگ الاپنا شروع کر دیا تو رتن لال نے اسے بری طرح جھڑک کر خاموش رہنے پر مجبور کر دیا اور پھر وہیں کھڑے کھڑے اس نے سچانند سے تفصیلات پوچھیں۔ پھر کچھ سوچتا رہا اور لاشوں کی طرف بڑھ گیا۔ ایک ساتھی نے سچانند کے اشارے پر چارجر لائٹ کی روشنی لاشوں پر پھینکی، وہ جھک کر ان کا جائزہ لیتا رہا پھر سیدھے کھڑے ہو کے سچانند سے بولا۔
''یہ معاملہ گمبھیر لگتا ہے، تم ایک کام کرو سچانند!''
''سر!'' وہ مؤدبانہ انداز میں اپنے سر کو قدرے خم کرتے ہوئے بولا تھا۔
''ہٹ فور کے ساجن داس سے بات کرو، اس سے پوچھو کہ کیا بلراج صاحب جاگ رہے ہیں؟''
بلراج سنگھ کے ذکر پر مجھے اپنے پیٹ میں گرہیں پڑتی محسوس ہونے لگیں اور میری ساری خوش فہمی ہوا ہونے لگی۔ میرا خیال تھا کہ رتن لال ہی اس مسئلے کو آسانی سے حل کر سکتا تھا، لیکن شاید یہ معاملہ واقعی نازک اور اہم تھا اسی لیے رتن لال اسے اپنی صوابدید پر حل کرنے کا رسک نہیں لینا چاہتا تھا۔ مجھے اب ایک تفکر آمیز بے چینی سی کھا گئی تھی۔
میں نہیں جانتا تھا کہ بلراج سنگھ میرے حق میں کیا فیصلہ دیتا، یہ میرے لیے اب دور کی بات ہوگئی تھی، پہلا تو یہ ڈر ہی مجھے کھائے جا رہا تھا کہ کہیں یہ بدذات بلراج سنگھ مجھے پہچان

ہی نہ لے۔ اگرچہ میں نے اپنا حلیہ، یہاں بھی رہتے ہوئے کافی حد تک بدل لیا تھا، اپنے سر اور داڑھی مونچھوں کے بال بھی بڑھا لیے تھے۔ دائیں گال پر ہلکے سے زخم کا نشان بھی بنا لیا تھا جو کانٹے دار جھاڑی میں پھنسنے کا رہین منت تھا۔ اسے میں نے صاف کرنے کی زحمت ہی گوارا نہیں کی تھی۔ آواز البتہ میں نے پہلے ہی تھوڑی بدل رکھی تھی، تاکہ اگر کبھی بلراج سنگھ سے میرا سامنا ہو بھی جاتا تو میں اسی آواز میں اس سے گفتگو کرتا، تاکہ کسی میرے قریبی ساتھی کو (دشمن ساتھی کو) بھی اس کا شبہ نہ ہونے پائے۔

بہرطور اس دوران سچانند نے ساجن داس سے رابطہ کیا تو اس نے یہی جواب دیا کہ بلرج سنگھ سو رہا تھا۔ لہٰذا ہمیں اگلے دن صبح اس کے سامنے پیش کرنے فیصلہ کرلیا گیا تھا اور پھر ہمیں ایک چھوٹی سی قیدیوں والی چھولداری میں بند کردیا گیا۔

مجھے اور اجے سنگھ کو الگ الگ ہی رکھا گیا تھا اور باہر پہرا لگا دیا گیا تھا۔ رات تو یوں بھی آخری پہر میں تھی اور صبح ہونے میں چند ہی گھنٹے رہ گئے تھے، تاہم میں بھی تھکا ہوا تھا، مگر صبح بلراج سنگھ کے رُوبرو پیش کیے جانے سے میرا ذہن کچھ پریشان بھی ہو رہا تھا، جانے وہ بدبخت میرے حق میں کیا فیصلہ صادر کرنے والا تھا؟ اور یہ دھڑکا الگ لگا ہوا تھا کہ کہیں وہ مجھے پہچان ہی نہ لے۔ ساتھ ہی مجھے کپیل دادا کی بھی فکر ہونے ہونے لگی کہ وہ مجھے مجرموں کی طرح ان کے نرغے میں دیکھ کر یقیناً تشویش اور پریشانی سے دوچار ہو گیا تھا۔ مجھے یہ ڈر بھی ہوا کہ کہیں وہ کوئی ایسا ویسا قدم ہی نہ اٹھا بیٹھے اور میرے ساتھ خود بھی کسی مصیبت کا شکار ہو جائے، البتہ مجھے کچھ تسلی تو تھی کہ میں نے اسے اسی لیے آنکھ کا اشارہ کیا تھا کہ اسے زیادہ فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے اور معاملہ ابھی ہاتھ سے نہیں نکلا، وغیرہ۔

صبح سویرے ہی مجھے ایک پہرے دار نے جگا دیا۔ میں السائی ہوئی آنکھوں کو مسلتا ہوا اٹھ بیٹھا اور پھر پہرے دار کے ایما پر اس کے ساتھ ہی باہر آ گیا۔

باہر ایک جیپ کھڑی تھی اس میں ڈرائیور سوار تھا، اس کے عقب میں اجے سنگھ بیٹھا تھا۔ دو گن بردار جیپ سے اترے چوکس کھڑے تھے۔ مجھے بھی جیپ میں سوار کرا دیا گیا تھا اس کے بعد باقی اسلحہ پوش بھی اس میں سوار ہو گئے اور جیپ آگے روانہ ہو گئی۔

مجھے یہ اندازہ قائم کرنے میں چنداں دیر نہیں لگی تھی کہ ہمیں اب بلراج سنگھ کے ہٹ فور کی طرف لے جایا جا رہا تھا۔ ہٹ زیادہ دور نہیں تھا، وہ رتن لال کے ہٹ کے عقب میں ہی پچاس ساٹھ گز کے فاصلے پر بنا ہوا تھا جو نسبتاً بڑا ہی دکھتا تھا۔

وہاں پہنچے تو رتن لال کو پہلے ہی سے میں نے موجود پایا۔ وہاں اس کے گن بردار ساتھی بھی موجود تھے جن کی تعداد تین تھی، یہ وہی تھے جو ہمیشہ اس کے ساتھ ہوتے تھے۔

ہٹ کے ایک بڑے گوشے میں مجھے اور اجے سنگھ کو کھڑا کر دیا گیا تھا۔

''پتا کرکے بتاؤ کہ بلراج صاحب اور سچانند کب لوٹ رہے ہیں؟'' معاً رتن لال نے ہمیں ساتھ لانے والوں میں سے ایک سے تحکمانہ انداز میں مخاطب ہوتے ہوئے کہا تو اس نے جواب میں کہا۔

''یس سر! چھوٹے سرکار سچانند کے ساتھ لاشوں کا جائزہ لے کر بس ابھی ترنت پہنچنے والے ہیں۔''

رتن لال ایک کرسی پر بیٹھا سگریٹ کے گہرے گہرے کش لگا رہا تھا۔ ساتھ ہی گاہے بہ گاہے میری اور اجے سنگھ کی طرف بھی دیکھ لیتا تھا۔

''سر! آپ تو مجھے جانتے ہی ہیں کہ میں سرکار کا کتنا وفادار ہوں...... سرکار کو میری بے گناہی اور بہادری کا ضرور بتایئے گا۔'' میں نے اسے اپنی طرف دیکھتا ہوا پایا تو فوراً بولا۔

''وفادار تو میں بھی ہوں...... غدار تم ہو، فرار تم ہو رہے تھے، میں نہیں۔'' اجے سنگھ خاموش نہ رہ سکا۔ میں نے بھی رتن لال کو سامنے پا کر دانستہ اجے سنگھ کی طرف دیکھ کر اس سے کہا۔

''تم اپنا جرم مجھ پر تھوپنے کی سازش میں کبھی کامیاب نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ رتن لال صاحب کے ساتھ میں نے کئی مہمات میں اپنی جان پر کھیل کر ساتھ دیا ہے۔''

یہ کہتے ہوئے میں نے دزدیدہ نظروں سے رتن لال کی طرف دیکھا تو اسے پُرغور سے انداز میں اپنا سر ہلاتے ہوئے دیکھا۔ اس میں اسی قدر حقیقت تھی کہ اس روز بھولاناتھ اور اس کے ٹولے سے ہونے والی لڑائی میں دیال داس ان کے ہی ہمراہ تھا جسے قابو کرنے کے بعد میں نے اس کا روپ دھار لیا تھا۔ اس لیے میں نے اسی بات کے حوالے سے یہ بات اجے سنگھ کو جتائی تھی اور مجھے پوری امید تھی کہ رتن لال اب بلراج سنگھ کے سامنے بھی میری سفارش کر سکتا تھا۔ جواب میں اجے سنگھ نے بھی مجھ سے کچھ کہنا چاہا تو رتن لال نے اسے جھڑک دیا۔

''منہ بند رکھو اپنا ابھی بلراج صاحب آجاتے

ہیں۔ فیصلہ ہو جائے گا۔ وہ لاشوں کا جائزہ لینے گئے ہوئے ہیں...... ابھی آ کر وہ تم دونوں سے ایسے سوالات کریں گے کہ انہیں خود ہی پتا چل جائے گا کہ تم دونوں میں سے اصل مجرم کون ہے اور کون چالاکی چلنے کی کوشش کر رہا ہے۔''

میں خاموش ہو گیا۔ اجے نے بھی چپ سادھ لی۔ مگر میرے اندر جو بے چینی تھی سوا ہوتی جا رہی تھی۔ مجھے اصل خطرہ اس بات کا نہیں تھا کہ فیصلہ کس کے حق میں ہوتا ہے۔ بلکہ خدشہ جو حقیقت میں مجھے پریشان کیے ہوئے تھا وہ میرے پہچان لیے جانے کا تھا۔ اگر فیصلہ میرے حق میں بھی ہوتا، جس کی مجھے کافی حد تک امید تو تھی لیکن اگر بلراج سنگھ میری اصلیت کو اپنی کسوٹی پر پرکھ لیتا تو معاملہ میرے تصور سے بھی زیادہ سنگین ہو سکتا تھا، حد تو یہ تھی کہ میں اب ذہنی طور پر بھی خود کو اس خطرے کے لیے تیار کرنے لگا تھا کہ اگر خدانخواستہ ایسا ہو بھی جاتا ہے تو مجھے پہلے سے اپنے دفاع کے لیے کچھ نہ کچھ سوچ لینا چاہیے، مگر کافی غور و خوض کے باوجود میں نے خود کو سرِدست بے بس ہی پایا۔

اسی وقت میرے سیدھے ہاتھ کے ایک کچے دھول اڑاتے راستے پر مجھے ایک سے زائد گاڑیوں کی آوازیں آتی ہوئی سنائی دیں۔ رتن لال ایک دم الرٹ ہو گیا۔ اس نے اپنے آدمیوں کو بھی ایک مخصوص اشارہ کر دیا۔ خود میرا بھی دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ بلراج سنگھ سے یوں تو میرا پہلے بھی سامنا ہوتا رہا تھا۔ بلاشبہ وہ ایک دلیر مگر سفاک اور کینہ پرور دشمن تھا۔ میرا اس کا سامنا جب بھی ہوا تھا وہ کسی اور ہی حالات میں ہوا تھا مگر اب بات اور تھی۔ وہ اب بالادست تھا اور میں زیر دست، ایک ذرا سی بھی مجھ پر شبے کی بھنک پڑتے ہی وہ مجھے دوسرا سانس لینے کا موقع دیے بغیر ہی گولی مار سکتا تھا، جبکہ میرے لیے مفر کی کوئی راہ ہی نہ ہوتی۔

اسی وقت دو گاڑیاں آگے پیچھے دوڑتی ہوئی چشم زدن میں ہمارے سامنے آ کر رک گئیں اور آگے والی گاڑی میں بلراج سنگھ کو دیکھ کر میری سانسیں بھی سینے میں اٹکنے لگیں۔

اس نے پی کیپ چڑھا رکھی تھی، پیروں میں لانگ بوٹ تھے۔ بائیں پہلو پہ بیلٹ کے ساتھ ہولسٹر جھول رہا تھا، جس میں سے ایک خوفناک سیاہ رنگ کے ریوالور کے دستے کی جھلک صاف نظر آ رہی تھی۔ اس کے عقب میں چار گن بردار بھی تھے۔ بلراج سنگھ نیچے اتر آیا، باقی لوگ بھی نیچے اتر آئے، پیچھے والی جیپ میں سچانند اور اس کے ساتھی تھے وہ بھی نیچے اتر آئے تھے۔ رتن لال کے مطابق غالباً سچانند، بلراج سنگھ کو رام گوپال اور وجے کی لاشوں کا معائنہ کروا آیا تھا۔

ہٹ کے اندر سے ایک آدمی دوڑتا ہوا نمودار ہوا۔ اس نے ایک بڑی سی کرسی سنبھالی ہوئی تھی جو اس نے عین میرے اور اجے سنگھ کے سامنے ہی ذرا فاصلے پر رکھ دی۔ وہ یقیناً بلراج سنگھ کے بیٹھنے کے لیے تھی۔

بلراج سنگھ نے ہم دونوں پر بہ ظاہر ایک سرسری سی نگاہ ڈالی اور پھر میں نے دیکھا کہ رتن لال، جو اس کے قریب آ گیا تھا، اس کے کان میں کچھ کھسر پسر کرنے لگا۔

اس کے بعد بلراج سنگھ کو میں نے اجے سنگھ کی طرف بڑھتے دیکھا اور اسے بولنے کو کہا تو اجے جیسے بولنے کا ہی منتظر تھا۔ فر فر شروع ہو گیا اور جو کچھ بھی اس نے کہا وہ سارا جھوٹ ہی تھا۔ میں اس دوران چپ ہی رہا تھا۔

جب اجے کی بکواس ختم ہو گئی، جسے بلراج سنگھ نے یک ٹک سی سرد مہری اور اسی انداز کی نظروں سے اس کی طرف گھورتے ہوئے سنی تھی۔ اس کے بعد بلراج سنگھ نے اسے اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کیا۔ مجھے اجے کا چہرہ پُرامید سا محسوس ہونے لگا۔ میرا دل کسی خیال سے دھڑکنے لگا۔

بلراج سنگھ نے اسے میرے دائیں جانب اپنے سامنے کھڑے ہونے کا اشارہ کیا اور پھر میرے بالکل قریب آن کھڑا ہوا۔

جب وہ میرے عین سامنے کھڑا ہو گیا تو میں نے اس کی طرف دیکھا۔ وہ چند ثانیے میرے چہرے کو تیز بھانپتی ہوئی نظروں سے گھورتا رہا تو میں نے اپنا چہرہ تھوڑا سا جھکا لیا۔ میرے اندر کی حالت شدید اتھل پتھل کا شکار تھی۔ اس کی سپاٹ خاموشی سے مجھے یوں لگتا تھا جیسے وہ ابھی اپنے ہولسٹر سے ریوالور نکال کر ایک عدد گولی میری پیشانی میں ٹھونک دے گا۔

''تم بتاؤ، کیا معاملہ تھا یہ......'' دوسرے ہی لمحے اس کی گمبھیر اور پاٹ دار آواز میرے کانوں سے ٹکرائی، میرے اندر دور تک یک گونہ سی طمانیت اترتی چلی گئی۔ اپنے بڑے دشمن کے سامنے میری پہلی کامیابی نے میرے ڈھتے ہوئے حوصلوں کے بادبان بلند کر دیے تھے۔ وہ مجھے نہیں پہچان پایا تھا۔

''......مگر یاد رکھنا، حقیقت کیا ہے، میں اس کی تہ تک پہلے ہی پہنچ چکا ہوں۔ اس لیے جھوٹ مت بولنا۔'' اس نے کھرکھراتے لہجے میں اپنا جملہ مکمل کیا اور تب پہلی بار مجھے اپنے رگ وپے میں ایک سنسناتی ہوئی لہر دوڑتی محسوس ہوئی تھی۔ جانے کیوں اس کی تہدید میں مجھے موت کی نامعلوم سی سرسراہٹ محسوس ہوئی تھی۔

تب ہی میں نے پورے اعتماد کے ساتھ اسے وہی حقیقت بتانا شروع کردی، جو میں اسے بتانے کا پہلے ہی سوچ چکا تھا۔ حقیقت تو وہی تھی جو اجے سنگھ اور وجے نے میرے اور گوپال کے خلاف سازش کے طور پر تیار کی تھی۔ لیکن اب اس کا ذکر کرنا خوامخواہ ہی معاملے کو طول دینے کے مترادف ہوتا، جبکہ اجے سنگھ کی چال میں پہلے ہی اسی پر الٹ چکا تھا اور اس طرح مجھے وہ ایک کھلا اور آسان موقع دے چکا تھا۔

چنانچہ میں نے اس موقعے سے ہی فائدہ اٹھاتے ہوئے بلراج سنگھ کو بتایا کہ مجھے ان تینوں پر پہلے ہی شبہ ہو چکا تھا کیونکہ ان تینوں کو اکثر میں نے آپس میں باتیں کرتے ہوئے پایا تھا اور جب میں ان کے پاس جاتا تو یہ ایک دم خاموش ہو کر کوئی اور بات چھیڑ دیا کرتے تھے۔''

''یہ جھوٹ......'' اجے سنگھ نے درمیان میں چلانا چاہا تھا کہ اسی وقت بلراج سنگھ کا ایک ہاتھ حرکت میں آیا اور اجے سنگھ کے گال پر اس کے بھاری ہاتھ کا زوردار تھپڑ پڑا۔ اجے سنگھ کئی قدم پیچھے کی طرف لڑکھڑاتا چلا گیا۔

''تمہیں بولنے کا موقع دے دیا گیا تھا۔ دوبارہ بولنے والے کو میں گولی مار دیا کرتا ہوں۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے اپنے ہولسٹر سے ریوالور نکال لیا۔ اعشاریہ، اڑتالیس بور کے اس ریوالور کی گولی کھوپڑی کے آر پار ہو جایا کرتی تھی۔

میں نے بات جاری رکھی۔ ''یہ تینوں میرا عندیہ بھی لینے کے لیے کچھ ایسی باتیں کیا کرتے تھے جیسے میرے بارے میں یہ اندازہ لگا سکیں کہ میں یہاں خوش ہوں یا نہیں۔ مگر چونکہ مجھے یہاں کام کرنے میں لطف آرہا تھا، اور خود کو میں سرکار کا نمک خوار ہی نہیں، بلکہ احسان مند بھی سمجھتا تھا، یہی وجہ تھی کہ میں .... رتن لال صاحب کے ساتھ بڑی بڑی مہمات میں شامل رہا ہوں۔ کوئی بڑا کارنامہ تو میں نے انجام نہیں دیا ہے مگر پیچھے بھی آج تک نہیں ہٹا ہوں۔ میں بتا رہا تھا کہ جب ان تینوں نے دیکھ لیا کہ میں یہاں خوش ہوں اور اکثر انہیں یہ بھی بتایا کرتا تھا کہ عنقریب یہ جگہ ایک اسٹیٹ کا درجہ رکھنے والی ہے اور ہم سب بہت جلد اچھے عہدوں پر فائز کیے جانے والے ہیں تو یہ مجھ سے دور ہونے لگے۔ کیونکہ یہ تینوں خود کو یہاں ایک قیدی کی طرح محسوس کرتے تھے۔ مگر میں بھی ان کی تاک میں رہنے لگا، بلکہ سچی بات تو یہ تھی کہ مجھے ان سے اپنی جان کا خوف ہونے لگا تھا کہ کیا خبر یہ مجھے سوتے میں ہلاک کر کے خود نکل جاتے۔ میں نے بھی ان سے کترانا اور دور رہنا شروع کردیا۔

کل رات یہ تینوں گشت کے بہانے سے نکلے تو میں نے ان کا پیچھا کیا۔ یہ تینوں واقعی فرار ہونے کی کوشش میں تھے۔ ان کا پیچھا کرتے ہوئے جب یہ لوگ ایک مقام پر آکر رک کر آپس میں باتیں کرنے لگے تو مجھے لگا کہ رام گوپال اور وجے بالکل بھی میری طرح اس فرار سے ناخوش تھے اور خوف زدہ بھی۔ مگر یہ اجے سنگھ بدستور ان کی ہمت بندھائے جا رہا تھا۔ تب ہی میں نے اچانک ان کے سامنے آکر انہیں سمجھانے کی کوشش کرنی چاہی لیکن مجھے بعد میں احساس ہوا کہ یہ میری غلطی تھی۔ انہوں نے مجھ پر حملہ کر دیا۔ گولیاں بھی چلیں اور غلطی میں ایک دوسرے کو بھی لگیں، مگر میں اجے سنگھ کو زندہ پکڑنے میں کامیاب ہو گیا اور فوراً میں نے فلش گن سے سرخ سگنل فائر کر دیا۔ شکر تھا کہ سچانند کی گشتی ٹیم بلیو آر وہاں پہنچ گئی اور ان لوگوں نے اجے سنگھ کو میری گرفت میں دیکھا۔''

میں اتنا بتا کر خاموش ہو گیا۔ بات جھوٹ تھی یا سچ، مگر گھوم پھر کر ایک طرح سے سچ پر ہی مبنی تھی۔ کیونکہ اجے نے تو واقعی ایسا منصوبہ بنا رکھا تھا، بلکہ اس سے بھی زیادہ کریہہ ناک تھا، یعنی مجھے اور رام گوپال کو دھوکے سے ہلاک کرنا اور پھر پیشی میں سرخ رُو ہونا۔

اسی وقت بلراج سنگھ نے اپنے ہاتھ میں پکڑے ہوئے ریوالور کی نال کا رخ میری پیشانی کی طرف کر دیا اور میرا دل اچھل کر حلق میں آن اٹکا۔

پل کے پل مجھے یوں لگا جیسے بلراج سنگھ میری اس جھوٹ سچ کی پلاننگ کو جان گیا تھا۔ جبکہ اجے سنگھ کے چہرے پر ایک دم بشاشت اور خوشی کے آثار نمودار ہوتے چلے گئے تھے۔ بلراج سنگھ کی گھورتی ہوئی زہرناک نظریں میرے چہرے پر جم کر رہ گئی تھیں۔ میرے لیے اب اپنے بچاؤ کے لیے کچھ نہ تھا۔ بلراج سنگھ کو جنرل کے ایڈ ڈوائی کی طرف سے ہر قسم کا ''فری ہینڈ'' ملا ہوا تھا۔

اس کے ریوالور کی بھیانک نال کا رخ میری جانب تھا اور ٹریگر پر انگلی ایک ذرا جنبش کی منتظر تھی کہ اسی وقت بلراج سنگھ کا یہی ہاتھ اچانک ہی متحرک ہوا اور ''ٹھائیں'' سے اس نے گولی چلا دی۔ میرے ساتھ کھڑا اجے سنگھ آواز نکالے بغیر ڈھیر ہو گیا۔ اس کی پیشانی سے خون کی لکیر بہہ نکلی تھی۔ میرے سینے میں اٹکی اٹکی ہوئی سی سانس خارج ہو گئی، مگر اب بھی کچھ پتا نہ تھا کہ میرے بارے میں بلراج سنگھ کیا فیصلہ صادر کرتا ہے؟

اس کے ایک ہی اشارے پر اجے سنگھ کی لاش کو وہاں سے ہٹا دیا گیا۔ اس کے بعد بلراج سنگھ میری جانب مڑا اور بہ غور آنکھیں سکیڑے میرے چہرے کی طرف دیکھنے لگا۔ اس جلاد صفت کو اپنی جانب اس طرح گھورتے پا کر سینے میں میرا دل جیسے رک رک کر دھڑکنے لگا۔ اس کے بعد اس نے رتن لال کی طرف دیکھ کر اسے مخصوص اشارہ کیا اور پھر خود تیز تیز قدموں سے اپنے ہٹ کے دروازے سے اندر داخل ہو گیا۔ سچانند اور رتن لال وہیں کھڑے رہے تھے، البتہ بلراج سنگھ کے وہاں سے جاتے وقت ان دونوں نے مؤدبانہ انداز میں اپنے سر کو جنبش دی تھی۔

''چل اوئے، تیری تو مکتی ہو گئی۔'' رتن لال میری طرف دیکھ کر مسکرایا اور میں یونہی دانستہ ہونق چہرے کے ساتھ اس کا منہ تکنے لگا تو وہ پاس ہی کھڑے مسکراتے ہوئے سچانند سے بولا۔

''اسے اپنی جگہ پر چھوڑ آؤ...... لگتا ہے اس کے پو بارہ ہیں۔''

سچانند نے بھی معنی خیز انداز میں اپنا سر ہلایا تھا۔ اس کے بعد اس نے مجھے آنے کا اشارہ کیا، میں گم صم سا ہی کھڑا تھا، فوراً اس کی جانب لپکا۔ اب میرے ساتھ ان کا رویہ بدل گیا تھا۔

میں سچانند کی جیپ میں سوار ہو گیا اور وہ روانہ ہو گئی۔ جیپ میں صرف میں اور سچانند تھے، تیسرا ڈرائیور تھا۔

''لگتا ہے تم نے چھوٹے سرکار کا من جیت لیا ہے، وہ بہت جلد تمہارے بارے میں کوئی فیصلہ کرنے کے موڈ میں دکھائی پڑتے ہیں۔ اپنے چھوٹے سرکار بلراج صاحب ہیں بھی بڑے دیالو، ایک بار کسی کی وفاداری جانچ لیں تو سمجھو وارے نیارے ہیں اس کے......''

سچانند نے ایک ذرا گردن موڑ کر میری طرف دیکھتے ہوئے کہا اور پھر ونڈ اسکرین کے پار دیکھنے لگا۔ میں اس کی عقب والی سیٹ پر بیٹھا تھا۔ اس کی بات نے میرا سیروں خون بڑھا دیا تھا۔ اگر وہ درست کہہ رہا تھا، جس کی کسی حد تک مجھے بھی امید تھی تو یقیناً پھر میں نے بلراج سنگھ جیسے آدمی کو بلف کر کے ایک بڑا پالا مار لیا تھا۔

تقدیر نے اکثر و بیشتر اس طرح بھی میری مشکل راہوں کو آسان کیا ہے کہ میرے خلاف دشمنوں کی چلائی ہوئی چالیں خود انہی پر الٹ دیں، جیسا کہ اب ہوا، اجے سنگھ میرے خلاف جو گڑھا کھودے ہوئے تھا وہ خود اسی میں جا گرا تھا اور اس کا فائدہ میری جھولی میں آن گرا تھا۔

سچانند کی باتوں سے مجھے لگا تھا کہ میرا عہدہ ترقی پانے والا تھا۔ دوسرا مجھے اجے سنگھ کی وہ رازدارانہ گفتگو کے الفاظ بھی یاد تھے جو میں نے چھپ کر سنے تھے جس میں وہ وجے کو اپنے ساتھ ملاتے ہوئے کہہ گیا تھا کہ ایک بار اگر سرکار کو ہماری وفاداری پر یقین ہو جائے تو سمجھو پو بارہ ہیں اور اب میں نسبتاً بہتر پوزیشن میں آنے والا تھا۔

میں اپنے جھونپڑے میں آ گیا تھا۔ خالی خالی جھونپڑے کو دیکھ کر مجھے وجے یاد آنے لگا اور مجھے افسوس بھی ہوا کہ اس نے اجے سنگھ کا ساتھ دے کر کتنی بڑی غلطی کی تھی اور اپنی جان سے ہی ہاتھ دھو بیٹھا تھا۔

جھونپڑے میں چھوڑنے کے بعد میری گن بھی مجھے لوٹا دی گئی تھی۔ مجھے بھوک اور اس سے زیادہ پیاس ستانے لگی تو میں فریج کی طرف بڑھا، اسے کھولا تو وہ خالی تھا۔ صرف بیئر کی ایک بوتل پڑی تھی۔ پیاس شدت اختیار کرنے لگی تو میں نے بیئر نکال لی اور اس کے لیبل پر چسپاں ٹیگ کو دیکھا تو وہ الکوحل فری نہ تھی، شدید پیاس کے باوجود میں نے اسے دوبارہ فریج میں رکھ دیا۔ لگتا تھا ان دونوں میں اجے سنگھ اور وجے نے سارا فریج ہی خالی کر دیا تھا۔ میں فریج کا دروازہ بند کر کے پلٹا ہی تھا کہ اچانک میں نے جھونپڑے کے دروازے پر کسی کی آہٹ سنی اور میں نے یک دم ہی گن کی جانب ہاتھ بڑھا دیا۔ دوسرے ہی لمحے ایک شخص لنگڑاتا ہوا اندر داخل ہوا اور بے اختیار میرے تنے ہوئے اعصاب پُرسکون ہوتے چلے گئے۔ وہ کھیل دادا تھا۔ اس کے چہرے پر ہنوز تفکر کے سائے لرزاں تھے۔ میں اسے دیکھتے ہی وفورِ جذبات تلے اس کے گلے لگ گیا۔

''یہ...... تیرے ساتھ کیا ہو رہا تھا، شہزی؟'' اس نے مجھ سے الگ ہونے کے بعد الجھن آمیز پریشانی سے پوچھا۔

''کچھ نہیں میرے یار! کیوں پریشان ہوتا ہے تو......'' میں مسکرایا۔ مجھے مسکراتا پا کر اس کی کچھ تسلی ہوئی اور وہ ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ میں نے ایک ذرا جھونپڑے سے باہر جھانکا اور پھر کھیل دادا کے قریب آ کر ہولے ہولے اسے ساری بات بتا دی۔ جسے سن کر وہ ششدر سا رہ گیا۔ پھر بولا۔

''شہزی تو ایک بڑے خطرے میں پڑنے سے نہ صرف بال بال بچا ہے بلکہ تو نے تو ایک بڑا پالا بھی مار لیا ہے۔ مگر یار! تو جتنا ان کے قریب ہوگا اتنا ہی خطرہ بھی تیرے لیے بڑھے گا۔'' میں نے اس کی بات پر خفیف سی

مسکراہٹ سے کہا۔

''جتنا بڑا فائدہ اتنا ہی بڑا خطرہ، اس کا مجھے بھی احساس ہے، پر یار دادا! اس کے بغیر کوئی چارہ بھی نہیں ہے، ویسے مجھے اسی دن کا تو انتظار ہے جب میں ان کی ناک کا بال بنوں گا اور پھر ان کی بیخ کنی کروں گا۔'' پھر ایک لمحہ ذرا توقف کے بعد اس سے بولا۔

''پر یار کبیل! تو ابھی خود کو محدود ہی رکھنا، میں نے فلم آگے چلادی ہے، اس کے ختم ہونے کا انتظار ضرور کرنا، ورنہ سارا کھیل بگڑ جائے گا۔''

''مگر مجھے اول خیر اور شکیلہ کی فکر ستارہی ہے شہزی!'' وہ بولا۔ ''وہ دونوں بے چارے ان کی قید میں ہیں اور بیگار کاٹ کاٹ کر ان کی بہت بری حالت ہورہی ہے۔''

''اس کا احساس مجھے بھی ہے کبیل دادا!'' میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے آزردہ سے لہجے میں کہا۔ ''میں بہت جلد ان کے لیے بھی کچھ کرتا ہوں۔''

''ایک خبر ہاتھ لگی ہے میرے......'' کبیل دادا نے موضوع بدلا۔

''کیسی خبر؟'' میں نے بھویں سکیڑ کر اس کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ ٹھیک اسی وقت مجھے باہر کسی گاڑی کی آواز سنائی دی۔ ہم دونوں ہی ٹھٹک گئے۔ میں نے اسے اسی طرح بیٹھے رہنے کا کہا اور جلدی سے اٹھ کر جھونپڑے سے باہر آگیا۔

سامنے ہی ایک نیلے رنگ کی بند وین کھڑی تھی۔ اس میں ایک ڈرائیور اور اس کے برابر میں ایک گھٹی ہوئی جسامت کا آدمی سوار تھا۔ وہی دروازہ کھول کر نیچے اترا تھا۔ پھر اس نے مجھے آنے کا اشارہ کیا اور وین کا عقبی دروازہ سلائیڈ کیا۔

''سرکار نے تیرے لیے کچھ کھانے پینے کی چیزیں بھیجی ہیں۔ اعلیٰ درجے کی ولایتی شراب کے علاوہ انواع و اقسام کے کھانے پینے کی چیزیں...... لے سنبھال۔''

اس نے ہنستے ہوئے کہا اور مجھے دروازے کے قریب آنے کا اشارہ کیا۔ اس میں کھانوں کے مہر بند ڈبے، صاف پانی کی بوتلیں اور مشروبات تھے۔ مجبوراً مجھے شراب کا ایک چھوٹا کریٹ بھی اٹھانا پڑا۔ یہ ساری چیزیں میں نے وین سے اس آدمی کی مدد سے اتروالیں، اس کے بعد وہ دروازہ بند کرکے وین میں بیٹھ کر چلا گیا۔

میں یہ ساری چیزیں خود پر لاد کر جھونپڑے میں چلا آیا اور فرش کے درمیان میں رکھ دیں۔

کبیل دادا جھونپڑے کی کھڑکی نما سوراخ سے لگا کھڑا تھا۔ مسکرا کر بولا۔ ''واہ رے شہزی! لگتا ہے تیری موجوں کے دن آرہے ہیں۔''

میں نے سب سے پہلے کھانے پینے کی اشیا ایک طرف کیں اور دو ڈبے اس کی طرف بڑھا دیے۔ ایک کٹر بھی اسے تھما دیا۔ وہ کین سنبھالے کٹر سے اس کی سیل کھولنے لگا اور پھر میں نے اسے چمچ تھما دیا وہ اس میں سے فروٹ کے ٹکڑے نکال کر کھانے لگا۔ باقی چیزیں میں نے کچن میں سیٹ کردیں۔ کچھ پکانے کی اشیا بھی تھیں جو... فریج میں رکھ دیں۔

''ایک ہیلی کاپٹر ہفتے میں ایک بار آتا ہے، یہ ساری چیزیں اعلیٰ درجے کی اسی میں شہر سے لائی جاتی ہیں۔'' وہ کھانے کے دوران بتانے لگا۔

''تم کوئی خبر لائے تھے؟'' میں نے اسے یاد دلایا اور خود بھی ایک کین کٹر سے کھولنے کے بعد اس کے سامنے والی کرسی پر براجمان ہوگیا۔

''اب تجھے بھی جلد سب معلوم ہوجائے گا پر مجھے صرف اتنا ہی معلوم ہوسکا ہے کہ یہاں ایک بڑی گیم کھیلی جارہی ہے، اپنی جان کا رسک لے کر میں نے ان کا ایک اہم راز جان لیا ہے۔ مگر شہزی! مجھے سب سے زیادہ فکر شکیلہ اور اول خیر کی ہورہی ہے۔ ڈرتا ہوں آگے جاکر ان کے ایک بڑے کھیل میں ہم سب کہیں کھو نہ جائیں۔''

وہ مجھے خاصا دل برداشتہ سا نظر آنے لگا۔ میں نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا اور ازراہِ تشفی بولا۔ ''کبیل دادا! حوصلہ رکھو، ہم دونوں ساتھ ہیں اور ایک طرح سے آزاد بھی۔ اول خیر اور شکیلہ سے تمہاری ملاقات آسان ہوتی ہے، میری نہیں، تم انہیں میری طرف سے حوصلہ دیتے رہا کرو۔'' میری بات پر کبیل دادا خفیف سی مسکراہٹ سے بولا۔

''ان دونوں کا تو اسی روز حوصلہ آسمان کو چھونے لگا تھا جب انہوں نے تمہیں دیکھا تھا۔ پر خیر! میں تجھے بتاتا ہوں۔ جنزلی کے ایل ایڈوانی یہاں اپنی جوائنٹ ڈارک کیسل کے نام سے بنوانا چاہتا ہے، ممکن ہے اس کے پسِ پردہ اس کا اپناوہ بھیانک منصوبہ ''ورلڈ بگ بینگ'' ہی کارفرما ہو، مجھے اب پتا چلا ہے کہ جاوا کی یہ سرزمین اس کے لیے اہم کیوں تھی۔ ایک بھارتی مسلم شخص نصیر شاہ جو ایک بہت بڑی کان کن کمپنی ''ایموزون مائننگ کمپنی'' کا پراسپیکٹر ہے مگر درحقیقت وہ ایک قابل گریجویٹ مائننگ انجینئر ہے، اسی نے کئی سال پہلے یہاں ہیروں کی ایک کان

دریافت کی تھی۔ مگر اپنا کام شروع کرنے کے لیے اسے بہت بڑے سرمائے کی ضرورت تھی، جو اس کے پاس نہ تھا، ایموزون مائننگ نے اس کے لیے اپنے توسط سے بڑے بڑے بینکوں سے قرضہ بھی لینے کی کوشش چاہی تھی۔ مگر ایک تو قرضے کی رقم بہت زیادہ تھی، جو چالیس ملین ڈالر بنتی ہے، دوسرے یہ کہ اگر کسی بینک نے اتنا بڑا سرمایہ دینے کی ہامی بھری بھی تو اس کی شرائط سخت تھیں' ایک تو ان کا مارک اپ (سود) زیادہ تھا، دوسرے یہ کہ وہ کان دریافت ہونے کے بعد اس کی رائلٹی میں بھی حصہ داری چاہتے تھے۔ اسی دوران ہی اس کی بھنک جب جنرل ایڈوانی کو پڑی تو اس نے اسے اپنی ممبئی والی رہائش گاہ پر بلوالیا۔

جنرل ایڈوانی کو اپنے بھیانک منصوبے کی تکمیل کے لیے ایک تو ایسے دورافتادہ علاقے کی ضرورت تھی جسے وہ اپنی آزاد ریاست کا درجہ دے سکے، دوسرے وہاں سے اس کی مستقل مالی سپورٹ کا کوئی معقول بندوبست ہوتا رہے، جس کے تحت وہ کاروبارِ ریاست چلا سکے۔ نصیر شاہ سے جب اس کی ون ٹو ون ملاقات ہوئی تو اس کی باتیں سن کر ایڈوانی کو اپنے دیرینہ خوابوں کی تعبیر ملتی محسوس ہونے لگی۔ یعنی ایسا علاقہ جو اس کی خواہشات کے عین مطابق دورافتادہ بھی تھا اور یہاں دیگر معدنیات کے علاوہ ہیرے کی کان کی موجودگی کا بھی انکشاف کیا جاچکا تھا اور یہ انکشاف کسی عام آدمی یا بڑبولے نے نہیں بلکہ ایک منجھے ہوئے اور پروفیشنل پراسپیکٹر نصیر شاہ نے کیا تھا۔ جو خود بھی ایک بڑی مائننگ کمپنی کا دیرینہ رکن تھا۔ لہٰذا موقع شناس کے ایل ایڈوانی نے نصیر شاہ کو ہاتھوں ہاتھ لیا اور اسے چالیس ملین ڈالر کی خطیر رقم کا سرمایہ فراہم کرنے کی بھی ہامی بھرلی۔ بلکہ ہر طرح کے تعاون کا بھی یقین دلایا۔ اس کے بعد کی کیا صورتِ حال ہے، یہ ابھی پردے میں ہے۔ اب پتا نہیں اس بے چارے کو اغوا کر کے اِدھر کہیں چھپا رکھا ہے، ہلاک تو اسے نہیں کرسکتے، کیونکہ ہیروں کی کان تک رسائی اور اس کی کھدائی وغیرہ پر وہ اتھارٹی رکھتا ہے، کیونکہ وہ ایک گریجویٹ مائننگ انجینئر اور کان کنی کا بڑا قابل شخص سمجھا جاتا ہے۔"

کبیل دادا اتنی صراحت بتانے کے بعد خاموش ہوا تو میری پُرغور سی نظریں ہنوز اس کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ ایک ذرا سانس لینے کے بعد اس نے دوبارہ کہا۔

"چونکہ جنرل ایڈوانی کا اصل منصوبہ ورلڈ بگ بینگ ہے اور اس کی وجہ وہ اس طلسمِ نور ہیرے کو بنانا چاہتا ہے، جو پاکستان کے علاقے موئن جودڑو سے برآمد ہوا تھا۔ وہ اب بہت جلد اس ہیرے کو وجہ نزاع بنا کر روس، پاکستان اور بھارت کے بیچ جنگ چھڑوانا چاہتا ہے۔ طلسمِ نور ہیرا چونکہ پاکستان کی ملکیت ہے، مگر جنرل ایڈوانی اس ہیرے کو جان بوجھ کر روس کی ملکیت ظاہر کرے گا، ان شورش پسند جرنیلوں کے ہرکارے ایک پورے نیٹ ورک سسٹم کے تحت مذکورہ ممالک میں پھیلے ہوئے ہیں، یہ پروپیگنڈا مختلف ممالک سے کیا جائے گا۔ بھارت میں بھی یہی پروپیگنڈا ہوگا، آج کل پاک بھارت کے تعلقات یوں بھی خطرناک حد تک خراب ہوچکے ہیں، بھارت کو جیسے ہی اس کا علم ہوگا کہ طلسمِ نور ہیرا اس کی ملکیت ہے وہ پاکستان پر بپھر جائے گا۔ امریکا اور اسرائیل اس کی مدد میں شامل ہوں گے۔ پاکستان کے ساتھ چین کے مفادات منسلک ہیں، چین بھی حلیف بن کر اس جنگ میں کودے گا تو اُدھر روس بھی لامحالہ بھارت کا ساتھ دے گا، جبکہ بھارت کے ساتھ بھوٹان، مالدیپ اور سری لنکا وغیرہ پہلے ہی ساتھ ہیں، کیونکہ بھارت ان کا خود ساختہ "منی سپر پاور" بنا ہوا ہے۔

پاکستان کے ساتھ چین شامل ہوگا تو ایران بھی مدد کو کود پڑے گا، کیونکہ امریکا اور اسرائیل کو بھارت کی مدد کرتے ہوئے ایران بھی برداشت نہیں کرسکے گا۔ پہلی عالمی جنگ میں بھی تو یہی کچھ ہوا تھا، پہلے دو ممالک کے درمیان ٹھنی تو سارے ہی ملک حلیف یا حریف ہونے کے ناتے اس میں کود پڑنے پر مجبور ہوگئے تھے۔"

میں کبیل دادا کی ان ساری معلومات پر دنگ رہ گیا تھا، اگرچہ اس حد تک مجھے بھی جان کاری تھی، مگر یہ بہت اہم راز تھا اور ماسوائے چند افراد کے کسی کو اس کا علم نہ تھا۔ جس کا مطلب تھا کبیل دادا نے یہاں رہتے ہوئے یہ اہم ترین معلومات اپنی جان پر ہی کھیل کر حاصل کی ہوں گی، اور میں تو جانتا ہی تھا، تاہم جنرل ایڈوانی کے اسٹیٹ ڈارک کیسل کو بنانے کا مقصد بھی یہی تھا کہ وہ طلسمِ نور ہیرے کا شوشہ چھوڑنے سے پہلے "ڈارک کیسل اسٹیٹ" کی تکمیل چاہتا تھا تاکہ وہ اس دور دراز علاقے میں اپنا "کام" بہ احسن وخوبی انجام دے سکے اور میں اسے ہیرے کا شوشہ چھوڑنے سے پہلے اس کی اسٹیٹ کو ہی ایڈوانی سمیت نیست ونابود کردینا چاہتا تھا۔ اب تو یہ اور بھی ضروری ہوگیا تھا، اس میں صرف میرے ملک کی بقا ہی نہیں بلکہ عالمِ انسانیت کی بھی بقا شامل تھی۔

وہ مجھے یک ٹک کسی پُرسوچ خاموشی میں پا کر گہری تشویش تلے آگے بولا۔ "شہزی! اسی لیے کہتا ہوں کہ ڈارک کیسل کی یہ منحوس ریاست وجود میں آنے سے پہلے ہی

ہمیں یہاں سے کوچ کر جانا ہوگا۔‘‘

میں نے پُرسوچ انداز میں ہونٹ بھینچتے ہوئے اپنے سر کو ہولے سے اثباتی جنبش دی اور پھر ایک گہری ہمکاری خارج کرتے ہوئے بولا۔ ’’کبیل دادا! یہاں میرے پیشِ نظر اور بھی بہت کچھ ہے۔ سب سے پہلا اور اہم مقصد عابدہ کی رہائی ہے۔ جس کے لیے میں ایسا کوئی گراؤنڈ بنانے کی تگ و دو میں ہوں کہ عابدہ کو اسیر کرنے والے دشمن خود میرے آگے گھٹنے ٹیک کر عابدہ کو میرے حوالے کرنے پر مجبور ہو جائیں۔ اس کے لیے میں نے امریکی سی آئی اے سینٹر کے ڈی ایجنٹ اور ٹائیگر ٹیگ کے چیف باسکل ہولارڈ کو جھکانا ہے اور اس کی پڑیا اس کے چہیتے داماد براز یلین نژاد لولوڈش کے پاس ہے، جو آج کل رنگون میں ہی مقیم ہے۔ اس کا ایک اہم برمی ہرکارا...... سے جی کو ہارا بھی یہاں میرے خون کا پیاسا ہو رہا ہے۔ جبکہ بھارت کا ایک بڑا ڈان بھولا ناتھ کا ایک پورا گینگ میرے پیچھے ہے۔ اپنے وطنِ عزیز کی سرمایۂ حیات امانت طلسم نور ہیرا بھی میں نے جنرل کے ایل ایڈوانی سے حاصل کرنا ہے۔ لیکن اس سے پہلے میں تم تینوں کو یہاں سے بہ خیریت اپنے ملک پاکستان چلتا کروں گا۔‘‘

میں نے بہت پختۃ العزم ہو کر یہ سب کبیل دادا سے کہا تھا جسے سن کر وہ بھونچکا سا ہو کر میری صورت دیکھتا رہ گیا تھا۔ وہ شاید یہی سمجھے ہوئے تھا کہ میں بھی ان کے ساتھ ہی یہاں سے کوچ کرنے کا ارادہ رکھے ہوئے تھا۔ اگرچہ کبیل دادا کو بھی میری ان ’’پیشِ آئندہ‘‘ مہمات کا کسی حد تک اندازہ تھا مگر ان میں سے چند ایک سے وہ ناواقف بھی تھا۔

’’لل...... لیکن شہزی! ہم تیرے ساتھ ہیں اور تیری مدد کے لیے ہی بیگم صاحبہ نے ہمیں یہاں بھیجا تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ بھارت میں قدم رکھتے ہی خود ہم اس مردودی جی بھجوانی کے چنگل میں پھنس گئے، لیکن ہر بار ایسا نہیں ہو سکتا۔ مجھے تو تم دیکھ ہی رہے ہو، تمہاری غیر موجودگی میں خود بھی یہاں سے اپنی اور شکیلہ وغیرہ کی رہائی کے سلسلے میں کوشاں تھا۔ اب تم آگئے ہو تو یہ کام اور بھی آسان ہو جائے گا۔‘‘

میں نے کبیل دادا کی بات پر خفیف سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ’’کبیل! تم نے مجھے پاکستان میں بیگم ولا اور چوہدری ممتاز کے سلسلے میں جو حالات بتائے ہیں، مجھے ان کی طرف سے تشویش ہونے لگی ہے۔ دل تو یہی چاہتا ہے کہ تم لوگوں کے ساتھ میں بھی پاکستان کی طرف عازمِ سفر ہو جاؤں، مگر پھر سوچتا ہوں کہ تقدیر نے مجھے یہاں کے جن معاملات میں الجھا رکھا ہے وہ ان سے کہیں زیادہ اہم ہیں۔ لہٰذا میرا تمہیں یہی مشورہ ہے کہ تم، اول خیر اور شکیلہ یہاں سے رہائی پاتے ہی فوراً پاکستان نکل جاؤ۔ زہرہ بیگم اکیلی ہیں وہاں...... نوشابہ الگ گل کھلانے میں مصروف ہے۔ عارفہ اور سیٹھ نوید سانچے والا کا بھی کچھ نہیں پتا کہ وہ سانپوں کی جوڑی اب کون سا نیا گل کھلانے کے چکروں میں ہے، ممکن ہے ان دونوں نے اب تک شادی بھی کر لی ہو......‘‘

یہ آخری بات کہتے ہوئے میرے ذہن میں اچانک ہی سرمد بابا کی وصیت یاد آگئی جو اُن کے عائلی وکیل ایڈووکیٹ سلیم ہیرانی نے مجھے اور عارفہ کو پڑھ کر سنائی تھی، جس کے مطابق اگر ان کی بیوہ بہو، سیٹھ نوید سانچے والا سے شادی کر لیتی ہے تو اس کے پاس جائیداد اور کاروبار وغیرہ کی جو پاور آف اٹارنی ہے وہ ان کے پوتی پوتے پنکی اور ودانی کے نام منتقل ہو جائے گی، لیکن اگر وہ کسی اور شریف انسان سے شادی کرتی ہے تو پھر یہ پاور اسی کے پاس رہے گی۔ جبکہ اڈیسہ کمپنی کے شیئر کا حصہ (جو ہمارے نام تھا) اس کا نصف میرے نام اور باقی نصف پنکی اور ودانی کے نام تھا۔

اس سلسلے میں اس ضمیر فروش عورت عارفہ کیا چکر چلا سکتی تھی، وہ میری غیر موجودگی سے فائدہ اٹھا کر اس میں یقیناً مصروف ہوگی اور کوئی بعید نہیں کہ اس نے باسکل ہولارڈ کے علاوہ لولوڈش سے بھی اس سے سلسلے میں کوئی خفیہ ساز باز کر رکھی ہو۔ جیسا کہ سیٹھ نوید سانچے والا بھی اس کے ساتھ تھا اور یہ ساری پٹیاں وہی اسے پڑھواتا تھا۔ جس کے بارے میں سرمد بابا کو ہی نہیں بلکہ مجھے بھی پورا یقین تھا کہ وہ محض دولت اور وسیع و عریض کاروبار پر قبضہ جمانے کے لیے عارفہ کو بے وقوف بنائے ہوئے تھا اور اس کے احساسِ محرومی سے فائدہ اٹھانے کی تگ و دو میں تھا۔ پاکستان میں بھی بہت سے اہم اور گمبھیر معاملات حل طلب تھے۔

ایک لحہ توقف کے بعد میں نے کبیل دادا سے دوبارہ مخاطب ہو کر کہا۔ ’’کبیل دادا! تم اس کی فکر نہ کرو، جب میں دیکھوں گا کہ یہاں کے معاملات طول پکڑتے محسوس ہو رہے ہیں تو میں بھی پاکستان لوٹنے کی کوشش کروں گا پہلی فرصت میں...... اب میں اپنا ایک پاؤں ایک کشتی میں اور دوسرا دوسری کشتی میں رکھنے کے قابل ہو گیا ہوں...... بس! تقدیر اسی طرح یاوری کرتی رہے تو سمجھو دادا! ایک دن یہ سارے مسائل حل ہو جائیں گے۔‘‘

میں نے دیکھا کبیل دادا بڑے دھیان اور توجہ کے ساتھ میری یہ ساری باتیں سن رہا تھا، پھر حلق سے ایک گہری

سانس خارج کر کے بولا۔ ''شہزی! تیری باتیں سنتا ہوں تو یوں لگتا ہے جیسے حالات تجھے کسی خود فریبی میں مبتلا کیے ہوئے ہیں، لیکن پھر تیرا ماضی جھانکتا ہوں تو مجھے یہ بات سرے سے ہی غلط محسوس ہوتی ہے۔ ایک حوالے سے تو ٹھیک بھی لگتا ہے مگر دوسرے زاویہ نگاہ سے تو مجھے شدید الجھن کا بھی شکار لگتا ہے۔ شہزی! تو ہے کیا بلا آخر......؟''

کبیل دادا کی اس بات پر میں پھیکے انداز میں ہنسا اور بولا۔ ''میں کوئی بلا نہیں ہوں یار! بس، تمہاری طرح کا ہی ایک عام انسان ہوں میں بھی...... یہ الگ بات ہے کہ میں نے آج تک، چاہے جیسے بھی حالات ہوں، انہیں فیس کیا ہے، ایک چیلنج سمجھ کر اور کرتا رہوں گا کہ یہی میری سرشت بھی ہے اور شاید تقدیر کا لکھا بھی......''

پھر موضوع بدلتے ہوئے میں نے اس سے نصیر شاہ والی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے اس سے تبادلۂ خیال کی غرض سے مزید کہا۔ ''ایڈوانی کا درحقیقت اپنے مکروہ مفادات کی خاطر جاوا قبیلے کی اس ریاست پر غاصبانہ طور پر قابض ہونے کا اصل مقصد ان کے وسائل پر قبضہ جمانا تھا، جس میں وہ کافی حد تک کامیاب ہو چکا ہے۔ لیکن تقدیر نے اب مجھے بھی اس کا موقع دیا ہے کہ میں ان کے اندر گھس کر ان کا منصوبہ سبوتاژ کر سکوں، کیا خبر اس کے بعد مجھے کچھ ایسی آسانیاں میسر آ جائیں جس کے بل بوتے پر میں اپنے مزید دیرینہ مقاصد کی کشتی کو اور آگے کھینچ سکوں۔ اس دوران اگر پاکستان کا بھی مجھے ایک چکر لگانا پڑا تو میں پیچھے نہیں ہٹوں گا۔ یہ میرا تم سے وعدہ ہے کبیل دادا!''

''وہ تو ٹھیک ہے، شہزی!'' کبیل بولا۔ ''میرا خیال تو یہی تھا کہ ہم چاروں مل کر اس کام کو انجام دینے کی کوشش کریں تو پھر کامیابی کے بعد ہم پاکستان لوٹ جائیں گے، رہا مسئلہ عابدہ کا تو وہ اپنی جگہ اہم اور گمبھیر تو ہے ہی، اس کے لیے بیگم صاحبہ کا بھی یہی مشورہ تھا کہ ہم باضابطہ طور پر امریکا کا رخ کرتے اور عابدہ کی رہائی کے سلسلے میں کوئی قانونی پیش رفت کرتے۔''

میں اس کی بات سن کر تلخی سے مسکرایا۔ ''بے ضابطہ کو باضابطہ طریقے سے کبھی ختم نہیں کیا جا سکتا، دادا! اس کے لیے بھی مجھے وہی زبان اور وہی ہتھیار استعمال کرنا پڑے گا جس کے لیے میں کوشاں بھی ہوں اور پُرامید بھی......''

اس کے بعد میں نے کبیل دادا کو کچھ ہدایات دیں اور پھر وہ مجھ سے گلے مل کر رخصت ہو گیا۔

میں کچھ کھانے پینے میں مصروف ہو گیا۔ شام ہوئی تو ایک کار مجھے لینے آن پہنچی۔ یہ سرخ رنگ کی فورڈ کار تھی۔ اس میں ڈرائیور سمیت دو افراد سوار تھے۔ انہیں بلراج سنگھ نے مجھے لینے کے لیے بھیجا تھا۔ میں اس میں سوار ہو گیا اور کار روانہ ہو گئی۔

میرا دل کامیابی کے احساس تلے بے طرح دھڑک بھی رہا تھا مگر ساتھ ہی دل و دماغ خدشات کا شکار بھی تھے۔ میں دشمنوں کے قریب رہنا چاہتا تھا، مگر بلراج سنگھ کے قریب نہیں، کیونکہ ہم زیادہ نہیں تو دو ایک بار ضرور آمنے سامنے ہو چکے تھے، میری ایک ذرا سی غلطی اسے بدکا سکتی تھی، کبھی کبھی سامنا ہونے کی بات اور تھی (اگرچہ اس میں بھی مجھے پہچان لیے جانے کا دھڑکا لگا رہتا تھا)، ہاں، ایڈوانی وغیرہ کی اور بات تھی۔ لیکن بلراج میرا شکار بھی تھا، میں سب سے پہلے اسے جہنم واصل کر کے ایک طرف سوشیلا کا انتقام پورا کر لیتا تو دوسری طرف اپنے ایک سفاک اور زیرک دماغ دشمن سے بھی چھٹکارا پا لیتا۔ تاہم اب دیکھنا یہ تھا کہ آیا میری یہ ''پیشی'' خصوصی تھی یا عمومی؟ لیکن مجھے اتنی جلدی پیشی کی امید نہ تھی۔

کار کا سفر تھوڑی دیر اور جاری رہا تو مجھے کچھ اچنبھا سا ہوا، کیونکہ میرے اندازے کے مطابق ہٹ فور جہاں بلراج سنگھ رہتا تھا، وہ زیادہ دور نہ تھا، تو پھر کیا مجھے کہیں اور لے جایا جا رہا تھا؟ مگر کہاں؟ اور کس کے پاس؟

''کیا تم مجھے بلراج صاحب کے پاس لے جا رہے ہو؟''

''ہاں! بتایا تو تھا تمہیں!'' ڈرائیور کے برابر میں بیٹھے ہوئے اسی آدمی نے جواب دیا۔

''مگر اُن کا ہٹ تو اتنا دور نہیں تھا۔''

''خوش قسمت ہو کہ تمہیں بلراج نے اپنے ہٹ میں نہیں بلکہ بڑی سرکار کے ہاں بلایا ہے......'' اس نے جیسے انکشاف کیا اور میرے پورے رگ و پے میں موت کی سرسراہٹ زہریلے سانپ کی طرح رینگتی چلی گئی۔

''تت...... تمہارا مطلب ہے، بڑی سرکار، یعنی جنرل ایڈوانی صاحب؟'' میں نے دانستہ اپنے لہجے میں حیرت آمیز خوشی سموتے ہوئے کہا۔

''ہاں!'' اس نے مختصر جواب دیا۔ وہ مجھے زیادہ بولنے یا بتانے کے موڈ میں نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں بھی خاموش ہو گیا۔ میرے اندر سنسنی سی طاری ہونے لگی تھی۔ تقدیر مجھے دانستہ اپنے اہم ترین دشمن کی شہ رگ کے نزدیک پہنچانے پر تلی ہوئی تھی کہ میں وہاں پہنچتے ہی اس کا گلا گھونٹ دوں۔ حالات اب بھی غیر یقینی تھے۔ کچھ پتا نہیں تھا کہ جیتی

بازی ہار میں پلٹ جاتی یا پھر دشمنوں کے گڑھ میں میری گرفت مضبوط ہو جاتی۔

جیپ آبادی سے کافی دور شمال مشرق کی سمت ایک سنگلاخ سے علاقے میں داخل ہوگئی۔ نارتھ انڈیمان کے جزیرے کا یہ گوشہ ساحلِ سمندر کے قریب تھا، جاوا کی بستی کی حدود ادھر سے ہی شروع ہوتی تھی۔ یہاں کم بلند چٹانوں کا سلسلہ اور جنگل کا ملا جلا امتزاج تھا اس پر سونے پہ سہاگا، ساحلی علاقہ بھی تقریباً قریب ہی تھا، جس نے یہاں کی قدرتی خوبصورتی کو دوچند کر دیا تھا۔

ایسی ہی ایک نسبتاً کم بلند چٹان پر مجھے دور ہی سے ایک قلعہ بند سی عمارت کے آثار نظر آنے لگے جو نامکمل تھے۔ وہاں کچھ مزدور البتہ کام میں جتے ہوئے نظر آ رہے تھے۔

جھکی جھکی شام کے پس منظر میں اس عمارت کی بناوٹ دلوں میں ہیبت طاری کیے دے رہی تھی۔ کار اس بل کھاتے راستے پر آ گئی جو سیدھا قدرے عمودی اور ڈارک کیسل کی ادھوری عمارت کی طرف جاتا تھا۔ یہ پختہ اور کنکریٹ سے بنا ہوا تھا۔ اس کے دو رویہ تراشیدہ منڈیروں اور سنگ سرخ کا کام جاری تھا۔ روش کے اختتام پر ایک وسیع احاطہ تھا، جس کے ایک جانب فینسی حوض اور فوارے لگائے جا رہے تھے۔ ایک طرف کھلی نشست گاہ کے طور پر بناوٹ کا کام ادھورا پڑا نظر آ رہا تھا۔

کار سے ہم اتر آئے اور ایک نظر میں نے کھڑے ہو کر ڈارک کیسل کی اس عظیم الشان عمارت پر ڈالی، جس کی بناوٹ میں قدیم طرزِ تعمیر کو مدِنظر رکھا گیا تھا۔ میرے اندازے کے مطابق ڈارک کیسل کا کام چالیس فیصد تک ہو چکا تھا۔ پہاڑی مقام پر اس وسیع و عریض محل نما عمارت کی تعمیر آسان کام نہ تھا۔

''ابھی تو یہ عمارت پوری بنی بھی نہیں اور تم اس کے سحر میں اتنا کھو گئے۔'' مجھے لانے والے ٹھگنے شخص نے غرور و فخر تلے مجھ سے کہا۔ ''پوری بن جائے گی تو کہیں پاگل ہی نہ ہو جاؤ، چلو آگے بڑھو......''

بائیں جانب مجھے ایک ہیلی پیڈ بھی دکھائی دیا۔ وہاں ایک چوپر نظر آیا۔ اس کے ساتھ ہی عقبی چٹانوں کی طرف مجھے ایک سیدھی اور سپاٹ سی ائر اسٹریپ (ہوائی پٹی) بھی نظر آئی، گویا یہاں بوقت ضرورت فوکر یا جی سیون ٹائپ کے طیارے بھی اُڑائے جا سکتے تھے۔ کچھ بوسٹر قسم کے کنورٹر اور اینٹنا بھی نصب ہوئے نظر آ رہے تھے۔ ایک بڑے پیالے کی شکل کا ریسیور بھی نصب تھا جس کے درمیان میں روٹر لگا ہوا تھا۔

ہم دروازے کی خوبصورت محراب سے اندر داخل ہو گئے۔ ہم بلند چھت والے ہال میں آ گئے۔ وہاں کچھ لوگوں کو میں نے اریب قریب آتے جاتے دیکھا، ان میں نیلی اور خاکی لباس میں ملفوف افراد کی تعداد زیادہ تھی، جن کے سروں پہ پلاسٹک فائبر کی پی کیپ تھیں، ان کے ہاتھوں میں بڑے بڑے نقشے، فیتے اور تھری اسٹینڈ کیمرے تھے۔

''یہ سب پروفیشنل ہیں، یعنی انجینئرز......آگے بڑھتے رہو۔'' مجھے ان کی طرف غور سے دیکھتے پا کر ٹھگنے نے بتایا۔

ہم دونوں آگے بڑھتے رہے اور ایک نسبتاً بہتر کمرے میں داخل ہو گئے، نسبتاً بہتر سے میری مراد، یہ کمرا رہائش وغیرہ کے قابل بنایا گیا تھا۔ مجھے وہ اسی کمرے میں لے کر پہنچا تو اس کی اندرونی ساخت سے صاف پتا چلتا تھا کہ یہ بھی ایک عارضی طور پر ہی بندوبست تھا۔ چند کرسیاں اور ایک میز تھی۔ جو اِدھر اُدھر بکھری ہوئی تھیں، فرش پر بچھی دری بھی میلی اور بکھری بکھری نظر آ رہی تھی، قریب ایک بڑی سی آرام دہ مسہری تھی۔ مجھے ایک کرسی پر ٹھگنے شخص نے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور بولا۔ ''ادھر ہی بیٹھے رہنا، جب تک میں نہ آ جاؤں۔''

میں نے اس کی طرف دیکھ کر سر کو اثبات میں ہلا دیا۔ وہ چلا گیا۔ کمرے کے باہر لوگوں کے بولنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ کام کی رفتار مجھے خاصی تیز نظر آتی محسوس ہوئی تھی۔ اندر باہر انجینئر اور ورکرز بہ شمول مزدور سبھی تن دہی اور انہماک کے ساتھ کام میں مصروف تھے۔

بلراج سنگھ کی طرح یہاں بھی میرا معاملہ، یعنی جنرل ایڈوانی کے سامنے پیش ہونا، ویسا ہی تھا کہ کہیں یہ مردود ایڈوانی مجھے پہچان نہ لے، تاہم اس کی طرف سے مجھے ایک تسلی تو تھی کہ اس سے میری ایک ہی بار ملاقات ہوئی تھی، جب میں اس کی لاڈلی پوتی رینا کے ساتھ ہی شاید اس کے رُوبرو ہوا تھا۔

بہرکیف میں اسی طرح سوچتے ہوئے ذہن کے ساتھ بیٹھا رہا، پھر کچھ منٹ گزرے تو کمرے میں وہی ٹھگنا شخص بلراج سنگھ کے ساتھ نمودار ہوا، میں نے فوراً کرسی سے اٹھ کر اپنے دونوں ہاتھ جوڑ کر اسے سلام پیش کیا۔

''آؤ میرے ساتھ......'' اس نے سلام کا جواب دیے بغیر مجھ سے کہا اور جیسے الٹے قدموں واپس مڑا، میں اس کے پیچھے ہولیا۔

وہ کمرے سے نکلا اور دائیں جانب مڑ گیا۔ اس کی

چال خاصی تیز تھی، میں نے بھی اپنے پیروں کی رفتار بڑھادی۔ مجھے یہاں لانے والا ٹھگنا شخص عمارت سے باہر نکل گیا تھا۔

بلراج سنگھ مجھے مختلف راہداریوں، جن کے فرش کہیں کہیں سے اکھڑے ہوئے تھے اور ان میں سنگ مرمر جیسی ٹائلیں لگائی جارہی تھیں، چھتوں پر فانوس اور فینسی بلب بھی نصب کیے جارہے تھے، سے گزارتا ہوا ایک بڑے کمرے کے دروازے کے قریب پہنچ کر رک گیا اور مجھے کھڑے رہنے کا اشارہ کر کے وہ خود دروازے کو آہستگی کے ساتھ اندر دھکیلتا ہوا داخل ہو گیا۔

اس کے ذرا ہی دیر بعد اس نے اندر سے جھانک کر مجھے آنے کا اشارہ کیا اور میں دھڑکتے دل کے ساتھ آگے بڑھ گیا۔

اندر قدم رکھتے ہی مجھے ایسا لگا جیسے میں واقعی کسی مہاراجا کے محل میں داخل ہو گیا ہوں۔ سامنے ہی ایک اونچے سے تخت پر ایک بڑی اور اونچی پشت گاہ والی کرسی پر جنرل کے ایل ایڈوانی بڑے ''کروفر'' کے ساتھ براجمان تھا۔ اس نے لباس بھی شاہی طرز کا راجا مہاراجوں والا پہنا ہوا تھا۔ زرق برق، چمکتا ہوا اور چہرے پر شاہوں والی رعونت اور آنکھوں میں سردمہری اور ہونٹوں پر تحکمانہ سا رعب و دبدبہ...... وہ شاید مجھے اپنی ادھوری شان و شوکت دکھا کر مرعوب کرنا چاہتا تھا، یا شاید اپنے جن وفاداروں کو یہاں بلواتا تو وہ انہیں اسی حالت میں ہی ملتا تھا۔ میں نے بھی جیسے فوراً ہی مرعوب ہونے کی ایکٹنگ کرتے ہوئے...... خود کو اس کے سامنے جھکا دیا اور خاص نوکر شاہی انداز میں بولا۔

''عالم پناہ! یہاں آنا اور آپ سے ملنے کا شرف پانا مجھ جیسے ایک ادنیٰ خادم کے لیے باعثِ فخر و خوشی کی بات ہے، مگر اس سے بڑھ کر اپنی قسمت پر نازاں بھی ہوں کہ مجھے یہ شرفِ باریابی بخشا گیا۔ جس کی میں اب ہر بار ہی آشا رکھوں گا۔''

نہایت نپے تلے لب و لہجے میں یہ سب کہا تو ایڈوانی کا چہرہ مزید رعونت اور پُرغرور سا نظر آنے لگا۔ میں اس بدبخت کی مطلق العنان ذہنیت اور سوچ سے اچھی طرح واقف تھا۔ ایک جابر جنرل اور ہٹلر جیسے عالم غارت گر جیسی متاعِ خرد و خور رکھنے والے انسان سے ایسی ہی ''آکڑ'' رکھنے کی توقع کی جاسکتی تھی۔

وہ ایک جابرانہ سی مسکراہٹ سے میری طرف دیکھ کر بولا۔ ''ہمیں تمہارا یہ انداز پسند آیا، ہماری وفاداری کا دم بھرنے والے کبھی ہم سے مایوس نہیں ہوں گے۔ تم نے اپنی جان پر کھیل کر دو غدار بھگوڑوں کو ان کے انجام تک پہنچایا اور تیسرے کو گرفتار، ہم تمہیں اس کا انعام دینا چاہتے ہیں۔ تم خوش قسمت ہو کہ پیشی سے پہلے ہی تمہیں ہماری اس عظیم الشان راجدھانی کا ایک بڑا عہدہ سونپا جانے والا ہے۔''

میں نے پھر اپنے سینے اور سر کو قدرے خم کرتے ہوئے مؤدبانہ انداز میں کہا۔ ''مہاراجا سرکار کی جے ہو، میری ایک بڑی اچھا پوری کردی سرکار نے، اس عظیم ریاست اور مہاراجا سرکار کا میں بھی ہمیشہ دم بھرتا رہوں گا۔''

''بلراج......'' دفعتاً ایڈوانی کھرکھراتی آواز میں بولا۔

''جی سرکار!'' بلراج سنگھ یک لخت سر کو خم دیتے ہوئے مؤدبانہ بولا۔

''اسے مس شلپا کے پاس لے جاؤ اور اس سے کہو کہ دو گھنٹے میں اس کا تفصیلی انٹرویو لینے کے بعد ہمیں رپورٹ کرے اور یہ بھی کہ وہ اسے یہاں کس کارلائق سمجھتی ہے، باقی حتمی فیصلہ ہمارا ہوگا۔''

ہزار اندیشوں اور وسوسوں کے باوجود میری بلراج سنگھ کے بعد جنرل ایڈوانی سے بھی یہ مختصر ملاقات کامیاب اور مفید ثابت ہوئی تھی۔ میرا دل خوشی اور کامیابی کے احساس تلے بلیوں اچھلنے لگا، بغیر کسی خون خرابے اور اپنی اور اپنے ساتھیوں کی جانوں کا رسک لیے بغیر میں دشمنوں کے ساتھ ایک ''وفادار'' کی حیثیت سے شامل ہو چکا تھا، ورنہ تو میں منصوبہ بندیاں ہی کرتا رہا تھا اور بلاشبہ کامیابی کے اس مقام تک پہنچنے کے لیے مجھے ایک طویل عرصہ درکار ہوتا، تب تک پتا نہیں کیا کیا کچھ ہو چکا ہوتا۔ یہ میری ایک لمبی چھلانگ تھی، بلاشبہ اور نیک نیتی کے ساتھ مجھے یہ کہنے میں کوئی عار نہیں کہ میری اس بڑی کامیابی کا اصل ''کریڈٹ'' اجے سنگھ اور اس کی سازش کو جاتا ہے، جو وہ خود اپنے لیے کرنا چاہتا تھا وہ میرے لیے کر گیا تھا۔ یہ الگ بات تھی کہ اس میں کافی حد تک میری بیدار مغزی اور غیر معمولی احتیاط پسندی کا دخل بھی تھا۔

میں نے یہاں اپنا ذہن ہر وقت بیدار، آنکھیں کھلی اور کان ہر آہٹ پر لگا رکھے تھے، ایک ذرا سی بھنک کو بھی میں درخورِ اعتنا نہیں جانتا تھا۔

میرا خیال تھا کہ مجھے کیسل کی سیر کرائی جائے گی، مگر ایسا نہ ہوا، بلراج سنگھ مجھے لے کر ایک کمرے میں پہنچا۔ وہاں ایک صحت مند اور متناسب خدوخال کی خوب صورت

اور پُرکشش عورت ایک میز پر کمپیوٹر کے سامنے بیٹھی تھی۔ جس کی اسکرین ایک بڑے سائز کی ایل ای ڈی سے مشابہ تھی، جو ایک اندازے کے مطابق بیالیس انچ کی تو ہوگی، جس سے بیک وقت ٹی وی اور کمپیوٹر اسکرین اور سی سی کلوز سرکٹ کیمرے کا کام لیا جا رہا تھا۔ کیونکہ اس وقت اسکرین چار سرکٹ میں تقسیم تھی اور ہر سرکٹ اسکرین میں ڈارک کیسل کے بیرونی اور کبھی اندرونی گوشوں کا منظر پیش کیا جا رہا تھا۔ وہاں لوگ اپنے اپنے کاموں میں مصروف نظر آرہے تھے۔

لڑکی خوبرو ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے کام میں ماہر معلوم ہوتی تھی۔ اس کا رنگ گورا اور آنکھیں تیز کٹار اسی تھیں۔ قد بھی دراز ہی معلوم ہوتا تھا۔ اس نے یوں تو مغربی طرز کا چست لباس پہن رکھا تھا، مگر دکھائی وہ انڈین ہی دیتی تھی۔ بال کرلی اور گھنے تھے، جنہیں اسٹائلش انداز دے رکھا تھا۔ شاید یہی مس شلپا تھی۔

اس کے ہمراہ ایک عمر رسیدہ آدمی بھی تھا جو اس کی کرسی کے قریب کھڑا تھا مگر اس کی نظریں اسکرین پر جمی ہوئی تھیں۔ اس کے چہرے پر موٹے سیاہ فریم والی عینک تھی، اس کے سر کے بال چھوٹے اور سفید تھے۔ وہ جھکی جھکی کمر والا عمر رسیدہ اس لڑکی سے ڈکٹیشن کے انداز میں کچھ کہنے میں مصروف تھا اور لڑکی شاید اسی کی ہدایت پر کی بورڈ کی مدد سے کیمرا زوم کر رہی تھی۔

ہماری آہٹ پر بھی جب وہ ہماری طرف متوجہ نہ ہوئے تو بلراج سنگھ نے ہولے سے کھنکھارا...... سب سے پہلے وہ لڑکی چونکی اور شاید بلراج کو دیکھ کر وہ ایک دم مؤدبانہ انداز میں اٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ عمر رسیدہ شخص بھی قدرے چونک کر ہماری طرف مڑا۔

''سر!'' لڑکی نے بلراج کی طرف دیکھ کر ہولے سے مؤدبانہ کہا۔ اس کی مترنم آواز بھی اس کی پُرکشش شخصیت سے ہم آہنگ تھی۔ جبکہ عمر رسیدہ شخص اپنی عینک درست کرنے لگا۔ وہ بس خاموشی سے ہماری طرف تکنے میں محو ہو گیا تھا۔

''مس شلپا! یہ دیال داس ہے۔'' بلراج سنگھ نے متانت کے ساتھ خوبصورت لڑکی سے کہا۔ پھر اس نے شلپا سے...... وہی کچھ مختصراً کہہ دیا جس کی ہدایت ابھی تھوڑی دیر پہلے جنرل ایڈوانی نے اسے دی تھی۔

شلپا نے پہلی بار ایک بھرپور نگاہ مجھ پر اور میرے چہرے پر ڈالی، اس کے بعد وہ بلراج کی طرف دیکھ کر اثبات میں سر ہلا کر ''اوکے سر'' بولی۔

''کون ہے یہ؟'' اس مجہول سے نظر آنے والے عمر رسیدہ شخص نے اپنی عینک کو چھوتے ہوئے ذرا سر نیا کر کے میری طرف دیکھا، جس کا جواب دینا بلراج نے غیر ضروری سمجھتے ہوئے دروازے کی جانب پلٹ جانا مناسب سمجھا۔

''بیٹھیے آپ......'' وہ مترنم سی آواز اور شستہ لہجے میں بولی اور میں بھی اس کی طرف مسکراتے دیکھ کر ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔

''پروفیسر ہیرا لال صاحب! آپ مجھے دو گھنٹے دے دیں، اس کے بعد میں خود ہی آپ کے پاس آکر یہ مسئلہ حل کرنے کی کوشش کرتی ہوں......''

ایک قریبی کرسی پر میرے براجمان ہوتے ہی شلپا نے اس عمر رسیدہ شخص کو مخاطب کرتے ہوئے کہا تو وہ قدرے چڑچڑے لہجے میں بولا۔

''ارے کیا غضب کر رہی ہو لڑکی؟ تم کیا مسئلہ حل کرو گی، یہ کوئی گڈے گڑیا کی شادی ہے، ہیرے کو توڑنا ہے، اس طرح کہ اس کی شفافیت اور ڈائمنشنل اثرات کو نقصان بھی نہ پہنچے۔ یہ صرف پروفیسر ہیرا ہی کر سکتا ہے......''

اس بوڑھے پروفیسر کے بولنے کا انداز مجھے لکھنوی سا لگا، جو مجھے کوئی ہیرا اسپیشلسٹ ٹائپ کی کوئی شے لگا تھا۔ نام بھی اس کا یہی تھا۔

''بجا فرمایا آپ نے......'' شلپا نے اس بار قدرے سرد نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''......سو، پلیز، ناؤ لیو می آلون فار ٹو آورز......''

پروفیسر ہیرا لال منہ بناتا ہوا اور میری طرف ایک اچٹتی نگاہ ڈالتا ہوا کمرے سے نکلتا چلا گیا۔

''آپ کا پورا نام دیال داس ہی ہے؟'' وہ مجھ سے مخاطب ہو کر بولی۔ ''آپ اپنے بارے میں مختصراً بتائیں، گھر، والدین، تعلیم اور پیشہ، یہاں کیسے آئے، وغیرہ...... جس کا جواب میں نے بالترتیب دیا۔

''میں ممبئی میں رہتا ہوں، والدین کا پتا نہیں، ہوش سنبھالا تو خود کو ناتھ آشرم میں پایا، جہاں ایک موٹا کالا شرابی نوعمر لڑکوں سے اپنے بدن کی مالش کرواتا تھا اور مارتا پیٹتا تھا۔ تنگ آکر میں وہاں سے بھاگا تو ایک بے اولاد جوڑے نے مجھے رکھ لیا۔ آدمی کی دکان تھی، جہاں شام میں، میں بھی بیٹھا کرتا تھا، وہیں سے میں نے کچھ تعلیم بھی حاصل کرلی، وہ آدمی منشیات کا دھندا کرتا تھا، ایک بار چھاپا لگا تو اس نے

مجھے پکڑوا دیا۔ شاید اسی لیے ہی اس نے مجھے گود لیا تھا کہ آڑے وقت میں وہ مجھے قربان کر سکے۔ مجھے آٹھ سال کی سزا ہوگئی، وہیں جیل میں ایک دادا ٹائپ آدمی سے میری دوستی ہوگئی، ہم ایک ساتھ ہی سزا کاٹ کر رہا ہوئے تو پھر میں اس کے ساتھ ہی شامل ہوگیا۔ حالات نے مجھے بدل دیا۔ کچھ اس دادا کا بھی قصور تھا، کیونکہ وہ ایک تیسرے درجے کا اٹھائی گیرا، جواری اور جیب کترا تھا۔ اسی نے ہی مجھے اس کام پر لگا دیا۔ ایک پولیس مقابلے میں وہ مارا گیا مگر میں نے اس کا پیشہ مرنے نہیں دیا، اس نے میری تربیت کی تھی، مجھے اسلحہ اور چاقو چلانا سکھایا تھا یوں میں راہ چلتے لوگوں کو لوٹنے لگا۔

اس کے علاوہ شاپ لفٹنگ (دکانوں سے چوری کرنا) بھی کر لیا کرتا تھا، وہیں کہیں فٹ پاتھ پر سو جاتا، ممبئی کی گلیوں میں آوارہ گردی کرتا، ذہن کا ہوشیار اور چالاک تھا۔ پولیس ہتھے کبھی نہیں چڑھا، مگر اپنی ذہنی فراست اور چالاکی کی بدولت، جس میں میری تعلیمی قابلیت بھی شامل تھی، ایک گینگ میں شامل ہوگیا، مگر جلد ہی وہاں سے بھی مجھے نکلنا پڑا، کسی وجہ سے ممبئی کی پوری پولیس اس کے پیچھے پڑ گئی تھی۔ زندگی میں سکون نہیں رہا، پھر ایک بھلے مانس سے میری ملاقات ہوگئی اور میں یہاں آ گیا، اب مجھے لگتا ہے کہ میں آج اپنے صحیح مقام پر کھڑا ہوں۔''

میں نے یہ سب انہی باتوں کی روشنی میں بتایا تھا جس کی معلومات میں گاہے بہ گاہے وجے سے اِدھر اُدھر کی باتوں سے لے لیا کرتا تھا۔ کچھ رتن لال کے منہ سے بھی سن رکھی تھیں، جبکہ اصل دیال داس کے شناختی کاغذات سے بھی میں نے مدد لی تھی۔ جبکہ اس کی ایک بات کو جان بچانے کے خوف سے جھوٹ سمجھتے ہوئے کہ وہ کسی بین الاقوامی این جی او کا رکن بھی رہ چکا تھا، اس کا ذکر کرنا میں نے مناسب نہیں سمجھا تھا۔ اگرچہ بعد میں یہاں آ کر اس کا یہ جھوٹ بھی کھل چکا تھا۔

بہرکیف شلپا نے میری زبانی یہ سب بڑے غور سے سنا تھا، پھر اپنے سامنے رکھے نوٹ پیڈ پر اس نے تیزی کے ساتھ کچھ لکھا اور سر اٹھا کر مجھ سے مخاطب ہوئی۔

''بہت اچھے...... تو تم نے خود کو یہاں ہر طرح سے فٹ پایا......؟'' اندازِ تخاطب سوالیہ تھا لہٰذا میں نے بھی اپنے دائیں ہاتھ کا انگوٹھا نکال کر مسکراتے ہوئے پوری تسلی آمیز لہجے میں کہا۔

''ایک دم فٹ......!''

''گڈ''! شلپا نے بھی اسی مسکراہٹ سے جواب دیا۔ پھر اگلا سوال کیا۔ ''دیال داس صاحب! آپ کے خیال میں یہاں آپ کس قسم کے عہدے کے لیے خود کو اہل سمجھتے ہیں؟''

شلپا کے ان جچے تلے سوالات پر مجھے کوئی حیرت نہیں ہو رہی تھی کہ اس دور افتادہ اور ایسے علاقے میں جہاں ان لوگوں نے ایک غریب اور پسماندہ جانگلی قوم جاوا قبیلے پر غاصبانہ تسلط جمانے کے بعد انہی لوگوں کی سرزمین پر انہیں قیدی بنا کر رکھا ہوا تھا، نہ صرف یہ بلکہ ان کے بعض قدرتی وسائل، جن میں تازہ دریافت شدہ ہیرے کی کان بھی شامل تھی، پر بھی اپنا قبضہ جما کر بڑی ڈھٹائی کے ساتھ یہاں اب اپنی ایک ایسی اسٹیٹ بنانے کے خواب دیکھ رہے تھے جیسے یہ سرزمین انہیں تحفے یا کسی خراجِ تحسین کی صورت میں ملی ہو۔ یہاں پر بڑے عہدوں کی بھرتیاں بھی عجیب اور بھدے طریقے سے کی جا رہی تھیں، یعنی تعلیمی قابلیت کے بجائے یہ جانچا جا رہا تھا کہ وہ کتنا اپنے ماضی کی دنیا سے بیزار اور اکتایا ہوا تھا، نیز جرائم کی دنیا میں خواہ ایک تیسرے ہی درجے کا مجرم ہی کیوں نہ ہو، اس کا اتنا ہی اونچا معیار سمجھا جا رہا تھا، جیسا کہ میں نے یہاں کے ماحول کا مشاہدہ اور تجربہ حاصل کیا تو انہی باتوں کا سہارا لیتے ہوئے میں نے اپنے بارے میں یہ سب جھوٹ بولا تھا اور میں شاید متوقع طور پر ''کوالیفائی'' بھی کرنے لگا تھا۔

یہی وجہ تھی کہ اس نے خود ہی مجھ سے میری اہلیت کے مطابق پوچھ بھی لیا تھا کہ میں کیا کر سکتا ہوں۔ اس کا جواب میں نے اپنے منصوبے کے مطابق دیتے ہوئے کہا۔

''مس شلپا! سچی بات کہوں گا کہ میں یہاں ڈارک کیسل میں خود کو دنیا کا خوش قسمت ترین آدمی سمجھ رہا ہوں، اگر مجھے اسی کے اندر ہی کوئی ایسی ذمے داری دے دی جائے جو میں بہ احسن و خوبی انجام دے سکوں تو میں سمجھتا ہوں کہ یہ میری ایک اور بڑی خوش نصیبی ہوگی۔ میں سمجھتا ہوں کہ آپ کا میرے سلسلے میں سفارشی نوٹ بھی میری خوش قسمتی پر آخری کیل ثابت ہو سکتا ہے۔''

''اگر میں جنرل صاحب سے تمہیں اپنے ساتھ ہی یہاں رکھنے پر ایک سفارشی نوٹ لگا دوں تو......؟''

شلپا نے ایک خاص ادا کے ساتھ اور اپنا نچلا ہونٹ اپنے موتیوں جیسے دانتوں کی بالائی قطار تلے دباتے ہوئے گہرے اور معنی خیز لہجے میں کہا تو میں اندر سے جیسے پورا ہی ''دھڑک'' اٹھا۔

اپنے دشمنوں سے نبرد آزما ہونے کے دوران میرا بہت

سی اور ہر قسم کی عورتوں سے واسطہ پڑتا رہا تھا اور میں ان کی ''سائیکی'' سمجھنے لگا تھا۔ ان میں کچھ خود پسند اور انا پرست ہوتی تھیں، بیشتر ایسی تھیں جو احساسِ کمتری اور عدم تحفظ کا شکار تھیں، تیسری قسم میں احساسِ محرومی کی ماری ہوئی شامل تھیں۔ چوتھی قسم وہ تھی جو بھرپور جذبات اور احساسات رکھے ہوئے تھیں مگر مجبوری کی بنا پر ان پر ذمے داریوں کا بوجھ بڑا ہوا تھا اور وہ ان کی یکسانیت سے سخت اکتائی اور بیزار رہتی تھیں، شلپا مجھے اسی سائیکی سے تعلق رکھنے والی ہی عورت لگتی تھی۔ ایک اور بات بھی تھی جو پسندیدگی کی ہوسکتی تھی، ساتھ کام کرنے والوں میں کسی کے ساتھ اس کا ''لگا'' نہیں کھایا ہوگا۔ ایک ساتھی کولیگ کو تو میں دیکھ چکا تھا جو ادھیڑ عمر تھا، یعنی پروفیسر ہیرالال، جس کی شخصیت ہی بذاتِ خود خشک تھی۔ باقی یہاں اور کتنے جواں مرد ہوں گے، اس کا مجھے ابھی نہ اندازہ ہوسکا تھا نہ ہی پتا چل سکا تھا۔ ممکن تھا اور بھی ہوں گے، مگر اس کے قریب آنے کا انہیں موقع نہیں ملتا ہوگا۔

یہی وجہ تھی شلپا نے مجھے اپنے ساتھ ہی یہاں کام کرنے کا عندیہ دے دیا تھا۔ میں نے فوراً چہرے پر دیدنی سی خوشی سجاتے ہوئے کہا۔ ''اگر ایسا ہوجائے مس شلپا تو مجھے اور کیا چاہیے کہ میں آپ جیسی ایک سینئر کارکن کے ساتھ رہتے ہوئے اپنا کام نہ صرف زیادہ بہتر طریقے سے کر پاؤں گا بلکہ آپ سے سیکھنے کا بھی موقع ملتا رہے گا مجھے.....''

''کلیئر.....'' اس نے مدھم سے لہجے میں کہا اور تیزی سے کچھ لکھتی چلی گئی۔ میرا انٹرویو اس نے کم از کم دو گھنٹے تک کرنا تھا، جو اس نے ایک ہی گھنٹے میں نمٹا لیا، باقی کا ایک گھنٹا اس نے اِدھر اُدھر کی عمومی باتوں میں پورا کیا تو میرا یہ خیال غلط ثابت ہوا، وہ باقی کا ایک گھنٹا نہیں پورا کررہی تھی بلکہ عمومی اور غیر متعلقہ نوعیت کی گفتگو میں بھی اس نے اپنے مطلب کی باتیں اخذ کرلی تھیں، مثلاً اس نے آخر میں مجھ سے یہ پوچھا تھا کہ میں نے یہاں رہتے ہوئے اپنے جیسے کتنے لوگوں کو اپنا گہرا دوست بنایا ہے، جن کے بارے میں تم یقین سے کہہ سکو کہ وہ اسٹیٹ اور جنرل ایڈوانی کی وفاداری کا دل سے عزم رکھتے ہیں، تو اس کے اس سوال پر میرے ذہن رسا میں ایکا ایکی ایک جھماکا ہوا تھا۔ میں نے فوراً اپنا سر اثبات میں ہلاتے ہوئے پورے تیقن بھرے مگر قدرے محتاط بھرے لہجے میں جواب دیا۔

''جی ہاں، مس شلپا! نہ صرف وفاداروں کا بلکہ غداروں کا بھی مجھے اندازہ ہوا ہے۔''

وہ میری توقع کے عین مطابق چونک کر بولی۔

''غدار.....؟ کون ہیں وہ.....؟''

اسے ایک دم اس ایشو پر اتنا سنجیدہ پاکر میں بھی اندر کھٹکے بغیر نہ رہ سکا تھا، جانتا تھا کہ ان کے نزدیک غداروں کا منفی کردار کس قدر نا قابلِ قبول اور اہم تھا۔ ایک ذرا سی بھنک پر وہ انہیں ختم کرڈالتے تھے یا پھر بیگار قیدی کی صورت میں انہیں ہمیشہ کے لیے پابندِ سلاسل کردیا جاتا تھا۔

چنانچہ میں نے بھی اپنے چہرے اور لہجے میں سنجیدگی سی طاری کرتے ہوئے جواباً اس سے کہا۔ ''غداروں اور وفاداروں کے درمیان تمیز قائم کرنا الگ بات ہے اور ان کے متعلق حتمی فیصلہ کرنا ایک الگ مسئلہ ہوتا ہے۔''

وہ میری بات کو یک ٹک اور بڑے دھیان سے.... سن رہی تھی۔

''بسا اوقات یہ ہوتا ہے کہ جلد بازی میں غدار کو وفادار اور وفادار کو غدار سمجھ لیا جاتا ہے۔'' میں نے بات جاری رکھتے ہوئے مزید کہا۔ ''اس طرح اگر ہوجائے تو سمجھو بڑا نا قابلِ تلافی نقصان ہوجاتا ہے، اگر ہم وفادار کو غدار کے شبہے میں ہلاک کردیتے ہیں تو ہم ایک وفادار کو کھودیتے ہیں، جن کی اس وقت ہمیں شدید ضرورت ہے۔ لیکن اگر ہم ایک غدار کو وفادار سمجھ کر اپنا لیتے ہیں تو اس کے نقصان کی تلافی تو ممکن ہی نہیں ہوسکتی۔ وہ ہمارے بیچ گھس کر دیمک کی طرح چپکے چپکے ہماری جڑیں کھوکھلی کرتا رہے گا، میری ہی مثال آپ لے لیں.....'' میں نے اتنا کہہ کر لمحہ بھر کو توقف کیا۔ شلپا کی آنکھوں میں اب سنجیدگی کے علاوہ اشتیاق اور دلچسپی بھی اُمڈ آئی تھی۔

''میں نے بروقت اجے سنگھ اور رام گوپال کی سازش کو بے نقاب کرڈالا...... اور میں نے بلراج سنگھ اور جنرل صاحب کے سامنے اس بات کا اعتراف بھی کیا تھا کہ وہ میرے دوست تھے، اگر ان کا مقصد صرف فرار ہی ہوتا تو شاید میں انہیں ہلاک نہیں کرتا، مگر ان کا اصل مقصد کچھ اور تھا، وہ اسٹیٹ کے کچھ ایسے خفیہ رازوں سے واقف ہوگئے تھے، جن کا باہر جانا اس اسٹیٹ کے لیے خطرناک ثابت ہوسکتا تھا۔ خیر...... جب اجے سنگھ کو میں نے پکڑوایا تو خود میں بھی نرغے میں آگیا اور مجھے بھی غدار بھگوڑا سمجھا جانے لگا۔ یہ تو اچھا ہوا کہ میں نے رتن لال صاحب کے ساتھ کئی خطرناک مہمات میں کام کرتے ہوئے اپنی جان کو کئی بار

خطرے میں ڈالا تو انہیں مجھ پر دوشواپ آ گیا، اس میں بے شک بلراج صاحب کی محتاط نظری تھی کہ انہوں نے اجے سنگھ اور میرے درمیان غدار اور وفادار کی پہچان کرلی۔ میرے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ اس سلسلے میں بہت محتاط روی اور گہری نظر نیز ان کے ساتھ انہی کے بھیس میں رہتے ہوئے ہی ایسے لوگوں کا پتا چل سکتا ہے۔''

میں نے اپنی بات ختم کی تو وہ اپنی بھویں ذرا اچکا کر مستفسر ہوئی۔ ''تمہارا خیال ہے، تم ہمارے جاسوس بن کر ایسے لوگوں کی مخبری کرو گے جو اسٹیٹ کے غدار یا وفادار ہیں؟''

''جی ہاں!'' میں نے فوراً منصوبے کے تحت، اپنی بات کی اہمیت جتانے کی غرض سے اثبات میں اپنا سر ہلا دیا۔ ''لیکن میں یہاں بھی رہتے ہوئے اپنا کام سرانجام دیتا رہوں گا جس کے قابل آپ مجھے سمجھیں گی۔''

''ہم......'' شلپا نے ایک پُرسوچ سی ہمکاری بھری، پھر آخر میں میرے چہرے پر اپنی نگاہیں مرکوز کرتے ہوئے بولی۔ ''یہ بتاؤ اجے سنگھ اور رام گوپال وغیرہ ہمارے کون سے ایسے اہم اور خفیہ راز سے واقف ہوگئے تھے جس کے بل بوتے پر وہ یہاں سے جانے کے بعد انہیں ہمارے خلاف استعمال کر سکتے تھے؟''

میں نے کبیل دادا کی بات اس کے سامنے دہرا دی پھر بولا: ''ہیروں کے کان کی دریافت اور پراسپیکٹر اینڈ مائننگ انجینئر نصیر شاہ کی یہاں موجودگی......''

میں نے بتایا اور شلپا کی آنکھیں جیسے پھٹنے کے قریب ہوگئیں۔ ''او...... مائی گاڈ! تت...... تو کیا وہ ہمارا اتنا اہم راز جان چکے تھے؟''

''جی ہاں، مس شلپا!'' میں نے اپنے لہجے میں گہری سنجیدگی سموتے ہوئے ایک طویل سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔

شلپا کی حالت سے مجھے صاف محسوس ہوا تھا کہ اس کے لیے یہ کس قدر اہم بات تھی، تو جنرل اور بلراج سنگھ کے لیے کس قدر اہم ہوسکتی تھی۔

وہ جلدی جلدی نوٹ لکھتی چلی گئی، اس کی حالت ایک دم ہی دگرگوں ہوگئی تھی، پھر وہ نوٹ بک سنبھال کر اٹھی اور مجھ سے بولی۔

''دیال داس! تمہارا یہ بہت بڑا کارنامہ ہے کہ تم نے ایسے خطرناک غداروں کو ختم کر ڈالا...... یہ تمہارے انٹرویو کا ایک ایسا اہم نقطہ ہے، جسے سن کر مجھے پورا وشواش ہے کہ جنرل صاحب تمہیں ہوسکتا ہے بلراج سنگھ سے بھی بڑا عہدہ دینے پر مجبور ہوجائیں۔ تم اِدھر ہی بیٹھو، میں ابھی انہیں جا کر تمہارے انٹرویو کے نتیجے سے آگاہ کرتی ہوں۔'' وہ یہ کہہ کر کمرے سے نکلتی چلی گئی۔

اس کی بات سن کر میرا دل بے پایاں مسرت تلے بلیوں اچھل رہا تھا۔ بلراج سنگھ کے مساوی عہدہ ملنا بھی کم بڑی بات نہ تھی، مگر یہاں تو یہ محترمہ شلپا میرے لیے اس سے بھی بڑا عہدہ ملنے کے لیے پُرامید تھی تو میں کیوں نا ہوتا بھلا......

میں اپنی جگہ بیٹھا رہا۔ شلپا تقریباً بیس منٹ بعد واپس لوٹی۔ میں نے کچھ بے چین سی نظروں سے اس کے چہرے کی طرف دیکھا، وہ میرے سلسلے میں جس قدر جوش اور پُرامید ہوکر جنرل ایڈوانی کے پاس گئی تھی، لوٹی تو وہ بات مجھے محسوس نہ ہوئی، جس کا واضح مطلب تھا کہ وہ نراش لوٹی تھی۔ تاہم میں بے چینی سے اس کے بولنے کا منتظر تھا کہ وہ میرے لیے بالآخر کتنی اچھی خبر لائی تھی؟

وہ تھکے تھکے سے انداز میں اپنی کرسی کی جانب بڑھی اور نوٹ پیڈ میز پر پھینک کر کرسی پر براجمان ہوگئی، میری نظریں اس کے دلکش چہرے پر ہنوز جمی ہوئی تھیں۔

''لگتا ہے میرے بارے میں جنرل صاحب نے کوئی خاص بڑا فیصلہ نہیں دیا۔''

''وہ تمہیں بلا رہے ہیں، جاؤ، بلراج بھی وہاں موجود ہے۔''

اس نے میرے سوال کا جواب دیے بغیر مجھ سے کہا تو میں نے اس کے ساتھ تھوڑی سی بے تکلفی سی برتی اور ذرا آگے جھک کر اس کی کشادہ اور گہری آنکھوں میں جھانکا۔ ''خیرت تو ہے، کیا میرے لیے کوئی نیا حکم صادر کیا جانے والا ہے؟''

وہ ایک بار پھر میرا جواب دینے کے بجائے میرا چہرہ غور سے دیکھنے لگی جیسے کچھ اخذ کرنا چاہ رہی ہو، جیسے کچھ بھانپنے کی کوشش کر رہی ہو۔ اسے یوں دیکھتا پا کر جانے کیوں میرے اندر پریشان کن سی بے چینی نے سر ابھارا تھا۔

خونی رشتوں کی خودغرضی اور پرائے بن جانے والے اپنوں کی بے غرض محبت میں پرورش پانے والے نوجوان کی سنسنی خیز سرگزشت کے مزید واقعات آئندہ ماہ

پہلا کیس

کبیر عباسی

صلاحیت رکھنے والا نابینا شخص، اس آدمی سے کہیں زیادہ دیکھتا ہے جس کے پاس آنکھیں تو ہوں مگر صلاحیت سے محروم ہو... یعنی عقل مند آدمی اپنے کمرے میں بیٹھے بیٹھے بہت کچھ جان لیتا ہے... سیرو تفریح کے دلدادہ نوجوانوں کی مہم جوئی... جو گھومتے گھومتے ایسی جگہ جانکلے جہاں ایک خونی ڈراما ان کا منتظر تھا...

اس نوجوان کا پہلا کیس جس کا دعویٰ تھا کہ وہ باصلاحیت ہے......

لائٹ جاتے ہی میری آنکھ کھل گئی۔ میں نے موبائل اٹھا کے ٹائم دیکھا، صبح کے آٹھ بج رہے تھے۔ مجھے سخت کوفت ہوئی۔ اس وقت لائٹ بھی نہیں تھی۔

کچھ دیر کروٹیں بدلنے کے بعد آخرکار مجھے چاروناچار اٹھنا ہی پڑا۔ میں غسل کر رہا تھا کہ موبائل کی رِنگ ٹون سنائی دی۔ موبائل کمرے میں تھا۔ میں جلدی جلدی نہانے لگا۔ رِنگ ٹون آف ہوتے ہی موبائل پھر بجنے لگتا۔ پتا نہیں کون بے صبرا تھا جو بار بار کال کر رہا ہے۔ میں سخت

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

جھنجلا گیا۔

غسل کے بعد باہر نکلا تو موبائل ابھی بھی بج رہا تھا۔ موبائل کی طرف ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ موبائل بجنا بند ہو گیا۔ سیل کی اسکرین پہ پانچ مسڈ کالز کا نوٹیفیکیشن جگمگا رہا تھا۔ تمام مسڈ کالز ارسلان کی تھیں۔ ارسلان میرا دوست اور یونیورسٹی فیلو ہے۔

میں بارانی یونیورسٹی راولپنڈی سے کمپیوٹر سائنس میں ماسٹرز کر رہا ہوں۔ میرا تیسرا سیمسٹر چل رہا ہے۔ جبکہ ارسلان کیمسٹری میں ماسٹرز کر رہا ہے۔ اس کا بھی تیسرا ہی سیمسٹر چل رہا ہے۔

میں نے اسے کال بیک کی۔ اس کے کال ریسیو کرتے ہی میں شروع ہو گیا۔

''کیا موت پڑ گئی ہے تمہیں؟ یہ کوئی وقت ہے کسی نوجوان کو کال کرنے کا اور وہ بھی چھٹی والے دن؟'' میں نے سخت غصے کا اظہار کرنے کی کوشش کی مگر اس پر کوئی اثر نہیں ہوا۔

اوہو، یعنی کہ الٹا چور کوتوال کو ڈانٹے۔ تم بھول گئے رات کو ہم نے کیا طے کیا تھا۔ تمہارے پاس پندرہ منٹ ہیں بس، ہم انتظار کر رہے ہیں۔'' وہ ایک ہی سانس میں بولتا چلا گیا۔

اس کے بتانے سے مجھے یاد آیا کہ رات کو وہ لوگ ایوبیہ گھومنے پھرنے کا پروگرام بنا رہے تھے۔ میں اس وقت اپنی ایک گرل فرینڈ کے ساتھ چیٹنگ میں مشغول تھا۔ اس لیے زیادہ توجہ نہیں دے سکا تھا۔ وہ کہہ رہے تھے کہ نو بجے روانہ ہونا ہے اور ابھی پونے نو ہو چکے تھے۔ میں جلدی سے تیار ہو کے باہر نکلا۔ امی کچن میں ناشتا بنا رہی تھیں اور ابو ڈائننگ ٹیبل پہ بیٹھے اخبار پڑھ رہے تھے۔

اوہ مارے گئے، ابو کو دیکھتے ہی میرے دل میں خیال آیا۔ ابو کا ہارڈ ویئر اسٹور ہے وہ عام طور پر آٹھ بجے ہی گھر سے نکل جاتے ہیں مگر آج جانے کیوں دیر ہو گئی تھی۔ ناشتے کے دوران میں ابو سے کچھ رسمی باتیں ہوتی رہیں۔ وہ ناشتا کر کے چل دیے تو میں نے سکون کا سانس لیا۔ ان کی موجودگی میں میرا باہر نکلنا ناممکن تھا۔

زعفران کی کال آ رہی تھی۔ میں نے کال کاٹ کے جسٹ کمنگ کا میسج کیا۔ ناشتا کر کے امی کو بتایا کہ میں مری جا رہا ہوں، امی نے حسب معمول دعائیں دے کے رخصت کیا۔ میں بائیک لے کے باہر نکل آیا، وہ تینوں گلی کے نکڑ پر میرا انتظار کر رہے تھے۔

حسیب بھی ارسلان کی طرح میرا یونیورسٹی فیلو ہے، چوتھا دوست زعفران تھا، ہم چاروں کے گروپ میں یہ واحد تھا جو ہمارا یونیورسٹی فیلو نہیں تھا۔ وہ ہمارے پڑوس میں ہی واقع ایک بیچلر ہوسٹل میں رہتا تھا۔ ہم اسلام آباد کے مضافاتی علاقے بہارہ کہو میں رہائش پذیر ہیں۔ زعفران کو ادھر شفٹ ہوئے چند ماہ ہی ہوئے تھے۔ اس سے میری پہلی ملاقات جم میں ہوئی تھی، اس کی باڈی شاندار تھی۔ اس کے علاوہ بھی وہ انتہائی متاثر کن شخصیت کا مالک تھا۔ میں انتہائی حسن پرست واقع ہوا ہوں۔ وہ مجھے پہلی ہی نظر میں اچھا لگا۔ جلد ہی ہم ایک دوسرے کے کافی قریب ہو گئے۔ میں نے اسے حسیب اور ارسلان سے بھی ملایا۔ اس کے بعد اکثر ہماری شامیں اکٹھے گزرنے لگیں۔ زعفران کسی کمپنی میں ملازمت کرتا تھا۔ وہ پانچ بجے تک گھر آ جاتا تھا۔

میں اور ارسلان اپنی بائیکس لے کے جا رہے تھے جبکہ زعفران میرے پیچھے اور حسیب، ارسلان کے پیچھے بیٹھ گیا۔

راستے میں ہم بائیکس ساتھ ساتھ چلاتے ہوئے گپ شپ بھی کر رہے تھے۔ کچھ دور تک ہم نے اسی طرح سست رفتاری سے سفر کیا۔ اس کے بعد ہم نے اسپیڈ بڑھا دی۔ تقریباً ایک گھنٹے بعد ہم ایوبیہ پہنچ چکے تھے۔

ویک اینڈ کی وجہ سے کافی رش تھا۔ چیئر لفٹ پر بیٹھنے کے خواہش مند خواتین و حضرات کی لمبی لائن لگی تھی۔ ہم بھی ٹکٹ کی لائن میں لگ گئے۔ لفٹ کی سیر کے بعد ہم ادھر ادھر آس پاس ہی گھومنے لگے۔ حسیب اور ارسلان ہر لڑکی پہ کمنٹس پاس کرتے جبکہ میں اور زعفران لڑکیوں سے بے نیاز آپس میں گپ شپ کر رہے تھے۔ ایسا نہیں تھا کہ ہمیں لڑکیوں میں دلچسپی نہیں تھی۔ اصل میں اس وقت ہم ایک اہم ضروری مسئلہ ڈسکس کر رہے تھے۔

ایک بجے ہم نے کھانا کھایا۔ کھانے کے بعد زعفران کہنے لگا کہ مجھے تو گھومنے کے لیے یہ پارک وغیرہ زیادہ اچھے نہیں لگتے۔ قدرتی مناظر کا اپنا ہی مزہ ہوتا ہے۔

تمہارا مطلب ہے جنگل کی طرف گھومنے پھرنے کے لیے چلیں؟ میں نے اس سے استفسار کیا تو اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ باقی دونوں بھی جنگل کی طرف جانے کے لیے راضی ہو گئے۔

☆☆☆

ہم ایک گھنٹے سے پیدل چل رہے تھے۔ جنگل واقعی بہت خوبصورت تھا۔ شہر کے پُر شور ماحول سے دور یہ جگہ

بالکل کسی جنت کا ٹکڑا لگ رہی تھی۔ ہم سب خوب انجوائے کر رہے تھے۔ ہم جنگل کے گھنے حصے سے گزر آئے تھے۔ آگے درخت چھدرے تھے۔ پہاڑی کے آخر میں ایک نالا پُرشور آواز کے ساتھ بہہ رہا تھا۔ ہمارا ٹارگٹ اس نالے تک پہنچنا تھا۔ اچانک ہی آسمان بادلوں سے گھر گیا۔ پہاڑی علاقے میں بارش اچانک ہی شروع ہو جاتی ہے۔ ویسے تو بارش سے بھیگنا ہم انجوائے ہی کرتے مگر ہمارے سیل فونز گیلے ہو جاتے اس لیے ہم نے رفتار تیز کر دی۔ ہم تھوڑا سا ہی چلے تھے کہ کچھ دور بنے ایک مکان کی جھلک دکھائی دی۔ اتنی دیر میں نظر آنے والا یہ واحد مکان تھا۔ اِدھر ہماری نظر مکان پر پڑی اُدھر بارش شروع ہو گئی۔ ہم نے بھاگنا شروع کر دیا۔ کچھ ہی دیر میں ہم مکان تک پہنچ چکے تھے۔ ہم سب کا سانس پھولا ہوا تھا۔

کچھ دیر میں سانس قابو میں آیا تو میں نے مکان کا جائزہ لیا۔ ہم ایک برآمدے میں کھڑے تھے۔ اس طرف ایک کمرے کا دروازہ کھل رہا تھا جس میں تالا جھول رہا تھا۔ مکان ویران لگ رہا تھا۔ ہم بے فکری سے بارش انجوائے کرنے لگے۔ حسیب نے سیل فون پہ گانے لگا لیے، یہ اور بات کے مکان کی چھت ٹین کی تھی اور بارش کی آواز کی وجہ سے گانوں کی آواز کم ہی آ رہی تھی۔ ارسلان نے ڈن ہل کی ڈبیا نکالی اور ہم سب سگریٹ پھونکنے لگے۔ میں نے سگریٹ کا ایک گہرا کش لے کے سارا دھواں پھیپھڑوں کے اندر اتارا۔ میں اس سے مکمل لطف کشید کرنا چاہ رہا تھا کہ یکدم ہی مجھے ایک ناگوار سی بُو محسوس ہوئی۔ اسی لمحے زعفران بولا۔

''یہ بدبو کیسی ہے؟''

بُو بہت ناگوار تھی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ کوئی جانور پاس ہی مرا ہوا ہو۔ زعفران اٹھ کے مکان کے سامنے کی جانب چل پڑا۔ ہم سب اس کے پیچھے تھے۔ اس طرف بھی لمبا برآمدہ تھا۔ برآمدے میں تین کمرے تھے اور سب میں ہی تالے لگے ہوئے تھے۔

اچانک میری نظر زمین پر پڑی۔ چیونٹیوں کی پوری فوج آخری کمرے کے دروازے کے نیچے سے باہر آ رہی تھی۔ تعفن میں اضافہ ہو گیا تھا۔ ہم سب نے ناک پہ ہاتھ رکھ لیے۔ تمام کمروں میں لکڑی کی کھڑکیاں لگی تھیں جن میں شفاف شیشے لگے تھے۔ میں نے اس کمرے کے شیشے کے ساتھ منہ لگا کے اندر جھانکنے کی کوشش کی۔ کمرے کی ایک کھڑکی بیرونی دیوار میں بھی تھی جس کی وجہ سے کمرے کا منظر کسی حد تک روشن تھا۔

میری نظر کمرے کے وسط میں پڑی تو میرا دل اچھل کے حلق میں آ گیا۔ یہ ایک انسانی ڈھانچا تھا جو کمرے کے وسط میں اوندھا پڑا تھا۔ بالوں سے یہ کسی عورت کا ڈھانچا لگ رہا تھا۔ صرف یہی نہیں ایک ڈھانچا بیڈ پر بھی پڑا نظر آ رہا تھا۔ بیڈ پر چت پڑا یہ ڈھانچا کسی مرد کا لگ رہا تھا۔ اس ٹھنڈے موسم میں بھی میرا جسم پسینے سے شرابور ہو گیا۔

ساتھ والے شیشے سے زعفران اندر جھانک رہا تھا۔ اس نے بھی ڈھانچے دیکھ لیے تھے۔ ہم پیچھے ہٹے تو ارسلان اور حسیب ہمیں سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگے۔

میں نے کھڑکی کی طرف اشارہ کیا، ہمارے چہروں پر ہوائیاں اُڑتے دیکھ کے وہ بھی خوفزدہ ہو گئے۔ وہ جھجکتے ہوئے کھڑکی کی طرف بڑھے۔ اچانک میرے عقب میں ایک خوفناک سی آواز ابھری۔ ارسلان اور حسیب یکدم گھبرا کے پیچھے ہٹے۔

☆☆☆

میں نے پیچھے مڑ کے دیکھا تو سانس میں سانس آئی۔ یہ زعفران تھا جو قے کر رہا تھا۔ قے کے دوران اس کے حلق سے جو آواز برآمد ہوتی وہ اچھی خاصی خوفناک تھی۔ ہم ڈھانچا نما لاشوں کی برآمدگی سے ویسے بھی کافی خوفزدہ تھے اس وجہ سے یہ آواز کچھ زیادہ ہی خوفناک لگی۔ کچھ دیر پہلے ہم تیز بارش کو انجوائے کر رہے تھے۔ اب اتنی تیز بارش ہمیں خوفزدہ کر رہی تھی۔

زعفران کی حالت کچھ دیر میں ہی سنبھل گئی۔ لاشوں والے کمرے کے سامنے بُو بہت زیادہ تھی ہم پہلے والی جگہ پہ واپس آ گئے۔ کچھ دیر بعد زعفران بولا۔ ''ہمیں ان لاشوں کے متعلق پولیس کو مطلع کرنا ہو گا۔ پتا نہیں یہ کتنے عرصے سے اِدھر پڑی ہیں۔''

ارسلان اور حسیب نے اس کی بات کی مخالفت کی۔ ''ہمیں کیا ضرورت ہے اپنے آپ کو مصیبت میں ڈالنے کی۔ بارش رکے تو واپس روانہ ہو جائیں گے۔'' ارسلان نے کہا۔

''یہ صحیح کہہ رہا ہے۔ پولیس تفتیش کے دوران ہمیں خواہ مخواہ تنگ کرے گی۔ اس لیے بہتر ہے کہ ہم خاموشی سے اِدھر سے روانہ ہو جائیں۔'' حسیب نے اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔

میرا خیال ان دونوں سے مختلف تھا۔ میری طبیعت میں مہم جوئی کافی زیادہ ہے۔ میں اس سے پہلے بھی اس

طرح کے سنسنی خیز قسم کے چکر میں نہیں پڑا تھا۔ اس قسم کے واقعات فلموں اور ناولوں میں ہی رونما ہوتے دیکھے تھے۔ اب میری خواہش تھی کہ میں حقیقت میں پولیس کو اس کیس کی تفتیش کرتے دیکھوں۔

''میرے خیال میں ہمیں قانون پسند شہری ہونے کے ناتے پولیس کو اطلاع دینی چاہیے۔ پولیس ہمیں خواہ مخواہ تنگ نہیں کرسکتی۔ آج کل پولیس اگر ڈرتی ہے تو وہ سب سے زیادہ اسٹوڈنٹس سے ڈرتی ہے۔ ہمارے پاس اسٹوڈنٹ پاور ہے سو ہمیں پولیس سے خوفزدہ نہیں ہونا چاہیے۔'' میں نے جوش سے کہا۔ میرا اندازہ تقریر کرنے والا تھا۔

''مگر پولیس کو اطلاع دینے کا فائدہ؟'' حسیب قدرے جھنجلایا ہوا تھا۔

''ایک تو ذمّے دار شہری ہونے کے ناتے ویسے بھی یہ ہماری ذمے داری بنتی ہے۔ دوسرا ہم لائف میں کچھ تھرل چاہتے تھے اسی لیے تو آج کا یہ سفر کیا ہے۔ پولیس کو اطلاع دینے کے خیال سے ہی مجھے تو سنسنی محسوس ہورہی ہے۔ آپ لوگ بھی ڈرنا چھوڑیں اور پولیس کو مطلع کرنے میں میرا ساتھ دیں۔'' آخر میں، میں نے مزاحیہ لہجہ اختیار کرکے ماحول پہ چھائی سنجیدگی کو کم کرنے کی کوشش کی۔

''اچھا تو پولیس کو مطلع کیسے کریں گے آپ؟ ون فائیو والے تو اتنی دور آنے سے رہے۔ باقی اِدھر کی پولیس چوکی کا نمبر بھی ہم میں سے کسی کے پاس نہیں ہوگا۔ کسی طرح پولیس کو اطلاع ہو بھی جائے تو اتنی تیز بارش میں آئے گا کون۔ الٹا ہم ہی پابند ہو کے رہ جائیں گے۔''

ارسلان نے ایک ہی سانس میں اچھے خاصے اعتراضات اٹھا دیے۔

''تم اس چیز کی فکر چھوڑو کہ پولیس کو کیسے اطلاع دی جائے گی اور وہ کیسے آئے گی۔ تم لوگ پہلے اس چیز پر تو متفق ہوجاؤ کہ ہمیں پولیس کو اطلاع کرنی چاہیے یا نہیں؟'' میں نے اس کے اعتراضات کو چٹکیوں میں اُڑا دیا۔

''اچھا چلو ہم متفق ہیں۔ تم پولیس کو اطلاع دو۔'' حسیب طنزیہ انداز میں بولا۔

اس کا انداز دیکھ کے میرے لبوں پر مسکراہٹ بکھر گئی۔ میں نے سیل فون نکالا اور اپنے ایک جاننے والے پولیس والے کا نمبر ملانے لگا۔

ارشد ہمارا پڑوسی تھا۔ زعفران کے علاوہ باقی دونوں اُسے جانتے تھے۔ وہ اے ایس آئی تھا۔ میری اس سے اچھی دعا سلام تھی۔ کافی دیر بیل بجنے کے بعد دوسری طرف سے کال ریسیو کی گئی۔

''ہیلو۔'' بولنے والے کی آواز میں بیزاری صاف محسوس کی جاسکتی تھی۔

''ارشد بھائی میں حنان بات کررہا ہوں' آپ کا پڑوسی۔''

''جی حنان کیسے ہو آپ؟ آج کیسے یاد کیا؟'' میری آواز سنتے ہی اس کا لہجہ خوشگوار ہوگیا۔

''اللہ کا شکر ہے۔ ارشد بھائی آپ کی ڈیوٹی کہاں ہے آج کل؟''

میں رسمی تکلفات ترک کرتے ہوئے ڈائریکٹ مطلب کی بات پہ آگیا۔

''کیوں خیریت؟'' ارشد نے جواب دینے کے بجائے سوال کیا۔

''ہاں خیریت ہی ہے۔ ہم لوگ ایوبیا گھومنے آئے ہوئے ہیں۔ اِدھر جنگل سے نیچے بارش سے بچنے کے لیے ہم نے ایک غیر آباد گھر میں پناہ لے لی۔ اندر سے ایک ناگوار بُو آرہی تھی ہم نے کھڑکی سے اندر جھانکا تو اُدھر دو انسانی ڈھانچے نظر آئے۔' میں نے حتی الامکان مختصر ترین الفاظ میں اُسے ساری تفصیل بتائی۔

اس کے پوچھنے پر میں نے اسے اس گھر کا محل وقوع بتایا۔

''او کے تم لوگ کسی چیز کو نہ چھیڑنا۔ یہ کیس ہماری چوکی کی حدود میں ہی آتا ہے ہم جلد از جلد پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں۔'' وہ مستعدی سے بولا۔ پتا نہیں وہ ہمیشہ ہی مستعد رہتا تھا یا میری وجہ سے زیادہ مستعدی دکھا رہا تھا۔

''ہاں جی کیا کہہ رہا ہے وہ؟'' میرے کال کاٹتے ہی حسیب نے بے چینی سے پوچھا۔

''وہ آرہا ہے۔'' میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

تم نے کسے کال کی ہے؟ زعفران نے پوچھا۔

اتنی دیر میں ہم بھی کافی حد تک نارمل ہوچکے تھے۔ بارش ابھی بھی اسی رفتار سے جاری تھی۔ ہمارے پاس اب انتظار کے سوا اور کوئی چارہ نہیں تھا۔

کچھ دیر تو ہم خاموشی سے برستی بارش کی بوندوں کو دیکھتے رہے۔ آخر میں نے ہی خاموشی توڑی۔

''کیوں بھئی ارسلان؟ ہم میں سے سب سے زیادہ جاسوسی موویز اور ناولز کے تم ہی شوقین ہو۔ تم ذرا اس کیس کے بارے میں اپنا مفروضہ تو بیان کرو۔''

''ہممم۔'' اُس نے چہرے پر جیمز بانڈ والے تاثرات لانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے ہنکارا ابھرا۔

''میرے خیال میں، وقوعہ کچھ یوں بنتا ہے۔'' وہ ڈرامائی لہجے میں بولا۔

ہم سب اُسے تجسّس ودلچسپی سے دیکھنے لگے۔

''ایک تھے میاں، میاں یعنی کے شوہر، اب وہ شوہر تھے تو ظاہر ہے اُن کی ایک عدد بیوی بھی تھی مگر وہ بیوی تھی بے وفا، وہ اپنے کسی عاشق کو لے کے اس ویرانے میں آ گئی۔ ہوسکتا ہے کہ گھر اس عورت یا اس کے شوہر کا ہو۔ یا یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یہ مکان اس کے عاشق کا ہو۔ بہر حال ہوا یہ کہ ہوگئی کسی طرح اس کے شوہر کو خبر، وہ برداشت نہ کرسکا اور اس نے دونوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔''

''اچھا تو اگر آپ کی تھیوری کو درست تسلیم کرلیں تو ان کی گاڑی کہاں گئی وہ اتنی دور پیدل تو نہیں آسکتے تھے؟''

مکان کے آگے سے ہی ایک کچا روڈ نیچے کی طرف جا رہا تھا۔ مگر مکان کے آگے پیچھے کوئی گاڑی کھڑی نظر نہیں آئی تھی۔ اس لیے میں نے اس سے گاڑی کے متعلق سوال کیا۔

''گاڑی شوہر یعنی کے قاتل صاحب لے گئے ہوں گے۔'' وہ بڑے اسٹائل سے بولا۔

اس کا انداز دیکھ کے سب مسکرانے لگے۔

میں نے اگلا سوال داغا۔ ''شوہر صاحب کس پر آئے تھے؟''

''میرے خیال میں وہ گاڑی کی ڈکی میں آئے ہوں گے۔ کیونکہ انہیں شک تو پہلے سے ہوگا۔ انہوں نے ڈکی میں بیٹھ کر ان کا پیچھا کیا اور قتل کرکے گاڑی لے گئے۔'' اس نے اپنی تھیوری کے حق میں دلائل دیے۔

''میں نہیں مانتا۔'' حسیب بولا۔ ''اتنا لمبا سفر ڈکی میں کرنا کہانیوں میں ہی ممکن ہے حقیقت میں یہ ممکن نہیں۔''

''اچھا تو تم بتادو جاسوسی فلمیں صرف میں ہی تو نہیں دیکھتا۔'' وہ بھناکے بولا۔

''فلمیں تو چلو ہم تمہارے ساتھ دیکھ لیتے ہیں مگر جاسوسی ناول تو زیادہ تم پڑھتے ہو نا۔'' حسیب اسے چھیڑنے والے انداز میں بولا۔

اچانک ارسلان کو جیسے کچھ یاد آیا، وہ مشکوک نظروں سے حسیب کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

''تم یہ تو بتاؤ تمہیں کیا پتا کہ وہ طویل سفر طے کرکے اِدھر آئے ہیں۔ ہوسکتا ہے وہ کسی قریبی بستی سے آئے ہوں اور شوہر صاحب اُدھر سے ہی ڈکی میں بیٹھے ہوں۔''

''ظاہر ہے بھئی اگر وہ گاڑی میں آئے ہوں گے تو طویل سفر طے کرکے ہی آئے ہوں گے۔ اگر کسی قریبی بستی سے آئے ہوں گے تو انہیں پیدل آنا چاہیے تھا۔'' حسیب منہ بنا کے بولا۔

''چلو جی مان لیا یا تو وہ آئے ہی پیدل تھے یا گاڑی قاتل لے گیا۔'' ارسلان نے گویا ہار مان لی۔

''تم لوگ اسی پر بضد کیوں ہو کہ وہ دونوں قتل ہی ہوئے ہیں۔ وہ طبعی موت بھی تو مرسکتے ہیں؟'' زعفران اتنی دیر میں پہلی بار بولا۔

''اگر وہ طبعی موت مرے ہوں تو پھر کیا خاک مزہ آئے گا۔ وہ یقیناً قتل ہوئے ہوں گے۔ تبھی تو کیس حل کرنے کا مزہ آئے گا۔'' حسیب برا سا منہ بنا کے بولا۔ اس کے انداز پہ سب مسکرانے لگے۔

''باہر سے تالا لگا ہے۔ اب یہ تو ممکن نہیں کہ وہ خود ہی باہر سے تالا لگا کے اندر طبعی موت مرنے میں مصروف ہوگئے ہوں۔'' میں نے نکتہ اٹھایا۔

''میں نے تو اپنی تھیوری بیان کردی اب تم بتاؤ تمہارے خیال میں کیا واقعہ رونما ہوا۔'' ارسلان میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

''میرے خیال میں یہ تو کنفرم ہے کہ یہ دونوں قتل ہوئے ہیں۔ اب یا تو تمہاری تھیوری کے مطابق بے وفا بیوی اور اس کے عاشق کو شوہر نے مارا ہے۔ یا پھر بے وفا شوہر اور اس کی محبوبہ کو بیوی نے مارا ہوگا۔ جاسوسی ڈائجسٹ کی تمام مختصر ترجمہ تحریروں میں تو ایسا ہی ہوتا ہے۔'' آخری جملہ میں نے شرارتاً کہا۔

''بھئی وہ مغربی کہانیوں میں ہوتا ہے تم بھول رہے ہو کہ ابھی ہم پاکستان کی حدود میں کھڑے ہیں۔ اِدھر کی بیویوں نے ابھی اتنی ترقی نہیں کی کہ شوہروں کو صرف بے وفائی کے جرم میں قتل کرنا شروع کردیں۔'' ارسلان نے ہنستے ہوئے کہا۔

ہم باتوں میں اتنا گم ہوگئے کہ پتا ہی نہیں چلا کہ کب بارش رکی اور چہار سو دھوپ پھیل گئی۔ ایک گاڑی کی گڑگڑاہٹ کی آواز آئی تو ہم سب چونکے۔ یہ ایک جیپ تھی، جو بڑی مشکل سے رینگتی ہوئی اوپر کی طرف آرہی تھی۔ چڑھائی بہت زیادہ تھی۔ میں نے چڑھائی دیکھ کے اندازہ لگایا کہ اِدھر صرف فور وہیل ڈرائیو ہی آسکتی ہے۔

جیپ قریب پہنچی تو اس میں سے دو پولیس والے اترے۔ ڈرائیور مقامی لگ رہا تھا۔ پولیس والوں میں سے

ایک تو اے ایس آئی ارشد تھا۔ ارشد کی عمر پچیس چھبیس برس ہی تھی۔ دوسرا شخص سپاہی تھا۔ اس کے بیج پر انور علی لکھا تھا۔ اس کی عمر تیس سال کے لگ بھگ لگ رہی تھی۔ ارشد نے ہم سے ہاتھ ملایا اور لاشوں کے متعلق دریافت کیا۔ میں نے اس کی کمرے کی طرف راہنمائی کی۔ چیونٹیاں ابھی تک جوق در جوق کمرے میں داخل ہو رہی تھیں۔

اس نے شیشے میں سے اندر جھانکا۔ ہم سب نے ناک پہ رومال یا ٹشو پیپرز رکھے ہوئے تھے مگر ارشد کو جیسے بُو کی پروا ہی نہیں تھی۔ ''جاؤ جا کے جیپ سے ٹول بکس نکال لاؤ'' اس نے اپنے ماتحت سپاہی کو حکم دیا۔

اس وقت، وہ بالکل بدلا ہوا ارشد لگ رہا تھا۔ محلے میں وہ جب بھی ملتا تھا بہت خوش اخلاق اور سیدھا سادہ معلوم ہوتا تھا۔ مگر اس وقت وہ خالص پولیس والا لگ رہا تھا۔

انور علی ٹول بکس لے آیا اب پتا نہیں وہ یہ بکس ساتھ لایا تھا یا یہ جیپ والے کا تھا۔ بہر حال اس نے ٹول بکس سے ایک لمبا پترا اور ہتھوڑا برآمد کیا۔

ہم کھڑکی کا شیشہ توڑ کے آسانی سے اندر داخل ہو سکتے ہیں۔ میں نے اُسے مشورہ دیا۔

''ہم تو اندر داخل ہو جائیں گے مگر لاشوں کو کیا تمہارے ابو جان باہر نکالیں گے۔'' وہ طنزیہ انداز میں بولا۔

مجھے اُس کا لہجہ اور انداز انتہائی ناگوار گزرا مگر میں نے برداشت کر لیا۔ ویسے بات اس کی ٹھیک تھی کیونکہ کھڑکیوں کے پٹ کافی چھوٹے تھے اور ان سے بمشکل ہی کوئی اندر داخل ہو سکتا تھا۔ لاشیں نکالنا وہ بھی اس گلی سڑی حالت میں تو ناممکن تھا۔

اس نے پترا تالے میں داخل کر کے ہتھوڑے سے تالے پر ضربیں لگائیں تین چار ضربوں میں ہی تالا ٹوٹ گیا۔

وہ دروازہ کھول کے پیچھے ہٹ گیا۔ چیونٹیاں اور کیڑے مکوڑے لاشوں کے ساتھ چمٹے ہوئے تھے۔ بُو اب ناقابلِ برداشت تھی۔

بیڈ پر پڑی مرد کی لاش کے چہرے کا مکمل گوشت گل چکا تھا۔ اس کے سر کی ہڈی میں ایک سوراخ نظر آ رہا تھا جو شاید گولی کا تھا۔ عورت کی لاش اوندھی پڑی تھی۔ اس کے سر کے بال کمر تک بکھرے ہوئے تھے۔ اس سے زیادہ مجھے اُسے دیکھنے کی ہمت نہیں ہو سکی۔

''جاؤ پلاسٹک کی شیٹس لے آؤ'' اس نے انور کو حکم دیا۔

''فرانسک والے کب آئیں گے؟'' میں خود کو یہ سوال پوچھنے سے باز نہیں رکھ پایا۔

اس نے مجھے غور سے دیکھا اور ہنسنے لگا۔ ''بیٹا، یہ کوئی انگلش فلم نہیں ''پاکستانی حقیقت'' ہے۔ یہاں میں ہی فرانسک والا ہوں، میں ہی ڈاکٹر ہوں اور میں ہی انکوئری آفیسر۔'' وہ ترحم آمیز انداز میں بولا۔

میں خاموشی سے اُسے دیکھنے لگا۔ میرے ذہن میں کافی تجسس تھا کہ وہ لاشوں کے متعلق کس طرح تحقیق کرے گا۔ مگر اس نے میرے سارے اندازوں پہ پانی پھیر دیا۔ اس نے تو کسی طرح کی تفتیش یا سراغ نوٹ کرنے کی زحمت ہی گوارا نہیں کی تھی۔ اس نے لاشوں کو پلاسٹک کی شیٹ میں لپیٹا۔ انور علی اس کی مدد کر رہا تھا۔ لاشیں لپیٹ کے ایک لاش ارشد نے اور دوسری انور نے اٹھائی اور جیپ کی طرف بڑھ گئے۔

ہم ہکا بکا انہیں دیکھ رہے تھے۔ ایسے تو نہ کبھی کسی فلم میں ہوا تھا اور نہ ہی کبھی کسی کہانی میں پڑھا تھا۔ واقعی یہ ''پاکستانی حقیقت'' تھی۔

لاشیں جیپ میں رکھ کر وہ واپس آئے۔

ارشد ہم سے مخاطب ہوا۔ ''تم میں سے کوئی جانتا ہے کہ یہ کس کا گھر ہے یا یہ لاشیں کس کی ہیں؟'' اس کا سوال مجھے خاصا احمقانہ لگا مگر میں خاموش رہا۔

''نہیں۔'' ارسلان نے سب کی نمائندگی کی۔ ''ہم اتفاق سے اِدھر آ نکلے تھے۔ ورنہ ہم زندگی میں اس سے پہلے کبھی اس طرف نہیں آئے۔''

''میں نے ڈرائیور سے اس مکان کے متعلق پوچھا ہے، وہ مقامی بندہ ہے۔ مگر وہ بھی بس اتنا ہی جانتا ہے کہ گرمیوں میں ایک جوڑا اِدھر آ کے کبھی کبھار رہتا تھا۔ وہ ہمیشہ کالے رنگ کی منی پجارو میں آتے تھے۔ انہوں نے نہ کبھی چوکیدار رکھا، نہ کسی اور مقامی شخص سے کسی قسم کا کام لیا۔ ویسے بھی یہ مکان بالکل الگ تھلگ ہے اس لیے اس سے زیادہ ان کے بارے میں شاید ہی کوئی جانتا ہو۔ ان کے چیتھڑے نما لباس سے بھی کچھ نہیں ملا۔'' وہ مایوسی سے بولا۔

''آپ نے مکان کی تلاشی تو لی ہی نہیں، ہو سکتا ہے ان کے شناختی کاغذات مل جائیں۔'' میں نے اس بار... جھجکتے ہوئے مشورہ دیا۔

''وہ تو لینی ہی ہے۔ لاشوں کی موجودگی میں تو ہمت

ہی نہیں ہو رہی تھی۔ پہلے انہیں اٹھوانا ضروری تھا۔'' یہ کہہ کے وہ دراز کھنگالنے لگا۔

انور علی کمرے میں رکھی وارڈروب کی تلاشی لینے لگا۔ اس میں تین چار جوڑے ہی لٹکے تھے۔ دو لیڈیز سوٹ تھے اور دو ''کوورز'' مردانہ سوٹس کے لگ رہے تھے۔

ہم سب انہیں خاموشی سے دیکھ رہے تھے۔ اچانک مجھے ایک خیال آیا، کمرے میں ایک دروازہ اور بھی کھل رہا تھا، یہ دروازہ واش روم کا لگ رہا تھا۔ میں نے اندر جھانکا یہ واقعی واش روم تھا۔ اس کا ایک دروازہ باہر برآمدے میں بھی کھل رہا تھا۔ باہر اس میں ہم نے تالا لگا دیکھا تھا۔

میری توقع کے مطابق ایک قمیص شلوار واش روم میں بھی لٹکی تھی۔ یہ مردانہ قمیص شلوار تھی۔ میں نے اس کی جیبوں کی تلاشی لی۔ فرنٹ پاکٹ میں سے مجھے دو ہزار کے قریب رقم اور ایک ڈیبٹ کارڈ ملا۔ ڈیبٹ کارڈ دیکھ کے مجھے خوشی ہوئی، اس سے ان کی شناخت میں مدد مل سکتی تھی۔ میں نے اردگرد دیکھا دروازے سے باہر مجھے انور کی پشت نظر آ رہی تھی۔ میں نے رقم جیب میں ڈال لی۔ یہ رقم اگر میں پولیس والوں کو دیتا تو وہ بھی اپنی ہی جیب میں ڈال لیتے۔

میں نے ڈیبٹ کارڈ پر لکھے نام کو پڑھنے کی کوشش کی تو میرے ساری خوشی جھاگ کی طرح بیٹھ گئی۔

نام مکمل طور پر گھس چکا تھا۔ بغور دیکھنے پر اتنا ہی اندازہ ہو سکا کہ یہ دو لفظوں پر مشتمل نام ہے جس کا پہلا حرف 'اے' تھا اور دوسرے لفظ کے آخری دو حروف غور سے دیکھنے پر اے اور ایل معلوم ہوئے۔

کارڈ حبیب بینک کا تھا اور اکاؤنٹ نمبر بھی ٹھیک سے نہیں پڑھا جا رہا تھا۔ پتا نہیں یہ شخص کیسے کارڈ کو استعمال کرتا تھا۔ ورنہ ایسے ہی رکھے رہنے سے تو کارڈ پہ لکھے ہندسے یا حروف اتنے نہیں گھس سکتے تھے۔

''اِدھر دکھانا۔'' آواز سن کے میں چونک گیا۔ یہ زعفران تھا جو واش روم کے دروازے پر کھڑا تھا۔ وہ کب آیا تھا مجھے کچھ خبر ہی نہیں ہوئی تھی۔ میں نے کارڈ اُسے تھما دیا۔

کارڈ سے مایوس ہو کر میں نے باقی جیبوں کی تلاشی لینا شروع کی۔ سائڈ پاکٹ سے مجھے ایک پاسپورٹ سائز تصویر اور کچھ وزیٹنگ کارڈز ملے۔ تصویر کسی مرد ہی کی تھی۔ اس کی عمر اندازاً چالیس سال کے لگ بھگ معلوم ہو رہی تھی۔ بھورے بال اور مونچھوں کے ساتھ وہ کافی ہینڈسم لگ رہا تھا۔ کنپٹیوں کے کچھ سفید بال اس کی عمر کی چغلی کھا رہے تھے ورنہ وہ پینتیس سے زیادہ کا نہ لگتا۔

تصویر اور کارڈز مجھے ارشد کے حوالے کرنے تھے اس لیے میں نے بیسن پر رکھ کے اپنے موبائل سے ان کی تصویریں بنا لیں۔ ''یہ کیا کر رہے ہو؟''

زعفران کی آواز خالی واش روم میں مجھے بہت اونچی محسوس ہوئی یا وہ بولا ہی اونچا تھا۔

میں تصویریں بنا کے پلٹا تو دروازے میں زعفران کے ساتھ ارشد کھڑا عجیب سی نظروں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔

''کیا کر رہے ہو؟'' اس نے سخت لہجے میں دریافت کیا۔

''کچھ نہیں، مجھے یہ تصویر اور وزیٹنگ کارڈز اس قمیص کی جیب سے ملے ہیں۔'' میں نے کارڈز اور تصویر اس کی طرف بڑھا دی۔

''وہ تو ٹھیک ہے مگر تم ان کی تصویریں کیوں بنا رہے تھے؟'' اس نے مشکوک لہجے میں پوچھا۔

''وہ بس ایسے ہی، مجھے بھی سراغ رسانی کا شوق ہے میں اپنے طور پر بھی یہ کیس حل کرنے کی کوشش کروں گا۔ میں نے شرماتے ہوئے کہا۔

''ہاہاہا۔'' اس نے میری بات سن کے قہقہہ لگایا۔

''بیٹا جی، یہ جو تم کر رہے ہو نا، اسے کارِ سرکار میں مداخلت کہتے ہیں۔ میں اس جرم میں تمہیں بھی اندر کر سکتا ہوں۔ تم کو اجازت کس نے دی ہے یوں تلاشی لینے کی؟'' وہ غصے میں لفظ کو چبا چبا کے بولا۔

''میں تو آپ کی مدد کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔'' میں نے اپنی ناگواری چھپانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

''تم اور مدد...... ہاہاہاہا...... کیا پدی اور کیا پدی کا شوربہ۔'' وہ ہنسنے لگا۔

کچھ دیر بعد اس کی ہنسی تھمی تو وہ بولا۔ ''بیٹا جی، دو چار جاسوسی فلمیں دیکھ کے تم اپنے آپ کو جیمز بانڈ سمجھنے لگے ہو۔ یہ قتل کا کیس ہے، کوئی کھیل نہیں۔ اسے حل کرنے کے لیے سالوں کے تجربے کی ضرورت ہوتی ہے۔ تمہاری اتنی اوقات نہیں۔'' وہ طنزیہ انداز میں بولا۔ لگ ہی نہیں رہا تھا کہ یہ وہی مہذب ارشد علی ہے جس سے کبھی کبھار محلے میں ملاقات ہوتی تھی۔

اس بار میں اپنے غصے پر قابو نہ رکھ سکا۔ ''کیس حل کرنے کے لیے تجربے سے زیادہ ذہانت کی ضرورت ہوتی ہے۔ تمہارا تجربہ بھی میں نے دیکھ لیا ہے۔ میں تمہیں چیلنج کرتا ہوں کہ تم سے پہلے یہ کیس حل کر کے دوں گا۔ میں غصے

سے بولا۔

وہ میری طرف دیکھ کے ایسے ہنسنے لگا جیسے میں نے اسے کوئی لطیفہ سنایا ہو۔

''اچھا جی جیمز بانڈ صاحب میں بھی دیکھتا ہوں آپ کیسے یہ کیس حل کرتے ہیں۔ مگر خیال رکھنا یہ نہ ہو کار سرکار میں مداخلت کے جرم میں حوالات کی سیر کرتے ہوئے پائے جاؤ۔'' اس نے اپنی پسندیدہ دھمکی دہرائی مگر میں خاموشی سے باہر نکل آیا۔ کچھ دیر میں ہم اپنے رکشے سے بیان ریکارڈ کرا کے واپس چلے آئے۔ واپس آتے ہوئے میں نے زعفران سے ڈیبٹ کارڈ کا مطالبہ کیا تو اس نے کہا وہ تو ارشد نے مجھ سے لے لیا تھا۔

اس کا جواب سن کے مجھے خاصی مایوسی ہوئی۔ میں نے تو زیادہ امیدیں کارڈ سے ہی وابستہ کی ہوئی تھیں۔ کارڈ پر نام اور اکاؤنٹ نمبر کھدا ہوا ہوتا ہے۔ اسے کئی طریقوں سے ظاہر کیا جاسکتا تھا۔ اس کے اکاؤنٹ نمبر سے اس کا مکمل ایڈریس مل سکتا تھا۔

خیر اس شخص کی تصویر اور کچھ وزیٹنگ کارڈز کی تصویریں میرے موبائل میں محفوظ تھیں۔ ان کی مدد سے بھی شناخت ممکن تھی۔ ایوبیا پہنچتے پہنچتے مغرب ہوگئی۔ ہم نے بائیکس اسٹارٹ کیں اور روانہ ہو گئے۔ زعفران میرے ساتھ بیٹھا تھا۔

''ذرا اپنا موبائل دینا۔ مجھے ایک کال کرنی ہے۔'' اس نے کہا تو میں نے موبائل جیب سے نکال کے اس کے حوالے کردیا۔

''سیکورٹی کوڈ تو بتاؤ۔''

میں عام طور پر اپنے موبائل کا سیکیورٹی کوڈ کسی کو بتاتا نہیں ہوں مگر اس وقت میں بائیک ڈرائیو کررہا تھا اور روڈ پر کافی سے زیادہ رش تھا روڈ بھی سنگل تھا اس لیے میں نے اسے کوڈ بتادیا۔

''تھوڑی دیر بعد اس نے سیل میری طرف یہ کہتے ہوئے بڑھایا۔'' یہ لو نمبر ہی بند جارہا ہے۔''

میں نے موبائل لے کے پاکٹ میں ٹھونس لیا۔

گھر پہنچ کے میں نے کھانا کھایا اور اپنے کمرے میں آگیا۔

اب میں سراغ رسانی کے لیے تیار تھا۔ میرے جسم میں سنسنی دوڑ رہی تھی۔ میں اس بچے کی طرح ایکسائٹڈ ہورہا تھا جو پہلی دفعہ جھولے میں بیٹھا ہو۔

میں نے لیپ ٹاپ کے ساتھ موبائل ڈیٹا کیبل کے ذریعے کنیکٹ کیا۔ میں ''گوگل امیج سرچ'' کے ذریعے اس تصویر کے مالک کو ڈھونڈنا چاہ رہا تھا۔ اگر اس تصویر سے ملتی جلتی کوئی بھی تصویر کسی سائٹ پر موجود ہوتی تو امکان قوی تھا کہ میں اسے گوگل امیج سرچ سے ڈھونڈنے میں کامیاب ہوجاؤں گا۔

میں نے تصویر اپ لوڈ کرنے کے لیے ''براؤز'' کا بٹن دبایا۔ براؤزنگ کرتے ہوئے میں سیل کی گیلری تک پہنچا۔ مگر یہ کیا موبائل کی گیلری میں تو نہ وہ تصویر تھی اور نہ ہی ان تین وزیٹنگ کارڈز کی تصاویر جو میں نے بنائی تھیں۔ ان کے علاوہ آج میں نے جو تصاویر بنائی تھیں، وہ سب موجود تھیں۔

میں نے موبائل لیپ ٹاپ سے ڈس کنیکٹ کیا اور گیلری چیک کرنے لگا مگر پورا سیل کھنگالنے کے باوجود وہ تصاویر تلاش نہیں کرسکا۔

میں سر پکڑ کے بیٹھ گیا۔ کیس حل کرنے کے میرے پاس جو واحد امید تھی، وہی دم توڑ گئی تھی۔

☆☆☆

اگلے دن شام پانچ بجے میں قاتل کے سامنے بیٹھا تھا۔ میں نے اس سے ملتے ہی یکدم پوچھا۔ ''تم نے ارشد کمال اور ان کی بیوی کو کیوں قتل کیا؟''

وہ حیرت سے مجھے دیکھنے لگا۔

''کیا بکواس کررہے ہو؟'' اس نے گھبراہٹ کو غصے کے پردے کے پیچھے چھپانے کی کوشش کی۔

''دھیرج میری جان...... '' اس وقت تمہیں اس لہجے میں مجھ سے بات کرنا بہت نقصان دہ سکتا ہے۔'' میرا لہجہ سرد تھا۔

''کیا کہہ رہے ہو تم، میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا۔'' اس بار اس نے بے بسی کی ایکٹنگ کی۔

''چلو کچھ میں تفصیل سے بتادیتا ہوں کچھ تم مجھے تفصیل سے بتادینا۔'' میں نے ہمدردانہ انداز اپناتے ہوئے کہا۔

وہ مجھے خالی خالی نظروں سے دیکھنے لگا۔

بات کچھ یوں ہے کہ ارشد کمال تمہارے چچا تھے۔ تمہارے والدین اور سسٹر دس سال پہلے ایک ایکسیڈنٹ میں جاں بحق ہوگئے تھے۔ تم اس وقت بارہ، تیرہ سال کے تھے۔ چچا اور چچی آ کے تمہارے ساتھ ہی رہنے لگے۔ تمہارے ابو نے امپورٹ ایکسپورٹ کا بزنس اسٹارٹ کیا تھا۔ وہ تمہارے چچا نے سنبھال لیا۔ ان کی محنت کی بدولت بزنس تیزی سے پھیلنے لگا۔ آج تم لوگوں کے انٹرنیشنل

مارکیٹ میں بھی کافی کانٹریکٹس چل رہے ہیں۔ یہ ساری ترقی تمہارے چچا کی محنت کی بدولت ہوئی مگر تم نے بزنس سنبھالتے ہی انہیں اور ان کی بیوی کو قتل کر دیا۔ اپنے محسنوں کے ساتھ ایسا بھی کرتا ہے کوئی؟'' میرا انداز ڈرامائی تھا۔

''اب تم مجھے بتاؤ گے کہ تم نے ایسا کیوں کیا؟''

''تم کیسے کہہ سکتے ہو کہ یہ سب میں نے کیا ہے، کیا ثبوت ہے تمہارے پاس؟'' وہ بولا تو اس کی آنکھوں میں مجھے بے یقینی اور حیرت کا سمندر موجزن نظر آیا۔

''ثبوت...... ؟ ہاہاہا! بیٹا جی بقول ارشد کے یہ کوئی ہالی ووڈ کی فلم نہیں جہاں ثبوت کے بغیر قاتل کا کچھ بگاڑا نہ جا سکتا ہو۔ یہ پاکستانی حقیقت ہے۔ وہ جب تمہیں حوالات میں بند کر کے تمہاری چھترول کرے گا تو تم ثبوت بھی خود دو گے اور گواہ بھی خود دو گے۔ تمہارے پاس قتل کا ٹھوس محرک موجود ہے۔ اور رہی بات ثبوت کی تو وہ میں تمہیں نہیں پولیس کو دوں گا۔''

''اچھا تو جاسوس صاحب آپ بتاؤ کیا محرک تھا میرے پاس قتل کا؟'' اس نے طنزیہ انداز میں پوچھا۔

''محرک بزنس ہی ہو سکتا ہے، تم نے کچھ عرصہ پہلے ہی بزنس جوائن کیا ہے۔ تم انہیں مکمل طور پر بے دخل کرنا چاہتے ہو گے۔ انہوں نے انکار کر دیا ہو گا۔ تو تم نے ان کی جان ہی لے لی۔'' میں نے اپنا اندازہ پیش کیا۔

''ہاہاہا...... بیٹا جی یہ کوئی جاسوسی ڈائجسٹ کی کہانی نہیں حقیقت ہے وہ بھی بقول تمہارے پاکستانی حقیقت...... ایسا کچھ نہیں ہوا جیسا تم نے اندازہ لگایا ہے۔'' اب وہ کافی حد تک سنبھل چکا تھا۔

''اچھا تو حقیقت تم بتا دو۔ میں ابھی تم سے وجہ ہی تو پوچھ رہا تھا کہ تم نے ان دونوں کو قتل کیوں کیا؟''

وہ سوچ میں پڑ گیا۔ ''میں تمہیں یہ سب کیوں بتاؤں؟'' کچھ لمحے سوچنے کے بعد وہ شک بھرے لہجے میں بولا۔

''تم مجھے نہیں بتانا چاہتے تو نہ بتاؤ۔ پولیس کو تو تمہیں سب بتانا ہی پڑے گا۔ مجھے تب پتا چل جائے گا۔'' میں نے بے پروائی سے کہا مگر اس بے پروائی کہ پیچھے چھپی دھمکی کو اس نے بخوبی محسوس کر لیا۔

''میں تمہیں سب بتا دوں تو تم میرے ساتھ کیا سلوک کرو گے؟'' وہ کافی سے زیادہ کنفیوز لگ رہا تھا۔

''تم میرے دوست ہو میں کوشش کروں گا معاملہ اِدھر ہی دب جائے۔ پر مجھے ساری تفصیل پتا تو ہونی چاہیے نا؟'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

کچھ دیر کشمکش میں رہنے کے بعد وہ شروع ہو گیا۔

میں ہکا بکا اس کی کہانی سن رہا تھا۔ اس کی کہانی سے اس کے کردار کی نئی نئی پرتیں کھل کے سامنے آ رہی تھیں۔

☆☆☆

آپ سوچ رہے ہوں گے کہ آخری امید کے دم توڑنے کے بعد بھی میں اتنی جلدی قاتل تک پہنچنے میں کیسے کامیاب ہوا۔ تو ہوا کچھ یوں کہ کل رات جب مجھے موبائل میں تصاویر نہ ملیں تو اسی وقت مجھے یقین ہو گیا کہ تصاویر زعفران نے ہی ڈیلیٹ کی ہیں۔ کیوں کی ہیں اس سوال کا جواب جاننا باقی تھا۔

اس نے جب بانک پہ..... مجھ سے موبائل مانگا تھا اسی وقت اس نے تصاویر ڈیلیٹ کی تھیں۔ گیلری پر بھی کوڈ لگا تھا۔ مگر یہ کوڈ وہی تھا جو سیل کی لاک اسکرین پر تھا۔ اس نے اندازے سے گیلری کھولنے کے لیے وہی کوڈ ٹرائی کیا ہو گا۔ میں نے کڑی سے کڑی جوڑی۔

اچانک مجھے خیال آیا کہ میرے سیل پر کافی ''ایپس'' میں ''آٹو فوٹو سنک'' کی آپشن آن ہے۔ میرے سیل پر... موبائل ڈیٹا ہر وقت آن رہتا تھا۔ امکان قوی تھا کہ وہ تصاویر محفوظ ہو گئی ہوں گی۔ میں نے جلدی سے ''انسٹا گرام'' کھولی توقع کے مطابق وہ چاروں تصاویر اس میں محفوظ تھیں۔

میں نے انہیں لیپ ٹاپ میں بھی محفوظ کر لیا۔

کھوئی ہوئی امید کے واپس بحال ہونے سے میرا جوش بڑھ گیا تھا۔

پہلی تصویر پر نظر پڑتے ہی میرا دل خوشی سے دھڑکنے لگا۔ وہ ہو بہو وہی تصویر تھی جو میرے پاس تھی۔ میں نے اس پر کلک کیا، یہ تصویر ٹوئیٹر پر تھی۔ میں نے ٹوئیٹر کا وہ اکاؤنٹ کھولا تو مجھے اس شخص کا نام پتا چل گیا۔ وہ تصویر ارشد کمال نامی بندے کی تھی۔

مجھے ڈیبٹ کارڈ پر لکھے نام کے حروف یاد آئے، وہ نام بھی ''اے'' سے شروع ہوتا تھا۔ دوسرے لفظ کے آخری حروف ''اے'' اور ''ایل'' تھے۔ یعنی ڈیبٹ کارڈ بھی ارشد کمال نامی بندے کا ہی تھا۔

میں نے ٹوئیٹر اکاؤنٹ کھنگالنا شروع کیا مگر اس میں اس کے متعلق کوئی نئی بات معلوم نہیں ہو سکی۔

سب سے مشہور سوشل سائٹ فیس بک ہے۔ اس پر اس کی آئی ڈی کا موجود ہونا یقینی تھا۔ اب تو مجھے اس کا نام بھی معلوم ہو چکا تھا۔ میں نے اپنا فیس بک اکاؤنٹ اوپن

کر کے ارشد کمال سرچ کیا۔ میرے سامنے اس نام کے کافی اکاؤنٹس کھل گئے۔ میں نے تصویر کا موازانہ ان پر لگی پروفائل پکچرز سے کرنا شروع کیا۔ ایک تصویر مجھے اس سے کافی ملتی جلتی لگی۔ میں نے وہ آئی ڈی کھولی۔

اس کا اور میرا ایک میوچل فرینڈ دیکھ کے مجھے خاصی حیرت ہوئی۔ میں نے اس پر کلک کیا۔ وہ نام دیکھ کر میرے لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ کڑی سے کڑی مل رہی تھی۔

میں نے باقی تصاویر دیکھنا شروع کیں۔ ان تصاویر میں بھی ارشد کمال کے ساتھ مجھے اپنا وہ فرینڈ نظر آ گیا، جو ہمارا میوچل فرینڈ تھا۔

ان میں سے آخری تصویر میں وہ دونوں ساتھ ساتھ کھڑے تھے۔ یہ تصویر چار ماہ پہلے کی تھی اور اس کے بیک گراؤنڈ میں وہ مکان نظر آ رہا تھا جہاں ہمیں وہ گلی سڑی لاشیں ملی تھیں۔ مکان کے برآمدے میں کھڑی وہ خاتون بھی کافی حد تک واضح نظر آ رہی تھی جو غالباً ایسے ہی تصویر میں آ گئی تھی۔ میں نے تصویر کو زوم کیا۔ اس کے پکسلز کافی حد تک پھٹ گئے مگر اس دھندلی تصویر میں بھی اس عورت کی خوبصورتی واضح تھی۔

میں نے ساری تصاویر دیکھ لیں مگر اور کسی تصویر میں وہ مجھے نظر نہیں آئی۔

تصاویر دیکھنے کے بعد میں نے اس اکاؤنٹ کا ''اباؤٹ'' سیکشن چیک کیا۔ ادھر مجھے اس کا موبائل نمبر مل گیا۔ میرا خوشی کا کوئی ٹھکانا نہیں رہا۔

میں نے باقی معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی تو توقع کے مطابق اس کا ایڈریس تو مجھے نہیں ملا تاہم اس کی بزنس آرگنائزیشن کا پتا چل گیا۔ اس نے آئی ڈی میں خود کو ''ایم'' اینڈ ''این'' ایکسپورٹس کا اونر ظاہر کیا ہوا تھا۔

موبائل نمبر سے میں اس کے گھر کا پتا بھی معلوم کر سکتا تھا، اور ایم اینڈ این ایکسپورٹس کو ڈھونڈنا بھی زیادہ مشکل نہیں تھا۔ میرے کافی رشتے دار یا تعلق دار امپورٹ ایکسپورٹ کا بزنس کرتے تھے۔ ان کے ذریعے ایم اینڈ این ایکسپورٹس کا پتا چل سکتا تھا اور وہاں سے ارشد کمال کے بارے میں کافی کچھ معلوم ہو سکتا تھا۔

اچانک مجھے وزیٹنگ کارڈز کا خیال آیا۔ میں نے وہ دیکھے تو تینوں کارڈز میں سے ایک ایم اینڈ این ایکسپورٹس کا بھی تھا اس پر اس کا مکمل پتا اور لینڈ لائن نمبر تحریر تھے۔ تاہم کسی شخص کا نام نہیں لکھا تھا۔ مجھے ایڈریس اور فون نمبر ہی درکار تھے اور وہ مجھے بغیر کسی تگ ودو کے مل گئے تھے۔

ایک گھنٹے سے بھی کم وقت میں صرف ایک تصویر کے سہارے اتنا کچھ جان لیا تھا۔ جو ارشد روایتی طریقہ تفتیش کے ذریعے ایک ہفتے میں بھی معلوم نہیں کر سکتا تھا۔ اور وہ مجھ پہ ہنس رہا تھا۔ یہی سب سوچتے ہوئے میں سو گیا۔ سونے سے پہلے مجھے اتنا اطمینان ضرور ہو گیا تھا کہ میں یہ کیس حل کرنے کے قریب پہنچ چکا ہوں۔

☆☆☆

اگلے دن میں نے یونیورسٹی سے چھٹی کر لی اور ایم اینڈ این ایکسپورٹس کے دفتر پہنچ گیا۔ یہ دفتر راولپنڈی کے مشہور کاروباری علاقے میں واقع تھا۔ دفتر دوسرے فلور پر تھا۔ میں اندر داخل ہوا تو ریسپشنسٹ نے میرا استقبال کیا۔ ہلکے میک اپ کے ساتھ وہ کافی خوبصورت لگ رہی تھی۔ اس کی عمر پچیس سے زیادہ نہیں تھی۔

''مجھے ارشد کمال صاحب سے ملنا ہے۔'' میں نے اس سے کہا تو وہ مسکرائی۔

''وہ تو تین چار ماہ پہلے ہی یہاں سے جا چکے ہیں۔'' اس نے شائستگی سے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ اس کی آواز بھی اس کی شخصیت کی طرح خوبصورت تھی۔

''کہاں گئے؟'' میں نے حیران ہونے کی اداکاری کی۔

''یہ تو مجھے نہیں پتا۔ بس اتنا ہی جانتی ہوں کہ وہ اپنے آبائی علاقے کی طرف شفٹ ہو گئے ہیں۔''

''تو اب کمپنی کا مالک کون ہے؟'' میں نے استفسار کیا۔

''سر اب اس کے مالک ارشد صاحب کے بھتیجے زعفران صاحب ہیں۔ دراصل یہ بزنس زعفران صاحب کے والد کا ہی تھا۔ ان کے مرنے کے بعد یہ ارشد صاحب نے سنبھال لیا تھا۔ جو اب انہوں نے واپس زعفران صاحب کے حوالے کر دیا ہے۔'' لڑکی کافی باتونی معلوم ہو رہی تھی۔

''ابھی زعفران صاحب سے ملاقات ہو سکتی ہے؟''

''جی وہ ہیں تو آفس میں ہی، میں ان سے پوچھ کے بتاتی ہوں۔ آپ اپنا نام بتائیں پلیز۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے انٹر کام اٹھا لیا۔

''نہیں نہیں رہنے دیں۔ میں اُن سے پھر کبھی مل لوں گا۔ مجھے ابھی ایک کام یاد آ گیا ہے۔'' میں نے لڑکی کو انٹر کام اٹھاتے دیکھ کے جلدی سے کہا۔ لڑکی نے مجھے حیرت سے دیکھ کے کندھے اچکا دیے۔

پہلے میں نے سوچا تھا کہ زعفران سے ابھی مل لوں مگر پھر خیال آیا کہ ابھی یہ مناسب نہیں۔ میں نے اس لڑکی کا

شکریہ ادا کیا اور باہر آ گیا۔

میں نے باہر نکل کے ٹائم دیکھا دس بجنے والے تھے۔ میں سیل جیب میں رکھنے ہی لگا تھا میسج ٹون بجی۔ میسج میں ارشد کمال کے گھر کا ایڈریس لکھا تھا۔

یہ سیٹلائٹ ٹاؤن راولپنڈی کے ایک گھر کا ایڈریس تھا۔ ارشد کمال کا نمبر جس سیلولر کمپنی کا تھا۔ میرا ایک دوست اس کے ہیڈ آفس میں کام کرتا تھا۔ میں نے اس سے نمبر کے مالک کا نام اور پتا معلوم کرنے کا کہا تھا۔ ایڈریس اسی نے سینڈ کیا تھا۔

میں نے ایڈریس کو غور سے پڑھا تو انکشاف ہوا کہ اس کے گھر کے پاس ہی میری ایک گرل فرینڈ سارہ کا گھر بھی ہے۔ سارہ یونیورسٹی میں میری کلاس فیلو تھی۔ وہ نہ صرف میری کلاس فیلو تھی بلکہ میری بہترین دوست بھی تھی بلکہ آج کل تو مجھے لگ رہا تھا کہ اس سے میری دوستی محبت کے مرحلے میں داخل ہو گئی ہے۔ بہرحال ابھی یہ بات یقینی نہیں تھی۔ مجھے کبھی بھی اپنے احساسات کی اتنی جلدی سمجھ نہیں آتی تھی۔

میں یونیورسٹی کی طرف روانہ ہو گیا۔ گیارہ بجے یونیورسٹی میں پہنچ چکا تھا۔ اس وقت ہمارا ایک پیریڈ فری ہوتا تھا۔ میں نے سارہ کو ''ویئر؟'' کا ٹیکسٹ کیا۔

''کیفے ٹیریا۔'' فوراً ہی اس کا جواب آیا۔

وہ اُدھر لڑکوں اور لڑکیوں کے ایک گروپ میں بیٹھی تھی میں اسے الگ ٹیبل پر لے آیا۔

اس نے پونی ٹیل باندھی ہوئی تھی۔ کانوں میں بڑے بڑے بالے تھے۔ بنا میک اَپ کے بھی اس کا چہرہ بہت اجلا لگ رہا تھا۔ وہ آنکھیں پٹ پٹا کے مجھے دیکھ رہی تھی۔ میں نے بمشکل اس کے چہرے سے نظر ہٹائی۔

''تم ارشد کمال کے بارے میں جانتی ہو؟ تمہاری ہی گلی میں رہتا ہے۔'' میں ڈائریکٹ ہی موضوع پہ آ گیا۔

''ہاں مگر تم کیوں پوچھ رہے ہو؟'' اس نے اپنی بڑی بڑی آنکھوں کو پھیلاتے ہوئے استفسار کیا۔

''پہلے جو میں پوچھ رہا ہوں، وہ بتاؤ پھر میں ساری بات بتاتا ہوں۔'' میں نے مسکراہٹ میں جھنجلاہٹ چھپاتے ہوئے کہا۔ میرے سوال کے جواب میں اگر کوئی سوال پوچھ لے تو مجھے سخت جھنجلاہٹ ہوتی ہے۔

''یہ ہمارے گھر کے پاس رہتے تھے مگر کافی ماہ پہلے ہی کہیں شفٹ ہو گئے تھے۔'' وہ میرا مزاج سمجھتی تھی اس لیے اس نے فوراً جواب دیا۔

اس سے کچھ دیر میں جو معلومات ملی۔ اس سے پتا چلا کہ دس سال پہلے زعفران کے والدین کے ایکسیڈنٹ کے بعد وہ ادھر آ کے رہنا شروع ہوئے تھے۔ انہوں نے ہی زعفران کی پرورش کی۔ کچھ ماہ پہلے زعفران نے گھر کرائے پر چڑھا دیا۔ پاس پڑوس میں اس نے یہ بتایا کہ وہ دوسرے شہر شفٹ ہو رہے ہیں۔ اِدھر کوئی دوسروں کے معاملات میں مداخلت نہیں کرتا اس لیے کسی نے اس سے زیادہ پوچھا نہیں۔

اس کے بعد میں نے کچھ اندازے لگائے اور شام کو زعفران کے ہاسٹل پہنچ گیا۔

☆☆☆

ساری کہانی سنانے کے بعد اس نے مجھ سے پوچھا۔

''تمہیں کیسے یہ سب پتا چلا؟''

''یہ میں تمہیں بعد میں بتاؤں گا۔ اس وقت اس سے زیادہ ضروری معاملات ہیں جن پر ہماری بات ہونا ضروری ہے۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا تو وہ اُلجھن بھرے انداز میں مجھے دیکھنے لگا۔

''کون سے معاملات؟'' وہ بولا تو اس کے لہجے میں بھی اُلجھن تھی۔

''سب سے پہلے تو مجھے وہ ڈیبٹ کارڈ دو جو کل تم نے مجھ سے لیا تھا۔'' میں نے سرد لہجے میں کہا۔

اس کا تمہیں کیا کرنا ہے؟'' وہ بے بسی سے بولا تاہم کل کی طرح آج اس نے مجھے ٹولی دینے کی کوشش نہیں کی۔

''سوال نہیں، میں تمہیں اپنا دوست سمجھتا تھا تم مجھے خود سب بتا دیتے تو میں کسی کو کچھ نہیں بتاتا مگر تم نے مجھے دھوکا دینے کی کوشش کی۔ کل تم نے ڈیبٹ کارڈ پر بھی قبضہ جما لیا اور تصویریں بھی ڈیلیٹ کر دیں۔ اب میں نے سب کچھ اپنی محنت اور ذہانت کے بل بوتے پر معلوم کیا ہے تو اس کا کچھ فائدہ تو مجھے ہونا چاہیے۔''

''وہ تو میری مجبوری تھی۔ میں ان کی شناخت تک پہنچنے والی ہر نشانی مٹا رہا تھا۔ بہرحال بچنا میری قسمت میں نہیں تھا۔ وہ افسردگی سے بولا۔ کچھ لمحات کے توقف کے بعد وہ بولا۔

''تم کیا فائدہ چاہتے ہو؟''

''دس لاکھ روپے۔'' میں نے اطمینان سے کہا تو اس کی آنکھیں پھٹ گئیں۔

''دیکھو ابھی مجھے کمپنی کے اکاؤنٹس پر بھی کنٹرول حاصل نہیں۔ مجھے ان پر کنٹرول حاصل کرنے کے لیے وقت

چاہیے۔ انکل کے اکاؤنٹ میں پانچ لاکھ کے قریب رقم ہے میرے پاس ڈیبٹ کارڈ کا کوڈ بھی ہے۔ تم یہ کارڈ لے لو اور پلیز اب خاموش رہنا۔'' وہ بے بسی سے بولا۔

''چلو ٹھیک ہے تم دوست ہو میرے تم مجھے دھوکا دینے کی کوشش نہ کرتے تو میں تمہیں ایسے بلیک میل نہ کرتا۔'' میں نے اطمینان سے کہا۔ وہ شرمندہ نظر آرہا تھا۔

اس نے مجھے کوڈ بتا دیا اور پھر سے مجھے خاموش رہنے کی التجا کی۔ میں نے اسے تسلی دی اور گھر چلا آیا۔

☆☆☆

اب آپ جاننا چاہ رہے ہوں گے کہ اس نے اپنے چچا چچی کو کیوں قتل کیا۔ میں اسی کی زبانی آپ کو بتاتا ہوں۔

''میں بارہ سال کا تھا جب میرے والدین کا انتقال ہوا۔ میرے چچا چچی ہمارے آبائی شہر میں رہتے تھے۔ چچا ایک پرائیویٹ کمپنی میں اکاؤنٹس آفیسر تھے۔ اس وقت ان کی شادی کو ایک دو سال ہی ہوئے تھے۔ میرے والدین کے انتقال کے بعد وہ میرے گھر میں ہی شفٹ ہو گئے۔ ابو اور وہ دو ہی بھائی تھے۔ انہوں نے میرا ہر طرح سے خیال رکھا۔ اتنا عرصہ گزر جانے کے بعد بھی وہ اولاد سے محروم تھے۔ یہ تقریباً ایک سال پہلے کی بات ہے کہ میں اپنے گھر کے بیسمنٹ میں بنے جم میں ایکسرسائز کر رہا تھا کہ آنٹی اُدھر آ گئیں۔ میں نے صرف ایک شارٹ پہنا ہوا تھا۔ میں انہیں دیکھ کر شرما گیا۔ وہ میرے پاس آ کے میرے بازوؤں کو ٹٹول ٹٹول کے دیکھنے لگیں۔ ''واہ تمہاری باڈی تو بہت زبردست ہے۔'' ان کا انداز نارمل تھا۔ مگر مجھے ان کی آنکھوں میں پیاس نظر آ رہی تھی۔

''ان کی عمر پینتیس سال سے کم ہی تھی اور وہ تھیں بھی بے پناہ خوبصورت۔ آج سے پہلے کبھی میں نے انہیں اس نظر سے نہیں دیکھا تھا۔ مگر آج جب وہ اس طرح میرے قریب آئیں تو میرا دل بھی دھڑکنے لگا۔ خیر قصہ مختصر میں بھی اپنے جذبات پہ قابو نہیں رکھ سکا اور اس کے بعد ہمارے درمیان نئے تعلقات کا آغاز ہو گیا۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ تمہارے چچا مکمل مردانہ صفات کے اہل نہیں ہیں اسی وجہ سے ہماری اولاد نہیں ہوئی۔ ہم اکثر تنہائی میں ساتھ وقت گزارنے لگے۔

''میرا ضمیر مجھے اکثر لتاڑتا کہ میرے چچا نے میری پرورش کی مجھے اتنی محبت اور شفقت دی۔ اور میں انہی کی عزت پہ ڈاکا مار رہا ہوں۔ میں اپنے آپ سے وعدہ کرتا کہ اب آنٹی سے نہیں ملوں گا مگر..... جذبات کی ندیا جب چڑھتی تو سارے وعدے بہا لے جاتی۔ کچھ ماہ بعد ہی میری ڈگری مکمل ہو گئی اور میں بزنس میں چچا کا ہاتھ بٹانے لگا۔ انہوں نے بزنس میں خوشدلی سے میرا استقبال کیا۔

''اب مجھے آنٹی سے تنہائی میں ملنے کا موقع کم ہی ملتا تھا۔ ایک بار چچا بزنس کے سلسلے میں دوسرے شہر گئے ہوئے تھے۔ میں آنٹی کے کمرے میں تھا۔ ہم ایک ہی بیڈ پر لیٹے ہوئے تھے۔ انہوں نے میرے کندھے پہ سر رکھ کے کہا۔ ''کاش، ارشد کسی طرح میری زندگی سے نکل جائے تو پھر میرے اور تمہارے درمیان کوئی رکاوٹ نہ رہے۔'' اس وقت میں بھی جذبات میں ان کی ہاں میں ہاں ملانے لگا۔

''ایوبیا سے نیچے ان کا ایک ریسٹ ہاؤس تھا۔ اکثر ہم گرمیوں میں اُدھر جاتے تھے۔ اس بار مئی کے آغاز میں ہی گرمی کافی ہو گئی ہم تینوں وہاں روانہ ہو گئے۔ اُدھر پہنچتے ہی بارشیں شروع ہو گئیں۔ آنٹی وہاں بہانے بہانے سے میرے کمرے میں آ کے مجھ سے چھیڑ چھاڑ کرتیں مگر چچا کی موجودگی میں باقی کچھ ممکن نہیں تھا۔ ادھر گئے ہمیں تیسرا دن تھا۔ میں رات کو سویا ہوا تھا اچانک میری آنکھ کھل گئی۔ میں بہت گہری نیند سوتا ہوں مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ میں نے دھماکے کی آواز سنی ہے۔ اسی وقت آنٹی میرے کمرے میں داخل ہوئیں۔ ان کے چہرے پہ ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ چچا کو ہم دونوں کے تعلق پر شک ہو گیا۔ آج انہوں نے اس حوالے سے مجھ سے بات بھی کی۔ میں نے الٹا ان پر غصہ کیا اور روتے روتے کروٹ بدل کر لیٹ گئی۔ وہ کچھ دیر بعد اٹھے اور الماری سے ایک پستول نکال لیا۔ یہ ان کا اپنا پستول تھا اور اس کا لائسنس بھی ان کے پاس تھا۔ میں کن اکھیوں سے انہیں دیکھ رہی تھی اور میرا دل خوف سے کنپٹیوں میں دھڑک رہا تھا۔ وہ شش و پنج میں تھے آخرکار وہ پستول لیے بیڈ پر آ کے لیٹ گئے۔ میں نے ان کی طرف کروٹ بدل لی اور نیم وا آنکھوں سے ان کو دیکھنے لگی۔ انہوں نے پستول کا رخ میری طرف کیا اور گولی چلانے ہی لگے تھے کہ میں نے ان کے ہاتھ پر ہاتھ مارا۔ میرا ہاتھ لگنے سے پستول کا رخ ان کی طرف ہو گیا اسی دوران گولی چل گئی جو اُن کے سر میں جا لگی۔'' اتنا کہہ کے انہوں نے میرا ہاتھ پکڑا اور کمرے کی طرف کھینچنے لگیں۔

''میں حیران پریشان ان کے ساتھ چل پڑا۔ کمرے میں پہنچا تو چچا بیڈ پر چت پڑے تھے ان کی پیشانی سے بہتا خون پورے چہرے پر پھیل رہا تھا۔

''میرے دل میں ایک ٹیس اٹھی۔ کچھ بھی تھا مجھے دنیا

گدھے

مجھے گدھوں پر بہت ترس آتا تھا۔ میں سوچتا تھا، ان کی بھی کیا زندگی ہے، ان کا سارا دن سامان ڈھونے اور مالک کے چانٹے کھاتے گزر جاتا ہے۔ تھوڑی دیر کے لیے ان کی کمر سے سامان اُتارا جاتا ہے تو دوسری جگہ سے سامان لانے کے لیے اس دفعہ مالک ان کی کمر پر سوار ہو جاتا ہے۔ رات گئے اِن گدھوں کو کھونٹی سے باندھ دیا جاتا ہے۔ جہاں یہ چپکے چپکے آنسو بہاتے ہیں۔

گزشتہ روز ایک گدھا گاڑی میں جُتے گدھے سے میں نے انٹرویو کیا۔ اس گدھے سے جو سوال جواب ہوئے ان کی تفصیل درج ذیل ہے۔

''گڈ آفٹرنون مائی ڈیئر ڈونکی!''

''آپ نے شاید مجھ سے کچھ کہا ہے؟''

''ہاں! میں نے تمہیں دوپہر کا سلام کیا ہے!''

''وعلیکم السلام، میں دراصل اردو میڈیم گدھا ہوں، مجھے انگریزی نہیں آتی، مجھے بتایا گیا تھا کہ انگریزی بولنا غلامی کی نشانی ہے بس اس وقت سے اپنی قومی زبان اُردو بولتا ہوں اور انگلش میڈیم کی غلامی کرتا ہوں۔''

''کیا تمہارا مالک انگلش میڈیم ہے؟''

''نہیں! اردو میڈیم ہے، وہ انگلش میڈیم طبقے کے لیے گدھے بھرتی کرتا ہے اور ان سے بھرتی ڈلوا کر ان کی بنیادیں مضبوط کرتا ہے۔''

''میں نے سڑک پر چلتے ہوئے کئی مرتبہ دیکھا ہے کہ زیادہ سامان لادے جانے کی وجہ سے گدھا گاڑی آگے کو اٹھ جاتی ہے اور تم اس کے ساتھ ہوا میں معلق ہو جاتے ہو۔ تم اس ظلم کے خلاف احتجاج کیوں نہیں کرتے؟''

''تم انسان خود پر ہونے والے ظلم کے خلاف احتجاج کرتے ہو مگر اس کا کیا نتیجہ نکلتا ہے جو ہم گدھوں کے احتجاج سے نکلے گا۔''

''تم کم از کم محکمۂ انسدادِ بے رحمیِ حیوانات سے شکایت تو کر سکتے ہو!''

''یہ محکمہ ہم گدھوں کے لیے پولیس ڈپارٹمنٹ کی حیثیت رکھتا ہے۔ کیا تم لوگ پولیس اسٹیشن جا کر اپنے اوپر ہونے والے کسی ظلم کی شکایت درج کرا سکتے ہو؟ اگر نہیں تو پھر اپنا مشورہ اپنے پاس ہی رکھو!''

''میں نے سُنا تھا کہ گدھا ایک بے وقوف جانور ہے لیکن تم تو اپنی باتوں سے خاصے عقلمند لگتے ہو!''

''یہ پراپیگنڈا بھی ظالموں ہی کا کیا ہوا ہے۔ کیا تم کبھی اسلام آباد گئے ہو؟''

''اکثر جانا ہوتا ہے!''

''پھر تم کیسے کہہ سکتے ہو کہ گدھا ایک بے وقوف جانور ہے۔ اکیسویں صدی میں چودھویں صدی کے نظام کی گدھا گاڑی کھینچنا کوئی آسان کام ہے؟ مگر اسلام آباد میں بیٹھے میرے بھائی بند دقیانوسی نظام کی گاڑی کتنی سہولت سے کھینچتے چلے جا رہے ہیں۔ خود میں بھی ان دنوں لنڈا بازار جانے کی سوچ رہا ہوں، وہاں سے کسی آنجہانی امریکن کا سوٹ اور ٹائی خریدوں گا، سنا ہے ان دنوں امریکی کاغذی یونیورسٹیوں کی ڈگریاں بھی بازار سے سستے داموں مل جاتی ہیں۔ بس تھوڑے سے پیسے جمع ہو جائیں، اس کے بعد اسلام آباد میں تم میرے پی اے کی معرفت مجھ سے بات کرنے کے لیے ترس جاؤ گے اور تمہیں ہر بار یہی بتایا جائے گا کہ صاحب میٹنگ میں ہیں!''

عطاء الحق قاسمی کی کتاب وصیت نامے سے اقتباس

میں سب سے زیادہ اگر کوئی پیارا تھا تو وہ میرے چچا ہی تھے۔ میں نے ہمیشہ انہیں اپنے باپ کی جگہ ہی دی تھی۔ میں انہیں اس حال میں دیکھ کے پاگل ہو گیا۔ ان کی قاتلہ میرے عقب میں کھڑی تھی۔ میں نے غصے سے اس کی گردن پکڑ لی اور دبانے لگا۔ اس نے مجھ سے اپنا آپ چھڑانے کی کافی کوشش کی مگر مجھ پر اس وقت جنون سوار تھا۔ مجھے اس وقت ہوش آیا جب وہ بے دم ہو کے میری بانہوں میں جھول گئی۔ میں نے اسے چھوڑ دیا تو وہ اُدھر ہی اوندھے منہ گر گئی۔ میں گھبرا گیا۔ مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ میں کیا کروں۔ آخر کار میں نے فرار کا فیصلہ کر لیا۔ میں نے ان کے شناختی کاغذات لیے، تمام دروازوں کو تالا لگایا اور گاڑی لے کے اسی وقت پنڈی والے گھر آ گیا۔ ادھر ہر کوئی مجھ سے چچا کے بارے میں پوچھتا اس لیے نے ادھر یہ مشہور کر دیا کہ ہم اپنے آبائی گاؤں شفٹ ہو رہے ہیں۔ اور مکان کرائے پر چڑھا کے بہارہ کہو آ گیا۔ ادھر مجھے کوئی بھی جانتا نہیں تھا۔ اس لیے میں نے یہاں کا انتخاب کیا۔ اِدھر آ کے میں نے سب کو یہی بتایا کہ میں ایک پرائیویٹ فرم میں جاب کرتا ہوں۔ میں نے گاڑی بھی بیچ دی اس کا ٹرانسفر لیٹر اوپن تھا اس لیے مجھے کوئی مسئلہ نہیں ہوا۔ ایک دو ماہ گزرے تو میرا سارا خوف دور ہو گیا۔ میں چچا کی موت بھی بھول گیا۔ ابھی کچھ دن پہلے میری اپنی آفس کی ایک لڑکی سے دوستی ہوئی وہ میرے ساتھ کچھ دن کے لیے کسی پہاڑی علاقے میں گھومنے پھرنے کی خواہش کرنے لگی۔ تو مجھے چچا کے اس ریسٹ ہاؤس کا خیال آیا۔ ان کی لاشیں وہاں سے نکل جاتیں تو وہ ریسٹ ہاؤس ایسے مقاصد کے لیے بہت مفید جگہ تھی۔ مجھے ادھر اکیلے جانے کی ہمت نہیں ہوئی۔ میں اگر اس گھر کو اپنا ظاہر کرتا اور ان لاشوں کو اپنے چچا چچی کی لاشیں مان لیتا تو میرے پکڑے جانے کے چانس روشن تھے۔ لاشیں اب یقیناً گل سڑ چکی ہوتیں کسی کو بھی علم نہیں تھا کہ وہ گھر کس کا ہے۔ نہ ان کی کوئی شناختی نشانی میں نے اُدھر چھوڑی تھی۔ سو میں تم لوگوں کو لے کر اُدھر چلا گیا۔ بارش نہ بھی ہوتی تو میں تم لوگوں کو لے کر اس گھر ضرور جاتا ہم سب مل کے لاشیں دریافت کرتے تو کسی کو بھی مجھ پر شک نہ ہوتا۔ مگر مجھے پتا نہیں تھا تمہاری شکل میں، میں اپنی موت کو ساتھ لے کے جا رہا ہوں۔'' آخر میں وہ پھیکے سے انداز میں مسکرایا تھا۔

☆☆☆

زعفران میرا دوست تھا۔ اسے پکڑوا کے مجھے کچھ نہ ملتا البتہ اسے بچا کے پانچ لاکھ تو مجھے ابھی مل رہے تھے۔ باقی وہ ساری زندگی میرا احسان مند رہتا اور میں اس سے فائدے اٹھاتا ہی رہتا۔ یہ سوچ کے میں نے اس کے بارے میں پولیس کو نہیں بتایا۔

''تقریباً ایک ہفتے بعد ارشد مجھے گلی میں ملا، وہ مجھے دیکھتے ہی طنزیہ انداز میں بولا۔ ''کیوں بھئی مسٹر جاسوس' تمہارا کیس کہاں تک پہنچا؟''

''میرا کیس یا تمہارا کیس؟ قتل کے کیس حل کرنا تو پولیس کا کام ہوتا ہے۔ تم اسے حل کرنے کے بجائے الٹا میرے کھاتے میں ڈال رہے ہو۔'' میں نے بھی طنز کا جواب طنز سے ہی دیا۔

''تھا تو وہ ہمارا ہی کیس مگر تمہیں بڑا جوش چڑھا تھا وہ کیس حل کرنے کا۔ بڑے چیلنج دے رہے تھے۔ کدھر گیا وہ جوش؟ عقل ٹھکانے آ گئی نا، میں نے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ یہ کیس حل کرنا آسان نہیں۔ میں اس کے بارے میں ابھی تک کچھ نہیں کر سکا تو خیر تم نے کیا کمال کر لینا تھا۔'' اس نے طنز کے بھرپور وار کیے، مگر میں مسکراتا ہی رہا۔

''پتا نہیں کیوں ایسے ہی مجھے جوش چڑھ گیا تھا۔ گھر آ کے سوچا تو مجھے اپنی حماقت کا احساس ہوا۔ سو میں نے تو کچھ کیا ہی نہیں۔'' میں نے اپنے لہجے میں مسکینی سموتے ہوئے کہا۔

وہ ہنسنے لگا۔ ''چلو شکر ہے تمہیں جلدی اپنی حماقت کا احساس ہو گیا ورنہ میں نے کارِ سرکار میں مداخلت کے جرم میں تمہیں اندر کر دینا تھا۔'' اس کے لہجے میں شرارت تھی۔

میں بھی ہنس دیا۔

لگتا تھا اس نے یہ کیس حل کرنے کی کوشش ہی نہیں کی تھی۔ ورنہ وزیٹنگ کارڈز اور تصویر کے ذریعے لاشوں کی شناخت کچھ مشکل کام نہیں تھا.... وزیٹنگ کارڈز والے کسی بھی ایڈریس پر وہ تصویر لے جاتا تو اسے ارشد کمال کے بارے میں معلوم ہو جاتا۔ مگر وہ ہڈحرام تھا یا اس کے پاس اتنا دماغ ہی نہیں تھا۔ اس کیس کا کوئی مدعی تو تھا نہیں اس لیے اس نے بھی تفتیش کی زحمت ہی گوارا نہیں کی تھی۔

وہ چلا گیا تو میں دل ہی دل میں مسکرا دیا۔ اسے کیا خبر تھی کہ وہ جس کیس کو حل کرنا ناممکن سمجھ رہا تھا، وہ میں نے چند گھنٹوں میں حل کر لیا تھا۔ نہ صرف کیس حل کر لیا تھا بلکہ اتنی رقم کمائی تھی جتنی وہ پورے سال میں بھی نہیں کما سکتا تھا۔ جی ہاں اس اکاؤنٹ میں چار لاکھ نوے ہزار کی رقم تھی اور پہلا کیس حل کرنے کا اتنا معاوضہ میرے خیال میں کافی سے بھی زیادہ تھا۔ آپ کا کیا خیال ہے؟

چڑھائی بہت طویل اور کٹھن تھی۔ ہماری اب تک کی کارکردگی توقع سے بہتر رہی تھی۔ خاص طور پر اگر اس حقیقت کو مدِنظر رکھا جاتا کہ ہم سب ایک دوسرے کے لیے اجنبی تھے اور ہمارے لیے ایک ٹیم کی طرح کام کرنے کا یہ پہلا موقع تھا۔ ہم سب ایک دوسرے سے مختلف تھے۔ صرف ایک چیز مشترک تھی اور وہ چیز تھی، ہمارا مقصد... اور ہمارا مقصد تھا ''کچھ لوگوں کی... اپنے پیاروں کی رہائی۔''

ہماری اس چھوٹی سی بے جوڑ ٹیم کے لیڈر شہباز خان

رہائی

ڈاکٹر سلیم عادل

سفر تفریح و لطف کے باعث ہی نہیں ہوتے... کچھ سفر تھکا دینے والے... وجود کو چُور چُور اور روح کو گھائل کر دینے والے بھی ہوتے ہیں... وہ چاروں بھی ایک دوسرے کی ہمراہی میں ایسے سفر پر نکلے تھے جو آگ و خون کی راہوں سے گزرتا تھا... ہر قدم قاتل کی گرفت کا حامل تھا... وہ سائل تھے... مگر ساحل سے دور نہ تھے...

خونی رشتوں کی تلاش میں خونی دریاؤں کا سامنا کرنے والے جانبازوں کا معرکہ.....

نے ایک مقام پر پہنچ کر سب کو رکنے کا اشارہ کیا اور بولا۔

''ہماری منزل، یعنی سائیں بابا کا فارم ہاؤس اس پہاڑ کی دوسری جانب ہے۔ اگر آپ حضرات میں سے کوئی واپس جانا چاہے تو ابھی وقت ہے، آپ لوٹ سکتے ہیں۔''

مجھے شہباز خان کی یہ بات بے تکی محسوس ہوئی لیکن اس کے باوجود یہ خیال ذہن میں آیا کہ واقعی، اپنی مہم اور اپنے فیصلے پر نظرثانی کرنے کا یہی موقع ہے۔ ظاہر ہے یہ جگہ ہمارے ملک کے دارالحکومت سے زیادہ دور نہ ہونے کے باوجود آزاد علاقہ تھا جہاں ملکی قوانین برائے نام ہی لاگو ہوتے تھے۔ یوں بھی ہمارے پاک وطن میں قانون کی جتنی پاسداری ہوتی ہے، وہ ہم سب بخوبی جانتے تھے۔

دوسری اہم بات یہ تھی کہ ہماری ٹیم جسے شہباز خان یہاں اکٹھا کر کے لے آیا تھا، کوئی کمانڈو یا تربیت یافتہ لڑاکا افراد کا گروپ نہیں تھا۔ اس ٹیم کے ممبران میں مجیب ضیا بینک منیجر، ملک بشیر بزنس مین، میں یعنی پرویز ترین پولیس افسر ریٹائرڈ شامل تھے۔

گنجے سر اور کلین شیو والا شہباز خان اس ٹیم کا لیڈر تھا۔

قصہ مختصر، ہم میں سے کوئی بھی واپس جانے کو تیار نہیں ہوا بلکہ ہمارا ارادہ مزید پختہ ہو گیا۔ یہ دیکھ کر شہباز خان کے چہرے پر آسودہ مسکراہٹ آ گئی۔

شہباز خان نے اپنے بارے میں بتایا تھا کہ اس کا تعلق حکومت کے ایک حساس اور خفیہ ادارے سے تھا لیکن پھر اپنے باس سے کسی کھٹ پٹ کی وجہ سے اسے جبری ریٹائرمنٹ کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ فی الحال اس کا پیشہ اور مصروفیت یہی تھی، یعنی خفیہ، غیر معمولی اور پُراسرار قسم کے گروپس کی چھان بین کرنا۔

پہاڑ کی چوٹی پر پہنچ کر ہمیں مطلوبہ فارم ہاؤس نظر آیا۔ ایک وسیع میدان میں بنا ہوا فارم ہاؤس تین بڑی عمارتوں پر مشتمل تھا۔ سب سے بڑی عمارت اصل میں ایک اصطبل تھا جسے ایک میٹنگ ہال کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا۔ باہر کی طرف کے رخ والی عمارت کو بیرک یعنی رہائشی ہاسٹل کی شکل دی گئی تھی۔ مرکزی رہائشی عمارت سائیں بابا کے اپنے استعمال میں تھی جس میں وہ اپنے باڈی گارڈز یعنی ''کھلونوں'' کے ساتھ رہتا تھا۔

شہباز خان دوربین لگائے فارم ہاؤس کو دیکھ رہا تھا۔ اردگرد کا علاقہ سنسان اور غیر آباد تھا۔ دور دور تک آبادی اور رہائش کا نام و نشان نہیں تھا۔ سائیں بابا نے خوب جگہ ڈھونڈی تھی۔ یہ فارم ہاؤس اس کے کسی مرید کے خاندان کی ملکیت تھی جسے سائیں بابا نے اونے پونے خرید کر اپنی کمیونٹی کے لیے وقف کر دیا تھا اور ظاہر ہے یہ رقم بھی اس نے مریدوں کے ذریعے ہی حاصل کی تھی۔

اتنے میں ملک بشیر، شہباز خان سے مخاطب ہوا۔ ''ذرا یہ دوربین مجھے دینا۔ میں بھی اس جگہ کو دیکھوں۔ اس پر میری بھی رقم لگی ہے۔ میرا ناہنجار خبیث بیٹا مجھ سے لاکھوں روپے لوٹ کر لے گیا ہے، اس کمینے سائیں بابا کے پاس۔ قسم سے، آج میں اپنا کچھ نہ کچھ نقصان پورا کر کے رہوں گا۔''

میں نے اسے ٹوکا۔ ''ملک صاحب! ہم کسی جنگ پر نہیں آئے۔ ہم یہاں صرف اپنے بچوں کی رہائی کے لیے آئے ہیں۔''

شہباز خان فوراً بولا۔ ''پرویز! تم ٹھیک کہتے ہو لیکن میں یہ بھی نہیں چاہوں گا کہ ہم ہر قسم کی صورتِ حال کے لیے خود کو تیار نہ کریں۔'' یہ کہہ کر اس نے اپنے کندھے سے لٹکتے چرمی تھیلے میں ہاتھ ڈالا اور جب اس کا ہاتھ باہر آیا تو اس میں ایک چھوٹے سائز کا ریوالور تھا۔ وہ اسے میری طرف بڑھا کر بولا۔ ''لو، یہ میں تمہارے لیے لایا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ سروس کے دوران میں تمہارے پاس اسی قسم کا ہتھیار ہوا کرتا تھا۔''

میں نے ہاتھ نہیں بڑھایا اور کہا۔ ''میرا خیال ہے ہم نے اس بات کا فیصلہ کیا تھا کہ کوئی ہتھیار استعمال نہیں کریں گے۔''

شہباز خان سنجیدگی سے بولا۔ ''دیکھو پرویز! تم جانتے ہو کہ سائیں بابا کے خلاف حال ہی میں قانونی کارروائی شروع کی گئی ہے اور اس کے نتیجے میں اسے اشتہاری قرار دے دیا گیا ہے۔ لیکن اب کیا کیا جائے کہ اس کے پیروکاروں میں چند بہت بااثر افراد کے بچے بھی شامل ہیں... اگر اس کے اڈے پر باقاعدہ ریڈ کیا جائے تو بہت خون خرابا ہوگا۔ اسی لیے ان بااثر افراد نے پولیس اور دیگر قانون نافذ کرنے والے محکموں کو روکا ہوا ہے۔ لیکن سائیں بابا کے نوجوان پیروکار بہت بھڑکے ہوئے ہیں۔ وہ بات کرتے ہیں خدا اور محبت کی لیکن حقیقت میں ان کا ایمان سائیں بابا پر ہے اور اگر ان کے اس ''ایمان'' کو کوئی خطرہ محسوس ہو تو وہ فوراً مرنے مارنے پر اتر آتے ہیں۔ یعنی وہ مسلح بھی ہیں اور مرنے مارنے پر تیار بھی۔ تو پھر کیا کرنا چاہیے؟ یہ ٹھیک ہے کہ ہم یہاں خون خرابا کرنے نہیں آئے لیکن اگر کوئی ٹولا ہماری جان لینے کی کوشش کرے تو ظاہر

ہے ہم انہیں اپنے سرتو پیش نہیں کر سکتے۔"

ملک بشیر جھٹ بولا۔ "خان صاحب! اگر پرویز صاحب نہیں مانتے تو یہ ریوالور مجھے دے دو۔"

میں نے خاموشی سے ریوالور شہباز خان کے ہاتھ سے لے لیا۔ یہ تقریباً نیا امریکن ساخت کا روگر ریوالور تھا۔ کسی روایتی ریوالور کے برعکس اس میں چھ کے بجائے پانچ خانے ہوتے ہیں لیکن اس کے چھوٹے سائز اور طاقتور اعشاریہ تین آٹھ بور کی گولیاں اس کی ایسی خوبیاں ہیں جو اس کی اس کمی کو پورا کرتی ہیں۔ ریوالور کے پانچوں خانے گولیوں سے بھرے ہوئے تھے۔ میں نے ریوالور اپنی پینٹ میں اڑس لیا۔ شہباز خان نے قہقہہ لگایا اور بولا۔ "لو بھئی، پولیس والے نے بالآخر اسلحہ قبول کر لیا۔ اور ہاں ملک صاحب! ریوالور میں نے پرویز صاحب کو اس لیے دیا ہے کہ وہ اس کا استعمال آپ سے بہتر جانتے ہیں اور آپ کے برعکس انہوں نے اسلحے سے صرف ٹارگٹ پریکٹس نہیں کی۔"

اس کے بعد ہمارا ایڈونچر شروع ہوا۔ اس ایڈونچر میں تین افراد ایسے تھے جو اپنے بچوں کی تلاش میں نکلے تھے اور انہیں سائیں بابا کے چنگل سے نکالنا چاہتے تھے۔

سائیں بابا چند برس پہلے اچانک ہمارے ملک میں نمودار ہوا تھا۔ لمبی داڑھی، آنکھوں میں ایک خاص قسم کی چمک لیے ہوئے۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس نے اپنے بے شمار پیروکار بنا لیے۔ اس کے تمام مرید نوجوان تھے۔ ان میں لڑکے بھی تھے اور لڑکیاں بھی۔ یہ سب گھروں سے بھاگے ہوئے یا بے گھر نوجوان تھے۔ ان سب کو سائیں بابا بہت اچھی اچھی باتیں بتاتا تھا۔ جلد ہی اس نے ان سب کو ایک فوج میں تبدیل کر دیا اور ان کی مدد سے شہر کے بدنام علاقوں سے منشیات فروشوں اور نشے کے عادی لوگوں کو بھگا دیا۔ اس کے ان کارناموں سے متاثر ہو کر بااثر افراد کے بچے بھی اس کی اس "فوج" میں شامل ہو گئے اور ان کی وساطت سے سائیں بابا کو بھاری رقوم بھی چندے کی صورت میں ملنا شروع ہو گئیں۔

آہستہ آہستہ لوگوں کو احساس ہوا کہ سائیں بابا جو تعلیمات دے رہا ہے، اس کا تعلق اسلام سے نہیں بلکہ کسی بھی جانے پہچانے مذہب سے نہیں ہے۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ خود کو ایک پیغمبر کے طور پر متعارف کروانے والا ہے۔ اس کے مرید اسے اپنا استاد اور پیر سے بڑھ کر بھی بہت کچھ مانتے ہیں۔ اس کے بعد یہ باتیں پھیلنا شروع ہو گئیں کہ سائیں بابا چندے میں ملنے والی رقوم کو ذاتی استعمال میں لا رہا ہے بلکہ ان رقوم کو پُراسرار عملیات، منشیات اور جنسی بے راہ روی کے لیے استعمال کر رہا ہے اور کروا رہا ہے۔ یہ بھی سننے میں آیا کہ وہ اپنی مرید لڑکیوں کو نشے کا عادی بنا کر ان سے جنسی فعل کا ارتکاب کرتا ہے۔ اس کے باوجود اس کے نام کا جادو ایسا چل چکا تھا کہ نوجوان اس کے مریدوں میں شامل ہونے سے باز نہ آئے۔ ان نوجوانوں میں میری اکلوتی بیٹی شرمین بھی شامل تھی۔

میرا ذہن ماضی کی طرف چلا گیا۔ میری نوکری میرے لیے عبادت کا درجہ رکھتی تھی۔ نہ دن اپنا، نہ رات اپنی۔ سائرہ سے شادی میری ایک جذباتی غلطی تھی۔ سائرہ کا تعلق تو متوسط گھرانے سے تھا لیکن اس کے ارادے اور خواہشات ضرورت سے زیادہ بلند تھیں۔ اس نے مجھ سے شادی یہ سوچ کر کی تھی کہ پولیس والے کی آمدنی لامحدود ہوتی ہے اور یہ کہ حرام حلال کی تمیز کیے بغیر میں اس کے آگے پیچھے دولت کے انبار لگا دوں گا۔ اسے یہ بھی علم تھا کہ میں ایک ایمان دار اور فرض شناس پولیس آفیسر ہوں لیکن اسے یقین تھا کہ وہ مجھے "راہِ راست" پر لے آئے گی۔ اس کی یہ خوش فہمی میں نے جلد ہی دور کر دی تھی۔ اس کا نتیجہ آئے دن کے جھگڑوں کی صورت میں نکلا اور بالآخر شادی کے بارہ سال بعد سائرہ گیارہ سالہ شرمین کو چھوڑ کر چلی گئی۔ میں نے اپنی بیٹی شرمین کو سنبھالنے کی بہت کوشش کی۔ دوستوں نے مشورہ دیا کہ میں دوسری شادی کر لوں تاکہ مجھے بیوی اور شرمین کو ماں مل جائے لیکن میں نے اپنی بچی پر سوتیلی ماں کو مسلط کرنا مناسب نہ سمجھا... یہ میری غلطی تھی۔

ایک فل ٹائم پولیس والا ہونے کی وجہ سے میں ایک پارٹ ٹائم شوہر بنا تھا اور اب جبکہ مجھے شرمین کو ماں اور باپ دونوں کی حیثیت سے پالنا تھا... میں مزید ناکام ثابت ہوا۔ بچی بے جا سختی، کبھی بے جا لاڈ۔ چھ برس بعد... شرمین مجھے چھوڑ کر اپنی ماں کے پاس چلی گئی۔ اس کی ماں شروع سے ہی اسے نہیں چاہتی تھی بلکہ وہ تو اسے پیدائش سے پہلے ہی ختم کر دینا چاہتی تھی۔ میرے پاس چھ برس گزارنے والی بیٹی اپنی ماں کے پاس چھ ماہ بھی نہ گزار سکی اور پھر مجھے علم ہوا کہ وہ سائیں بابا کے پیروکاروں میں شامل ہو کر اس کے پاس جا چکی ہے۔ میں کچھ بھی نہ کر سکا کیونکہ اس وقت تک شرمین بالغ ہو چکی تھی اور یہ کہ اس وقت سائیں بابا کی شہرت ایک پرہیزگار اور خدائی فوج دار جیسی تھی جو گھر سے بھاگے اور معاشرے کے ٹھکرائے ہوئے

نوجوانوں کو زندگی کا ایک عظیم مقصد دے رہا تھا اور انہیں راہِ راست پر لا رہا تھا۔ جب تک سائیں بابا کا اصل روپ سامنے آیا، اس وقت تک وہ بہت طاقت حاصل کر چکا تھا۔ چند بااثر اور مشہور سیاست دانوں کے بچے اس کے گروہ میں شامل ہو چکے تھے اور سائیں بابا کو اپنے ماں باپ سے بڑھ کر مانتے تھے۔ اگر ان بچوں کے ماں باپ سائیں بابا کے خلاف کوئی کارروائی کرتے تو وہ مرنے مارنے پر تیار ہو جاتے۔ چنانچہ ان کے بااثر ماں باپ نے نہ صرف ان سے چھیڑ چھاڑ سے پرہیز کیا بلکہ اپنا اثر رسوخ استعمال کر کے اس بات کو بھی یقینی بنایا کہ قانون نافذ کرنے والے ادارے بھی انہیں اور ان کے سائیں بابا کو ان کے حال پر چھوڑ دیں۔ چنانچہ قانونی طور پر سائیں بابا کو مجرم اور اشتہاری قرار دینے کے باوجود اس کے خلاف کوئی عملی کارروائی سرکاری سطح پر نہیں کی گئی تھی۔

اپنی بیٹی کی طرف سے مایوس ہو کر میں نے خود کو اپنی نوکری میں مزید مصروف بلکہ غرق کر دیا اور ایک رات میں نے خود کو واقعی غرق کر دیا۔ شہر کے پوش علاقے میں مسلح ڈاکا پڑ رہا تھا۔ کسی ہمسائے کو شک ہوا تو اس نے پولیس کو فون کر دیا۔ ہمارے ملک میں پولیس ایسے موقع پر وقوعہ کے بعد پہنچتی ہے لیکن یہ ''میں'' تھا۔ میں نے اپنے سب انسپکٹر اور دو کانسٹیبلوں کو ساتھ لیا اور بتائے ہوئے پتے پر پہنچ گیا۔ اندر سے باقاعدہ گولیاں چلنے کی آواز آ رہی تھی۔ ڈاکو شاید نشے میں تھے جو یوں کھلم کھلا فائرنگ کر رہے تھے۔ آس پاس کے لوگ گھروں میں دبکے ہوئے تھے۔ میں نے اپنے عملے کو اشارہ کیا اور اندھا دھند گھر کے مین گیٹ سے اندر داخل ہو گیا۔ اب میرے سامنے گھر کی مین بلڈنگ تھی۔ اچانک دروازے میں سے ایک لمبا تڑنگا نوجوان باہر نکلا۔ مجھے دیکھ کر وہ ایک لمحے کو ٹھٹکا اور پھر ہاتھ میں پکڑی ہوئی پمپ ایکشن شاٹ گن سیدھی کی لیکن اس سے پہلے کہ وہ ٹریگر دباتا، میرے ہاتھ میں پکڑے ہوئے سروس ریوالور نے شعلہ اگلا اور وہ اپنا سینہ پکڑے الٹ کر پیچھے جا گرا۔ اعشاریہ تین آٹھ کی گولی نے اس کے بائیں پھیپھڑے اور دل کے پرخچے اڑا دیے تھے۔

چند لمحوں بعد اسی دروازے سے اس کا ساتھی نکلا۔ اس نے دائیں ہاتھ سے دو بچوں کو پکڑا ہوا تھا۔ وہ بائیں ہاتھ میں پکڑے ہوئے ریوالور کو ہلا کر گرجا۔

''انسپکٹر! پستول پھینک دے ورنہ میں ان بچوں کو اُڑا دوں گا۔'' اندر سے دبی دبی چیخوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ میں نے گہری سانس لی اور ریوالور کی نال نیچے جھکا دی۔ ڈاکو نے اطمینان کی سانس لی اور ڈرائنگ روم کے دروازے کی طرف مڑا جہاں سے بچوں کی ماں روتی ہوئی باہر نکل رہی تھی۔ اچانک میں نے اپنا ریوالور سیدھا کیا اور ایک اور دھماکا گونجا۔ میرے ریوالور کی گولی اس ڈاکو کے دائیں کان میں داخل ہو کر بائیں کان سے باہر نکل گئی۔ اس کے کان کے اندرونی اعضا، بھیجا اور خون اُڑ کر پیچھے ڈرائنگ روم کی کھڑکی کے شیشے پر جا لگا تھا۔ گولی ڈاکو کے سر سے گزر کر کھڑکی کا شیشہ توڑتی ہوئی اندر کہیں گم ہو گئی تھی۔ میں نے سامنے دیکھا، کھڑکی کے شیشے میں گولی کا سوراخ اور اس کے اردگرد ڈاکو کے خون کے چھینٹے مدھم روشنی میں نظر آ رہے تھے۔ کچھ چھینٹے بچوں کی چیختی ہوئی ماں کے چہرے پر بھی گرے لیکن اطمینان کی بات یہ تھی کہ بچوں اور ان کی ماں کو کوئی گزند نہیں پہنچی تھی۔

میں نے اطمینان کی سانس اندر کھینچی لیکن اس سانس کو باہر نکلنے کا موقع نہیں ملا کیونکہ اسی وقت مجھے ایسا لگا جیسے کسی نے میری کمر میں دہکتا ہوا انگارا داخل کر دیا ہو۔ دراصل میں یہ سوچ کر اپنی پشت سے غافل ہو گیا تھا کہ میرا عملہ میرے پیچھے مجھے کور کیے ہوئے ہے جبکہ میرا سب انسپکٹر اور دونوں کانسٹیبل تو اپنی جان کے خوف سے گولیوں کی آواز سن کر سرے سے گھر میں داخل ہی نہیں ہوئے تھے۔ ڈاکوؤں کا تیسرا ساتھی پیچھے آم کے درخت کے پاس زمین پر رکھی ہوئی ایک بوری کے پیچھے چھپا ہوا تھا اور موقع ملتے ہی مجھ پر وار کر گیا تھا لیکن اس کے پاس کوئی آتشیں ہتھیار نہیں تھا۔ صرف ایک خنجر تھا جسے اس نے میری کمر میں گھونپ دیا تھا۔ شدید زخمی ہونے کے باوجود میں تیزی سے گھوما۔ وہ خنجر میری کمر میں بائیں طرف، شانے سے کچھ نیچے اپنے آدھے پھل تک دھنسا ہوا تھا۔ حملہ آور اسے یونہی چھوڑ کر پیچھے ہٹ گیا تھا۔ وہ سیاہ رنگ کی جیکٹ میں ملبوس تھا۔ جیکٹ کے بٹن بند تھے اور جیکٹ کی ہڈ نما ٹوپی اس کے سر پر تھی جس نے اس کے سر کے علاوہ چہرے کو آدھے سے زیادہ چھپا رکھا تھا۔

میں نے ریوالور سیدھا کیا اور ٹریگر دبا دیا۔ گولی سیدھی اس کے سینے میں دائیں جانب لگی۔ گولی کے دھکے سے حملہ آور پیچھے آم کے درخت سے جا ٹکرایا اور پھر نیوٹن کے تیسرے کلیے کے مطابق درخت کے جوابی دھکے سے واپس آگے کو آیا۔ اس کی جیکٹ ٹوپی سمیت پھٹ کر درخت کی شاخوں میں الجھ کر پیچھے رہ گئی اور پھر... اس حملہ آور یعنی تیسرے ڈاکو کے گھنے، لمبے سیاہ بال، کانوں میں پہنی

ہوئی بالیاں، سفید رنگ کی تنگ قمیص اور سینے کے نشیب و فراز نمایاں ہو گئے۔ یہ سب ایک لمحے کے لیے میری نظروں کے سامنے آیا اور اس کے بعد وہ حملہ آور لڑکی پشت کے بل بوری کے اوپر ڈھیر ہو گئی۔

میں لڑکھڑاتا ہوا اس کے پاس پہنچا۔ گھنے سیاہ بالوں، اجلی رنگت اور نشیلی آنکھوں والی وہ ایک خوب صورت لڑکی تھی اور... میری بیٹی شرمین کی ہم عمر۔ اس کی سفید قمیص خون سے سرخ ہو چکی تھی۔ میری چلائی ہوئی گولی نے اس کی دائیں چھاتی اور پھیپھڑے کو پھاڑ دیا تھا۔ اس نے آہستگی سے آنکھیں کھول کر میری طرف دیکھا اور پھر اس کی نظریں گھوم کر ڈرائنگ روم کی کھڑکی کے ٹوٹے ہوئے شیشے پر ٹھہر گئیں جہاں دوسرے ڈاکو کا خون گولی کے سوراخ کے اردگرد نمایاں نظر آ رہا تھا۔ لڑکی کی آنکھوں میں اس لمحے کرب نظر آیا۔ اس نے میری طرف دیکھا۔ اس کے ہونٹ نیم وا تھے اور ان میں سے اس کے موتیوں جیسے سفید دانت نظر آ رہے تھے۔ وہ مجھے کچھ کہنا چاہ رہی تھی، لیکن ساتھ ہی اسے کھانسی آئی اور اس کے منہ سے خون کی پھوار اچھل کر میرے چہرے پر پڑی۔ اس کے ساتھ ہی اس کے جسم نے ایک جھٹکا کھایا اور ساکت ہو گیا۔ اس کی کھلی آنکھیں ٹوٹی ہوئی کھڑکی اور گولی کے سوراخ پر مرکوز تھیں۔ غالباً دوسرا ڈاکو اس کا محبوب تھا اور اس کے بہکاوے میں آ کر وہ اس کے گروپ کے ساتھ اس جرم میں شامل ہو گئی تھی اور اسے خاک اور خون میں لوٹتا دیکھ کر برداشت نہ کر پائی تھی اور مجھ پر وار کرنے کی غلطی کر بیٹھی تھی۔

اس کے ساتھ ہی میں بھی ہوش و حواس سے بیگانہ ہو گیا تھا۔

☆☆☆

ہوش آیا تو میں اسپتال میں تھا۔ میرے اس کارنامے نے محکمے میں میری دھوم مچا دی تھی۔ اخباروں نے میرے اس کارنامے کو سرخیوں میں شائع کیا۔ میں صحت یاب ہو گیا۔ میری بہت عرصے سے رکی ہوئی ترقی مجھے مل گئی۔ میں انسپکٹر سے ڈی ایس پی بن گیا۔ لیکن جلد ہی مجھے احساس ہوا کہ میں پہلے والا پرویز ترین نہیں رہا تھا۔ کسی بھی مہم، کسی بھی ایکشن کا ذکر ہوتا تو میری نگاہوں میں اس لڑکی کی آنکھیں اور اس کا خون میں لت پت جسم گھوم جاتا۔ مجھے ایسا لگتا جیسے میں نے اپنی بیٹی پر گولی چلائی ہو۔ مجھے یہ احساس ہونے لگا کہ اس ذہنی حالت میں اگر میں پولیس کی ملازمت جاری رکھوں تو یہ ناانصافی ہو گی۔ یوں بھی میری

حالت میرے محکمے سے چھپی نہ رہ سکی تھی۔ کچھ دوستوں کے کہنے پر میں نے اعلیٰ حکام کو محکمہ تبدیل کرنے کی درخواست دی تاکہ میں آفس ورک والی ملازمت کر سکوں۔ میری درخواست منظور ہو گئی اور مجھے صوبائی حکومت کے ایک محکمے میں بطور سیکشن آفیسر تبدیل کر دیا گیا۔ لیکن چند دنوں میں ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ یہ ملازمت میرے لیے نہیں تھی۔ میں ایکشن کا، فیلڈ کا بندہ تھا جس کے میں قابل نہیں رہا تھا۔ آفس نامی پنجرہ مجھے راس نہیں آ سکتا تھا۔ اس لڑکی کی ہلاکت نے میرا کیریئر تباہ کر دیا تھا۔

چنانچہ میں نے ایک بار پھر درخواست دی اور اس مرتبہ قبل از وقت ریٹائرمنٹ کے لیے۔

میری یہ درخواست بھی منظور ہو گئی اور مجھے پورے اعزاز، انعام اور پنشن کے ساتھ ریٹائر کر دیا گیا۔

اب میں تھا اور میری تنہائی۔ بیوی سے علیحدگی اور طلاق کو دس برس بیت گئے تھے۔ شرمین سے جدا ہوئے بھی دو برس سے زیادہ عرصہ گزر گیا تھا اور اس سے کسی قسم کا رابطہ نہیں ہو سکا تھا۔ اکثر راتوں کو بے خوابی کی حالت میں، میں اپنے ریوالور اور اس کے ساتھ پڑی ہوئی گولیوں کو دیکھتا اور ذہن میں خودکشی کے خیالات آ جاتے۔

انہی دنوں شہباز خان نے مجھ سے رابطہ کیا۔ میں پہلے اس سے کبھی نہیں ملا تھا۔ البتہ اخبار میں اس کے لکھے ہوئے مضامین پڑھتا رہتا تھا۔ کچھ عرصہ پہلے اس کے مضامین چھپنے بند ہو گئے تھے اور ایک دن اچانک وہ میرے سامنے تھا۔

اس نے اپنا تعارف کروایا تھا کیونکہ میں نے نہ اسے پہلے دیکھا تھا اور نہ ہی کبھی اس کی تصویر دیکھی تھی۔ اس نے بتایا کہ وہ سائیں بابا کے مرکز پر غیر سرکاری حملہ کرنا چاہتا ہے۔ اس کام کے لیے اس کے ساتھ دو مزید لوگ شامل تھے یعنی ملک بشیر اور مجیب ضیا۔ ان دونوں کے بیٹے سائیں بابا کے شکاروں میں شامل تھے۔ ان کی کہانیاں بھی میری کہانی سے کسی حد تک ملتی جلتی تھی۔ مجیب ضیا فطرتاً ایک شریف آدمی تھا لیکن اس کی بدقسمتی یہ تھی کہ اس کی بیوی بچپن سے ہی ایک ذہنی مرض میں مبتلا تھی لیکن شادی کے وقت اس کی بیوی کے ماں باپ نے کامیابی سے اس حقیقت کو چھپا لیا تھا۔ شادی کے کچھ عرصے بعد ہی مجیب ضیا کو اس بات کا علم ہو گیا لیکن ایک تو اس کی فطری شرافت اور دوسرے یہ کہ اس کی بیوی امید سے ہو گئی تھی۔

چنانچہ مجیب ضیا نے اس مصیبت کو قسمت کا لکھا سمجھ کر قبول کر لیا تھا اور یہی اس کی بدقسمتی میں اضافے کا باعث

بنا۔ مجیب ضیا ایک صحت مند بچے کا باپ بن گیا لیکن ایک نیم پاگل ماں کے زیرِ سایہ تربیت نے بچے کی شخصیت پر منفی اثرات ڈالے۔ مجیب ضیا کی ملازمت بینک میں تھی اور مصروفیت کی بنا پر وہ اپنے بیٹے کو مناسب وقت اور تربیت نہ دے سکا۔ اسی دوران جب اس کا بیٹا سترہ برس کا تھا، اس کی بیوی نے اپنی دوا کی مقدار سے زیادہ خوراک لے لی اور رات کو ایسی سوئی کہ صبح اٹھنا نصیب نہیں ہوا۔ مجیب ضیا کا بیٹا، شہزاد مجیب پہلے ہی منشیات کا عادی بن چکا تھا۔ ماں کی موت نے سونے پر سہاگے کا کام کیا۔ لاشعوری طور پر وہ باپ سے نفرت کرتا تھا۔ ماں کے مرنے کے چند ماہ بعد ہی وہ گھر سے بھاگ کر سائیں بابا کے پیروکاروں میں شامل ہو گیا۔ یہ سب باتیں مجیب ضیا نے اپنے گھر میں جائے کے دوران ہمیں بتائی تھیں اور ساتھ میں اپنے بیٹے کی تصویریں بھی دکھائی تھیں۔ اس کا بیٹا ایک خوبرو نوجوان تھا لیکن تصویروں میں بھی اس کی آنکھوں میں شدت پسندی اور نفرت کے تاثرات نظر آرہے تھے۔

شہباز خان کا دوسرا ساتھی ملک بشیر ایک سخت گیر قسم کا کاروباری شخص تھا۔ دولت مند ہونے کے باوجود وہ پیسے کے معاملے میں خاصا کنجوس واقع ہوا تھا۔ اس کا ایک ہی بیٹا تھا، ملک دلاور۔ اس کے بچپن سے ہی ملک بشیر اس پر بے جا سختی اور بات بات پر ڈانٹ ڈپٹ کرنے کا عادی تھا۔ ذرا سی بات پر اسے روئی کی طرح دھنک کر رکھ دینا بھی عام بات تھی۔ اس وجہ سے بچپن سے ہی بچے کے ذہن میں باغیانہ خیالات تھے۔ جوان ہونے کے بعد ملک دلاور نے باپ کو آنکھیں دکھانا شروع کیں۔ باپ کی سخت گیری کے باوجود وہ باپ سے اکثر بھاری رقم حاصل کرلیا کرتا تھا کیونکہ اب ملک بشیر کسی حد تک بیٹے سے خائف رہنے لگ گیا تھا۔ ماں بے چاری کا گھر میں کوئی خاص عمل دخل نہیں تھا۔ اس کے باوجود وہ ہمیشہ بیٹے کی طرف داری کی کوشش کرتی۔

گھر کا یہی ماحول جو زیادہ تر منفی تھا، ملک دلاور پر اثر انداز ہوا اور پھر جب سائیں بابا کی شہرت ہوئی تو ایک صبح ملک دلاور اپنے کمرے سے اور گھر سے غائب پایا گیا۔ جاتے ہوئے وہ باپ کے سیف سے لاکھوں روپے کیش اور ماں کے زیورات بھی صاف کر گیا تھا اور اس کے بدلے میں اپنے سرہانے ایک رقعہ چھوڑ گیا تھا جس کے مطابق وہ ایک ''نیک'' مقصد کے لیے گھر چھوڑ کر جارہا تھا اور باپ کے سیف میں موجود رقم اور ماں کا زیور بھی وہ ایک نیک مقصد میں استعمال کرنے کے لیے لے جارہا تھا۔ خط میں اس نے ماں اور باپ دونوں کو تنبیہ کی تھی کہ اسے تلاش کرنے کی کوشش نہ کی جائے ورنہ اس کے خطرناک نتائج نکل سکتے ہیں۔

اس واقعے کو تقریباً ایک برس گزر گیا تھا اور ملک دلاور نے اپنے ماں اور باپ دونوں سے رابطہ کرنے کی کوشش یا زحمت نہیں کی تھی۔

مجیب ضیا کے برعکس ملک بشیر کا دل افسوس یا غم کے بجائے غصے سے بھرا ہوا تھا۔ چنانچہ جب شہباز خان نے اس سے اس مہم میں شامل ہونے کی درخواست کی تو وہ بہ خوشی تیار ہو گیا تھا۔ مجیب ضیا پہلے ہی تیار تھا۔ اس مہم کا مقصد ان بچوں کی سائیں بابا کے چنگل سے نجات تھی۔ اس ساری مہم کا خرچہ شہباز خان برداشت کررہا تھا۔ شہباز خان نے مجھے بھی اس مہم میں شامل کرنے کی پیشکش کی۔ یہ مہم بظاہر ناممکن اور احمقانہ نظر آتی تھی لیکن پھر مجھے خیال آیا کہ مجھ جیسے شخص کے لیے جس کی زندگی کا کوئی مقصد نہ رہا ہو... جس کے پاس کھونے کے لیے کچھ نہ ہو، یہ مہم ایک نعمت سے کم نہیں۔ اگر اس مہم میں جان چلی گئی تو ایسی موت خودکشی سے تو بہتر ہی ہو گی اور اگر یہ مہم کامیاب ہو گئی تو مجھے اپنی بیٹی، اپنی شرمین واپس مل جائے گی۔ چنانچہ میں نے بھی اس مہم میں شمولیت کی ہامی بھر لی تھی۔

☆☆☆

ہم چاروں سائیں بابا کے ٹھکانے کی طرف رواں دواں تھے۔ شہباز خان ہمیں لے کر ایک مکئی کے کھیت میں گھس گیا جس کے پودے قدِ آدم سے کچھ ہی کم تھے۔ شہباز خان بولا۔ ''میرے پیچھے چلو اور ذرا جھک کے اور خاموش رہنا۔ سائیں بابا کا ٹھکانا اس کھیت سے آگے ہے۔''

شہباز خان سب سے آگے تھا۔ اس سے پیچھے میں، مجھ سے پیچھے ملک بشیر اور سب سے پیچھے مجیب ضیا۔ اچانک مجھے اپنے پیچھے پودے ٹوٹنے کی کھڑکھڑاہٹ سنائی دی۔ میں نے اور ملک بشیر نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ مجیب ضیا اطمینان سے چلا آرہا تھا۔ اس نے اپنے پیچھے ہونے والی آواز پر توجہ نہیں دی تھی۔ غالباً اس کی حسیات اتنی تیز نہیں تھیں۔ اچانک فضا شاٹ گن کے فائر کی آواز سے لرز اٹھی اور میں نے مجیب ضیا کے دائیں طرف کے آدھے چہرے اور سر کو پھٹتے اور خون، گوشت اور مغز کے ملغوبے میں تبدیل ہوتے دیکھا اور وہ آواز نکالے بغیر منہ کے بل زمین پر گر کر ساکت ہو گیا۔ اس سے چند قدم پیچھے ایک نوجوان اپنے ہاتھ میں

ایک نالی والی بارہ بور کی شاٹ گن لیے کھڑا تھا اور مسلسل کہتا جا رہا تھا۔ ''ہم سائیں بابا سے محبت کرتے ہیں۔ ہم اس کی ہر بات مانتے ہیں۔ جو اس کو مارنے آئے گا، ہم اس کی جان لے لیں گے۔'' اچانک ایسا محسوس ہوا کہ مکئی کے کھیت میں جان پڑ گئی ہے۔ ہمارے دونوں اطراف سے سائیں بابا کے مریدوں نے حملہ کر دیا۔ یہ تعداد میں تین تھے اور سب کے ہاتھوں میں مختلف قسم کے ہتھیار تھے۔

ایک کے ہاتھ میں نیزہ، ایک کے ہاتھ میں کلہاڑی اور ایک کے ہاتھ میں گنڈاسا۔ ان سب نے اپنے جسم پر مکئی کے پتے باندھ رکھے تھے اور دور سے دیکھنے میں مکئی کے چلتے پھرتے پودے نظر آتے تھے۔

ملک بشیر چیخا۔ ''پرویز! ریوالور نکالو۔ فائر کرو۔''

لیکن میں نے اس کی بات سنی ان سنی کر دی۔ یہ سب نوجوان تھے اور ان کی حرکتیں بہت آہستہ تھیں۔ لگتا تھا جیسے یہ سب کسی ٹرانس یا نشہ آور دوا کے زیر اثر ہیں۔ نیزے سے مسلح نوجوان نے مجھ پر حملہ کیا۔ اس نے نیزہ آگے کیا۔ میں نے جھکائی دی اور ساتھ ہی میری بھرپور لات اس کے پیٹ پر پڑی اور وہ الٹ کر پیچھے جا گرا۔ اس کا نیزہ میرے ہاتھ میں آ گیا۔ اب میں نے شاٹ گن سے مسلح نوجوان پر توجہ دی۔ وہ اپنی سنگل بیرل شاٹ گن کو دوبارہ لوڈ کر رہا تھا لیکن میں اس سے زیادہ پھرتیلا ثابت ہوا۔ وہ نوجوان اپنی گن میں کارتوس ڈال چکا تھا لیکن اس سے پہلے کہ وہ اسے سیدھا کرتا، میں نے نیزہ اس کے حلق میں گھونپ دیا اور وہ آواز نکالے بغیر مجیب ضیا کی لاش کے پاس ڈھیر ہو گیا۔ اب میں نے اس کے چہرے پر نظر ڈالی تو انکشاف ہوا کہ یہ نوجوان، یعنی مجیب ضیا کا قاتل، مجیب ضیا کا اپنا بیٹا شہزاد مجیب تھا۔ جس بیٹے کی تلاش میں مجیب ضیا اس مہم میں شامل ہوا تھا، اسی بیٹے نے اس کی جان لے لی اور اب خود بھی ایک لاش کی صورت میں اپنے باپ کے پہلو میں پڑا تھا۔

''لو مجیب ضیا۔'' میں بڑبڑایا۔ ''تمہارا ایڈونچر تو یہیں ختم ہو گیا۔ مبارک ہو۔''

اچانک میں حقیقت کی دنیا میں واپس آ گیا۔ مجھے ملک بشیر کی چنگھاڑتی ہوئی آواز آئی۔ ''خبیث! کتے کے پلے! خون چوسنے والی جونکیں! ہم ان بچوں پر اپنا سب کچھ نچھاور کر دیتے ہیں اور یہ ہماری جان کے دشمن بن گئے ہیں!'' وہ یہ کہتا جاتا اور ہاتھ میں پکڑی ہوئی کلہاڑی کے وار کرتا جاتا۔ یہ کلہاڑی اس نے ایک حملہ آور سے چھینی تھی۔ میں نے اور شہباز خان نے مل کر ملک بشیر کو قابو کیا لیکن اس

جھوٹ

بھگت سنگھ اپنے دوست کے ساتھ جا رہے تھے کہ کھیت کے کنارے انہیں دو بم پڑے نظر آئے۔ انہوں نے اٹھا لیے اور کہا کہ وہ انہیں پولیس کے حوالے کر دیں گے۔

دوست نے ڈرے سہمے لہجے میں کہا۔ ''اگر راستے میں ان میں سے کوئی بم پھٹ گیا تو کیا ہوگا؟''

''اوئے کوئی بات نہیں۔'' سردار جی نے بے پروائی سے کہا۔ ''تھوڑا سا جھوٹ بولنا پڑے گا۔ پولیس والوں سے کہہ دیں گے کہ ہمیں ایک ہی بم ملا تھا۔''

عمر کوٹ سے وقار احمد کی سادگی

وقت تک وہ بقیہ تینوں حملہ آوروں کو ہلاک کر چکا تھا۔

میں نے شہباز خان سے کہا۔ ''خان صاحب! ہم یہاں اس لیے تو نہیں آئے تھے۔ یہ دیکھیے... ملک نے ان لڑکوں کا قیمہ بنا دیا ہے۔ صرف اس کا نہیں جس نے اس پر حملہ کیا تھا... بلکہ اس کا بھی جس نے آپ پر حملہ کیا تھا اور اس کا بھی جو میری لات کھا کر زمین پر پڑا ہوا تھا۔''

شہباز خان بولا۔ ''جو ہو چکا سو ہو چکا۔ یہ جنگ ہے۔ اس نے وہی کیا جو اسے کرنا چاہیے تھا۔ تم نے بھی وہی کیا۔ اب چلو۔''

ظاہر ہے اب ہمیں اکٹھے ہی چلنا تھا۔ اگر پہلے ہم اکٹھے نہیں بھی تھے تو اب ہمارے بیچ ایک رشتہ بن گیا تھا۔ خون کا رشتہ بلکہ خون خرابے کا رشتہ۔

☆☆☆

دور سے کچھ گانے کی مدھم سی آوازیں آ رہی تھیں۔ میں نے غور کیا تو اندازہ ہوا کہ یہ آوازیں اصطبل سے آ رہی تھیں۔ شہباز خان کی معلومات کے مطابق آج رات ان کا کسی مخصوص قسم کی ''عبادت'' کا سیشن تھا۔ اپنی روٹین پر یہ لوگ سختی سے کاربند رہتے تھے خواہ سائیں بابا ان کے درمیان اس وقت موجود ہو یا نہ ہو۔ میں نے ایک گہری سانس لی۔ غالباً اسی شور میں انہوں نے ہماری لڑائی اور خون خرابے کی آوازیں نہیں سنی تھیں اور ہم ان کے اڈے کے نزدیک پہنچ گئے تھے۔ ہمارے اور اصطبل کے درمیان وہ بلڈنگ تھی جسے بیرک کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا۔ اچانک ملک بشیر بولا۔ ''وہ دیکھو، بیرک کے دروازے پر ایک گارڈ

کھڑا ہے وہ ہمارا انتظار کر رہا ہے تا کہ ہم اسے نظر آئیں اور وہ ہمیں گولیوں سے بھون ڈالے۔'' اس سے پہلے میں یا شہباز خان اسے روک پاتے، وہ جست لگا کر نوجوان گارڈ کے سر پر پہنچ گیا ۔۔۔ گارڈ کو اس کے نزدیک آنے کی خبر نہ ہوئی۔ اصطبل سے آنے والی آوازیں اسے بھی مست کر رہی تھیں اور وہ آہستہ آہستہ جھوم رہا تھا۔ اس نے ہاتھ میں روسی ساخت کی اے کے 47 رائفل، ''المعروف'' بلکہ ''البدنام'' کلاشنکوف تھام رکھی تھی۔

اچانک اس کی نگاہ ملک بشیر پر پڑ گئی لیکن اس سے پہلے کہ وہ گن سیدھی کرتا، ملک بشیر کی کلہاڑی نے اس کے سر کو درمیان سے دو حصوں میں تقسیم کر دیا۔ اس کے بعد ملک بشیر نے اس کی گری ہوئی کلاشنکوف اٹھائی اور بیرک کے دروازے کی طرف اس طرح لپکا جیسے بھیڑیا بھیڑ کی طرف جھپٹتا ہے۔ اس سے پہلے کہ میں اسے پکڑتا، وہ بیرک کے اندر پہنچ چکا تھا۔ ایک لمحے بعد فضا کلاشنکوف کی مخصوص تڑتڑاہٹ سے گونج اٹھی۔ ساتھ میں اس کے منہ سے مغلظات کا طوفان اٹھ رہا تھا۔ ''حرام زادے، غلیظ کیچوے، کتے ۔۔۔ اگر ہم نے ان کا سر کچلنے میں پہل نہ کی تو یہ ہمیں مار ڈالیں گے۔''

ملک بشیر اپنا ذہنی توازن کھو چکا تھا۔ مجھے احساس ہوا کہ وہ یہاں اپنے بچے کی رہائی کے لیے نہیں آیا تھا۔ وہ غالباً سال بھر پہلے اپنے بچے پر صبر کر چکا تھا اور آج وہ صرف بدلہ لینے آیا تھا۔ میں سن حالت میں کھڑا رہا اور ملک بشیر میرے پاس سے گزر کر باہر چلا گیا۔ بیرک میں نوجوانوں کی لاشوں کے سوا کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ یہاں سائیں بابا کے وہی مرید تھے جن کی آج رات عبادت کی باری نہیں تھی۔ میں نے ان سب لاشوں کے چہرے دیکھے لیکن ان میں شرمین نہیں تھی۔

دیوار پر ایک نوٹس بورڈ لٹکا ہوا تھا۔ میں نے اسے غور سے دیکھا کہ شاید کوئی ایسی لسٹ نظر آ جائے جس سے اندازہ ہو جائے کہ کون کس بلڈنگ میں ہے۔ شاید مجھے اپنی بیٹی کا کچھ پتا چل جائے لیکن وہاں صرف سائیں بابا کی تصویر لگی ہوئی تھی۔ اس کی آنکھیں ہپناٹزم کا اثر لیے ہوئے تھیں۔ تصویر میں سائیں بابا کی تقریباً دو فٹ لمبی داڑھی اور گھنی مونچھیں تھیں جنہوں نے اس کا آدھے سے زیادہ چہرہ چھپا رکھا تھا۔ اس کی آنکھیں مجھے اپنے چہرے میں گڑتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں جیسے میرا مذاق اڑا رہی ہوں۔

اچانک میں نے فضا میں ایک بار پھر کلاشنکوف کی تڑتڑاہٹ سنی۔ میں نے گھبرا کر باہر کی طرف دیکھا۔ ''اوہ میرے خدا! اصطبل یعنی میٹنگ ہال ۔۔۔'' میں باہر بھاگا۔

میٹنگ ہال کا گیٹ کھلا ہوا تھا۔ میں نے گیٹ پر کھڑے ہو کر اندر نگاہ ڈالی۔ ملک بشیر درجنوں پاگل نوجوانوں کے درمیان کھڑا تھا اور گھوم گھوم کر فائرنگ کر رہا تھا۔ اس کے اردگرد چند نوجوان زخمی اور مردہ حالت میں پڑے تھے۔ اتنے میں کلاشنکوف کی تڑتڑاہٹ بند ہو گئی۔ اس کا میگزین خالی ہو چکا تھا۔ اب ملک بشیر کی باری تھی۔ چھریوں، کلہاڑیوں اور ڈنڈوں سے مسلح غصے میں بپھرے ہوئے پاگل اس پر ٹوٹ پڑے اور چند لمحوں میں اس کی مسخ شدہ لاش زمین پر پڑی تھی۔ میں ابھی تک گیٹ پر کھڑا تھا۔

اس ساری کارروائی کے دوران میں لاشعوری طور پر سب نوجوانوں کے چہرے دیکھ چکا تھا اور شرمین ان میں بھی نہیں تھی۔ اچانک ایک نوجوان کی نظر مجھ پر پڑ گئی اور اس نے چلا کر باقیوں کو متوجہ کیا اور یہ جتھا میری طرف لپکا۔ میں نے فوراً پیچھے ہٹ کر گیٹ بند کرنے کی کوشش کی لیکن ایک نوجوان نے اپنی ٹانگ اور ایک نے اپنا بازو گیٹ میں پھنسا دیا۔ سب مل کر گیٹ کو اندر سے دھکا دے کر کھولنے کی کوشش کر رہے تھے اور گیٹ کھلنے ہی والا تھا۔ مجھے اپنا انجام اچھی طرح نظر آ رہا تھا۔ اچانک میں نے شہباز خان کو اپنے ساتھ کھڑے پایا۔ ہم دونوں مل کر بھاری گیٹ کو بند کرنے اور لکڑی کا بھاری کنڈا لگانے میں کامیاب ہو گئے۔ شہباز خان بولا۔

''اب چلو یہاں سے۔ میں نے اس عمارت کے باقی تمام راستے بھی باہر سے بند کر دیے ہیں۔ اب یہاں سے کوئی باہر نہیں نکل سکتا۔ اب صرف سائیں بابا کی رہائش گاہ والی عمارت باقی رہ گئی ہے۔''

اتنے میں مجھے اصطبل میں سے دھواں اٹھتا دکھائی دیا۔ میں رک گیا۔ ''خان۔'' میں نے کہا۔ ''میرا خیال ہے کہ کلاشنکوف میں کچھ روشنی کرنے والی گولیاں بھی تھیں جن کی وجہ سے اصطبل میں آگ لگ گئی ہے۔ اصطبل کی ساری عمارت لکڑی کی ہے اور باہر جانے کے تمام راستے بند ہیں۔ اس کا مطلب ہے کہ اندر رہ جانے والے سب نوجوان ۔۔۔''

شہباز خان نے میری بات کاٹ کر جملہ مکمل کیا۔ ''ہاں! اندر رہ جانے والے سب پاگل نوجوان ہماری کھال اتار کر ہماری انتڑیاں نکال کر دیوار پر لٹکا دیں گے، اگر انہیں موقع مل جائے تو ۔۔۔ اور تم ان کے اس کام کو آسان

بنانے کی کوشش مت کرو۔"

میں نے سوچا کہ اصطبل میں موجود جتھے میں شرمین نہیں تھی۔ یعنی وہ سائیں بابا کی رہائش گاہ میں ہی ہو سکتی تھی۔ ملک بشیر کے بیٹے کو میں شکل سے نہیں پہچانتا تھا لیکن مجھے یقین تھا کہ وہ اصطبل میں موجود زندہ جل کر مرتے ہوئے گروپ میں شامل تھا۔

شہباز خان نے مجھے ٹھوکا دیا۔ "پرویز! کس سوچ میں پڑ گئے؟ ہوش و حواس قائم رکھو۔ اب ہم سائیں بابا کی رہائش گاہ میں داخل ہونے جا رہے ہیں۔ وہاں تھوڑے سے گارڈ ہوتے ہیں لیکن دھیان رکھنا۔ وہ گارڈ پوری طرح مسلح ہوتے ہیں اور ان جانوروں کی طرح ہوش و حواس سے بیگانے نہیں ہوتے۔ تم پیچھے سے رہائش گاہ میں گھسنے کی کوشش کرو۔ جب میں تمہاری طرف سے گولی چلنے کی آواز سنوں گا تو سامنے سے داخل ہو جاؤں گا۔"

☆☆☆

مجھے اندازہ تھا کہ سائیں بابا کے گارڈ ہمارا انتظار کر رہے ہیں۔ انہیں یقین ہو گا کہ ہم آئیں گے لیکن وہ خاموشی سے انتظار کر رہے تھے تاکہ ہم اندر آئیں اور چوہوں کی طرح پھنس جائیں، واپس نہ جانے کے لیے۔ ان کو شکست دینے کا یہی طریقہ تھا کہ میں ان سے بہتر کارکردگی کا مظاہرہ کروں۔ اس وقت میرے اندر کا سویا ہوا نڈر پولیس افسر بیدار ہو چکا تھا۔ میں رہائش گاہ کے پچھلے دروازے کے پاس پہنچا۔ وہاں خاموشی تھی مگر میں جانتا تھا کہ اس دروازے کے پیچھے شکاری گھات لگائے کھڑا ہے۔ مجھے دروازے کے بائیں طرف شیشے کی کھڑکی نظر آئی۔

میں نے ریوالور نکال کر ہاتھ میں پکڑا اور اپنے جسم کی پوری قوت سے اس پر چھلانگ لگا دی اور کھڑکی کا شیشہ توڑتا ہوا اندر جا گرا۔ زمین پر گرتے ہی میں نے اپنے ریوالور کا رخ دائیں طرف کیا اور ٹریگر دبا دیا۔ میرا اندازہ درست تھا۔ دروازے کے پیچھے ایک گارڈ ہاتھ میں اسرائیلی ساخت کی آٹومیٹک اوزی سب مشین گن لیے تیار کھڑا تھا لیکن وہ دروازے کے لیے تیار تھا جبکہ میری گولی کھڑکی کی طرف سے آئی تھی اور اس کے حلق سے پار ہو گئی تھی۔ وہ وہیں ساکت کھڑا رہ گیا۔ اس کے منہ سے خرخراہٹ کی آواز نکلی، پھر اس کا جسم اکڑا اور وہ پہلو کے بل ڈھے گیا۔

اچانک مجھے ایک اندھیرے کونے سے ہلکی سی آہٹ سنائی دی۔ میں نے بغیر نشانہ لیے اس طرف فائر جھونک دیا۔ ساتھ ہی ایک چیخ سنائی دی اور ایک آدمی نظر آیا جو اپنے پیٹ پر ہاتھ رکھے ابلتے ہوئے خون کو روکنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ اس کی دو نالی والی شاٹ گن اس کے ہاتھوں سے نکل کر زمین پر گر پڑی تھی۔ میں نے اس پر مزید وقت اور ایمونیشن ضائع کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔

اب میں ایک وسیع لاؤنج میں تھا۔ میرا رخ سیڑھیوں کی جانب تھا۔ شہباز خان کی اطلاع کے مطابق سائیں بابا کا بیڈروم اوپر تھا۔ میرے ذہن میں اپنے پچھلے ایکشن کی رات کی یاد بھوت کی طرح اپنی پرچھائیاں دکھائی دے رہی تھی اور مجھے لگ رہا تھا کہ ابھی کوئی خنجر میری پیٹھ میں گھس جائے گا۔ میرا پرانا زخم پھر درد کرنے لگا تھا لیکن شرمین کو پانے کی امید، اسے رہا کرانے کی خواہش مجھے آگے بڑھا رہی تھی۔ سیڑھیوں پر مجھے ایک گارڈ نظر آیا جو اپنی ایم 16 سے فائرنگ کرتا ہوا نیچے آ رہا تھا لیکن میں اندھیرے میں تھا جبکہ وہ روشنی میں ہونے کی وجہ سے آسان ہدف تھا۔ میرے ریوالور نے ایک اور شعلہ اگلا اور وہ گارڈ بھی سیڑھیوں سے نیچے لڑھک گیا۔ اچانک ایک گولی میرے سر کو چھوتی ہوئی فرش میں دھنس گئی۔ میں نے فوراً خود کو زمین پر گرا دیا اور لاؤنج میں پڑی ہوئی بڑی سی کھانے کی میز کے نیچے گھس گیا۔ میز کے کونے سے میں نے ذرا سا سر نکال کر اوپر دیکھا تو سیڑھیوں کے اوپر ایک لمبے بالوں والا شخص نظر آیا۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی اس نے ہاتھ میں پکڑی ہوئی کاربین سے مجھ پر ایک اور فائر کیا۔ میں فوراً چھلانگ مار کر میز کے نیچے سے نکل آیا۔ میز درمیان سے دو ٹکڑے ہو گئی۔ لمبے بالوں والے گارڈ کی کاربین خالی ہو چکی تھی اور وہ اسے دوبارہ لوڈ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میرے لیے اتنا موقع کافی تھا۔ میرے ریوالور نے چوتھی گولی اگلی اور یہ چوتھا گارڈ بھی ریلنگ کے پاس ڈھیر ہو گیا...

خاموشی... غالباً یہاں چار ہی گارڈز تھے اور سب ہی میرے ریوالور کا نشانہ بن چکے تھے۔

میں آہستگی سے سیڑھیاں چڑھتا سائیں بابا کے بیڈروم کے دروازے پر پہنچا اور اندر جھانکا۔ کمرے میں سائیں بابا کے کوئی آثار نہیں تھے لیکن کمرے میں کوئی اور تھا۔ کمرے میں شرمین تھی۔ ہاں، میری بیٹی شرمین۔ سائیں بابا کے بستر پر نہایت شرمناک حالت میں۔ تقریباً برہنہ۔ میں نے پتھرائی ہوئی آنکھوں سے اس کے چہرے کا جائزہ لیا... زرد... اجڑا ہوا چہرہ۔ اس کے دونوں برہنہ بازوؤں پر ٹیکوں کی سوئیوں کے نشان تھے... نہیں نہیں۔ یہ وہ نہیں ہے۔ یہ تو اس لڑکی کی طرح ہے جسے میں نے گولی مار دی

تھی۔ یہ میری شرمین نہیں ہوسکتی۔ اچانک شرمین نے آنکھیں کھولیں۔ چند لمحے میری طرف خالی خالی نظروں سے دیکھتی رہی پھر اس کے ہونٹ ہلے اور ایک مدھم سی آواز میرے کانوں میں پڑی۔ ''ابا...''

اچانک مجھے اپنے پاس کسی کی موجودگی کا احساس ہوا۔ شہباز خان میرے ساتھ کھڑا تھا۔ اس کی پھنکار نما آواز آئی۔ ''پرویز! دیکھو اس کو... ایک نشئی، کتنی بے ہوش، کتنی مدہوش۔ اسے پتا ہی نہیں کہ اس کے اطراف کیا ہورہا ہے۔ کیا یہی ہے تمہاری بیٹی جس کے لیے تم آگ اور خون کے دریا کو پار کرکے آئے ہو؟ اس نشے کی ماری ہوئی فاحشہ کے لیے جو سائیں بابا کے ساتھ جانے کب سے منہ کالا کررہی ہے' اس کے کمرے میں۔ پرویز! آج پھر ایک لڑکی نے تمہاری پشت میں خنجر گھونپا ہے۔ یہ تمہاری بیٹی نہیں، تمہاری دشمن ہے۔ کیا بیٹی ایسی ہوتی ہے پرویز! تمہارے ریوالور میں جو آخری گولی بچی ہے، وہ اس فاحشہ کے لیے ہے۔ ختم کردو اپنی عزت کی دشمن کو۔ کیا تم ایسا نہیں کرسکتے؟''

ریوالور پر میری گرفت مضبوط ہوگئی۔ ''ہاں، میں ایسا کر سکتا ہوں۔'' میں نے شہباز خان کے چہرے کی طرف دیکھا۔ پھر اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ اس کی جلتی ہوئی آنکھیں مجھے ہپناٹائز کررہی تھیں۔ پھر... پھر... ان آنکھوں نے میرے اندر ناقابلِ برداشت غضب بھر دیا۔ اس غضب نے شک و شبہ اور جھجک دور کردی۔ اس کی آنکھیں، بالکل اس نوٹس بورڈ والی تصویر کی آنکھوں کی طرح تھیں۔

عمارت میں ایک اور دھماکا گونجا۔ میرا ریوالور اپنی پانچویں اور آخری گولی فائر کرچکا تھا۔

شہباز خان نے حیرت سے میرے چہرے کو دیکھا اور پھر اپنے پیٹ سے ابلتے ہوئے خون کو... میری چلائی ہوئی گولی اس کے جگر کو پھاڑتی ہوئی اس کی کمر سے باہر نکل چکی تھی۔

میں نے پھنکار کر کہا۔ ''یہ تم نے کیا کرڈالا۔ تم شہباز خان نہیں ہو۔ تم تو خود سائیں بابا ہو پاگل کتے... تم نے اپنے ہی پیروکاروں کا خون کروا ڈالا۔ کیوں؟ کیوں؟ مرتے مرتے سچ بول جا۔''

شہباز خان، یعنی سائیں بابا دیوار کا سہارا لیے کھڑا تھا لیکن اب وہ آہستہ آہستہ زمین پر بیٹھ رہا تھا۔ غالباً اس کی ٹانگوں میں سے جان نکل رہی تھی۔ اس نے منہ کھولا اور کمزور سی آواز میں بولا۔ ''شہباز خان اس وقت میرے مریدوں کے ہتھے چڑھ گیا تھا جب وہ میرے اس مرکز میں گھسنے کی کوشش کررہا تھا۔ میں نے اسے قتل کرکے شناختی کاغذات رکھ لیے۔ اس کی لاش کو نزدیک ہی دفن کردیا۔ پھر یہاں سے باہر جاکر اپنی داڑھی مونچھیں اور سر کے بال منڈوا دیے اور تمہیں اور ان دونوں کو اپنے ساتھ شامل کر لیا۔ تم نے اور ان دونوں میں سے کسی نے کبھی شہباز خان کو نہیں دیکھا تھا۔ اس لیے تم نے میری بات پر یقین کرتے ہوئے مجھے شہباز خان سمجھ لیا۔ میرا یہ مذہب خاتمے کے قریب تھا۔ میری غلطی یہ تھی کہ میں نے معاشرے کے ٹھکرائے ہوئے ناکارہ اور نامراد لوگوں کو مرید بنایا تھا۔ یہ فیصلہ میں نے چند روز پہلے ہی کیا تھا کہ ان کو 'شہید' بنادوں اور ان کو ''شہید'' کرنے والے ملک کے شریف شہری ہوں... تم جیسے... پھر مجھے کون پوچھتا یا الزام دیتا؟ میں دوبارہ کچھ عرصے بعد ظاہر ہوتا اور پھر سے سیٹ اپ بناتا اور اس مرتبہ بہتر قسم کے لوگوں کو مرید بناتا لیکن صرف ایک غلطی مجھ سے ہوئی... صرف ایک...''

اب میرے سامنے سائیں بابا کی لاش دیوار سے ٹیک لگائے نیم دراز حالت میں پڑی تھی۔ اس کی آنکھیں کھلی تھیں لیکن اب ان میں نہ ہپناٹزم کا اثر تھا اور نہ جلا ڈالنے والی چمک۔

میں نے کہا۔ ''ہاں سائیں بابا! تم اپنی بات پوری کرنے سے پہلے جہنم واصل ہوگئے لیکن میں سمجھ گیا۔ تم سے ایک غلطی ہوئی۔ وہ غلطی یہ تھی کہ تم نے مجھ جیسے آدمی کو استعمال کرنے کی کوشش کی جو نہ تو مجیب ضیا کی طرح کمزور تھا اور نہ ملک بشیر کی طرح نفرت سے بھرا ہوا۔''

میں نے شہباز خان کا دیا ہوا ریوالور اچھی طرح صاف کرکے باقی بے شمار ہتھیاروں کے درمیان پھینک دیا۔ پھر اپنی بیٹی کو بستر کی چادر میں لپیٹ کر گود میں اٹھایا اور لاشوں کے درمیان سے گزرتا چلا گیا۔ ان لوگوں کی لاشوں کے درمیان سے جنہوں نے سائیں بابا کو اجازت دی تھی کہ وہ ان کی راہبری کرے۔ خوب راہبری کی اس نے۔

میں اب اپنی نیم بے ہوش بیٹی سے مخاطب تھا۔ ''بیٹی! آج تیرا باپ تجھے واپس مل گیا۔ اس سب میں تیرا کوئی قصور نہیں۔ سب قصور میرا تھا لیکن اب میں اپنی ساری کوتاہیوں کی تلافی کروں گا۔ میں تیرا باپ ہوں۔ میں تیری ماں ہوں۔ سوجا۔ ہمیں گھر جانا ہے۔ کل صبح ایک روشن دن طلوع ہوگا۔''

سینڈی لیزلی تاریک ہال کے فرش پر کھڑا پولیس
کے آنے کا انتظار کررہا تھا۔ برآمدے کے اختتام پر ایک
لاش میز پر پڑی ہوئی تھی اور اس سے خون بہہ رہا تھا۔ مرنے
والا شخص ڈینو بالان ایک طرح سے میرا اور سینڈی کا دوست
تھا۔ سینڈی کو یہ معلوم نہیں تھا کہ قاتل اب بھی مکان کے اندر
موجود ہے یا نہیں۔ اس کے نزدیک یہ جاننے سے زیادہ اہم
اپنے آپ کو چھپانا اور بچانا تھا۔
''میں بہت خوف زدہ ہو گیا تھا ہنی۔'' اس نے گھر

ہتھیار

تنویر واسطی

لالچ و ہوس کے جذبے کب بیدار ہو جائیں، کچھ کہا نہیں جاسکتا... شائستہ اور نفاست پسند اطوار رکھنے والے بھی کبھی کبھی بہک ہی جاتے ہیں... احساسِ جرم ان کو ستاتا بھی نہیں... بلکہ وہ صعوبتیں اٹھاتے ہیں تو اس دولت کو حاصل کرنے کے لیے جس پر ان کا کوئی حق نہیں ہوتا... اختیار کا غیر معمولی استعمال...

باکمال مصور کی تصویروں کی گمشدگی سے شروع ہونے والی سنسنی خیز کہانی

آنے کے بعد بتایا۔

ڈینو جس مکان میں رہتا تھا وہ کسی زمانے میں فارم ہاؤس ہوا کرتا تھا جسے بعد میں مکان میں تبدیل کر دیا گیا۔ اس میں ایک ہی مرکزی کمرا تھا جہاں سے ایک برآمدہ کچن سے گزرتا ہوا کونے میں واقع غسل خانے تک جاتا تھا۔ جب ڈینو کو قتل کیا گیا اس وقت سینڈی غسل خانے میں تھا۔ وہاں اسے گولی چلنے کی آواز نہیں آئی اور وہ یہی سمجھا کہ کوئی کتاب گری ہے یا کرسی کھسکائی گئی ہے۔ جب وہ لیونگ روم میں واپس آیا تو اسے اس واقعہ کا علم ہوا۔

''میں فوراً ہی واپس جانا چاہ رہا تھا لیکن تم جانتے ہو کہ غسل خانے میں مرنا کون پسند کرتا ہے۔''

''کیا تم نے ڈینو کی نبض دیکھی تھی؟''

''نہیں۔'' وہ کرسی کی پشت سے ٹیک لگاتے ہوئے بولا۔ ''مجھے ایسا کرنا چاہیے تھا لیکن اس سے کیا فرق پڑتا۔ میں اس کے لیے کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ سوائے اس کے کہ نو گیارہ پر فون کر دوں۔''

اس نے مشروب کی چسکی لی اور بولا۔ ''اس وقت میں ایک ہی بات سوچ رہا تھا کہ اگر کوئی اور بھی گھر میں موجود ہے اور اسے میری موجودگی کا علم ہو گیا تو وہ مجھے بھی نہیں چھوڑے گا۔ اس لیے میں نے گھر کی اندرونی یا بیرونی بتیاں روشن کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔''

اس نے اندھیرے میں فرش پر لیٹے لیٹے نو گیارہ کو فون کیا اور پولیس کار کے سائرن کی آواز کا انتظار کرنے لگا۔ فون کرنے کے بعد اسے اطمینان ہو گیا کہ گھر میں کوئی اور نہیں ہے۔

''مجھے مزید مشروب چاہیے۔'' اس نے خالی گلاس اپنے گال سے رگڑتے ہوئے کہا۔ ''ڈینو کی میز اور کتابوں پر خون پھیلا ہوا تھا۔ ڈینو اور میں بہت سی تصویریں اور فریم تمہاری کار میں رکھ چکے تھے۔ وہ اب بھی وہیں ہوں گی۔''

''کیا تمام تصویریں رکھ دی گئی تھیں؟'' میں نے پوچھا۔

''دو سیٹ باقی رہ گئے تھے جنہیں ہم کار میں نہ رکھ سکے۔'' وہ مشروب کا گھونٹ لیتے ہوئے بولا۔ ''لیکن جب پولیس آئی تو وہ وہاں نہیں تھے۔''

''کیا تم نے پولیس کو ان کے بارے میں بتایا؟''

سینڈی نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''نہیں۔ میں نہیں جانتا تھا کہ کیا کرنا ہے اور میں تمہیں اس تحقیقات سے دور رکھنا چاہتا تھا۔ اب ہمیں کار میں رکھی تصویروں کے بارے میں کچھ کرنا چاہیے۔''

☆☆☆

آر فرانسس سڈنی کو دیکھ کر یوں لگا جیسے وہ عدالت میں پیش ہونے کے لیے تیار ہو کر آیا ہے۔ میری میسا چوسٹس کے علاقے برک شائرز میں ایک آرٹ گیلری ہے اور جب وہ ڈینو کے قتل ہونے سے دو دن پہلے گیلری میں آیا تھا تو وہ جولائی کی ایک گرم سہ پہر تھی اور میرے خیال میں وہ دن سوٹ پہننے کے لیے مناسب نہ تھا۔ اس نے سیدھا اس کمرے کا رخ کیا جہاں میں نئے تصویریں نمائش کے لیے رکھی ہوئی تھیں۔ ان میں سے بہت سی میڈی بالان کی بنائی ہوئی تھیں۔

اس نے بالان کی تصویروں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''کیا یہ اصل ہیں اور تم نے فاؤنڈیشن سے ان کی تصدیق کروائی ہے؟''

''نہیں۔''

''پھر یہ مستند نہیں ہیں۔ یہ فیصلہ ہم کرتے ہیں کہ ان میں سے کون سی میڈی بالان کی بنائی ہوئی اصلی تصویر ہے اور کون سی نہیں۔ اس لیے تم یہ تمام تصویریں ہمیں بھیج دو۔'' اس نے جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک کارڈ نکالا اور بولا۔ ''میرا نام آر فرانسس سڈنی ہے اور میں میڈی بالان ٹرسٹ کا سربراہ ہوں۔ تم اس وقت تک ان تصویروں کو اصلی کہہ کر فروخت نہیں کر سکتے جب تک کہ متعلقہ کمیٹی اس کی تصدیق نہ کر دے۔''

''مجھے کسی تصدیق کی ضرورت نہیں کیونکہ یہ تصویریں بالان ہی کی بنائی ہوئی ہیں۔''

اس نے میری بات پر توجہ نہیں دی اور بولا۔ ''کیا ان کے علاوہ بھی تمہارے پاس ایسی نام نہاد تصویریں ہیں۔ تم نے یہ کہاں سے حاصل کیں؟''

''مسٹر سڈنی! کیا یہ بتانا ضروری ہے؟'' میں نے احتجاج کرتے ہوئے کہا۔

''کس نے تمہیں بتایا کہ یہ تصویریں اصلی ہیں؟ یہ کس طرح تمہیں بھیجی گئی تھیں اور انہیں بھیجنے والا کون تھا؟'' یہ کہہ کر وہ میری جانب مڑا اور مجھے غور سے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''یقیناً تم مجھے بتانا نہیں چاہ رہے۔''

''ہاں اور کوئی بھی ایسا نہیں کرے گا۔''

''ٹھیک ہے۔'' اس نے رکھائی سے کہا۔ ''پھر ہم خود ہی دیکھ لیں گے کہ یہ میڈی بالان کی بنائی ہوئی اصلی تصویریں ہیں یا نہیں۔''

میں جانتا تھا کہ یہ تصویریں کہاں سے آئی ہیں لیکن یہ فیصلہ کرنا آسان نہیں تھا کہ وہ تصویریں اصلی ہیں یا نہیں۔

میڈی بالان کا انتقال کثرتِ شراب نوشی اور منشیات کے استعمال سے ہوا۔ وہ غلط صحبت میں پڑ گئی تھی اور اس کے اردگرد خوشامدی لوگ اکٹھے ہو گئے تھے جو اسے یہ باور کرانے کی کوشش کرتے رہے کہ وہ دوسری آرٹسٹوں سے کہیں زیادہ فعال اور متحرک ہے لیکن میڈی کو ان کی باتوں پر یقین نہیں تھا اور وہ اس بارے میں ہمیشہ شک میں مبتلا رہی اور اسی شک سے بچنے کے لیے اس نے شراب اور منشیات کا سہارا لیا۔ وہ ان دوستوں پر بھروسا کرتی رہی جو ہمیشہ اسے یہ یقین دلانے کی کوشش کرتے تھے کہ اس کے پاس وہ سب کچھ ہے جو وہ چاہتی تھی۔

اس کا شمار مشہور امریکی مصور وار ہول کے بعد آنے والی نسل کی ان چند آرٹسٹوں میں ہوتا تھا جنہوں نے آرٹ کو ایک نئی سمت دینے کا طریقہ دریافت کیا۔ اس کے پاس ایک نئی طاقت اور نئی سوچ تھی اور اسی کی بدولت وہ اپنے ہم عصروں میں ممتاز نظر آتی تھی۔ اس کے تخلیق کردہ شاہکار معنویت سے پُر تھے اور وہ کسی ابہام کے بغیر اس کا اظہار کرتی تھی۔ اس کے کام میں اس کی موجودگی کا پرتو نظر آتا تھا اور یہی خصوصیت اسے با اختیار بناتی تھی۔ اسی وجہ سے وہ تنہائی پسند ہو گئی اور اس کے اندر یہ خوف بیٹھ گیا کہ وہ کب تک کام کرتی رہے گی۔ کیا آنے والے کل، مہینے یا سال میں وہ ایسا کوئی شاہکار دوبارہ تخلیق کر سکے گی۔

یہی میڈی بالان، ڈینو بالان کی بیٹی تھی۔

اسی روز سہ پہر میں ایک اور شخص میرے پاس آیا اور بولا۔ ''تم نے فرانسس کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا۔ اگر کوئی اس کے اختیار کو تسلیم نہ کرے تو اسے اچھا نہیں لگتا۔''

میں نے اس اجنبی شخص کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھا تو وہ مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولا۔

''میرا نام آئن روسا ہے اور میں میڈی بالان ٹرسٹ سے آر فرانسس کا شریک کار ہوں۔''

میں آئن روسا کو جانتا تھا۔ وہ لندن کی ایک معروف گیلری کا مالک تھا اور اس کے پیرس میں بھی کاروباری تعلقات تھے۔ وہ راتوں کا شہزادہ اور متنازع رائے دینے کا ماہر تھا۔ اس میں کوئی ایسی قابلیت نہ تھی کہ اسے کسی ایسے بورڈ میں بٹھایا جاتا جو میڈی بالان کی تصویروں کی جانچ کرے لیکن آرٹ مارکیٹ میں ظاہری قابلیت نہیں دیکھی جاتی۔ آئن روسا ایک کامیاب تاجر تھا اور اس کی فروخت کی ہوئی تصویریں قیمت اور تعداد کے لحاظ سے سرفہرست ہوتی تھیں اور یہی اس کی واحد قابلیت تھی۔

''وہ کون سی تصویریں ہیں جو تم فروخت کرنا چاہ رہے ہو؟'' اس نے کہا پھر ان پر ایک سرسری نظر ڈالتے ہوئے بولا۔ ''میڈی بالان تیز چلنے کی عادی تھی۔ اس کی بنائی ہوئی تصویروں کا کوئی ریکارڈ نہیں ہے۔ بس کچھ بدخط تحریریں اور رسیدیں ملی ہیں۔ ان سب کو یکجا کر کے کچھ معلوم کرنا بہت مشکل کام ہے لیکن ہمیں یہ ذمے داری سونپی گئی ہے۔''

''تم جانتے ہو کہ میڈی بالان نے ترکہ میں وسیع جائداد اور اثاثے چھوڑے ہیں جن کی دیکھ بھال ایک منتظم کرتا ہے۔ وہ اس قانونی فرم میں پارٹنر بھی ہے جو آر فرانسس کے لیے کام کرتی ہے۔ اسی لیے فرانسس اس ورثے کی حفاظت کرنے کے بارے میں سنجیدہ ہے۔''

''حفاظت سے تمہارا کیا مطلب ہے؟''

''وہ نہیں چاہتا کہ میڈی کے نام اور وقار کو کوئی نقصان پہنچے اور مارکیٹ میں اس کی جعلی تصاویر فروخت ہوں۔''

''اس جائداد سے مستفید ہونے والے کون لوگ ہیں؟''

''میں نہیں جانتا۔ شاید کچھ خیراتی ادارے اور فنڈز کو مدد دی جاتی ہو۔''

''اور ڈینو؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔

''اس کے لیے ایک پیسا بھی نہیں ہے۔ ان دونوں کے درمیان کئی سالوں سے بات چیت بند تھی لیکن اس کی وجہ میں نہیں جانتا اور نہ ہی میرے نزدیک اس کی کوئی اہمیت ہے۔''

''مسٹر روسا۔'' میں نے قدرے تلخ لہجے میں کہا۔ ''ان دونوں کے درمیان صلح ہو گئی تھی اور وہ مرنے سے پہلے اپنے باپ سے ملنے آئی تھی۔''

''مجھے اس خبر کی سچائی پر یقین نہیں آرہا۔'' اس کے انداز میں ہلکی سی ناراضی تھی۔

''تمہارے یقین کرنے یا نہ کرنے سے کچھ نہیں ہوتا لیکن یہی سچ ہے۔ وہ دونوں اکٹھے یہاں آئے تھے اور ان کے ساتھ ایک نوجوان بھی تھا۔ بظاہر وہ اس کا موجودہ بوائے فرینڈ لگ رہا تھا۔''

''یہاں، اس گیلری میں؟'' اس نے حیران ہوتے ہوئے پوچھا۔

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا تو وہ اپنے ہونٹ چباتے ہوئے بولا۔ ''اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میڈی نے اپنی وصیت میں باپ کے لیے کچھ نہیں چھوڑا اور سب کچھ ٹرسٹ کے حوالے کر دیا۔ اسی لیے ہم چاہتے ہیں کہ مارکیٹ میں اس کے نام سے جو تصویریں فروخت کے لیے پیش کی جا رہی ہیں ان کی تصدیق کی جائے۔ ہمارے یہاں آنے کا یہی مقصد ہے، کیا تمہارے پاس اس کے علاوہ بھی بالان کی بنائی ہوئی تصویریں ہیں؟''

میرے پاس اور بھی تصویریں تھیں لیکن میں نے انہیں نمائش کے لیے نہیں رکھا تھا اور ان کا علم صرف مجھے یا تصویریں بھیجنے والے کو تھا اور شاید آئن روسا کو اس کا پتا چل گیا تھا۔

''مجھے چیک کرنا ہوگا۔'' میں نے اسے ٹالنے کے لیے کہا۔

''تم ان تصویروں کو پیک کر کے ہمیں بھیج دو تاکہ ان کے اصلی ہونے کی تصدیق کی جا سکے۔''

میں جانتا تھا کہ تصویروں کے غیر مصدقہ ہونے کی صورت میں وہ ان کے فریم پر سرخ رنگ سے ایکس لکھ دیں گے جس کے بعد یہ تصویریں فروخت نہیں ہو سکیں گی۔

''میں ایسا نہیں کر سکتا۔''

''کیوں؟'' آئن روسا کے لہجے کی نرمی غائب ہو گئی اور وہ اپنی عمر سے دس سال بڑا نظر آنے لگا۔

''یہ تصویریں میری ملکیت نہیں بلکہ فروخت کے لیے یہاں رکھی گئی ہیں۔ اس لیے میرے پاس انہیں ٹرسٹ کو بھیجنے کا اختیار نہیں۔''

''ایسی صورت میں تم ان تصویروں کو میڈی بالان کے نام سے فروخت نہیں کر سکتے۔ یہ اختیار تمہیں اسی وقت مل سکتا ہے جب ٹرسٹ کی جانب سے ان کے اصلی ہونے کی تصدیق ہو جائے۔''

''شاید۔''

''نہیں مسٹر برڈ مین، شاید نہیں۔ ان تصویروں کو میڈی بالان کے نام سے بیچنا فراڈ ہوگا۔''

''میں تمہاری پوزیشن سمجھ رہا ہوں۔''

''یہ صرف میری پوزیشن کا معاملہ نہیں۔ اپنی زندگی میں ہی میڈی بالان نے بتایا تھا کہ اس کا حقیقی کام کون سا ہے۔ اس کی موت کے بعد یہ اختیار ٹرسٹ کے پاس چلا گیا لہٰذا ان کی تصدیق کے بغیر تم ان تصویروں کو نہیں بیچ سکتے۔''

ہماری گفتگو اس وقت ختم ہوئی جب دو جوڑے گیلری میں داخل ہوئے۔ آئن روسا مجھے گھورتا ہوا چلا گیا۔ لیکن اس کے انداز سے لگ رہا تھا کہ وہ دوبارہ مجھے قائل کرنے کی کوشش کرے گا۔

میں نے ایسی کئی تصویریں ابھی تک گیلری میں نہیں رکھی تھیں جو مجھے ڈینو سے ملی تھیں۔ یہ ایک طرح سے اچھا ہی ہوا ورنہ روسا ان کے لیے بھی اصرار کرتا۔ اس کا کہنا درست ثابت ہوا کہ ٹرسٹ کے دوسرے ممبر بھی گیلری کا دورہ کر سکتے ہیں۔ ان میں ورگل کنگ بھی تھا۔ آرٹ کے معاملے میں اس کی معلومات بڑی محدود تھیں لیکن وہ اپنے آپ کو عقلِ کل سمجھتا تھا۔

وہ دوسرے روز ہی آ گیا اور مجھ سے ملے بغیر سیدھا اس کونے میں گیا جہاں میڈی بالان کی تصویریں رکھی تھیں۔ اس نے ایک بینچ گھسیٹی اور اس پر بیٹھ کر ان تصویروں کو غور سے دیکھنے لگا۔ شاید وہ باتیں کرنے کے موڈ میں نہیں تھا۔ لہٰذا میں بھی دوسرے کام میں مصروف ہو گیا۔ چند منٹ بعد میں نے اس کی جانب دیکھا تو وہ ایک کتاب پر نظریں جمائے ہوئے تھا۔ کبھی وہ اس کتاب کو دیکھتا اور کبھی بالان کی بنائی ہوئی تصویروں کو دیکھ رہا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ وہ کتاب کس نوعیت کی تھی۔ یہ ایک ایسی تحریر تھی جس میں میڈی بالان کی تصویروں کی تصدیق کے لیے اشارے درج تھے اور وہ اس کو پڑھ کر ان تصویروں کی اصلیت جانچنے کی کوشش کر رہا تھا۔

ورگل نے میری طرف دیکھا اور بولا۔ ''بظاہر تو ان تصویروں میں میڈی بالان کی ٹیکنیک نظر آتی ہے۔ اب یہ ہمارے اوپر منحصر ہے کہ اس کے ورثے کا تحفظ کریں اور ایسے چند ہی لوگ ہیں جو اس بارے میں ٹھوس رائے دے سکیں۔ میڈی بالان جیسا کوئی نہیں اور نہ ہی کوئی وہ کام کر سکتا ہے جو اس نے کیا۔ اب یہ ذمے داری مجھے سونپی گئی ہے کہ اس کے ورثے کا تحفظ کروں۔ میں جعلی تصویروں کی فروخت سے اس کی ساکھ کو خراب نہیں ہونے دوں گا۔ ہمیں ہر قیمت پر اس کا تحفظ کرنا ہے۔''

ورگل کے دماغ میں یہ بات بیٹھ گئی تھی کہ میڈی بالان کے ساتھ ساتھ اس کی اپنی ساکھ کا تحفظ بھی ناگزیر تھا اور اسے یہ ڈر تھا کہ اگر اس سے ان تصویروں کی تصدیق میں کوئی چوک ہو گئی تو آرٹ مارکیٹ میں اس کی ساکھ متاثر ہو گی اور وہ یہ خطرہ مول لینے کے لیے تیار نہیں تھا۔

''تمہیں یہ تصویریں لازماً ہمیں بھیجنا ہوں گی۔''

اس سے پہلے کہ میں کوئی جواب دیتا میں نے کسی کے بے ترتیب قدموں کی آہٹ سنی۔ وہ میری ارسل تھی جو چھڑی کے سہارے قدم بڑھاتی ہماری طرف آرہی تھی۔ اس نے ورگل کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''ورگل کنگ تمہارے ہاتھ میں کیا ہے۔ تم اس کی مدد سے کوئی فیصلہ نہیں کر سکتے اور اگر ایسا ہوا تو وہ غلط فیصلہ ہوگا۔''

پھر اس نے میری طرف دیکھا اور بولی۔ ''تم ہی اس ساری پریشانی کا باعث ہو۔ میں تم سے ایک منٹ میں بات کرتی ہوں۔''

وہ پیر پٹختی ہوئی ایک تصویر کی جانب بڑھی اور جھک کر اسے سونگھنے لگی پھر اس نے دو تین دوسری تصویروں پر بھی یہی عمل دہرایا اور سیدھے کھڑے ہو کر ان کا جائزہ لینے لگی پھر کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولی۔ ''ممکن ہے۔''

''میں نے بھی یہی بات سوچی تھی۔'' ورگل نے کہا۔

''میری تسلی نہیں ہوئی۔'' وہ تصویروں کو غور سے دیکھتے ہوئے بولی۔ ''کوئی بھی شخص صحیح رنگوں اور آئل کا استعمال کر کے ایسی تصویریں بنا سکتا ہے۔ تم، مسٹر برگ مین یا کوئی اور...'' پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولی۔

''ہم پہلے بھی مل چکے ہیں۔ میرا نام میری ارسل ہے۔''

ہم پہلے بھی کئی بار مل چکے تھے۔ وہ نیویارک سٹی میں ایک بہت ہی کامیاب آرٹ گیلری کی مالک تھی جبکہ اس کی دوسری گیلری لاس اینجلس میں واقع تھی جس کے بارے میں سنا جاتا تھا کہ وہ زیادہ کامیاب نہیں ہے۔ پہلے وہ مارا ارسولا تھی لیکن کالج کی تعلیم مکمل ہونے کے بعد اس کی ملاقات ایک نوجوان وکیل سائمن ڈیلورم سے ہوئی اور اس سے شادی کرنے کے بعد اس نے اپنا نام میری ارسل رکھ لیا۔ میری نے سائمن کی قانونی فرم سے میڈی بالان کے ترکہ کے بارے میں ایک وصیت نامہ تیار کروایا۔ اس فرم میں فرانسس سڈنی بھی پارٹنر تھا۔ اس وصیت نامہ کی رُو سے میڈی بالان کی وفات کے بعد اس کی تمام جائداد اور اثاثے ایک ٹرسٹ کے زیرِ انتظام ہوں گے۔ اس کے ارا کین میں فرانسس سڈنی اور میری ارسل بھی شامل تھے۔ وہ تمام تصویریں بھی اس ٹرسٹ کی ملکیت میں چلی گئیں جو اس کی وفات تک فروخت نہیں ہوئی تھیں۔ وہ سب باعزت لوگ تھے۔ اس لیے کسی نے یہ جاننے کی ضرورت محسوس نہیں کی کہ کیا میڈی بالان نے ایسے کسی وصیت نامہ پر دستخط کیے تھے یا نہیں۔

البتہ ڈینو بالان مطمئن نہیں تھا۔ اسے جب وصیت نامہ کے بارے میں علم ہوا تو اس نے متعلقہ قانونی فرم کو کوئی خط لکھے۔ اسے جواب میں بتایا گیا کہ اس وصیت نامہ پر میڈی بالان کے دستخط موجود ہیں اور یہ کہ اب اس سلسلے میں مزید کسی خط و کتابت کی ضرورت نہیں۔

''تمہارے خیال میں یہ تصویریں میڈی کی ہو سکتی ہیں یا اس کی بنائی ہوئی اصل تصویروں جیسی لگتی ہیں۔'' میری ارسل نے پوچھا۔

''نہیں نہیں۔'' ورگل جلدی سے بولا۔ ''میں نے صرف امکان ظاہر کیا تھا کہ یہ تصویریں میڈی کی ہو سکتی ہیں۔''

''تمہیں اس کا یقین کیسے آئے گا؟''

''انہیں سائنسی طور پر بھی جانچا جا سکتا ہے لیکن عہدِ حاضر میں بنائی گئی تصویروں کے لیے اس کی ضرورت نہیں۔ کوئی تجربہ کار آنکھ ہی اس کی تصدیق کر سکتی ہے۔''

''مجھے یہی خطرہ ہے۔'' میری قہقہہ لگاتے ہوئے بولی۔ ''میں نے میڈی بالان کی تصویریں حاصل کرنے کے لیے کافی رقم خرچ کی ہے اور میں نہیں چاہتی کہ ان کی قدر و قیمت کا انحصار ان نقادوں اور فنونِ لطیفہ کے ماہرین پر ہو جو ہوا کا رخ دیکھ کر اپنا ذہن تبدیل کر لیتے ہیں۔ کیا تم بھی ایسا کر سکتے ہو۔ میرا خیال ہے کہ نہیں۔''

ورگل نے میری کی طرف دیکھے بغیر کہا۔ ''مجھے اپنا ذہن تبدیل کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔''

میری ارسل گلا صاف کرتے ہوئے بولی۔ آئن روسما کے بارے میں کیا خیال ہے۔ اگر ٹرسٹ کے اثاثوں کی قیمت گر گئی تو وہ جیل جانے سے نہیں بچ سکے گا۔ اسے فرانس میں وکیلوں کو فیس دینے کے لیے پیسوں کی ضرورت ہوگی۔''

ورگل اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا اور ٹالنے والے انداز میں بولا۔ ''ہم اس موضوع پر میٹنگ میں بھی گفتگو کر سکتے ہیں۔'' یہ کہہ کر وہ تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا گیلری سے باہر چلا گیا۔

میری ارسل نے گہری سانس لی اور بولی۔ ''یہ شخص ہوشیار اور مدد کرنے والا ہے لیکن...'' اس نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا اور بات بدلتے ہوئے بولی۔ ''بہتر ہوگا کہ اسے خیمے کے اندر آنے دیا جائے۔''

''آئن روسما کو جیل جانے کا خطرہ کیوں ہے؟'' میں

نے پوچھا۔

''وہ ایک اسکینڈل میں پھنسا ہوا ہے۔'' اس نے پیرس کے ایک مشہور نیلام گھر کا نام لیتے ہوئے کہا۔ ''شاید تمہیں معلوم نہ ہو کہ فرانسیسی اخباروں میں اس کی پوری تفصیل شائع ہو چکی ہے۔ اس پر تصویروں کے سلسلے میں جعل سازی کرنے کا الزام ہے لیکن تم یہ سب فساد کیوں پھیلا رہے ہو۔ میڈی بالان کی تصویریں پیک کر کے ہمیں بھیج دو۔ ہم تمہیں ان کی رسید دے دیں گے۔''

''لیکن میں ایسا نہیں کروں گا؟'' میں نے پُرسکون انداز میں کہا۔

''کیوں؟'' وہ حیران ہوتے ہوئے بولی۔

''میں ایسا کیوں کروں؟''

''تاکہ تمہیں معلوم ہو جائے کہ ان تصویروں میں کوئی جعل سازی نہیں کی گئی ہے۔''

میں نے جواب میں قہقہہ لگایا اور اس نے بھی میرا ساتھ دیا۔ پھر مسکراتے ہوئے بولی۔ ''مسٹر برگ مین! میں حقوقِ نسواں کی علم بردار تو نہیں لیکن ایک عورت کے تخلیق کردہ فن میں اس کی موجودگی کو محسوس کر سکتی ہوں۔ تمہیں یہ تصویریں لازماً ہمیں بھیجنا ہوں گی۔ اس کے علاوہ کوئی اور راستہ نہیں ہے۔''

اس کے تحکمانہ انداز پر مجھے بھی غصہ آ گیا، میں نے کہا۔ ''میں کئی بار تمہارے ساتھیوں سے بھی کہہ چکا ہوں کہ مجھے اس کا اختیار نہیں ہے اور اگر یہ تصویریں میری ملکیت ہوتیں تب بھی ایسا نہ کرتا۔''

''تم ایک گستاخ نوجوان کے مانند ضد کر کے ہیرو بننے کی کوشش کر رہے ہو۔ شاید تمہیں معلوم نہیں کہ تمہاری وجہ سے بہت سے لوگوں کا بہت کچھ داؤ پر لگا ہوا ہے۔'' یہ کہہ کر وہ کھڑی ہوئی اور اپنی چھڑی فرش پر مارتے ہوئے بولی۔ ''تمہیں بہت تکلیف ہوگی۔'' یہ کہہ کر اس نے دوبارہ چھڑی فرش پر ماری۔ اس مرتبہ وہ میرے جوتے کی نوک پر لگی اور میں چلّا اٹھا۔

''یہ تم کیا کر رہی ہو؟'' اس نے کوئی جواب نہیں دیا اور مجھے گھورتے ہوئے گیلری سے باہر چلی گئی۔

گھر پہنچا تو انگوٹھے میں شدید تکلیف ہو رہی تھی۔ سینڈی نے ڈاکٹر کے پاس چلنے کے لیے کہا لیکن میں نے منع کر دیا اور کہا کہ اگر زخم ٹھیک نہ ہوا تو ڈاکٹر کے پاس چلا جاؤں گا ورنہ اس کی ضرورت نہیں۔ سینڈی نے مجھے اس طرح دیکھا جیسے اسے میری دماغی حالت پر شبہ ہو رہا ہو۔

''تم مجھے جن کا ایک گلاس اور کوئی ٹانک دے دو۔ تاکہ کچھ سکون آ جائے۔'' میں نے کہا۔

سینڈی کو کھانا پکانے سے دلچسپی نہیں تھی اور میں کچن میں کھڑے ہو کر کام نہیں کر سکتا تھا۔ لہٰذا ہم لوگ کھانا کھانے کے لیے ایک قریبی ریستوران میں چلے گئے۔ وہاں بیٹھتے ہی سینڈی نے پوچھا۔ ''یہ سب لوگ تمہاری تصویروں میں کیوں دلچسپی لے رہے ہیں؟''

''تصدیق کے لیے اور یہ صرف مجھ تک ہی محدود نہیں۔ ایسا ہو بھی نہیں سکتا لیکن میری گیلری یہاں پر ہے اس لیے وہ مجھ سے ہی پہل کرنا چاہتے ہیں۔ مجھے تو یہ بھی کوئی سازش لگ رہی ہے۔ فرانسس نے انہی پہاڑیوں میں ڈیرا جما رکھا ہے اور ڈینو بھی یہیں رہتا ہے لیکن وہ ابھی تک ٹرسٹ کی نظروں میں نہیں آیا۔ ممکن ہے کہ وہ اس بارے میں کچھ جانتا ہو۔''

سینڈی کچھ ہچکچاتے ہوئے بولا۔ ''تم اس سے پوچھ سکتے ہو، وہ کل شام ہمارے ساتھ ڈنر کرے گا، اسے اپنی کار سروس کے لیے دینی ہے۔ اس لیے میں ہی اسے گھر چھوڑنے جاؤں گا۔''

ہم ایک ایسی میز کے گرد بیٹھے ہوئے تھے جہاں سے کھڑکی کے ذریعے باہر کا منظر بالکل صاف دکھائی دے رہا تھا۔ لان میں درختوں کی قطاریں اِستادہ تھیں جنہوں نے گلاب کے باغ کو ڈھانپ رکھا تھا۔ ڈھلتے ہوئے سورج کی روپہلی کرنیں درختوں اور گھاس پر روشنی بکھیر رہی تھیں۔ لیکن ہم زیادہ دیر تک اس نظارے سے لطف اندوز نہ ہو سکے۔ اچانک ہی ایک شخص ہمارے اور کھڑکی کے درمیان والی میز پر آ کر بیٹھ گیا۔ اس کے ہاتھ میں بیئر کا گلاس تھا اور اس نے اپنے چہرے کا رخ ہماری جانب کر رکھا تھا۔ اس نے خوش اخلاقی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ''ہیلو۔''

اس کی عمر چالیس کے لگ بھگ تھی اور چہرہ کچھ جانا پہچانا سا لگ رہا تھا۔ اس نے بیئر کا گھونٹ لیا اور بولا۔ ''تم تصویروں کے ڈیلر ہو۔ تمہاری آرٹ گیلری بھی ہے۔ میں تمہیں دیکھ کر سوچ رہا تھا کہ یہ تم ہی ہو۔ ہم پہلے بھی مل چکے ہیں۔ جب میں میڈی اور ڈینو کے ساتھ یہاں آیا تھا۔''

میں نے اسے پہچان لیا۔ وہ میڈی کا بوائے فرینڈ تھا۔ میں نے اپنا اور سینڈی کا تعارف کروایا تو وہ تھوڑا سا کھڑا ہوا، اور اس نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ ''بوش۔ شاید تم میرا نام نہیں جانتے ہو۔ مجھے ایڈگر ایلین بوش کہتے ہیں اور یہ لوگ جو میڈی بالان کو اپنانے کا دعویٰ

کرز رہے ہیں، وہ مجھ سے بات کرنا نہیں چاہتے لیکن وہ یہ نہیں بتا سکتے کہ کون سی تصویر میڈی بالان کی ہے اور کون سی نہیں کیونکہ وہ اس بارے میں کچھ نہیں جانتے اور جان بھی نہیں سکتے۔''

اس نے لمحہ بھر توقف کیا اور براہِ راست میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا۔ ''وہ اس لیے نہیں جان سکتے کیونکہ میں میڈی بالان ہوں۔''

''تم میڈی بالان ہو۔ یہ کیا کہہ رہے ہو؟''

''میں نے ہی وہ تصویریں بنائی ہیں۔''

''تم ان تصویروں میں رنگ بھرتے تھے؟''

''ہاں۔ اس کے علاوہ میں نے اسکیچز بھی بنائے ہیں۔''

''گویا تم اس کی مدد کیا کرتے تھے؟''

''نہیں دوست نہیں۔ یہ تصویریں میں نے ہی بنائی ہیں۔ تم جانتے ہو وہ یہاں بہت کم رہا کرتی تھی اور زیادہ تر دوسرے کاموں میں مصروف ہوتی تھی۔''

''کیا وہ تمہارے کام کی نگرانی کرتی تھی؟'' میں نے بے چین ہوتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں، کیوں نہیں۔'' وہ چاروں طرف نظریں دوڑاتے ہوئے بولا۔

ایڈگر ایلن بوش کے انکشاف نے مجھے پریشانی میں مبتلا کر دیا تھا اگر واقعی اس نے میڈی کی کچھ تصویریں مکمل کی تھیں تو میرے لیے یہ جاننا ضروری ہو گیا تھا کہ میرے پاس گیلری میں جو میڈی بالان کی تصویریں رکھی ہوئی ہیں، ان میں کوئی ایسی تصویر تو موجود نہیں۔ ایسی صورت میں ٹرسٹ والوں کا دعویٰ وزنی معلوم ہو رہا تھا کہ وہی تصدیق کر کے بتا سکتے ہیں کہ ان میں سے کون سی تصویر اصلی ہے یا نقلی۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ ایڈگر ایلن بوش یہ سب کچھ مجھے کیوں بتا رہا تھا اور اس کا جواب بہت آسان تھا۔

''وہ میرے مقروض ہیں۔ وہ تمام اثاثوں پر اپنا حق نہیں جتا سکتے۔ انہیں میرا حصہ دینا ہوگا۔''

''مجھ سے کیا چاہتے ہو؟''

''جو کچھ تمہیں معلوم ہوا ہے، وہ انہیں بتا دو لیکن نہیں... وہ اس کی پروا نہیں کریں گے۔ البتہ تم یہ بات دوسرے ڈیلرز کو بتا سکتے ہو۔ وہ میری بات پر توجہ نہیں دیں گے لیکن تم خود ایک ڈیلر ہو۔ اس لیے ممکن ہے کہ وہ تمہاری بات سن لیں۔''

وہ جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا لیکن اچانک اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا اور بولا۔ ''تمہارا خیال ہے کہ میں پاگل ہوں۔ ایسا نہیں ہے۔ میں اپنے ہوش و حواس میں رہ کر یہ سب کچھ کہہ رہا ہوں۔''

اگر وہ یہ سمجھ رہا تھا کہ میں اس کے مقصد کے لیے آگے بڑھوں گا تو یقیناً وہ پاگل ہی تھا لیکن اس کا یہ دعویٰ کہ اس نے میڈی بالان کی تصویروں پر کام کیا ہے، پاگل پن کے زمرے میں نہیں آتا تھا کیونکہ بہت سے مشہور مصور بھی اپنے کام کو مکمل کرنے کے لیے معاونین کی خدمات حاصل کرتے ہیں۔

ہم گھر واپس آ رہے تھے کہ گیلری کے سامنے پارکنگ لاٹ میں ایک کار کھڑی ہوئی نظر آئی۔ اس کی بتیاں بجھی ہوئی تھیں۔ جب ہم اس کے نزدیک پہنچے تو کار کا دروازہ کھلا اور اس میں سے ورکل کنگ برآمد ہوا۔ اس نے اپنی انگلی سے چشمہ سیدھا کیا اور بولا۔ ''مسٹر برگ مین! میں تم سے کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں اگر یہ ممکن ہو۔''

سینڈی اس کا اشارہ سمجھ گیا اور بولا۔ ''مجھے کچھ کام کرنا ہیں۔'' یہ کہہ کر وہ گھر کے اندر چلا گیا۔

''کوئی ایسی جگہ ہے جہاں بیٹھ کر ہم بات کر سکیں۔'' ورکل بولا۔

میں اس وقت گیلری کھولنے کے بکھیڑے میں نہیں پڑنا چاہ رہا تھا۔ لہٰذا اسے گھر کے اندر لے گیا۔ میں نے اسے مرکزی کمرے میں بٹھایا جو بیک وقت لیونگ روم، ڈائننگ روم، لائبریری اور ٹیلی وژن روم کا کام دیتا تھا۔ دراصل ہمارے گھر کے آدھے حصے میں گیلری واقع تھی اور عقب میں ہمارا رہائشی حصہ تھا۔

''کچھ پیو گے؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں، اگر تھوڑی سی وائن مل جائے۔''

میں لنگڑاتا ہوا کچن کی طرف گیا اور وائن کے دو گلاس لے آیا۔ اس نے پوچھا۔ ''تمہارے پاؤں کو کیا ہوا؟''

''ایک بڑی گیلری کی مالکن نے اپنی چھڑی سے میرے پاؤں پر ضرب لگائی تھی۔'' میں نے کہا۔ ''تم یہاں کیوں آئے ہو؟''

''وہ سب تم سے بہت ناراض ہیں۔''

''کیا ان میں میری ارسل بھی شامل ہے۔ میں جانتا ہوں کہ وہ تھوڑی سی تنک مزاج ہے اور یہ بھی جانتا ہوں کہ ٹرسٹ کے دوسرے دو ممبر بھی مجھ سے ناراض ہیں۔ گو کہ آئن روساں نے مجھے کوئی دھمکی نہیں دی لیکن اس وقت گیلری میں گاہک نہ آ جاتے تو شاید وہ اس سے بھی دریغ نہ کرتا۔ کیا

تم بھی مجھ سے ناراض ہو مسٹر ورگل؟''

''نہیں لیکن یہ ضرور کہوں گا تم وہ تصویریں ہمیں بھیج دو، یہ بہت اہم ہے۔''

''میں اگر ایسا نہ کروں تو کیا ہوگا؟''

''وہ تمہیں نقصان پہنچانے کی کوشش کریں گے۔'' ورگل نے کہا۔

''کیا تم صرف یہی کہنے کے لیے آئے ہو کہ ٹرسٹ جس میں تم بھی شامل ہو، مجھے نقصان پہنچانے کی کوشش کرے گا۔''

''میں یہی سمجھتا ہوں لیکن وہ تمہیں جسمانی طور پر نقصان نہیں پہنچائیں گے۔''

''یہ بڑی عجیب بات ہے کہ ایک باعزت نقاد رات کے اندھیرے میں میرے گھر کے باہر انتظار کررہا ہے اور جب میں اسے اندر بلاتا ہوں تو وہ مجھے دھمکیاں دینے لگتا ہے۔ گویا تم جسمانی نہیں لیکن معاشی طور پر مجھے تباہ کردو گے۔ میرے کیریئر کا خاتمہ ہوجائے گا۔ مجھ پر مقدمہ کردو گے وغیرہ وغیرہ۔ کیا یہ سب غیر معمولی باتیں نہیں ہیں۔''

''یہ بہت اہم ہے۔''

''تمہیں جو کچھ کہنا تھا وہ کہہ چکے۔ اب کیا مجھ پر ریوالور تان لوگے؟''

''نہیں نہیں، بالکل نہیں۔''

''کیا تم سمجھتے ہو کہ ان دھمکیوں سے مرعوب ہوجاؤں گا۔''

''میں نے کوئی دھمکی نہیں دی۔ صرف تمہارے لیے پیغام لے کر آیا ہوں۔'' وہ تھوڑا سا ہچکچاتے ہوئے بولا۔ ''تمہیں یہ سمجھ لینا چاہیے کہ تم اس کاروبار سے وابستہ ہو۔ تم یہ تصویریں ہمیں بھیج دو، ہم تمہیں ان کا وہ معاوضہ دیں گے جو ان کی فروخت سے متوقع ہے۔ اس میں تمہارے لیے کوئی دردِسر نہیں اور نہ ہمیں کوئی مشکل ہوگی۔''

''تم سمجھ رہے ہو کہ یہ تصویریں میری ملکیت ہیں۔''

''اگر یہ تصویریں تمہاری نہیں ہیں تب بھی ان کے اصل مالک کو تصدیق کروانا ہوگی۔ اس میں اس کا کوئی نقصان نہیں ہے۔ تم اسے بتاسکتے ہو کہ ایسا کرنا ہوگا۔ اس طرح تم اس کا نقصان کم کرسکتے ہو۔ میرا مطلب ہے کہ اگر یہ تصویریں اصلی نہیں ہیں۔''

''تم مجھے رشوت کی پیشکش کررہے ہو؟'' میں نے غصے سے کہا۔

''نہیں نہیں۔'' وہ بوکھلاتے ہوئے بولا۔ ''یہ رشوت نہیں ہے اور میری تجویز کو غیر قانونی نہیں کہا جاسکتا۔''

''کیا ان لوگوں نے تمہیں مجھے خریدنے کے لیے یہاں بھیجا ہے؟''

''نہیں، تم غلط سمجھ رہے ہو۔ میرا یہ مطلب نہیں تھا۔ ان لوگوں کو اس بارے میں کچھ علم نہیں۔ یہ میرا اپنا آئیڈیا تھا۔''

میں یہ سوچ کر حیران ہورہا تھا کہ اگر میں اس کی بات مان لوں تو کیا وہ اپنی جیب سے مجھے ادائیگی کرے گا۔ وہ ساکھ اور کیریئر کی خاطر یہ رقم مجھے دینے پر آمادہ ہوگیا تھا۔ ایک طرح سے دیکھا جائے تو وہ اپنی ہی بے عزتی کررہا تھا۔ مجھے اس پر افسوس ہونے لگا لیکن اپنے آپ کو اس کی پریشانی اور بے وقوفی میں شامل نہ کرنے پر مجھے کوئی افسوس نہ تھا۔

''مجھے افسوس ہے، میں ایسا نہیں کرسکتا۔'' میں نے بے رخی سے کہا۔

''کوئی بات نہیں۔'' وہ اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولا۔ ''کیا میں امید کروں کہ یہ گفتگو ہم دونوں تک محدود رہے گی۔''

''اگر تمہارا اشارہ ٹرسٹ کے ممبران کی جانب ہے تو میں انہیں کچھ نہیں بتاؤں گا۔''

☆☆☆

میں ڈینو بالان کو سینڈی کی معرفت جانتا تھا۔ ان کی ملاقات اس وقت ہوئی جب سینڈی کرافٹس کالج میں پڑھ رہا تھا اور ڈینو وہاں کلچرل ہسٹری پڑھایا کرتا تھا۔ اس نے اپنی کار سروس کے لیے دے دی تھی اور سینڈی اسے اپنے ساتھ لے آیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ رات کا کھانا کھانے کے بعد وہ ڈینو کو اس کے گھر چھوڑ آئے گا۔ کھانے کے دوران ڈینو نے کہا۔ ''ہاں، میں میڈی بالان ٹرسٹ کے بارے میں جانتا ہوں اور اس مسٹر کنگ کو بھی، البتہ دوسرے لوگوں سے میری واقفیت نہیں۔ اس لیے میں اس ٹرسٹ پر بھروسا نہیں کرسکتا۔ انہیں ڈینو بالان سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ میڈی کے ساتھ میری زبردست لڑائی تھی اور وہ مجھ سے نہیں ملتی تھی لہٰذا مجھے میڈی کی بنائی ہوئی تصویروں اور اس کے فن کے بارے میں کچھ علم نہیں پھر مجھے کیوں ٹرسٹ کا ممبر بنایا جائے۔''

''شاید انہیں یہ معلوم نہیں کہ تم دونوں کے درمیان صلح ہوگئی تھی۔''

''انہیں یہ بھی معلوم نہیں ہوگا کہ وہ بہت بڑی تعداد

میں اپنی تصویریں میرے پاس چھوڑ گئی تھی۔ وہ اپنے نام نہاد دوست کے ساتھ آئی تھی۔ انہوں نے ایک وین کرائے پر لی اور اس میں تمام تصویریں، رنگ، سیاہی اور اسکرین وغیرہ رکھ کر میرے پاس لے آئی۔ اس کا دوست ایڈگر ایلن بوش بھی نہیں جانتا تھا کہ وہ ایسا کیوں کر رہی ہے لیکن مجھے معلوم تھا۔ اس نے یہ سب چیزیں میرے پاس اس لیے رکھوائی تھیں کہ ایڈگر ایلن بوش ان تصویروں پر کام نہ کر سکے اور انہیں میڈی بالان کے نام سے فروخت نہ کرے۔"

"کیا تمہیں معلوم ہے کہ ان دنوں وہ یہاں آیا ہوا ہے؟"

"ہاں، وہ میرے پاس بھی آیا تھا اور اس نے دعویٰ کیا کہ وہ میڈی بالان کے ساتھ مل کر ان تصویروں پر کام کرتا رہا ہے۔ وہ چاہتا تھا کہ میں ٹرسٹ کو یہ بات بتا دوں لیکن میں نے انکار کر دیا۔ اس پر وہ ناراض ہو گیا اور دھمکی دی کہ مجھے پچھتانا پڑے گا۔"

"وہ اسی لیے یہاں آیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں۔ میں نہیں جانتا کہ اسے ٹرسٹ کی میٹنگ کے بارے میں کیسے معلوم ہوا تاہم اس نے انہیں سچ بتانے کا پلان بنایا ہے تاکہ وہ ان سے اپنا حصہ مانگ سکے۔ ممکن ہے کہ وہ پہلے ہی بتا چکا ہو۔"

"شاید اسی لیے وہ لوگ ہمارا دروازہ کھٹکھٹا رہے ہیں۔" سینڈی نے کہا۔

"کیا وہ تمہارے پاس بھی آئے تھے؟" پھر میں نے انہیں ٹرسٹ کے اراکین کے بارے میں بتایا جو میرے پاس آ چکے تھے۔

"روسا میرے پاس آیا تھا۔ اس سے پہلے وہ ایڈگر ایلن بوش سے بھی بات کر چکا تھا۔ وہ ان تصویروں کو دیکھنا چاہ رہا تھا جو میڈی نے مجھے دی تھیں۔ میں نے اُسے وہ تصویریں دکھا دیں۔"

"کیا تم بتا سکتے ہو کہ ان میں سے بوش کی بنائی ہوئی تصویریں کون سی ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"یہ تم ٹرسٹ سے پوچھو..... وہ بتائیں گے۔ میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتا۔"

"انہوں نے تم سے کچھ نہیں کہا؟"

"نہیں، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ تصویروں کی تصدیق کرنا کوئی آرٹ یا سائنس نہیں محض کاروبار ہے۔ کون جانے کب ان کا ذہن تبدیل ہو جائے اور وہ اصلی کو نقلی اور نقلی کو اصلی ثابت کر دیں۔ آپ ان پر کوئی دعویٰ نہیں کر سکتے وہ پہلے ہی ایک معاہدے پر دستخط کروا لیتے ہیں جس کے مطابق ہمیں اُن کا ہر فیصلہ قابلِ قبول ہوگا۔"

"تم نے جو تصویریں مجھے بھیجی تھیں، کیا ان پر بھی ایڈگر ایلن بوش نے کام کیا تھا؟"

"نہیں۔" وہ میری طرف جھکتے ہوئے نیچی آواز میں بولا۔ "میں نے ان پر کام کیا تھا۔"

"کیا مطلب؟" میں حیران ہوتے ہوئے بولا۔

"میں نے صرف انہیں مکمل کیا تھا۔ وہ ان تصویروں پر کام شروع کر چکی تھی۔ پھر اس نے سب چیزیں میرے حوالے کر دیں تو میں نے ان تصویروں کو مکمل کر دیا۔"

"ڈینو..... !" سینڈی نے غصے سے کہا۔ "تم نے وہ تصویریں ٹونی کو فروخت کرنے کے لیے دے دیں اور ظاہر کیا کہ یہ میڈی کی بنائی ہوئی اصلی تصویریں ہیں۔ یہ تم نے ٹھیک نہیں کیا۔"

"جب سینڈی تمہیں گھر چھوڑنے جائے تو یہ تصویریں بھی اپنے ساتھ لے جانا۔" میں نے ڈینو سے کہا۔ "میں انہیں اپنے پاس نہیں رکھنا چاہتا۔"

"ٹھیک ہے۔" ڈینو نے کہا۔ "تم چاہو تو انہیں تصدیق کے لیے بھی بھیج سکتے ہو۔"

"نہیں۔" میں نے خفگی سے کہا۔ "میں انہیں انکار کر چکا ہوں۔"

"کیا تم نے ان کے علاوہ بھی کچھ اور تصویریں بنائی ہیں؟" سینڈی نے پوچھا۔

"صرف مکمل کی ہیں اور اس میں کوئی برائی نہیں ہے۔"

"اندازاً ایسی کتنی تصویریں ہوں گی؟" سینڈی نے پوچھا۔

"زیادہ نہیں ہیں۔ مجھے اور بھی کام کرنا ہوتے ہیں۔ میرے پاس اتنا وقت نہیں کہ رنگوں اور برش سے کھیلتا رہوں۔"

میں اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا اور گیلری کی طرف جانے لگا۔ سینڈی میرے پیچھے پیچھے آیا اور آہستہ سے بولا۔ "ہمیں میڈی بالان کی بنائی ہوئی تصویریں ڈینو کے پاس نہیں چھوڑنی چاہئیں۔"

"وہ تصویریں اسی نے ڈینو کو دی تھیں۔ اُن سے ہمارا کوئی تعلق نہیں ہے۔"

"میں جانتا ہوں لیکن اگر ڈینو نے وہ تصویریں کسی کو دے دیں اور کوئی ان کی حقیقت جان گیا تو تم بھی اس کی

لپیٹ میں آ جاؤ گے۔"

وہ ٹھیک ہی کہہ رہا تھا پھر بھی میں نے پوچھ ہی لیا۔

"ہم اس سامان کا کیا کریں گے؟"

"فی الحال ہم انہیں گیسٹ ہاؤس میں رکھ دیں گے جب تک کہ ان کے بارے میں کوئی فیصلہ نہ ہو جائے۔"

ڈینو کو راضی کرنا آسان نہیں تھا لیکن جب اسے پوری بات سمجھائی گئی تو وہ مان گیا۔ وہ دونوں میری ایس یو وی کار لے گئے جسے میں تصویریں ڈھونے کے لیے استعمال کیا کرتا تھا۔ میں اپنے پیر کی تکلیف کی وجہ سے گھر پر ہی رک گیا۔

رات کا ایک بجا ہوگا جب پولیس نے سینڈی کو ڈینو کے گھر سے آنے کی اجازت دی۔ ہم دونوں نے گاڑی میں سے تصویریں، فریم اور دوسرا سامان نکال کر گیسٹ ہاؤس میں رکھنا شروع کر دیا۔ میں اپنی چوٹ کی وجہ سے کچھ کرنے کے قابل نہ تھا۔ اس لیے زیادہ تر کام سینڈی کو ہی کرنا پڑا۔ ہم دونوں میں سے کسی کو بھی یقین نہیں تھا کہ جو کچھ ہم کر رہے ہیں وہ قانونی اور اخلاقی طور پر جائز ہے اور نہ ہی ہم یہ جانتے تھے کہ اس کے نتائج کیا ہوں گے۔ میں گومگو کی حالت میں تھا کہ ہم نے مسئلے کو حل کرنے کا جو طریقہ نکالا ہے کیا وہ درست ہے اور جو شخص مجھے اس کیفیت سے نکال سکتا وہ مر چکا تھا۔ اسے قتل کر دیا گیا تھا اور ہم وہ سامان اتار رہے تھے جو ہمارا نہیں تھا۔

کام ختم کرنے کے بعد ہم نے بڑے کمرے کی تمام بتیاں بجھا دیں اور پردے ہٹا دیے تاکہ چاند کی روشنی اندر آسکے۔ میں ایک صوفے پر ڈھیر ہوتے ہوئے بولا۔ "میرے گھٹنے میں شدید درد ہو رہا ہے۔"

سینڈی نے پہلے تو کوئی جواب نہیں دیا پھر بولا۔ "میں تمہیں ایک بات بتانا بھول گیا۔ تمہیں یاد ہے میں نے تم سے ایک مرتبہ ڈینو کی وصیت کے بارے میں بات کی تھی۔"

"اس میں کیا خاص بات ہے؟"

اس نے لحہ بھر توقف کیا پھر نیچی آواز میں بولا۔ "اس نے مجھے جائداد کا مختار بنایا تھا۔"

مجھے یاد آ گیا۔ اس نے شاید پانچ سال پہلے یہ بات بتائی تھی لیکن اس وقت اس کی اتنی اہمیت نہیں تھی لیکن کیا وہ سب سچ تھا۔ میں ٹھنڈی سانس لینے کے سوا کچھ نہ کر سکا۔ سینڈی میرا ردِعمل دیکھنے کے بعد مایوس ہو گیا اور بولا۔ "چلو سو جائیں۔"

لیکن وہ وصیت اب بھی اہمیت رکھتی تھی۔ اس کا اندازہ ہمیں اس وقت ہوا جب اگلی صبح بیس نیلسن نے سینڈی کو فون کیا۔ وہ کرافش میری میں وکالت کرتی تھی اور اس سے ہماری پرانی دوستی تھی۔ اسی نے ڈینو کی وصیت تیار کی تھی اور ایک طرح سے وہی سینڈی کو جائداد کا مختار بنانے کی ذمے دار تھی۔ اس نے ڈینو سے کہا تھا کہ وہ کسی ایسے شخص کو مختار نامزد کرے جس کا جائداد کے حوالے سے کوئی ذاتی مفاد نہ ہو چنانچہ قرعہ فال سینڈی کے نام نکلا۔

بیس نے فون پر کہا کہ کیا سینڈی جمعہ کی صبح اس سے ڈینو کے گھر پر مل سکتا ہے تاکہ وہ مل کر قیمتی اثاثوں کی فہرست تیار کر سکیں۔ سینڈی رضامند ہو گیا اور مجھ سے کہنے لگا۔ "اگر مجھے یہ کام کرنا ہے تو ضرور کروں گا۔ اس میں پیچھے ہٹنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

☆☆☆

وہ وکیل سے ملنے کے بعد گھر واپس آیا تو اس نے مجھے بتایا۔ "جب ہم وہاں پہنچے تو دو پولیس والے ڈینو کے مکان کی نگرانی کر رہے تھے۔ انہوں نے ہمیں اندر نہیں جانے دیا۔ وہ نہیں جانتے تھے کہ ہم کون ہیں اور نہ ہی انہیں اس سے کوئی دلچسپی تھی۔ بیس کا خیال تھا کہ شاید ہمیں کورٹ آرڈر کی ضرورت پڑے لیکن میں نے سراغ رساں روما نو کو فون کیا۔ وہ پولیس والے روما نو سے بات کر کے مطمئن نہیں تھے کیونکہ وہ اس کے ماتحت نہیں ہیں۔ بہر حال انہوں نے ہمیں اس شرط پر اندر جانے کی اجازت دی کہ ہم کسی چیز کو ہاتھ نہیں لگائیں گے۔"

ڈینو کا مکان صرف دو دن خالی رہا لیکن جولائی کے گرم موسم میں یہ دو دن بھی بہت بھاری تھے۔ گھر میں اندھیرا تھا اور کچن میں رکھی ہوئی باسی چیزوں کی بُو سارے گھر میں پھیل گئی تھی۔ مجھ پر گھبراہٹ طاری ہونے لگی۔ سینڈی نے کہا۔ "ابھی تک فرش اور میز پر خون کے دھبے نظر آ رہے تھے۔ میں وہاں سے فوراً نکلنا چاہ رہا تھا لیکن ہمیں سامان کی فہرست بنانا تھی۔ خصوصاً ایسی چیزوں کی جن کے چوری ہونے کا خطرہ ہوتا کہ ہم انہیں کسی محفوظ مقام پر منتقل کر سکیں۔ ہمیں اسٹیریو اور ٹی وی سے زیادہ تصویروں اور کمپیوٹر کی فکر تھی۔"

"کیا تم بتا سکتے ہو کہ یہاں سے کوئی چیز غائب ہوئی ہے؟" وکیل نے پوچھا۔

"میں نہیں جانتا۔" سینڈی نے کہا۔ "آخری بار جب یہاں آیا تو میں کافی پریشان تھا۔"

باہر ایک کار کے رکنے کی آواز آئی۔ کار کا دروازہ کھلا اور زور سے بند ہو گیا۔ باہر سے ملی جلی آوازیں آئیں اور

سینڈی نے اُن میں سے ایک کو پہچان لیا اور بولا۔ ''ہمیں یہاں سے فوراً نکل جانا چاہیے۔ یہ کسی وحشی اور دیوانے کی آواز لگتی ہے۔''

بھاری قدموں کی آواز آئی اور پولیس والے نے دروازے پر آ کر کہا۔ ''مسٹر سینڈی! باہر ایک شخص کھڑا ہے جو تم سے بات کرنا چاہ رہا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ یہاں اس کی بھی کچھ چیزیں رکھی ہوئی ہیں۔''

''میں اس شخص سے ملنا چاہوں گی۔'' وکیل نے کہا۔

''ٹھیک ہے۔ تم میرے ساتھ باہر چلو۔'' سینڈی نے کہا۔

انہیں دیکھتے ہی وہ شخص سینڈی کی جانب لپکا اور بولا۔ ''تم سینڈی ہی ہونا۔ ہم پہلے بھی مل چکے ہیں۔ تمہیں یاد آ گیا، میں ایلن بوش ہوں۔''

''اس نے اپنے آنے کا مقصد نہیں بتایا؟'' میں نے پوچھا۔

''وہ اپنی تصویریں لینے آیا تھا۔'' سینڈی نے مشروب کا گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔ ''اس کا دعویٰ تھا کہ یہ تصویریں میڈی بالان کی ہیں اور نہ ہی ڈینو کی بلکہ اس نے حفاظت کی غرض سے ڈینو کے پاس رکھوائی تھیں۔ وہ اپنے ساتھ وین بھی لے کر آیا تھا لیکن وکیل نے یہ کہہ کر اسے تصویریں لے جانے سے منع کر دیا کہ جب تک ان اشیا کی فہرست تیار نہیں ہو جاتی اور مسٹر بالان کی وصیت کے مطابق انہیں تقسیم نہیں کر دیا جاتا۔ وہ کسی چیز کو ہاتھ نہیں لگا سکتا۔''

''مسٹر بالان کا ان تصویروں سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ میں نے میڈی کے ساتھ مل کر بنائی تھیں بلکہ ان میں زیادہ تر تصویریں میری بنائی ہوئی ہیں۔'' ایلن بوش نے وضاحت پیش کرنے کی کوشش کی۔

''ایسی صورت میں جائداد کا تصفیہ ہو جانے کے بعد وہ تصویریں تمہیں واپس مل جائیں گی۔ تصفیہ ہونے تک یہ سب چیزیں اسی گھر میں محفوظ رہیں گی۔'' وکیل نے جواب دیا۔

وہ دھمکیاں دیتا ہوا وہاں سے چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد وکیل نے پوچھا کہ وہ کن تصویروں کی بات کر رہا تھا۔

''تم نے اُسے کیا بتایا؟'' میں نے بے چین ہوتے ہوئے پوچھا۔

''وہ سب کچھ جو میں جانتا تھا کیونکہ اسی میں بہتری تھی۔ وکیل سے کچھ نہیں چھپانا چاہیے۔'' سینڈی نے کہا۔

میں سینڈی کی بات سے اختلاف نہیں کر سکتا تھا اس لیے خاموش رہا۔ سینڈی اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''تھوڑی دیر بعد ایک اور کار ڈینو بالان کے گھر کے سامنے آ کر رکی اور اس میں سے ایک خوش پوش شخص برآمد ہوا۔ میں اسے نہیں جانتا تھا۔ اس نے دونوں پولیس والوں سے ہاتھ ملایا اور ہم سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔ ''تم دونوں کون ہو؟''

''بیس نیلسن۔'' وکیل نے اپنا ہاتھ مصافحہ کے لیے بڑھا دیا۔

''کیا تم اپنا تعارف کروانا پسند کرو گے۔'' سینڈی نے کہا۔

''آرفرانسس سڈنی۔'' وہ شخص بولا۔ ''تم لوگ یہاں کیا کر رہے ہو؟''

''میں ڈینو بالان کی وکیل ہوں اور یہ مسٹر سینڈی ہیں۔ اس جائداد کے مختار۔'' وکیل نے کہا۔ ''کیا میں تمہاری آمد کا مقصد جان سکتی ہوں؟''

''میں میڈی بالان ٹرسٹ کا ڈائریکٹر ہوں۔ ہم میڈی بالان کی ان تمام تصویروں اور دیگر اشیا کے مالک ہیں جو مسٹر بالان کے قبضے میں تھیں یا انہوں نے غیر قانونی طور پر حاصل کر رکھی تھیں۔''

''یہ بالکل فضول بات ہے۔'' وکیل نے کہا۔ ''اس مکان میں موجود تمام اشیا مسٹر بالان کی ملکیت تصور کی جائیں گی۔''

''جو تصویریں اس نے غیر قانونی طور پر حاصل کی ہیں، وہ اس کی ملکیت کیسے ہو سکتی ہیں۔'' فرانسس نے کہا۔ ''ہم ان تصویروں کو اس وقت تک اپنے پاس محفوظ رکھیں گے جب تک ان کی ملکیت کا فیصلہ نہ ہو جائے۔ میں پولیس والوں سے نمٹ لوں گا۔''

''ٹھیک ہے جب اثاثوں کی فہرست تیار ہو جائے گی تو ہم تمہیں اس کی ایک نقل بھیج دیں گے۔''

''یہ کافی نہیں ہے۔'' فرانسس جارحانہ انداز میں بولا۔ ''مجھے میڈی بالان کی وہ تصویریں ابھی چاہئیں جو ڈینو بالان نے چھپائی ہوئی ہیں۔ کیا اس کے گھر میں کوئی اسٹور ہے یا اس نے یہ تصویریں کہیں اور چھپا دی تھیں؟''

''اس کی کار میں اتنی گنجائش نہیں تھی کہ وہ ان تصویروں کو کہیں اور منتقل کر سکتا۔'' سینڈی نے کہا۔

''پھر وہ تصویریں اسی گھر میں ہوں گی۔ میں خود ہی

دیکھ لیتا ہوں۔''

''اور ہم تمہیں روک نہیں سکتے۔'' سینڈی نے اس کے راستے میں آتے ہوئے کہا۔

فرانسس نے سینڈی کی آستین پکڑی اور اسے وکیل سے دور کرتے ہوئے بولا۔ ''تم ایسی کوشش بھی نہیں کر سکتے۔''

پولیس والے تیزی سے اس کی جانب لپکے۔ انہوں نے فرانسس کو پکڑا اور دھکیلتے ہوئے کار تک لے گئے۔ دو منٹ بعد تین پولیس کاریں وہاں آئیں۔ انہوں نے فرانسس کو ہتھکڑی لگائی اور اسے اپنے ساتھ لے گئے۔

سینڈی کی زبانی سارا ماجرا سننے کے بعد میں نے کہا۔ ''تم نے جان بوجھ کر اُسے مشتعل کیا۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہا؟''

سینڈی کوئی جواب دینے کے بجائے معنی خیز انداز میں مسکرا دیا۔

اگلے روز میسا چوسٹس پولیس نے آر فرانسس کو رہا کر دیا اور سینڈی کو اس واقعہ کے بارے میں گفتگو کرنے کے لیے بدھ کی شام کو بلایا۔ اس دن میری گیلری میں کافی گاہک آئے۔ ان میں سے دو نے اپنی پسندیدہ تصویریں خریدیں البتہ ایک گاہک نے پوچھا۔ ''میں نے سنا ہے کہ تمہارے پاس میڈی بالان کی تصویریں تھیں۔ وہ کہاں گئیں۔''

''وہ اسٹیٹ کو واپس کر دیں۔''

میرے لیے وہ ایک تکلیف دہ دن تھا۔ وہ تصویریں میرے گیسٹ ہاؤس میں تھیں جن کی کسی کو تلاش تھی اور اسی نے ڈینو بالان کا قتل کیا ہوگا۔ وہ شخص خاموش نہیں رہے گا البتہ میں اس شام ڈینو کے گھر نہیں گیا تھا۔ اسی لیے وہ گمشدہ تصویروں کے حوالے سے مجھ پر شک نہیں کر سکتا لیکن سینڈی وہاں موجود تھا۔ گویا اس کی زندگی خطرے میں تھی۔

اس شام جب سینڈی پولیس اسٹیشن سے واپس آیا تو ہم ٹھنڈی ہوا کا لطف لینے کے لیے باہر صحن میں بیٹھ گئے۔ سینڈی نے پوچھا۔ ''یہ ٹرسٹیز کس طرح ٹرسٹ سے پیسا حاصل کرتے ہیں۔ میرا مطلب ہے جائز طور پر۔''

''انہیں بھاری وظیفہ ملتا ہے۔ سفری اور رہائشی اخراجات اس کے علاوہ ہیں اور ان کی بہت زیادہ باریک بینی سے جانچ پڑتال نہیں ہوتی۔ ممکن ہے کہ ان کا وظیفہ بھی ٹرسٹ کی آمدنی کے حساب سے مقرر کیا جاتا ہو۔''

''اسی لیے وہ تصویروں کی قیمتیں بڑھانا چاہتے ہیں جو جعل سازی کی نشاندہی کر کے ہی ممکن ہے۔''

''ہاں، ٹرسٹ کی اپنی ذمے داریاں اور فرائض ہیں لیکن ان میں سب سے اہم میڈی بالان کے اثاثوں کی قدر میں اضافہ ہے۔ یہ ایک ایسی ذمے داری ہے جسے ٹرسٹ کا ہر رکن بڑی خوشی سے ادا کرتا ہے کیونکہ اسی پر ان کی آمدنی کا انحصار ہے۔''

''کیا ان سب کو مسٹر روسا کی طرح پیسوں کی ضرورت ہے؟''

''یقیناً، وہ بھی انسان ہیں اور انہیں اپنی ضرورتیں پوری کرنے کے لیے پیسا چاہیے۔''

''لیکن آر فرانسس تو خاصا امیر آدمی معلوم ہوتا ہے۔ کم از کم اس کی کار دیکھنے سے تو یہی اندازہ ہوتا ہے۔''

میں نے اپنے اندر بے چینی سے محسوس کی اور بولا۔ ''مجھے ڈر لگ رہا ہے۔ جس شخص نے ڈینو کا قتل کیا ہے کہیں وہ تمہاری تلاش میں نہ ہو۔''

''یہ کیسے ہو سکتا ہے؟'' سینڈی نے کہا۔ ''اس بارے میں کوئی نہیں جانتا اور نہ کسی کو اندازہ ہو سکتا ہے۔''

یہ اُس کی بھول تھی۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ کوئی ایسا کر سکتا ہے۔ میں نے کار کے رکنے کی آواز نہیں سنی اور نہ ہی مجھے گیٹ کھلنے کا پتا چلا البتہ ایک آواز میری سماعت سے ضرور ٹکرائی۔

''بہت عمدہ کار ہے۔'' اس کا اشارہ میری ایس یو وی کی طرف تھا اور یہ آواز آر فرانسس کی تھی۔ میں نے مڑ کر دیکھا۔ وہ ہم سے دس گز کے فاصلے پر کھڑا ہوا تھا۔ میں نے اپنی جگہ سے اٹھنے کی کوشش کی تو وہ بولا۔

''بیٹھ جاؤ، کھڑے ہونے کی ضرورت نہیں۔ یہ کار کس کی ہے؟''

ہم نے کوئی جواب نہیں دیا تو وہ بولا۔ ''اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میڈی بالان کی کچھ تصویریں غائب ہیں اور اسی کار کے ذریعے ان تصویروں کو کہیں لے جایا گیا ہے۔''

''تم کیا کہنا چاہ رہے ہو۔'' میں تیزی سے بولا۔

''میں نے اس کار کو اس رات مسٹر بالان کے گھر کے باہر دیکھا تھا اور آج مجھے پتا چل گیا کہ یہ کار مسٹر بالان کی نہیں تھی۔ مسٹر برگ مین! سیدھی طرح بتا دو کہ وہ تصویریں کہاں ہیں؟'' یہ کہہ کر اس نے اپنی جیب سے پستول نکال لیا۔

میں نے کوئی جواب نہیں دیا تو اس نے دوبارہ

پوچھا۔ ''وہ تصویریں کہاں ہیں؟''

اس سے پہلے کہ میں کوئی جواب دیتا، سینڈی نے کہا۔ ''بوٹ ہاؤس میں۔ اس طرف۔'' اس نے جھیل کی جانب اشارہ کیا تو مجھے حیرت ہونے لگی۔ وہاں جھیل کنارے ایک پرانا بوٹ ہاؤس تھا جس میں ہم باغبانی کے آلات رکھتے تھے۔ ہمارے پاس تو کوئی چھوٹی کشتی بھی نہ تھی جسے ہم جھیل میں اتار سکیں۔ وہاں تصویریں رکھنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ وہ جگہ چوہوں اور دیگر کیڑے مکوڑوں کی آماجگاہ تھی۔

لیکن آر فرانسس کی سمجھ میں یہ بات نہیں آئی۔ ویسے بھی جب آدمی کے ہاتھ میں پستول ہو تو اس کے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت ختم ہو جاتی ہے۔

''اب تم کھڑے ہو سکتے ہو۔'' فرانسس نے کہا۔ ''ہم تھوڑی سی چہل قدمی کریں گے۔''

میں نہیں جانتا تھا کہ سینڈی کے ذہن میں کیا ہے۔ میں نے اپنی چھڑی اٹھائی اور اس کے سہارے کھڑا ہو گیا۔

''تم لنگڑا رہے ہو۔'' فرانسس نے پوچھا۔

''ہاں۔ آج صبح میرے پیر پر فرائی پین گر گیا تھا۔''

''ٹھیک ہے، تم دونوں مجھ سے آگے رہو۔ اور ہاں جیب میں ہاتھ ڈالنے کی ضرورت نہیں۔''

ہم نے آہستہ آہستہ چلنا شروع کر دیا۔ وہ ہمارے پیچھے آرہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں پستول تھا اور ہماری زندگیاں اس کے رحم و کرم پر تھیں۔ اس کے باوجود میرا ذہن تیزی سے کام کر رہا تھا۔ اس نے میری کار ڈینو بالان کے گھر کے باہر دیکھی تھی جس کا مطلب ہے کہ وہ بھی وہاں موجود تھا اور اسی نے ڈینو کو قتل کیا ہوگا۔ اسے باپ بیٹی کے درمیان صلح کا علم ہو گیا تھا اور میڈی کے مرنے کے بعد ڈینو ہی اس کی جائداد اور اثاثوں کا مالک تھا۔ اس لیے اسے راستے سے ہٹانا ضروری ہو گیا تھا۔

ہم بوٹ ہاؤس پر پہنچے تو اس نے مجھے دروازہ کھولنے کا حکم دیا۔ جب ہم تینوں اندر داخل ہو گئے تو میں نے اس کی ہدایت کے مطابق دروازہ بند کر دیا۔ بوٹ ہاؤس بالکل خالی تھا البتہ اس کے فرش میں ایک بڑا سا خلا موجود تھا جس میں ایک چھوٹی کشتی بہ آسانی سما سکتی تھی۔ فرانسس نے چند قدم آگے بڑھائے۔ میں اس کے پیچھے تھا۔ سینڈی نے چلاتے ہوئے کہا۔ ''دیکھ کر چلو، آگے کا فرش بوسیدہ ہے۔''

وہ رک گیا اور جھک کر نیچے دیکھنے لگا۔ میں نے اپنی چھڑی گھمائی اور اس کے سر پر دے ماری۔ وہ لڑکھڑایا اور اس پر گھبراہٹ طاری ہو گئی۔ میں نے دوسرا وار اس کے بازو پر کیا۔ پستول اس کے ہاتھ سے نکل کر میرے عقب میں جا گرا جسے سینڈی نے فوراً ہی اٹھا لیا۔ میں نے چھڑی کا ایک اور وار اس کے گھٹنے پر کیا اور وہ پانی میں جا گرا۔ سینڈی نے پستول مجھے پکڑایا اور بولا۔ ''تم اس کا استعمال جانتے ہو۔''

میں نے دونوں ہاتھوں سے پستول پکڑ لیا اور اس کا رخ فرانسس کی طرف کرتے ہوئے بولا۔ ''مجھے پستول چلانا آتا ہے مسٹر فرانسس! پانی سے باہر آنے کی کوشش مت کرنا۔''

''میرے جوتے۔'' اس نے کہا۔ ''یہ پانی میں خراب ہو جائیں گے۔''

اُسے اس حال میں بھی جوتوں کی فکر تھی۔ اس نے پانی سے باہر آنے کی کوشش کی تو میں نے فائر کر دیا اور بولا۔ ''یہ محض ایک وارننگ تھی۔ پانی میں ہی رہو۔''

سینڈی نے فون پر پولیس کو اطلاع دی اور انہوں نے وہاں پہنچنے میں دیر نہیں لگائی۔ ان کے ساتھ ہمارا ایک طویل سیشن ہوا۔ اس کے بعد ہم گھر واپس آسکے۔ اندھیرا ہو چکا تھا اور ہم بری طرح تھک گئے تھے۔ اس لیے آرام کرنے کی غرض سے لان میں جا کر بیٹھ گئے۔ میں نے سینڈی سے کہا۔ ''میری سمجھ میں اب تک نہیں آیا کہ تم اُسے لے کر بوٹ ہاؤس کیوں گئے تھے؟''

''اس وقت میری سمجھ میں بھی ایک بات آئی تھی۔ میرا خیال تھا کہ شاید ہمیں پانی میں چھلانگ لگانے کا موقع مل جائے۔''

''تمہارے ذہن میں چھڑی کا خیال نہیں تھا؟''

''نہیں، ویسے یہ چھڑی تمہیں کہاں سے ملی؟'' سینڈی نے پوچھا۔

''یہ مجھے کار کی ڈکی میں تصویروں کے ساتھ رکھی ہوئی ملی تھی۔''

''اوہ، یقیناً یہ ڈینو بالان نے ہی تمہارے لیے بھیجی ہوگی۔ اس نے بھی یہ سوچا بھی نہ ہوگا کہ یہی چھڑی اُس کے قاتل کو پکڑنے میں مددگار ثابت ہوگی۔''

''واقعی میرے ذہن میں بھی نہیں تھا کہ چھڑی کو ہتھیار کے طور پر بھی استعمال کیا جا سکتا ہے۔''

سینڈی مسکرا کر رہ گیا۔ میں نے اُسے یہ نہیں بتایا کہ گھر سے چلتے وقت ہی میں نے یہ منصوبہ بنا لیا تھا۔

اونچی اڑان

سلیم فاروقی

زندگی کی حقیقت زندگی ہی ہے... جس کی ابتدا رحمِ مادر میں نہیں... اور جس کا اختتام قبر میں نہیں ہوتا... کیونکہ گزرنے والے سال جاودانی زندگی کے سامنے ایک لمحے سے زیادہ کچھ نہیں... اس کے باوجود اس ایک لمحے کی زندگی کا ساتھ حاصل کرنے کے لیے لوگ ایسے خوابوں کو آنکھوں میں بسا لیتے ہیں... جن کی تعبیر کا حصول ناممکن ہو... تشنگی اور سرابوں کا تعاقب کرنے والے خواہش گزیدوں کا ڈرامائی کھیل... شاندار آغاز کے ساتھ ہی کامیابی ان کے قدم چوم رہی تھی... منزل تکمیل کے مراحل میں تھی کہ اچانک ہی پروازِ کھیل نے غلط اڑان بھر لی...

اغوا برائے تاوان کی واردات کا سنسنی خیز احوال...... سرورق کی تیز رفتار کہانی

اس دن سردی کچھ زیادہ ہی تھی۔ نوید تیزی سے قدم اٹھاتا ہوا بس اسٹاپ کی طرف جا رہا تھا۔ سردی سے بچنے کے لیے اس نے دونوں ہاتھ پینٹ کی جیبوں میں ڈال رکھے تھے۔ اس وقت صبح کے ساڑھے نو بج رہے تھے۔ اس کے باوجود سردی کی شدت میں کمی واقع نہیں ہوئی تھی۔ اسے رہ رہ کر شوروم کے مالک غضنفر پر بھی غصہ آ رہا تھا۔ گاڑیوں کا کوئی شوروم ساڑھے دس گیارہ بجے سے پہلے نہیں کھلتا تھا لیکن غضنفر کا حکم تھا کہ شوروم دس بجے تک کھلنا چاہیے۔

''اونہہ، دس بجے تک کھلنا چاہیے۔'' نوید جھنجلا کر بڑبڑایا۔

غضنفر خود تو نارتھ ناظم آباد میں رہتا تھا لیکن اس کا شوروم ڈیفنس میں تھا اور وہاں کے چند بڑے شورومز میں سے ایک تھا۔ شوروم خاصا بڑا تھا۔ اس میں بہ یک وقت بارہ سے پندرہ گاڑیاں کھڑی ہو سکتی تھیں۔ اس کے ایک گوشے میں غضنفر کا آفس تھا۔

نوید نے ٹھیک دس بجے شوروم کھول دیا۔ اسی وقت صفائی کرنے والا لڑکا بھی آ گیا۔ نوید آفس اور گاڑیوں کی جھاڑ پونچھ کرانے کے بعد چائے پی رہا تھا کہ شوروم کے سامنے جدید ماڈل کی ایک ٹویوٹا کرولا آ کر رکی۔ اس میں سے پینٹ کوٹ میں ملبوس ایک شخص اترا اور شوروم میں داخل ہو گیا۔ اسے دیکھ کر نوید جلدی سے اٹھا اور اس کے نزدیک پہنچ گیا۔

نووارد وہاں کھڑی ہوئی گاڑیوں کا جائزہ لے رہا تھا۔

''سر، آپ کو نیو کار چاہیے یا یوزڈ؟'' نوید نے پوچھا۔

نووارد کے چہرے پر ناگواری کا تاثر چھا گیا۔ وہ سرد لہجے میں بولا۔ ''آپ کیا سمجھتے ہیں کہ میں استعمال شدہ کار خریدوں گا؟''

''سوری سر!'' نوید جلدی سے بولا۔ ''ہمارے پاس جدید ماڈل کی گاڑیاں بھی ہیں۔ یہ ماڈل آپ کو کسی دوسرے شوروم پر نہیں ملیں گے۔'' پھر وہ دونوں ہاتھ ملتا ہوا

بولا۔ ''آپ فرمائیں، آپ کو کون سی گاڑی پسند ہے؟ یہ جدید ماڈل کی کرولا ہے اور یہ ہنڈا اسوک کا نیا ماڈل ہے۔ انتہائی آرام دہ اور......''

''مجھے کوئی ڈھنگ کی گاڑی چاہیے۔'' نووارد نے کہا۔ ''گاڑی اصل میں میرے باس کو چاہیے۔ میں تو ان کا منیجر ہوں۔''

''تو پھر آپ فرمائیں، گاڑی ہمارے شوروم میں نہ بھی ہوئی تو ہم آپ کے لیے ارینج کردیں گے۔''

''مجھے جدید ماڈل کی اکیورا چاہیے۔'' نووارد نے کہا۔

نوید ہکا بکا رہ گیا۔ اکیورا جیسی قیمتی گاڑی کا نام سن کر ہی وہ دنگ رہ گیا تھا۔ پھر وہ سنبھل کر بولا۔ ''آپ تشریف تو رکھیں۔ میں باس سے بات کرتا ہوں۔''

نوید اسے غضنفر کے آفس میں لے آیا اور ہیٹر آن کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے لڑکے سے کافی لانے کو کہا۔ پھر اس نے غضنفر کا نمبر ملایا۔ دوسری طرف گھنٹی بجتی رہی لیکن غضنفر نے فون نہیں اٹھایا۔

''میرے خیال میں باس واش روم میں ہیں۔'' نوید نے جلدی سے کہا۔

''میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے مسٹر......''

''میرا نام نوید ہے سر، آپ فکرمت کریں، باس سے میں ابھی بات کرلیتا ہوں۔'' اس دوران میں لڑکا کافی بنالایا تھا۔ شوروم کے ایک سرے پر چھوٹا سا کچن اور واش روم بھی تھا۔

نووارد کافی پی رہا تھا۔ نوید نے ایک مرتبہ پھر غضنفر کا نمبر ملالیا۔ وہ جانتا تھا کہ غضنفر اس وقت سورہا ہوگا لیکن جب کروڑوں کا سودا ہو تو کسی کو بھی نیند سے اٹھایا جاسکتا ہے۔ دوسری طرف گھنٹیاں بجتی رہیں۔

نوید مایوس ہوکر سلسلہ منقطع کرنے والا تھا کہ غضنفر پھاڑ کھانے والے لہجے میں دہاڑا۔ ''کیا آفت آگئی ہے نوید؟ ایسا کیا ضروری کام تھا کہ تم نے میری نیند خراب کردی ایڈیٹ؟''

''سر! ایسا ہی کام تھا۔'' نوید نے کہا۔ ''یہاں شوروم میں مسٹر......'' اس نے سوالیہ نظروں سے نو وارد کو دیکھا۔

''رضا نام ہے میرا، علی رضا۔'' نو وارد نے کہا۔

''آگے بھی تو کچھ پھوٹو۔'' غضنفر غرایا۔ ''کیا وہاں مسٹر پرائم منسٹر تشریف لے آئے ہیں؟''

''سر، یہاں مسٹر علی رضا موجود ہیں، یہ ملک کے ایک بہت بڑے جاگیردار اور صنعت کار کے منیجر ہیں۔ انہیں جدید ماڈل کی اکیورا (Aqura) چاہیے۔''

''کورا نہیں، کورے کہتے ہیں اسے۔ تم اتنے عرصے سے شوروم پر کام کر رہے ہو اور گاڑیوں کے نام تک درست نہیں لے سکتے؟''

''میں نے اکیورا کہا ہے سر۔'' نوید نے جھنجلا کر کہا۔

''کیا؟'' غضنفر کی نیند رفو چکر ہو گئی۔ ''جدید ماڈل کی اکیورا؟ اس منیجر کو اندازہ بھی ہے کہ برانڈ نیو اکیورا کی قیمت کتنی ہے؟''

''جی سر، بہت اچھی طرح اندازہ ہے۔'' نوید نے کہا پھر وہ علی رضا سے بولا۔ ''سر! آپ کو گاڑی کی ڈلیوری کب چاہیے؟''

''میں تو کہوں گا کہ آپ ڈلیوری مجھے آج ہی دے دیں۔'' علی رضا نے کہا۔

اس کی آواز شاید غضنفر نے سن لی تھی۔ اس نے نوید سے کہا۔ ''تم اسے روک کر رکھو، میں ابھی آدھے گھنٹے میں پہنچ رہا ہوں۔''

نوید جانتا تھا کہ غضنفر کا آدھا گھنٹا سوا گھنٹے کے برابر ہوتا ہے لیکن یہ بات اس نے علی رضا پر ظاہر نہیں کی۔ اس نے مسکرا کر کہا۔ ''باس خود دس منٹ میں یہاں پہنچ رہے ہیں۔''

اسی وقت نوید کے سیل فون کی گھنٹی بجی۔ نوید نے اسکرین پر غضنفر کا نام دیکھا اور رضا سے بولا۔ ''معاف کیجیے گا، میں ذرا فون سن لوں۔'' وہ رضا سے کچھ دور چلا گیا اور بولا۔ ''یس باس؟''

''اس پارٹی کو گھیر کے رکھو۔ میں راستے میں ہوں۔ ونڈرلینڈ والوں کے پاس ایک اکیورا ہے، میں ان سے بات کرتا ہوا آؤں گا۔ ممکن ہے، گاڑی بھی لے آؤں، تم بس پارٹی کو نکلنے مت دینا۔ اگر یہ سودا ہو گیا تو میں تمہیں بھی دگنا کمیشن دوں گا۔''

''ٹھیک ہے سر، آپ فکر ہی مت کریں۔'' نوید نے کہا اور سیل فون جیب میں رکھ کر رضا کے پاس آ گیا۔

رضا نے گھڑی دیکھی اور بولا۔ ''نوید صاحب! آدھا گھنٹا تو ہو چکا ہے۔ ملک صاحب میرا انتظار کر رہے ہوں گے۔ مجھے اور بھی کام کرنا ہیں۔''

''سر! بس دس منٹ!'' نوید نے کہا۔ ''ابھی باس ہی کا ٹیلی فون تھا۔ وہ شاید آپ کی گاڑی لے کر ہی آئیں گے۔'' پھر وہ مسکرا کر بولا۔ ''آج سردی کچھ زیادہ ہی ہے اگر موڈ ہے تو ایک کپ کافی مزید پی لیں۔''

''ویسے آپ کا ملازم کافی بہت اچھی بناتا ہے۔ ایک کپ مزید پینے میں کوئی حرج بھی نہیں ہے۔'' رضا مسکرا کر بولا۔

رضا نے کافی کا دوسرا کپ ختم کیا ہی تھا کہ غضنفر وہاں پہنچ گیا۔ رضا کی باوقار شخصیت دیکھ کر وہ بھی مرعوب ہو گیا۔ رسمی جملوں کے تبادلے کے بعد غضنفر نے کہا۔ ''میرے پاس ایک اکیورا ہے تو لیکن وہ تقریباً ہزار میٹر چلی ہوئی ہے۔''

''مجھے اس سلسلے میں ملک صاحب سے بات کرنا ہو گی۔ انہیں بھی تو شوق ہیں، اچھی گاڑیں اور قدیم زمانے کے سکے۔ ان کے پاس خلجیوں کے دور کے سکے بھی ہیں اور ترکی کے سلطان چہارم کے زمانے کے سکے بھی۔'' اس نے سیل فون پر نمبر ملایا اور بولا۔ ''السلام علیکم ملک صاحب!...... جی ہاں ایک شوروم پر آپ کے مطلب کی گاڑی ہے لیکن وہ کچھ چلی ہوئی ہے...... یس سر، جدید ماڈل ہے۔ او کے سر، بس میں آدھے گھنٹے میں پہنچ رہا ہوں۔''

''کیا فرما رہے ہیں ملک صاحب؟'' غضنفر نے پوچھا۔

''آپ اگر گاڑی مجھے ایک نظر دکھا دیں تو میں یہ سودا ڈن کر دوں۔''

''میں گاڑی ابھی یہیں منگوا لیتا ہوں، آپ اچھی طرح تسلی کر لیں بلکہ ٹیسٹ ڈرائیو بھی کر لیں۔'' غضنفر نے سیل فون پر کسی کو کال کی اور گاڑی بھیجنے کو کہا۔

دس منٹ کے اندر اندر چمچماتی ہوئی سفید رنگ کی اکیورا وہاں پہنچ گئی۔ گاڑی واقعی بہت شاندار تھی۔ رضا نے گھوم پھر کے اس کا جائزہ لیا۔ اس کی سیٹ پر بیٹھ کر دیکھا۔ گاڑی کی ایک ایک چیز اپنی مثال آپ تھی۔

''کیا ڈیمانڈ ہے آپ کی؟'' گاڑی کا ہر طرح سے جائزہ لے کر رضا نے پوچھا۔

''ملک صاحب گاڑیوں کے شوقین ہیں تو انہیں اس گاڑی کی مارکیٹ ویلیو کا علم بھی ہو گا۔ اصل میں اتنی شاندار

گاڑیاں شوقین اور خاندانی لوگ ہی رکھتے ہیں۔ ہم بھی ایسے لوگوں کا خاص خیال رکھتے ہیں۔ ملک صاحب یقیناً ہر سال گاڑی تبدیل کرتے ہوں گے۔ آپ کو اپنا مستقل گاہک بنانے کے لیے میں اس گاڑی کی قیمت زیادہ نہیں لگاؤں گا، آپ کے لیے صرف دو کروڑ تیس لاکھ روپے۔''

''اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ ہمیں مستقل اپنا گاہک نہیں بنانا چاہتے۔'' رضا نے رکھائی سے کہا۔ ''میرا خیال ہے کہ میں نے یہاں وقت ہی ضائع کیا ہے۔'' یہ کہہ کر رضا نے اپنا بریف کیس اٹھایا اور کھڑا ہوگیا۔

''ارے صاحب! آپ تو ناراض ہو گئے۔ ملک صاحب جیسی شخصیت کے لیے یہ رقم کچھ بھی نہیں ہے۔''

''بات رقم کی نہیں ہے بلکہ مارکیٹ ویلیو کی ہے۔ گاڑی اگر زیرو میٹر ہوتی تو اس سے زیادہ قیمت کی ہوتی لیکن......''

''آپ ہی فرمائیں، آپ کیا آفر دے رہے ہیں؟'' غضنفر نے کہا۔

''میں نے اب تک ملک صاحب کے لیے کئی گاڑیاں خریدی ہیں۔ مجھے بھی مارکیٹ کا اندازہ ہے۔ میں اس گاڑی کے دو کروڑ سے زیادہ نہیں دوں گا۔'' رضا نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

''میں آپ کو یہ گاڑی دو کروڑ پندرہ لاکھ میں دے سکتا ہوں۔'' غضنفر نے خالص کاروباری لہجے میں کہا۔

''سوری مسٹر غضنفر!'' رضا نے کہا۔ ''میں نے اپنے ساتھ ساتھ آپ کا وقت بھی برباد کیا اور آپ کی نیند بھی۔'' رضا نے یہ کہہ کر باہر کی طرف قدم بڑھائے۔

''ایک منٹ رضا صاحب!'' غضنفر پارٹی ہاتھ سے نکلتے دیکھ کر مضطرب ہوگیا۔ ''اب آپ نے فیصلہ کر ہی لیا ہے تو پھر چلیے یوں ہی سہی۔''

رضا مسکرا کر بیٹھ گیا۔ اس نے اپنا بریف کیس کھولا اور اس میں سے نوٹوں کی پانچ گڈیاں نکالیں۔ ''ٹوکن منی کے طور پر میں آپ کو پانچ لاکھ روپے دے رہا ہوں۔ اصل میں ملک صاحب اسلام آباد میں ہیں۔ وہ آج رات یا کل صبح تک آجائیں گے۔ وہ نہ بھی آئے تو میں آپ کو بقیہ رقم کی ادائیگی کردوں گا۔ اب یہ گاڑی میری امانت ہے، میں کل کسی وقت کیش دے کر یہ گاڑی لے جاؤں گا۔''

''ضرور رضا صاحب۔'' غضنفر نے مسکرا کر کہا۔

رضا اس سے ہاتھ ملا کر رخصت ہونے لگا تو اس کی نظر نوید پر پڑی۔ اس نے جیب میں ہاتھ ڈال کر کچھ نوٹ

ویری گڈ! اس لباس میں آپ بہت خوبصورت اور اسمارٹ لگ رہی ہیں

نکالے اور اس میں سے دس ہزار نوید کو دیتے ہوئے بولا۔ ''یہ تمہاری محنت کا انعام ہے۔ تم بہت اچھے سیلز مین ہو۔ تم نے جس خوبی سے مجھے باتوں میں لگا کر یہاں روکا، وہ خوبی بہت کم لوگوں میں ہوتی ہے۔''

نوید نے ایک نظر غضنفر پر ڈالی۔ غضنفر نے اسے آنکھوں ہی آنکھوں میں رقم لینے کا حکم دیا۔

''بہت شکریہ سر!'' نوید نے کہا اور نوٹ اس سے لے لیے۔

رضا کے جانے کے بعد غضنفر ہنس کر بولا۔ ''آج کا دن میرے لیے بہت لکی ہے۔ اس ڈیل میں ہم کم سے کم بیس لاکھ کمائیں گے۔'' پھر نوید کو دیکھ کر بولا۔ ''تم دو مہینے سے نئی موٹر سائیکل کی ڈیمانڈ کر رہے تھے نا، رضا سے کیش ملنے کے بعد میں تمہیں نئی موٹر سائیکل بھی دلوا دوں گا۔ ایسی ڈیل اگر مہینے میں ایک دفعہ ہی ہو جائے تو وارے نیارے ہو جائیں گے۔''

''سر! ہمیں ونڈر لینڈ والوں کو بھی تو کچھ دینا ہوگا؟'' نوید نے کہا۔

''ونڈر لینڈ!'' غضنفر مسکرایا۔ ''یہ گاڑی گزشتہ ایک مہینے سے ان کے شوروم میں کھڑی تھی۔ انہیں اس کا کوئی گاہک مل ہی نہیں رہا تھا۔ میں نے انہیں صرف دو لاکھ دینے

کا وعدہ کیا ہے۔"
اسی وقت ایک گاہک شوروم میں داخل ہوا تو نوید اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔

☆☆☆

ایس ایس پی سجاد آفس میں داخل ہوا ہی تھا کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ اس نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے ریسیور اٹھا لیا۔ دوسری طرف سے آپریٹر کی آواز آئی۔ "سر! ڈی آئی جی صاحب لائن پر ہیں۔"
"السلام علیکم سر۔"
"وعلیکم السلام۔" ڈی آئی جی نے کہا۔ "ایس پی صاحب! ابراہیم چاندی والا کیس کی کیا اپ ڈیٹ ہے؟"
"سر! آج اس کیس کا ڈراپ سین ہو جائے گا۔ کیس تو ایک ہفتے پہلے ہی ختم ہو جاتا لیکن میں گروہ کے سرغنہ کو پکڑنے کے چکر میں تھا۔ آج رات مجھے یہ موقع مل جائے گا۔ رات کو سرغنہ سمیت تمام ملزم سلاخوں کے پیچھے ہوں گے۔"
"او کے، وش یو بیسٹ لک آفیسر۔" ڈی آئی جی نے کہا۔ "مجھے بھی کیس کی اپ ڈیٹ سے انفارم کرتے رہنا۔"
یہ کہہ کر ڈی آئی جی نے سلسلہ منقطع کر دیا۔
سجاد نے ریسیور کریڈل پر رکھ کر کرسی کی پشت سے سر ٹکا لیا پھر اچانک اسے کچھ خیال آیا۔ اس نے انٹر کام پر کوئی نمبر ڈائل کیا اور بولا۔ "انسپکٹر صاحب! ذرا میرے کمرے میں آیئے۔"
فوراً ہی ایک پولیس انسپکٹر اپنی پینٹ کی بیلٹ سنبھالتا ہوا کمرے میں داخل ہوا۔ اس کے جسم پر ضرورت سے زائد چربی تھی، پیٹ کا حجم اس کے جسم سے کہیں زیادہ تھا۔ چہرے پر کاہلی کے آثار تھے لیکن اس وقت وہ سجاد کے سامنے تن کر کھڑا ہونے کی کوشش میں مزید مضحکہ خیز لگ رہا تھا۔
"انسپکٹر صاحب گل محمد کے کیس کا کیا ہوا؟"
"سر! میں نے کل سے اب تک اس کے پانچ ٹھکانوں پر چھاپے مارے ہیں لیکن وہ ابھی تک ہاتھ نہیں آیا۔"
"اسے زمین کھا گئی یا آسمان نگل گیا؟" سجاد کے لہجے میں ناگواری تھی۔ "یہ بات تو طے ہے کہ وہ کراچی سے باہر نہیں نکلا ہے پھر اتنی دیر کیوں ہو رہی ہے؟"
"سر! کراچی بھی کوئی چھوٹا شہر نہیں ہے۔ اسے گرفتار کرنا گویا بھوسے میں سوئی تلاش کرنا ہے۔"
"آپ نے کل سے اب تک کہاں کہاں چھاپے مارے ہیں، ان کا پورا ریکارڈ میری آئی ڈی پر سینڈ کر دیں اور سب انسپکٹر منیر کو میرے پاس بھیج دیں۔"
سجاد ان آفیسرز میں سے تھا جو پولیس کی ملازمت اپنے شوق کی خاطر کرتے ہیں۔ وہ بہت بڑے باپ کا بیٹا تھا۔ اس کے ایک چچا قومی اسمبلی کے ممبر بھی تھے۔ محکمے میں اس کی عزت اپنے خاندانی پس منظر کی وجہ سے نہیں تھی بلکہ کارکردگی کی بنیاد پر تھی۔ گزشتہ پانچ سال میں اس نے ایسے ایسے کیس حل کیے تھے جنہیں سرد خانے میں ڈال دیا گیا تھا۔ اس نے سی ایس ایس کا امتحان پاس کرنے کے بعد پولیس ڈپارٹمنٹ کا انتخاب کیا تھا اور محض پانچ سال میں اے ایس پی کے عہدے سے ترقی پا کر ایس ایس پی ہو گیا تھا۔ ان دنوں وہ کرائم برانچ میں تھا۔ اس نے محکمے سے صرف ایک ہی رعایت طلب کی تھی کہ وہ صرف ڈی آئی جی کو جواب دہ تھا اور ٹھوس ثبوتوں اور شواہد کی موجودگی میں کسی پر بھی ہاتھ ڈال سکتا تھا۔ محکمے کے دوسرے آفیسر اس سے حسد کرتے تھے لیکن سجاد کو ان کی پروا نہیں تھی۔
وہ فون پر کسی سے گفتگو میں مصروف تھا کہ سب انسپکٹر منیر نے کمرے میں داخل ہو کر اسے سیلوٹ کیا۔ سجاد نے ہاتھ کے اشارے سے اسے بیٹھنے کو کہا اور ریسیور میں بولا۔
"تم سائے کی طرح ان کے پیچھے لگے رہو اور مجھے پل پل کی رپورٹ دیتے رہو۔"
فون سے فارغ ہو کر سجاد نے سب انسپکٹر منیر سے کہا۔ "کیا پروگریس ہے؟"
"سر! ساری تیاری مکمل ہے۔" منیر نے کہا۔ "بس آپ کے حکم کی دیر ہے۔"
"ہر طرح سے اطمینان کر لو۔ ایک دفعہ نذیر سومرو ہاتھ سے نکل گیا تو اسے دوبارہ پکڑنا بہت مشکل ہو گا۔"
"میرا انفارمر مجھے ایک ایک پل کی رپورٹ دے رہا ہے سر، مجھے امید ہے کہ ہم خالی ہاتھ نہیں لوٹیں گے۔"
"دیٹس گڈ!" سجاد نے کہا۔ "جاؤ، وش یو گڈ لک۔"
اس نے کچھ رپورٹس دیکھنے کے لیے لیپ ٹاپ آن ہی کیا تھا کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ سجاد نے کمپیوٹر کے اسکرین پر نظریں جمائے جمائے ریسیور اٹھا لیا اور بولا۔ "ہیلو۔"
"ہیلو کے بچے۔" دوسری طرف سے مراد کی آواز آئی۔ "تمہارا سیل فون ہر وقت آف کیوں رہتا ہے؟"
"میرا سیل فون اس وقت چارجنگ پر لگا ہے۔" سجاد نے ہنس کر کہا۔

''اچھا سن، تو آج شام کو کیا کر رہا ہے؟'' مراد نے پوچھا۔

''یہ تو شام ہی کو معلوم ہوگا۔'' سجاد مسکرایا۔ ''ویسے ابھی تک تو کوئی خاص پروگرام نہیں ہے۔''

''تو پھر آج تو میری طرف آجا۔ میں نے اپنے پرانے دوستوں کی ایک پارٹی کی ہے اور سب سے زیادہ پرانا تو تو ہی ہے۔ اسکول سے لے کر یونیورسٹی تک تو میرے سر پر نازل رہا ہے۔''

''اگر کوئی مصروفیت نہیں ہوئی تو میں ضرور آؤں گا۔'' سجاد نے کہا۔

''کوئی اگر مگر نہیں۔'' مراد نے کہا۔ ''ثمرین نے تجھے خاص طور پر بلایا ہے۔''

مراد کا گھرانا بنیادی طور پر جاگیردار تھا۔ لیکن ان لوگوں نے اب جاگیرداری کے ساتھ ساتھ صنعت کاری بھی شروع کر دی تھی۔

مراد کی نئی نویلی بیوی ثمرین بھی ایک بڑے صنعت کار گھرانے سے تعلق رکھتی تھی۔

جب مہمان رخصت ہونے لگے تو مراد نے سجاد کو روک لیا۔ وہ اس سے بہت سی باتیں کرنا چاہتا تھا۔ ایک ہی شہر میں رہتے ہوئے مہینوں ان کی ملاقات نہیں ہوتی۔ سجاد گزشتہ مہینے مراد کی شادی اور ولیمے میں شریک ہوا تھا لیکن محض شرکت کی حد تک۔

''یار، میں پرسوں ہنی مون کے لیے جا رہا ہوں۔'' مراد نے ہنس کر کہا۔

''اتنی جلدی؟'' سجاد نے اس پر طنز کیا۔ ''اگر ساتھ میں تمہارا ایک آدھ بچہ ہوتا تو زیادہ انجوائے کرتے۔''

''زیادہ طنز مت کر۔'' مراد نے کہا۔ ''تو نے تو اب تک شادی ہی نہیں کی ہے۔ اپنے بارے میں کیا خیال ہے؟''

''ویسے تو ہنی مون کے لیے کہاں جا رہا ہے؟''

''سجاد بھائی!'' مراد سے پہلے ثمرین بول اٹھی۔ ''ہم نے دنیا کا تقریباً ہر شہر دیکھ رکھا ہے لیکن افسوس کی بات یہ ہے کہ اب تک پاکستان پورا نہیں دیکھا۔ سوائے مری اور سوات کے ہم کہیں گئے ہی نہیں ہیں۔ ہم ہنی مون اپنے ملک میں منائیں گے۔''

''یہ تو بہت اچھی بات ہے۔'' سجاد نے کہا۔ ''واقعی اپنا ملک تو پوری طرح میں نے بھی نہیں دیکھا۔''

''ہم پرسوں علی الصباح یہاں سے بائی روڈ نکلیں

پاس ورڈ

قبرستان میں تدفین کا عمل جاری تھا۔ ایک صاحب مسلسل اپنے موبائل فون پر مصروف تھے۔ اچانک انہوں نے جھک کر اپنے بڑے بھائی سے پوچھا۔ ''نیٹ کا پاس ورڈ کیا ہے؟''

''ڈونٹ ٹاک!'' (DON'T TALK) بڑے بھائی نے خفگی سے کہا۔

''بھائی جان! سب کیپٹل میں ہے نا؟'' انہوں نے ڈونٹ ٹاک کی ہدایت کو پاس ورڈ سمجھ کر وضاحت چاہی۔

☆☆☆

سردار بلونت سنگھ اپنی بیوی کے ساتھ موٹر سائیکل پر بازار سے گزر رہے تھے کہ ان کے ایک لفنگے دوست نے آواز لگائی۔ ''سردار! گرل فرینڈ کو کہاں لے جا رہا ہے؟''

''گرل فرینڈ ہوگی تیری!'' بلونت سنگھ نے چیخ کر جواب دیا۔ ''میری تو یہ بیوی ہے بیوی!''

سرداری

لندن میں ساؤتھ آل کی ایک دکان میں گاہک نے داخل ہو کر پوچھا۔

''سرسوں دا تیل ہے؟''

دکان دار نے متانت سے پوچھا۔ ''کیا آپ سردار ہیں؟''

''جی ہاں......!'' گاہک نے بگڑ کر کہا۔ ''لیکن یہ کیا سوال ہے...... اگر میں زیتون پوچھتا تو کیا تم مجھے اطالوی سمجھتے...... حلال گوشت مانگتا تو مسلمان مان لیتے۔ کوشر چکن پوچھتا تو یہودی بنا دیتے...... اس سوال سے مطلب کیا تھا تمہارا؟''

''سر! میں کچھ بھی نہیں سمجھتا۔'' دکان دار نے سنجیدگی سے کہا۔ ''دراصل آپ نے سرسوں کا تیل مانگا جبکہ یہ صرف شراب کی دکان ہے!''

جعلی نوٹ

سردار بھگت سنگھ بینک آف انڈیا میں نقد رقم جمع کرانے گئے۔ کیشیئر نے گنتی کے دوران میں اعتراض کیا کہ پانچ نوٹ جعلی ہیں۔

سردار جی سینہ تان کر بولے۔ ''تجھے اس سے کیا مطلب، اصلی ہوں یا جعلی جانے تو میرے اکاؤنٹ میں ہیں۔''

لندن سے عمر آفریدی کا تجربہ

گے۔'' مراد نے کہا۔ ''میں نے اس پورے سفر کا روٹ بھی طے کرلیا ہے۔ ہم کم سے کم دو مہینے کراچی سے باہر گزاریں گے۔''

''تم لوگ بائی روڈ جاؤ گے؟'' سجاد نے پوچھا۔

''ہاں یار، بائی روڈ سفر کرنے کی تو بات ہی اور ہے۔'' مراد نے کہا۔

''میری مانو تو بائی روڈ نہ جاؤ۔'' سجاد نے کہا۔ ''آج کل حالات ایسے نہیں ہیں کہ بائی روڈ اتنا طویل سفر کیا جائے۔ پھر تم گاڑی بھی خود ہی ڈرائیو کرو گے اور......''

''میں نے کراچی اور لاہور کے درمیان بے شمار سفر کیے ہیں۔'' مراد نے کہا۔ ''پھر میں اکیلا نہیں ہوں۔ میرے ساتھ دو گارڈز بھی ہوں گے۔ وہ لوگ دوسری گاڑی میں ہمارے پیچھے آئیں گے۔''

''اس کے باوجود میں تمہیں یہی مشورہ دوں گا کہ بائی روڈ سفر مت کرو۔''

''اب آپ ڈرائیں تو مت سجاد بھائی۔'' ثمرین نے کہا۔ ''روزانہ سیکڑوں لوگ بائی روڈ سفر کرتے ہیں۔''

''اب تم لوگوں نے فیصلہ کر ہی لیا ہے تو میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ ویسے تم مجھ سے رابطے میں رہنا۔''

''تجھ سے رابطے میں رہوں؟'' مراد نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''تیرا اسیل فون یا تو مصروف رہتا ہے یا پھر آف ہوتا ہے۔''

''میرے دوسرے نمبر پر رابطہ کرنا۔ وہ نمبر بہت کم لوگوں کے پاس ہے۔'' پھر وہ چونک کر بولا۔ ''تیرے پاس اسلحے کا لائسنس تو ہے؟''

''ہاں، میرے پاس لائسنس ہے لیکن اسلحہ سفر کے دوران میں ساتھ رکھنے کے لیے اجازت نامہ بھی ضروری ہوتا ہے۔'' مراد نے کہا۔

''میں وہ اجازت نامہ کل ہی بنوا دوں گا۔'' سجاد نے کہا، پھر گھڑی دیکھ کر بولا۔ ''ارے یار، باتوں میں رات کا ایک بج گیا۔ صبح میری ایک ضروری میٹنگ بھی ہے، میں چلتا ہوں۔''

☆☆☆

وہ لوگ کراچی سے نکلے تو موسم بہت خوش گوار تھا۔ مراد اپنی لینڈ کروزر خود ہی ڈرائیو کر رہا تھا۔ ثمرین پسنجر سیٹ پر بیٹھی ہوئی تھی۔ گارڈز کی ڈبل کیبن پک اپ ان کے پیچھے تھی۔

مراد نے گاڑی کا ڈی وی ڈی پلیئر آن کر دیا۔ آواز کے ساتھ ہی بانسری نواز ایک مشہور کلاسک گانے کی دھن چھیڑ رہا تھا۔ مراد اس کے سحر میں کھو کر رہ گیا۔

''واہ کیا دھن ہے......'' ثمرین نے بھی جھومتے ہوئے تعریف کی۔ ''پلیز دوبارہ لگا دو۔''

''پہلے تم مجھے ایک کپ کافی دو۔'' مراد نے کہا۔

ثمرین نے عقبی نشست پر رکھے ہوئے بیگ سے تھرماس اور کپ نکالا اور مراد کو کافی دے دی۔

مراد کافی پی ہی رہا تھا کہ فائرنگ کی آواز سن کر بری طرح اچھل پڑا۔ کافی چھلک کر اس کے کپڑوں پر گر گئی اور وہ بیک ویو مرر میں دیکھنے لگا۔ اس کے گارڈز کی ڈبل کیبن پک اپ سڑک کے کنارے اوندھی پڑی تھی اور ایک گاڑی بہت تیز رفتاری سے اس کے پیچھے آ رہی تھی۔

''یہ...... یہ...... کیا ہو رہا ہے مراد؟'' ثمرین نے بوکھلا کر پوچھا۔

مراد نے جواب دیے بغیر گاڑی کی رفتار ایک دم بڑھا دی۔

ان کا تعاقب کرنے والی گاڑی کی رفتار بھی بڑھ گئی۔ اس گاڑی کا انجن مراد کی لینڈ کروزر سے زیادہ طاقت ور تو نہیں تھا لیکن اس کا ڈرائیور بہت مشاق تھا۔ اس نے گاڑی کی رفتار خوف ناک حد تک بڑھا دی اور مراد کی گاڑی کے نزدیک آ کر کچھ بولا۔ مراد کو اس کی آواز سنائی نہیں دی کیونکہ گاڑی کے شیشے بند تھے اور ہیٹر آن تھا۔

گاڑی کا ڈرائیور اپنے حلیے ہی سے ڈاکو لگ رہا تھا۔ ڈرائیور سمیت اس گاڑی میں چار آدمی تھے۔ پھر وہ شخص جو کچھ کہنے کی کوشش کر رہا تھا، اس نے کھڑکی سے رائفل کی نال باہر نکالی اور مراد کو رکنے کا اشارہ کیا۔

ثمرین بری طرح لرز رہی تھی۔ اس نے مراد سے کہا۔ ''مراد پلیز گاڑی مت روکنا۔''

''اگر میں نے گاڑی نہیں روکی تو یہ لوگ ہمیں بھون کر رکھ دیں گے۔ دیکھا نہیں، ان لوگوں نے ہمارے گارڈز کا کیا حشر کیا ہے۔''

اسی وقت ایک فائر ہوا لیکن گولی ان لوگوں نے ہوا میں چلائی تھی۔ مراد کا پاؤں بے ساختہ بریک پیڈل پر چلا گیا اور اس نے گاڑی روک دی۔

حملہ آوروں کی گاڑی انہیں اوورٹیک کر کے ان کی گاڑی کے سامنے یوں رکی کہ ان کا راستہ مسدود ہو گیا۔

پھر اس گاڑی کے تین دروازے ایک ساتھ کھلے اور اس میں سے خوفناک شکلوں والے تین لمبے تڑنگے آدمی باہر نکلے۔ ان لوگوں نے گہرے رنگوں کی قمیص شلواریں پہن

رکھی تھیں، سر پر پگڑیاں تھیں اور داڑھی مونچھوں کے بال بے تحاشا بڑھے ہوئے تھے۔

ان میں سے ایک شخص کلاشنکوف لے کر مراد کی گاڑی کی طرف بڑھا اور کرخت لہجے میں بولا۔ ''نیچے اُترو۔''

''کون ہو تم لوگ؟'' مراد نے کہا۔ ''اور یہ کیا حرکت ہے؟''

''اڑے نیچے اُتر حرکت کا بچہ، ابھی تیرے کو بتاتے ہیں کہ ہم کون ہیں؟'' اس نے کلاشنکوف کی نال مراد پر تان کر کہا۔ ''دروازہ کھول۔''

مراد نے دروازہ کھول دیا۔ اس نے مراد کا گریبان پکڑ کر باہر گھسیٹ لیا۔ اچانک گھسیٹے جانے سے وہ پختہ سڑک پر گرا لیکن اپنی چوٹوں کی پروا کیے بغیر فوراً ہی کھڑا ہو گیا۔ وہ اس وقت جینز، جیکٹ اور موٹے سول کے جوگرز میں تھا۔ ایک آدمی نے آگے بڑھ کر اس کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی۔

''میڈم! آپ بھی باہر آجائیں۔'' مراد کو وہی آواز سنائی دی لیکن اس مرتبہ لہجہ خاصا مہذب تھا۔ ''میں عورتوں پر ہاتھ اٹھانے کا قائل نہیں ہوں۔ آپ خود ہی باہر آجاؤ تو بہتر ہو گا۔''

ثمرین بھی اپنی طرف کا دروازہ کھول کر باہر آگئی۔ اس نے فوری طور پر اپنے آپ پر قابو پا لیا تھا۔ اس نے ناگواری سے کہا۔ ''آخر تم لوگ ہو کون اور ہم سے کیا چاہتے ہو؟''

''ابھی تھوڑی دیر میں آپ کو سب معلوم ہو جائے گا۔'' پھر اس نے سندھی میں اپنے ساتھی سے کہا۔ ''اڑے سومر! میڈم کی آنکھوں پر پٹی باندھ دے مگر ذرا خیال سے انہیں تکلیف نہ ہو۔''

پھر ان دونوں کا ہاتھ پکڑ کر وہ اپنی گاڑی تک لے گئے اور عقبی نشست پر بٹھا دیا۔ انہوں نے احتیاط کے طور پر مراد کے ہاتھ بھی پشت پر باندھ دیے تھے۔

''اڑے علی محمد!'' اس شخص کی آواز پھر سنائی دی۔ ''بابا، ان لوگوں کی گاڑی سے سارا سامان نکال لے۔''

چند لمحوں بعد گاڑی کا انجن اسٹارٹ ہوا اور وہ تیزی سے ایک طرف روانہ ہو گئی۔ اس شخص نے مراد کی تلاشی لے کر اس کی جیب سے بٹوا، پسٹل اور سیل فون نکال لیا تھا۔ اس نے ثمرین کے بیگ سے بھی سیل فون اور نقدی نکال لی۔

''تم لوگ بتاتے کیوں نہیں کہ تم ہو کون اور ہمیں کہاں لے جا رہے ہو؟'' مراد نے پوچھا۔

''سائیں، آپ اتنے ہی بھولے ہو یا بن رہے ہو؟'' اس شخص نے کہا جو دوسروں کو احکامات دیتا رہا تھا۔ غالباً وہی ان لوگوں کا لیڈر تھا۔ ''بابا سائیں، ہم لوگ ڈاکو ہیں۔'' اس نے یوں فخر سے کہا جیسے کسی ملٹی نیشنل کمپنی کا کوئی عہدے دار ہو۔

''یہ تم اچھا نہیں کر رہے ہو؟'' مراد نے کہا۔ ''میں......''

اس کا جملہ ادھورا رہ گیا کیونکہ چہرے پر پڑنے والا تھپڑ خاصا زوردار تھا۔ ''اب اگر بڑبڑ کی تو زبان کاٹ کر پھینک دوں گا۔''

گاڑی تیز رفتاری سے دوڑتی رہی۔ مراد کا اندازہ تھا کہ انہیں اس حالت میں سفر کرتے ہوئے تقریباً ایک گھنٹا گزر چکا ہے۔ پھر گاڑی ہائی وے سے بائیں طرف گھومی

اور کچے راستے پر دوڑنے لگی لیکن یہ کچا راستہ بھی ہموار تھا۔ مزید آدھے گھنٹے بعد مراد کو ہچکولے محسوس ہوئے تو اسے اندازہ ہوا کہ گاڑی اب اونچے نیچے غیر ہموار راستوں پر جارہی ہے۔سردی کی شدت میں اضافہ ہوگیا تھا۔مراد کی لگژری گاڑی کی طرح اس میں ہیٹر بھی نہیں تھا۔مراد کے جسم پر موٹی جیکٹ تھی اسے سردی کا زیادہ احساس نہیں ہورہا تھا۔اسے ثمرین کی فکر تھی۔ اس نے ہلکا سا سویٹر پہن رکھا تھا۔البتہ اس کے گلے میں موٹی اونی کپڑے کی شال تھی جو چلتے وقت مراد کی والدہ نے زبردستی اسے اوڑھادی تھی۔

اس غیر ہموار راستے پر گاڑی تقریباً ایک، ڈیڑھ گھنٹا چلتی رہی پھر ایک جگہ گاڑی رک گئی۔ پھر گاڑی کے دروازے کھلے اور کسی نے مراد کو بے رحمی سے باہر گھسیٹ لیا۔لیکن وہاں کی زمین کچی اور مٹی بھر بھری تھی اس لیے اسے زیادہ چوٹ نہیں لگی۔ثمرین کو البتہ ان لوگوں نے بہت آرام سے اُتارا تھا۔

مراد نے اس علاقے کا جائزہ لیا لیکن ہر طرف درخت اور خودرو جھاڑ جھنکاڑ کے سوا کچھ دکھائی نہیں دیا۔ درختوں کے بیچ میں بل کھاتی ہوئی ایک پگڈنڈی سی بنی ہوئی تھی۔کچھ فاصلے پر کچی اینٹوں کا ایک مکان تھا۔

''سائیں یار محمد!'' ایک آدمی نے اس شخص کو مخاطب کیا جو ان کا سرغنہ لگ رہا تھا۔مراد کو بھی پہلی دفعہ اس کا نام معلوم ہوا۔

''کیا ہے؟'' یار محمد نے کرخت لہجے میں پوچھا۔

''سائیں، اس چھوکری کے موبائل کی گھنٹی بج رہی ہے۔''

''تو نے موبائل فون بند نہیں کیا تھا؟'' یار محمد دہاڑا۔ ''بند کر اسے فوراً۔''

پھر وہ مراد اور ثمرین کو اس کچے مکان میں لے آیا، مکان کیا، کچی اینٹوں کے دو کمرے تھے اور اوپر گھاس پھوس کی چھت تھی۔ کمرے کے فرش پر پیال کا ڈھیر تھا۔ وہاں صرف پانی کا ایک گھڑا اور مٹی کا کوزہ رکھا ہوا تھا۔

''بابا، تم لوگ ابھی ادھر آرام کرو۔ اگر تم نے ہماری بات مانی تو تمہارے ساتھ کوئی زیادتی نہیں ہوگی۔''

''میرا سامان یہاں بھجوا دو۔ اس میں کچھ کھانے کا سامان اور کافی کا تھرماس ہے۔''

''اڑے بابا سائیں، تم فکر مت کرو، ابھی سومر دودھ پتی کی اسپیشل چائے بنا کر لائے گا۔ بسکٹ اور پیسٹری بھی ہے۔تم لوگوں کو کھانے کی کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔ ہاں، ادھر بستر نہیں ہے، تم لوگوں کو اسی پیال پر لیٹنا پڑے گا۔'' پھر اس نے جیب سے سیل فون نکالا اور نمبر ڈائل کر کے بولا۔

''سائیں، کام ہوگیا۔ وہ دونوں اب ہمارے قبضے میں ہیں۔ اچھا سائیں، ابھی بات کرتا ہوں، ...... کتنی ڈیمانڈ......؟ ٹھیک ہے سائیں۔''

ثمرین سردی سے کانپ رہی تھی۔ مراد نے اپنی جیکٹ اتار کر اسے پہنادی اور اس کی شال اس کے سر اور کانوں پر لپیٹ دی۔ گاڑی سے اتارنے کے بعد ان لوگوں نے مراد کے ہاتھ بھی کھول دیے تھے۔

تھوڑی دیر بعد سومر واقعی گرما گرم چائے اور بسکٹ کے پیکٹ لے آیا۔ اس شدید سردی میں مراد کو چائے بھی نعمتِ غیر مترقبہ لگ رہی تھی۔

☆☆☆

''مراد اب تک حیدر آباد تو پہنچ گیا ہوگا۔'' مراد کی والدہ صفیہ بیگم نے شوہر سے پوچھا۔

مراد کے والد سیٹھ ایاز اس وقت لیپ ٹاپ پر مصروف تھے۔ انہوں نے اسکرین سے نظریں ہٹائے بغیر کہا۔''وہاں پہنچ کر وہ لوگ آرام کررہے ہوں گے۔ ٹیلی فون بھی آجائے گا، ایسی بھی کیا پریشانی ہے۔''

''پریشانی تو ہے۔'' صفیہ بیگم نے کہا۔''میں نے کچھ دیر پہلے ثمرین کو کال کی تھی، گھنٹی بجتی رہی لیکن اس نے کال ریسیو نہیں کی۔ میں نے دوبارہ کال کی تو اس کا موبائل بند تھا۔''

سیٹھ ایاز مسکرانے لگے۔''صفیہ بیگم، وہ لوگ ہنی مون پر گئے ہیں۔ انہیں انجوائے کرنے دو۔ مراد خود ہی کال کرے گا۔''

اچانک سیٹھ ایاز کے سیل فون کی گھنٹی بجی۔ انہوں نے سیل فون کے اسکرین پر نظر ڈالی اور مسکرا کر بولے۔

''تمہارے لاڈلے کی کال آگئی۔''

''اللہ، تیرا شکر ہے۔'' صفیہ بیگم نے کہا اور شوہر کو دیکھنے لگیں۔

ایاز نے کال ریسیو کی اور بولے۔''یار، تم کہاں ہو، کم سے کم اپنی ماں کو ایک کال تو کرلیتے ......کیا......کون بول رہا ہے؟......مراد کہاں ہے؟''

''مراد جہاں بھی ہے ابھی تک خیریت سے ہے۔'' دوسری طرف سے یار محمد کی کرخت آواز سنائی دی۔

''اور ثمرین...... میرا مطلب ہے میری بہو؟'' ایاز صاحب سے گھبراہٹ میں بات نہیں ہو پارہی تھی۔

''وہ بھی ابھی تک بالکل خیریت سے ہے۔'' یار محمد نے درشت لہجے میں کہا۔

''تم لوگ کون ہو اور کیا چاہتے ہو؟'' ایاز صاحب نے پوچھا۔

''اتنی جلدی مت کرو سائیں۔'' یار محمد نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ سب کچھ بتا دیں گے..... آپ ہماری دوسری کال کا انتظار کرو۔ ہاں، پولیس کو اس چکر میں مت گھسیٹنا ورنہ آپ کو اپنے بہو اور بیٹے کی لاشیں ملیں گی۔'' یہ کہہ کر یار محمد نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

ایاز سیٹھ ہیلو..... ہیلو ہی کرتے رہ گئے۔

''کون تھا؟'' صفیہ بیگم نے کانپتی ہوئی آواز میں پوچھا۔ شوہر کی یکطرفہ گفتگو سے وہ سمجھ تو گئی تھیں کہ معاملہ سنگین ہے۔

''حوصلہ رکھنا بیگم۔'' ایاز صاحب نے کہا۔ ''کسی نے مراد اور ثمرین کو اغوا کر لیا ہے۔''

''اغوا کر لیا ہے۔'' صفیہ بیگم نے سنا اور غش کھا کر صوفے پر ہی ڈھیر ہو گئیں۔ وہ گہرے گہرے سانس لے رہی تھیں جیسے میلوں سے بھاگتی چلی آ رہی ہوں۔

ایاز صاحب نے ان کے چہرے پر پانی کے چھینٹے مارے تو انہوں نے آہستہ آہستہ آنکھیں کھول دیں اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے کمرے کی چھت کو گھورنے لگیں۔ پھر وہ کانپتی ہوئی آواز میں بولیں۔ ''نہ جانے اس وقت مراد کا کیا حال ہوگا؟''

''مراد اور ثمرین بالکل خیریت سے ہیں۔ میں نے پہلے ہی کہا تھا کہ حوصلہ رکھنا۔ اغوا کرنے والے تاوان کے لیے اغوا کرتے ہیں۔ وہ مراد اور ثمرین کو اس وقت تک کوئی نقصان نہیں پہنچائیں گے جب تک انہیں تاوان کی رقم ملنے کی امید ہوگی۔'' سیٹھ ایاز نے ان کو تسلی دی۔

''تم اٹھ کر بیٹھو۔ میں تمہارے لیے چائے منگواتا ہوں۔ تمہارا تو پورا جسم سرد ہو رہا ہے۔'' ایاز صاحب نے ملازم کو آواز دے کر چائے لانے کو کہا اور بولے۔ ''دیکھو، گھر کے کسی ملازم کو بھی اس واقعے کا علم نہیں ہونا چاہیے۔ زیادہ باتیں ملازمین ہی کے ذریعے پھیلتی ہیں۔''

اسی وقت کمرے کا دروازہ کھلا اور سجاد مسکراتا ہوا اندر داخل ہوا۔ اس نے حسبِ عادت بلند آواز میں کہا۔

''السلام علیکم ایوری باڈی۔''

''وعلیکم السلام!'' ایاز صاحب بجھے بجھے لہجے میں بولے۔

سجاد ان دونوں کو دیکھ کر ایک ہی نظر میں بھانپ گیا کہ کوئی نہ کوئی گڑبڑ ہے۔ اس نے ایاز صاحب سے پوچھا۔

''کیا بات ہے انکل، سب خیریت تو ہے؟''

مجھے پتا ہے کہ آپ دونوں کھانا کھائے بغیر نہیں جائیں گے۔

میری ماما کچن میں شور باپتلا کر رہی ہیں

''ہاں، بیٹا سب خیریت ہے۔'' ایاز صاحب نظریں چراتے ہوئے بولے۔

''آنٹی۔'' اس نے صفیہ بیگم کو مخاطب کیا۔ ''آپ بتائیں آخر بات کیا ہے۔ میں تو اس گھر کے ایک فرد کی طرح ہوں۔ ایسی کون سی بات ہے جو آپ لوگ مجھ سے بھی چھپا رہے ہیں۔''

''ارے بیٹا غضب ہو گیا..... وہ......''

''صفیہ بیگم۔'' ایاز صاحب نے انہیں ٹوکا۔ ''ایسی کوئی بات نہیں ہے کہ سجاد کو پریشان کیا جائے۔'' انہیں فون پر ملنے والی دھمکی یاد تھی کہ اس معاملے میں پولیس کو نہ گھسیٹا جائے۔ سجاد بہرحال ایک پولیس آفیسر تھا۔

''آپ سجاد سے کیا چھپا رہے ہیں؟'' صفیہ بیگم نے کہا پھر وہ روہانسی ہو کر بولیں۔ ''سجاد بیٹا! مراد اور ثمرین کو کچھ لوگوں نے اغوا کر لیا ہے۔''

''اغوا کر لیا ہے؟'' سجاد چونک کر بولا۔ ''کب...... اور یہ بات آپ مجھے اب بتا رہے ہیں۔''

''ابھی تمہارے آنے سے پہلے ہی ان لوگوں نے فون کیا تھا۔'' ایاز صاحب نے کہا۔ ''انہوں نے دھمکی دی تھی کہ پولیس کو اس معاملے میں انوالو مت کرنا ورنہ مراد اور ثمرین کی جان جا سکتی ہے۔''

''کس نمبر سے کال آئی تھی؟'' سجاد نے پوچھا۔ ''مجھے وہ نمبر بتائیں۔''

''ان لوگوں نے مراد ہی کا سیل فون استعمال کیا تھا۔ میں تو یہی سمجھا تھا کہ کال مراد کی ہے۔''

''آپ پریشان نہ ہوں۔ میں ان لوگوں کو بھی نہیں چھوڑوں گا اور مراد اور ثمرین پر بھی آنچ نہیں آئے گی۔'' پھر وہ کچھ سوچ کر بولا۔ ''آپ کے گھر میں کتنے سیل فون اور لینڈ لائن ٹیلی فون ہیں؟''

''میرے پاس دو سیل فون ہیں، ایک سیل فون تمہاری آنٹی کا ہے اور دو لینڈ لائن ٹیلی فون ہیں۔''

''ان کے علاوہ گھر کے ملازمین کے پاس بھی سیل فون ہوں گے؟'' سجاد نے پوچھا۔

''ہاں، میرا خیال ہے کہ ہمارے مالی کے علاوہ سب کے پاس سیل فون ہیں۔'' ایاز صاحب نے کہا۔

''گھر میں جتنے بھی ملازمین ہیں سب کو فوری طور پر ڈرائنگ روم میں بلوالیں۔''

''تم آخر کرنا کیا چاہتے ہو؟'' صفیہ بیگم نے پوچھا۔

''آنٹی پلیز، مجھے اپنا کام کرنے دیں۔'' سجاد نے سرد لہجے میں کہا۔ ''اور مجھے اپنے سیل فونز اور لینڈ لائن فونز کے نمبر لکھ کر دے دیں۔ میں یہ سارے نمبر ابھی آبزرویشن پر لگا دیتا ہوں۔''

''بیٹا، اس سے کہیں مراد اور ثمرین کو......''

''آپ فکر مت کریں آنٹی!'' سجاد نے پُریقین لہجے میں کہا۔ ''میں چوبیس گھنٹے کے اندر اندر اغوا کرنے والوں تک پہنچ جاؤں گا۔''

''امیر علی۔'' ایاز صاحب نے ملازم کو آواز دی۔ ''سب نوکروں سے کہہ دو کہ برآمدے میں جمع ہو جائیں۔ مجھے ان لوگوں سے کوئی ضروری بات کرنا ہے۔''

سجاد نے اپنا سیل فون نکالا اور نمبر ملا کر بولا۔ ''افتخار! میں سیٹھ ایاز کے بنگلے سے بول رہا ہوں۔ تم اپنی پوری آئی ٹی کی کٹ لے کر بیس منٹ کے اندر یہاں پہنچ جاؤ۔''

اچانک ایاز صاحب کے فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ یہ کال لینڈ لائن پر آرہی تھی۔ سجاد نے اٹھ کر نمبر دیکھا اور خود کلامی کے انداز میں بولا۔ ''یہ کال تو کسی لینڈ لائن نمبر سے کی جارہی ہے اور نمبر بھی جیل روڈ کے علاقے کا ہے۔ آپ کال ریسیو کریں۔'' یہ کہہ کر سجاد نے فون کا اسپیکر آن کر دیا۔

''ہیلو!'' ایاز صاحب نے کہا۔

''آپ سیٹھ ایاز بول رہے ہیں؟'' دوسری طرف سے کوئی انتہائی سرد لہجے میں بولا۔

''جی ہاں، بول رہا ہوں۔'' ایاز صاحب نے کہا۔

''میں لیاقت نیشنل اسپتال سے بول رہا ہوں۔ آپ کا ایک گارڈ حمزہ خان ایک حادثے میں زخمی ہو گیا ہے۔ وہ اس وقت یہاں موجود ہے۔''

''حمزہ خان زخمی ہے۔'' ایاز صاحب نے پوچھا۔ ''اس کی حالت اب کیسی ہے؟''

اس کے دائیں شانے اور پیر میں گولیاں لگی ہیں۔ زخم اتنے مہلک نہیں ہیں لیکن اس کا خون بہت ضائع ہو گیا ہے ویسے اس کی حالت اب خطرے سے باہر ہے۔''

''بہت شکریہ۔'' ایاز صاحب نے کہا۔ ''میں ابھی کسی کو بھیجتا ہوں۔'' پھر وہ سجاد سے مخاطب ہوئے۔ ''حمزہ ان گارڈز میں سے ایک ہے جو مراد کے ساتھ گئے تھے۔''

''کیا وہ دونوں مراد ہی کی گاڑی میں تھے؟''

''نہیں، وہ مراد کے پیچھے دوسری گاڑی میں تھے۔''

ملازم اسی وقت چائے لے آیا اور ان لوگوں کو چائے دے کر بولا۔ ''صاحب جی! میں نے سب نوکروں کو برآمدے میں جمع کر لیا ہے۔''

''ٹھیک ہے میں ابھی آتا ہوں۔'' ایاز صاحب نے کہا۔

چائے پینے کے بعد وہ لوگ برآمدے میں آگئے۔ گرم کمرے سے باہر نکلتے ہی یخ بستہ ہوا نے ان کا استقبال کیا۔ تمام ملازم اسی سرد موسم میں کھڑے سردی سے کانپ رہے تھے۔ وہ سب حیران تھے کہ بڑے صاحب نے اس وقت ان سب کو کیوں طلب کیا ہے؟

''تم لوگ ذرا اپنے اپنے موبائل فون نکال لو۔'' سجاد نے کہا۔

ان سب نے حیرت سے سجاد کو دیکھا، پھر ایک دوسرے پر نظر ڈالی اور اپنی جیبوں سے موبائل فون نکال لیے۔

سجاد نے سب سے موبائل فون لے کر ایک شاپر میں ڈال لیے۔ ان میں سے دو ملازمین کے پاس سیل فون نہیں تھے۔

''تمہارا سیل فون کہاں ہے؟'' سجاد نے ایک ملازم سے پوچھا۔

''میرا سیل فون کوارٹر میں ہے صاحب۔'' ملازم نے جواب دیا۔

''اسے ابھی جا کر لے آؤ۔'' سجاد نے اسے حکم دیا پھر دوسرے ملازم سے مخاطب ہوا۔ ''تم نے بھی اپنا سیل فون نہیں دیا؟''

''یہ میرا امالی عبدالرحیم ہے۔'' ایاز صاحب نے کہا۔
''اس کے پاس سیل فون نہیں ہے۔''
''بغیر سیل فون کے تمہارا کام چل جاتا ہے؟'' سجاد نے پوچھا۔
''کام تو چل ہی جاتا ہے جی۔'' عبدالرحیم نے جواب دیا۔ ''کوئی بہت ضروری بات کرنا ہو تو میں اپنی بیٹی کے موبائل سے یا پھر گھر کے فون سے کر لیتا ہوں۔''
''تمہاری بیٹی کے پاس موبائل ہے؟'' سجاد نے پوچھا۔
''موبائل تو آج کل بچے بچے کے پاس ہے۔ بڑے صاحب نے میٹرک پاس کرنے پر اسے موبائل دیا تھا۔'' عبدالرحیم نے کہا۔
''اس کا موبائل بھی لے آؤ۔'' سجاد نے سرد لہجے میں کہا پھر بولا۔ ''تم میں سے اور کسی کے پاس کوئی دوسرا موبائل ہو تو وہ بھی لے آؤ۔''
جواب میں وہ سب خاموش رہے۔
سجاد نے سارے موبائل سمیٹے اور ان سب سے کہا۔ ''اب تم لوگ جاؤ۔ کل تک تمہارے موبائل فون تمہیں مل جائیں گے۔'' وہ سب جانے لگے تو سجاد نے امیر علی سے کہا۔ ''عبدالرحیم آئے تو اسے ڈرائنگ روم میں بھیج دینا۔''
تھوڑی دیر میں عبدالرحیم کمرے میں داخل ہوا۔ اس کے پیچھے جو لڑکی تھی وہ بہت زیادہ حسین تو نہیں تھی لیکن اس کے چہرے میں عجیب قسم کی کشش تھی، اس کا متناسب جسم گویا سانچے میں ڈھلا ہوا تھا۔
''یہ میری بیٹی ہے صاحب۔'' عبدالرحیم نے سجاد سے کہا۔
لڑکی نے اسے سلام کیا، پھر آہستہ سے بولی۔ ''ایس ایس پی صاحب! سیل فون اور ڈائری انسان کی انتہائی ذاتی چیزیں ہوتی ہیں۔ آپ کس قانون کے تحت میرا سیل فون مانگ رہے ہیں؟''
''تمیز سے بات کرو غزالہ!'' ایاز صاحب نے درشت لہجے میں کہا۔
''غزالہ کا سوال درست ہے انکل۔'' سجاد نے مسکرا کر کہا۔ ''ویسے تو مجھے حق نہیں ہے کہ میں تمہارا سیل فون اپنے قبضے میں رکھوں لیکن کچھ قانونی تقاضے پورے کرنے کے لیے مجھے ایسا کرنا پڑ رہا ہے۔''
''اٹس او کے آفیسر۔'' غزالہ نے ہنس کر کہا۔
''گڈ گرل!'' سجاد مسکرایا۔

عبدالرحیم، غزالہ کو لے کر رخصت ہو گیا۔
اسی وقت آئی ٹی کا ماہر افتخار اپنے ساز و سامان کے ساتھ وہاں آ گیا۔ اس کے ساتھ اس کی اسسٹنٹ شائستہ بھی تھی۔ انہوں نے ڈرائنگ روم ہی کے ایک گوشے میں اپنا مانیٹر اور دوسری ڈیوائسز لگا دیں۔
سجاد نے اسے ایاز صاحب کے دونوں لینڈ لائن نمبر اور تینوں سیل نمبر دیے اور بولا۔ ''ان سب نمبروں کو آبزرویشن پر لگا دو۔ ان پر آنے والی ہر کال کو ریکارڈ بھی کرنا ہے اور اسے ٹریک بھی کرنا ہے۔''
''او کے سر۔'' افتخار نے مستعدی سے جواب دیا۔
افتخار اور شائستہ کچھ دیر اپنی ڈیوائسز سے الجھے رہے پھر افتخار نے کہا۔ ''سر! میں نے آپ کے دیے ہوئے ہر نمبر کو آبزرویشن پر لگا دیا ہے۔''
''ریکارڈنگ کا انتظام بھی ہو گیا ہے اور کال ٹریکنگ کا بھی۔'' شائستہ نے کہا۔
''میں نے آپ کے تمام ملازموں کے سیل فون اس لیے قبضے میں لیے ہیں کہ اغوا کرنے والے مراد کے سیل فون سے کسی ملازم کے نمبر پر بھی کال کر سکتے تھے۔ اتنا تو وہ بھی جانتے ہوں گے کہ میں مراد کا دوست ہوں اور ان کی دھمکی کے باوجود آپ کی مدد ضرور کروں گا۔ وہ کسی بھی ملازم کے سیل فون پر رابطہ کر سکتے تھے۔ اب میں نے تمام ملازموں کے سیل فون بند کر دیے ہیں۔''
اچانک ایاز صاحب کے سیل فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ افتخار اور شائستہ نے جلدی سے ہیڈ فون کانوں پر چڑھائے اور اس بورڈ کی طرف متوجہ ہو گئے جس پر زگ زیگ کی شکل میں لکیریں متحرک تھیں۔
''السلام علیکم سیٹھ صاحب۔'' ایک آواز گونجی۔
''وعلیکم السلام، اسلام صاحب۔'' ایاز صاحب نے کہا۔ ''آپ نے اس وقت زحمت کیسے کی؟''
''مجھے ابھی ابھی ثمرین کے سیل فون سے ایک کال موصول ہوئی ہے۔ وہ کہہ رہا تھا کہ ہم نے آپ کی بیٹی اور داماد کو اغوا کر لیا ہے، کیا آپ کو......''
''اسلام صاحب!'' ایاز صاحب نے کہا۔ ''مجھے بھی ایک کال موصول ہوئی ہے لیکن آپ گھبرائیں مت، یہ مراد کے کسی دوست کی شرارت بھی ہو سکتی ہے۔ آپ ایسا کریں، بھابی کو لے کر یہیں آ جائیں۔''
''میں ابھی آ رہا ہوں۔'' اسلام صاحب کی گھبرائی ہوئی آواز سنائی دی۔

سجاد نے دل ہی دل میں خود کو ملامت کی کہ اسے پہلے ثمرین کے والدین کا خیال کیوں نہیں آیا۔ اس نے ایاز صاحب سے پوچھا۔ ''انکل، کیا ثمرین بھائی کے بھائی بہن بھی ہیں؟''

''اس کے دو بھائی ہیں اور دونوں امریکا میں سیٹل ہیں۔ ثمرین اکلوتی بیٹی ہے۔''

سجاد نے سکون کا سانس لیا ورنہ اسے مزید فون نمبرز آبزرویشن پر لگانا پڑتے۔

تھوڑی دیر بعد ثمرین کے والدین بھی بوکھلائے ہوئے وہاں آگئے۔ جب اسلام صاحب کو یہ معلوم ہوا کہ سجاد کا تعلق پولیس سے ہے تو وہ بہت جزبز ہوئے اور بولے۔ ''ایاز صاحب! اغوا کرنے والوں نے دھمکی دی ہے کہ پولیس کو اس کیس میں انوالو کیا تو انجام بہت بُرا ہو گا۔''

''سجاد، مراد کا دوست ہے اسلام صاحب۔'' ایاز صاحب نے کہا۔ ''آپ پریشان نہ ہوں۔ ان کی دھمکی صرف دھمکی ہوتی ہے، انہیں صرف اور صرف تاوان کی رقم سے غرض ہوتی ہے۔'' یہ کہتے ہوئے ایاز صاحب کا لہجہ ان کے الفاظ کا ساتھ نہیں دے رہا تھا۔ وہ تو خود سجاد کو ملوث کرنے کے حق میں نہیں تھے۔

☆☆☆

''ارے سومر!'' یار محمد نے سومر کو آواز دی جو ایک درخت کی اونچی سی شاخ پر بیٹھا ہوا تھا۔ ''سائیں کی گاڑی نظر آئی؟''

''نہیں سائیں، ابھی تک تو......'' پھر وہ جملہ ادھورا چھوڑ کر بولا۔ ''سائیں ایک گاڑی کی لائٹ نظر تو آ رہی ہے۔''

''بابا، جلدی بتا، وہ کون سی گاڑی ہے۔ کسی اور کی گاڑی تو نہیں ہے۔''

''نہیں سائیں، میں سائیں کی گاڑی کی لائٹ پہچانتا ہوں۔''

چند منٹ بعد وہ گاڑی نزدیک آگئی۔ اس کے انجن کی آواز بھی واضح طور پر سنائی دے رہی تھی۔ یار محمد نے احتیاط کے طور پر اپنے تینوں ساتھیوں کو ایسی پوزیشن میں بٹھایا تھا کہ کسی خطرے کی صورت میں وہ حملہ آور کا بھرپور مقابلہ کر سکیں۔

گاڑی اس کچے مکان کے سامنے آ کر رکی تو یار محمد کے تنے ہوئے اعصاب ڈھیلے پڑ گئے۔ آنے والی گاڑی ... طاقت ور انجن والی جیپ تھی۔ اس میں سے جو شخص اترا، وہ خاصا دراز قد اور جامہ زیب تھا۔ اس نے سفید براق کاٹن کی کلف دار شلوار قمیص پہن رکھی تھی۔ پیروں میں انتہائی قیمتی لیدر کے امپورٹڈ جوتے تھے اور اس نے اپنے جسم کے گرد انتہائی قیمتی شال لپیٹ رکھی تھی۔

''یار محمد نے آگے بڑھ کر اس کے پاؤں چھوئے اور ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا۔

''بابا یار محمد! کیا حال ہے ہمارے مہمانوں کا؟''

''ابھی تک تو مزے میں ہیں سائیں۔'' یار محمد نے کہا۔

''اس کے باپ سے بات کی؟'' آنے والے نے پوچھا۔

''جی سائیں! میں نے ابھی صرف اطلاع دی ہے۔''

وہ باتیں کرتا ہوا اس کمرے میں آ گیا جہاں مراد اور ثمرین کو رکھا گیا تھا۔ کمرے میں ایک طرف لالٹین لٹک رہی تھی۔ اس کی زرد اور ناکافی روشنی میں مراد اور ثمرین کے چہرے بھی زرد نظر آ رہے تھے۔ لیکن وہ دونوں جاگ رہے تھے۔

''کیا حال ہے مراد صاحب؟'' آنے والے نے پوچھا۔

''تمہارے سامنے ہی ہے۔'' مراد نے تلخی سے جواب دیا۔

''ہم نے تمہارے باپ سے منع بھی کیا تھا کہ پولیس کو اس کیس میں انوالومت کرنا، اس کے باوجود وہ ایس ایس پی تمہارے گھر بیٹھا ہے۔''

''وہ ایس ایس پی میرے بچپن کا دوست ہے اور اکثر ہمارے گھر آتا رہتا ہے۔'' مراد نے کہا۔

''ویسے ہمیں اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔'' آنے والے نے کہا۔ ''تمہارا باپ اگر پورے صوبے کی پولیس فورس بھی اکٹھی کر لے تو شہباز کی گرد کو بھی نہیں پہنچ سکتا۔''

''اچھا، تم شہباز ہو؟'' مراد چونک کر بولا۔ ''میں یہی سوچ رہا تھا کہ تمہاری شکل کچھ جانی پہچانی سی کیوں لگ رہی ہے۔'' مراد نے اسے غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

شہباز بُری طرح چونک اٹھا۔ ''تم مجھے کیسے جانتے ہو؟''

''میں نے شاید تمہیں کراچی ... جیم خانہ میں دیکھا ہے۔''

''کراچی جیم خانہ۔'' شہباز تلخی سے ہنس کر بولا۔
''میں نے تو کبھی کراچی جیم خانے کی شکل بھی نہیں دیکھی۔''
''تو پھر مجھے غلط فہمی ہوئی ہوگی۔'' مراد نے کہا۔
اچانک شہباز نے لہجہ بدل کر درشت انداز میں کہا۔
''مجھے باتوں میں لگا کر وقت ضائع مت کر۔ اپنا سیل فون مجھے دے۔ میں ڈائریکٹ اس ایس ایس پی کو کال کرتا ہوں جس کی کامیابیوں کے جھنڈے گڑے ہوئے ہیں۔''
اس کا سیل فون تو سائیں میرے پاس ہے۔'' یار محمد نے سیل فون نکال کر شہباز کو دے دیا۔
''ستر ستر ہزار روپے کے سیل فون رکھتے ہو، اور تمہارے ہی شہر کے لاکھوں لوگوں کو ایک وقت کی روٹی بھی نہیں ملتی۔'' شہباز نے تلخی سے کہا اور سجاد کا نمبر سرچ کرنے لگا۔ پھر اس نے نمبر ڈائل کر کے اسپیکر فون آن کر دیا۔ دوسری طرف دوسری ہی گھنٹی پر کال ریسیو کر لی گئی اور سجاد کی آواز سنائی دی۔ ''ہیلو۔''
''تو بہت بڑا سراغ رساں بن کر بیٹھا ہے نا، تو کیا سمجھتا ہے میں تجھ سے ڈر جاؤں گا؟''
''کون بول رہا ہے؟'' سجاد نے رسان سے پوچھا۔
''تو اتنا بھولا تو نہیں ہے۔'' شہباز نے کہا ''کہ تو یہ نہ سمجھ سکے کہ یہ کال کون کر رہا ہے۔ تیرا دوست اور اس کی خوب صورت بیوی میرے قبضے میں ہیں۔'' اس نے لفظ 'خوب صورت' پر زور دے کر کہا۔
''ہاں، مجھے تمہاری ہی کال کا انتظار تھا۔ بولو تمہیں کیا چاہیے؟''
''ان دونوں کی زندگی کے صرف دس کروڑ۔'' شہباز خان نے یوں کہا جیسے دس ہزار روپے کی بات کر رہا ہو۔ ''وہ بھی کل صبح تک۔''
''تم ہوش میں تو ہو؟'' سجاد غرایا۔ ''اس وقت رات کے ڈھائی بجے ہیں۔ صبح تک دس کروڑ کا بندوبست کیسے ہو سکتا ہے۔ تم ایاز صاحب سے بات کرو۔'' اس نے سیل فون ایاز صاحب کو دے دیا تھا۔
فوراً ہی ان کی بھرائی ہوئی آواز سنائی دی۔ ''میں جانتا ہوں۔ تم نے مراد کو اغوا کرنے سے پہلے ہوم ورک بھی کیا ہوگا۔ تم یہ بھی جانتے ہو کہ ارب پتی ہونے کے باوجود میں فوری طور پر دس کروڑ روپے کا بندوبست نہیں کر سکتا۔ مجھے کم سے کم ایک دن کی تو مہلت دو۔''
''تا کہ چوبیس گھنٹے میں تمہارا یہ ذہین اور قابل سراغ رساں ہمارا سراغ لگا کر ہم تک پہنچ جائے۔ نو، میں یہ رسک نہیں لے سکتا۔''
''کل تک میرے اکاؤنٹ میں پچیس کروڑ تھے۔'' ایاز نے کہا۔ ''لیکن میں نے کل ہی ایک پارٹی کو پے منٹ کر دی۔''
''مجھے کہانیاں مت سناؤ۔'' شہباز نے درشت لہجے میں کہا۔ ''تم لوگ اپنی بہو کے والدین سے بات کرو۔ وہ بھی کوئی کنگلے نہیں ہیں۔''
''میں ثمرین کا باپ بول رہا ہوں بیٹا۔'' اسلام صاحب نے کہا۔ ''بیٹا! میرے ساتھ بھی یہی صورت حال ہے۔ مجھے بھی کم سے کم چوبیس گھنٹے کی مہلت چاہیے۔''
''آپ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ مجھے بے وقوف بنا لیں گے۔ میں مان ہی نہیں سکتا کہ آپ کے اکاؤنٹ میں پیسے نہ ہوں۔'' شہباز نے تلخی سے کہا۔
''دیکھو بیٹا! اولاد سے زیادہ دنیا میں کوئی چیز عزیز نہیں ہوتی۔ میں تم سے جھوٹ کیوں بولوں گا۔''
''دیکھو، مجھے بیٹا بیٹا کہہ کر اپنائیت ظاہر کرنے کی کوشش مت کرو۔ دوسری بات یہ کہ اگر تمہارا وہ ذہین ایس ایس پی یہ کوشش کر رہا ہے کہ وہ میری لوکیشن معلوم کر لے گا تو اسے ناکامی ہوگی۔ میں ابھی دس منٹ بعد یہاں سے روانہ ہو جاؤں گا۔ ہم لوگ اغوا کرنے کے بعد کہیں ٹک کر نہیں بیٹھتے۔ اس سے نقصان تم ہی لوگوں کا ہوتا ہے۔ ہم مغویوں کو اپنے ساتھ پیدل لے جاتے ہیں۔ تمہاری بیٹی ان پتھریلے اور خاردار راستوں پر چلنے کی عادی نہیں ہے۔ اب تم خود سوچ لو کہ اس کا کیا حشر ہوگا۔''
''میری بات تو سنو۔'' اسلام صاحب نے کچھ کہنا چاہا۔
شہباز نے ان کی بات کاٹ دی اور بولا۔ ''میں آدھے گھنٹے بعد کال کروں گا۔ مجھے یہاں بیٹھے بیٹھے معلوم ہو جائے گا کہ تم لوگ رقم کا بندوبست کر رہے ہو یا مجھے تلاش کرنے کی کوشش کر رہے ہو؟ پھر میں رقم کا مطالبہ نہیں کروں گا بلکہ خود اس جگہ کی نشاندہی کروں گا جہاں تمہیں اپنے بچوں کی لاشیں ملیں گی۔'' یہ کہہ کر اس نے کہا۔ ''تم اگر میری بات کو جھوٹ سمجھ رہے ہو تو خود ہی اپنے بچوں سے بات کر لو۔ ابھی تو میں نے انہیں کچھ بھی نہیں کہا ہے لیکن اب ان کا وہ حشر کروں گا کہ تم نے سوچا بھی نہ ہوگا۔ میرے پاس اس وقت آٹھ آدمی ہیں اور تمہاری بیٹی ضرورت سے زیادہ ہی خوب صورت ہے۔'' اس نے سیل فون ثمرین کے حوالے کر دیا۔

دوسرے ہی لمحے ثمرین کی آواز آئی۔ ''ڈیڈی! یہ لوگ بہت خطرناک ہیں۔ ابھی تک تو ان لوگوں نے ہمیں کوئی نقصان نہیں پہنچایا ہے لیکن......''

''ثمرین بیٹا تم فکرمت کرو۔'' ایاز صاحب نے کہا۔ ''سیل فون مراد کو دو۔''

''مراد اس وقت بات کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہے بابا۔'' ثمرین نے کہا۔ ''ان لوگوں نے اس کے منہ میں کپڑا ٹھونس رکھا ہے۔''

''سن لیا تم نے۔'' فون پر پھر شہباز کی آواز ابھری۔ میں اب آدھے گھنٹے بعد کال کروں گا۔'' یہ کہہ کر اس نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

☆☆☆

سجاد بری طرح تلملا رہا تھا۔ اس نے سب لوگوں کے سیل فون آبزرویشن پر لگا دیے تھے لیکن اپنا سیل فون نہیں لگایا تھا۔ اسے امید نہیں تھی کہ اغوا کرنے والے اسی کے سیل فون پر کال کرلیں گے۔ ایاز صاحب، صفیہ بیگم اور ثمرین کے والدین اسے ناگواری سے دیکھ رہے تھے جیسے مراد اور ثمرین کے اغوا کا ذمے دار وہی ہو۔

''کبھی کبھی انسان کی ذہانت اور خوش فہمی اسے لے ڈوبتی ہے۔'' ایاز صاحب نے کہا۔ ''وہ خود تو ڈوبتا ہی ہے، دوسروں کو بھی ڈبو دیتا ہے۔''

''انکل! مراد میرا بچپن کا دوست ہے۔'' سجاد نے کہا۔ ''میں اس کا برا کیوں چاہوں گا۔ میں ابھی مایوس نہیں ہوا ہوں۔ میں......''

''بیٹا، تم تو اب رہنے ہی دو۔ ہم ان لوگوں کو پیسے دے دیں گے۔ یہ پیسا کسی دن کام آئے گا اور یہ ہمارے بچوں کی جان سے زیادہ قیمتی تو نہیں ہے۔'' صفیہ بیگم نے ناگواری سے کہا۔ ''تم نے تو بڑے طمطراق سے یہ سازوسامان اکٹھا کیا تھا۔ بہت زیادہ مستعدی دکھائی تھی۔ اس کا نتیجہ کیا نکلا؟ ان لوگوں نے تمہاری ہی آنکھوں میں دھول جھونک دی۔''

''ایسی بات نہیں ہے آنٹی۔'' پھر وہ افتخار سے مخاطب ہوا۔ ''افتخار کیا رپورٹ ہے؟''

''سر! آپ کے سیل فون پر کال کرنے والا یہاں سے تقریباً ایک سو پچاس اور ایک سو ستر کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔ اگر ہم شمال کی طرف سفر کریں تو بالکل درست لوکیشن معلوم ہوسکتی ہے۔''

''اس وقت تک وہ لوگ کہیں سے کہیں نکل جائیں گے۔'' ایاز صاحب نے کہا۔

''انکل، مجھے ایک شبہ اور بھی ہے۔'' سجاد نے کہا۔ ''یہاں کوئی ایسا ہے جو اغوا کرنے والوں کو یہاں کی خبریں پہنچا رہا ہے؟''

''یہ تم بعد میں معلوم کرتے رہنا۔ ابھی تو ہمیں اپنے بچوں کی جان بچانا ہے۔''

اچانک ایاز صاحب کے ٹیلی فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ سجاد چونک کر بولا۔ ''یہ ان ہی لوگوں کا فون ہوگا۔ اس مرتبہ ان لوگوں نے سیل فون کے بجائے لینڈ لائن پر کال کی ہے۔''

''سر! نمبر بھی کسی لینڈ لائن ہی کا ہے۔'' شائستہ نے کہا۔

ایاز صاحب نے بٹن دبا کر کال ریسیو کرتے ہوئے کہا۔ ''ہیلو۔''

''پھر تم لوگوں نے کیا فیصلہ کیا۔ اب صبح ہونے میں زیادہ دیر نہیں ہے۔ مجھے صبح تک رقم چاہیے۔''

''تم شاید یقین نہیں کرو گے، اس وقت میرے اکاؤنٹ میں ڈیڑھ کروڑ روپے سے زیادہ کی رقم نہیں ہے۔''

''اپنے سمدھی سے پوچھو۔'' شہباز نے درشت لہجے میں کہا۔

''میرے اکاؤنٹ میں بھی اس وقت ایک کروڑ ہی ہوں گے۔'' اسلام صاحب نے کہا۔

''میں اب تم لوگوں کو آدھے گھنٹے بعد کال کروں گا۔'' شہباز نے کہا اور سلسلہ منقطع کر دیا۔

اسی وقت ملازم نے اطلاع دی کہ کوئی پولیس افسر ایس پی صاحب سے ملنا چاہتا ہے۔

وہ انسپکٹر فرید تھا۔ سجاد نے اسے زخمی گارڈ کا بیان لینے بھیجا تھا۔

''سر! گارڈ نے بتایا ہے کہ سپر ہائی وے پر تھانہ بولان خان کے نزدیک ایک ڈبل کیبن پک اپ سے ان پر فائرنگ کی گئی۔''

''اس نے پک اپ کا نمبر نوٹ کیا؟'' سجاد نے پوچھا۔

''سر! اس کا کہنا ہے کہ فائرنگ اتنی اچانک شروع ہوئی کہ انہیں اپنے ہتھیار تک اٹھانے کا موقع نہیں ملا۔ پہلی گولی اسے لگی۔ وہ زخمی ہو کر سیٹ پر گر گیا لیکن ہوش میں تھا۔ دوسری دو گولیاں ڈرائیور کو لگیں۔ گاڑی اس کے

کنٹرول سے باہر ہو کر کچے میں اُتر گئی۔ ہمیں چھوڑ کر وہ مراد صاحب کی گاڑی کی طرف چلے گئے۔ اسے اس وقت بھی ہوش تھا۔ اس نے ڈرائیور کو ہلا جلا کر دیکھا، اس میں زندگی کی کوئی رمق نہیں تھی، پھر وہ بے ہوش ہو گیا۔ وہاں سے موٹر وے پولیس نے اسے اسپتال پہنچایا۔"

"آپ نے جائے واردات کا جائزہ لیا؟" ایس ایس پی نے پوچھا۔

"یس سر!" گارڈز کی ڈبل کیبن پک اپ اسی طرح کچے میں پڑی تھی۔ اس میں سے ڈرائیور کی لاش کو اسپتال منتقل کر دیا گیا تھا۔ وہاں سے تقریباً دس بارہ کلومیٹر کے فاصلے پر ایک لینڈ کروزر بھی ملی ہے۔ اس کے چاروں دروازے کھلے ہوئے تھے۔"

"گاڑی کے نزدیک مزاحمت یا کشمکش کے آثار تھے؟"

"نو سر۔" انسپکٹر نے جواب دیا۔ "البتہ گاڑی میں سے ڈی وی ڈی پلیئر، اسٹپنی، جیک اور بیٹری غائب ہے۔"

"وہ گاڑی اس وقت کہاں ہے؟"

"وہ تھانہ بلال خان کی پولیس چوکی پر کھڑی ہے۔" انسپکٹر نے جواب دیا۔

انسپکٹر کو فارغ کر کے سجاد دوبارہ ڈرائنگ روم میں پہنچا ہی تھا کہ ایاز صاحب کے سیل فون کی بیل پھر بجی۔ افتخار اور شائستہ دونوں مستعد ہو گئے۔

"ہاں، تو تم لوگوں نے کیا فیصلہ کیا ہے؟" شہباز کی مکروہ آواز فون کے اسپیکر پر اُبھری۔ "صبح تک کتنی رقم دے رہے ہو؟"

"دیکھو دس کروڑ تو صبح تک ہمارے لیے کسی طور ممکن نہیں ہے۔ فی الحال تو ہم دونوں کے پاس کیش صرف تین کروڑ ہے۔" ایاز نے کہا۔

"او کے، تین کروڑ ہی سہی، میں کچھ دیر میں کال کر کے تمہیں بتاتا ہوں کہ رقم کہاں پہنچانا ہے۔"

"سر! اس مرتبہ فون کرنے والے کی سمت مختلف تھی۔" شائستہ نے کہا۔ "وہ بالکل مخالف سمت سے بول رہا تھا۔"

"یہ لوگ جگہ بدل بدل کر کال کرتے ہیں۔" سجاد نے کہا۔ "لیکن میں انہیں چھوڑوں گا نہیں۔"

"سجاد!" صفیہ بیگم نے کہا۔ "پہلے دونوں بچے ساتھ خیریت کے گھر آ جائیں، پھر تم ان لوگوں کو چھوڑنا یا پکڑنا یا ان کے ٹکڑے کر دینا۔" ان کے لہجے میں طنز تھا۔ "تین کروڑ کی رقم ایسی نہیں ہے کہ اس کی خاطر بچوں کی زندگی خطرے میں ڈالی جائے۔"

☆☆☆

نوید اس دن بہت خوش تھا۔ ایک دن پہلے ہی غضنفر نے اسے زیرو میٹر موٹر سائیکل دلوائی تھی اور اس کی تنخواہ میں بھی پندرہ سو روپے کا اضافہ کیا تھا۔ آج رضا نے گاڑی کی پے منٹ کر کے ڈلیوری لینے کا وعدہ کیا تھا۔ اس نے گاڑی کو رات ہی سروس کے لیے دے دیا تھا اور اب ملازم لڑکے سے اس پر پالش کروا رہا تھا۔

تھوڑی دیر بعد گاڑی چمچمانے لگی۔ نوید نے ایک نظر گاڑی پر ڈالی اور مطمئن ہو کر اپنی سیٹ پر جا بیٹھا۔ اس نے ملازم لڑکے سے چائے بنانے کو کہا اور ترنگ میں آ کر سیٹی پر ایک معروف دھن بجانے لگا۔ رضا نے ساڑھے نو بجے آنے کا وعدہ کیا تھا۔ وہ وقت کا بہت پابند تھا اس لیے نوید صبح نو بجے شوروم پہنچ گیا۔

ٹھیک ساڑھے نو بجے رضا کی ٹویوٹا کرولا شوروم کے سامنے رکی۔ نوید فوراً ہی کھڑا ہو گیا اور اس کے استقبال کو دروازے کی طرف بڑھا۔ اس نے بہت ادب سے رضا کو سلام کیا اور اسے لے کر غضنفر کے دفتر میں آ گیا۔

اسی وقت غضنفر بھی وہاں پہنچ گیا۔ اسے معلوم تھا کہ آج رضا پے منٹ کرے گا۔ نوید اسے دیکھ کر خوش ہو گیا کہ اب تمام قانونی اور کاغذی کارروائی غضنفر خود ہی کرلے گا۔

غضنفر نے رضا کو کافی کی پیشکش کی لیکن اس نے معذرت کر لی اور غضنفر سے بولا۔ "آپ ایسا کریں، مجھے اپنا اکاؤنٹ نمبر دے دیں تاکہ رقم آپ کے اکاؤنٹ میں ٹرانسفر کی جا سکے۔"

"اکاؤنٹ نمبر؟" غضنفر نے چونک کر کہا۔

"جی ہاں۔" رضا نے کہا۔ "اب میں کروڑوں کی رقم ساتھ لے کر تو نہیں گھوم سکتا۔ آپ اکاؤنٹ نمبر بتائیں، رقم ابھی آپ کے اکاؤنٹ میں آ جائے گی۔ کنفرم کرنے کے بعد ہی میں آپ سے ڈلیوری لوں گا۔"

غضنفر اس کی بات پر مطمئن ہو گیا۔ اس نے اکاؤنٹ نمبر بتایا جسے رضا نے ایک کاغذ پر نوٹ کر لیا، پھر بولا۔ "میں ملک صاحب کو آپ کا نمبر بتا دوں تاکہ وہ رقم آپ کے اکاؤنٹ میں ٹرانسفر کر دیں۔" اس نے سیل فون پر اکاؤنٹ نمبر لکھوایا اور بولا۔ "سر! میں یہیں شوروم میں بیٹھا ہوں۔ غضنفر صاحب ٹرانزکشن کی تصدیق کے بعد ہی گاڑی دیں گے، او کے سر، میں انتظار کر رہا ہوں۔"

دس منٹ بعد رضا کے سیل فون کی بیل بجی۔ اس نے اسکرین پر نظر ڈالی اور جلدی سے ریسیور اٹھا لیا۔ ''یس سر! اچھا رقم آپ نے منتقل کر دی؟...... ارے...... آپ کب پہنچے؟ جی میں یہاں شوروم پر ہی بیٹھا ہوں۔ اس کا ایڈریس تو میں آپ کو سمجھا ہی چکا ہوں...... جی ہاں، بینک کے سامنے ہی ہے۔'' اس نے سیل فون کی لائن منقطع کر کے غضنفر سے کہا۔ ''رقم آپ کے اکاؤنٹ میں شفٹ ہو چکی ہے۔ آپ بینک فون کر کے کنفرم کر لیں۔''

''تصدیق تو خیر ہوتی رہے گی۔ آپ ایک آخری نظر گاڑی پر مزید ڈال لیں۔''

''ارے صاحب، گاڑی تو پہلی ہی نظر میں مجھے پسند آ گئی تھی۔ اب دعا کریں کہ یہ ملک صاحب کو بھی پسند آ جائے۔ وہ آج صبح ہی کراچی پہنچے ہیں اور یہیں آ رہے ہیں۔''

''موسٹ ویلکم!'' غضنفر نے ہنس کر کہا۔ ''اس بہانے ملک صاحب سے ملاقات بھی ہو جائے گی۔ میں نے ان کے لیے ایسی چیز پسند کی ہے کہ وہ بار بار اسی شوروم پر آئیں گے۔''

''ملک صاحب ہر سال گاڑیاں بدلنے کے عادی ہیں۔ کبھی کبھی تو سال میں دو دفعہ بھی گاڑی بدل لیتے ہیں۔ میں نے ان سے آپ کی اکیورا کی اتنی تعریف کی ہے کہ سمجھیں گاڑی انہیں دیکھے بغیر ہی پسند آ گئی ہے۔ یوں بھی وہ میری پسند پر اعتماد کرتے ہیں۔''

''میں ذرا بینک ٹیلی فون کر لوں۔'' غضنفر نے کہا۔ وہ بہت اچھا سیلز مین تھا لیکن پیسے کے معاملے میں بہت کائیاں تھا۔

☆☆☆

رات کے بلکہ صبح کے چار بج رہے تھے۔ مراد ابھی تک جاگ رہا تھا۔ شدید سردی کے باعث اسے نیند بھی نہیں آ رہی تھی۔ شہباز کے کہنے پر ان دونوں کے ہاتھ پیر باندھ دیے گئے تھے۔ اس سے مراد کو مزید تکلیف ہو رہی تھی۔ اسے ثمرین کا بھی خیال تھا۔ ثمرین نازوں میں پلی تھی۔ اس نے تو تصور میں بھی نہ سوچا ہوگا کہ کبھی اسے اس حال میں زمین پر سونا پڑے گا۔ مراد نے آہستہ سے اسے آواز دی۔

''رینو! کیا تم جاگ رہی ہو؟''

''اس ماحول میں نیند آ سکتی ہے؟'' ثمرین نے تلخ لہجے میں کہا۔ اس کی آواز سردی سے کپکپا رہی تھی۔

''اڑے یار محمد۔'' باہر سے شہباز کی آواز آئی۔

''میں نے ان لوگوں کو اپنی ڈیمانڈ بتا دی ہے۔ اب انہیں فون کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ میں کراچی جا رہا ہوں۔ یہاں کے معاملات تم سنبھال لینا۔'' وہ یار محمد سے سندھی میں گفتگو کر رہا تھا۔

''سائیں ان دونوں کا کیا کرنا ہے، انہیں کہاں چھوڑنا ہے؟''

''انہیں زندہ نہیں چھوڑنا ہے۔'' شہباز نے سفاک لہجے میں کہا۔

''سائیں، پیسے کی بات تو ہو گئی ہے۔'' یار محمد نے حیرت سے کہا۔

''ہاں پیسے کی بات ہو گئی ہے۔ پیسے وصول کرنے کے بعد میں تمہیں فون کروں گا۔ تم ان دونوں کو ٹھکانے لگا کر یہیں جنگل میں پھینک دینا۔ لڑکے نے مجھے پہچان لیا ہے۔ وہ بڑے باپ کا بیٹا ہے، پھر اس حرام زادے ایس ایس پی کا دوست ہے۔ بعد میں... میرے لیے کوئی مشکل کھڑی کر سکتا ہے۔''

''ٹھیک ہے سائیں۔'' یار محمد نے کہا۔

''ان دونوں کو ٹھکانے لگانے کے بعد تم لوگ بھی یہاں سے نکل جانا۔ ان کی کوئی چیز یہاں رہنے نہ پائے، تم اور سومر ہوشیار رہنا۔ علی محمد تو ویسے بھی چرس کا عادی ہے۔ کوشش کرنا کہ وہ چرس نہ ہی پیے۔''

''ٹھیک ہے سائیں۔'' یار محمد نے کہا۔

''ہاں، تم لوگ فکر مت کرنا۔ اس دفعہ تم لوگوں کو دگنے پیسے ملیں گے۔'' شہباز نے کہا۔ ''میں اب چلتا ہوں۔''

ان کی باتیں سن کر مراد سناٹے میں رہ گیا۔ گویا ان لوگوں نے مراد اور ثمرین کو مارنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اس کا ذہن بہت تیزی سے کام کر رہا تھا کہ اس افتاد سے کیسے بچا جائے؟

پھر گاڑی کا انجن اسٹارٹ ہونے کی آواز آئی تو مراد سمجھ گیا کہ شہباز جا چکا ہے۔

یار محمد اور شہباز کو یہ اندازہ نہیں تھا کہ مراد نہ صرف سندھی سمجھتا ہے بلکہ بول بھی سکتا ہے۔ بنیادی طور پر وہ سندھ ہی کا رہنے والا تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ اس کی پیدائش کراچی میں ہوئی تھی۔ اس کی ماں کا تعلق کراچی سے تھا لیکن ان کے زیادہ تر ملازم گوٹھ کے تھے۔ مراد خود بھی اکثر گوٹھ جاتا رہتا تھا۔ سندھی زبان اس نے اپنے نوکروں ہی سے سیکھی تھی۔

مراد کو اندازہ تھا کہ وہ تینوں الگ الگ اور ایک

دوسرے سے دور مورچے بنا کر بیٹھے ہوں گے۔ ان لوگوں کے سر پر سجاد کی تلوار لٹک رہی تھی۔ ان کا خیال تھا کہ سجاد کسی بھی وقت وہاں پہنچ سکتا تھا۔ اس لیے وہ لوگ کچھ زیادہ ہی چوکنے تھے۔

''اڑے سومر۔'' یار محمد نے بلند آواز میں اسے پکارا۔

تھوڑی دیر بعد قدموں کی آہٹ سنائی دی اور سومر کی آواز آئی۔ ''کیا بات ہے یار محمد؟''

''بابا، ابھی تو ادھر بیٹھ۔ میں تھوڑی دیر سو لوں۔''

''اچھا، مجھے بیڑی تو دیتا جا، میرے پاس بیڑی ختم ہوگئی ہے۔''

''وہ علی محمد کہاں ہے؟'' یار محمد نے پوچھا۔

''وہ اپنی جگہ پر بیٹھا ہے۔ چرسی موالی ہے لیکن ڈرائیور بہت اچھا ہے۔'' یار محمد نے کہا۔ ''اس کا نشانہ بھی ہم سب سے اچھا ہے۔ ابھی میں جاتا ہوں اور تو سو مت جانا، ادھر کا دھیان رکھنا۔''

''وہ دونوں رسیوں سے بندھے ہوئے ہیں۔'' سومر نے کہا۔ ''وہ تو اپنی جگہ سے ہل بھی نہیں سکتے۔''

پھر ان کو قدموں کی آہٹیں سنائی دیں جو آہستہ آہستہ معدوم ہوگئیں۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ یار محمد بھی چلا گیا تھا۔

مراد نے کچھ دیر مزید انتظار کیا پھر اسے سومر کے خوفناک خراٹے سنائی دیے۔ وہ باہر سو رہا تھا۔ سردی بھی شدید تھی۔ اس کے باوجود نہ جانے اسے کیسے اتنی گہری نیند آگئی تھی۔

''رینو۔'' مراد نے آہستہ سے ثمرین کو آواز دی۔ ''کیا تم بھی سو گئیں؟''

''میں بھی شاید سو ہی جاتی لیکن یہاں تو مچھر اتنے خوفناک ہیں کہ سونے نہیں دے رہے ہیں۔''

''تم اپنی رسیاں کھولنے کی کوشش کرو۔ ان لوگوں نے تمہیں اتنی مضبوطی سے نہیں باندھا ہے۔''

''کوئی فائدہ نہیں ہے۔'' ثمرین نے کہا۔ ''وہ تینوں مسلح ہیں اور ہمیں گولی مارنے میں دیر نہیں کریں گے۔''

''رینو پلیز۔'' مراد نے کہا۔ ''اپنی رسیاں کھولنے کی کوشش کرو ورنہ یہ رات ہماری زندگی کی آخری رات ثابت ہوگی۔ تاوان لینے کے بعد بھی یہ لوگ ہمیں زندہ نہیں چھوڑیں گے۔''

''کیوں؟'' ثمرین نے کہا۔ ''میں نے سنا ہے کہ یہ لوگ تاوان لینے کے بعد چھوڑ دیتے ہیں۔'' ثمرین نے کہا۔

''ہاں، لیکن ہمیں نہیں چھوڑیں گے۔'' مراد جھنجلا کر بولا۔ ''وہ منحوس شہباز ان لوگوں کو یہی حکم دے کر گیا ہے کیونکہ میں نے اسے پہچان لیا ہے۔''

''تم نے کیا واقعی اسے پہچان لیا ہے مراد؟''

''مجھے شبہ ہے کہ یہ وہی شخص ہے، یہ شبہ غلط بھی ہوسکتا ہے۔'' پھر وہ بولا۔ ''ہمارے پاس وقت کم ہے اور تم سوال جواب میں لگی ہوئی ہو۔'' وہ دونوں احتیاطاً انگریزی میں باتیں کررہے تھے۔

''کوشش کرتی ہوں۔'' ثمرین نے کہا۔

''تمہارے پیروں کی رسیاں ڈھیلی ہیں۔ میں دیکھ رہا تھا تمہیں باندھتے وقت ان لوگوں نے رعایت کی تھی۔''

ثمرین نے اپنے پیروں کو حرکت دی۔ اس کے پیروں میں بندھی ہوئی رسیاں واقعی ڈھیلی تھیں۔ اس نے آہستہ آہستہ پیروں کو دو چار جھٹکے دیے تو رسیاں مزید ڈھیلی ہوگئیں۔

پھر دو چار مرتبہ کوشش کرنے کے بعد اپنے پیر کھولنے میں کامیاب ہوگئی۔

''میں نے اپنے پیر کھول لیے ہیں۔'' ثمرین نے کہا۔

''گڈ۔'' مراد نے کہا۔ پھر بولا۔ ''اب تم کوشش کر کے میرے ہاتھوں میں بندھی ہوئی رسیاں کھولو۔''

''تمہاری رسیاں کیسے کھولوں۔ میرے ہاتھ تو پشت پر بندھے ہوئے ہیں۔'' پھر وہ چونک کر بولی۔ ''ایک طریقہ ہے۔ میں نے جو یوگا سیکھا ہے، وہ کس دن کام آئے گا۔''

وہ فرش پر بیٹھ گئی اور اپنے ہاتھوں کو کمر سے گزار کر کولھوں تک لے گئی۔ پھر اس نے جسم کمان کی طرح موڑا اور ہاتھوں کو کولھوں سے گزار کر گھٹنوں تک لائی اور دوسرے ہی لمحے اس کے بندھے ہوئے ہاتھ سامنے تھے۔

اس کھینچا تانی میں رسیاں یوں بھی ڈھیلی پڑ گئی تھیں۔ اس نے دانتوں کی مدد سے رسیوں کی گرہیں کھول لیں۔ رسی موٹی تھی اس لیے ایسا کرتے ہوئے اس کی کلائیوں کے ساتھ ساتھ ہونٹوں سے بھی خون رسنے لگا لیکن اس نے کسی نہ کس طرح اپنے ہاتھ کھول ہی لیے پھر اس نے وقت ضائع کیے بغیر مراد کے ہاتھ کھولے، پھر اپنے پیر مراد نے خود ہی کھول لیے۔

دوسرا مرحلہ کمرے سے باہر جانے کا تھا۔ دروازے میں باہر سے زنجیر لگی ہوئی تھی۔

''ذرا سا شور کرو۔'' مراد نے کہا۔ ''یوں جیسے تمہیں

کسی کیڑے نے کاٹ لیا ہے لیکن پہلے اپنے جوتے پہن کر شال لپیٹ لو۔ بعد میں ہمیں موقع نہیں ملے گا۔''

ثمرین دروازے کے پاس جا کر چیخی۔ ''آوچ...... مرگئی...... مراد...... مجھے کسی کیڑے نے کاٹ لیا ہے...... آہ...... میں مر رہی ہوں۔'' ثمرین ذرا بلند آواز میں چیخی۔

باہر سے سومر کی آواز آئی۔ ''کیوں شور مچا رہے ہو، سونے بھی نہیں دیتے۔''

''میری بیوی کو کسی کیڑے نے کاٹ لیا ہے، تمہیں سونے کی پڑی ہے۔'' مراد نے چیخ کر کہا۔

دوسرے ہی لمحے سومر نے دروازہ کھول کر اندر جھانکا۔ مراد نے اس کی گردن پکڑ کر اسے اندر گھسیٹ لیا۔ وہ سنبھلنے بھی نہیں پایا تھا کہ ثمرین نے اس کی رائفل کندھے سے اتار لی اور مراد کی طرف اچھال دی۔ مراد نے رائفل کے بٹ سے سومر کے سر پر زوردار وار کیا۔ چوٹ شدید تھی۔ سومر تیورا کر کچے فرش پر گر پڑا۔

مراد نے رائفل سنبھالی اور دبے پاؤں کمرے سے باہر نکل گیا۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ یار محمد کہاں سو رہا ہے۔ اس نے حتی الامکان سومر کا لہجہ اور آواز بنا کر کہا۔ ''یار محمد...... او یار محمد۔''

''اڑے بابا یہ شور کیسا ہے؟'' علی محمد کی آواز نزدیک سے سنائی دی۔

مراد، ثمرین کو لے کر تیزی سے جھاڑیوں کے پیچھے چھپ گیا۔

انہیں اندھیرے میں علی محمد کا ہیولا نظر آیا۔ وہ محتاط انداز میں ادھر ادھر دیکھتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ خطرناک بات یہ تھی کہ اس کے ہاتھ میں رائفل تھی اور وہ کسی بھی وقت فائر کر سکتا تھا۔ مراد سن چکا تھا کہ اس کا نشانہ بہت غضب کا ہے۔

وہ کچھ اور آگے بڑھا تو اس کی پشت مراد کی طرف ہو گئی۔ مراد نے بڑا سا ایک پتھر اٹھایا۔ اسے ہاتھ میں تولا اور تاک کر علی... کے سر پر مار دیا۔ پتھر ٹھیک نشانے پر لگا۔ اس... کے حلق سے اذیت بھری چیخ نکلی اور وہ کٹے ہوئے درخت کی طرح زمین پر گر کے ساکت ہو گیا۔

اچانک کہیں دور سے یار محمد کی آواز سنائی دی۔

''اڑے علی... خیر تو آہے؟''

پھر مراد کو دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز سنائی دی۔

وہ پھر جھاڑیوں میں دبک گیا۔ یار محمد بھاگتا ہوا وہاں پہنچا۔ اس کے ہاتھ میں طاقتور روشنی کی ایک ٹارچ بھی تھی۔ غنیمت یہ تھا کہ اس کا رخ مراد کی مخالف سمت میں تھا۔ وہ علی محمد اور سومر کو آوازیں دیتا ہوا آگے بڑھا۔ اچانک اس کی نظر علی... پر پڑی۔ وہ جھک کر اسے دیکھنے لگا۔ مراد کے لیے یہی موقع تھا۔ اس نے سومر کی رائفل ڈنڈے کی طرح پکڑ لی اور دبے پاؤں یار محمد کے عقب میں پہنچ کر اس کے سر پر رائفل کے بٹ سے وار کیا۔ یار محمد ایک کریہہ چیخ مار کے ڈھیر ہو گیا۔

مراد کو اندازہ تھا کہ گاڑی کی چابیاں علی محمد کی جیب میں ہوں گی۔ اس نے بہت پھرتی سے اس کی تلاشی لی اور اس کی جیب سے چابیاں نکال لیں۔ مراد یہ بھی جانتا تھا کہ گاڑی کہاں کھڑی ہے؟

وہ ثمرین کا ہاتھ پکڑ کر تیزی سے اونچے نیچے راستوں پر دوڑا۔ ثمرین نے چیخ کر کہا۔ ''ذرا آہستہ بھاگو مراد، میرے پیروں میں پتھر چبھ رہے ہیں۔''

وہ لوگ ایک اونچے ٹیلے پر چڑھے تو انہیں ڈبل کیبن پک اپ نظر آ گئی۔ مراد، ثمرین کا ہاتھ پکڑ کر تیزی سے گاڑی کی طرف دوڑا۔ اسے اب بھی خطرہ تھا کہ ان لوگوں میں سے کوئی ہوش میں آ کر ان کا تعاقب نہ شروع کر دے۔ وہ لوگ تو اس جنگل کے کیڑے تھے۔ ایسے راستوں سے واقف ہوں گے جہاں وہ گاڑی سے پہلے پہنچ سکیں۔

گاڑی کا انجن اسٹارٹ کر کے سب سے پہلے اس نے فیول گیج پر نظر ڈالی۔ پیٹرول کا ٹینک آدھے سے بھی زیادہ بھرا ہوا تھا۔

اس نے اندازے سے گاڑی کا رخ مخالف سمت میں کیا اور گاڑی کو بھگانا شروع کر دیا۔ گاڑی اونچے نیچے راستوں پر اچھلتی کودتی آگے بڑھتی رہی۔ تقریباً آدھے گھنٹے بعد مراد کو احساس ہوا کہ وہ اس پگڈنڈی کو کھو بیٹھا ہے جس پر چل کر وہ لوگ یہاں تک پہنچے تھے۔ یہ احساس بہت ہولناک تھا۔ وہ اس جنگل میں بھٹک جاتے تو یا تو دوبارہ یار محمد وغیرہ کے ہاتھ لگ جاتے یا پھر ڈاکوؤں کے کسی دوسرے گروہ کے ہتھے چڑھ جاتے۔ اسے ایک خطرہ یہ بھی تھا کہ شہباز واپس بھی آ سکتا تھا۔ ممکن ہے وہ یہ تصدیق کرنے آئے کہ اس کے آدمیوں نے انہیں ہلاک کیا ہے یا نہیں۔

سپیدۂ سحر نمودار ہو رہا تھا اور مراد کی الجھن بڑھتی جا رہی تھی۔ اسے ابھی تک وہاں سے نکلنے کا راستہ نہیں ملا تھا۔

''کیا ہوا مراد؟'' ثمرین نے پوچھا۔ ''تم ایک ہی

جگہ چکر کیوں کاٹ رہے ہو۔ یہ اونٹ کے کوہان جیسی پہاڑی ابھی تو میں نے دیکھی تھی، تم پھر گھوم پھر کے وہیں پہنچ گئے۔"

"میں راستہ بھول گیا ہوں ثمرین۔" مراد نے کہا اور گاڑی ایک جگہ کھڑی کر دی۔ ہم اسی طرح بھٹکتے رہے تو سب پیٹرول ختم ہو جائے گا پھر ہمارے لیے کوئی نئی مصیبت کھڑی ہو جائے گی۔"

"میرے خیال میں دائیں طرف چلو۔" ثمرین نے کہا۔ "ممکن ہے مین روڈ اسی طرف ہو۔"

☆☆☆

مراد کو اس جنگل میں بھٹکتے ہوئے تین گھنٹے ہو چکے تھے۔ گاڑی کا پیٹرول بھی اب ختم ہونے والا تھا۔ "اگر آئندہ آدھے گھنٹے میں ہمیں راستہ نہ ملا تو پھر پیدل ہی چلنا پڑے گا۔" مراد نے کہا۔ "سورج سر پر آگیا ہے اور ہم ابھی تک اس جنگل میں بھٹک رہے ہیں۔"

اچانک ثمرین کو مدھم سی ایک آواز سنائی دی۔ ایسی آواز جیسی بھینسوں کے گلے میں پڑی ہوئی گھنٹیوں کی ہوتی ہے۔

"گاڑی روکو مراد۔" ثمرین چیخ کر بولی۔

مراد نے گھبرا کر گاڑی روک دی۔ "کیا ہوا، تم ٹھیک تو ہو؟"

"ہاں، میں ٹھیک ہوں۔" ثمرین نے کہا۔ "تم نے کوئی آواز سنی؟"

"کیسی آواز؟" مراد جھنجلا کر بولا۔

"جانوروں کے گلوں میں پڑی ہوئی گھنٹیوں کی آواز۔" ثمرین نے کہا۔

"رینو، اس ویرانے میں تمہارے کان بج رہے ہیں۔ یہاں تو سوائے جھینگروں کی آواز کے اور کوئی آواز ہی نہیں ہے۔ یہاں تو شاید پرندے بھی نہیں ہیں۔ مجھے تو کسی پرندے کی...... " وہ اچانک خاموش ہو گیا اور بولا۔ "ہاں، کوئی آواز آ تو رہی ہے۔"

"ہم کسی گوٹھ کے نزدیک ہیں۔" ثمرین خوشی سے کانپتی ہوئی آواز میں بولی۔

آواز اب کچھ واضح ہو گئی تھی۔ مراد نے گاڑی کا رخ آواز کی طرف موڑ دیا۔

☆☆☆

غضنفر نے ریسیور رکھا اور ملک صاحب سے بولا۔ "میرے اکاؤنٹ میں رقم کچھ دیر پہلے منتقل ہو چکی ہے۔"

"وہ گاڑی کہاں ہے رضا؟" ملک صاحب نے پوچھا۔

"گاڑی؟" غضنفر نے حیرت سے کہا۔ "یہ آپ کے سامنے ہی تو کھڑی ہے۔" نئے ماڈل کی اکیورا۔"

"یہ گاڑی؟" ملک نے ہونٹ سکیڑے۔ "یہ تو مجھے زیرو میٹر نہیں لگتی۔"

"سر! یہ زیرو میٹر ہے بھی نہیں لیکن بہت کم چلی ہوئی ہے۔"

"رضا!" ملک نے درشت لہجے میں اسے مخاطب کیا۔ "تم نے مجھے بتایا کیوں نہیں کہ گاڑی استعمال شدہ ہے؟"

"سر! استعمال شدہ تو نہیں ہے، ہاں برائے نام چلی ہوئی ہے۔"

"ایڈیٹ۔" ملک غرایا۔ "استعمال شدہ کیا ہوتا ہے؟" پھر وہ غضنفر سے بولا۔ "سوری غضنفر! میں استعمال شدہ گاڑیاں رکھنے کا تو تصور بھی نہیں کر سکتا۔"

"سر، گاڑی کا سودا ہو چکا ہے۔ اب آپ اس سودے سے کیسے انکار کر سکتے ہیں؟"

"غلطی آپ کی نہیں مسٹر غضنفر، میرے منیجر کی ہے لیکن میں یہ گاڑی نہیں لے سکتا۔"

"سر، اس صورت میں آپ کو ٹوکن منی چھوڑنا ہو گی۔"

"ٹوکن منی چھوڑنی ہوگی؟" رضا بھی غصے سے بولا۔ "مسٹر غضنفر ٹوکن منی کوئی دس بیس ہزار نہیں بلکہ پانچ لاکھ تھی۔"

"سر! ٹوکن منی تو بیس لاکھ بھی ہو تو سودا کینسل ہونے کی صورت میں چھوڑنا پڑتی ہے۔"

"مسٹر غضنفر، آپ شاید ملک صاحب سے اچھی طرح واقف نہیں ہیں، یہ اگر چاہیں تو......"

"رضا!" ملک نے اسے ٹوک دیا۔ "اپنی غلطی کو دوسرے کے سر پر مت تھوپو، اصول تو یہی ہے کہ سودا کینسل ہو جائے تو ٹوکن منی چھوڑنا پڑتی ہے۔ ہاں اگر سودا ان کی طرف سے کینسل ہوتا تو میں پانچ کے بجائے دس لاکھ وصول کرتا۔" پھر وہ غضنفر سے مخاطب ہوا۔ "او کے مسٹر غضنفر، یو آر رائٹ۔ ہمارا آئندہ بھی تعلق رہے گا۔ رضا نے آپ کو بتایا ہو گا کہ مجھے شاندار گاڑیوں کا جنون کی حد تک شوق ہے۔ دوسری بات یہ کہ میں کوئی گاڑی ایک سال سے زیادہ نہیں رکھتا۔ گاڑی کی سیل کے سلسلے میں بھی مجھے آپ کی مدد کی ضرورت ہوگی۔"

''سر، پھر اب کیا کریں؟'' غضنفر خوش تھا کہ بیٹھے بٹھائے پانچ لاکھ تو مل ہی گئے۔

''میں نے آپ کے اکاؤنٹ میں......'' اس کی بات ادھوری رہ گئی۔ اس کے سیل فون کی گھنٹی بجنے لگی تھی۔ اس نے غضنفر سے کہا۔ ''سوری۔'' پھر وہ سیل فون کان سے لگا کر بولا۔ ''ہاں نصیر بولو...... کیا...... تم نے دیکھا ہی نہیں...... لگتا ہے تم سب مل کر مجھے کنگال کر دو گے۔ ایڈیٹ! یہ کوئی چھوٹی غلطی ہے؟...... شٹ اپ۔'' اس نے غصے میں سیل فون بند کر دیا اور چند لمحے تک گہرے گہرے سانس لے کر خود کو سنبھالتا رہا۔

''کیا ہوا سر؟'' رضا نے پوچھا۔ ''خیریت تو ہے؟''

''جب تم جیسے نکمے لوگ میرے ساتھ ہوں تو خیریت کہاں ہوتی ہے۔'' ملک غرایا، پھر غضنفر سے بولا۔ ''ہمارے اکاؤنٹس منیجر نے ایک اور گل کھلایا ہے۔ ایک پارٹی سے اسے تین کروڑ کا چیک ملا تھا۔ اس نے سوچے سمجھے بغیر وہ آپ کے اکاؤنٹ میں جمع کرا دیا۔''

''نو پرابلم سر۔'' غضنفر نے خوش دلی سے کہا۔ ''آپ کی رقم میرے ہی اکاؤنٹ میں ہے۔ میں ابھی بینک سے آپ کے اکاؤنٹ میں شفٹ کرا دیتا ہوں۔''

''مجھے آج شام کی فلائٹ سے دبئی جانا ہے۔'' ملک نے کہا۔ ''اگر چیک کے بجائے آپ کیش لے آئیں تو بہتر ہوگا۔ آپ کو زحمت تو ہوگی۔''

''کیسی زحمت سر۔'' غضنفر نے کہا۔ ''بس ابھی منیجر کو فون کر کے کہتا ہوں کہ وہ کیش تیار رکھے، میں دس منٹ میں آ کر اس سے کیش لے لوں گا۔'' پھر وہ کچھ سوچ کر بولا۔

''لیکن سر! اتنا کیش آپ کیسے لے جائیں گے؟''

''میں نے دبئی جانے کے لیے دو سوٹ کیس خریدے تھے، وہ ابھی تک میری گاڑی میں پڑے ہوئے ہیں۔''

''میں ابھی منگوا لیتا ہوں۔'' اس نے نوید کو مخاطب کیا۔ ''نوید! ملک صاحب کی گاڑی سے ایک سوٹ کیس لے آؤ۔'' نوید گاڑی کی چابیاں لے کر چلا گیا۔ غضنفر نے خوشامدانہ لہجے میں کہا۔ ''سر گاڑی تو آپ کی یہ بھی شاندار ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہ جدید ماڈل کی ہے۔''

''آپ کا خیال درست ہے مسٹر غضنفر! یہ پراڈو میں نے دو مہینے پہلے ہی خریدی ہے۔''

''سر! اگر آپ اسے بیچنے میں انٹرسٹڈ ہوں تو......''

''میں یہ گاڑی بیچوں گا تو ضرور لیکن ابھی نہیں، کم سے کم دو مہینے بعد۔''

''سر! مجھے ضرور یاد رکھیے گا۔''

''ضرور...... مسٹر غضنفر!'' ملک نے کہا۔ ''آپ میرے ساتھ اتنا تعاون کر رہے ہیں تو میں بھی آپ کے ساتھ تعاون کروں گا۔''

اسی وقت نوید بڑا سا ایک سوٹ کیس لے کر آ گیا۔

''آپ تشریف رکھیں، میں کیش لے کر آتا ہوں۔'' غضنفر نے کہا۔ نوید بھی اس کے ساتھ چلا گیا۔

''تم لوگ مجھے کنگال کر کے چھوڑو گے۔'' ملک نے مصنوعی غصے سے کہا۔

تھوڑی دیر بعد غضنفر اور نوید بینک سے کیش لے آئے۔

ملک نے ایک مرتبہ پھر غضنفر سے وعدہ کیا کہ آئندہ جب بھی میں گاڑی بیچوں گا یا خریدوں گا، پہلا حق آپ کا ہو گا۔

پھر وہ دونوں فوراً ہی اپنی گاڑیوں میں وہاں سے روانہ ہو گئے۔

☆☆☆

مراد دس منٹ کے اندر اندر اس بستی میں جا پہنچا۔ گاؤں والوں نے اپنا ایک آدمی ان کے ساتھ کر دیا جو انہیں پختہ سڑک پر چھوڑ کر واپس چلا گیا۔ وہ کوئی ذیلی سڑک تھی، کچھ دور چلنے کے بعد وہ لوگ سپر ہائی وے پر پہنچ گئے۔ گاڑی میں پیٹرول ختم ہونے کے قریب تھا لیکن مراد جانتا تھا کہ پیٹرول پمپ وہاں سے زیادہ فاصلے پر نہیں ہے۔ بس وہ یہ دعا کر رہا تھا کہ گاڑی وہاں تک پہنچ جائے ورنہ اسے پیٹرول کا ڈبا لے کر پیٹرول پمپ پر جانا پڑتا لیکن ان کی گاڑی پیٹرول پمپ تک پہنچ ہی گئی۔ وہاں پہنچ کر مراد کو خیال آیا کہ اس کے پاس پیسے تو ہیں ہی نہیں۔ پمپ کا ملازم لڑکا اس کے کہنے پر ٹینک فل کر رہا تھا۔

اس کی پریشانی کو ثمرین بھی بھانپ گئی۔ مراد نے پریشانی کے عالم میں کہا۔ ''رینو، ہمارے پاس پیسے تو ہیں ہی نہیں۔ اب پمپ والے کو پیسے کہاں سے دیں گے؟''

''میرے پاس سونے کی ایک چین ہے۔ وہ میں نے شرٹ کے اندر چھپا لی تھی اس لیے ان لوگوں سے محفوظ رہی۔''

مراد ایک طرف گاڑی لگا کر نیچے اترا اور سیدھا منیجر کے کیبن میں چلا گیا۔

''جی فرمائیے؟'' منیجر نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

''سر! میں ایک پرابلم میں ہوں۔ مجھے ڈاکوؤں نے لوٹ لیا ہے۔ میرا پرس اور میری بیوی کی تمام نقدی، سیل فون وغیرہ سب کچھ لوٹ کر لے گئے۔ گولڈ کی ایک چین بچ گئی ہے۔ آپ وہ رکھ لیں۔ میں شام تک آپ کو پیٹرول کے پیسے بھجوا دوں گا۔ میرے پاس اس وقت سیل فون نہیں ہے ورنہ میں اپنے گھر کال کر دیتا اور......''

''نو پرابلم سر۔'' منیجر نے خوش اخلاقی سے کہا۔ ''آپ واقعی پریشانی میں ہیں۔ میں بھی یہاں ملازم ہوں، آپ صرف اپنا شناختی کارڈ یہاں رکھوا دیں۔''

اس کی بات پر مراد ہنسنے لگا۔ ''میرا شناختی کارڈ بھی میرے پرس میں تھا۔'' پھر وہ چونک کر بولا۔ ''میں بھی کتنا احمق ہوں۔ یہاں فون تو ہوگا۔ آپ کے پاس سیل فون بھی ہوگا۔ میں اپنے بابا کو کال کر دیتا ہوں۔ شاید آپ نے میرے بابا کا نام سنا ہو، ان کا نام سیٹھ ایاز ہے اور......''

''آپ ایاز صاحب کے بیٹے ہیں؟'' منیجر اپنی جگہ سے کھڑا ہوگیا۔ ''سر! آپ کے والد کا تو نام ہی کافی ہے۔ آپ جائیں، پیسوں کی فکر مت کریں۔''

''تھینک یو۔'' مراد نے کہا اور دوبارہ گاڑی میں آ کر بیٹھ گیا۔

''کیا منیجر کو اپنے اغوا کی داستان سنا رہے تھے؟'' ثمرین ہنس کر بولی۔ خطرے سے باہر آتے ہی وہ پہلے کی طرح خوش گوار موڈ میں آ گئی تھی۔

''ہاں، منیجر نے کہا کہ آپ یہ داستان کتابی شکل میں چھپوا دیں، ہاتھوں ہاتھ بک جائے گی۔''

''اچھا ابھی تو یہاں سے نکلو یا یہیں کتاب بھی چھپواؤ گے؟''

مراد نے گاڑی کا انجن اسٹارٹ کیا اور اسے برق رفتاری سے کراچی کی طرف دوڑانے لگا۔

☆☆☆

''اس اکاؤنٹ میں ابھی ایک بڑی رقم کی منتقلی ہوئی ہے۔'' سجاد نے بینک منیجر سے پوچھا۔ ''کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ یہ اکاؤنٹ کس کا ہے؟''

''سوری سر۔'' منیجر نے خوش اخلاقی سے کہا۔ ''یہ ہمارے رولز کے خلاف ہے۔ ہم اپنے کسی بھی کلائنٹ کے بارے میں کسی غیر متعلق شخص کو کچھ نہیں بتاتے۔''

یہ ایک پولیس میٹر ہے مسٹر منیجر۔'' سجاد نے سرد لہجے میں کہا۔ ''میں اغوا برائے تاوان کے ایک کیس کی تفتیش کر رہا ہوں۔ یہ میرا سرکاری آئی ڈی کارڈ ہے۔'' سجاد نے جیب سے اپنا کارڈ نکالا اور منیجر کے حوالے کر دیا۔

''ایس ایس پی سجاد۔'' منیجر اس کے احترام میں کھڑا ہوگیا۔ ''آپ کے پاس اپنے ڈپارٹمنٹ کا اجازت نامہ تو یقیناً ہوگا؟''

''مسٹر منیجر!'' سجاد نے جھنجلا کر کہا۔ ''آپ میرا وقت ضائع کر رہے ہیں۔ اگر اغوا کنندگان اس تاخیر کی وجہ سے بچ نکلے تو مجبوراً آپ کو بھی شاملِ تفتیش کرنا ہوگا۔''

منیجر بھی شاید اصولوں پر ڈٹ جانے والا شخص تھا۔ اس نے رکھائی سے کہا۔ ''آپ مجھے ضرور شاملِ تفتیش کریں، پولیس سے تعاون کرنا تو ہر قانون پسند شہری کا فرض ہے۔''

''اور آپ میرا وقت ضائع کر کے یہ فرض ادا کر رہے ہیں؟'' سجاد نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

''سوری سر، آپ کو اس سلسلے میں ہیڈ آفس سے بات کرنا ہوگی۔''

''اوکے۔'' سجاد بھنا گیا۔ ''مجھے اپنے سینئر ایگزیکٹو یا پریذیڈنٹ کا سیل نمبر دیں۔''

''آپ زحمت نہ کریں، میں ابھی پریذیڈنٹ صاحب سے آپ کی بات کراتا ہوں۔''

''میں نے کہا ہے کہ مجھے اپنے پریذیڈنٹ کا سیل نمبر دیں۔''

''لکھیے۔'' منیجر نے کہا اور سجاد کو اپنے پریذیڈنٹ کا نمبر لکھوا دیا۔ سجاد نے وہ نمبر اپنے سیل فون میں محفوظ کر لیا اور فوراً ہی اسے کال کر لی۔ دوسری طرف سے کسی مترنم آواز والی لڑکی نے کال ریسیو کی۔ سجاد نے جھنجلا کر سلسلہ منقطع کر دیا اور بولا۔ ''میں نے آپ سے آپ کے CEO کا سیل نمبر مانگا تھا۔ آپ نے مجھے لینڈ لائن نمبر دے دیا۔ جلدی میں مجھے بھی خیال نہیں آیا کہ یہ سیل نمبر نہیں ہے۔''

''سوری سر، ان کی پرمیشن کے بغیر میں آپ کو ان کا سیل نمبر نہیں دے سکتا۔''

''لعنت بھیجیں اپنے پریذیڈنٹ پر، میرے پاس اتنے اختیارات ہیں کہ میں ابھی اور اسی وقت آپ کو اریسٹ کر سکتا ہوں۔''

''میں بھی کوئی پٹواری یا پرچون فروش نہیں ہوں کہ آپ مجھے ہانک کر لے جائیں گے۔''

اب صورتِ حال سجاد کے لیے ناقابلِ برداشت ہو گئی تھی۔ اس نے اپنا سیل فون نکالا اور نمبر ملانے کے بعد بولا۔ ''انسپکٹر بشیر! ایس ایس پی سجاد بول رہا ہوں۔ میں خیابانِ اتحاد کی اسی بینک برانچ پر موجود ہوں۔ آپ پولیس

موبائل لے کر فوراً وہاں پہنچیں۔''
منیجر کے چہرے پر پہلی دفعہ تشویش کے آثار نمودار ہوئے۔ اس نے اپنا سیل فون نکالا اور کوئی نمبر ڈائل کر کے بولا۔ ''سر، ڈیفنس کی برانچ سے منیجر ارشد بول رہا ہوں۔ پولیس کے ایک ایس ایس پی صاحب ایک کلائنٹ کے بارے میں معلوم کرنا چاہ رہے تھے۔ میں نے انکار کیا تو انہوں نے مجھے گرفتار کرنے کی دھمکی دے دی...... جی سر، موجود ہیں۔'' اس نے سجاد سے کہا۔ ''پریذیڈنٹ صاحب آپ سے بات کریں گے۔''
''ان سے کہو کہ اس وقت میرے پاس وقت نہیں ہے۔ ایک گھنٹے بعد مجھے پولیس اسٹیشن میں کال کرلیں۔''
اسی وقت انسپکٹر بشیر ایک اے ایس آئی کے ساتھ بینک میں داخل ہوا اور سیدھا سجاد کے پاس پہنچا۔ ''یس سر۔''
''اریسٹ کرو منیجر صاحب کو۔'' سجاد نے کہا۔
''سر! ہتھکڑی لگاؤں یا......''
''کیسی باتیں کررہے ہو، منیجر صاحب باعزت اور قانون پسند شہری ہیں۔ تم انہیں ہتھکڑی لگاؤ گے؟ انہیں بہت عزت سے پولیس موبائل میں بٹھا کر پولیس اسٹیشن لے جاؤ۔ میں بھی وہاں پہنچ رہا ہوں۔''
اسی وقت منیجر کے سیل فون کی گھنٹی بجی۔ اس نے جلدی سے کال موصول کی اور بولا۔ ''یس سر!...... جی سر، ایس ایس پی سجاد ان کا نام ہے...... سر وہ...... اوکے سر۔''
اس نے سیل فون رکھ کر سجاد سے کہا۔ ''ہیڈ آفس سے آرڈر آگئے ہیں۔ میں آپ کو اکاؤنٹ ہولڈر کا نام اور پتا بتا رہا ہوں۔''
''اب تو آپ نے بہت دیر کردی منیجر صاحب۔ اب آپ نام بھی بتادیں تو میں آپ کو شاملِ تفتیش ضرور کروں گا، نام بتایئے؟''
''اکاؤنٹ ہولڈر کا نام غضنفر علی ہے۔ اس کا گاڑیوں کا شوروم ہے۔ اس کے اکاؤنٹ میں تین کروڑ کی رقم منتقل کی گئی تھی جو اس نے ابھی آدھا گھنٹا پہلے بینک سے نکلوالی ہے۔''
''آپ میری اجازت کے بغیر کراچی سے باہر نہیں جائیں گے اور کہیں جائیں گے تو پولیس کو پہلے سے انفارم کریں گے۔'' سجاد نے اٹھتے ہوئے کہا۔ پھر وہ بشیر سے بولا۔ ''آؤ میرے ساتھ، میں ذرا اس کار ڈیلر کی زیارت بھی کرلوں جو اغوا برائے تاوان کا دھندا بھی کرتا ہے۔''

کھیل

گالف میں معروف دو کھلاڑی اپنے کھیل میں منہمک تھے کہ ملحقہ قبرستان میں جنازے کا ایک جلوس نمودار ہوا۔ ایک کھلاڑی نے اپنی پی کیپ اتار کر سینے سے لگائی اور تدفین ہونے تک سر جھکائے کھڑا رہا۔
ساتھی نے اس اہتمام کا سبب دریافت کیا تو بولا۔
''ہماری شادی کو چالیس سال ہوئے تھے۔ مجھے اپنی بیوی کے جنازے کا کم از کم اتنا احترام تو کرنا ہی چاہیے تھا!''

انتخاب

فلپ باسکٹ بال کا شوقین تھا۔ روزرات کو دیر سے گھر آتا اور تھکن سے چور ہونے کا شکوہ کرتا۔ دن بھر دفتر میں مغز زنی پھر کھیل اس کے بعد جم خانے میں ورزش...... بیوی کو شدت سے احساس تھا کہ فلپ خود پر ظلم کررہا ہے۔
شوہر کی تفریح اور تبدیلی کے لیے وہ اس کی سالگرہ پر اسے ایک مشہور کلب لے گئی۔ وہاں قدم رکھتے ہی دربان نے بے تکلفی سے کہا۔ ''ہائے فلپ! کیسے ہو؟'' بیوی نے چونک کر پوچھا کہ فلپ پہلے بھی وہاں آیا ہے۔ فلپ نے کہا کہ دربان اس کے ساتھ باسکٹ بال کھیلتا ہے۔ اندر پہنچے تو ایک ویٹریس اٹھلاتی ہوئی ان کی میز پر آئی اور بولی۔
''تمہارا شوق تو مجھے معلوم ہے، میڈم کے لیے کیا لاؤں؟''
اس بار بیوی کی تیوریاں چڑھ گئیں۔ ''یہ تمہاری ڈرنک کے بارے میں کیسے جانتی ہے؟'' فلپ نے جلدی سے بتایا کہ وہ ویٹریس عورتوں کی ٹیم میں والی بال کھیلتی ہے۔ میوزک شروع ہوئی تو شوخ ڈانسر نے میزوں کے درمیان سے گزر کر فلپ کے گلے میں بازو حمائل کردیے اور بولی۔ ''آج پھر تم اپنے پسندیدہ ڈانس کی فرمائش کرو گے۔''
بیوی کا پارا چڑھ گیا۔ اب اس کی سمجھ میں آیا کہ فلپ اپنی شامیں کہاں گزارتا تھا۔ اس نے پرس اٹھایا اور قہر بار انداز میں پاؤں پٹختی باہر نکل گئی۔
فلپ اس کے پیچھے دوڑا۔ وہ ٹیکسی روک کر اندر بیٹھی ہی تھی کہ دروازہ بند ہونے سے پہلے فلپ اس کے برابر میں گھس گیا۔ وہ غصے میں چلّاتے ہوئے فلپ پر دو ہتڑ برسانے لگی۔
ڈرائیور نے ٹیکسی آگے بڑھائی اور مڑ کر بولا۔
''فلپ! آج تم غلطی سے یہ لڑاکا عورت لے آئے...... تمہارا انتخاب تو ہمیشہ زبردست ہوتا ہے۔''

خان پور سے مریم یوسف کا تعاون

غضنفر بہت ٹرنگ میں بیٹھا تھا۔ وہ اس وقت نئی ڈیل پر چیچ دیکھنے میں مصروف تھا۔

سجاد کو دیکھ کر وہ اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا اور بولا۔ ''جی سر، فرمائیے۔ آپ کو نیو کار چاہیے یا یوزڈ؟''

''تمہارا نام غضنفر علی ہے؟'' سجاد نے سرد لہجے میں پوچھا۔

''جی سر، میں ہی غضنفر ہوں۔'' غضنفر نے کچھ الجھ کر کہا۔

''تم نے ابھی بینک سے تین کروڑ کا کیش لیا ہے؟''

''جی سر۔'' غضنفر نے کہا۔

''میں تمہیں اغوا برائے تاوان کے جرم میں گرفتار کرتا ہوں۔'' سجاد نے کہا اور بشیر سے بولا۔ ''ہتھکڑی لگاؤ اسے۔''

''لیکن سر!'' غضنفر نے کچھ کہنا چاہا لیکن بشیر نے آگے بڑھ کر اس کے ہاتھ میں ہتھکڑی پہنا دی۔

''تمہارے ساتھ اور کتنے آدمی کام کرتے ہیں؟''

''میرا اسسٹنٹ نوید اور آفس بوائے اجمل۔'' غضنفر نے جواب دیا۔

سجاد نے ان دونوں کو بھی حراست میں لے لیا۔

''میں ایک ٹیلی فون کرلوں؟'' غضنفر نے کہا۔

''اب جو کچھ کرنا ہو، پولیس اسٹیشن جا کر کرنا۔''

''لیکن سر، مجھے میرا قصور تو بتائیں۔'' غضنفر نے کہا۔

''تھانے جا کر سب کچھ معلوم ہو جائے گا بچو۔'' انسپکٹر بشیر نے کہا اور اسے باہر کی طرف دھکیلا۔

☆☆☆

''تو تمہارا کہنا یہ ہے کہ تمہیں اغوا کی اس واردات کا کچھ علم نہیں ہے۔''

''جی سر، میں اتنی دیر سے یہی تو سمجھا رہا ہوں آپ کو۔'' غضنفر نے کہا۔

''سر جی۔'' انسپکٹر بشیر نے کہا۔ ''آپ اسے خان محمد کے حوالے کر دیں، یہ اگلی پچھلی ساری وارداتیں قبول کر لے گا۔''

''میرا تعلق ایک باعزت گھرانے سے ہے ایس ایس پی صاحب! میں کوئی واردا تیا نہیں ہوں۔'' غضنفر نے کہا۔

''تم سے تو خان محمد ہی نمٹے گا۔'' سجاد نے کہا اور انسپکٹر بشیر کے ساتھ لاک اپ سے باہر نکل آیا۔

''اسے ٹارچر مت کرنا۔'' باہر آکر اس نے بشیر سے کہا۔ ''بس اسے سونے مت دینا، میں کل اس کا ریمانڈ لے لوں گا۔''

☆☆☆

''یار، تجھے پتا ہے، تیری ضرب سے ایک آدمی مر گیا ہے۔'' سجاد نے مراد سے کہا۔ وہ اس وقت مراد کے ساتھ اس کے اسٹڈی روم میں بیٹھا تھا۔

''تو کیا مجھے قتل کے الزام میں گرفتار کرنے آیا ہے؟''

''ہاں، گرفتار تو کرنا پڑے گا۔'' سجاد نے سنجیدہ ہو کر کہا۔ ''تجھے بھی اور بھابی ثمرین کو بھی۔''

''تو ہوش میں تو ہے؟'' مراد نے منہ بنا کر کہا۔ ''میرا ارادہ اسے قتل کرنے کا نہیں تھا۔ اگر وہ مر گیا تو اس میں میرا کیا قصور، میں نے جو کچھ کیا اپنے بچاؤ کے لیے کیا ورنہ وہ لوگ مجھے مار دیتے۔''

''یار، تو تو اچھا خاصا قانون جانتا ہے۔'' سجاد ہنس کر بولا۔ ''تجھے اور ثمرین بھابی کو ایک دفعہ پولیس اسٹیشن جا کے اپنا بیان تو دینا پڑا گا۔''

''کیا ایسا نہیں ہوسکتا کہ پولیس کا کوئی آفیسر یہاں آکر بیان لے لے۔''

''ضرور ہوسکتا ہے۔ ویسے بھی ڈاکٹر نے تم دونوں کو بیڈ ریسٹ کے لیے کہا ہے۔''

''ڈاکٹر نے مجھ سے ایسی کوئی بات نہیں کہی۔''

''گھامڑ! یہ تو وہ بیان ہے جو تو پولیس کو دے گا۔'' پھر وہ چونک کر بولا۔ ''یار، اس گھر میں کوئی شخص ایسا ہے جو اغوا کرنے والوں سے ملا ہوا تھا، اور پل پل کی خبریں پہنچا رہا تھا۔''

''ایسا کون ہوسکتا ہے؟'' مراد نے کہا۔ ''تمام ملازم بابا کے اعتماد کے ہیں اور سب بہت پرانے ہیں۔''

''میں نے ابھی تک ملازمین کے سیل فون واپس نہیں کیے ہیں۔'' سجاد نے کہا۔ نیٹ ورک کمپنیز کے پاس ان کا پورا ریکارڈ ہوتا ہے۔ میں معلوم کرلوں گا کہ خبریں اغوا کنندگان کو کون پہنچا رہا تھا؟'' پھر وہ کچھ سوچ کر بولا۔ ''جس شخص کے اکاؤنٹ میں تاوان کی رقم جمع ہوئی ہے، وہ کاروں کے ایک شوروم کا مالک ہے۔ بظاہر تو وہ مجھے مجرم نہیں لگتا کہ آج کل لوگ ظاہر میں کچھ ہوتے ہیں اور باطن میں کچھ اور، بہرحال جلد ہی معلوم ہو جائے گا کہ اصل مجرم کون ہے۔''

☆☆☆

سجاد اس وقت نوید کے سامنے بیٹھا تھا۔ نوید بہت زیادہ سہا ہوا تھا۔ سجاد نے اس سے پوچھا۔ ''تم شروع سے بتاؤ کہ واقعہ کیا ہوا تھا؟''

نوید نے شروع سے لے کر آخر تک پوری بات تفصیل

سے بتادی۔

''تم اس شخص کو دیکھو گے تو پہچان لو گے؟''

''کسے، ملک صاحب کو یا رضا کو؟'' نوید نے پوچھا۔

''رضا تو کئی مرتبہ وہاں آیا ہے۔ اسے تو میں لاکھوں کی بھیڑ میں بھی شناخت کرلوں گا۔ ملک صاحب صرف ایک دفعہ آئے تھے جب وہ کیش لے کر گئے تھے۔''

''ان دونوں کا حلیہ بتاؤ؟'' سجاد نے پوچھا۔

''رضا خاصا وجیہہ اور خوش پوش نوجوان تھا۔ اس کے گورے رنگ پر سیاہ مونچھیں بہت اچھی لگتی تھیں۔ وہ ہمیشہ اپنی شرٹ کے کف میں کف لنکس استعمال کرتا تھا اور رے بن کے گلاسز استعمال کرتا تھا۔''

''اور ملک صاحب؟'' سجاد نے پوچھا۔

''ملک صاحب خاصے وجیہہ و شکیل اور دراز قد کے انسان تھے۔ میں نے انہیں کاٹن کے سفید براق کرتہ شلوار میں دیکھا۔ ان کی رنگت سرخ و سفید تھی لیکن میں نے انہیں سگریٹ پیتے نہیں دیکھا۔ ممکن ہے اس وقت نہ پی رہے ہوں۔ ان کی شخصیت میں ایک عجیب سی کشش تھی۔ براؤن بالوں اور آنکھوں کی وجہ سے وہ غیر ملکی لگتے تھے۔ لیکن جب بولتے تھے تو......''

''غضنفر نے جو حلیہ بتایا وہی نوید بتا رہا ہے۔'' سجاد خود کلامی کے انداز میں بولا۔ ''ہاں، اگر ان کے بتائے ہوئے واقعات اور حلیوں پر فرق ہوتا تو ان پر شبہ نہ کرنے کا جواز ہوتا۔'' اس نے لاک اپ میں کھڑے ہوئے سنتری سے کہا۔

وہاں سے وہ سی پی ایل سی کے آفس گیا اور انہیں تمام سیل فونز اور لینڈ لائنز کے نمبرز دے کر ان کا ریکارڈ بتانے کو کہا۔ ان تاریخوں کا جب مراد ہنی مون پر گیا تھا اور اس سے پہلے دو دن کا ریکارڈ خاص طور پر نکالنے کو کہا۔ سی پی ایل سی والوں نے سجاد کو شام تک آنے کو کہا۔

☆☆☆

سجاد، مراد کے ڈرائنگ روم میں بیٹھا تھا۔ وہ سی پی ایل سی سے تمام موبائل فونز کا ریکارڈ لے آیا تھا۔ اس نے فائل دیکھتے ہوئے ایک پرنٹ آؤٹ نکالا اور مراد سے کہا۔

''ذرا اس لڑکی کو بلاؤ جو تمہارے مالی کی بیٹی ہے۔''

''کیوں اس سے کیا کام پڑ گیا؟'' مراد نے کہا۔

''تم اسے بلاؤ تو، کام بھی بتا دوں گا۔''

تھوڑی دیر بعد غزالہ وہاں کھڑی تھی اور خاصی حیران پریشان نظر آرہی تھی۔

''تم یہاں کب سے ہو؟'' سجاد نے پوچھا۔

''مجھے یہاں رہتے ہوئے بیس سال ہو گئے۔''

غزالہ نے کہا۔ ''اتنی ہی میری عمر ہے۔ میں یہیں پیدا ہوئی تھی کیونکہ بابا شروع ہی سے صاحب کے پاس تھے۔''

''جتنا سوال کیا جائے اتنا ہی جواب دو۔'' سجاد نے درشت لہجے میں کہا۔

''میں وہی جواب تو دے رہی ہوں۔'' غزالہ نے کہا۔

''تم ساجد کو کب سے جانتی ہو؟''

غزالہ کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگی تھیں۔ اس نے خود کو فوراً ہی سنبھال لیا اور بولی۔ ''کون ساجد؟''

''دیکھو لڑکی!'' سجاد نے بھنّا کر کہا۔ ''میں جو کچھ پوچھوں اس کا جواب سچ سچ دو۔ تم ساجد کو کب سے جانتی ہو؟''

''میں کسی ساجد کو نہیں جانتی۔'' غزالہ نے ڈھٹائی سے کہا۔

''اس کا مطلب ہے کہ تمہیں پولیس اسٹیشن لے جا کر لیڈی پولیس افسر کے حوالے کر دوں۔ وہ مردوں سے زیادہ سفاک ہوتی ہیں۔ ایک منٹ میں تمہارے کس بل نکال دیں گی۔''

اسی وقت ایاز صاحب کمرے میں داخل ہوئے۔ غزالہ انہیں دیکھ کر رونے لگی۔ ایاز صاحب نے جلدی سے پوچھا۔ ''ارے ارے بیٹا، کیا ہوا...... تم رو کیوں رہی ہو؟''

''بابا یہ...... یہ مجھ سے کہہ رہے ہیں کہ تمہیں پولیس اسٹیشن لے جاؤں گا۔''

''کیوں بھئی؟'' ایاز صاحب نے پوچھا۔ ''کیا کر دیا ہماری بیٹی نے؟''

''آپ کی اس بیٹی نے تو وہ کیا ہے کہ آپ تصور بھی نہیں کر سکتے۔ یہ تو مراد کی زندگی ہی تھی جو یہ بچ گیا ورنہ آپ کی اس بیٹی نے تو کوئی کسر چھوڑی نہیں تھی۔''

''تم کیا کہہ رہے ہو، میں کچھ سمجھا نہیں۔'' ایاز صاحب نے الجھ کر کہا۔ ''غزالہ نے ایسا کیا کر دیا جس سے مراد کی جان خطرے میں پڑ گئی؟''

''مراد کے اغوا میں غزالہ کا ہاتھ ہے۔'' سجاد نے کہا۔

اس کے الفاظ بم کے گولے کی طرح ایاز صاحب کی سماعت سے ٹکرائے۔ مراد بھی گم صم اور بہت زیادہ پریشان ہو کر سجاد کو دیکھنے لگا۔ غزالہ ہچکیاں لے کر رونے لگی۔

''کیا تم اب بھی یہی کہو گی کہ تم ساجد کو نہیں جانتیں؟''

''ہاں، میں ساجد کو جانتی ہوں۔'' غزالہ نے سر اٹھا کر کہا۔ ''اغوا کا منصوبہ اسی کا تھا۔ ہمارا ارادہ تو دس کروڑ روپے تاوان لینے کا تھا لیکن شہباز نے اسے سمجھایا کہ اتنے

ہاتھ پیر مت پھیلاؤ، جتنے مل رہے ہیں، لے لو، یوں تین کروڑ پر سودا طے ہوگیا۔''

''اور بینک کے ذریعے تاوان لینے کا پلان کس کا تھا؟''

''یہ آئیڈیا میرا ہی تھا، مجھے بچپن ہی سے جاسوسی ناول پڑھنے کا شوق ہے۔ میں نے انگریزی میں ایک کہانی پڑھی تھی۔ اس میں اغوا کرنے والوں نے اس طرح تاوان وصول کیا تھا۔''

اسی وقت عبدالرحیم اندر آیا اور غزالہ کو وہاں دیکھ کر حیران رہ گیا اور بولا۔ ''تم یہاں کیا کر رہی ہو؟''

''اسے میں نے بلایا ہے۔'' سجاد نے کہا۔

''یہ ساجد کون ہے؟'' ایاز گرج کر بولے۔

''میرا بھتیجا ہے۔'' عبدالرحیم نے کہا۔ ''بھائی متعین شروع ہی میں دبئی چلے گئے تھے۔ وہ بہترین پلمبر ہیں اور ......''

''خاموش ہوجاؤ۔'' ایاز دہاڑ کر بولے۔ پھر وہ غزالہ سے مخاطب ہوئے۔ ''ساجد سے تمہارا کیا تعلق ہے؟''

''میں اور ساجد شادی کرنا چاہتے تھے۔ ہم نہیں چاہتے تھے کہ اپنے والدین کی طرح ہم بھی عسرت اور مفلسی کی زندگی گزاریں۔ میں بھی کچھ پڑھ لکھ گئی تھی اور ساجد بھی بی اے کر چکا ہے۔''

''شہباز سے اس کا کیا تعلق ہے؟'' سجاد نے پوچھا۔

''وہ...... دراصل...... شہباز...... اسے جیل میں ملا تھا۔'' غزالہ نے اٹکتے ہوئے کہا۔

''جیل میں ملا تھا؟'' مراد نے حیرت سے کہا۔ ''کیا ساجد جیل بھی جا چکا ہے؟''

''جی ہاں، اس نے ایک آدمی کو دھوکا دے کر اس سے دو لاکھ روپے ہتھیا لیے تھے۔ وہ کسی بڑے سرکاری افسر کا بھانجا تھا۔ اس کی شکایت پر پولیس نے ساجد کو گرفتار کرلیا اور اسے تین مہینے کی سزا ہوگئی۔''

''یہاں کی خبریں تم ساجد کو پہنچاتی تھیں اور ساجد شہباز تک پہنچا دیتا تھا؟''

''جی ہاں۔'' غزالہ نے کہا۔ ''جب آپ نے میرا سیل فون لے لیا تو ساجد نے مجھے ایک دوسرا سیل فون لا دیا۔ میں اسی کے ذریعے ساجد کو اطلاع دیتی تھی۔''

''تم یہ بھی جھوٹ کہہ رہی ہو کہ یہ آئیڈیا تمہارا تھا۔'' سجاد نے درشت لہجے میں کہا۔ ''یہ آئیڈیا تمہارا تھا نا ساجد کا، یہ آئیڈیا شہباز کا تھا۔ اس نے اس قسم کی ایک واردات پشاور میں بھی کی تھی اور بچ نکلا تھا۔ وہاں کا پراپرٹی ایجنٹ آج بھی ناکردہ گناہ کی سزا بھگت رہا ہے۔ وہاں اس نے گاڑی کے بجائے ایک بنگلے کے پلاٹ کا سودا کیا تھا اور پیسے اس پراپرٹی ایجنٹ کے اکاؤنٹ میں منگوا کر لے لیے تھے۔''

اسی وقت سجاد کے سیل فون کی بیل بج اٹھی۔ سجاد نے اسکرین پر نظر دوڑائی اور سیل فون کان سے لگا لیا۔ ''ہاں بشیر، کیا اطلاع ہے...... ویری گڈ...... اسے لاک اپ میں رکھو، میں ابھی آرہا ہوں۔''

پھر اس نے ایاز صاحب سے کہا۔ ''انکل! شہباز کو ائرپورٹ سے گرفتار کرلیا گیا ہے۔ اس لڑکی نے محض ایک کروڑ کی خاطر آپ کے بیٹے اور بہو کی جان لینا چاہی تھی۔ بقیہ دو کروڑ شہباز نے ہتھیا لیے تھے کیونکہ ابتدائی سرمایہ کاری بھی اس کی تھی۔''

تھوڑی دیر بعد ملازم نے آکر بتایا کہ کوئی انسپکٹر شائستہ آئی ہیں۔

''ہاں انہیں بھیجو۔'' سجاد نے کہا۔

انسپکٹر شائستہ خرانٹ سی، مضبوط ہاتھ پیروں کی عورت تھی۔ سجاد نے غزالہ کی طرف اشارہ کیا۔ اس نے جیب سے ہتھکڑی نکالی اور غزالہ کے ہاتھ میں ڈال دی۔

غزالہ بُری طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی اور بولی۔ ''جب میں گرفتار ہو رہی ہوں تو ساجد کو کیوں چھوڑوں، وہ بھی تو برابر کا شریک ہے۔''

''گڈ!'' سجاد نے کہا۔ ''بتاؤ اس وقت ساجد کہاں ہے؟''

''وہ اس وقت کینٹ اسٹیشن کے نزدیک سستے سے ایک ہوٹل گلیکسی کے کمرا نمبر 205 میں مقیم ہے۔''

انسپکٹر، غزالہ کو کھینچتی ہوئی باہر لے گئی۔ عبدالرحیم بلک بلک کر رونے لگا۔

☆☆☆

شام تک ساجد بھی گرفتار ہوگیا۔ وہ اس وقت ہوٹل میں نہیں تھا بلکہ کہیں گیا ہوا تھا۔ پولیس کے دو آدمی گھات لگا کر بیٹھ گئے۔ وہ جونہی اپنے کمرے میں آیا، پکڑا گیا۔

نوید آج بھی اسی شوروم پر کام کرتا ہے۔ غضنفر اس سے بہت خوش ہے کیونکہ ائرپورٹ پر اسی نے شہباز کو پہچانا تھا کہ یہی آدمی ملک بن کر ان کے شوروم پر آیا تھا بعد میں اس کی نشاندہی پر رضا کو بھی گرفتار کرلیا گیا۔

غضنفر اب کسی پارٹی کو اپنا اکاؤنٹ نمبر نہیں دیتا بلکہ اس سے کیش یا کراس چیک لیتا ہے۔

شناخت

زویا اعجاز

صبر... برداشت کے ساتھ اخلاقی پابندیوں کی قید میں زندگی گزارنا از حد دشوار ہے... جو مستقل مزاج... مضبوط اور توکل و قناعت کی خاصیت رکھتے ہیں... وہی اس راہِ پُرخار پر چل سکتے ہیں... مگر معاشرے میں رچے بسے گمراہوں اور منافق پرستوں کی اپنی دنیا آباد ہے۔ ایسے ہی خواص سے بھرپور سرورق کی تیکھی تحریر... جس کے کرداروں نے اپنے گرد ایسی دیواریں ایستادہ کررکھی تھیں جن کے آر پار دیکھنا ممکن نہ ہو... سنگ دل... بے رحم دنیا سے الگ تھلگ ہر دم انھی درو دیوار میں زندگی بتا دینا چاہتے تھے... مگر خود پسندی کی یہ قید بھی ان پر بھاری پڑ رہی تھی... اسیری سے رہائی ان کے لیے موت کا پیغام تھی...

اپنی ذات کی پرتوں میں مقید شناخت کے مراحل سے گزرتی دل گداز داستان

مؤذن کی آواز دلوں کو موم کی طرح پگھلاتی ہرسو گونج رہی تھی۔

اپنے ہاتھ پشت پر باندھے وہ بہت بے چینی سے ٹہل رہا تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ اس کے دل و دماغ میں کوئی انجانا خوف چٹکیاں لے رہا ہے۔ پینتیس سال سے متجاوز عمر، مضبوط کاٹھی، محنت کش ہاتھ پاؤں اور تمتماتا چہرہ اُسے ایک سخت گیر مرد کا روپ دیتا تھا۔ گھنی بھوئیں اور ورم زدہ آنکھیں یہ تاثر مزید گہرا کر دیتی تھیں۔

وہ دزدیدہ نگاہوں سے برآمدے کے آخری کونے میں موجود کمرے کو دیکھتا اور پریشانی سے اپنی مٹھیاں بھینچ لیتا۔ ایسی بے بسی اسے آج تک محسوس نہ ہوئی تھی۔ اس کے قدموں کی دھمک سے تو دھرتی لرز جایا کرتی تھی۔ وہ جابر خان تھا...... سنگلاخ پہاڑوں کا جری بیٹا...... قصبے کے ایک متمول فرد جانباز خان کا اکلوتا وارث...... جانباز کی حیثیت قصبے کے سردار کے بعد مسلمہ تھی۔

زندگی سے کسی پالتو سدھائے ہوئے جانور کی طرح سلوک کرنے والے جابر خان نے جو چاہا' پایا تھا لیکن اپنے بیج کی آبیاری سے تاحال کوئی درخت تو کجا' پودا بھی سینچ نہ پایا۔ اولاد کے معاملے میں وہ انتہائی بدقسمت ثابت ہوا۔

پچھلی تین بیویوں نے یہ سکھ نہ دیا تو اس نے پڑوسی ملک میں جنگ کے شعلوں سے فرار ہونے والے رحمت خان کی بیٹی سے مقامی رواج کے مطابق نکاح رچالیا......

پلوشہ اس سے اٹھارہ سال چھوٹی تھی۔ جلد ہی اسے اولاد کی نوید بھی مل گئی...... جابر خان کا بس نہ چلتا کہ وہ کسی بھی طرح اس بچے کو وقت سے پہلے ہی اس دنیا میں لے آئے۔ پلوشہ اس کی دیوانگی سے خائف رہتی لیکن اپنی اہمیت کے احساس سے دل میں فخر وغرور کے جذبات بھی جنم لینے لگتے۔

جابر کی تینوں بیویاں اس سے قبل سوکنوں کے روایتی حسد وعناد سے خوب لڑا کرتیں۔ لیکن اب ان کی لڑائی موقوف ہوگئی تھی۔ پلوشہ سے ملنے والے اس دردِ مشترک سے ان میں اتحاد ہوگیا۔ اس کی کم عمری اور قسمت کی یاوری سے ان کے سینے پر سانپ لوٹتے تھے۔ شراکت کا دکھ تو کسی نہ کسی طرح سہہ لیا تھا لیکن اب اس کل کی چھوکری کے پاؤں بھاری ہونے کی خبر اُن سے برداشت نہیں ہو رہی تھی۔ گھر ایک میدانِ جنگ بن گیا۔ اپنی تجربہ کاری کی بنا پر انہوں نے اسے خوراک' حکیمی دوائیوں سے لے کر جسمانی نقصان تک پہنچانے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی لیکن ہر دفعہ دہری ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔

وہ مستقبل میں بھی ان کی دست بُرد سے محفوظ ہوگئی۔ جابر نے اپنے وسیع گھر کی حد بندی کرتے ہوئے پلوشہ کے لیے ایک مکمل الگ تھلگ پورشن بنوا دیا جہاں وہ کسی ملکہ کی طرح لیے محض آرام کیا کرتی۔

اور آج وہ وقت آ گیا تھا جس کے لیے دونوں میاں بیوی نے جانے کتنے خواب سینچ رکھے تھے۔

ٹہلتے ٹہلتے جابر خان کے پاؤں شل سے ہوگئے تو وہ کمرے کے دروازے کے پاس جا کھڑا ہوا۔ [illegible] کی دبی دبی چیخیں اور کراہیں اس کا لہو سنسنانے لگیں۔

"ابی کتنا دیر لگے گا اور؟" وہ غصے سے بولا۔

"بس خان! تھوڑی دیر اور......" بانو کی لرزیدہ آواز آئی۔

بانو اس علاقے کی عمر رسیدہ عورت تھی۔ زچہ و بچہ کی نگہداشت کا اسے سالہا سال کا تجربہ تھا۔ پکی سڑک کے کنارے اگرچہ ایک نیم سرکاری ہسپتال بن چکا تھا لیکن مقامی لوگ اب بھی اپنی عورتوں کو ڈاکٹر کے پاس لے جانے یا انگریزی دوائی کا استعمال بے حیائی اور کفر سمجھتے۔

تصور میں اولاد کے لیے نام سوچتے' اسے بانہوں میں جھولے جھلاتے اس نے ایک جانب بیٹھ کر اپنی بانسری تھام لی۔ ہتھیاروں کے بعد بانسری بجانے کا یہ شوق اسے بچپن ہی سے تھا۔ اس کی سخت گیر طبیعت میں اس رجحان کی وجہ تو آج تک کوئی بھی سمجھ ہی نہ پایا تھا۔ البتہ اس کی مہارت کے سبھی قائل تھے۔ ذہنی تناؤ کے تحت آنکھیں موند کر اس نے بانسری اپنے ہونٹوں سے لگالی۔ مدھر تان اور اندرونی جانب سے پلوشہ کی چیخ و پکار اسے عجب سرور میں مبتلا کر رہی تھیں۔

کچھ ہی لمحوں بعد کمرے سے ... کراہوں اور چیخوں کی آواز تھم گئی اور ایک باریک سی آواز نے روتے ہوئے اس دنیا کے قفس میں اپنی آمد کا اعلان کر دیا۔

جابر خان خوشی و جوش سے بے قابو ہوگیا۔ اس کے جسم کا سارا لہو دماغ میں جا سمایا تھا۔ اسے یقین تھا کہ پلوشہ کے بطن سے 'ولی عہد' ہی مولود ہوا ہے...... وہ فرطِ مسرت سے گھر کی چھت پر گیا اور شلوار کے نیفے میں اڑسے پستول سے تڑاتڑ کئی فائر کھول دیے۔ اس کا دل چاہتا تھا کہ ساری دنیا میں چیخ چیخ کر اپنی اس 'کامیابی' کی منادی کرادے۔

اپنا ولولہ فضاؤں میں اچھالتے وہ نیچے آیا تو بانو برآمدے میں ہی کھڑی تھی۔ اس کے چہرے پر گھنڈی زردی نظر انداز کرتے ہوئے اس نے پوچھا۔

"دونوں ماں بیٹا کیسے ہیں اب؟"

"ٹھیک ہیں خان!" وہ چند قدم آگے بڑھی اور نظریں چراتے ہوئے بولی۔ "پلوشہ اپنے دودھ پلا رہی ہے...... بس خان! جو اللہ کی مرضی...... انسان کا زور بھی چلا ہے کیا؟"

"کیا اناپ شناپ بکے جا رہی ہو؟ ولادت کے گھر میں پُرسہ کیوں دے رہی ہو ام کو؟"

''میں چلتی ہوں خان! پھر رات بہت گہری ہو جائے گی۔''

اس کی عجلت جابر خان کو مضطرب کر گئی۔ ذہن میں سرسراتے خدشے کے تحت دروازے کو ٹھوکر مارتا ہوا وہ اندر داخل ہوا۔ پلوشہ کی آنکھوں میں ویرانی تھی۔ وہ بچے کو سینے سے چمٹائے ممتا کی حرارت اسے سونپ رہی تھی۔

''خیریت ہے ناں پلوشہ؟ ؟ امارا بیٹا ٹھیک تو ہے ناں۔'' وہ بیقراری سے بولا۔

پلوشہ آنکھوں میں امڈتے سیلاب پر بند نہ باندھ سکی اور بچے کو جابر کے سامنے کر دیا جس کے خوابوں اور آرزوؤں کا فلک بوس قلعہ دھڑام سے مسمار ہوا۔ وہ اس پر پل پڑا۔

''بیٹا چاہیے تھا ام کو خبیث عورت! امارا دیا کھاتی رہی' امارے گھر میں پلتی رہی اور بدلے میں ایک بیٹا نہ دے سکی...... حرام خور!''

''نہ کرو خان! امارا کیا قصور ہے؟'' وہ گڑگڑائی۔

''تیرا ہی قصور ہے...... کدھر منہ کالا کیا تم نے...... امارا بیٹا ہی ہونا تھا...... پہاڑی درگاہ والے حضرت سائیں نے بھی بتایا تھا ام کو...... امارا بیٹا۔'' وہ غصے سے کف اڑانے لگا۔

''حضرت سائیں کوئی خدا نہیں ہیں خان! یہ تو خدا کی دین ہے...... امارا کیا عمل دخل......''

''خاموش رہ خبیث! ابی ام جا رہا ہے بانو کے پاس...... اس کے بعد جب ام واپس آئے گا تو تجھے اور تیری اولاد دونوں کو زندہ نہیں چھوڑے گا......''

اس کی لہو رنگ آنکھوں میں تیرتے ڈورے پلوشہ کی دھڑکنیں ساکت کر گئے۔ وہ جانتی تھی کہ جنسی درندہ جابر خان اپنی اس بات پر بہر صورت عمل کرے گا۔ وہ دروازے کو ایک بار پھر ٹھوکر مارتا تن فن کرتا ہوا وہاں سے چلا گیا......

پلوشہ کو اپنا وجود کسی برف میں مقید محسوس ہونے لگا۔ کرب اور جسمانی تکلیف سے سوا شوہر کے اس فیصلے کی اذیت نا قابلِ برداشت تھی۔ منجمد ہوتے احساسات کے ساتھ اس کے ذہن میں گھور تاریکی چھانے لگی۔ لیکن نومولود کی بھوک سے بلکتی آواز نے وجود کا گلیشیر ایک پل میں پگھلا دیا۔ اس نے دیوانہ وار اسے اپنی چھاتی سے چمٹا لیا...... اولاد کے اس لمس نے مجبور و بے کس بیوی میں ایک ماں زندہ کر دی۔

اولاد کی تڑپ سے مکہ کی سنگلاخ پہاڑیوں میں دیوانہ وار بھاگنے والی ماں اپنے جگر کے ٹکڑے کی بقا کے لیے جبلی بہادری لیے پیدا ہوتی ہے۔ وہ نرم و نازک' لاغر اور لاوارث عورت اب صرف ایک 'ماں' بن کر مستقبل کا فوری لائحہ عمل تشکیل دے رہی تھی۔ ممتا کی حرارت سے پیٹ کا ایندھن بھرتے ہی بچے کو بھی سکون آ گیا۔

پلوشہ نے جابر خان کے شکاری تھیلے میں اپنا سامان' رقم اور چھوٹے موٹے زیورات کے ساتھ پچھلے نو ماہ میں بُنے ننھے موزے' سویٹر' ٹوپیاں بھی رکھ لیے۔ ایک بڑی سی چادر سے اپنا وجود ڈھانپے وہ ایک حتمی فیصلے پر پہنچ گئی تھی۔

☆☆☆

تاریکی' پہاڑوں سے لپٹے کہر اور شدید نقاہت کے باعث اس کی رگوں میں خون منجمد ہو رہا تھا لیکن سب کچھ نظر انداز کیے وہ حتی الامکان تیز تیز قدموں سے چلتی رہی۔ وہ کبھی کہیں اکیلی نہیں گئی تھی۔ پچھلے سال شوہر اسے اپنی ایک رشتے دار خاتون کے گھر تعزیت کے لیے لے کر گیا تھا۔ تب اسے اندازہ ہوا تھا کہ گھر سے نکلنے پر دو موڑ کاٹتے ہی پکی سڑک اور پھر مزید تھوڑی دور جانے پر بس مل جاتی ہے۔ اسے تب بھی بس سے اترتے خوش باش چہرے آزاد فضاؤں کے پنچھی لگے تھے۔

خوش قسمتی سے اس کے وہاں پہنچنے سے قبل ایک بس روانگی کے لیے تیار کھڑی تھی۔ وہ لپک کر اس میں سوار ہونے لگی تو کنڈکٹر نے اس کا بازو تھام کر کہا۔

''او بی بی! کدھر جاتی ہو؟''

''امارا ماں بہت بیمار ہے بھائی! ام کو جانا ہے...... اماری مدد کرو۔''

''کدھر رہتی ہے وہ؟''

''کراچی۔'' اس کے ہونٹوں سے اپنے باپ سے کئی بار سنا ایک نام پھسلا۔

''اچھا...... آؤ بیٹھو۔ ٹکٹ بنا دیتا ہوں تمہارا۔''

تھوڑی دیر بعد بس روانہ ہو گئی۔ جابر خان' اس کی جلاد بیویاں اور خوف کھڑکی سے نظر آتے مناظر کی طرح کہیں پیچھے رہ گئے۔ اب ایک ماں کے سفر کا آغاز ہو چکا تھا۔

☆☆☆

نیم غنودگی کی اس کیفیت میں وہ جانے کتنی دیر ہچکولے لیتی رہی...... بھوک اور نقاہت نے وجود میں پنجے گاڑے تو رستے میں بس کے رکنے پر ایک سڑک کنارے

ڈھابے سے دال روٹی لے کر کھالی اور کچھ ایک کاغذ میں لپیٹ کر اپنے تھیلے میں رکھ لی۔ اس کے جگر کا وہ ٹکڑا بدستور سینے سے لپٹا تھا۔

کراچی پہنچ کر بس سے باہر نکلتے ہی اس کے حواس باختہ ہوگئے۔ اتنا ہجوم تو اس نے درگاہ کے میلے میں بھی کبھی نہ دیکھا تھا۔ کھوے سے کھوا چھل رہا تھا۔ مرد اور عورتوں کو ایک ساتھ آزادانہ بے حجاب گھومتے دیکھ کر اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔

''خو بابا! اس شہر میں تم کیسے آ کر رہ لیا کرتے تھے؟''

شام کے سائے گہرے ہونے لگے تو اسے سر چھپانے کے لیے کسی جگہ کی ضرورت کا احساس ہونے لگا۔ انتظار گاہ کے ایک انتہائی کونے میں دبکی بیٹھی وہ نم آنکھوں سے آسمان کی وسعتوں کو دیکھنے لگی۔

''امارا مدد کرو خدایا! ام کیا کرے؟ کہاں جائے۔ ام کو کوئی رستہ دکھادو۔'' وہ بلکنے لگی۔

رات کے گیسو آسمان پر بکھر گئے تھے۔ بس اسٹینڈ کی رونق میں اب وہ گہما گہمی نہ رہی۔ مدھم ٹمٹماتی روشنیوں میں اِکادُکا افراد اور آس پاس منڈلاتی بلیاں اور کتے نظر آرہے تھے۔ اس کی آنکھیں نیند سے بوجھل ہونے لگیں۔

''کون ہو بی بی تم؟ یہاں اس پہر کیا کر رہی ہو؟''

پلوشہ چونک گئی۔ ایک ادھیڑ عمر آدمی مشکوک نگاہوں سے اسے گھور رہا تھا۔ ''یہ بچہ کس کا اُٹھا کر لائی ہو؟''

''اُٹھایا نہیں ہے...... یہ امارا بچہ ہے۔'' وہ تڑپ گئی۔

''تو پھر اس وقت یہاں کیا کر رہی ہو؟ کہیں کسی گاہک کی تلاش میں تو نہیں بیٹھیں؟'' اس بار وہ مزید سختی سے بولا۔

''خدا کا خوف کرو بھائی...... ام ایسا ویسا عورت نہیں ہے...... امارا شوہر نے گھر سے نکال دیا ہے...... اسے بیٹا چاہیے تھا ناں۔ ام اسے بیٹا نہ دے سکا۔ یہی قصور تھا امارا......''

''لاحول ولا قوۃ...... انسان تھا کہ کوئی حیوان...... اولاد تو رب کریم کا تحفہ ہوتی ہے...... اور یہ کفرانِ نعمت۔''

پلوشہ خاموش رہی۔

''اب تم یہاں کیا کر رہی ہو؟ کسی رشتے دار کے گھر چلی جاؤ۔''

''امارا کوئی رشتے دار نہیں۔''

''او خدایا! اس آدمی کو ذرا خیال نہ آیا کہ باہر تو بھیڑیے گھومتے ہیں۔ جوان بیوی اور بیٹی کو ان کے درندوں کے سامنے پھینک دیا۔ یہ تو تمہاری ہڈیاں تک بھنبھوڑ ڈالیں گے۔'' وہ حقیقتاً فکرمند تھا۔

''ام کیا کرے اب...... امارا تو کوئی بھی نہیں۔'' وہ سسکیاں بھرتے ہوئے بولی۔

''جس کا کوئی نہیں اس کا خدا تو ہوتا ہے ناں...... تم فکر نہ کرو۔'' اس باریش آدمی کی آنکھوں میں بھی اس کی حالت دیکھ کر نمی آگئی تھی۔ جانے کون سا دکھ تھا جو آنسوؤں کی صورت لیے اس کا درد بٹانے چلا آیا تھا۔ ''آؤ میرے ساتھ۔''

وہ کچھ سوچے سمجھے بغیر اپنی چادر سنبھالتی اس کے پیچھے چل دی۔ بس اسٹینڈ سے باہر نکل کر وہ کچھ دیر چلتے رہے۔ پھر ایک ٹیکسی رکوالی۔ پلوشہ کے لیے یہ شہر جادونگری تھا۔ ہر قدم پر ایک نیا اور انوکھا منظر اس کی حیرتوں میں اضافہ کرتا۔ اردگرد کے مناظر سے یکسر غافل وہ ٹیکسی رکنے پر اپنے خیالات کی رو سے باہر آئی تھی۔

وہ ایک بڑی سی عمارت کے سامنے کھڑے تھے جس کے باہر موجود ایک جھولا دیکھ کر اس کے دل سے کرب کی ایک ٹیس سی اُٹھی۔ ایسا ہی ایک جھولا تو جابر خان بھی پچھلے ماہ خرید کر لایا تھا۔ وہ اپنے 'بیٹے' کی ولادت کے لیے بہت خوش تھا۔ حضرت سائیں کی ہدایت کے مطابق وہ اسے درگاہ پر کھلے جنگلی پھول لا کر کھلاتا۔ بیٹے کی خواہش ایک جنون کا روپ دھار گئی تھی۔

باریش آدمی اُسے ایک سادہ سے کمرے میں لے آیا۔ اسے کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کرتا وہ ایک ادھیڑ عمر عورت کو اس کے حالات مختصراً بتانے لگا۔ عورت کے چہرے سے چھلکتی نرمی اور محبت پلوشہ کے دل کو تقویت دینے لگی۔ کسی وجدانی کیفیت کے تحت اسے اپنے تحفظ کا یقین ہو چلا تھا۔ کچھ دیر بعد وہ آدمی اس کے سر پر دستِ شفقت پھیرتا نرمی سے گویا ہوا:

''تمہیں بہت مضبوط ہاتھوں میں سونپے جا رہا ہوں...... اللہ تمہارا حامی و ناصر رہے۔''

اس کی روانگی کے بعد عورت نے انتہائی شفیق لہجے میں اس سے پوچھا۔ ''کچھ کھانے کے لیے منگواؤں تمہارے لیے بیٹی؟''

''نن...... نہیں...... شکریہ آپا! ام نے وہیں گاڑی سے نکل کر کھالیا تھا۔''

عورت نے مسکراتے ہوئے بچے کے چہرے سے

کمبل کا کونا ہٹایا اور بے اختیار بولی۔ ''ماشاء اللہ! چشمِ بددور...... بہت پیاری بیٹی ہے تمہاری...... کیا نام رکھا ہے اس کا؟'' وہ غالباً اس کا دھیان بٹانا چاہتی تھیں۔

''نام رکھنے کی نوبت ہی نہیں آئی آپا۔'' اس کی آنکھوں میں اداسی کے ساتھ ایک اور منظر لہرایا۔

''کچھ سوچا تو ہوگا آخر؟''

''رباب...... ام اس کا نام رباب رکھے گا...... امارا اماں کا نام تھا یہ۔''

''بہت پیارا نام ہے...... چلو آؤ! میں تمہیں باقی سب سے ملواتی ہوں۔'' اس عورت نے محبت سے کہا۔

اس عمارت میں پلوشہ کو بے شمار کمرے اور عورتیں نظر آئیں۔ سب نے خوشدلی سے اس کا استقبال کیا۔ پلوشہ کا دل بہل گیا۔ رباب کو دیکھ کر کوئی بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہتا۔ ان اجنبی عورتوں کے درمیان ایڈجسٹ ہونے میں اسے بالکل دقت نہ ہوئی۔ وہ سب اس کا خاندان بن گئی تھیں۔ اور اس خاندان میں ہر روز اس سے کہیں زیادہ مجبور اور بے کس عورتیں آیا کرتیں۔ ان کی بانہیں ہمیشہ وا اور دل کشادہ رہتے۔

پلوشہ کو وہاں رہتے دو سال بیت گئے۔

☆☆☆

اس ادارے کے متعلق اب اسے بہت سی باتوں کا علم ہو گیا تھا۔ خدا خوفی اور انسانی ہمدردی کے تحت قائم کیے گئے اس نظام نے جانے کتنی بے سہارا عورتوں اور بچوں کو اپنی چھایا میں شفیق والدین کی طرح پناہ دے رکھی تھی۔

پلوشہ وہاں بہت خوش تھی۔ رباب تو سب کی آنکھوں کا تارا تھی۔ لیکن وہ اسے کسی بھی عورت کے پاس زیادہ دیر رہنے نہ دیتی۔ اس کے آس پاس منڈلاتی رہتی۔ اسے رباب کے چھن جانے کا خوف بہت بے چین رکھتا تھا۔

آغاز میں جب وہ یہاں آئی تھی تو راتوں میں چیخیں مارتی اٹھ جایا کرتی۔ اسے خواب میں جابر خان نظر آتا جس کے ہاتھ میں موجود ایک بڑی سی تلوار کی نوک پر رباب کا خون آلود سر لٹک رہا ہوتا...... تو کبھی وہ اپنے پستول کی تمام تر گولیاں اس کے جسم میں اتار کر رباب کو اپنے ساتھ گھسیٹتا لے جاتا۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اسے یہ خواب تو کم نظر آتے لیکن رباب کو کوئی بھی نقصان پہنچنے کا اندیشہ اس کے دل و دماغ میں کنڈلی مارے بیٹھا رہا۔

ادارے میں رہائش پذیر عورتوں کو خود مختاری کی راہ پر چلانے کے لیے منتظمین نے انہیں کئی ایک ہنر سکھانے کا بندوبست بھی کر رکھا تھا۔ پلوشہ سلائی کڑھائی میں بہت ماہر تھی۔ ہاتھ میں بلا کی صفائی تھی۔ اس نے چادروں اور زنانہ ملبوسات پر اپنا ہنر آزمانا شروع کر دیا۔ اس کی بنائی کشیدہ کاری مارکیٹ میں ہاتھوں ہاتھ لی جاتی۔

وہ اپنی اس نئی زندگی میں بہت خوش تھی۔ اپنی کمائی اسے احساسِ محتاجی سے بچائے ہوئے تھی۔ رباب کی طرف سے بھی اسے کوئی پریشانی نہ تھی۔ وہ بہت صابر بچی تھی...... اپنے ہم عمر بچوں کی طرح ماں کو تنگ کرتی نہ کوئی ضد۔ وہ جہاں بٹھاتی' وہاں سے گھٹنوں نہ ہلتی۔

اس کی ذہانت کا بھی کوئی جواب نہ تھا۔ ادارے کی جانب سے بچوں کو قرآن ناظرہ اور بنیادی تعلیم کی سہولت بھی موجود تھی۔ رباب پڑھائی گئی ہر بات بہت جلد سیکھ لیتی۔ تین سال کی عمر میں ہی اس کی زبان دانی بہت واضح تھی۔ پلوشہ اسے دیکھ دیکھ کر جیتی۔ ماضی کا آسیب اب اعصاب پر اتنا حاوی نہ رہا تھا لیکن مستقبل کے اندیشے اب بھی بہت ہولاتے۔

اسے وہاں عورتوں کا رباب کو اپنے ساتھ چپکائے رکھنا بھی بہت ناگوار گزرتا۔

''پلوشہ! بچی کو کھلنے ملنے دیا کرو دوسرے بچوں میں۔'' اسے اکثر ایسے ہی کلمات سننے کو ملتے۔

''کھیلتی تو ہے وہ سب کے ساتھ اور کیسے کھلے ملے؟'' وہ دانستہ بے نیازی سے کہتی۔

''ہر وقت تو اس کا سایہ بنی رہتی ہو۔ اس کی شخصیت دب جائے گی اس طرح۔''

''امارا بیٹی ہے وہ...... ام اس کے لیے فکر مند رہتا ہے بس۔''

''کیسی فکر بھئی؟ ؟ یہاں اس کو کون نقصان پہنچا سکتا ہے۔''

''قسمت کبھی بتا کر وار نہیں کرتی...... ام کو اسی قسمت سے ڈر لگتا ہے۔'' وہ مضطرب سی ہو جاتی۔

''ارے ہٹاؤ بھی...... یوں کہو ناں کہ ہم پہ اعتبار نہیں تمہیں۔'' مقابل کو بہت برا لگتا۔

''اپنی قسمت پہ اعتبار نہیں...... بس۔ ورنہ آپ سب کے خلوص پہ ام کو کوئی شک نہیں۔'' وہ منظر سے ہٹنے میں ہی عافیت سمجھتی۔

آپا اکثر اسے اپنے پاس بلا کر اس کے کام کی بہت تعریف کرتیں۔ اس روز بھی انہوں نے اسے اپنے پاس بلا

بھیجا۔
''تمہارے ہاتھ کی صفائی کا جواب نہیں پلوشہ۔ میں نے اتنی نفاست اور عمدگی آج تک کسی کے کام میں نہیں دیکھی۔''
''بہت شکریہ آپا۔''
''تم میری چھوٹی بہنوں جیسی ہو میری چندا...... اور بہنوں میں شکریہ کا کوئی تکلف نہیں ہوتا۔'' ان کے پیار بھرے لہجے پر اس کا دل بھر آتا۔
''رباب کے بارے میں کیا سوچا ہے تم نے؟''
''سوچنا کیا ہے آپا؟ وہ امارے ساتھ ہی رہے گی ناں۔'' وہ گھبرا کر بولی۔
''بالکل تمہارے ساتھ ہی رہے گی...... میں تو اس کی پڑھائی لکھائی کے متعلق بات کر رہی ہوں پگلی۔''
''جی آپا! ام تو چاہتا ہے کہ وہ بہت سا پڑھے۔''
''تو پھر اسے کسی اچھے سے اسکول میں داخل کروانا ہوگا...... اتنی ذہین بچی تو ملک و قوم کا اثاثہ ہے۔ اسے ضائع نہیں کرنا چاہتی میں۔''
''نن...... نہیں آپا...... ام اسے خود سے دور نہیں کرنا چاہتا۔ وہ کہیں نہیں جائے گی۔'' اس کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔
اس کی حالت دیکھ کر وہ خاموش ہوگئیں۔ اسی اثنا میں ان کے پاس ملبوسات کے کچھ خاص ڈیزائن کی بابت بات چیت کے لیے مارکیٹ سے ایک نمائندہ چلا آیا۔ پلوشہ بے دھیانی میں وہاں سے چلی آئی۔ اس کے دل پر ایک قیامت بیت رہی تھی۔ رباب سے ایک پل کی علیحدگی بھی اسے گوارا نہ تھی۔
اس کے ذہن کے دریچوں پر کچھ سال پہلے کے کچھ مناظر نے ایک بار پھر دستک دی لیکن وہ اذیت سے سر جھٹکتی ایک بار پھر سوئی دھاگا میں الجھ گئی۔

☆☆☆

پلوشہ کی زندگی بیٹھے بٹھائے ایک آزار میں مبتلا ہوگئی تھی۔ آپا رباب کے داخلے کے لیے اس پر کئی بار دباؤ ڈال چکی تھیں۔ کبھی کبھی اس کا دل وہاں سے بھاگ جانے کے لیے مچلنے لگتا۔ لیکن بھاگ کر جاتی بھی کہاں؟
اس چاردیواری میں اپنی اور رباب کے تحفظ کی ضمانت اسے کوئی بھی قدم اٹھانے سے روکے ہوئے تھی۔
اس سرد رات میں اسے آپا نے ایک بار پھر گھیر لیا لیکن اس بار ان کا مدعا الگ تھا۔

''اکیلی عورت کے لیے ساری زندگی تنہا گزارنا بہت مشکل ہوتا ہے اور بچی کا ساتھ ہو تو یہ مشکل مزید دوبھر ہو جاتی ہے۔''
پلوشہ خاموشی اور ناسمجھی سے انہیں دیکھتی رہی۔
''تمہاری عمر کی لڑکیاں تو آزادانہ پڑھائی، نوکری اور خودمختار زندگی سے محظوظ ہوتی ہیں......'' انہوں نے تمہید باندھی۔
''یہ تو امارا قسمت ہے آپا۔'' اس نے سر جھکالیا۔
''تم چاہو تو تمہارے شوہر سے طلاق یا خلع دلوا کر دوسری شادی کا ذمہ بھی لے سکتے ہیں ہم۔'' انہوں نے متانت سے کہا۔
''نہیں آپا! ایسا سوچنا بھی مت...... وہ ام کو کبھی طلاق نہیں دے گا...... رباب کو بھی جان سے مار دے گا۔ خدا کے لیے ایسا سوچنا بھی مت۔''
''اچھا ٹھیک ہے...... ٹھیک ہے...... تم پُرسکون رہو...... تمہاری مرضی کے خلاف کچھ نہیں ہوگا...... اگر شادی ہو جاتی تو تم اور رباب ایک شاندار، بے خوف زندگی گزار لیتیں...... لیکن چلو خیر...... چھوڑو اِس بات کو۔'' آپا نے بات ختم کردی۔
پلوشہ اپنے کمرے میں لوٹ گئی۔
رباب کو اپنے سینے سے چمٹائے وہ بے آواز آنسوؤں سے روتی رہی۔
''کاش تم نے امارا رباب کو اپنا لیا ہوتا جابر خان...... کاش تم نے اس رات تھوڑا سا نرمی دکھایا ہوتا۔'' وہ اپنے ہونٹ کچلتے ہوئے ایک بار پھر انہی لمحات میں مقید ہوگئی۔

☆☆☆

رباب کے ننھے کپڑے اور دیگر سامان جابر خان ہی کے ایک تھیلے میں ڈالے وہ اپنی چادر لپیٹے وہاں سے جانے کے لیے تیار تھی۔
کہاں اور کیسے؟ یہ اسے خود بھی واضح نہ تھا۔
اسی پل جابر خان کمرے میں در آیا۔ اس کے چہرے پر برستی وحشت اسے ہولانے لگی۔ وہ اس کی تیاری دیکھ کر مزید بھپر گیا۔
''کہاں دفان ہو رہی ہے؟''
''کک...... کہیں نہیں خان...... کہیں بھی نہیں۔''
پلوشہ کی ٹانگیں لرزنے لگیں۔
''تو یہ چادر اور سامان لیے اپنا اماں کی شادی میں جا رہی ہے کیا؟'' وہ دہاڑا۔

''امارا اماں کو بیچ میں مت لاؤ خان......'' وہ اپنی مرحومہ ماں کی اس تذلیل پر چپ نہ رہ سکی۔

''تو اتنی رات کو یہ سامان باندھے اپنی اس گناہوں کی پوٹلی لیے کس عاشق کے ساتھ بھاگ رہی ہو؟''

''خدا کا خوف کرو خان! اپنی اولاد کو گناہوں کی پوٹلی مت بولو۔'' وہ رونے لگی۔

''تو اور کیا بولوں پھر؟ یہ امارا اولاد ہے ہی نہیں! سمجھی تو...... کسی اور کا بیج ہمارے آنگن میں بونے نہیں دے گا ام تجھے۔''

''یہ تمہارا ہی بچہ ہے خان! امارا یقین کرو۔''

''حضرت سائیں نے کہا تھا امارا بیٹا ہوگا...... وہ کبھی غلط پیش گوئی نہیں کرتے حرام خور!''

''حضرت سائیں کا کہا کوئی الہامی حکم نہیں خان...... اتنے شقی القلب مت بنو۔''

''بدکاری نے تیرے دماغ پر بے غیرتی کا پردہ بھی ڈال دیا ہے۔ تو حضرت سائیں کو جھوٹا کہہ کر اپنے گناہوں میں مزید اضافہ کر رہی ہے۔'' وہ غصے سے کف اُڑانے لگا۔

''ام جھوٹا ہے نہ بدکار۔ یہ تمہارا ہی اولاد......'' جابر کے زوردار تھپڑ نے اس کی بات مکمل نہ ہونے دی۔

''میں تجھے بھی مار دوں گا اور اس غلاظت کو بھی......''

اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔

اس نے ہاتھ میں پکڑا پستول بستر پر رکھا اور دونوں ہاتھوں سے رباب اور پلوشہ کی گردن دبوچ لی۔ خوف، وحشت اور جان بچانے کی جبلی آرزو میں وہ لڑکھڑا کر دو قدم دائیں جانب ہٹی اور یخ پڑتی انگلیوں سے بستر پر پڑا پستول تھام کر اس کا سارا بارود شوہر کے جسم میں اتار دیا۔

گرم لہو اور اسلحہ کی ٹھنڈک نے اس کا وجود شل کر دیا۔

وہ گھٹنوں کے بل وہیں فرش پر ڈھے کر زار و قطار روتی چلی گئی۔

''ام پہاڑوں کا بیٹی ہے خان...... ام نے تم سے بھی ٹوٹ کر محبت کی...... ہر زیادتی برداشت کی لیکن اپنی اولاد کی قربانی دینے کا حوصلہ ام میں نہیں۔''

جابر خان کی بے نور نگاہیں چھت پر گڑی تھیں...... اپنے جسم سے اس کے لہو کی باقیات صاف کرتی وہ وہاں سے چلی آئی۔

اس وقت اسے یقین تھا کہ وہ رباب کی پرورش بنا روک ٹوک خود مختاری سے کر لے گی لیکن وقت کی تیز دھار تلوار نے اس کے تمام ارادے خاک میں ملا دیے۔

دارالامان میں گزارے ان ماہ و سال نے اسے شوہر اور سائبان کی ضرورت کا احساس دلا دیا تھا۔

لیکن وہ اپنی ہی غلط بیانی کے دام میں بری طرح پھنس گئی۔ اتنے عرصے سے جھوٹ کی بنیاد پر گزاری اس نئی زندگی میں اب یکدم اپنی 'بیوگی' کا راز کیسے آشکار کر دیتی؟ آپا کے کہنے کے مطابق طلاق یا خلع بھی کیونکر لی جا سکتی تھی۔

وہ اس مدافعانہ قتل کے جال میں بری طرح الجھ گئی تھی۔ احساسِ بے بسی سے اس نے اپنی جلتی آنکھیں میچ لیں۔

''امارا مدد کرو خدایا!'' اس کے دل سے ایک تڑپ اٹھی۔

اسی پل ذہن میں ایک جھماکا ہوا۔ اسے اپنے جھوٹ کو نبھانے کی ایک راہ سوجھ گئی تھی۔ وہ اب سنجیدگی سے اس نوخیز خیال کے تمام پہلوؤں پر غور کرنے لگی۔

☆☆☆

دارالامان کی سرگرمیاں حسبِ معمول جاری تھیں۔ اس کی بنائی ہوئی چادروں کی مقبولیت میں مزید اضافہ ہونے لگا۔ مارکیٹ ایجنٹس اکثر اپنے مطلوبہ معیار کی اشیا بنوانے کے لیے آپا ہی کی موجودگی میں اس سے براہِ راست بات کر لیا کرتے۔ وہ بہت ذہانت سے ان کے مطالبات ذہن نشین کرتی اور اگلی بار ان کی توقعات سے کہیں بڑھ کر مال تیار کر دیتی۔

اس بات چیت اور اپنی محنت کے سبب ملنے والی ستائش نے اس کے اعتماد میں کئی گنا اضافہ کیا تھا۔ ذہن میں ایک منصوبہ مکمل جزئیات سے موجود تھا۔ اسے صرف ایک بہترین موقع کی تلاش تھی...... ایک ایسا موقع جس پر وہ اپنا آخری داؤ کھیل کر وجود سے لپٹی نادیدہ بیڑیوں سے آزاد ہو جاتی۔

اور پھر قدرت اس پر مہربان ہو ہی گئی۔

☆☆☆

ملک کے پہاڑی علاقوں میں آنے والا زلزلہ بہت بھیانک تھا۔

اُمّت کا خوابیدہ ایمان جگاتے اس زلزلے کی تباہی زبان زدِ عام تھی۔ اس روز صبح ہی سے ٹی وی پر بس یہی ایک خبر بار بار دکھائی جا رہی تھی۔ ادارے کی عورتوں کے لیے ایک کامن روم میں چھوٹا سا ٹی وی سیٹ رکھا تھا جہاں آج وہ سبھی اپنے گناہوں کی معافی طلب کرتی ان مناظر کو دیکھ رہی تھیں۔

پلوشہ بظاہر اپنے کام میں مگن تھی لیکن اندر باہر آتے جاتے اس نے اپنی ٹائمنگ سیٹ کر لی۔ اسکرین پر ایک پہاڑی علاقے کے کچھ مناظر ابھرتے ہی اس کی لرزہ خیز چیخ نے سبھی عورتوں کو اس کی طرف متوجہ کر دیا۔

وہ پھٹی پھٹی نگاہوں سے ٹیلی ویژن کو دیکھتی خشک پتے کی طرح کانپ رہی تھی۔ اس کی یہ حالت دیکھ کر سلمٰی بھاگم بھاگ آپا کو بلا لائی۔

''پلوشہ! کیا ہوا میری چندا؟ کیا دیکھ لیا ایسا؟'' انہوں نے پریشانی سے استفسار کیا۔

وہ دیوانہ وار رباب کو تلاشنے لگی۔ اسے اپنے ساتھ لپٹائے وہ دھاڑیں مار مار کر رو رہی تھی۔

''کیا ہو گیا ہے پلوشہ تمہیں؟ تم تو بہت بہادر ہو...... یہ اچانک کیا افتاد آن پڑی؟'' نازیہ نے اسے تقریباً جھنجوڑ ڈالا۔

''ام بیوہ ہو گیا آپا...... امارا رباب یتیم ہو گیا......'' اس کی ہچکیاں بندھ گئیں۔ ''وہ دہاں خان اور زرینہ کا گھر، ملبا اور لاشیں ام نے خود دیکھا......''

آپا نے اسے محبت سے گلے لگا لیا اور دھیرے دھیرے اس کی پشت سہلانے لگیں۔

''وہ بہت اچھا تھا آپا...... امارا خیال بھی رکھتا تھا...... ہر نعمت اس نے ام کو دی...... لیکن امارا رباب کو قبول نہ کر سکا...... زندگی کا ہر سکون دیا اس نے ام کو......''

''یہ تو قانونِ قدرت ہے پلوشہ! ہر جاندار نے موت سے بغلگیر ہونا ہے...... تم حوصلہ رکھو میری بہن! اس میں بھی ضرور تمہاری کوئی بہتری ہو گی۔'' وہ اسے تھپکتے ہوئے کہنے لگیں۔

دیگر عورتیں بھی اسے اپنی جانب سے حتیٰ المقدور تسلی تشفی دے رہی تھیں۔ وہ اس کی کم گوئی اور لیے دیے رہنے والی فطرت کے باوجود اس سے بہت انس رکھتی تھیں اور اس کی حالت پر حقیقتاً دکھی تھیں۔

پلوشہ کی عدت کا آغاز ہو گیا۔

☆☆☆

وقت اپنی مخصوص صوتی رتھ پر سوار گزرتا رہا۔

اس کی عدت مکمل ہوئے بھی کئی ماہ بیت گئے اور ایک روز آپا نے پھر اسے اپنے پاس بلا بھیجا۔

''مجھے تم سے بہت ضروری بات کرنی ہے پلوشہ!''

''حکم کریں آپا!''

''تمہارے شوہر کی موت کا مجھے بہت افسوس ہے...... اگر زندگی مہلت دیتی تو شاید اپنی پھول سی بچی کے لیے اس کے دل میں رحم پیدا ہو ہی جاتا۔''

''ام بھی اسی آس پر زندگی گزار رہا تھا آپا...... کہ شاید کبھی کسی روز وہ رباب کو اپنانے لوٹ آتا...... لیکن وہ تو ان رستوں کا راہی بن گیا جہاں سے واپسی ممکن ہی نہیں۔'' اس کی آواز بھر آئی۔

''میرا تم سے کوئی خونی رشتہ تو نہیں لیکن خدا گواہ ہے تم مجھے اپنی بہنوں ہی کی طرح عزیز ہو۔''

''ام کو معلوم ہے آپا!''

''تمہارے سامنے پہاڑ جیسی زندگی پڑی ہے...... ہم نے یہاں اب تک کئی بے سہارا عورتوں کے گھر دوبارہ بسائے ہیں۔ تم بھی اس بارے میں ضرور سوچنا...... اب تو کوئی رکاوٹ بھی نہیں...... تم ایک بہترین زندگی کی حق دار ہو۔'' وہ نرمی سے بولیں۔

''آپا! یہ آسان نہیں ہو گا امارے لیے۔'' وہ جز بز ہوئی۔

''زندگی جمود کا نام نہیں ہے میری چندا اور نہ ہی مرنے والوں کے ساتھ کوئی اپنا آپ مار سکتا ہے۔ آگے بڑھو اور اپنے حصے کی خوشیاں وصولو۔''

''ام سے کون شادی کرے گا...... ایک بچی ہے اماری......'' وہ نیم رضامندی سے بولی۔

''تم رضامند ہو جاؤ تو یہ کوئی مشکل مرحلہ نہیں...... کس چیز کی کمی ہے آخر تم میں؟''

''امارے لیے تو رباب اور اس کا تحفظ سب سے مقدم ہے آپا!'' اس نے ڈھکے چھپے انداز میں اپنا مدعا بیان کیا۔

''میں جانتی ہوں...... اور میرے پاس ایک بہترین آپشن موجود ہے تبھی تو تمہیں بلایا ہے آج۔''

پلوشہ خاموشی سے ان کی جانب دیکھتی رہی۔

''تمہاری عدت سے قبل حسن اکثر کچھ ڈیزائنز کی تیاری کے لیے یہاں آتا تھا...... یاد ہے تمہیں؟''

''جی! کچھ کچھ یاد تو ہے۔''

''اس نے مجھ سے تمہاری شادی کی بات کی ہے لیکن عدت کے باعث میں نے تمہیں بتانا مناسب نہیں سمجھا۔''

''مگر آپا! وہ تو اتنا پڑھا لکھا کاروباری بندہ ہے...... وہ امارا بچی کو کیوں قبول کرے گا بھلا؟'' اس نے الجھ کر پوچھا۔

''وہ بچی ہی کی وجہ سے تو اپنانا چاہتا ہے تمہیں......

بہت اچھا اور شریف النفس آدمی ہے...... تمہاری اور رباب کی حفاظت میں کوئی کوتاہی نہیں کرے گا۔ بھروسا رکھو میرے تجربے پر۔''

''امارا تو عرش پر خدا اور زمین پر بس آپ ہی سہارا ہو۔'' وہ خلوصِ دل سے بولی۔

''تم اچھی طرح سوچ بچار کرلو...... کسی دباؤ کے تحت کوئی فیصلہ نہیں کرنا۔''

پلوشہ اثبات میں سر ہلا کے اُٹھ گئی۔

☆☆☆

ایک ہفتے بعد اس نے حسن سے شادی کی ہامی بھر لی۔

دارالامان سے اسے بھرپور محبتوں اور دعاؤں کے سائے میں رخصت کیا گیا۔ یہاں گزرے چھ سالوں کی یاد آنکھوں میں نمی بن کر چمکی تھی۔ وہ آپا اور سب ساتھیوں کے اصرار کے باوجود رباب کو رخصتی کے وقت اپنے ساتھ ہی لے آئی تھی۔

آنے والے وقت کی بابت اس نے کوئی لائحہ عمل تو نہ بنایا تھا لیکن بیٹی کی پرورش وہ مکمل انفرادی آزادی ہی کے تحت کرنا چاہتی تھی۔ نئے شوہر سے متعلق کچھ خدشات بھی بہرحال لاحق تھے جو حسن کے مہذبانہ اطوار اور اندازِ گفتگو نے اولین رات ہی زائل کردیے۔

''میاں بیوی ایک دوسرے کا لباس ہوتے ہیں...... باہمی عیب ڈھانپتے ہیں...... یہی اس رشتے کا اصل حُسن ہوتا ہے پلوشہ۔'' حسن نے دھیمی آواز میں اپنی بات کا آغاز کیا تھا۔ اس کی یہ شائستگی و متانت اس کے لیے بہت خوشگوار تجربہ تھی۔

''ایک بات پوچھوں آپ سے؟'' وہ اس کی نرمی سے تھوڑی شہ پاکر بولی۔

''ضرور پوچھو بھئی!''

''آپ اتنا اچھا آدمی ہے۔ پیسے والا بھی ہے...... پھر ام سے شادی کیوں کی؟ آپ کو تو کوئی بھی لڑکی خوشی خوشی قبول کرلیتی۔''

وہ اس کی معصومیت بھرے انداز پر مسکرائے بغیر نہ رہ سکا لیکن اس مسکراہٹ میں بھی کسی زخم کی جھلک پلوشہ کو بخوبی محسوس ہوگئی تھی۔

''میں اسی بات کی طرف آرہا تھا۔'' اس نے ہولے سے گلا کھنکھارا۔'' مجھے قبول کرنے کے لیے بہت دل گردے کی ضرورت ہے...... جو ہر کس و ناکس کے بس میں بالکل نہیں۔''

''ام سمجھا نہیں۔''

''میرا وجود کسی کے لیے خوشی کا باعث نہیں بن سکتا پلوشہ...... میں ایک ادھورا انسان ہوں۔'' وہ ہونٹ کاٹتے ہوئے بولا۔

وہ اب خاموشی سے اس کے مزید انکشافات کی منتظر تھی۔

☆☆☆

حسن علی جنوبی پنجاب کے ایک مشہور شہر میں رہتا تھا۔

اس کے والد علی احمد کی محلے میں ہی کریانہ کی چھوٹی سی دکان تھی۔ ان کی زندگی بہت اچھی نہیں تو بری بھی نہیں تھی۔ اچھا کھاتے پہنتے اوڑھتے تھے۔ اپنے علاقے کے بہت سے لوگوں کی نسبت وہ ایک معقول زندگی بسر کررہے تھے۔ حسن علی کے علاوہ ان کا ایک اور بیٹا تھا جو بچپن میں گلے پر پتنگ کی ڈور پھر جانے سے اسپتال جانے سے قبل ہی اپنی اصل منزل تک جا پہنچا۔ اس کے بعد ان کی امیدوں اور آرزوؤں کا واحد محور صرف حسن تھا۔ اس کی ہر بات بے چون وچرا تسلیم کرلی جاتی۔ اکلوتی اولاد کے چھن جانے کے خوف نے اس کے والدین کو بہت بزدل بنادیا تھا۔

علی احمد سارا دن اپنی دکان پر مصروف رہتا اور ماں گھرداری میں۔ ان حالات میں اسکول کے بعد نچلے طبقے کے پڑھائی سے جان چھڑانے اور اپنے ماں باپ کی سختیوں سے گھبرائے ان لڑکوں کے ساتھ آوارہ گردی کرنے میں اسے کسی قسم کا کوئی خوف نہ تھا۔ سارا دن سڑکیں ناپ کر وہ شام ڈھلے گھر آتا تو ماں کو مطمئن کرنے کے لیے اس کے پاس ایک ہی بہانہ ہوتا۔

''ہم سب دوست پڑھائی کے لیے اسکول ہی کے ماسٹر صاحب کے گھر پڑھنے چلے جاتے ہیں۔''

''تو اس ماسٹر کی فیس کون بھرتا ہے؟'' ماں مشکوک ہوکر پوچھتی۔

''ہم بدلے میں ان کے چھوٹے موٹے کام کردیتے ہیں، سودا سلف لادیتے ہیں...... وہ اسی میں خوش ہوجاتے ہیں۔'' وہ بے نیازی سے کہتا۔

کوثر نے ایک دو بار شوہر سے اس مسئلے پر گفتگو کرنا چاہی لیکن وہ سنجیدہ نہ ہوا اور بے پروائی سے کہا۔

''وہ لڑکی ذات نہیں ہے بھلیے لوکے! اُسے چار دیواری میں قید کرکے نہیں رکھا جاسکتا۔''

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

''لیکن آخر پتا بھی تو چلے کن دوستوں کے ساتھ رہتا ہے سارا دن؟'' ماں کے اندیشے بے جا نہ تھے۔

''اچھا تو میں ایک کام کرتا ہوں...... دکان پر تالے ڈال دیتا ہوں...... اور بیٹے کی چوکیداری شروع کر دیتا ہوں۔'' وہ بیزاری سے بولا۔

''تم سے تو بات کرنی ہی فضول ہے۔'' کوثر غصے سے کہتی اٹھ گئی۔

بات آئی گئی ہوگئی۔ حسن کے معمولات میں کوئی فرق نہ آیا۔ اس نے میٹرک کے بعد مزید پڑھائی سے انکار کر دیا۔

''پڑھنا نہیں تو پھر میرے ساتھ دکان پر بیٹھ جایا کر۔ میری بوڑھی ہڈیوں کو بھی تھوڑا آرام نصیب ہو۔'' علی احمد نے اسے فوری تجویز دی۔

''یہ دکان داری میرا معیار نہیں ہے ابا جی! میں کوئی اور کام کرنا چاہتا ہوں۔'' اس نے نخوت سے کہا۔

''اور کونسی افسری کرنی ہے تجھے؟'' ماں نے چمک کر پوچھا۔

''میرے دوست کا ایک ماموں مارکیٹ میں اپنی دکان فروخت کر رہا ہے...... کمپیوٹر اور انٹرنیٹ کی سہولت دیتا تھا وہ لڑکوں کو۔ صاف ستھرا دفتری کام ہے۔ کسی مالک یا گاہکوں کی کوئی چخ چخ نہیں۔'' اس نے سادہ لوح والدین کو گھیرتے ہوئے کہا۔ ''پڑھ لکھ کر بھی تو آخر چاکری ہی کرنی ہے نہیں۔''

''کتنے میں بیچ رہا ہے وہ؟''

''بینک میں موجود رقم سے بھی کم دام میں۔'' وہ ہوشیاری سے بولا۔

''اچھا ٹھیک ہے...... اگر تجھے یہ کام پسند ہے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔'' حسبِ توقع علی احمد بہت آرام سے راضی ہوگیا۔

حسن بھاگم بھاگ بازار سے مٹھائی لے آیا۔ والدین کا منہ میٹھا کرواتے اس نے اپنے ذہن میں پنپتے منصوبوں کی انہیں ہوا بھی نہ لگنے دی۔ موبائل فونز کے اس دور میں کمپیوٹر اور انٹرنیٹ کے لیے بازاروں میں خوار ہونے کے لیے اب اس نئی نسل کے پاس قطعی وقت نہ تھا۔ اس کے دوست کا ماموں اسی خسارے کے باعث اپنا کاروبار سمیٹ رہا تھا۔

حسن اسی نسل کا نمائندہ تھا اور بخوبی جانتا تھا کہ گاہکوں کو گھیرنے کے لیے اسے کچھ نیا چارا ڈالنا ہوگا۔ اور ایسے ہی کئی ایک چارے اس کے دماغ میں مکمل جزئیات سے محفوظ تھے۔

اس نے اپنی دکان میں 'شیشہ اور الکحل' کی فراہمی کے ساتھ پچھلی جانب مخصوص کیبن بنوا کر لڑکوں اور لڑکیوں کو 'ملاقات' کے لیے 'گھریلو ماحول' بھی فراہم کرنا شروع کر دیا۔ نتیجتاً اس کا کاروبار راتوں رات آسمان کی بلندیوں تک جا پہنچا تھا۔

☆☆☆

کوئلوں کی دلالی میں ہاتھ کالے ہونا تو روزِ اول سے طے ہے۔

حسن بھی اپنے اس کاروبار کے 'ثمرات' سے مکمل مستفید ہوتا رہتا تھا۔ نشے کی علتوں کے ساتھ اسے لڑکیوں کی 'لت' بھی بری طرح لگ گئی تھی۔ قانونی انتظامیہ کو ان کا مطلوبہ 'حصہ' پہنچ جاتا' وہ بھی اس کی طرف سے مکمل آنکھیں موندے بیٹھی تھی۔

اس کاروبار کو پانچ سال بیت گئے۔ نشے نے اسے جسمانی طور پر اچھا خاصا تباہ کر ڈالا تھا لیکن وہ آنکھیں موندے سرپٹ اس 'میدانِ لذت' میں بھاگ رہا تھا۔ اور پھر ایک ہی جھٹکے میں اس کے پاوں تلے سے زمین کھینچ لی گئی۔

اس کے 'کیفے' کی مقبولیت کی وجہ سے اسی علاقے میں ایک دو لوگوں نے اسی طرز پر اپنے قدم جمانے کی کوشش کی لیکن ناکام رہے۔ حسن کا دماغ مزید ساتویں آسمان کی سیر کرنے لگا۔ اسی دوران زین نامی ایک لڑکا اس کا حریف بن کر میدان میں کود پڑا۔

زین کا ایک رشتے دار پولیس میں اونچے عہدے پر تھا۔ لہٰذا اسے 'حصے' کے ساتھ 'رشتے داری' کا بونس بھی حاصل تھا۔ حسن کے کچھ بھی کرنے یا حفاظتی تدابیر اختیار کرنے سے قبل ہی اس کے کیفے پر کریک ڈاون کر کے معاون عملے اور موقع پر موجود لڑکیوں 'لڑکوں سمیت اسے حوالات میں پھینک دیا گیا۔

شام تک وہ اس کھردرے' ناہموار فرش پر بیٹھے اپنی قسمت کے اس پھیر کو کوستے رہے۔ ان میں سے کئی لڑکے اپنے 'تعلقات' کی بنا پر اپنے ساتھ قید لڑکیوں کی رہائی میں بھی کامیاب ہوگئے تھے۔ حسن نے بھی ڈیوٹی پر موجود اس پولیس والے کی بہتیری منت سماجت کی۔ وہ بھی ایک فون کال کے بعد یہاں سے بخوبی باہر نکل سکتا تھا۔ لیکن کسی نے اس کی ایک نہ سنی۔

اس رات کی آمد تک وہ سمجھ چکا تھا کہ اس کے بارے میں خاصے سخت احکامات جاری ہوئے ہیں۔ تھک ہار کر وہ وہیں بیٹھ گیا۔ اسے علم تھا کہ جلد یابدیر 'بلی تھیلے سے باہر آجائے گی۔ تھوڑی ہی دیر بعد اسے ایک ایس پی کے سامنے پیش کر دیا گیا۔ اس کے سخت گیر چہرے پر کرختگی گویا ثبت ہو چکی تھی۔ آنکھوں سے پھوٹتے شرارے مقابل کو بھسم کرنے کے درپے نظر آتے تھے۔

''لے بیٹا حسن! لگتا ہے تیرے زوال کا وقت شروع ہو گیا ہے۔'' اس نے خود کلامی کی۔

''کپڑے اتارو اِس کے سارے۔'' اس کا پہلا ہی حکم حسن کے لیے کسی کوڑے سے کم نہ تھا۔

''میں نے کونسا گناہ کر دیا ہے آخر؟ جس کی مجھے یہ سزا دی جارہی ہے۔'' وہ چیخ گیا۔ ''تم سب لوگوں کا حصہ پہنچا تا رہا ہوں۔ پھر یہ ناانصافی کیوں ہو رہی ہے میرے ساتھ؟''

''اوئے چپ کر ناانصافی کے گھوڑے!'' ایس پی دہاڑا۔ ''تجھے شریف گھرانوں کی بہو بیٹیوں کی عزت خراب کرنے کی اجازت کس نے دی تھی؟''

''میں کسی کو گھر سے پکڑ کر نہیں لاتا تھا...... وہ سب خود آتے تھے میرے پاس۔'' حسن کا دماغ بھی بالکل الٹ چکا تھا۔

''وہ آتے تھے' اپنے منہ کالے کرتے اور تو ان کی ویڈیو ریکارڈنگ کر لیا کرتا۔'' اس نے تنفر سے کہا۔

''میں کیوں کروں گا ایسا؟ اپنے کاروبار کی گڈ ول کیوں خراب کروں گا میں۔'' اسے اس الزام کا سر پیر سمجھ ہی نہ آرہا تھا۔

''اوئے رشید! سنا نہیں تو نے...... کپڑے اتار اِس بِلّے کے۔ بڑی چیاؤں میاؤں کر رہا ہے یہ...... اس کی زبان بند کرتا ہوں میں ابھی۔'' ایس پی امتیاز ملک نے کمرے میں موجود ایک اے ایس آئی سے کہا۔

اس کے کپڑے تن سے جدا کر دیے گئے۔ حسن اس لمحہ پل پل مر رہا تھا۔ امتیاز کے اشارے پر اے ایس آئی نے اس پر حیا سوز تشدد کی انتہا کر دی۔ اس کے جسم کا ہر حصہ بری طرح رگیدا گیا۔ جسمانی ناطاقتی کا شکار حسن اس تشدد کے سامنے مکمل ڈھے گیا۔ امتیاز کی مزید کچھ باتوں سے اسے تمام گیم کی سمجھ آگئی۔

اس کے حریف گروپ کے کسی لڑکے نے ذرا اونچا ہاتھ مارتے ہوئے انہی کے قبیلے کی کوئی لڑکی اپنے دام میں جکڑ لی تھی۔ 'ایڈونچر' کی دلدادہ اس لڑکی کو دانستہ طور پر اس کے کیفے کے 'خفیہ' حصے میں لایا گیا اور وہاں گزارے 'لمحات' کی ویڈیو بنا کر اسی کے کیفے سے انٹرنیٹ پر ڈال دی گئی۔

زخم زخم وجود کے ساتھ برہنہ حالت میں زمین پر لیٹے حسن نے اس لمحہ شدت سے موت کی دعا کی۔ لیکن ابھی اس دعا کی قبولیت کا وقت ہی نہ آیا تھا۔

اس پر ہونے والے تشدد کے نتیجے میں وہ اپنی مردانگی کا بھرم کھو بیٹھا۔ کھوکھلے وجود میں جب گناہوں کی مزید تاب نہ رہی تو اس کے پاس اپنے 'اصل' کی طرف لوٹنے کے سوا کوئی چارہ نہ رہا۔ وہ سچے دل سے تائب ہو گیا۔

والدین اس واقعے سے محض اس حد تک باخبر تھے کہ کاروباری دشمنی کے باعث اسے جھوٹے الزام میں پولیس کے حوالے کیا گیا۔ اس واقعے کے قیامت خیز اثرات سے وہ ہمیشہ بے خبر رہے۔

وہ اس پر شادی کے لیے دباؤ ڈالتے لیکن حسن انہیں بڑی سہولت سے ٹال دیتا۔ سابقہ کاروبار میں گھاٹے کا بہانہ بنا کر اس نے ریڈی میڈ ملبوسات اور ہاتھ سے بنی کشیدہ کاری کی چادروں کی سپلائی شروع کر دی۔ حلال رزق کی برکت ہوئی تو والدین کو لیے اپنا سابقہ علاقہ چھوڑ کر دوسرے علاقے میں منتقل ہو گیا۔

اپنی توبہ پر وہ ہمیشہ کاربند رہا۔ والدین شادی کا اصرار کرتے ملکِ عدم سدھار گئے۔ تنہا زندگی کا آزار ان کے جانے کے بعد معلوم ہوا تھا۔ بہت سوچنے کے بعد اس نے کسی یتیم و بے آسرا کو اپنا سہارا دینے کا فیصلہ کیا۔ شاید اس طرح وہ اپنی گناہ گار زندگی کا مزید کفارہ ادا کرنے میں کامیاب رہتا۔

ایک دوست کی دعوت پر وہ کچھ سال قبل اپنے تیار کردہ مال کے نمونے لیے کراچی آیا تھا۔ یہاں پلوشہ کی صورت میں اسے اپنی تلاش ختم ہوتی محسوس ہوئی۔ اس نے ایک آخری داؤ کھیلنے کی کوشش کی تھی۔ اگر ناکام رہتا تو خاموشی سے پنجاب واپس لوٹ جاتا اور کسی حرفِ غلط کی طرح شادی کا تصور ہی بھول جاتا۔

☆☆☆

پلوشہ دم سادھے اس کے انکشافات سن رہی تھی۔

''خاندان میں اِکا دُکا رشتے دار موجود ہیں جو میرے شادی سے انکار پر مختلف چہ مگوئیاں کرنے لگے ہیں۔ میں ایک یتیم کو اپنا نام دے کر لاشعوری طور پر انہیں اپنے وجود کی تکمیل کا احساس دلانا چاہتا تھا۔ اِسے میری خودغرضی سمجھو

یا مجبوری...... میں رباب کو سچے دل سے ایک باپ جیسا سائبان دینا چاہتا ہوں۔'' اپنی بات مکمل کرتے وہ ہانپنے لگا تھا۔ ''اگر تمہیں اس ادھورے انسان کا ساتھ قبول نہیں...... تو میں اس رشتے کو ختم کردوں گا۔''

پلوشہ کے دل میں اس شخص کے لیے بے اختیار محبت اُمڈ آئی۔ وہ اس کے مضبوط بازو پر اپنا ہاتھ رکھے بولی۔

''ام آپ کے ساتھ ہے حسن! کسی بھی مجبوری اور بندش کے بغیر...... رباب میرا نہیں' اب آپ کا بھی اولاد ہے۔''

''میں تمہیں اور ہماری بچی کو بہت خوش رکھوں گا۔ دنیا کی ہر نعمت لا کر دوں گا۔'' وہ اپنے جذبوں کی تمام تر صداقت سے بولا۔

ان قسمت گزیدہ دونوں افراد کا آخری داؤ کامیاب رہا تھا۔

زندگی میں ایک خوشگوار تبدیلی در آئی۔ شوہر کی محبت اور نرم خوئی نے اسے ایک نئے جذبے سے روشناس کروایا۔ اس خوبصورتی' ز ماہٹ اور لذت سے وہ پہلے کبھی آگاہ ہی نہ تھی۔ وہ رباب کا بھی بے حد خیال رکھتا۔ اس کی محبت میں پلوشہ کو کبھی کوئی کھوٹ نظر نہ آئی۔

ایک ادھورے اور نامکمل انسان نے اس کی زندگی کو بے تحاشا رنگ و روشنی سے مکمل کردیا تھا۔ وہ شکرانہ بجالاتے نہ تھکتی۔

☆☆☆

شادی کے کچھ ماہ بعد حسن نے واپسی کا قصد کرلیا۔

وہ اپنی زمین اور خاک اوڑھے والدین کی یادوں سے اٹے اسی شہر میں منتقل ہونا چاہتا تھا۔ یہاں کا کاروبار اپنے دوست کو فروخت کر کے اس نے واپسی کے تمام انتظامات مکمل کرلیے۔

پنجاب روانگی سے قبل وہ دارالامان کی ساتھیوں اور آپا کے لیے ڈھیروں تحائف لیے ان سے ملنے پہنچ گئی۔ رباب بھی اس کے ساتھ ہی تھی۔ اس کے چہرے کی طمانیت اور آنکھوں میں چمک نے حالِ دل بزبان خاموشی کہہ ڈالا۔

''خوش ہوناں پلوشہ؟'' آپا نے مسکرا کر پوچھا۔

''جی آپا! اللہ پاک نے بہت کرم کیا ہے۔''

''پروردگار یہ خوشیاں سلامت رکھے اور جلد ہی تمہاری گود ہری کرے۔''

وہ یکدم خاموش ہوگئی اور بدقت بولی۔ ''شکریہ آپا...... ام کو اجازت دو اب...... آپ سب کی بہت یاد آئے گی۔''

وہ سب سے فرداً فرداً مل کر لوٹ آئی۔

ایک ہفتے بعد وہ حسن کے ساتھ پنجاب منتقل ہوگئی۔

اس نئی سرزمین پر ایک نئی زندگی کے آغاز میں اسے کوئی دقت نہ ہوئی۔ اپنا وطن چھوڑنے کے بعد اسے اب کوئی بھی ہجرت مشکل نہیں لگتی تھی۔ اپنی قسمت کے اس پھیر کو دل سے قبول کرنے کے بعد ہی زندگی پُرسکون گزر سکتی تھی۔

اپنے وطن سے جڑی یادیں تو وہ کبھی فراموش کر ہی نہ پائی تھی۔ بلند و بالا پہاڑوں سے مدھر نغموں کی طرح بہتے چشمے' کچے صحن اور چھوٹے کمروں پر مشتمل ایک گھر' جس میں وہ اپنے والدین اور چھوٹے بھائی کے ساتھ خود کو کسی جنت میں محسوس کیا کرتی۔ لیکن امن و آشتی کا وہ دور بہت مختصر تھا۔

جنگ کے شعلوں نے ان کی زندگیاں بھسم کردیں۔ آئے روز ہونے والے دھماکوں اور حملوں کی زد میں بھائی محب اللہ اور اس کی ماں رباب بھی آگئے۔ ان کی سوختہ لاشیں اپنی نظروں کے سامنے دفن ہوتے دیکھ کر پلوشہ کی روح میں ناقابلِ اندمل گھاؤ لگے تھے۔ دل کے ایک کونے سے ہمیشہ لہو رِستا۔ ازدواجی زندگی کی مسرتیں بھی اس کمی اور محرومی کا ازالہ نہیں کرپائی تھیں۔

اس کی روح تو آج بھی انہی پہاڑوں میں بھٹکتی۔ ہاں' بس یہ جسدِ خاکی اپنے دنیاوی فرائض نبھاتا چلا آرہا تھا۔ والدین اور بھائی کی جدائی کے بعد رباب کا وجود اس کی شدید دیوانگی کی زد میں تھا۔ وہ اب بھی اسے ایک لمحہ کے لیے خود سے جدا نہیں ہونے دیتی تھی۔ وہ نازک سی گڑیا جیسی بچی اپنی عمر سے بہت چھوٹی لگتی۔

حسن نے یہاں آمد کے بعد اپنے تعلقات استعمال کرتے ہوئے ان دونوں کے شناختی کاغذات دوبارہ بنوائے جن کی رُو سے پلوشہ اسی ملک کی رہائشی اور رباب ان کی سگی اولاد قرار پائی۔ وہ انہیں کسی بھی قسم کی تنگی و ترشی کا احساس نہ ہونے دیتا۔ پلوشہ اپنے اس آخری داؤ کی کامیابی پر بہت خوش تھی۔ وہ رباب کی آزادانہ اور خودمختار پرورش کے لیے آزاد تھی مگر حسن کچھ اور ہی منصوبے بنائے بیٹھا تھا۔ جن کا علم ہوتے ہی اس نے ایک ہنگامہ برپا کردیا۔

☆☆☆

''آخر تم سمجھتی کیوں نہیں ہو پلوشہ! یہ سب بہت ضروری ہے۔'' حسن نے جھنجلا کر کہا۔

''ام اسے ضروری نہیں سمجھتا۔'' وہ بیزاری سے بولی۔

''پڑھائی کے بغیر اس دنیا میں جینا آسان نہیں ہے...... یہ دنیا ایک جنگل ہے جس میں بقا اور حفاظت کے لیے تعلیم اور اعتماد کے ہتھیار بہت ضروری ہیں۔'' اس نے ایک اور دلیل دی۔

حسن شہر کے بہترین اسکول کا داخلہ فارم لے کر آیا تھا۔ وہ رباب کی تعلیم وتربیت میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھنا چاہتا تھا لیکن پلوشہ اسے اسکول بھیجنے سے انکاری تھی۔ اس رات ان دونوں میں پہلی بار کسی بات پر تلخ کلامی ہوئی۔

''ہوگا ضروری...... لیکن ام نے کہا ناں...... ام اسے ضروری نہیں سمجھتا۔'' وہ ہٹ دھرمی سے بولی۔

''آج کل تو پڑھی لکھی لڑکیوں کو بر نہیں ملتے...... اور تم رباب کو بالکل ہی اَن پڑھ رکھنا چاہتی ہو...... کیا حرج ہے اسے اسکول بھیجنے میں آخر؟'' وہ زچ ہوگیا۔

''امارا دل نہیں مانتا بس......''

''اسکول کوئی میدانِ جنگ میں تو نہیں ہے پلوشہ!! یہیں پاس ہی تو ہے...... میں خود ذمے داری لوں گا اسے لانے اور لے جانے کی۔''

''ام اپنا بچی کو ایک پل کے لیے اپنی نظروں سے دور نہیں کرنا چاہتا...... خدا کا واسطہ ہے...... ام پر رحم کرو۔'' اس نے باقاعدہ ہاتھ جوڑ دیے۔

''تو کیا تم رباب کا مستقبل برباد کرنا چاہتی ہو؟'' حسن کو بھی غصہ آگیا۔

''اس کے واسطے گھر میں ہی پڑھنے کا بندوبست کر دو...... مگر باہر کہیں بھیجنے کا نام مت لو۔''

''ٹھیک ہے!! یہی کرنا پڑے گا اب۔'' وہ تھکے تھکے انداز سے کہتا اُٹھ گیا۔

رباب کے لیے اس کی محبت وخلوص کسی بھی سگے باپ سے کم نہ تھی۔ وہ یہ ذمے داری مکمل دیانتداری سے نبھا رہا تھا۔ اس نے ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ پروفیشنل خاتون اس کی تعلیم کے لیے مقرر کر دی۔ اس کی ذہانت مزید نکھرنے لگی لیکن معاشرتی مطابقت اور اعتماد سے وہ بالکل عاری تھی۔

زندگی بہت سہل انداز میں گزر رہی تھی۔ حسن کا کاروبار بھی خوب جم گیا۔ وہ مختلف کڑھائی شدہ لباس اور چادریں دکانوں اور بوتیکس پر مہیا کرتا۔ پلوشہ کے ہاتھ میں بالکل مشینی کڑھائی جیسی نفاست تھی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کے کام میں مزید نکھار آتا رہا۔

حسن نے اس عرصے میں انہیں کبھی کسی تنگی کا سامنا نہ ہونے دیا۔ پلوشہ اور رباب کے لیے ایک مشترکہ بینک اکاؤنٹ الگ سے کھلوا دیا تھا۔ وہ اس رشتے کو سچے دل سے نبھاتا آرہا تھا۔

رباب کے لیے مقرر کردہ معلمہ نے اسے بہترین تعلیم تو دی لیکن اس میں اعتماد پیدا نہ کر سکی۔ وہ جس قدر اس کی ذہانت سے متاثر تھی اسی قدر پلوشہ کی ضد اور ہٹ دھرمی پر حیران بھی۔ اس فیصلے کی منطق اسے کبھی سمجھ ہی نہ آئی۔

''اگر یہ بچی باقاعدہ کسی تعلیمی ادارے میں پڑھے تو اس کی ذہانت کندن کی طرح چمکے گی...... یہ تو اثاثہ ہے ایک۔'' وہ پلوشہ سے کہتی۔

''معاف کرو ام کو بی بی! تم بس وہ کام کرو جس کے لیے تمہیں یہاں لایا گیا ہے...... ام کو پتا ہے امارا بیٹی کے لیے کیا بہتر ہے؟'' اس کا کڑوا لہجہ فریدہ کو خاموش کروا دیتا۔

وقت کا چرخہ گھومتا رہا۔ دس سال کا عرصہ چپکے سے بیت گیا۔

رباب کی جسمانی حالت میں آنے والے تغیرات پلوشہ کو خائف کرنے لگے تھے۔ فریدہ کے شوہر کا تبادلہ وسطی پنجاب میں ہوگیا تو اس نے بھی آنے سے معذرت کر لی۔ رباب ان دنوں میٹرک کے امتحانات کی تیاری میں مشغول تھی۔

''اس بچی کو اعلیٰ تعلیم ضرور دلوایئے گا...... اس کی ذہانت کبھی ضائع مت ہونے دیجیے گا۔'' اس نے حسن سے بطورِ خاص وعدہ لیا۔

''انشاء اللہ! میں اس کی مزید تعلیم کے لیے بھی بہترین انتظامات کروں گا۔'' وہ پُرعزم تھا۔

لیکن اس کی نوبت ہی نہ آسکی۔

پُرسکون زندگی کے بحر سے تلاطم کی ایک زوردار لہر ان کے وجود کو خس وخاشاک کی طرح بہا لے گئی۔ ٹریفک کے ایک بظاہر معمولی حادثے میں حسن نے اس قدر خاموشی سے موت کو گلے لگایا کہ وہ دونوں یقین ہی نہ کر پا رہی تھیں۔

''کوئی یوں بھی کرتا ہے کیا؟ اس طرح بھی کوئی روٹھ کے جاتا ہے کیا؟ ام کو تمہارا بہت ضرورت تھا حسن!'' پلوشہ بلک بلک کر رو دیتی۔

سائبان سے محرومی اور رباب کے مستقبل سے لاحق خدشات نے اس کے وجود کو بھی گھن کی طرح چاٹنا شروع کر دیا۔

''اماں! فریدہ آنٹی کہتی تھیں...... کم از کم میٹرک کے پرچے ضرور دینا...... اب کون مجھے لے جائے گا...... کون میرے خوابوں کی تکمیل کرے گا؟'' وہ پھوٹ پھوٹ کر

رونے لگتی تو پلوشہ کے لیے اسے سنبھالنا مشکل ہوجاتا۔
مستقبل کے ہولناک اندیشے ان دونوں ہی کے دلوں کا آزار بن گئے تھے۔ عدت مکمل ہونے کے بعد اس نے ایک بار پھر ہمت باندھی اور سوئی دھاگا سنبھال لیا۔ لیکن اب پہلے سی ہمت تھی نہ جذبہ۔ اسے اپنا وجود بند مٹھی میں ریت کے مانند بھربھراتا محسوس ہوتا۔
حسن کی موت سے وہ ٹوٹ کر رہ گئی تھی۔

☆☆☆

ایک سال بعد رباب نے ایک بار پھر امتحان دینے کی ٹھان لی۔ چارو ناچار پلوشہ نے اسے خود لے جانے کی ذمے داری اٹھائی۔ سوئے اتفاق اس کا امتحانی سینٹر زیادہ دور نہ تھا۔ تین گلیاں اور ایک مرکزی سڑک عبور کرنے کے بعد اس سرکاری اسکول میں محلے کی کئی لڑکیاں پڑھتی تھیں۔ رباب ان کے ساتھ بھی بآسانی وہاں جاسکتی تھی لیکن پلوشہ اپنے دل کا کیا کرتی؟ جو کسی ذی نفس پہ اب اعتبار کرنے کو تیار ہی نہ تھا۔
جھکے قدموں اور دکھی دل سے وہ اسے ساتھ لے جاتی اور پرچہ ختم ہونے تک وہیں بیٹھی اس کی منتظر رہتی۔ نہ جانے کیوں اسے رستے میں کسی کی نگاہوں کی تپش بری طرح محسوس ہوتی تھی۔ وجود کسی شکنجے میں جکڑا لگتا۔ لیکن اپنا وہم گردان کر وہ سر جھٹک دیتی۔
پہلے چار پرچے تو آرام سے گزر گئے۔ لیکن پانچویں روز اس کا وہم مجسم صورت میں اس کے سامنے آن کھڑا ہوا۔
وہ ایک بھاری بھرکم شخص تھا۔ اس کی ہیئت نے پلوشہ کی سٹی گم کر دی۔ وہ ان کا رستہ روکے کھڑا بہت گہری نگاہوں سے انہیں دیکھ رہا تھا۔
''رستہ چھوڑو امارا......'' وہ خشک پڑتے ہونٹوں پر زبان پھیر کر بولی۔
''ضد چھوڑ دو اپنی۔'' اس نے انگشتِ شہادت اٹھا کر متنبہ کیا۔
''امارے ساتھ فضول بک بک نہ کرو۔''
''ضد چھوڑ دے اپنی عورت! ورنہ تباہی تیرے سر پر منڈلاتی نظر آرہی ہے......اب بھی وقت ہے......سمجھ جا......امانت میں خیانت نہ کر......'' وہ اپنی سرخ آنکھوں سے گھورتا ان کے رستے سے ہٹ گیا۔
پلوشہ رباب کا ہاتھ تھامے وہاں سے تقریباً بھاگتی ہوئی چلی گئی۔
اگلے تمام پرچوں میں وہ سر جھکائے ان سے ایک مخصوص فاصلے پر چلتا رہتا۔ اس کے بے ضرر وجود سے رباب کو بھی عجیب بے عنوان اضطراب لاحق ہونے لگتا تھا۔
امتحان ختم ہوتے ہی پلوشہ نے سکون کا سانس لیا۔ اس نے بیٹی کو مزید تعلیم دلوانے سے توبہ کر لی تھی۔
رباب فی الوقت اس کے فیصلے سے بے خبر تھی۔

☆☆☆

کچھ دنوں سے پلوشہ کے بائیں بازو اور سر میں بے تحاشا درد رہنے لگا تھا۔
عمر کے اس موڑ پر شریکِ حیات کی کمی بھی بری طرح کھلتی۔ اس ادھورے انسان نے ان کی زندگی کی تکمیل اس خوبصورتی سے کی تھی کہ اتنا وقت گزرنے کے باوجود وہ اس کے بغیر جینے کا حوصلہ پیدا کرنے میں ناکام تھیں۔ اس کے جانے کے بعد تلخیوں اور آزمائشوں نے ایک بار پھر ان کا در دیکھ لیا۔
طبیعت کی کسلمندی اور بیزاری کے باعث اس کے کام میں بھی خاصا فرق پڑا۔ آرڈر وقت پر تیار نہ ہو پاتے۔ حسن ہی کے دوست کے توسط سے ملنے والے ان آرڈرز میں واضح کمی ہوتی چلی گئی۔ گزر بسر کا واحد ذریعہ اب بینک میں محفوظ وہ رقم تھی جس پر ہر ماہ منافع مل جایا کرتا۔ زندگی کی گاڑی کسی نہ کسی طرح گھسٹنے ہی لگی تھی۔
اس کی طبیعت میں متواتر بگاڑ دیکھ کر رباب کا دل ڈوبنے لگتا۔ وہ اکثر اسے اپنا علاج کروانے کے لیے قائل کرنے کی کوششوں میں ہلکان رہتی۔
''اماں! کسی اچھے ڈاکٹر کے پاس چل کر ایک بار اپنا چیک اپ کیوں نہیں کروالیتی ہو؟ آپ کی یہ تکلیف مجھ سے برداشت نہیں ہوتی۔'' وہ رو دی۔
''ماں کی جان! کون لے کے جائے گا ام کو ڈاکٹر کے پاس' اتنا پیسہ کدھر سے آئے گا؟ بہت طویل سلسلے ہیں علاج کے......کون کرے گا یہ سب؟'' وہ اداسی سے بولی۔
''میں لے کے چلوں گی آپ کو......اور کسی سرکاری اسپتال میں چلیں گے وہاں تو اتنا خرچہ نہیں ہوتا ناں۔''
''نہیں! بالکل نہیں! تم کہیں نہیں جائے گا......ام کو ایسے ہی پڑا رہنے دو۔ خود ہی ٹھیک ہوجائے گا ام......'' اس نے ہٹ دھرمی دکھائی۔
''کیوں پڑا رہنے دوں ایسے ہی آپ کو؟ خود ہی کچھ بھی ٹھیک نہیں ہوتا اماں! کس چیز کا ڈر کنڈلی مارے بیٹھا ہے آخر آپ کے اندر؟'' وہ روہانسی ہوگئی۔
''کوئی ڈر نہیں ام کو......امارا اماں بننے کی کوشش

مت کرو...... جاؤ یہاں سے...... ہانڈی چڑھاؤ جاکے۔"
پلوشہ درشتی سے بولی۔

رباب آنکھوں میں آنسو لیے اٹھ گئی۔ کھانا بنانے کے دوران میں اس نے ہمسایہ میں ثریا خالہ سے بات کرنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ وہ بھی سالوں سے یہیں رہتی آرہی تھیں اور محلے کی واحد عورت تھی جس سے پلوشہ نے میل جول رکھا تھا۔ وگرنہ حسن کی ہدایات کے باوجود اس نے کبھی محلے میں آمدورفت نہیں رکھی۔

کھانے کے بعد وہ تھوڑی دیر قیلولہ کی غرض سے سو جایا کرتی تھی۔ رباب موقع غنیمت جان کر ثریا کے گھر چلی گئی۔ وہ اسے دیکھ کر حیران رہ گئیں۔

"خیریت تو ہے ناں رباب؟"

"خالہ! آپ ہی سمجھاؤ میری اماں کو۔ اپنی جان پر یوں ظلم نہ کرے۔ میرا اور کون ہے اس کے سوا؟" وہ ماں کی بیماری اور حالت بتاتے بتاتے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

"پتا نہیں کونسا روگ لگا ہے تیری ماں کی جان کو؟ اپنا بھید بھی تو نہیں دیتی کسی کو۔" وہ بھی فکرمند تھیں۔ "اچھا تو فکر نہ کر...... میں شام کو ڈاکٹر خود لے آؤں گی...... یہیں پاس میں ہی تو اس کا کلینک موجود ہے...... میرے بیٹے کا بڑا اچھا دوست ہے۔ میں اس کی منت سماجت کروں گی کہ ایک بار آکے دیکھ لے گھر۔" وہ اسے پچکارتے ہوئے بولیں۔

"ٹھیک ہے خالہ! بڑی مہربانی آپ کی...... میں چلتی ہوں...... اماں جاگ گئی تو بڑا ہنگامہ کرے گی۔" وہ عجلت میں کہتی الٹے قدموں پر لوٹ آئی۔

امید کی کرن نظر آتے ہی اس کے دل کو قرار آگیا تھا۔

☆☆☆

شام ہوتے ہی ثریا خالہ اس ڈاکٹر کو ساتھ لیے چلی آئیں۔

پلوشہ کی آنکھوں میں رباب کی اس جسارت پر غصہ عود آیا تھا لیکن وہ خاموش ہی رہی۔ ڈاکٹر نے ابتدائی چیک اپ کے بعد کچھ دوائیاں لکھ دیں۔

"دو ہفتوں تک یہ میڈیسنز انہیں باقاعدہ استعمال کروائیں...... اس کے بعد کچھ ضروری ٹیسٹ بھی کروانے ہیں۔ ان کا دل بہت کمزور ہے...... تاخیر میں نقصان کے سوا اب کچھ نہیں۔" وہ پیشہ ورانہ انداز میں کہتا اٹھ گیا۔

"یہ نسخہ مجھے پکڑا دے پُتر!" خالہ نے کہا۔ "میں لیاقت کو بھیج کر منگوا دوں گی دوائیں۔"

وہ دونوں پلوشہ کو احتیاط اور ذمے داری کی تلقین کرتے رخصت ہوگئے۔ ان کے جاتے ہی رباب کے صبر کا پیمانہ لبریز ہوگیا اور وہ پھٹ پڑی۔

"خدا کا واسطہ ہے اماں! ڈاکٹر جو کہہ کر گیا ہے، اس پر عمل کر لینا...... ورنہ ایک کام تو ضرور کرنا...... اپنے ہاتھوں سے میرا گلا دبا دینا۔"

"یہ کیا کہہ رہی ہے رباب تو؟" پلوشہ ششدر رہ گئی۔

"ٹھیک ہی کہہ رہی ہوں اماں! آپ کی روز بروز بگڑتی حالت دیکھ کر میرا دل بیٹھنے لگتا ہے۔ میں تو آپ کے بغیر اس گلی سے باہر نہیں جا سکتی...... زندگی کیسے گزاروں گی؟"

"ام تیرے لیے ہی تو جیتا ہے رباب!" وہ نڈھال ہوگئی۔

"تو پھر مان لو میری بات...... اپنے ٹیسٹ کروالینا۔ ثریا خالہ کے ساتھ چلے جائیں گے ہم دونوں۔" اس نے امید و آس کی کیفیت میں کہا۔

"ہوسکتا ہے اس کی نوبت ہی نہ آئے...... ام اس سے پہلے ہی ٹھیک ہوجائے۔" وہ اس کا ہاتھ چومتے ہوئے بولی۔

"اللہ آپ کی زبان مبارک کرے اماں۔" رباب ماں کی یہ تبدیلی دیکھ کر بہت خوش تھی۔

ایک ہفتہ میں دوائیوں کے باقاعدہ استعمال سے اس کی طبیعت میں واضح بہتری محسوس ہوئی تھی۔ خالہ ثریا اس کی عیادت کے لیے آئی تو وہ بھی اس بہتری پر خوش ہوگئی۔

"میں چار دن کے لیے اپنی بیٹی کے گھر جا رہی ہوں...... اس کی زچگی میں بہت کم وقت رہ گیا ہے۔ وہاں سے لوٹتے ہی ہم اس کے ٹیسٹ کروالیں گے۔" انہوں نے رباب کو ایک بار پھر تسلی دی۔

"آپ کا یہ احسان میں کبھی نہیں چکا سکوں گی خالہ!" اس نے خلوص دل سے کہا تو وہ اسے پیار دیتی چلی گئیں۔

رباب نے اس روز بہت دل سے سارے کام نمٹائے۔ ماں کی طبیعت میں سکون دیکھ کر اس کا وجود ہلکا پھلکا ہوگیا تھا۔ لیکن خوشی و اطمینان کی یہ کیفیت پانی کے بلبلے سے عارضی ثابت ہوئی۔

اس رات پلوشہ کی حالت یکدم بگڑ گئی۔ تیز بخار کے ساتھ شدید کھانسی نے اسے پل بھر میں نچوڑ کر رکھ دیا۔ اسے نیم غشی کی حالت میں دیکھ کر رباب کے ہاتھ پاؤں

پھول گئے۔ وہ کچھ سوچ کر اٹھی۔ ایک بڑی سی چادر اپنے گرد لپیٹی اور اندازے سے اسی ڈاکٹر کے کلینک کی تلاش میں چل دی۔ رستوں سے واقفیت اسے پہلی مرتبہ اپنے امتحانات کے دوران میں ہوئی تھی۔

☆☆☆

وہ اپنی گلی سے باہر نکلنے نہ پائی تھی کہ ہر سُو مزید اندھیرا چھا گیا۔

اس کے تیزی سے بڑھتے قدم وہیں رک گئے۔ غیر اعلانیہ لوڈ شیڈنگ سے اکثر گھروں کے باہر جلنے والی ٹیوب لائٹس اور انرجی سیورز یکدم بند ہو گئے اور اسٹریٹ لائٹس تو مدتوں پہلے ہی روشنی کے منبع سے محروم ہو چکی تھیں۔ اس تاریکی میں رباب نے پل بھر کے لیے واپسی کا ارادہ کیا لیکن ماں کی ابتر حالت کا تصور ذہن میں آتے ہی وہ اپنے قدموں کو بڑھنے سے روک نہ سکی۔

دل میں دعاؤں کا ورد کرتی وہ اپنے اندازے سے چلی جا رہی تھی لیکن راستہ کسی شیطان کی آنت کی طرح طویل ہوتا چلا گیا۔ اسی وقت ایک ہیبت نے اسے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ وہ راستہ بھول چکی تھی۔

وہ جانے کس سمت میں نکل آئی تھی۔ اپنی اس حماقت کا احساس اسے بہت دیر سے ہوا۔ فلک پر آخری تاریخوں کے چاند کی مدھم پڑتی روشنی میں اردگرد نظر آنے والی عمارتوں کے سائے کسی بھوت کی طرح اسے اپنی طرف لپکتے محسوس ہونے لگے۔

خوف اور وحشت سے اس کا دل پسلیوں کا قفس توڑنے پر مُصر تھا۔ زبان سوکھے چمڑے کی طرح خشک ہو کر تالو سے جا چپکی۔ حلق میں کانٹوں کی آبیاری نے مزید بے حال کر دیا۔ وہ بے جان ہوتی ٹانگوں کے ساتھ وہیں ڈھے گئی۔

اس کی چادر سر سے ڈھلک کر کندھے پر آ پڑی۔ منتشر بال، فق رنگت اور اجڑی حالت میں وہ خود بھی کوئی بد روح ہی لگ رہی تھی۔ کتنے ہی لمحے یوں ہی خاموشی سے سرک گئے۔ اس کا ذہن اس افتاد سے بچاؤ کی صورتِ حال پر غور کرتا رہا لیکن کوئی تدبیر سوجھ کے ہی نہ دی۔

اسی پل اسے دور سے روشنی کا ایک ننھا سا نکتہ اپنی طرف بڑھتا نظر آیا۔ دل میں امید کی ایک کرن پھر سے جاگزیں ہو گئی۔ قریب آتی وہ روشنی کسی گاڑی کی ہیڈ لائٹس تھیں۔ رباب کے مردہ تن میں ایک نئی روح بیدار ہو گئی۔

اس نے کسی بھی طرح اسے رکوانے کا تہیہ کر لیا اور فوراً اُٹھ کھڑی ہوئی۔

گاڑی اس کے پاس آ کر خود بخود رک گئی۔

اس کے کچھ کہنے یا کرنے سے قبل ہی پچھلے حصے سے دو جسیم افراد باہر نکلے اور اس کے قریب آ کر کھڑے ہو گئے۔ ان کی مخصوص وردی اور اس گاڑی کی ساخت دیکھنے پر اس کا دل بلیوں اچھلنے لگا۔ وہ عوام کے محافظوں کے سامنے موجود تھی۔ اس تصور سے ہی اسے بہت تقویت ملی۔ تمام اندیشے یکدم تحلیل ہو گئے اور اپنا وجود اب اسے تحفظ اور عافیت میں محسوس ہونے لگا۔

تمام تفکرات اور پریشانیاں فراموش کر کے اس کے چہرے پر اُمید بھری ایک مسکراہٹ کھل اٹھی مگر اگلے ہی پل سمع خراش الفاظ نے اس کے پیروں تلے سے زمین کھینچ لی۔

''ہاں بھئی! رات کے اس پہر کس نے وقت دے کر بلایا ہے تجھے اس علاقے میں؟'' ایک پولیس والے نے کرختگی سے پوچھا۔

''جی! کک... کک... کیا مطلب...... میں تو رستہ بھول کے آئی ہوں اِدھر۔'' وہ نا سمجھی سے بولی۔

''رستہ بھول کے ہی آئی ہوئی لگتی ہے سر جی! ورنہ اس علاقے کی ساری رنڈیوں کا صورت شناس ہوں میں۔'' دوسرے پولیس والے نے اسے گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے اس کی معلومات میں اضافہ کیا۔

''آہاہا...... ویسے نگ تو بڑا ستھرا ہے یہ بھی۔'' اس نے دائیں آنکھ میچتے ہوئے کہا۔

''یہ کیسی گفتگو کر رہے ہیں آپ؟ مجھے راستہ سمجھا دیں پلیز......'' رباب ہراساں ہو گئی۔

''چل کیا یاد کرے گی...... آج ہمیں مہمان نوازی کا موقع دے...... سارے رستوں سے واقفیت کروا دیں گے تجھے۔'' وہ اس کے گلابی چہرے کو اپنی دو انگلیوں سے ٹٹولتے ہوئے بولا۔

''آ...... آپ...... کک...... کیا کہہ رہے ہیں...... میں تو ڈاکٹر کی تلاش میں آئی تھی...... لیکن اندھیرے کی وجہ سے رستہ بھول گئی ہوں۔'' وہ اپنی بات پر ایک پھر زور دیتے ہوئے بے چارگی سے بولی۔

اس بات پر دونوں نے فلک شگاف قہقہہ لگایا۔

''او چن کھناں!! ہم بھی تو ڈاکٹر ہی ہیں...... ہمیں علاج کا ایک موقع تو دے...... ہماری دوائیوں سے بہت فائدہ ہو گا تجھے۔'' ایک نے اسے رخسار پر چٹکی بھرتے

ہوئے بولا۔

رباب کو سمجھ ہی نہ آرہی تھی کہ وہ کس طرح اپنا مدعا انہیں بیان کرے۔ اس کے کچھ کہنے سے پیشتر ہی پہلے والے نے اسے بازو سے پکڑ کر گھسیٹا اور پولیس وین میں پھینک دیا۔ اس کی ہتھیلیوں اور گھٹنوں پر بری طرح خراشیں آگئیں لیکن اس درد سے کہیں زیادہ اپنی ماں کی حالت کا تصور اسے تکلیف دے رہا تھا۔ جانے وہ کس حال میں ہوگی گھر میں۔ اس کا دل جیسے کسی نے زور سے مٹھی میں بھینچ دیا۔

گاڑی اندازاً پندرہ سے بیس منٹ مختلف سڑکوں پر دوڑتی رہی۔ ان کی معنی خیز باتیں اور مختلف بہانوں سے اسے چھونے کی کوششیں اس کی روح میں ناقابلِ بیان جلن پیدا کررہی تھیں۔ آنسوؤں اور مٹی کے ملاپ نے اس کا حلیہ مزید ابتر کردیا۔

''یا اللہ! میں کہاں پھنس گئی ہوں؟'' اس کے دل سے ایک کراہ برآمد ہوئی۔

تھوڑی ہی دیر بعد گاڑی تھانے کی حدود میں داخل ہوگئی۔ لرزیدہ ٹانگوں اور شل ہوتا وجود ..... اسے ایک جان لیوا شکنجے میں جکڑا محسوس ہونے لگا۔ انہونیوں کے بھوت اردگرد بے ہنگم رقص کرتے نظر آنے لگے۔ اس نے اترتے ہی سب سے پہلے چادر اپنے گرد دوبارہ لپیٹی تھی۔

تھانے کی اندرونی عمارت میں لے جا کر اسے ایس۔ آئی کے سامنے پیش کردیا گیا۔ زمانے بھر کی سختی اور کرختگی چہرے پر سجائے وہ اسے خشونت زدہ نظروں سے دیکھتا رہا۔ دونوں ٹانگیں سامنے رکھی میز پر سجائے وہ سگریٹ کے گہرے کش لے رہا تھا۔ اس کا اچھی طرح معائنہ کرنے کے بعد وہ ..... ایس۔ آئی بابر کی طرف متوجہ ہوکر بولا۔

''کہاں سے اٹھا کر لائے ہو اِسے؟''

''ڈاکٹر کی تلاش میں بھٹک رہی تھی ..... ہم اسے رستوں کا حدودِ اربعہ سمجھانے لے آئے ہیں۔''

''نیا پنچھی لگتا ہے یہ تو کوئی؟''

''ہاں جی! اس علاقے میں کبھی نظر نہیں آئی پہلے۔'' اس نے اپنے افسر کی تائید کی۔

''میں اپنی اماں کے لیے ڈاکٹر کو بلانے آئی تھی جی ..... ان کی طبیعت ٹھیک نہیں ..... مجھے جانے دو ..... خدا کا واسطہ ہے۔'' رباب نے بلکتے ہوئے کہا۔

''لگتا ہے ماں بیٹی دونوں ہی اس دھندے میں ہیں .....'' ایس۔ آئی مراد بنگش کے پتلے سفاک ہونٹوں پر ایک زہرناک مسکراہٹ نے جھلک دکھائی۔

''آپ حکم کریں سر جی! اس کی ماں کو بھی یہیں لے آتے ہیں۔'' بابر نے ہونٹوں پر زبان پھیرتے کہا۔

''بلوائیں گے اسے بھی ..... جلد ہی بلوائیں گے ...... پہلے اس کی سیوا تو کرلوں میں ذرا۔'' مراد بے تابی سے بولا۔ ''اسے لے چلو زنان خانہ میں ..... میں ذرا ملاقات کی تیاری کرکے آتا ہوں۔''

''ہمیں بھی موقع دیجیے گا اس سیوا کا سر جی!'' بابر اپنے افسر سے کچھ زیادہ ہی بے تکلف معلوم ہوتا تھا۔

''ہاں بھئی! کیوں نہیں ..... مل بانٹ کر کھانے میں ہی برکت ہوتی ہے۔''

بابر اسے ایک بار پھر گھسیٹتا ہوا اندرونی کمرے میں لے گیا۔ اذیت و کرب سے رباب کی آنکھیں جل رہی تھیں۔ اس کمرے کے کھردرے فرش پر بیٹھی وہ اردگرد نظر آتے تشدد کے اوزار دیکھ کر اپنی رہی سہی ہمت بھی کھو بیٹھی اور بلند آواز میں روتے ان سے رحم کی بھیک مانگنے لگی۔ کسی کے کان پر جوں تک نہ رینگی۔ احساسِ بے بسی سے اس نے اپنا سر سلاخوں سے دے مارا۔

کچھ دیر بعد بدمست ہاتھی کی طرح جھومتا مراد اس کے سامنے موجود تھا۔

''کیوں ہلکان کررہی ہے خود کو؟ یہ ڈراما بازیاں کر کے کیا ثابت کرنا چاہتی ہے تو؟'' اس کی آواز نشے سے لڑکھڑا رہی تھی۔

باہر موجود بابر اور شبیر آنے والے لمحات کی سرشاری میں مبتلا تھے۔ ایسے مناظر اور صدائیں تو ان کے لیے روز کا معمول تھیں۔ مراد کے لیے شراب و شباب مہیا کرنا ان کی 'غیر سرکاری' ڈیوٹی تھی۔ جس کے ثمرات انہیں 'سرکاری' طور پر بھی مل جایا کرتے۔ ہر آنے والے نئے شکار کی کراہیں اور سسکیاں تھوڑی ہی دیر میں تھم جایا کرتی تھیں۔ لیکن اس بار مراد کی جوابی مغلظات نے انہیں چونکا دیا۔

وہ سوالیہ نظروں سے ایک دوسرے کی جانب دیکھنے لگے۔ مراد نیم برہنگی کی حالت میں تن فن کرتا باہر نکلا اور ان دونوں کے درپے ہوگیا۔

''حرام خور ہو تم سب کے سب۔''

''کیا ہوگیا سر جی؟'' وہ ششدر رہ گئے۔

''ابے یہ غلاظت کہاں سے اٹھا لائے ہو؟ عقل کے اندھو ..... مخنث ہے وہ۔'' مراد کراہت و تنفر سے دہاڑا۔

☆☆☆

رات نے اپنا دامن آسمان کی وسعتوں سے سمیٹنے کا آغاز کر دیا تھا۔

بابر اور شبیر اسے مراد کے حکم پر دوبارہ اسی مقام پر چھوڑ گئے۔ اس کے چہرے پر نیل اور زخموں کے نشانات تھے۔ بازو، آستینوں اور کہنیوں سے کپڑے بری طرح ادھڑ گئے تھے۔ ہتھیلیوں، گھٹنوں اور کہنیوں پر خراشوں سے لہو رس رہا تھا لیکن ان زخموں کے علاوہ روح پر لگنے والے گھاؤ کا تو کوئی شمار ہی نہ تھا۔

گم گشتہ رستے اب اپنا نشان خود بتانے لگے تھے لیکن وہ بے نشاں ہو گئی تھی۔ فضا میں فجر کی اذانوں کی پُر کیف صدائیں گونج رہی تھیں۔ بے جان قدموں سے اپنا وجود گھسیٹتے وہ بمشکل گھر تک پہنچی۔ دروازہ اسی طرح بند تھا جیسے وہ گزشتہ رات اسے لاکڈ کر گئی تھی۔ اسے ماں کا سامنا کرتے ہوئے سخت ندامت اور گھبراہٹ ہونے لگی مگر کمرے میں داخل ہوتے ہی ایک منظر نے اس کی بصارت کو پتھرا دیا۔

پلوشہ بستر پر غیر فطری انداز میں لیٹی تھی۔ ناک سے لہو کی پتلی سی دھار بہہ کر منجمد ہو چکی تھی۔ رباب دیوانہ وار اسے جھنجوڑنے لگی لیکن وہ تو اب اس کی صداؤں اور آہ و بکا سے بہت دور چلی گئی تھی۔

”ہوسکتا ہے ٹیسٹ کروانے کی نوبت ہی نہ آئے..... اس سے پہلے ہی ام ٹھیک ہوجائے......“ اس کی سماعت میں کچھ دن قبل کہی ماں کی بات گونجی۔

وہ واقعی ٹھیک ہوگئی تھی...... ہر دکھ، تکلیف اور سوچ سے آزاد...... رباب کی کراہیں چیخوں میں ڈھلنے لگیں اور ذہن تاریکیوں میں ڈوبتا چلا گیا۔

صبح ہوتے ہی ان کا آنگن عورتوں سے بھر گیا۔ اس کی ماتمی صدائیں سن کر قریبی ہمسائیاں تجسس اور ہمدردی میں گھر چلی آئی تھیں۔ پلوشہ کو سنبھال کر ایک چارپائی پر لٹاتے وہ اس کی لٹی پٹی حالت دیکھ کر ایک دوسرے کو معنی خیز اشارے اور کھسر پھسر بھی کرتی رہیں۔ رباب کو کسی بھی بات کا ہوش نہ تھا۔

اس کی پتھرائی بصارت اور آنکھوں کی پتلیوں میں صرف ایک ہی منظر مقید تھا...... پلوشہ کا بے جان، ٹھنڈا جسم......اور چھت کی کڑیوں میں بھٹکتی خالی نگاہیں......

محلے کی عورتوں نے ہی اس کے غسل اور کفن دفن کا انتظام کیا۔ وہ سب اس کی میت کے گرد بیٹھی باآوازِ بلند دعائیہ کلمات و آیات پڑھ رہی تھیں۔ لیکن رباب کے ذہن میں ماں کے ساتھ گزرے ماہ و سال کے کچھ لمحات رقص کر رہے تھے۔

☆☆☆

وہ الگ تھی۔ اپنی ارد گرد کی دنیا سے منفرد تھی۔ یہ بات تو وہ بچپن ہی میں جان گئی تھی۔ یہی آگہی کسی عذاب کے مانند اس کا سہانا بچپن نگل گئی۔

کراچی کے اس دارالامان میں گزرے ایام آج بھی روزِ اول کی طرح اس کی یادداشت میں محفوظ تھے۔ سب عورتیں بہت گھل مل کر رہتیں۔ ایک دوسرے کے بچوں کو پیار کرتیں۔ ان کے ناز نخرے، نہلانا دھلانا سب اپنی اولاد ہی کی طرح کر دیا کرتیں لیکن پلوشہ نے اسے کبھی ان سے زیادہ قربت بڑھانے نہ دی۔

”تمہاری بیٹی ہمیں اپنے بچوں ہی کی طرح عزیز ہے پلوشہ! سارا دن مشقت کے بعد تھک جاتی ہو۔ بچی کے کام ہمارے ساتھ بانٹ لیا کرو۔“ وہ اکثر یہی فقرے الفاظ کے ذرا سے ردّ و بدل کے ساتھ سنتی۔

”ام کو اپنا بچی کے کام کر کے بہت سکون ملتا ہے اور سکون ولذت دیتا ہے، تھکاوٹ نہیں۔“

پلوشہ نے اسے بھی سختی سے ہدایت کر رکھی تھی کہ حوائج ضروریات کے لیے وہ بہر صورت اس کے پاس آیا کرے۔ رباب ہمیشہ ماں کی ہر بات پر بلا چون وچرا عمل کرتی۔ اس کا دل چاہتا کہ وہ بھی باقی بچوں کی طرح آزادانہ گھومے پھرے، کھیلے کودے لیکن ماں کا سخت پہرا اسے اپنے پاس سے ہلنے بھی نہ دیتا۔

وہاں زیرِ استعمال غسل خانوں میں اکثر عورتیں اپنے چھوٹے بچوں کو نہلانے دھلانے میں کوئی پردہ روا نہ رکھتیں اور بعض اوقات یوں بھی ہوتا کہ وہ بھی اتفاقاً وہاں نکل جاتی۔ اپنی انفرادیت کا احساس پہلی مرتبہ اسے تبھی ہوا تھا۔ اس کے چھوٹے سے ذہن میں بے شمار سوالات کلبلاتے لیکن جواب طلب کرنے کی ہمت تھی نہ موقع۔

اس انفرادیت اور پلوشہ کی حد سے سوا احتیاط پسندی کے ملاپ نے اس کے وجود میں عجیب گھٹن پیدا کر دی۔ اس کی زندگی محض احساسِ کرب سے عبارت تھی۔ جانے کیوں عمر کا ہر زینہ چڑھتے اسے پختہ یقین ہو چلا تھا کہ وہ اپنے آس پاس لوگوں میں رہنے کے قابل نہیں ہے۔ اس کی منزل، دنیا، تکمیل اور اصل مقام کہیں کسی اور جہان میں

پوشیدہ ہیں۔ ایک ایسا جہان جسے وہ دریافت کرنے کے تجسس میں مبتلا تھی لیکن منزل تک پہنچنے کی مسافت سے لاعلم تھی۔

وہ اپنے مدار سے بھٹکے ہوئے سیارے کی طرح اپنے وجود کے نشان کھوجتی...... جتنا کھوجتی' الجھن بڑھنے لگتی اور اس بڑھتی الجھن سے اس کی کھوج میں مزید شدت آجاتی۔

''میں کون ہوں؟ یہاں ان لوگوں میں میرا کیا کردار ہے؟ ان میں سے کوئی ایک بھی تو میرے جیسا نہیں......تو بھلا میں یہاں کیوں رہ رہی ہوں؟'' لاتعداد سوالات اپنے نکیلے پنجوں سے اس کا معصوم ذہن اور سوچیں لہولہان کیا کرتے۔

☆☆☆

عورتوں کی تلاوت اور دعائیہ کلمات میں شدت پیدا ہونے لگی۔

اس کی ساکت پتلیوں میں اِک ذرا سی تحریک پیدا ہوئی۔ اس کے مقابل میت کی چارپائی کی دوسری جانب سامنے گھر میں رہنے والے فضل بخش کی نوبیاہتا بہو بیٹھی تھی۔ اس کے دائیں ہاتھ میں ایک تسبیح تھی جس کے منکے اس کے ملتے لبوں کے ساتھ گردش میں تھے۔ وہ ایک ٹک اسے دیکھتی رہی۔ اس کے وجود میں ہونے والی ذرا سی جنبش سے کلائیوں میں موجود طلائی کڑے اور چوڑیاں کھنکنے لگتے۔

یہ کھنک اس کے ذہن کے دریچوں پر دستک دینے لگی......سماعت کی فریکوئنسی نے کچھ مانوس آوازوں سے ایک بار پھر ناتا جوڑلیا۔

''پلوشہ! کہاں ہو بھئی؟ پلوشی!......'' حسن بے تابی سے اسے صدائیں دیتا آیا۔

''باورچی خانے میں ہے......بس ابھی آیا......''

''نہیں بھئی! تم رہنے دو...... میں ہی وہیں آجاتا ہوں۔'' وہ ہاتھ میں پکڑے شاپنگ بیگ لیے وہیں پہنچ گیا۔

برآمدے میں بچھے تخت پوش پر اپنے کھلونے لیے بیٹھی رباب کی نظریں لاشعوری طور پر انہی پر مرکوز تھیں۔

''یہ اتنا سب کیا اُٹھا لائے ہیں؟'' پلوشہ حیران تھی۔

''تم دونوں کے لیے عید کا تحفہ لایا ہوں۔'' وہ مسکرایا۔

''سچی......دکھاؤ تو بھلا؟''

حسن نے اس کے سامنے میز پر چوڑیوں کے کئی خوبصورت سیٹ' ہار اور چھوٹے چھوٹے نازک زیورات کا ڈھیر لگادیا۔

''بہت خوبصورت ہیں سچ میں......'' پلوشہ کی خوشی دیدنی تھی۔

پھر جب اس کی نظر دوسرے شاپنگ بیگ میں موجود چھوٹے سائز کی چوڑیوں اور زیورات پر پڑی تو اس کے چہرے سے مسکراہٹ پل بھر میں غائب ہوگئی۔

''یہ کس کے لیے ہیں؟''

''میری بیٹی کے لیے...... اور کس لیے بھلا؟'' حسن نے اطمینان سے کہا۔

''اسے ایسی چیزیں نہیں پسند...... ام نے بتایا تھا آپ کو۔'' وہ مضطرب ہوگئی۔ ''وہ بس کھلونوں اور کتابوں میں خوش رہتی ہے۔''

''تو اب ان کا کیا کروں میں؟'' وہ مایوسی سے بولا۔

دور بیٹھی رباب کا دل چاہا کہ وہ یہ سب سامان فوراً کہیں چھپادے لیکن ایسی کسی بھی سوچ پر وہ کبھی عمل کر ہی نہ پائی تھی۔ اس نے حسرت سے باپ کی طرف دیکھا کہ شاید وہ اس کے دل کی صدا سن لے مگر بے سود۔ وہ حسبِ سابق پلوشہ کی بات تسلیم کیے وہ سامان لوٹانے اور اسے کھلونے دلانے پر رضامند ہوگیا۔

رباب دل مسوس کررہ گئی۔

اگلے روز پلوشہ نہانے کے لیے گئی تو اس کے ذہن میں فوری ایک خیال آیا۔ وہ اس کے کمرے میں گئی اور بے تابی سے الماری کھول کر اس کے وہ تمام تحائف ہاتھوں' کانوں میں پہن لیے۔ وہیں اسے ایک سرخ زرتار دوپٹا بھی نظر آیا۔ اس نے جھٹ سے وہ بھی اوڑھ لیا۔ آئینے کے سامنے کھڑی خود کو مختلف انداز سے دیکھ کر اسے عجیب سی خوشی محسوس ہورہی تھی۔

یکدم اس کا نازک وجود کسی زلزلے کی زد میں آگیا۔ پلوشہ نے اسے بالوں سے جکڑ کر زوردار طمانچہ مارا تھا۔ وہ اپنا تولیا لینے آئی تھی۔ رباب پر نظر پڑتے ہی اس کے دل و دماغ میں ایک حشر برپا ہوگیا۔

وہ اپنا ہاتھ رخسار پر دھرے پھٹی پھٹی آنکھوں سے ماں کو دیکھنے لگی جس نے آج تک اسے پھولوں کی کسی چھڑی سے بھی نہ چھوا تھا۔

''اماں! میں تو بس یہ...... یونہی پہن کر دیکھ رہی تھی۔'' اس کی آواز بھیگ گئی۔

''کیوں پہن رہی تھی یہ سب؟ ام نے منع کیا تھا ناں تجھے۔'' وہ درشتی سے بولی۔

''لیکن کیوں اماں؟ میں کیوں نہیں پہن سکتی؟''

''دیکھ رباب! امارا ایک بات اپنے ذہن میں بٹھا لے...... یہ چوڑیاں' ہار' بندے...... تیرے لیے نہیں...... آج کے بعد تو ان کی طرف دیکھے گی بھی نہیں۔''

''مجھے اچھی لگتی ہیں یہ سب چیزیں اماں! میرا دل چاہتا ہے میں خوب سارا میک اپ کروں...... مور کی طرح ناچوں...... پنکھ لگائے کہیں اُڑ جاؤں۔''

پلوشہ پورے وجود سے کانپ گئی۔ اسے اپنی برسوں کی ریاضت خاک میں ملتی نظر آنے لگی۔ وہ یکدم اُٹھی اور باورچی خانے سے تیز دھار چھُری اٹھا لائی۔ رباب اس چھری اور ماں کی آنکھوں سے چھلکتی وحشت دیکھ کر بے پناہ خوفزدہ ہوگئی۔

اسی جنون میں اس نے وہ چھری اپنی گردن پر رکھ لی۔ دہشت سے رباب کی چیخیں گلے میں ہی گھٹ گئیں۔ اس نے آنکھیں زور سے میچ لیں اور تھر تھر کانپنے لگی۔

''اگر تو نے دوبارہ ایسا کرنے کا سوچا بھی تو ام اس چاقو سے تیرے سامنے اپنا گردن کاٹ لے گا......''

''نن...... نہیں اماں! چھوڑ دو اِسے...... میں نہیں کروں گی ایسا...... جو کہو گی وہی کروں گی۔'' اس کا دل خوف سے پھٹنے کے قریب تھا۔

پلوشہ نے اُسے اپنے سینے میں بھینچ لیا اور خود بھی رونے لگی۔

''تُو ایسا کرے گی تو ام سے بہت دور چلی جائے گی...... وہ چھین لیں گے تجھے ام سے۔''

اس وقت تو اسے سمجھ نہ آیا کہ اس کی ماں کن لوگوں سے خوفزدہ ہے؟ لیکن اس کا پہرا مزید کڑا ہوگیا۔ وہ جانتی تھی کہ رباب جلد یا بدیر ان کتابوں میں اپنی سچائی سے واقف ہوجائے گی۔ لیکن وہ یہ نہیں جانتی تھی کہ اس تلخ سچائی سے تو وہ بہت کم عمری میں ہی آگاہ ہوگئی تھی۔

پلوشہ سائے کی طرح اس کے ساتھ لگی رہتی۔ فریدہ سے پڑھنے کے اوقات میں بھی وہ ان کے آس پاس ہی موجود رہتی۔ اسے ماں کی اس حالت پر بہت ترس آتا۔ جانے کن لوگوں کا خوف تھا اُسے؟ وہ ہر وقت اسی الجھن میں رہتی۔

اس سوال کا جواب بھی اسے بہت جلد مل گیا۔

☆☆☆

وہ تینوں ایک شادی کی تقریب میں موجود تھے۔

حسن کے ماموں زاد بھائی کی شادی میں اس کی بیوی اور بچی کو بطورِ خاص مدعو کیا گیا تھا۔ پلوشہ صرف حسن کے اصرار پر جانے کے لیے آمادہ ہوئی تھی۔ مہندی کی اس مخلوط تقریب میں پنجاب کے سبھی رنگ اپنے جوبن پر تھے۔ تیل اور مہندی کی رسم کے بعد اسٹیج پر آنے والے افراد کو دیکھ کر پلوشہ کی گرفت اس کے گرد بہت سخت ہوگئی۔

وہ دو خواجہ سرا تھے۔

ان کے بھڑکیلے لباس میں' تیز میک اَپ اور تھرکتے وجود اس تقریب میں موجود سبھی مرد و زن کو بہت محظوظ کر رہے تھے۔ شوقین مزاج مرد حضرات ان پر بے تحاشا پیسے لٹانے لگے۔ وہ دونوں ناچتے' تھرکتے اسٹیج سے نیچے آگئے۔ پنجابی گانوں پر رقص کرتے ان خواجہ سراؤں کو اگر مستی کے عالم میں کوئی اپنی طرف کھینچ لیتا تو وہ بھی بھرپور جوابی کارروائی سے اسے مستفید کرتے۔ حسن بھی اس محفل اور 'چھیڑ خانی' میں مکمل جوش سے شریک تھا۔

لٹائے جانے والے پیسوں میں اضافہ ہوتا رہا۔ اس کے ہم عمر کئی بچے زمین پر گرے نوٹ اٹھاتے اور شرم و اشتیاق کی ملی جلی کیفیات سے ان کے حوالے کر دیتے۔

رباب کا دل بھی بچوں کو دیکھ کر مچلنے لگا۔

پلوشہ غالباً اس کی خواہش بھانپ گئی تھی۔ اس نے پسینے سے تر ہاتھ میں اس کی ہتھیلی دبوچ لی۔ غیر مرئی لہروں کی طرح ماں کے سبھی خدشات اس کے ذہن میں منتقل ہوگئے۔ اسے اپنے تمام سوالوں کے جواب اسی پل مل گئے۔

سامنے دعوت نظارہ دیتے وہ دو بے ضرر افراد ہی اس کی ماں کا خوف تھے اور رباب حسن کی شناخت بھی۔

☆☆☆

''ارے اسے رُلا دو کوئی ایک بار۔ صدمے سے کہیں دماغ ہی نہ اُلٹ جائے اس کا۔'' جانے کس کونے سے ایک آواز اس کی سماعت میں پڑی۔

محلے کے چند افراد پلوشہ کی میت لے جاچکے تھے لیکن اس کے شل وجود میں کوئی جنبش نہ ہوئی۔ آنسو بھی اس کی آنکھوں کا رستہ بھول گئے تھے۔ سبھی عورتیں اس کی جسمانی حالت پر چہ میگوئیاں کرتی دھیرے دھیرے وہاں سے رخصت ہونے لگیں۔ کسی نے بھی ہمدردی کے دو بول ادا کرنے کی زحمت نہ کی۔

شام تک گھر بالکل خالی ہوگیا لیکن وہ وہیں اسی حالت میں بیٹھی رہی۔ اس کے وجود میں حرکت کی ہمت تھی نہ کوئی چاہت۔ وہ خالی نظروں سے آسمان کو...... اپنے بخت کی طرح سیاہی میں ملبوس ہوتے دیکھتی رہی۔ اسے دروازے پر ایک ہلکی سی دستک سنائی دی مگر وہ تب بھی ہل

کے نہ دی۔ اگلے ہی لمحے اس کے پاس وہی مانوس شخص آبیٹھا جسے دیکھ کر پلوشہ بدک جایا کرتی۔ وہ ایک بھاری بھر کم جسامت والا خواجہ سرا تھا۔ اس کے ہاتھ بہت بڑے تھے۔ رباب کی حالت دیکھ کر اس نے اذیت سے اپنی آنکھیں میچ لیں۔ اس کی چوڑی ناک اور بھی پھیلی ہوئی دکھائی دینے لگی۔

''اپنی یہ کیا حالت بنالی ہے تو نے میری چندا؟ میں نے تو پہلے بھی کہا تھا تیری ماں سے کہ تو ہماری امانت ہے...... تو اس دنیا کی نہیں ہے۔'' جسامت کے برعکس اس کی آواز میں بہت نرمی تھی۔

رباب کا دل اس ہمدردی اور محبت بھرے لہجے سے پسیج گیا اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ وہ اپنے بھدے ہاتھوں سے اس کے رخساروں پر آئے آنسو صاف کرتا قدرے تشویش سے بولا۔

''محلے کی عورتیں جانے کیا بکواس کرتی پھر رہی ہیں...... ہوسکتا ہے تجھے یہاں سے زبردستی نکال دیا جائے۔''

''میں کہاں جاؤں گی؟ میرا تو کوئی بھی نہیں اس دنیا میں۔'' وہ متوحش ہوگئی۔

''میں ہوں ناں تیرے ساتھ...... کیوں روتی ہے پگلی؟ تو اب اکیلی نہیں ہے...... مجھے اپنی بڑی بہن سمجھ لے یا بھائی...... لیکن میرے ساتھ چل میری چندا...... یہ دنیا ہمارے لیے نہیں بنی...... مکمل وجود والے ان لوگوں کے دلوں میں ہم جیسے ادھورے اور ناکارہ افراد کے لیے جگہ ہوتی ہے نہ عزت...... ہم تو محض ان کی دل بستگی کا ساماں ہوتے ہیں۔'' اس کا دلگیر لہجہ رباب کے آنسوؤں میں مزید اضافہ کرنے لگا۔

''اپنا ضروری سامان اٹھا لے جلدی...... اور چل میرے ساتھ۔''

وہ کسی معمول کے مانند اس کی ہدایات پر عمل کرتی چلی گئی۔ کچھ کپڑے، بینک کی رسیدیں اور والدین کی ایک تصویر لیے وہ حسرت بھری نظروں سے اپنی اس جنت کو دیکھتی اس کے ساتھ چلی آئی۔ انجانی منزل پر اس کے قدم اپنی شناخت کی تلاش میں آگے بڑھتے گئے۔

☆☆☆

وہ ایک عجیب علاقہ تھا۔

ٹوٹی پھوٹی گلیاں، غلاظت اگلتے گٹر، اکھڑے ہوئے رنگ و روغن والی خستہ حال دیواریں...... وہاں ہر گوشے سے بدبو پھوٹتی محسوس ہورہی تھی۔ رباب کے لیے اس گندگی اور ماحول کا تصور بھی کبھی محال تھا مگر اب وہ ان ٹیڑھے راستوں پر چلنے پر مجبور تھی۔

بدبو سے اس کا دماغ چکرانے لگا اور معدے میں شدید اینٹھن نے اس کے قدم وہیں روک دیے۔ وہ دائیں طرف میلی سی دیوار کے سہارے نیچے جھکی اور قے کردی۔ حلق اور زبان میں عجیب سی کڑواہٹ پھیل گئی۔ آنکھوں سے پانی نکلنے لگا۔ یہ کڑواہٹ اسے اپنی پوری زندگی پر محیط معلوم ہونے لگی تھی۔

ایک بھاری بھرکم ہاتھ اس کے کندھے سہلانے لگا تو وہ قدرے سنبھل گئی۔

''بڑی نازک مزاج ہے بھئی تُو! مدتوں ان شرفاء کے درمیان رہی جن کا باطن غلاظت اور بدبو سے اٹا ہے...... لیکن پھر بھی یہاں کی بُو تجھ سے برداشت نہیں ہورہی...... ہو جائے گی عادی آہستہ آہستہ۔'' وہ اس کا ہاتھ تھامے آگے بڑھ گیا۔

تھوڑی ہی دور اس گلی کے اختتام پر ایک نیم تاریک سا مکان موجود تھا۔ وہ اسی مکان کے سامنے رک گیا۔ کہنہ سال دروازے پر ستے سے کپڑے کا ایک بدرنگا دوپٹا لٹک رہا تھا جس میں کئی جگہ بڑے بڑے سوراخ موجود تھے۔ وہ بڑے اطمینان سے اسے لیے اندر داخل ہوگیا۔ چھوٹی سی ڈیوڑھی اور اس سے بھی مختصر صحن کے آگے دو کمرے تھے۔ در و دیوار میں خستگی اور عسرت بسی تھی۔

ایک کمرے میں اسے اپنے چہروں پر لیپا پوتی کرتے کئی افراد نظر آئے۔ انہیں دیکھ کر سبھی کی باچھیں کھل گئیں۔

''کہاں رہ گئے تھے میاں جی؟ کب سے اُڈیک رہے ہیں تجھے۔'' گہرے میک اَپ اور کھلے گلے والی چست قمیص میں ملبوس ایک وجود ہاتھ نچاتے ہوئے بولا۔

''کہیں نہیں بجلی! ایک اور سیارہ اپنے مدار سے جدا ہو کر دوسری دنیا میں بھٹک رہا تھا...... بس اسے اپنی دنیا کا رستہ دکھانے گیا تھا۔'' وہ سادگی سے کہتا ستے سے پلاسٹک کے جگ سے پانی انڈیل کر پینے لگا۔

''آئے ہائے...... اسے کہاں سے ڈھونڈ لیا میاں جی...... یہ تو محض ملائی سے بنی معلوم ہوتی ہے۔'' بجلی نے ایک بار پھر ہاتھ نچائے۔

باقی سب بھی اس کی طرف متوجہ ہوگئے۔ ان کی نظروں سے جھلکتی ستائش رباب کو نروس کرنے لگی۔ ایک سانولی رنگت اور دبلی جسامت والا شخص آنکھوں میں شوخی و

شرارت لیے اس کی طرف بڑھا اور چند قدم دور کھڑے ہو کر یکدم بولا۔

''کس نام سے پکاروں...... کیا نام ہے تمہارا
کیوں تم کو دیکھتے ہی...... دل کھو گیا ہمارا۔''

کمرے میں سب کے قہقہے گونج اٹھے۔ رباب پہلے تو بوکھلائی پھر جھینپتے ہوئے بولی ''میرا نام رباب ہے۔''

''بہت خوبصورت اور نغمگی بھرا نام ہے...... بالکل تمہاری طرح۔'' بلّی نے کہا۔

''ویسے میاں جی! اسے رقص ضرور سکھائیں گے...... راتوں رات اس کا نام مشہور ہوگا۔'' اسی سانولے شخص نے کہا۔

''خاموش رہ صنم! ہم نے کسی پر کوئی زور زبردستی نہیں کی...... اور نہ ہی اس پر کرنے دوں گا میں...... زیادہ شیخ چلی نہ بن...... اور اپنے کام پر دھیان رکھ۔'' میاں جی نے سبھی پر نظر دوڑاتے جواب دیا۔

صنم نے اس کی ڈانٹ کا قطعی برا نہ مانا۔ سبھی اپنے معمول کے مطابق اپنی تیاری کو 'فائنل ٹچ' دیتے کسی تقریب میں شرکت کے لیے روانہ ہو گئے۔ اس کمرے میں ان دونوں کے سوا اب صرف گہری خاموشی تھی۔ وہ دیوار کے ایک کونے میں موجود پچکے ہوئے فوم پر بیٹھ گئی۔ یہاں ہر چیز پر میل کی اتنی تہیں موجود تھیں کہ اصل رنگ روپ نظر ہی نہ آتا تھا۔

میاں جی نامی وہ شخص اس کے لیے ایک پلیٹ میں کھانا لے آیا۔ ''مجھے پتا ہے تو نے کچھ نہیں کھایا ہوگا۔ پیٹ کا ایندھن تو بھرنا ہی ہوتا ہے نا ہر حال میں...... تھوڑا سا کھا لے۔''

اس کا خلوص رباب کو اس کی بات ماننے پر ہر بار مجبور کر دیتا۔ وہ بحالت مجبوری بد ذائقہ چاول زہر مار کرنے لگی۔

''ایک بات پوچھوں میں آپ سے؟'' اس نے جھجکتے ہوئے کہا۔

''لے بھلا...... پوچھنے کی کیا لوڑ ہے...... ایک نہیں تو دس باتیں پوچھ۔''

''آپ کو کیسے اندازہ ہوا کہ میں بھی آپ کی طرح......'' وہ اپنے خیالات کو الفاظ کا روپ نہیں دے پا رہی تھی۔

''تیری آنکھوں کی ویرانی سے...... تیرے چہرے اور آنکھوں میں اس دنیا سے اجنبیت کا احساس میں تو کیا...... کوئی بھی دیکھ سکتا ہے۔'' وہ متانت سے بولا۔ ''تو خوش قسمت ہے...... دھتکارے جانے کا کرب نہیں سہا۔''

''آپ کا نام کیا ہے؟''

''ہم جیسوں کے کوئی نام نہیں ہوتے...... جو نام پیدائش سے جڑے ہوتے ہیں، وہ تو اُسی دنیا میں رہ جاتے ہیں...... یہاں میں صرف 'شمع' ہوں۔ یہی میری شناخت ہے...... اور یہی پہچان لیے میں مر جاؤں گا۔''

رباب خاموشی سے اس کے چہرے پر پھیلی تلخی دیکھتی رہی۔ اسے بھی شاید علم ہو گیا تھا کہ وہ اپنا غم غلط کرنے کے لیے اس کی ذات اور ماضی کو کرید رہی ہے۔ وہ چہرے پر مسکراہٹ لیے اپنے تصور کی انگلی تھمائے اسے ایک دور افتادہ گاؤں میں لے گیا، جہاں وہ شمعون غوری تھا۔

☆☆☆

شمعون ایک مزارع کی اولاد تھا۔

شادی کے سات سال بعد منتوں، مرادوں کے بعد اس کی پیدائش سے قبل غوری احمد کے تین بچے شیر خوارگی میں ہی وفات پا گئے تھے۔ اس کی ولادت کی نوید ملی تو انہیں اپنی دعاؤں اور صبر کا پھل ملتا محسوس ہونے لگا۔ لیکن وہ ایک ایسی آزمائش بن کے ان کی زندگی میں در آیا جس کے لیے وہ تیار ہی نہ تھے۔

غوری احمد ایک عام انسان تھا۔ جو دعاؤں کی قبولیت پر شکر تو کر سکتا تھا لیکن کسی آزمائش پر صبر کرنے کا یارا نہ تھا۔ اپنی بیوی کو جی بھر کر کوسنے کے بعد اس نے شمعون کو اس کے 'قبیلے' میں بھیجنے کی رٹ پکڑ لی۔ بیوی نے انکار کر دیا۔ وہ اگلے ہی دن طلاق کا تحفہ لیے اپنی ماں کے گھر چلی گئی۔

باپ کی وفات کے بعد ماں بھی تنہا زندگی گزارنے پر مجبور تھی۔ اب دونوں ماں بیٹی مل کر آہ و زاری کر لیتیں۔ شمعون کی اصلیت کسی مقدس راز کی طرح چھپالی گئی۔ زبیدہ سوچتی تھی کہ اسے پڑھا لکھا کر افسری دلوا دے گی اور ان کی قسمت بھی بدل جائے گی۔ افسری ہی وہ واحد ذریعہ ہوگی جو شمعون کا 'عیب' ڈھانپ کر اسے عام انسانی سطح پر لے آئے گی۔

مگر قسمت کے ایک ہی وار نے اس کا کئی برسوں سے بنایا جانے والا آرزوؤں کا محل تنکا تنکا بکھیر دیا۔

شمعون کی ذہانت ہی اس کی سب سے بڑی دشمن ٹھہری۔ مڈل کلاس کے بعد ہائی اسکول کے لیے بڑے قصبے کے اسکول میں اس کی کامیابیوں کے ڈنکے بجنے لگے۔ اس کی کلاس میں چودھریوں کا ایک لڑکا بھی پڑھتا تھا جو اس کی

آمد سے پہلے وہاں کا 'بے تاج بادشاہ' تھا۔

عامر ذہین ہی نہیں' مکار بھی خوب تھا۔ مخالف کو چٹکیوں میں اُڑانے کا ہنر تو گھٹی میں پڑا تھا۔ شمعون کی محنت اور لگن کی بے ضرر خوبیاں چودھری زادے کی 'جنگی سوچ' سے ٹکر نہ لے سکیں۔ تاڑنے والے بھی قیامت کی نظر رکھتے تھے۔ اسے شمعون کے متعلق ہلکے پھلکے شبہات تو پہلے ہی تھے۔ ایک بروقت چال نے ان خدشات پر تصدیق کی مہر بھی ثبت کردی۔

اسکول کے لڑکوں کے لیے نہانے دھونے کا انتظام ایک ٹیوب ویل پر تھا۔ لیکن وہ ہمیشہ نہانے کے لیے وہیں موجود کوٹھری کے ٹوٹے پھوٹے بیت الخلاء میں اپنے لیے پانی کی ایک بڑی بالٹی لے جاتا تھا۔ عامر اور اس کے چند دوستوں نے اس کے کپڑے غائب کر دیے۔ اور اسکول کے باقی لڑکوں کو بھی ایک 'تماشا' دکھانے کی غرض سے وہیں اکٹھا کرلیا۔

شمعون غوری کا بھید کھل گیا۔

حسد' نفرت اور بغض فاتح قرار پائے۔ سادگی' محنت' ذہانت اور بقاء کی تمام تر کوششیں اس شام رسوا ہوگئیں۔ اس کے چہرے اور جسم پر سیاہی پھیر کر گلے میں ایک رسی ڈال دی گئی اور برہنہ حالت میں کسی چوپایہ کی طرح قصبے کی گلیوں میں گھسیٹا جاتا رہا۔ وہ اس سے بھی کہیں زیادہ سخت 'سزا' کا مستحق تھا۔ مکمل انسانوں کے دیس میں اس 'نامکمل' قابلِ نفرت انسان کے لیے کوئی جگہ تھی نہ عزت۔ اس نے کامل لوگوں کو 'دھوکا' دینے کا جو گناہ کیا تھا' اس کی سزا تو بہر صورت ملنی تھی۔

اسی شام شمعون مرگیا۔

اس عزت افزائی کے بعد وہ اپنے گھر جانے کی ہمت تو نہ کر پایا لیکن اپنی اہانت کا انتقام... لینے کی ہمت ضرور تھی۔ رات کی تاریکی چھاتے ہی اس نے عامر کے بڑے سے حویلی نما گھر سے کچھ پہلے واقع ایک کھنڈر نما مکان میں گھات لگالی۔ جلد ہی عامر اور اس سارے کھیل کا ماسٹر مائنڈ احسن بہت سرشاری سے بے خوف و خطر گھر واپس آتے نظر آگئے۔ اس نے اپنے مضبوط ہاتھوں سے دونوں کی گردن دبوچ لی۔ اس کے ہاتھ پاؤں فطری طور پر بہت بڑے تھے۔

غصہ' جنون اور وحشت نے اس کے جسم میں بے پناہ طاقت پیدا کر دی تھی۔ اپنے دونوں ہاتھوں سے ان کے نرخرے اس طرح دبائے کہ انہیں آواز نکالنے کا موقع بھی نہ مل سکا۔ اس کے بعد ان کے ادھ موئے جسموں کو وہیں گرایا اور ایک بڑے پتھر سے دونوں کے چہرے بری طرح کچل دیے۔

عامر کے تن سے کپڑے اتار کر اس نے اپنی ستر پوشی کی اور خاموشی سے وہ علاقہ چھوڑ کر اپنی پہچان و شناخت کی تلاش میں بھٹکتا ان تاریک گلیوں اور رنگ برنگے لوگوں میں آن پہنچا۔ یہی اس کے اپنے تھے۔ وہ انہی میں زندگی گزارنے کے لیے پیدا ہوا تھا اور یہیں اسے مرجانا تھا۔ شمعون غوری سے 'شمع' بننے کے اس سفر کے بعد وہ لاشعوری طور پر رباب جیسے 'سیاروں' کی تلاش میں بھی رہتا اور کوئی نہ کوئی نامکمل وجود اسے مل ہی جاتا۔

☆☆☆

''اتنا کچھ ہوجانے کے بعد بھی آپ کس طرح ہنس بول لیتے ہیں؟'' رباب کھانا بھول چکی تھی۔

''مشکلیں اتنی پڑیں کہ آسان ہوگئیں...... تجھے بھی عادت ہوجائے گی۔'' اس نے بے نیازی سے کہا۔ ''آرام کرلے تھوڑی دیر...... ابھی وہ پلٹن لوٹ آئی تو مچھلی منڈی بن جائے گا یہ کمرا۔''

پچھلے چھتیس گھنٹوں میں اس کی زندگی نے بہت 'رنگ' بدلے تھے اور اب اس کینوس پر ایک ہی مستقل رنگ ٹھہر گیا۔ اس کی آنکھیں نیند سے جل رہی تھیں۔ دکھتے دل' ٹوٹتے جسم اور سُن ہوتے دماغ کے باوجود اسے نیند نے اپنی آغوش میں لے لیا۔

رات کے پچھلے پہر یکدم کسی شور اور کھٹ پٹ سے اس کی آنکھ دوبارہ کھل گئی۔ پنچھی اپنے آشیانے میں لوٹ آئے تھے۔ تھکاوٹ اور اندرونی کرب سے ان کی حالت انتہائی قابلِ رحم لگ رہی تھی۔ اس کا دل اداسی سے بھر گیا۔ وہ چپکے سے اٹھی اور ان کے پاس جا کر بڑی محبت سے بولی۔

''تھک گئے ہوناں سب...... چائے بنا کے لادوں آپ لوگوں کو؟''

اس کے بے ریا اور پُرخلوص انداز پر وہاں خاموشی چھا گئی۔

''ہماری یہ تھکاوٹ تو روز کا معمول ہے۔ تُو کب تک یہ مہربانیاں کرتی رہے گی؟'' صنم نے کہا۔

''جب تک آپ کہیں گے...... میں کھانا بھی بنا دیا کروں گی...... اور تو اماں نے کچھ سکھایا نہیں...... بس میری شناخت چھپاتے چھپاتے زندگی سے لڑتی رہی...... مجھے دنیا سے چھپا کر رکھتی رہی...... اور جس روز یہ پہچان کھلی...... اس

پہاڑوں کی بیٹی کو جانے کیسے خبر ہوگئی...... اپنی ناکامی پر مجھ سے روٹھ گئی۔" اس کے آنسو چھلک گئے۔

"آئے ہائے...... میں تیرے صدقے...... میری رانی...... نہ رو...... میرا کلیجا پھٹ جائے گا۔" ببلی کی آنکھیں بھی نم ہوگئیں۔

اگلے چند دنوں میں وہ ان کے ساتھ خوب گھل مل گئی۔ ان کے کئی کام اس نے اپنے ذمے لے لیے تھے۔ وہ تعداد میں پانچ تھے۔ شمع، ببلی، صنم، گل اور روزی۔ سب ہی کی ذات سے کوئی نہ کوئی المیہ وابستہ تھا۔ لیکن سبھی اپنی پریشانیاں پسِ پشت ڈالے اس زندگی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر جی رہے تھے۔

شمع کو محض بھاری بھرکم جسامت کی وجہ سے ازراہِ مزاح 'میاں جی' کہا جاتا تھا۔ اپنی اسی جسامت کے باعث وہ ان سب کے ساتھ ناچ گانے اور رقص کی تقریبات میں حصہ نہیں لے پاتا تھا۔ لہٰذا اس نے باہر کے سب کام سنبھال لیے۔ گھر کے لیے سودا سلف اور دیگر اشیا کے علاوہ آس پاس کے علاقوں میں کسی بھی ولادت اور شادی پر بھی گہری نظر رکھنا پڑتی۔ ایسے مواقع کی خبر ملتے ہی وہ 'بدھائی' لینے وہاں پہنچ جاتے۔

جوں جوں وقت گزرتا رہا، اسے ان کی زندگیوں کے خفتہ پہلوؤں کا بھی علم ہونے لگا۔ بے قدری اور عزتِ نفس سے محرومی ان کی روح کو گھن کی طرح چاٹتی تھی۔ ہر گزرتے دن کے ساتھ ان کی آنکھوں میں کرب اور روحوں میں دراڑ کی ایک نئی لکیر پیدا ہو جاتی۔ وہ جس قدر بھی کماتے، اس کا تین چوتھائی حصہ تو ان کی اپنی زیبائش میں صرف ہو جاتا۔ تقریبات کے لیے کپڑوں اور بہترین میک اپ کا سامان تو گویا ان کے ہتھیار تھے، جس سے وہ اپنی آمدنی کے مزید مواقع پیدا کرتے۔ ان اخراجات کے وہ سبھی عادی ہو چکے تھے لیکن ایک وجود ایسا بھی تھا جو ان معاملات میں دل کھول کر 'کنجوسی' کرتا۔ اس کی کوشش یہی ہوتی کہ وہ سستے سامان کی خریداری کے بعد بچنے والے پیسے اپنے 'خفیہ کھاتے' میں جمع کر لے۔

یہ گل تھی۔

اندرونِ شہر کے ایک مذہبی گھرانے سے تعلق رکھنے والی گل ہوش سنبھالتے ہی اپنی اصل دنیا میں لوٹ آئی تھی۔ اس کی شخصیت اور قلب و روح پر مذہب کا بہت گہرا اثر تھا۔ ببلی اور صنم کے برعکس وہ اٹھتے بیٹھتے، چلتے پھرتے نعتیہ اشعار گنگناتی۔ اس حرماں نصیب کی بس ایک ہی آرزو تھی...... خانۂ خدا کی زیارت...... اور اسی مقصد کے لیے وہ جانے کتنے سالوں سے پائی پائی جوڑ رہی تھی۔

اس کی خواہش کی تکمیل میں اب کچھ ہی وقت باقی رہ گیا تھا۔ مدتوں سے جمع شدہ رقم جلد ہی مطلوبہ ہدف تک پہنچنے والی تھی۔ گل کی خوشی دیدنی تھی۔ اور اسے خوش دیکھ کر باقی سب بھی بے حد و حساب خوش تھے۔

مگر مسرتوں سے نہال رقص میں مشغول وہ مور اپنے پاؤں دیکھنا بھول گئے تھے۔

☆☆☆

اس تنگ و تاریک گھر میں ایک اداسی کا عالم تھا۔

گل کے برسوں پرانے خواب بہت بری طرح ٹوٹے تھے۔ رقم کی تکمیل ہوتے ہی کچھ زمینی حقائق اس کے آڑے آگئے۔ سفری کاغذات بنوانے کے لیے اسے جس شناختی کارڈ کی ضرورت تھی، وہ اس کے پاس موجود تھا نہ ہی وہ اسے بنوانے کی مجاز تھی۔

"صبر سے کام لے گل! میں نے سنا تھا کہ سرکار ہمیں جلد ہی یہ اختیار مہیا کر دے گی۔ شناختی کارڈ بننے لگیں گے ہمارے بھی...... جہاں اتنا انتظار کیا ہے تو نے، تھوڑا اور کر لے۔" شمع نے اسے بھرپور تسلی دی۔

"نہیں میاں جی! میرا دل کہتا ہے کہ یہ رکاوٹیں کبھی ختم نہیں ہوں گی۔ یہ ختم ہوئی تو کوئی اور پیدا ہو جائے گی۔" گل مایوس ہو چکی تھی۔

"مجھے تو ایک بات کی سمجھ نہیں آتی......" رباب افسردگی سے بولی۔ "ہمیں بھی تو اسی خدا نے پیدا کیا ہے، اس کی بنائی ہوئی کائنات کی ہر چیز ہمارے لیے یکساں ہے۔ دھوپ، بارش، پھول، پودے، ہوا، چاند، ستاروں نے تو کبھی ہمیں اپنی تاثیر سے محروم نہیں رکھا...... تو پھر یہ چند مٹھی بھر انسان ہمارے خدا کیوں بن بیٹھے ہیں۔ ہم سے زندگی کے بنیادی حقوق چھین کر اپنی کون سی حس کی تسکین کرتے ہیں۔"

"لے دس بھلا! ایک گل کی اداسی کیا کم تھی...... اب تو بھی شروع ہوگئی ہے۔" صنم نے مصنوعی خفگی دکھائی۔ "اس طرح فلمی ہیروئن بن کر بیٹھے رہنے سے کچھ نہیں ہوگا...... ہمت کرو۔ کوئی نہ کوئی رستہ جلد ہی نکل آئے گا۔"

اسی پل شمع کے موبائل کی گھنٹی بجی۔ اس نے انہیں خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور فون آن کر کے کان سے لگا لیا۔ کچھ منٹ تک وہ آنکھیں سکیڑے مخاطب کی بات سنتا رہا۔ اس کے چہرے پر مدوجزر کی سی کیفیت طاری تھی۔

''ٹھیک ہے ملک صاحب...... آپ بے فکر رہیں......ہم وقت پر پہنچ جائیں گے۔''

اس نے الوداعی کلمات کے بعد فون بند کر دیا۔

''لے بھئی گل! تیرا مسئلہ حل ہوتا نظر آ رہا ہے۔'' اس کا انداز معنی خیز تھا۔

''کس کا فون تھا میاں جی؟'' وہ سبھی متجسس تھے۔

''ملک مقصود کے کارندے کا فون تھا بھئی...... اپنے حلقے میں کامیابی حاصل کی ہے ناں اُس نے...... تو یار دوستوں کے ساتھ موج مستی کا پروگرام ہے ان کا۔''

''لیکن میاں جی! یہ لوگ تو ہائی کلاس پروفیشنل رقاصائیں بلایا کرتے ہیں...... ہماری یاد کیسے آ گئی ان کو؟'' روزی نے الجھ کر پوچھا۔

''انہیں بھی بلایا ہے لیکن اس کے کچھ دوست اب بھی پرانے وقتوں کی سوچ رکھتے ہیں...... اس لیے ہمیں بھی دعوت دے دی ہے۔''

''ہم نے تو ان سیاسی لوگوں کے منہ نہ لگنے کا فیصلہ کیا تھا میاں جی! یہ اچانک تبدیلی کیوں؟'' ببلی نے اسے یاد دہانی کروائی۔

''سب یاد ہے مجھے...... بھولا نہیں ہوں میں بھی...... یہ فیصلہ میں نے گل کے لیے کیا ہے۔'' شمع کے لہجے میں گہری سنجیدگی تھی۔

''میرا کیا بھلا ہوگا اِس میں...... میں نے اپنی خواہش پہ فاتحہ پڑھ لی ہے۔ تم سب لوگ بھی چھوڑ دو اِس بات کو اب۔'' گل کی آواز آنسوؤں سے بوجھل ہو چکی تھی۔

''ایک رستہ اب بھی موجود ہے گل...... میں ذاتی طور پر اُس سے بات کروں گا۔ تیرے شناختی کارڈ کے لیے اُس کے تعلقات کام آ سکتے ہیں۔'' شمع نے اسے تسلی دی۔ ''تو جو بھی کہے۔ میں ایک کوشش ضرور کروں گا۔''

''جانا کب ہے؟'' صنم نے پوچھا۔

''آج رات...... تیاریاں شروع کر دو...... میں بھی جاؤں گا ساتھ۔'' اس نے حتمی انداز میں کہا۔

☆☆☆

اگلی صبح کا سورج بہت سی امیدیں اور خوشیاں لیے طلوع ہوا۔

ملک مقصود کے ڈیرے پر ہونے والی تقریب بہت یادگار تھی۔ شراب و شباب کے نشے میں دھت اس کے دوستوں نے ان پر پیسہ بھی جی بھر کر لٹایا۔ شمع نے رات کو موقع پا کر ملک کے خصوصی کارندے سے گل کا مسئلہ حل کرنے کے لیے ساری بات چیت بھی کر لی تھی۔ زلفی نے اس سلسلے میں جلد ہی مطلوبہ نتائج کی یقین دہانی کروائی تھی۔

ملک کے اس دستِ راست کے بارے میں یہی مشہور تھا کہ اس کے قائل ہوتے ہی خود مقصود بھی فوری قائل ہو جایا کرتا ہے۔

امید اور آس بھرے ماحول میں دوپہر کا کھانا کھایا گیا۔ آج رات ان کا کوئی بھی فنکشن نہ تھا اس لیے سبھی سستی سے اِدھر اُدھر اینڈتے پھر رہے تھے۔ شام کے سائے گہرے ہونے لگے تو گھر کے باہر ایک بے ہنگم شور برپا ہو گیا۔

ایک بڑی سی جیپ سے تین افراد برآمد ہوئے اور دندناتے ہوئے اندر داخل ہو گئے۔ وہ کلف لگی شلوار قمیص میں ملبوس تھے اور سبھی کے ہاتھوں میں اسلحہ تھا۔ نشے سے سرخ آنکھیں، کانوں میں بالیاں اور انگلیوں میں رنگ برنگے پتھروں کی انگوٹھیاں ان کے 'قبیلے' کا بخوبی پتا دے رہی تھی۔

''بے نتھے بیل کی طرح کدھر گھسے چلے آ رہے ہو؟ کیا بے ہودگی ہے یہ؟'' ببلی نے چلا کر کہا۔

''بکواس بند کر اپنی ہیجڑے! کدھر ہے تم لوگوں کا گرو؟ سامنے لاؤ اُسے۔'' ان میں سے ایک طویل قامت اور چھریرے جسامت والے شخص نے اپنا ماؤزر لہراتے ہوئے کہا۔

''میں ہیجڑا ہوں تو تُو کونسا مرد کا بچہ ہے...... اس اسلحے کے بل پہ ہی ہے تیری مردانگی بھی۔'' ببلی نے طیش سے کہا۔

اس شخص کی آنکھوں سے شرارے لپکنے لگے۔ اس نے ماؤزر کا دستہ ببلی کے منہ پر دے مارا۔ اس کے کئی دانت ٹوٹ کر باہر جا گرے اور چہرہ لہولہان ہو گیا۔ اسی اثنا میں دوسرے شخص نے شمع کو کمرے سے باہر آتے دیکھا تو اسے گریبان سے پکڑ کر صحن میں لا پھینکا۔

''تجھے کیا علم نہیں تھا کہ ملک مقصود ہماری پارٹی کو ہرانے کا جشن منا رہا ہے؟'' اس نے دہاڑ کر کہا۔

''علم تھا مجھے۔'' شمع کے پُرسکون انداز نے اسے مزید طیش میں مبتلا کر دیا۔

''تو پھر اپنی اس پلٹن کے ساتھ کیا کرنے گیا تھا تُو وہاں؟'' تیسرے شخص نے اسے زوردار تھپڑ مارتے ہوئے پوچھا۔

''وہی کرنے گیا تھا...... جو ہمارا کام ہے۔'' وہ بے خوفی سے بولا۔

''ہمارے علاقے میں رہتے ہو اور ہمارے ہی دشمنوں کے ساتھ مل کر جشن مناتے ہو؟'' اس طویل قامت نے کہا۔

''ہم کونسا تمہاری دنیا کے باسی ہیں' جو تمہاری ہار جیت کی پروا کریں...... ہماری تو کمائی کا ذریعہ ہی یہی ناچ گانا ہے...... اسی سے کمائیں گے اور کھائیں گے۔'' روزی نے تن کر کہا۔

''ہائے ہائے! تیور تو دیکھو ذرا اِس کے۔'' وہ اپنی بندوق اس کے رخسار کے قریب لے آیا۔ روزی کی سبزی مائل کجراری آنکھوں میں موجود بے خوفی اسے طیش دلا رہی تھی۔ اس نے روزی کا سر اپنی طرف جھکا تو اس کے سیاہ بال بائیں جانب جھولنے لگے۔ اس کے پھولے نتھنے' میک اَپ زدہ چہرے سے جھلکتی سختی اور آنکھوں میں چھلکتی سرخی انہیں کسی کوڑے کی طرح چبھنے لگی۔

مخالف پارٹی اپنی شکست کے بعد بہت تلملائی ہوئی تھی۔ ان کی خصوصی 'فورس' کے کارنامے بھی کسی سے ڈھکے چھپے نہیں تھے۔ چند افراد پر مشتمل یہ گروہ اپنی ذات میں ایک مکمل مافیا تھا۔ دکان داروں سے بھتا وصولی' اغوا برائے تاوان' منشیات وغیرہ...... ایسا کون سا کام تھا' جو وہ اس پارٹی کی سرپرستی میں نہیں کرتے تھے۔

مقصود کی فتح نے مخالفین کے کیمپ میں صفِ ماتم بچھا دی۔ اس شکست کا غصہ علاقے کے دیگر لوگوں کی طرح ان بے ضرر افراد پر بھی خوب اترا۔

روزی کی برحق بات اور بے خوف تیوروں نے اُن کے تن بدن میں آگ لگا دی۔ گھٹے ہوئے جسم اور سانپ جیسی زہریلی آنکھوں والے اس شخص نے اسے بالوں سے گھسیٹ کر زمین پر گرایا اور اس کی ٹانگوں پر پستول کے فائر کھول دیے۔

''اب انہی ٹوٹی ہوئی ٹانگوں سے ناچنے جانا وہاں۔''

وہ غصہ اور جنون میں اپنے ہوش بالکل ہی کھو چکا تھا۔ شمع کو بھی ٹھوکریں رسید کرتے وہ مغلظات بکتے آندھی و طوفان کی طرح واپس چلے گئے۔

☆☆☆

خوشی و مسرت کے لمحات پل بھر میں ہی آہ و بکا میں بدل گئے۔

شمع اور صنم اسے اپنے کندھوں پر لادے مرکزی سڑک کی طرف لپکے۔ روزی کو اسپتال لے جانے کے لیے سواری کا بندوبست وہیں سے ہو سکتا تھا۔ اسپتال پہنچ کر ان

کے سامنے ایک اور پل صراط کھڑا تھا۔

انتظامیہ نے اس واقعے کو پولیس کیس قرار دیتے ہوئے اسے ابتدائی طبی امداد دینے سے انکار کر دیا۔ چاروناچار شمع نے زلفی کو فون کیا اور اس سارے واقعہ کا پس منظر بتاتے ہوئے مدد کی اپیل کی۔ ملک مقصود کی سیاسی شہرت کے لیے زلفی نے انتظامیہ کو علاج اور فوری آپریشن کا حکم دے دیا۔

اس پریشانی کا خاتمہ ہوا تو شمع کو اپنی خالی جیب کا تصور ہولانے لگا۔ وہ صنم کو وہیں چھوڑ کے گھر چلا آیا۔ اس کی اپنی جمع پونجی میں تو بمشکل چند ہزار روپے موجود تھے۔ باقی سب کی بھی یہی صورتِ حال تھی۔ گل کے سامنے دستِ سوال دراز کرنے کی اس میں تاب نہ تھی۔

رباب نے اس کی پریشانی بھانپ لی۔ اس نے اپنے سامان سے ایک چرمی بیگ نکالا اور شمع کے پاس چلی آئی۔

''یہ رکھ لیں میاں جی!......''

''یہ کیا ہے رباب؟'' اس نے حیرانی سے پوچھا۔

''کاغذ کے وہ ٹکڑے ہیں جو میرے لیے بے مول ہیں...... لیکن روزی کی زندگی بچانے کا یہی مول ہیں۔''

''تیرے پاس کہاں سے آئے اتنے پیسے؟''

''اماں نے اپنے آخری ایام میں بینک میں جمع ساری رقم نکلوا لی تھی...... اسے بھی غالباً علم ہو چلا تھا کہ اس کے بعد میری شناخت ان پیسوں کو خود وہاں سے لانے کے لیے ناکافی ہوگی۔'' وہ گہری سانس بھر کے بولی۔

اس کی آنکھوں سے جھلکتے خلوص نے شمع کو آبدیدہ کر دیا۔ ''ان پیسوں کے بعد تیرے پاس تو کچھ بھی باقی نہ رہے گا...... تو انہیں اپنے پاس ہی رکھ...... میں زلفی سے بات کرتا ہوں۔ وہ اپنی سیاسی ساکھ کے لیے مالی تعاون بھی کر دے گا۔''

''میرے پاس آپ سب رہو گے نا...... پیسوں کا کیا ہے...... زلفی سے بعد میں کر لینا بات...... ابھی یہی لے جاؤ......'' اس کا انداز ملتجیانہ تھا۔

شمع کو اس کی ذہنی کیفیت بخوبی سمجھ آ گئی تھی۔ اس نے محبت سے اس کا ہاتھ دبایا اور مسکراتے ہوئے وہ بیگ لیے دوبارہ اسپتال روانہ ہو گیا۔

☆☆☆

روزی کا آپریشن کر دیا گیا۔ لیکن خون زیادہ بہہ جانے کی وجہ سے اس کی جسمانی مدافعت بہت کم ہو گئی تھی۔ آپریشن کے دو گھنٹے بعد وہ زندگی کی بازی ہار گئی۔

ان سب پر یکدم ایک قیامت ٹوٹ گئی تھی۔ وہ ایک طویل مدت سے ایک ہی خاندان کی طرح رہتے آئے تھے۔ نواحی علاقے سے آئی روزی کو اس کے لواحقین نے پیدائش کے فوری بعد ہی خود سے جدا کر دیا تھا۔ مختلف گروہوں کے ساتھ رہتی وہ بالآخر شمع سے آملی اور اب تو واپسی کا تصور ہی فراموش کر چکی تھی۔

ان سبھی کے دلوں پر شام جیسا موسم ٹھہر گیا تھا۔ آنسو تھے کہ بہتے ہی چلے جا رہے تھے۔ وہ گھر کسی قبرستان کا منظر پیش کر رہا تھا۔ یہ خاموشی دفعتاً شمع کے موبائل فون کی گھنٹی سے ختم ہوئی۔

''کیا بات ہے زلفی! اب کس لیے فون کیا ہے؟'' وہ دکھ اور بیزاری سے بولا۔

''ٹھیک ہے۔ میں تھوڑی دیر میں پہنچتا ہوں۔'' کچھ دیر اس کی بات سننے کے بعد شمع نے دوبارہ کہا۔

''اب کدھر کی تیاری ہے؟'' بجلی کی آواز میں کھنڈروں کی سی ویرانی تھی۔

شمع نے اسے خاموشی کا اشارہ کرتے اپنے پیچھے آنے کو کہا۔ وہ گل کو کسی بھی بات کی بھنک نہیں پڑنے دینا چاہتے تھے۔ سرگوشی میں بجلی کو اپنا مدعا سمجھاتے وہ عجلت میں باہر نکل گیا۔

''اب کیوں گیا ہے یہ اُدھر؟'' صنم نے دبے ہوئے غصیلے لہجے میں کہا۔

''گل کے کاغذات کا انتظام ہوتا نظر آ رہا ہے...... اسی کے لیے گیا ہے......''

''اللہ پاک جلد ہی کوئی وسیلہ بنا دے گل کے لیے...... کسی کی مسافت تو منزل تک پہنچے۔'' رباب دھیرے سے بولی۔

☆☆☆

فضا میں عشا کی اذانیں گونج رہی تھیں۔

وہ سب اب بھی شمع کے انتظار میں تھے۔ آدھے گھنٹے بعد چہرے پر دبے دبے جوش سے اس کی واپسی ہوئی۔

''گل کہاں ہے؟'' اس نے چھوٹتے ہی استفسار کیا۔

''وضو کے لیے گئی ہے...... کئی بار پوچھ چکی ہے تمہارا۔'' صنم نے بتایا۔

''اسے کوئی بھنک تو نہیں لگنے دی ناں؟''

''نہیں۔ لیکن تم بتاؤ؟ سب خیریت رہی؟''

''ہاں! انتظام پکا ہی سمجھو۔ ایک ہفتے میں اُس کے کاغذات ہمارے ہاتھ میں ہوں گے۔''

''شکر ہے پروردگار کا...... میں نے بہت دعائیں

مانگی تھیں ان کے لیے۔'' رباب بھی کھل کر مسکرائی۔
اسی اثنا میں گل بھی کمرے میں چلی آئی۔ ان کے چہروں پر کھلی مسکراہٹیں دیکھ کر اچنبھے سے بولی۔
''کیا بات ہے؟ کون سا قارون کا خزانہ لگ گیا ہے ہاتھ؟''
''خزانہ ہی سمجھ لے گل...... تیرے کاغذات کی تیاری کا بندوبست ہو گیا ہے۔ بس اب تو اپنے خوابوں کی تکمیل کے لیے تیار ہو جا۔'' شمع نے آگے بڑھ کر اسے گلے لگا لیا۔
''میاں جی! یہ مذاق کا ویلا نہیں ہے۔'' وہ بے یقینی سے بولی۔
''لے دس بھلا...... مذاق کیوں کروں گا میں تیرے ساتھ؟''
گل پر شادیٔ مرگ کی کیفیت طاری ہو گئی۔ ''میرے اللہ! میں کیسے شکر ادا کروں تیرا؟''
''روزی کی قربانی تیری منزل آسان کر گئی۔ زلفی اور ملک مقصود خود بھی بہت افسردہ تھے اس کی ایسی موت پر۔'' شمع کے انکشاف نے سب کی آنکھیں ایک بار پھر نم کر دیں۔
''میں آج خاص طور پر شکرانے کے نفل پڑھوں گی......''
گل نے کمرے کے مغربی کونے میں جائے نماز بچھالی۔
اس کی عبادت میں خلل نہ پڑنے کی غرض سے وہ آپس میں دھیمی آواز میں گفتگو کرنے لگے۔ تبھی بیرونی دروازے پر انہیں قدموں کی دھمک سنائی دی۔ ان کے سنبھلنے سے قبل ہی ایک بار پھر اسلحہ بردار دندناتے ہوئے اندر داخل ہو گئے۔

☆☆☆

''پچھلی دفعہ کا پڑھایا ہوا سبق بھول گئے تھے کیا۔ جو آج پھر اپنے اس ناجائز باپ کے پاس جا پہنچے۔'' اس طویل قامت نے کہا۔
''دیکھ جیدے! ہمارا تجھ سے کوئی جھگڑا نہیں...... جیسا تم لوگ سمجھ رہے ہو ویسا کچھ بھی نہیں ہے۔'' شمع نے موقع کی نزاکت دیکھتے ہوئے تحمل سے کہا۔
''اب تیری اوقات ہے کیا ہم سے جھگڑا کرنے کی؟'' جیدے نے تمسخر اڑایا۔
''نہیں...... ہماری یہ حیثیت نہیں کہ تم لوگوں سے الجھیں اس لیے ہمیں اپنی زندگی جینے دو۔''
''میرے منع کرنے کے باوجود تُو ملک سے ملنے کیوں گیا؟ کونسے جشن کی تیاریاں ہیں اب؟''
''میں اپنے ذاتی کام کے لیے گیا تھا...... تم لوگوں کا کوئی سروکار نہیں اس سے۔'' شمع نے رکھائی اختیار کی۔
''او بلے بھئی بلے! سن رہا ہے جیدے! اب ان کے ذاتی کام سیاسی اکھاڑوں میں ہوا کریں گے۔'' جانی نے زوردار قہقہہ لگایا۔
''میں اپنے ایک ساتھی کے لیے سفری کاغذات بنوانا چاہتا تھا اسی لیے مدد چاہیے تھی اُن کی...... اب جاؤ تم لوگ یہاں سے۔''
جیدے اور جانی کی نظر گل پر پڑی۔ ان کی آنکھوں میں شیطانیت صاف نظر آنے لگی۔ جیدے نے اپنے تیسرے ساتھی کو مبہم سا اشارہ کیا۔ وہ لپک کر گل کے سجدہ ریز وجود پر اپنے پاؤں کا دباؤ ڈالے کھڑا ہو گیا۔
''یہ کیا درندگی ہے جیدے! روکو اس کو۔'' شمع سمیت وہ سب ہی تڑپ اٹھے۔
''سچ سچ بتا! اپنے ساتھی کی موت کا سودا کر کے آیا ہے ہمارے خلاف؟'' جانی غرایا۔
''میں صرف اس کے کاغذات کے لیے گیا تھا......'' وہ چیخ گیا۔
''یہ ایسے نہیں مانے گا۔'' جیدا بھڑک گیا۔ ''شیرو! شروع ہو جا۔'' اس نے تیسرے ساتھی کو ایک مخصوص اشارہ کیا۔
شیرو کی آنکھوں میں خباثت اور ہونٹوں پر ایک زہریلی مسکراہٹ جھلکنے لگی۔ اس نے گل کے تڑپتے وجود پر اپنے پاؤں کا دباؤ مزید بڑھایا اور اس کے جسم میں تین گولیاں اتار دیں۔
ان کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ شمع نے اپنے بھاری بھرکم ہاتھوں سے دونوں کا نرخرہ دبوچ لیا۔ شیرو نے اپنے پستول کی باقی تین گولیاں اس کے سر اور سینے میں مار دیں۔ خون کسی فوارے کی طرح اُبلا اور صدمے سے ساکت کھڑی رباب، صنم اور بلی کے کپڑے داغدار کر گیا۔
''انہیں آئندہ کہیں ناچنے گانے کے قابل نہیں چھوڑنا جانی!'' جیدا بولا۔
''سمجھ گیا ہوں میں...... بس دیکھتا جا میں کرتا کیا ہوں؟''
اس نے ایک ٹوٹی پھوٹی چوبی الماری میں موجود ان کے کپڑوں اور میک اپ کا سامان نکال کر لائٹر میں موجود پیٹرول ان پر انڈیل دیا۔
جانی کی نظروں میں صنم اور بلی کے لیے مچلتے شہوانی جذبات جیدے سے پوشیدہ نہ رہ سکے۔ اس نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''ادھر ایک اور چھوٹا کمرا موجود ہے۔ وہیں لے جاؤ ان دونوں کو۔''

جانی نے شیرو کی مدد سے ان کے مچلتے وجود چار پائی کی رسی سے باندھے اور انہیں زبردستی گھسیٹتے ہوئے لے گئے۔ جیدے نے رباب کو سختی سے جکڑ رکھا تھا۔ جو اُن دونوں کی مزاحمت اور چیخیں سن کر اپنے حواس کھو رہی تھی۔

ابلیسیت کا وہ رقص تھوڑی دیر بعد تھم گیا۔ ان دونوں کی صدائیں گولیوں کی آواز میں دب گئیں۔ اگلے ہی لمحہ شیرو کپڑے سے بنا ایک تھیلا اٹھائے بڑے جوش سے جیدے کے پاس چلا آیا۔

''یہ دیکھ ذرا استاد...... اس خزانے پر سانپ بنے بیٹھے تھے یہ......'' اس نے زیرِ لب موٹی سی گالی دی۔

اس تھیلے میں ان حرماں نصیبوں کی سالہا سال سے جمع شدہ رقم تھی۔ جس میں گل کا حصہ سب سے زیادہ تھا۔

''لے چل ساتھ یہ رقم۔'' جیدا بے نیازی سے بولا۔

''اس مکھن ملائی کا کیا کرنا ہے؟'' جانی نے رباب کی طرف اشارہ کیا۔

''نیا پنچھی لگتا ہے یہ اس گروہ کا...... لے چلتے ہیں اسے بھی ساتھ ہی۔''

کمرے میں موجود مختصر سامان کو نذرِ آتش کر کے وہ اطمینان سے رخصت ہو گئے۔

☆☆☆

رباب کے لیے ایک قیامت خیز دور کا آغاز ہو گیا۔

ماں کی جدائی کے بعد اس کے نئے ساتھیوں کا خلوص اسے کسی نہ کسی طرح زندگی کی طرف واپس لے آیا تھا۔ لیکن چند ہی دنوں میں اپنے سامنے پانچ بہیمانہ قتل اس کے اعصاب کو بری طرح توڑ پھوڑ گئے۔ جیدے اور اس کے گروہ کے باقی ساتھیوں کی بدنیتی وہ بخوبی سمجھ چکی تھی۔ وہ کئی ہفتے بیہوشی اور نیم بیہوشی میں بھی ان کی درندگی اپنے وجود پر سہتی رہی۔ وہ بھیڑیوں کا ایک غول تھا جن کے نرغے میں ایک بھیڑ آن پھنسی تھی۔ بدترین جنسی تشدد سہتے اس کا ذہنی توازن یکدم اُلٹ جاتا۔ اپنے ساتھیوں کی خونچکاں لاشیں ہر وقت پردۂ تصور پر رقص کرتیں۔ وہ کسی بھی صورت وہاں سے رہائی پانا چاہتی تھی۔

لیکن کیسے؟

اس بات کا علم خود اُسے بھی نہ تھا۔ وہ شراب کے نشے میں اسے 'مجرابازی' کے لیے بھی مجبور کرتے لیکن اسے یہ سب کسی نے سکھایا ہی کب تھا؟

''مجھے ناچنا نہیں آتا۔ خدا کے واسطے مجھ پر رحم کرو۔'' وہ ہاتھ جوڑ دیتی۔

''تو تجھے آتا کیا ہے نامراد؟ ناچ سکتی ہے نہ ہی مردوں کو خوش کر پاتی ہے...... شمع کے ساتھ کرتی کیا تھی تو؟'' جیدا اسے بالوں سے جھنجھوڑتا ہوا بولا۔

''کچھ بھی نہیں کرتی تھی میں...... بے کار وجود ہے میرا...... میری بھی جان لے لو جیسے اُن سب کی لی...... مجھے بھی کیوں نہیں مار دیتے؟'' وہ حلق کے بل چلائی۔

''مارنا ہی تو نہیں ہے تجھے میری رانی! ذرا اپنے آپ کو دیکھ آئینے میں...... ایسا حسین چہرہ اور قیامت ڈھاتا سراپا کیسے ختم کر دوں میں؟ کوئی بات نہیں...... تجھے اگر کچھ نہیں آتا کرنا تو ہم سکھا دیں گے سب کچھ...... بجلی بنا دیں گے تجھے۔'' وہ اس کی کیفیت سے محظوظ ہوتا ہوا بولا۔

وہ ان کے لیے ایک کھلونا بن گئی جسے وہ ہمہ وقت کچوکے دیتے۔ اس گینگ کے ساتھ رہنا رباب کی روح کا آزار بن گیا۔ کئی دن سوچ بچار کے بعد اس نے ذہن میں ایک منصوبہ ترتیب دے ہی ڈالا۔ اپنے دماغی توازن کی خرابی کا یقین دلانے کے لیے اس نے پاگلوں جیسی حرکات شروع کر دیں۔ اپنے لیے بھیجا گیا کھانا اور سالن وہ اپنے سر اور جسم پر انڈیل لیتی۔ اسی پر بس نہ رہتا تو بیت الخلاء کی گندگی اپنے وجود پر لپٹا لیتی۔ اپنی بزدلی، کم ہمتی پر اُسے طیش بھی آنے لگتا۔

چند ہی دنوں میں وہ غلاظت اور بدبو کا ڈھیر بن گئی تو اس کا وجود پامال کرنے والے وحشیوں نے بھی گھن کھاتے ہوئے اس کے پاس آمد میں کمی کر دی۔

دن گزرتے رہے، وہ اپنے اس نئے قفس میں بے بسی سے پھڑ پھڑاتی رہی۔ اس مختصر عرصہ میں ہی اس کی صحت تباہ ہو گئی۔ روز و شب کا شمار بھی کھو گیا تھا۔ اس کے کمرے میں جب بھی جیدے کا کوئی گماشتہ اپنی شیطنت کی تسکین کے لیے آتا تو وہ سمجھ جاتی کہ ایک اور سیاہ رات نے اپنے پر پھیلا لیے ہیں۔

جانے کتنا عرصہ بیت گیا؟

اس کا استخوانی وجود ابلیس کے ان چیلوں کے لیے مکمل بے کشش ہوا تو انہوں نے اسے منہ لگانا ترک کر دیا۔ وہ چت لیٹی کمرے کی چھت کی کڑیاں گنتی، اپنے ماضی کے آسیب سے فرار میں ہلکان رہتی۔ تبھی ایک روز مخصوص شور شرابا اور للکار نے اس کے وجود میں سنسنی دوڑا دی۔

''ساری زندگی ہماری دی ہوئی ہڈیوں پہ پلتا رہا ہے...... اور آج ہمیں ہی کاٹنے چلا آیا ہے تُو؟'' یہ کھردری آواز بلاشبہ جیدے کی تھی۔

''اوپر سے بڑے سخت آرڈر ملے ہیں مجھے...... تم

پاک سوسائٹی پر موجود مشہور و معروف مصنفین

عُمیرہ احمد	صائمہ اکرام	عُشنا کوثر سردار	اشفاق احمد
نمرہ احمد	سعدیہ عابد	نبیلہ عزیز	نسیم حجازی
فرحت اشتیاق	عفت سحر طاہر	فائزہ افتخار	عنایت اللّٰہ التمش
قُدسیہ بانو	تنزیلہ ریاض	نبیلہ ابر راجہ	ہاشم ندیم
نگہت سیما	فائزہ افتخار	آمنہ ریاض	مُمتاز مُفتی
نگہت عبداللّٰہ	سباس گُل	عنیزہ سید	مُستنصر حُسین
رضیہ بٹ	رُخسانہ نگار عدنان	اقراء صغیر احمد	علیم الحق
رفعت سراج	اُمِ مریم	نایاب جیلانی	ایماے راحت

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود ماہانہ ڈائجسٹس

خواتین ڈائجسٹ، شُعاع ڈائجسٹ، آنچل ڈائجسٹ، کرن ڈائجسٹ، پاکیزہ ڈائجسٹ، حناء ڈائجسٹ، رِدا ڈائجسٹ، حجاب ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، جاسُوسی ڈائجسٹ، سرگُزشت ڈائجسٹ، نئے اُفق، سچی کہانیاں، ڈالڈا کا دستر خوان، مصالحہ میگزین

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی شارٹ کٹس

تمام مُصنفین کے ناولز، ماہانہ ڈائجسٹ کی لسٹ، کِڈز کارنر، عمران سیریز از مظہر کلیم ایم اے، عمران سیریز از ابنِ صفی، جاسُوسی دُنیا از ابنِ صفی، ٹورنٹ ڈاؤنلوڈ کا طریقہ، آن لائن ریڈنگ کا طریقہ،

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براوزر میں لکھیں یا گُوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائیٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اِس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بُک پر رابطہ کریں۔۔۔

لوگوں کی گرفتاری پر مجبور ہوں میں۔'' اس بھاری بھر کم آواز میں اسے رہائی کی نوید جھلکتی محسوس ہوئی۔

''تجھے چودھری صاحب کی پہنچ کا اندازہ نہیں ہے کیا فیاض۔ تو اُن کے بندوں پر ہاتھ ڈال کے اچھا نہیں کر رہا؟''

''چودھری صاحب کا وقت اب ایکسپائر ہو چکا ہے میرے بھولے بادشاہ...... ملک مقصود کی پہنچ کے سامنے اس نے بھی گھٹنے ٹیک دیے ہیں۔''

''او چھڈو ایس پی صاحب! آپ کے لیے کیا مشکل ہے؟ اِدھر ہی مک مکا کر لیتے ہیں۔'' جالی نے معنی خیز انداز میں کہا۔

''مجھے کیا فائدہ ہوگا اس مک مکا میں؟'' فیاض نے نیم رضامندی سے جواب دیا۔

''ہمارے دو تین نچلے درجے کے ورکر لے جاؤ ساتھ' تھوڑا اسلحہ اور ایک آدھ قیدی بازیاب کروالو...... اور ہمیں یہاں سے نکلنے کا محفوظ رستہ فراہم کر دو...... بعد میں اپنی مرضی کی پولیس مقابلہ کی رپورٹ بنالینا۔'' جیدے نے فوری راہ سجھائی۔ ''پیسہ آپ کی اپنی مرضی کا۔''

''او کے! میں تیار ہوں...... تم لوگ نکلنے کی تیاری کرو فوراً۔'' فیاض نے عجلت میں کہا۔

اگلے دس سے پندرہ منٹ وہ افراتفری اور شور شرابہ سنتی رہی۔ ان کے جانے کے بعد فیاض کے حکم پر دو حوالداروں نے کمروں کی تلاشی کا آغاز کر دیا۔ رباب کے علاوہ اوپری منزل کے کمروں سے دو رقاصائیں بھی برآمد ہوئیں۔ انہیں گھسیٹ کر پولیس وین میں ڈال دیا گیا۔

رباب کے ذہن میں کچھ عرصہ پہلے کے وہ مناظر پوری شدت سے اجاگر ہو گئے جن کی بدولت وہ اس گرداب میں پھنس کر ایک لامتناہی عذاب کا شکار ہوئی تھی۔

پولیس اسٹیشن پہنچ کر انہیں حوالات میں بند کر دیا گیا۔ حوالدار آتے جاتے انہیں فحش اشارے اور معنی خیز گفتگو سے چٹکیاں بھرتے رہے۔ وہ دونوں لڑکیاں ان کی بیہودہ گوئی میں برابر شریک رہیں۔ غالباً وہ انہیں اسی طرح رجھا کر اپنی رہائی کی صورت پیدا کرنا چاہتی تھیں لیکن رباب بالکل ویران نظروں سے سامنے دیوار پر ٹکٹکی باندھے دیکھتی رہی۔

''کیا بات ہے سرکار! آپ نے چپ کا روزہ نہیں توڑنا آج؟'' ایک حوالدار نے اس سے مخاطب ہو کر طنزاً کہا۔

اس نے ایک اچٹتی نظر سے اسے دیکھا اور پھر اپنے سابقہ مشغلے میں مصروف ہو گئی۔

''ہائے ہائے! کیا ظالم نظریں ہیں......'' وہ ایک فحش اشارہ کر کے بولا۔

رباب نے سنی ان سنی کر دی۔

رات ہوتے ہی تھانے کی گہما گہمی ماند پڑ گئی۔ ڈیوٹی پر موجود اہلکار باہمی رضامندی سے ان دونوں رقاصاؤں کو اندرونی کمرے میں لے گئے۔ اب حوالات کے باہر وہی حوالدار کھڑا اسے بھوکی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اسے علم تھا کہ اندر موجود اس کے ساتھی اب صبح ہی کی خبر لائیں گے۔

وہ کچھ دیر بے چینی سے ٹہلتا رہا۔ جب ضبط کا یارا نہ رہا تو اس نے حوالات کا دروازہ کھولا اور رباب کے پاس آ کھڑا ہوا۔ وہ اس کے عزائم بھانپ چکی تھی۔ کرب و اذیت نے اس کی رگیں چٹخا دیں۔ ذہن میں ایک فوری منصوبہ پنپنے لگا۔

''اندر کیوں چلے آئے ہو؟ مجھے بھی کسی الگ کمرے میں لے جاتے جیسے وہ سب گئے ہیں۔'' رباب نے مسکرا کر کہا۔

''وہ صاحب لوگ ہیں بھئی! ہمیں ایسی سہولتیں کہاں میسر ہیں؟'' وہ اس کی مسکراہٹ کو رضامندی سمجھ کر ریشہ خطمی ہو گیا۔

اسے سلاخوں کے سامنے سے ہٹا کر وہ ایک جانب لے گیا۔ حوالدار کی دست درازی بڑھتی ہی چلی جا رہی تھی۔ وہ اس کی بھرپور 'حوصلہ افزائی' کرنے لگی۔ چڑھتی سانسوں میں وہ پہلے ہی اپنے ہوش و حواس سے بیگانہ ہو رہا تھا' رباب کی خود سپردگی کے بعد وہ گرد و پیش سے مزید لاتعلق ہو گیا۔

اس نے اپنا اسلحہ بے پروائی سے ایک جانب رکھ دیا۔

رباب پر وحشت سوار ہونے لگی۔ وہ ایسے ہی کسی موقع کی تلاش میں تھی۔

اس نے ایک جھٹکے سے اس کا پستول نکالا اور اپنے سینے کے دائیں جانب رکھ کر ٹریگر دبا دیا۔

گرم لہو کا فوارہ اچھلا اور اس حوالدار کا چہرہ رنگین کر گیا۔ اس کے تمام جذبات خوف میں ڈھل گئے۔ فائر کی آواز سن کر اندرونی کمرے میں موجود اہلکار بھی بھاگے چلے آئے۔ رباب کی سانس اب اکھڑنے لگی تھی۔ آنکھیں بند ہونے لگیں۔ غشی کی حالت میں ایک اے۔ ایس۔ آئی کی آواز اس کی سماعت میں پڑی۔

''میت پر کپڑا لا کے ڈال دو کوئی۔''

اس اذیت کے عالم میں بھی اس کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ آ گئی۔ طمانیت کے ایک بھرپور احساس سے اس نے آخری ہچکی لی اور آنکھیں موند لیں۔

اسے اپنی شناخت مل گئی تھی۔